اسلام اپنی نگاہ میں

اصول و مظاہرِ اسلام - بنیادی مآخذ کی روشنی میں

تالیف:
ساچیکو مراتا - ولیم چیٹک

ترجمہ:
محمد سہیل عمر

ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد
اقبال اکادمی پاکستان، لاہور

جملہ حقوق محفوظ

ناشر:

ادارہ تحقیقاتِ اسلامی
شاہ فیصل مسجد کمپلیکس، اسلام آباد

شریک ناشر:
اقبال اکادمی پاکستان
(حکومتِ پاکستان، وزارتِ ثقافت)
چھٹی منزل، ایوان اقبال، لاہور

Tel: [+92-42] 6314-510
[+92-42] 9203-573
Fax: [+92-42] 631-4496
Email: director@iap.gov.pk
Website: www.allamaiqbal.com

ISBN 978-969-416-420-5

طبع اوّل	:	۲۰۰۸
تعداد	:	۱۱۰۰
قیمت (مجلد)	:	-/۵۰۰ روپے
قیمت (پیپر بیک)	:	-/۴۵۰ روپے
مطبع	:	شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

محل فروخت: سیلز ڈپو، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، شاہ فیصل مسجد کمپلیکس، اسلام آباد
۱۱۶، میکلورڈ روڈ، لاہور، فون: ۷۳۵۷۲۱۴

فہرست مطالب

تمہید ۱

تعارف ۹

⁕ قرآن: ۹، رسول خداؐ: ۱۷، حدیث جبرئیل: ۲۵، دین: ۲۹، اسلام کی تین جہات: ۳۶، اسلامی علوم: ۳۹، چوتھی جہت: ۴۶

حصہ اوّل: اسلام ۴۷

باب اوّل: ارکانِ دین ۵۵

⁕ عمل-اطاعت کی تجسیم: ۵۵، رکن اوّل- شہادت: ۵۷، رکن دوم- نماز: ۵۹، رکن سوم- زکوٰۃ: ۶۶، رکن چہارم- روزہ: ۶۷، رکن پنجم- حج: ۷۱، رکن ششم- جہاد و مجاہدہ: ۷۳، شریعتِ اسلامیہ: ۷۵، گناہ: ۸۰

باب دوم: ''اسلام'' کا تاریخی پیکر ۸۵

⁕ قرآن وسنت: ۸۵، مذاہب فقہ: ۸۷، فقہ اور سیاست: ۹۱

حصہ دوم: ایمان ۹۵

⁕ اسلام اور ایمان: ۹۷، اُصولِ ثلاثہ: ۱۰۷

باب سوم: توحید ۱۱۱

⁕ پہلی شہادت: ۱۱۱، خدا: ۱۱۳، شرک: ۱۱۶، آیاتِ خداوندی: ۱۲۱، تعبیر آیات: ۱۲۴، اسمائے الٰہیہ: ۱۳۰، کلام: ۱۳۷، ذات وصفات: ۱۳۹، رحمت اور غضب: ۱۴۵، قرب وبُعد: ۱۴۷، تنزیہ اور تشبیہ: ۱۵۰، رحمت غضب سے بڑھی ہوئی ہے: ۱۵۵، افعالِ خداوندی: ۱۵۹، غیب وشہود: ۱۶۱، ارض وسما: ۱۶۳

⁕ فرشتے: ۱۷۰، فرستادگانِ غیب: ۱۷۱، نور: ۱۷۴، فرشتوں کی نورانیت: ۱۷۸، طین-آدمِ خاکی: ۱۸۲، ارواح واجسام: ۱۸۴، وجودِ ناری: ۱۹۰، نفس: ۱۹۶، خیال: ۱۹۸، خلاصہ: ۲۰۱

❁ پیمانۂ تقدیر:۲۰۲، قوتِ تخلیق:۲۰۲، خیر و شر:۲۰۸، آزمائش:۲۱۴، آزادی و اختیار: ۲۱۸، مخلوقات کا اُصولِ تنوع: ۲۲۵، نوعِ انسانی: ۲۲۹، عبد اور خلیفۃ اللہ: ۲۳۶، مہربان بادشاہ: ۲۴۰، مراتبِ تخلیق: ۲۴۲

باب چہارم: نبوّت ۲۴۹

❁ شہادتِ ثانی - انبیا کا پیغام: ۲۴۹، نبی اور رسول: ۲۵۰، امانتِ الٰہی: ۲۵۲، بنیادی فطرتِ انسانی: ۲۵۶، آدم اور ابلیس: ۲۵۹، ہبوطِ آدم: ۲۶۵، غفلت: ۲۶۸، ذکر: ۲۷۲، آیاتِ خداوندی کے روبرو: ۲۷۶، ہدایت اور گمراہی: ۲۷۹، ظلم: ۲۸۶، دستِ قدرت: ۲۹۱

❁ اسلام اور دیگر ادیان: ۳۰۰، نبوّتِ عام اور نبوّتِ خاص: ۳۰۰، یہودیت اور عیسائیت: ۳۰۷، القرآن: ۳۱۸، اسمائے قرآن: ۳۲۷، محمد رسول اللہؐ: ۳۳۳، بشارت اور انتباہ: ۳۳۷

باب پنجم: آخرت ۳۴۹

❁ زندگی اور موت: ۳۵۳، دنیا اور آخرت: ۳۵۵، قبر: ۳۵۹، دنیا کا خاتمہ: ۳۶۳، قیامت: ۳۶۶، جنت اور دوزخ: ۳۷۷

❁ نفس کی آشکارائی: ۳۸۳، صورتِ الٰہیہ کا قیام: ۳۸۳، خیال: ۳۸۹، عالم رؤیا: ۳۹۶، برزخ: ۴۰۰، فرشتوں کا سامنا: ۴۰۵، روزِ جزا: ۴۱۱

باب ششم: مسلم فکریات ۴۱۹

❁ اسلام کے ابتدائی عہد میں ایمان کا بیان کیسے ہوا؟: ۴۲۳، علم کلام: ۴۲۸، تصوّفِ نظری: ۴۳۴، فلسفہ: ۴۳۷، فہم و ادراک کے قطبین: ۴۴۱، علم کلام کی عقلیت: ۴۵۲، فلسفے کے تجریدی افکار: ۴۵۵، مشاہدۂ حق کے بارے میں تصوّف کا نقطۂ نظر: ۴۶۱

حصہ سوم: احسان ۴۶۵

باب ہفتم: احسان کی قرآنی بنیادیں ۴۶۷

❁ احسان - لفظ اور معانی: ۴۶۷، عبادت: ۴۷۷، دیدارِ حق: ۴۸۱، اخلاص: ۴۸۴، تقویٰ: ۴۹۲، محبت: ۴۹۹، تصوّرِ صالحیت: ۵۰۳

باب ہشتم: احسان کے تاریخی مظاہر ۵۱۵

❁ دُعا و مناجات: ۵۱۵، فنونِ لطیفہ اور شاعری: ۵۱۸، عملی تصوف: ۵۲۹، اقلیمِ عشق: ۵۳۷، روحِ خداوندی کا پیکر: ۵۴۲

حصہ چہارم: اسلام-تاریخ اور تصوّرِ تاریخ ۵۵۱

بابِ نہم: تاریخ و تعبیر ۵۵۳

❁ اسلام اور ماضی کی تعبیر: ۵۵۷، آثارِ قیامت: ۵۶۲

بابِ دہم: موجودہ صورتِ حال ۵۶۷

❁ اسبابِ زوال: ۵۶۹، آثارِ تاریخی پر ایک نظر: ۵۷۱

مختصر فرہنگ ۵۷۷

اسماء الحسنٰی ۵۹۱

حواشی و تعلیقات ۵۹۹

اشاریہ ۶۲۱

❁......❁❁......❁

بسم الله الرحمن الرحيم

تمہید

سٹیٹ یونی ورسٹی آف نیویارک سٹونی بروک کے شعبہ مطالعات دین میں ۱۹۸۳ء سے لے کر اب تک سال میں ایک مرتبہ ہم دونوں میں سے کوئی ایک اسلام پر ایک تعارفی کورس پڑھاتا رہا ہے۔ یہ کتاب اسی کورس کی دین ہے۔ تدریس کے دوران میں ہماری کوشش ہمیشہ یہی رہی کہ وہ نقطۂ نظر، وہ تصور اور وہ تناظر پڑھنے اور پڑھانے والوں کی گرفت میں آ جائے جو اسلام کے بنیادی مآخذ میں روح ورواں کی طرح جاری وساری ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس تصور کو آج کی زبان میں بیان بھی کر دیا جائے۔ آغاز ہی میں ہمیں ایک مسئلے کا سامنا کرنا پڑا۔ مسئلہ یہ تھا کہ بھانت بھانت کے طالب علموں کو اسلام کس طرح پڑھایا جائے؟ ان کی اکثریت لونگ آئی لینڈ نیویارک یا اس کے گردونواح کے علاقے سے تعلق رکھتی تھی۔ ان میں امریکی اور دوسری قوموں کے لوگ سبھی شامل تھے۔ عام طور پر ان میں سے ایک تہائی طالب علم وہ ہوتے تھے جن کے والدین یا ان سے پچھلی پیڑھی میں لوگ اسلامی دنیا کے مختلف گوشوں سے آ کر امریکہ میں آباد ہوئے، چین اور انڈونیشیا کے ساحل سے آنے والوں سے لے کر البانیا اور مراکش کے باسیوں تک۔

اسلام پر یہ کورس پڑھنے سے غیر مسلم طلبا کی اکثریت کی غرض یہ ہوتی ہے کہ یونی ورسٹی کی طرف سے جتنے تعلیمی تقاضے ہیں انھیں پورا کیا جا سکے یا محض یہ کہ اس کورس کے اوقات تدریس میں انھیں اپنے لیے ایک سہولت نظر آتی ہے۔ مسلمان طلبا اس کورس میں کئی اسباب سے شریک ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض طلبا میں اسلام سے ایک لاتعلقی کے باوجود امریکی معاشرے سے اتنی بے اطمینانی جنم لے چکی ہوتی ہے کہ وہ انھیں اپنی اصل کی تلاش میں کوشاں ہونے پر مجبور کر دے۔ کچھ طلبا کے والدین یا بڑوں کا اصرار ہوتا ہے کہ وہ اس کورس میں شریک ہو کر اپنے دین کے بارے میں کچھ سیکھیں۔ کچھ طالب علم ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس زعم میں شریک درس ہو جاتے ہیں کہ چونکہ وہ مسلمان ہیں لہٰذا ان کو آسانی سے اس کورس میں ''اے'' گریڈ مل جائے گا۔ (ان بے چاروں کا خواب جلد ہی چکنا چور ہو جاتا ہے)۔ گاہے گاہے اُن نظریاتی گروہوں سے منسلک کوئی طالب علم بھی آ جاتا ہے جنھیں ہم

''بنیاد پرستی'' کے عمومی عنوان سے یاد کرتے ہیں۔ ایسے طالب علم ہماری کلاسوں میں اس لیے آتے ہیں کہ بذاتِ خود یہ دیکھ سکیں کہ غیر مسلم اہلِ علم پر اسلام کے بارے میں رائے دینے کے سلسلے میں اعتماد کیوں نہیں کیا جاتا۔

جب ایسے طرح طرح کے لوگوں سے بات کرنا ہو تو مسئلہ زیادہ شدید ہو جاتا ہے کہ ان رنگا رنگ مخاطبین کے سامنے اسلام کو کیسے پیش کیا جائے کہ انھیں سمجھ بھی آ جائے اور اس میں تحریف بھی نہ کرنا پڑے۔ مسلمان طلبا اپنے دین کے بارے میں عموماً کچھ نہیں جانتے لیکن دبے دبے رہتے ہیں، دفاعی انداز میں۔ جانتے تو مغربی طلبا بھی کچھ نہیں لیکن ان کا مزاج جارحانہ ہوتا ہے۔ ان دو طرح کے طالب علموں کو اسلام کیسے سمجھایا جائے؟ ایک طریقہ جو ہم نے ہمیشہ استعمال کیا ہے یہ ہوا کرتا ہے کہ طالب علموں سے وہ کتابیں پڑھنے کو کہا جائے جو معاصر اہلِ قلم نے اسلام پر تصنیف کی ہیں اور جو اسلام کے بارے میں دیانت اور ہمدردی سے بات کرتے ہیں۔ خوش قسمتی سے ایسی کتابوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔[1] ایک اور طریقہ یہ ہے کہ اسلام کو یوں نہ پڑھایا جائے کہ وہ ایک اجنبی، تیسری دنیا کی پیداوار یا آثارِ قدیمہ کی قبیل کی کوئی شے معلوم ہونے لگے بلکہ اسے ایسے انداز میں پیش کیا جائے جس سے پتا چلے کہ اسلام وہ تصورِ کائنات ہے جو آج بھی کروڑوں لوگوں کی زندگی کو معنی عطا کر رہا ہے۔ ہمارے لیکچروں اور گفتگو کا ہدف آغاز ہی سے یہ رہتا ہے کہ یہ بتایا جائے کہ اسلام خود اپنے بارے میں کیا کہتا ہے، خود کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔ یہ کتاب جو آپ کے ہاتھ میں ہے ہماری تدریسی کاوشوں اور ہماری گفتگو کا ماحصل ہے۔

ایسی کتابیں تو بہت سی ہیں جو اسلام کو آج کی دنیا کے لیے ایک بامعنی اور زندہ حقیقت قرار دیتی ہیں لیکن ان میں سے بہت کم ایسی ہیں جو یہ دیکھنے کی کوشش کرتی ہیں کہ مسلمان کی نگاہ میں یہ کائنات کیا ہے۔ ان کتب میں اگر مسلمانوں کی آرا سے استفادہ کیا بھی جاتا ہے تو ان لوگوں کی باتوں کو حوالہ بنایا جاتا ہے جنھوں نے سیاسی اندازِ فکر اختیار کیا اور جدید میڈیا اور ذرائع ابلاغ کی اہمیت کو پوری طرح محسوس کیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے ہاں حقیقت و ماہیتِ اشیا پر سنجیدہ اور نرم روگفت وشنید کا فقدان ہے۔ اس کی جگہ ان کے ہاں ڈرامائی اعلانات اور کیمرے کے لیے پرکشش واقعات نے لے رکھی ہے۔ یہ اسلامی دنیا کے علمی مراکز کا روایتی زاویۂ نظر نہیں ہے۔

مغرب میں لکھی جانے والی کتب میں سے بعض میں یہ کوشش نظر آتی ہے کہ فکرِ اسلامی کو اس کی

گہرائی میں واضح کیا جائے، لیکن ان کتب میں مبتدی طلبا کے لیے مشکلات بہت ہوتی ہیں۔ اوّل تو ان کو پڑھنے کے لیے دین کے بارے میں تفصیلی علم درکار ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ ان میں زبان ایسی استعمال کی جاتی ہے جو بنیادی طور پر مغربی روایت علم سے مستعار ہوتی ہے۔ ان کتب میں اگر کہیں قرانی اسلوبِ بیان اور اصطلاحات پر انحصار کیا بھی جاتا ہے تو بھی ان میں یہ شاذ ہی نظر آتا ہے کہ مصنف نے اسلام کی اپنی عقلی روایت کی پوری گہرائی، گیرائی اور تنوع پر توجہ دینے کی زحمت کی ہو۔

اس کتاب میں ہمارا ہدف یہ رہا ہے کہ قارئین پر یہ واضح ہو سکے کہ اسلام خود اپنے بارے میں کیا کہتا ہے؟ ''اسلام'' سے ہماری مراد وہ عظیم کتابیں ہیں جو (حالیہ دور سے پہلے تک) متفقہ طور پر اسلامی روایت کی معیاری تصانیف اور نشاناتِ عظمت مانی گئی ہیں۔ ہر عظیم مذہب کی طرح اسلام کے بھی نمایاں اور شاندار سنگ میل ہیں اور ہم نے انھی کی مدد سے اسلام کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کتابوں کا تارو پود قرآن مجید سے اٹھا ہے۔ ایک بہت گہرے معنی میں اسلام قرآن ہے اور قرآن اسلام ہے۔ قرآن کی بنیادی شرح و وضاحت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کی۔ ان کے بعد بڑے بڑے لوگ، فقہا، متکلمین، فلسفی، اولیا، حکما ہر زمانے کی ضرورت کے مطابق اسلام کے اصل تصور کے بارے میں توضیحات اور شرح وتبیین کرتے آئے ہیں۔

اسلام کی اپنی ایک کائنات ہے۔ ہم نے اس کتاب میں اس کائنات کی جانب ایک در باز کرنے کی سعی کی ہے۔ ہمیں اس چیز سے سرے سے کوئی دلچسپی نہیں کہ اسلام کو جدید علمی دنیا کے ان رائج الوقت نقطہ ہائے نگاہ میں سے کسی ایک غالب نقطۂ نظر کی کسوٹی پر پرکھا جائے جن میں اپنے آپ کو جاننے کے لیے، خود شناسی کے مختلف معاصر معیارات کو بنیاد بنایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس ہم اسلام کو ماضی کے ان عظیم مسلمانوں کی نگاہ سے دیکھنا چاہتے ہیں جن کے ہاتھوں تفسیر وتعبیرِ قرآن کے مرکزی اور بڑے اسالیب کی صورت گری ہوئی اور جن کے ذریعے اسلام میں فہم دین کی روایت کی تشکیل ہوئی۔

اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم صرف اسلام کی کلاسیکی کتب میں سے اقتباسات لے کر ان کا ترجمہ ایک مجموعے کی شکل میں پیش کر دیں گے۔ کلاسیکی متون ان لوگوں کے لیے نہیں ہوتے جو ابھی اسلام کے مطالعہ کا آغاز کر رہے ہوں۔ ان کتابوں کے تقاضے ان کی ہمت سے سوا ہوتے ہیں کیونکہ یہ کتابیں ان لوگوں کے لیے لکھی ہی نہیں گئیں جو کسی دوسرے ثقافتی دائرے سے تعلق رکھتے ہوں۔ ان کتابوں کے مخاطب وہ لوگ رہے ہیں جن کا طرزِ فکر کم وبیش وہی تھا جو ان کتابوں کے مصنّفین کا تھا

اور جو دنیا کی دید کا وہی زاویہ اپنائے ہوئے تھے جو ان کتابوں کے لکھنے والوں کے پیشِ نظر تھا۔ مزید براں یہ کتابیں بالعموم ان لوگوں سے کلام کرتی تھیں جنھیں اسلامی علوم پر ایک منتہیانہ دسترس حاصل تھی۔ اسلامی علوم پر ایسی نظر اور ان پر یہ عبور ہماری یونی ورسٹیوں کے گریجویٹ سکولوں میں بھی فراہم ہونا ناممکن ہے، انڈر گریجویٹ سطح کا تو ذکر ہی کیا!

اسلامی روایت کی کلاسیکی کتب کا کردار آج کی درسی کتب سے مختلف رہا ہے۔ درسی کتابوں میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ ہر چیز کو ایک نسبتاً ابتدائی صورت میں واضح کر دیا جائے۔ اس کے برعکس کلاسیکی کتب اس غرض سے لکھی جاتی تھیں کہ کسی ایک موقف یا مبحث کو اس کے وسیع فکری تناظر میں رکھ کر دیکھا جا سکے۔ ان کتب میں اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ مصنف نے اپنے دلائل کا صرف اجمالی خاکہ درج کر دیا اور اس کی تفصیلات کتاب کو پڑھانے والے حضرات نے دورانِ درس زبانی بیان کر دیں۔ طالب علم بھی کتاب کو لائبریری سے آج جاری کروا کے اگلے ہفتے واپس کرنے کے معمول سے آزاد تھے۔ ان کی اکثریت کتاب کو اپنے ہاتھ سے نقل کر کے اپنا نسخہ تیار کرتی تھی اور پھر کسی ماہر استاد کے پاس بیٹھ کر مہینوں بلکہ سالوں تک کتاب کو لفظاً لفظاً پڑھتی تھی۔ ہمیں اس عمل کا ذاتی تجربہ ہے اور ہم اسلامی دنیا کے ایسے حلقہ ہائے درس میں شامل رہے ہیں جہاں کلاسیکی متون کا مطالعہ کیا جاتا تھا۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ اگر استاد اچھا ہو تو وہ آسانی سے کسی ایک لفظ یا کسی فقرے کو لے کر اس سے ایک جہانِ معنی برآمد کرتا چلا جاتا ہے۔

ہم نے ان کلاسیکی کتابوں کو اپنے قارئین کے سامنے رکھنے کے بجائے یہ کیا ہے کہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ وہ کیا نقطۂ نظر، کیا تناظر ہے جو ان کتب کے پسِ پشت کارفرما ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ہماری کوشش یہ بھی رہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ان کتابوں اور جدید دنیا کی بھاری بھرکم عالمانہ کتابوں میں استعمال ہونے والے مجرد اور اصطلاحی اسلوب بیان اور الفاظ سے گریز کیا جائے۔ ہم نے یہ سعی بھی کی ہے کہ قرآن کے اپنے طرزِ بیان کو سامنے رکھا جائے اور اس کی شرح و وضاحت کے لیے اس کا خلاصہ کرنے کے بجائے اقتباسات دیے جائیں۔

ہمیں بخوبی علم ہے کہ آج کے بہت سے مسلمانوں میں ان کتب سے ایک بیزاری پائی جاتی ہے، ان کی نظر میں یہ سب فرسودہ اور از کار رفتہ مواد ہے۔ وہ اپنے اس فکری ورثے کو، اس میراثِ فکر کو چھوڑ کر اس کی جگہ کسی زیادہ ''سائنٹفک'' علمی کاوش مثلاً سوشیالوجی کو اپنانا چاہتے ہیں۔ ہر وہ شخص جو یہ

دعویٰ کرتا ہے کہ اسلام کی میراثِ فکر، اس کی عقلیات کا وسیع ذخیرہ غیر ضروری اور لایعنی ہے اور صرف قرآن ہمارے لیے کافی ہے وہ روحِ عصر یا اپنے زمانے کے رجحانات کے سامنے سپر ڈال چکا ہے۔ جو لوگ ماضی کی شرح و تعبیر کو یوں نظر انداز کرتے ہیں ان کے نصیب میں صرف یہ رہ جاتا ہے کہ اپنی کتاب کو آج کے مروّجہ تناظر اور لمحۂ حاضر کے مقبول تصورِ کائنات کی روشنی میں دیکھیں اور اسی کے حوالے سے اس کی تفسیر کریں۔ پھر بات کچھ اور ہو جاتی ہے، راستہ بدل جاتا ہے۔ ہمارے بڑے علما جو کچھ ہمیشہ لکھتے آئے ہیں یہ اس سے مختلف چیز بن جاتی ہے۔ وہ لوگ اپنے موجود کی، اپنے لمحۂ جاری کی شرح و تعبیر اپنی عظیم الشان روایت کی روشنی میں کرتے تھے اور کبھی خود کو تقاضائے وقت کے سحرِ گریزاں کا شکار نہیں ہونے دیتے تھے کہ ''آج کے مطابق'' ہونے سے زیادہ لمحاتی، گریز پا اور پُر فریب تجریدی چیز اور کچھ نہیں ہو سکتی۔

اسلام پر جو تعارفی کتب ہماری نظر سے گذری ہیں ان میں یہ دیکھنے کی کوشش بہت کم کی جاتی ہے کہ مسلمانوں کا فہمِ حقیقت کیا ہے، مسلمان حقیقت کسے کہتے ہیں؟ قارئین کو یہ تو بتا دیا جاتا ہے کہ قرآن مجید کی اہمیت بنیادی ہے یا یہ کہ خدا اور آخرت کے بارے میں مسلمانوں کے عقائد یہ ہیں لیکن ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے کہ ان کتابوں کے لکھنے والے سرسری انداز میں ذکر کرنے سے بڑھ کر صحیح معنی میں یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ اصل میں ان عقائد کا مطلب کیا ہے۔ ان کتابوں میں عام طور پر ہوتا کیا ہے، فکرِ اسلامی کی ایک مختصر سی تاریخ جسے پڑھ کر مسلمان مفکرین ایک طرح سے کم عقل محسوس ہونے لگتے ہیں اور قاری یہ کہ اٹھتا ہے کہ آخر ان غیر متعلق سوالات پر بحث کرنے میں ان لوگوں نے اتنا وقت کیوں برباد کیا؟ اسلام پر لکھنے والے جو اہلِ قلم ذرا ہمدردانہ رویّہ رکھتے ہیں، وہ یہ وضاحت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ مباحث اپنے زمانے میں، اپنے تاریخی تناظر میں اہمیت رکھتے تھے۔ یہ کوئی نہیں بتاتا کہ یہ مباحث آج بھی اتنے ہی بامعنی اور اہم ہیں جتنے اپنے زمانے میں تھے اور ان پر آج بھی مغرب کے تمدنی دائرے میں زور شور سے مباحثہ جاری ہے، ہاں اس کی اصطلاحات اور لفظیات میں تبدیلی آ گئی ہے۔

ہمارا کہنا یہ ہے کہ اسلامی روایت میں ہمیں بڑے بڑے سوالات کے بڑے اور اہم جوابات کی متعدد مثالیں ملتی ہیں، ایسے سوالات جن کے بارے میں ہر انسان کبھی نہ کبھی سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارے زمانے کا رجحان یہ ہے کہ ان سوالات کو غیر متعلق، لاینحل یا خود شکن

قرار دے کر رد کر دیا جائے۔ ہمارا اشارہ ان سوالات کی طرف ہے جو ایک پانچ سالہ بچہ فطری طور پر پوچھنا چاہتا ہے، کیوں، کیسے، کیا؟ اور پھر اپنے بڑوں کے خوفِ استہزا سے گھبرا کر چپ رہ جاتا ہے۔ ہم اس دنیا میں کیوں آئے ہیں؟ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ پیدا ہونے سے پہلے ہم کہاں تھے؟ مرنے کے بعد ہم کہاں جائیں گے؟ یہ دنیا کہاں سے آئی؟ خدا کیسے پیدا ہوا؟ فرشتے کیا ہوتے ہیں؟ دنیا میں اتنی برائیاں کیوں ہیں؟ شیاطین کیا ہوتے ہیں؟ اگر اللہ تعالیٰ رحمٰن و رحیم ہے تو اس نے ابلیس کو کیوں پیدا کیا؟ اللہ تعالیٰ لوگوں کو کیوں تکالیف اٹھانے دیتا ہے؟ خدائے رحمٰن و رحیم کچھ لوگوں کے لیے جہنم کیوں مقدر کر دیتا ہے؟ مجھے آخر یہ سب کچھ بھگتنے کی کیا مجبوری ہے؟

اسلام پر لکھی گئی کتابیں اپنے قارئین سے سرسری طور پر یہ ذکر تو کر دیتی ہیں کہ مسلمان مفکرین نے ان سوالات کے جواب میں کیا سوچا، لیکن جو بات اَن کہی رہ جاتی ہے وہ یہ ہے کہ آخر وہ کیا فکری کائنات ہے، بیانِ حقیقت کا وہ کون سا اسلوب ہے جو مسلم فکر کو اس کا مخصوص تناظر عطا کرتا ہے اور جس سے ان سوالات کے جواب معنی خیز بن جاتے ہیں۔ اسلام پر ہونے والے یہ مطالعات عموماً مسلم فکر میں پائے جانے والے اختلافات پر زور دیتے ہیں، لیکن یہ بتانے سے قاصر رہتے ہیں کہ ان اختلافی مباحث میں ہمیشہ صحیح یا غلط، صواب و ناصواب کی منطق نہیں چلتی۔ فہم کے مختلف تناظر ایک دوسرے سے جدا اس لیے ہوتے ہیں کہ دین کے بنیادی مآخذ کی شرح و تعبیر میں فرق واقع ہو جاتا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ کسی ایک مسئلے پر ایک موقف دوسرے ہر موقف کو لازماً رد کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ مذکورہ کتابوں میں یہ بتایا جاتا ہے کہ مسلمان مفکرین ان مسائل، مثلاً جبر و قدر کے مسئلے پر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا رہتے تھے، لیکن اگر اس مبحث سے متعلق ہر طرح کی کتابوں پر غور سے ایک نظر ڈالی جائے تو یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ بحث کے سبھی فریق اس ایک چیز کے متفقہ طور پر قائل ہیں کہ اس مسئلے میں حق یہ ہے کہ دونوں جانب حق پایا جاتا ہے، معاملہ بین بین ہے، نہ یہ پوری طرح درست، اور نہ وہ کاملاً غلط اور نادرست۔ جن لوگوں کے ہاں کسی ایک انتہا کی طرف جھکاؤ نظر آتا ہے، وہاں بھی اس طرح کے انتہا پسند مؤقف اکثر ایک عقلی ریاضت کے طور پر تشکیل دیئے گئے ہیں اور ان کو خود ان کے بنیاد گذار مفکر یا اس کے شاگردوں کے ہاتھوں شکست و ریخت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

ہماری کتاب کئی لحاظ سے ان کتابوں کا جواب کہی جا سکتی ہے جو عام طور پر مغربی قارئین کو اسلام سے متعارف کروانے کے لیے استعمال میں آتی رہی ہیں۔ ہم نے اس کتاب میں جو معلومات قارئین

کی نذر کی ہیں، ان سے مقصود یہ رہا ہے کہ وہ تمام خلا پر کیے جا سکیں جو عام طور پر مروّج تعارفی کتب میں پائے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ یہاں آپ کو ایک پہلو غالب نظر آئے گا، لیکن دوسرے پہلو کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ایک آسان کام ہے۔ اس کے لیے عام طور پر دستیاب تعارفی درسی کتب میں سے کسی کا بھی مطالعہ کافی رہے گا، یا پھر تاریخ اسلام پر جو تحریریں ملتی ہیں، ان میں فراہم کردہ معلومات کے مطابق اسلام پر نظر ڈالنا مفید رہے گا۔

قارئین کی خدمت میں ایک بات ہم ابتدا ہی میں عرض کر دینا مناسب جانتے ہیں کہ یہ کتاب ''تاریخی معلومات'' سے تہی رکھی گئی ہے۔ کتاب کے آخری حصے میں ہم اسلام کے تصورِ تاریخ کے بارے میں بھی کچھ گذارشات کریں گے۔ اس سے یہ امر واضح ہو جائے گا کہ تاریخ کے تنقیدی مطالعے کا جدید رجحان جو معاملات سرفہرست رکھتا ہے، وہ ہمارے لیے کیوں غیر اہم ہیں۔ تاریخ نویسی کا مطلب آخر اس کے سوا اور کیا ہے کہ ماضی کے واقعات کی معنویت تلاش کرنے کے عمل میں آج کے تصورِ حقیقت کو بنیاد بنایا جائے۔ واقعات اسی وقت سمجھ میں آتے ہیں جب انھیں انسان کی نگاہ کے آئینۂ تعبیر میں دیکھا جاتا ہے۔ ان میں معنی از خود پیدا نہیں ہوتے۔ قرآن اور اسلامی روایت کو ذرا معاصر علمی آرا اور مروّجہ نظریات کی عینک سے پڑھ کر دیکھیے۔ ایسا کرتے ہی ان کی وہ ساری اہمیت اور معنویت جو روایتی اسلام میں انھیں حاصل رہی ہے، لازماً نظر سے اوجھل ہو جائے گی۔ فطری امر ہے کہ بطور مصنّفین ہمارا بھی ایک زاویۂ نگاہ ہے۔ تعبیرِ حقیقت کے لیے ہماری اپنی عینک ہے، بلکہ بعض لوگ تو شاید ہمیں اس لیے نشانۂ تنقید بنائیں گے کہ ہم نے اسلام کے تصورِ دین کو خود اس کے اپنے اندر یعنی اسلامی تہذیب کے بطن میں تلاش کرنے کی سعی کی ہے اور اس کے لیے اسلام کی عقلی روایت پر بالعموم اور تصوف پر بالخصوص انحصار کیا ہے، لیکن وہ ناقدین یہ نہیں دیکھ رہے کہ یہی تو اسلام کے وہ علمی تناظر ہیں جن میں اسلامی روایت کے بارے میں سب سے گہرے اور خود شناسی پر مبنی افکار پائے جاتے ہیں۔ مسلمان مفکرین اور اہلِ علم نے بھی تو خود اپنے آپ کو، اپنے دین اور اپنی تہذیب کو سمجھا ہے۔ اگر ہم نے ان کے اس فہم کو معتبر نہ جانا تو پھر ہمارے لیے ضروری ٹھہرے گا کہ اس کی جگہ جدید مغربی مفکرین کے افکار و نظریات کو اہم قرار دیں۔ اگر ایسا ہوا تو پھر ہم اسلامی روایت کو ان تنقیدی نظریات اور مناہجِ علم کی عینک سے دیکھنے لگیں گے جو مغربی یونی ورسٹیوں میں پروان چڑھے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ آخر ایک اجنبی تناظر اور ایک درآمد شدہ زاویۂ نگاہ کو اسلامی روایت کے اپنے

تناظر پر کیوں ترجیح دی جائے جبکہ یہ اسلامی تناظر وقت کے صدمات جھیل کر زمانے کی کسوٹی پر پورا اترا ہے؟ ہمیں یہ بات سرے سے نامناسب لگتی ہے کہ کسی منہاج علم کو صرف اس لیے اختیار کرلیا جائے کہ آج کل اس کا چلن زیادہ ہے اور ایک ایسی فکری روایت کے وسائل کو نظرانداز کردیا جائے جو ہزار سال تاریخ کے بعد بھی ایک زندہ حقیقت ہے۔

آخر میں ہم ان تمام طلبا کا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں جو گذشتہ دس سال میں سٹونی بروک میں ہمارے حلقۂ درس میں شامل ہوتے رہے۔ ان کے سوالات، خواہ ذہانت سے کیے گئے ہوں یا اس کے بغیر، ہمارے لیے معاون ہوتے رہے۔ ان کی مسلسل دلچسپی اور سوالات کی صورت میں جاری رہنے والے عملِ تفتیش نے ہمیں مجبور کیے رکھا کہ ہم نے اسلام کے تصورِ دین کے بارے میں، خود اس کی نظر میں اس کی شناخت کے بارے میں جو کچھ سمجھا تھا، اس پر بار بار غور وفکر کرتے رہیں اور اسے بیان کرنے کے لیے وہ سانچے اور اسالیب تلاش کریں جن کی افادیت کا اعتراف کیا جائے۔

تعارف

بات ''اسلام'' کی ہو تو بعض اصطلاحات کو کھولنا اور ان کے معنی متعین کرنا ضروری ٹھہرتا ہے۔ ''اسلام'' عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی ہیں ''اللہ کی مرضی کے سامنے سر جھکا دینا''، ''اللہ کی مرضی کے سامنے خوئے تسلیم و سرافگندگی''، ''منشائے الٰہی کو مان کر قبول کر لینا''۔[1] اس لفظ کے ایک خاص معنی بھی ہیں۔ اس معنی میں ''اسلام'' عنوان ہے اس دین کا جو قرآن مجید اور سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذریعے قائم ہوا، اور مسلمان وہ ہے جس نے منشائے خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا، یا پھر وہ جو دینِ اسلام کا پیرو کار ہے۔ قرآن وہ کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرشتۂ وحی حضرت جبرئیل کے وسیلے سے سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل کی۔ یہ تو ہوا حکایتِ اسلام کا بنیادی اور سادہ ترین خاکہ۔ آیئے اب اس خاکے میں تفصیلات کا اضافہ کریں۔

قرآن

اسلام کے ماننے والوں کی تعداد آج سو کروڑ کے لگ بھگ ہوگی۔ یہ سوچنا درست نہیں ہوگا کہ سبھی مسلمان اپنے دین کے قیام کی داستان سے شناسائی رکھتے ہیں۔ اکثر مسلمانوں کے لیے تاریخ بطور تاریخ کچھ ایسی دلچسپی کی چیز کبھی تھی نہیں۔ رہے تاریخی واقعات و حوادث، تو اُن کے ضمن میں اہم بات صرف اس قدر ہے کہ اللہ کے افعال کا ظہور ان کے وسیلے سے ہوتا ہے۔ ماضی کے وہی واقعات اصل اہمیت رکھتے ہیں جن کا براہ راست اثر انسان کے لمحۂ حاضر پر پڑتا ہو یا پھر ان کا تعلق ان احوال سے رہا ہو جو انسان کو جہانِ دیگر میں پیش آنے والے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھیے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن کا نازل ہونا ایک ایسا واقعہ ہے جس کی اہمیت اور عظمت کے سامنے دیگر ہر چیز ماند پڑ جاتی ہے۔ نزولِ قرآن کے وقت کے صحیح تاریخی اور سماجی حالات کے مطالعے کا تعلق علم کے ایک ایسے انتہائی تخصّص والے شعبے سے ہے جس میں معدودے چند علما ہی اختصاص پیدا کرتے ہیں۔ مغربی مورخین نے اگر اس پہلو پر بہت زیادہ توجہ دی ہے تو اس سے کسی حد تک اس بات کی نشان دہی ہو جاتی

ہے کہ جدید آدمی کی نظر میں حقیقی کیا ہے اور اہم کیا، لیکن خود مسلمانوں کی نگاہ میں قرآن کی اہمیت کیا ہے، اس نکتے کو کھولنے کے لیے البتہ مورخینِ غرب کا رویہ قطعاً مددگار ثابت نہیں ہوتا۔

اس کتاب میں زیادہ تر ہماری کوشش یہ رہے گی کہ قرآنی تعلیمات کے بعض واضح مضمرات کو کھول کر بیان کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ قرآن خود اپنے بارے میں کیا کہتا ہے۔ سردست تو ہمیں قرآن کی ظاہری ہیئت کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے کہ ہمارے قارئین کی اکثریت نے غالباً اس کتابِ مجید کو دیکھا تک نہ ہوگا۔ ہاں ترجمۂ قرآن شاید چند قارئین کی نظر سے گذر چکا ہو۔[۲]

یہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ ہم قرآن مجید اور ترجمۂ قرآن کے درمیان فرق قائم کر رہے ہیں۔ عیسائیوں کے نقطۂ نظر کے بالکل برعکس، مسلمانوں کے لیے یہ ایک معمول کی بات ہے۔ مسیحی حضرات کے لیے انجیل بہرصورت انجیل ہی ہوگی خواہ اسے کسی بھی زبان میں تحریر کیا گیا ہو جب کہ مسلمانوں کے نزدیک کلامِ خداوندی وہ ہے جو ایک مخصوص، متعین عربی زبان کے سانچے میں نازل ہوا اور اس کی یہ لسانی ہیئت بھی ان کے نزدیک اتنی ہی ناگزیر ہے جتنے وہ مفاہیم جو اس کے الفاظ کے وسیلے سے ہم تک پہنچتے ہیں۔ سو قرآن صرف قرآنِ عربی ہے۔ رہے اس کے تراجم تو وہ محض ترجمانِ قرآن ہیں انھیں قرآن نہیں کہا جا سکتا۔ عالمِ اسلام کی علاقائی زبانوں میں قرآن کے تراجم، بالخصوص فارسی زبان میں، اوائل ہی میں ہو گئے تھے تاہم ان کی حیثیت مستقل کتاب کی بجائے متنِ قرآن کے معانی کی بین السطور شرح و تفسیر اور قرآن فہمی کے امدادی وسائل سے زیادہ نہیں تھی۔

کئی اعتبار سے قرآن کی لسانی ہیئت یعنی عربی زبان میں ہونے کی اہمیت اس کے متن کے معانی سے بڑھی ہوئی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ مسلمانوں میں بھی آیاتِ قرآنی کے صحیح مدلول اور شرح و تعبیر کے معاملے میں اختلافات پائے جاتے ہیں اور یہ اختلافات ان مناقشوں سے کم نہیں ہیں جو دوسرے ادیان کے ماننے والوں میں اپنے اپنے صحائف کے بارے میں جنم لیتے رہے ہیں۔ اسلام کی فکری تاریخ کے رچاؤ اور گہرائی کا ایک سبب وہ تنوع بھی ہے جو آیاتِ قرآنی کی تفسیر کے ضمن میں نظر آتا ہے۔ مسلمان مفکرین سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب یہ قول اکثر سننے میں آتا ہے کہ ہر آیتِ قرآنی کے سات مفاہیم ہیں۔ اوّلین مفہوم وہ ہے جسے ہم لغوی مفہوم کہتے ہیں جب کہ ساتواں اور سب سے گہرا مفہوم صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ (متنِ قرآن کو توجہ سے پڑھنے والے ہر شخص پر نبی علیہ السلام کے اس قول کی حکمت از خود آشکار ہو جائے گی۔) قرآنی عربی تمثیل و اجمال کی زبان ہے

جس کا ہر لفظ اپنے اندر کتنا ہی کچھ سمیٹے ہوئے ہے اور یہ خوبی عربی زبان کی خصوصیات اور لسانی ساخت کی مرہونِ احسان ہے۔ فطری بات ہے کہ ایسی ثروت منداور وسائل ابلاغ سے مالا مال زبان پڑھتے ہوئے قاری ایک ہی آیت کے معانی کی مختلف سطحوں کا مطالعہ کرتا چلا جائے۔

قرآنی عربی کی گہرائی اور گیرائی، نیز مختلف تعبیرات اور معانی کی تہ داری قبول کرنے کی صلاحیت پر نظر کیجیے تو یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس ایک کتاب نے کیوں کر اسلام جیسی عظیم عالمی تہذیب کی صورت گری کا کام انجام دیا۔ اگر متنِ قرآنی کی ہر آیت سے ہر شخص نے صرف ایک ہی مفہوم اخذ کیا ہوتا تو اسلام اس طرح اتنی دور تک کبھی نہ پھیلتا، جتنا آج ہمیں نظر آتا ہے۔ اس کتاب کے مخاطب سبھی طرح کے لوگ تھے، مردِ سادہ بھی اور ایک تہذیبی رچاؤ اور شائستگی کے حامل اربابِ دانش بھی، گلہ بان بھی اور فلسفی بھی، سائنسدان بھی اور اہلِ فن بھی۔

قرآن کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اپنا پیغام بھیجتے ہیں تو اسی زبان میں جو اس کے مخاطبین کی زبان ہوتی ہے۔[۳] وحی جن پر نازل کی جاتی ان کی ضروریات اور تقاضوں کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ قرآن ہی ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام اہلِ دنیا کے لیے پیامبر بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اگر پیغامِ قرآنی دنیا میں ہر ایک تک پہنچانے کے لیے ہے تو پھر قرآن کا ایسی زبان میں خطاب کرنا لازم تھا جسے ہر کس و ناکس سمجھ سکے، اسی لیے اسلام فی الواقع بہت تیزی سے دنیا کی تقریباً سبھی تہذیبوں میں پھیلتا چلا گیا، چین اور جنوب مشرقی ایشیا سے لے کر تا بہ سرزمینِ افریقہ و یورپ۔ ان تہذیبوں اور علاقوں کے لوگ طرح طرح کی کتنی ہی زبانیں بولتے تھے۔ ہمارا اشارہ صرف اس زبان کی طرف نہیں جو حرف وصوت میں ظاہر ہوتی ہے، بلکہ وہ زبان بھی جس میں دل و دماغ کلام کرتے ہیں۔ قرآن مجید نے ان سب کو اپنا مخاطب بنایا ہے۔ اس کا طرزِ کلام اپنی ایک الگ شان اور خصوصیات رکھتا ہے۔

کچھ لوگوں کا گمان ہے کہ عربی زبان اشاعتِ اسلام میں روک بنتی ہے۔ یہ بات درست نہیں۔ عربی زبان اسلام کے پھیلنے میں مددگار رہی ہے۔ متنِ قرآن تو ایک متعین شے تھی لیکن اس کے معانی میں شرح و تعبیر کے تقاضوں سے سازگاری کی بہت گنجایش تھی۔ وہ لوگ جو عربی سے نابلد تھے، ان کے لیے قرآن کا عربی متن پڑھنا اور جاننا ضروری ٹھہرتا تھا اور اس کے بعد وہ اپنے ثقافتی اور لسانی ورثے کے حوالے سے اسے سمجھنے کی سعی کرتے تھے۔ کسی ایک شخص کی شرح و تعبیر کو حتمی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ نئی نسل نہ تو پچھلوں کے ترجمہ و تفسیر پر کلیتاً انحصار کر سکتی ہے، نہ فہمِ متن کے اس معیار و مثال

کو نظر انداز کرسکتی ہے جو روایتِ سلف نے قائم کردی ہے۔ ہر مسلمان کو اپنے صحیفے سے اپنا تعلق خود قائم کرنا ہوتا ہے۔ ہر صاحبِ اخلاص مسلمان کو لازم تھا کہ وہ خطاب و کلام کی اس عربی کائنات میں اپنی جگہ بنائے، وہ فضا جو اس کے لیے کائناتِ ربّانی ہے۔

قرآنِ عربی اگر ایک طرف مدارج و اسالیبِ فہم میں تنوع کا مؤید ہے تو دوسری جانب اس سے خارجی ہیئت کی یکسانیت و یک رنگی کی پرورش بھی ہوتی ہے۔ تمام مسلمان ایک ہی صحیفے کی اسی ایک زبان میں تلاوت کرتے ہیں۔ یومیہ فرض نمازیں بھی وہ کم بیش یکساں انداز میں ادا کرتے ہیں۔ وحی کے ذریعے اللہ کے نازل کردہ کلام کو اسلام میں جو بنیادی اہمیت حاصل ہے، اس کے پیشِ نظر تلاوت ہی وہ سب سے بڑا وسیلہ ہے جس کے سہارے انسان کلمة اللّٰه سے شریکِ کلام ہوتا ہے۔ تفہیم کا عمل ثانوی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ کلامِ الٰہی کے معانی کی گہرائیوں پر مکمل عبور کسے حاصل ہوسکتا ہے! سب سے اہم ذمہ داری یہ ہے کہ کلامِ ربّانی کو قبول کر کے محفوظ کیا جائے۔ اس کی عربی ہیئت اہم تر ہے۔ یہ صورت و ہیئت آپ تک پہنچے گی تبھی تو آپ اس سے کچھ حاصل کر پائیں گے۔

قرآن کا ترجمہ قرآن نہیں ہوتا، معانیِ قرآن کی ترجمانی سے عبارت ہوتا ہے۔ انگریزی میں قرآن کے درجنوں تراجم تو رہے ہوں گے۔ ہر ترجمہ اپنے مترجم کے فہمِ قرآن کا آئینہ دار ہے، ہر ترجمہ دوسرے ترجمے سے خاصا مختلف ہے اور ان میں سے کوئی ترجمہ بھی قرآنِ مجید نہیں ہے۔ کلامِ خداوندی وہی ایک قرآن ہے خواہ اس کے ترجمان کتنے ہی کیوں نہ ہوں۔ جتنے قاری اتنے ترجمان۔

اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اسلام اختلاف آرا و تعبیرات کا ایک کھٹ راگ ہے، ہر شخص کی اپنی ڈفلی اپنا راگ۔ بحیثیت مجموعی اسلام میں ارکانِ ایمان اور اعمالِ شرعی کے بارے میں دوسرے ادیان، مثلاً عیسائیت کے مقابلے میں کہیں کم اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ وہ حضرات جو تفسیرِ قرآن کا بیڑا اٹھانا چاہتے ہوں، انھیں قرآن کے جہانِ کلام میں داخل ہونے کے لیے بہت سے علوم کی تربیت حاصل کرنا ہوتی ہے۔ مزید برآں اس حصولِ علم کے ساتھ ساتھ انھیں قرآن کی تجسیم، یعنی تلاوتِ متن اور عباداتِ شرعی، کے سانچے میں بھی ڈھلنا ہوتا ہے۔ جو لوگ قرآن کی ہدایت کے مطابق قرآن سے اپنا تعلق پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی قلبِ ماہیت کرنے کی قوت قرآن میں واضح طور پر موجود ہے۔ یہی اسلام ہے یعنی قرآن کے وسیلے سے معلوم ہونے والی منشائے خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا۔ لیکن یہ تسلیم و قبول محض ارادی نہیں ہوتا۔ قرآن لوگوں میں ان کے وجود کی سطح پر بھی

یہ سرافگندگی اور خوئے تسلیم استوار کر دیتا ہے، یوں کہ قرآن کا اساسی پیغام ان کا سامانِ ہستی بن کر جھلکنے لگتا ہے۔ پھر خواہ ان کی تعبیرات کتنی ہی ''نئی اور انوکھی'' کیوں نہ ہوں۔

واضح رہے کہ ہم تعبیراتِ قرآن کا ذکر ایک خاص سیاق وسباق میں کر رہے ہیں یعنی اسلام کے ایمان وعمل کے دائرے کے اندر۔ اسلام سے مخلص نہ ہونے کے باوجود بہت سے مغربی اہلِ علم نے بھی قرآن کے متن کی اپنے طور پر شرح وتعبیر کی ہے۔ ان تصانیف سے غیر مسلموں کو قرآن فہمی میں مدد ملنے کی امید بہت کم ہے۔ وہ قرآن جو مسلمانوں پر کھلتا ہے، اس کی جھلک ان تعبیرات میں نہیں ملتی۔

وہ عربی کتاب جس کو قرآن کہا جاتا ہے، ضخامت میں تقریباً عہد نامۂ جدید کے برابر ہے۔ مطبوعہ مصحف اکثر ۲۰۰ سے ۴۰۰ صفحات کے درمیان ہوتا ہے۔ عبرانی انجیل اور عہد نامۂ جدید کے برعکس، قرآن ایک ہی ہستی کی زبان سے صادر ہوا جس نے فرشتۂ وحی جبرئیل سے سن کر اسے لوگوں کے سامنے پڑھ کر سنایا۔ یہودی اور مسیحی مصاحف بہت سی کتب کا مجموعہ ہیں، ان کے مصنف انسان تھے اور ان کی تعداد بھی بہت تھی۔ ان کتب کے سرچشمۂ وحی سے ماخوذ ہونے پر بھی اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ یہ مان بھی لیجیے کہ انجیل کی مختلف کتابیں الہامی کتب ہیں، تب بھی یہ بات اپنی جگہ رہے گی کہ یہ کتب مختلف لوگوں کو الہام کی گئیں جو نہ تو ایک جگہ کے رہنے والے تھے نہ ایک ہی زمانے میں پیدا ہوئے۔

قرآن چھوٹی بڑی سورتوں کا مجموعہ ہے۔ سورت کے لفظی معنی ہیں ''باڑ، احاطہ، کسی تعمیر کا ایک حصہ۔'' مختصر ترین سورت میں دس الفاظ ہیں اور طویل ترین سورت، جو متنِ قرآن میں دوسرے نمبر پر ہے، ۶۱۰۰ الفاظ پر مشتمل ہے۔ پہلی سورت ''الفاتحہ'' نسبتاً چھوٹی ہے (۲۵ الفاظ)۔ دوسری سورت سے آگے بڑھیے تو سورتوں کی لمبائی تدریجاً کم ہوتی جاتی ہے، البتہ یہ کوئی مقررہ قاعدہ نہیں ہے۔ آخری ساٹھ سورتیں مجموعی طور پر اتنی لمبی ہوں گی جتنی سورہ بقرہ۔

ہر سورت مختصر حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ان میں ہر ایک کو آیت کہا جاتا ہے۔ لمبی آیات میں سے بعض تو چھوٹی سورتوں سے بھی زیادہ طویل ہیں۔ انگریزی میں آیت کو عموماً verse کے لفظ سے ترجمہ میں ظاہر کیا جاتا ہے، تاہم لفظی معنی میں اس کا مطلب ہے ''نشانی یا علامت'' (sign)۔ یہ لفظ نہایت اہم ہے لہٰذا ہم اس پر قدرے تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

قرآن کے مشمولات کو پڑھ کر عبرانی انجیل اور عہد نامۂ جدید کے بعض حصوں کی یاد آتی ہے۔ قرآن میں بھی انھی بہت سی شخصیات کا ذکر ہے اور ان کے بارے میں بیان کردہ قصصِ قرآنی کا مقصود

بھی پڑھنے والوں کے لیے نصیحت وعبرت آموزی ہے۔ ماضی کی عظیم اور مثالی انسانی ہستیوں کو نبی کا نام دیا گیا ہے اور ان میں سے اہم ترین کا نام لے کر ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان ہستیوں میں آدم، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام شامل ہیں۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا نام تو دوسرے تمام حضرات سے زیادہ مرتبہ مذکور ہوا ہے۔ اور ان کے ساتھ اُن کے سب سے بڑے دشمن فرعون کا ذکر بھی عموماً ملتا ہے جسے قرآن میں انسانی شرّ وفساد کے مستقل نمونے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

قرآن تفصیل سے بتاتا ہے کہ نبیوں کے پیروکاروں بالخصوص یہود ونصاریٰ نے کس طرح اپنے انبیا کے پیام و ہدایت کے مطابق زندگی گذاری اور اس ہدایتِ نبوی سے روگردانی بھی کی۔ اللہ کی پسندیدہ زندگی کیسے گذاری جاتی ہے؟ قرآن اس کے بارے میں احکامات دیتا ہے۔ وہ لوگوں کو نماز پڑھنے، روزہ رکھنے اور محتاجوں کی خبر گیری کی تلقین کرتا ہے۔ انسانوں کے باہمی رشتے ناتے قرآن میں بہت تفصیل سے بیان ہوئے ہیں نیز قوانینِ وراثت، نکاح وطلاق کے معاملات جن کو پڑھ کر عبرانی انجیل کے بعض حصے ذہن میں ابھرتے ہیں۔ عہد نامۂ جدید کے لیے البتہ یہ باتیں سرے سے اجنبی ہیں۔ قرآن لوگوں کو تاکید کرتا ہے کہ وہ احکامِ حق کو صرف اور صرف اللہ کے لیے قبول کریں اور ان کی بجا آوری میں دنیاوی اغراض کو مدنظر نہ رکھیں۔ پیغامِ حق کو رد کرنے والوں کے لیے قرآن میں نارِ جہنم کی وعید ہے اور فرمانِ خداوندی کو قبول کرنے والوں کے لیے جنت کی نعمتوں اور فلاح کا وعدہ۔ یہودی اور عیسوی انجیل کے مقابلے میں قرآن اللہ تعالیٰ کا خاص طور پر ذکر کرتا ہے اور بار بار ذکر کرتا ہے۔ موضوع خواہ کچھ بھی ہو، قرآن ہر بات کو لوٹا کر اللہ تعالیٰ کی طرف لے جاتا ہے اور اس غرض سے وہ کلام کے درمیان ایسے فقرے شامل کرتا چلا جاتا ہے جن میں اللہ تعالیٰ کو اس کے کسی ایک نام یا کئی اسمائے الٰہی سے یاد کیا گیا ہو، مثلاً ''**واللہ علیم قدیر**'' ''**وکان اللّٰہ عزیزاً حکیما**''۔

اہل مغرب کے لیے قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس کو جانچنا اور اس کی قدر پہچاننا ایک نہایت ہی دشوار کام ہے اور ترجمے کی وساطت سے تو یہ مشکلات خاص طور پر بڑھ جاتی ہیں، حتیٰ کہ وہ لوگ جنھوں نے سالہا سال عربی زبان کی تحصیل میں صرف کیے ہیں، تاکہ قرآن کو اس کی زبان میں پڑھ سکیں ان کو بھی ہوسکتا ہے کہ بسا اوقات قرآن غیر منطقی، تنظیم سے عاری اور نادرست معلوم ہو۔ بایں ہمہ نہ صرف اسلامی تہذیب اس بات کی وافر شہادت فراہم کرتی ہے، بلکہ عظیم فلسفیوں، متکلمین اور شعرا کی تفاسیر اور شرح وتعبیر بھی اس پر دال ہے کہ دراصل مسئلہ متنِ قرآن کا نہیں، پڑھنے والے کا

ہے۔ یہ البتہ درست ہے کہ آج تک صفحۂ قرطاس پر ثبت ہونے والی کوئی تحریر بلاشبہ ایسی غیر معمولی نوعیت کی نہیں رہی۔ یہ کتاب ایک غیر معمولی کتاب ہے۔ لوگوں کے خیال میں ایک کتاب کو جو کچھ ہونا چاہیے، قرآن اس سے مختلف ہے۔ اسی لیے اس سے ایسے لوگوں کی توقعات پوری نہیں ہوتیں۔

نو آبادیاتی استعماری نظام کے عروج کے زمانے میں، جب سماجی ڈارونیت[۲] نے اہلِ مغرب کی ایک بڑی تعداد کے ذہن میں یہ بات پختہ کر دی تھی کہ مغرب والے اوجِ کمالِ انسانی کے مظہر ہیں، بہت سے اہلِ علم مسلمانوں کو محض اس لیے حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے کہ ان کے خیال میں قرآن ایک قابلِ احترام صحیفہ تھا۔ یہ مغربی لوگ بزعمِ خویش ارتقائے انسانی کی جن بلندیوں پر فائز تھے، وہاں سے انھیں قرآن حکایاتِ کہن اور اوہام وخرافات کا ایک بے سلیقہ ملغوبہ نظر آتا تھا۔

مغرب کی علمی دنیا کا بڑا حصہ اب ثقافتی برتری کا یہ مفروضہ ترک کر چکا ہے اور قرآن پر اس اعتبار سے نگاہ کرتا ہے کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو اپنے جوہر میں یکتا ہے۔ قرآن کے بارے میں پچاس سال پہلے کے مقابلے میں آج مثبت تحریریں کہیں آسانی سے مل جاتی ہیں، تاہم اب بھی ایسی بڑی بڑی رکاوٹیں پائی جاتی ہیں جو غیر مسلموں کے لیے اور ان لوگوں کے لیے جنھیں عربی زبان اور علومِ اسلامی کی پوری مہارت میسر نہیں ہے، قرآن کی قدر شناسی میں آڑے آجاتی ہیں، بلکہ بسا اوقات تو یہ مہارت بھی کتابِ مجید تک رسائی کی ضمانت فراہم کرنے سے قاصر رہتی ہے۔

بہت سے مسلمان، خاص طور پر وہ جن کی مادری زبان عربی ہے، کچھ یوں سمجھتے ہیں گویا قرآن پر ان کا حق ملکیت ہو، تاہم اکثر یوں ہوتا ہے کہ ایک شخص کو قرآن کا خاصا حصہ یاد تو ہوتا ہے، لیکن اس تصورِ کائنات کا اسے سرے سے کوئی شعور نہیں ہوتا جو قرآن کے لفظ لفظ میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ قرآن کا منقلب کر دینے والا اثر قبول کرنے میں کوئی رکاوٹ محسوس کرتا ہو۔ ہاں اس سے یہ ضرور ہوگا کہ وہ قرآن کے معانی کو اس پیرائے میں ظاہر کرنے سے قاصر ہوگا جو اس کی اپنی روایت سے ہم آہنگ ہو۔

قرآنِ مجید کا تصورِ کائنات وہ بنیادی رکاوٹ ہے جو اس کتابِ مجید کے فہم کے راستے میں اہلِ مغرب کے لیے حائل ہو جاتی ہے۔ یہاں تک تو درست ہے کہ قرآن دنیا و مافیہا کے بارے میں جو نقطۂ نظر رکھتا ہے، اُس کا یہودی اور عیسوی تصورِ کائنات دونوں سے ایک قریبی تعلق ہے، مگر دنیائے جدید کے اکثر لوگ یہودی اور عیسوی تصورِ کائنات سے بھی اتنے ہی نابلد ہیں جتنے اسلام کے تناظر

سے۔محض کلیسا، صومعہ اور مسجد میں عبادت کے لیے چلے جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب آپ گردوپیش کی دنیا کو اپنے معاصر لادین لوگوں سے کسی الگ انداز میں دیکھنے لگے ہیں۔ ہماری تہذیبی زندگی میں جو اندازِ فکر غالب ہے، اسے ہم عبادت گاہوں میں نہیں سیکھتے۔اس کی ترویج تعلیمی اداروں اور ذرائعِ ابلاغ کے ذریعے ہوتی ہے۔ہم لاکھ کہا کریں کہ ہماری تعلیم سائنسی، غیر جانبدار اور تعصّبات سے آزاد ہے، مگر یہ حکم لگانا بھی خود ایک حد درجہ جانب داری کی بات ہے۔ ہمارے معاصرین میں سے کتنے ہی مفکر اور سماجی تنقید کے ماہرین ہمیں یہی بتا رہے ہیں۔[۵]

عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ اگر وہ لوگ ترجمۂ قرآن پڑھنے کی کوشش کریں جنھیں اسلام کے تصورِ کائنات سے کوئی علاقہ نہیں ہے تو انھیں اس میں اپنے تعصّبات ہی کی تائید ملتی ہے، خواہ یہ تعصّبات جو بھی رہے ہوں۔قرآن اس کائنات کے بارے میں جو نقطۂ نظر رکھتا ہے، اس تک صحیح معنوں میں رسائی تبھی ممکن ہے جب آپ کو اس فکری پس منظر کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو جو اس کتاب میں نفوذ کیے ہوئے ہے۔اور یہ اندازِ فکر ہمارے لیے سراسر نامانوس ہے، کیونکہ ہمیں اپنی تمدنی زندگی میں اور جدید تعلیم کے تحت جس ڈھب سے سوچنا سکھایا جاتا ہے، وہ کچھ اور ہی ہے۔

کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ سب لوگ جنھیں ہم ''ذہنِ جدید'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں، قرآن میں سے کچھ بھی سمجھنے جاننے کے قابل نہیں ہیں کیونکہ اس زمرے میں تو عملاً سبھی انگریزی بولنے والے اور جدید تعلیم یافتہ مسلمان شامل ہو جاتے ہیں۔ہم یہ بھی نہیں کہہ رہے کہ انھیں قرآن کے موجودہ تراجم پڑھنے کی زحمت نہیں کرنا چاہیے۔اس سلسلے میں پہلی بات یہ مدنظر رہے کہ اگر قرآن کا ترجمہ ہوتا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مترجم نے قرآن کو جدید اسالیبِ فکر کے دائرے میں لانے کا کام سرانجام دینے کی سعی کی ہوگی اور ہوسکتا ہے کہ اسی کارن معانیِ متن کو بری طرح مسخ کر ڈالا ہو۔ بہرکیف! اگر آپ عربی نہیں جانتے اور اسلام سے شناسائی حاصل کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں تو آپ کو یہ کتاب لازماً ترجمے ہی میں پڑھنا ہوگی۔ہم نے اس ضمن میں عموماً یہ بات زیادہ مفید پائی ہے کہ ساری کتاب کو ترتیب وار پڑھنے کی کوشش کرنے کے بجائے آپ کہیں سے بھی اسے کھول کر چند صفحات پڑھ لیں اور پھر آیندہ دوسرے کسی مقام کا مطالعہ شروع کریں۔

قرآن کا تصورِ کائنات اور عربی زبان ایک دوسرے سے قریبی تعلق میں جڑے ہوئے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان آرامی تھی۔آرامی اور عبرانی زبانوں کی طرح عربی بھی سامی زبان

ہے۔ سامی زبانوں کی داخلی منطق غیر سامی یعنی ہندیورپی زبانوں سے بہت مختلف ہے۔ موخرالذکر زبانوں کے زمرے میں انگریزی، لاطینی، سنسکرت اور فارسی شامل ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہر لفظ کا ایک مادہ یا جڑ بنیاد ہوتی ہے جو عام طور پر تین حروف پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس سہ حرفی بنیاد پر تعمیر اٹھاتے ہوئے سینکڑوں لفظوں کی صورت گری کی جاسکتی ہے، خواہ ان میں سے چند سو لفظ ہی عملاً استعمال میں لائے جائیں۔ تصورات کی معنوی جہت پر روشنی ڈالنے کے لیے ہمیں آگے چل کر اکثر عربی الفاظ کے بارے میں بحث کرنا ہوگی۔ اس بحث کے بغیر یہ ممکن ہی نہیں ہوگا کہ ہم معانی کی اس وسعت اور گہرائی کی طرف اشارہ کرسکیں جو ان الفاظ نے اپنے دامن میں سمیٹ رکھی ہے نہ انگریزی میں عربی الفاظ کو ترجمہ کرنے کی مشکلات بیان ہوسکیں گی، نہ عربی زبان کے الفاظ میں پایا جانے والا وہ باہمی ربط ہی کھل کر سامنے آسکے گا جو اصل عربی میں ازخود واضح ہو جاتا ہے۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم

سیدنا محمدؐ کی حیاتِ مبارکہ کا بیان بارہا کیا گیا ہے۔[۶] مغربی قارئین کو سیرت کی جو تفاصیل میسر ہیں وہ سب کی سب کم ہی مسلمانوں کے علم میں ہوں گی۔ وہ قارئین جو مسیحی پس منظر رکھتے ہیں، ان کے لیے ایک نکتہ پیشِ نظر رکھنا مناسب ہوگا۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح کا اناجیل میں جو بیان ملتا ہے، وہ عیسائیت کے لیے ایمانیات کے ایک بڑے حصے کا کردار ادا کرتا ہے جب کہ اسلام میں قرآن کو اولین حیثیت حاصل ہے۔ رسولِ خداؐ کو مسلمانوں کی دینی زندگی میں بے پناہ اہمیت حاصل ہے، لیکن ان کی یہ اہمیت اس تعلق کے حوالے سے ہے جو کلام اللہ اور رسول اللہؐ کے درمیان قائم ہے۔ اس ضمن میں ایف۔ ای۔ پیٹرز نے اپنے مندرجہ ذیل تبصرے میں یہی نکتہ ہمیں یاد دلایا ہے جس کی طرف کئی دوسرے مصنّفین بھی اشارہ کر چکے ہیں:[۷]

> ایک عیسائی کو ''عیسیٰ مسیح کی بشارتوں'' کا مطالعہ کیے بنا چارہ نہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کا کارِ مقدس اسی میں ظاہر ہوا ہے۔ مسلمان اگر ''رسولِ خداؐ کی سیرت'' کا مطالعہ کرتا ہے تو محض ایک نیک عمل کے طور پر۔ وحیِ خداوندی کہیں اور واقع ہے۔

سیدنا محمدؐ ۵۷۰ عیسوی میں عرب کے شہر مکہ کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اہلِ مکہ کا تعلق مختلف عرب قبائل سے تھا جن کے کچھ خانوادے ہنوز بادیہ نشین تھے۔ شہر تجارتی مرکز کی حیثیت سے بھی اہم تھا، مگر اہم تر بات یہ تھی کہ یہاں کعبہ کے نام سے ایک قدیم عبادت گاہ واقع تھی۔ کہا جاتا

تھا کہ اس کی بنیاد سیدنا آدمؑ نے رکھی تھی اور اس کی تعمیر نو سیدنا ابراہیمؑ کے ہاتھوں انجام پائی تھی۔ سیدنا محمدؐ کے زمانے میں کعبہ بتوں کی آماجگاہ بن چکا تھا جہاں عرب قبائل کے خداؤں کے بہت سے بت رکھے ہوئے تھے۔ سال کے چار مہینے ''مقدس مہینے'' قرار دیے گئے تھے۔ ان مہینوں میں قبائل کی باہمی جنگ ممنوع تھی۔

عربوں کے قدیم اندازِ جنگ اور آج کی جنگوں میں کوئی مشابہت نہیں، سوائے اس کے کہ ان جنگوں میں گاہ گاہ کچھ لوگ کام آجاتے تھے۔ ان جنگوں سے اصل غرض یہ تھی کہ ان کے تمدن میں مردانگی کا جوہر باقی رہے اور مال و دولت وقفے وقفے سے ایک سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتی رہے۔ پھر اس طرح ہر قبیلے کے امتیازی خصائص اور موروثی خوبیوں کو بھی جلا ملتی رہتی تھی۔ جنگوں میں بعض اوقات صاحبانِ شمشیر کی بجائے قبیلے کے شاعر مردِ میدان کی حیثیت اختیار کر جاتے تھے۔ جنگ کی داستانوں میں بارہا ایسے قصے بھی دیکھے گئے کہ قبائل کے جنگجو لڑائی کے لیے صف آرا ہوئے اور پھر صرف اس لیے میدان جنگ سے منہ موڑ گئے کہ کسی عظیم شاعر نے ان کی ہجو کر کے انھیں شرمسار کر دیا تھا۔

سیدنا محمدؐ کے والد ان کی ولادت سے قبل فوت ہو چکے تھے۔ چھ سال کی عمر میں والدہ بھی چل بسیں۔ آپؐ کی پرورش دوسرے اعزہ نے کی۔ اہلِ مکہ کی اکثریت کی طرح آپؐ کو بھی کچھ مدت کے لیے ایک بدو قبیلے میں رکھا گیا تا کہ آپ خالص عربی زبان اور عاداتِ عرب اخذ کر سکیں۔ بڑے ہو کر آپؐ اپنے لوگوں میں ایک معزز فرد کے طور پر ابھرے۔ آپؐ کی صداقت و امانت اور شرافت معروف تھی۔ تجارت سے بھی شغف رکھا اور تجارتی قافلوں کے ساتھ شام کے سفر کیے۔ آں حضرتؐ کی عمر پچیس سال کے لگ بھگ تھی کہ اموالِ تجارت کی مالکہ نے آپؐ کو شادی کی تجویز پیش کی۔ حضرت خدیجہؓ نسبتاً زیادہ مالدار تھیں، بیوہ تھیں اور چالیس کے سن میں تھیں۔ آپؐ نے تجویز قبول کی اور آیندہ ۲۵ سال حضرت خدیجہؓ کی وفات تک ان کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کی۔

آنحضرتؐ عرب کے مقامی قبائل کی مذہبی رسوم سے مطمئن نہ تھے۔ آپؐ کی ترجیح قدیم دینِ عرب کے توحید پرستوں کا وہ سلسلہ تھا جس کے ماننے والے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے اور حنیف (جمع: حنفاء) کے نام سے جانے جاتے تھے۔ آپؐ پہاڑوں میں واقع ایک غار میں جا کر بیٹھتے اور تنہائی میں غور فرمایا کرتے تھے۔ اسی غار میں وہ واقعہ پیش آیا جس نے آگے چل کر تاریخ عالم میں دوررس اور بھرپور اثرات ثبت کرنا تھے۔ اس وقت آپؐ کی عمر ۴۰ برس کی تھی۔ وہ عمر جس میں قرآن

کے مطابق انسان اپنے پورے بلوغ اور پختگی کو پہنچتا ہے۔ ”حتی اذا بلغ اشده وبلغ اربعین سنة“[8] (۴۶:۱۵) (یہاں تک کہ جب پہنچا اپنی قوت کو اور پہنچا چالیس برس کو) آپؐ غار حرا میں غور و فکر میں مشغول تھے کہ ایک فرشتہ نمودار ہوا۔ اس فرشتے نے آپؐ کو بتایا کہ اللہ نے آپؐ کو اپنا رسول بنایا ہے۔ قرآن کے پہلے چند کلمات کی وحی بھی وہیں نازل ہوئی۔

فرشتہ لوٹ کر نہ آیا تو آنحضرتؐ کو تشویش ہونے لگی اور کچھ عرصہ اسی پریشانی میں گذرا۔ حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کو سہارا دیا۔ انھیں یقین تھا کہ ان کا شوہر اس قدر راست فکر ہے کہ اس کے ذہن پر اثر ممکن نہیں۔ بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ فرشتۂ وحی کے ظاہر نہ ہونے سے آپؐ کی ایسی حالت ہوئی کہ پہاڑ سے خود کو گرا دینے پر آمادہ ہو گئے۔ آخر کار فرشتہ پھر ظاہر ہوا اور پھر آنحضرتؐ کو پیغام دیا کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ اس کے بعد فرشتہ متواتر پیامِ خداوندی لے کر آتا رہا۔ کسی قدر گھبراہٹ کے بعد آنحضرتؐ نے فرمانِ خداوندی کو قبول کر لیا اور اعلانِ نبوّت کرنا شروع کر دیا۔

آہستہ آہستہ آپؐ کے لائے ہوئے پیغامِ ہدایت کی صداقت لوگوں کے دل میں گھر کرتی گئی۔ آپؐ جو اِن سے کہتے وہ صاف اور سادہ الفاظ میں یوں تھا: خدا نے مجھے اس لیے چنا ہے کہ تم لوگوں کو یوم الحساب کی وعید سناؤں، خدا کا حکم مانو اور اپنے طور طریقے درست کر لو۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انسان خدا ہی کی عبادت کرے کہ عبادت کے لائق وہی ہے، کچھ مراسم کی پابندی کرے اور اخلاقی قیود پر عمل کرے، اپنی انفرادی زندگی میں بھی اور سماجی زندگی میں بھی۔

آج بہت سے لوگوں کے لیے یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ یہ پیغام کیوں کر لوگوں پر اثرانداز ہوا ہو گا۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ سیدنا محمدؐ اس کی ایک دلیل بھی ساتھ پیش کرتے تھے جس کے سامنے ان کے زمانے کے بہت سے لوگ زیر ہو جاتے تھے۔ اور وہ دلیل تھی پیغامِ خداوندی کی زبان یعنی خود قرآنِ مجید جس کی آیات آپؐ کی رحلت تک وقفے وقفے سے نازل ہوتی رہیں۔

ایک ایسے معاشرے میں جہاں شاعری تلوار سے زیادہ کارگر ہو، قرآن کے زبان و بیان کا دبدبہ اور ہیبت یقیناً سننے والوں کو اس کی حقیقت کا قائل کر لیتا ہوگا۔ یاد رہے کہ قرآن کو شاعری نہیں سمجھا جاتا تھا، اگرچہ اس کے بعض حصے ایسے ہیں جن میں بھرپور شعریت ملتی ہے، تاہم اس کو جو بھی سنتا بے ساختہ کہ اٹھتا کہ قرآن کی زبان میں ایک غیر معمولی زور اور تاثیر ہے۔ یہ چیز قرآن کی ان آیات کے بارے میں خاص طور پر درست ہے جو آنحضرتؐ کے زمانۂ نبوّت کے ابتدائی زمانے میں آپؐ پر نازل ہوئیں۔

قرآن آنحضرتؐ کی سب سے بڑی دلیل تھا، کیونکہ یہ کتاب، فی الحقیقت، ایک زندہ معجزہ تھی۔

کچھ بھی کہیے، آنحضرتؐ تھے تو نوعِ انسانی میں سے۔ انھیں سبھی پہلے سے جانتے تھے۔ ان کی شہرت ایک اچھے شریف آدمی کی تھی، لیکن اس وقت تک ان میں کوئی بہت خاص بات نہیں تھی۔ آپؐ مکہ کے عام باشندوں میں سے تھے گو آپؐ کی امانت اور دیانت کی وجہ سے آپؐ کو ''الامین'' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اپنے شہر کے بہت سے لوگوں کی مانند آپؐ بھی عرب قبائل کی خالص عربی بولتے تھے۔ مکہ کے عوام میں سے ایک شخص کی زبان پر اچانک ایک روز ایک ایسا کلام جاری ہو جاتا ہے جس کے حسن، شکوہ بیان اور اثر انگیزی کا ٹھکانا نہ تھا۔ صرف یہی نہیں کہ عربوں نے ایسی زبان کبھی سنی نہ تھی بلکہ اس کا پیغام بھی انھیں کچھ ایسی باتیں یاد دلا رہا تھا جو اِن کے کان میں پڑ چکی تھیں۔ یاد رہے کہ یہ اس معاشرے کی بات ہو رہی ہے جس میں زورِ بیان اور قوت واقتدار کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔

عرب خود کو آلِ اسماعیلؑ قرار دیتے تھے جو اولادِ ابراہیمؑ میں سے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ کو بھی عرب پرانے انبیا میں شمار کرتے تھے، لیکن ان کا پیغام کیا تھا؟ یہ بات شاید چند ہی لوگوں پر واضح رہی ہو۔ علاوہ ازیں ان کے گرد و پیش میں یہودی اور نصرانی بھی آباد تھے۔ ان تینوں گروہوں کے لیے آنحضرتؐ کی کہی ہوئی باتیں نامانوس نہیں تھیں۔ قرآن میں بارہا وہ اعتراضات مذکور ہوئے ہیں جو مقامی لوگوں کی طرف سے اس نئے پیغامِ ربّانی پر کیے جا رہے تھے۔ یہی لوگ تھے جو قرآن کو ''گذرے ہوئے لوگوں کے افسانے'' اور ''پرانے وقتوں کی قصہ کہانیاں'' کا نام دیتے تھے۔ بالفاظِ دیگر اُن کا ردِعمل یہ تھا کہ بھئی ہم نے یہ سب پہلے بھی سن رکھا ہے اور یہ سب کچھ بیکار کی باتیں ہیں:

يَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (٦:٢٥)	کہتے ہیں وہ منکر، یہ کچھ نہیں مگر نقلیں ہیں اگلوں کی۔
لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (٢٧:٦٨)	وعدہ مل چکا ہے اس کا ہم کو اور ہمارے باپ دادوں کو آگے سے اور کچھ نہیں، یہ نقلیں ہیں اگلوں کی۔

اوّلین مسلمانوں کا دل اسلام پر جم گیا تھا تو اس کی تہ میں کئی باتیں تھی۔ آنحضرتؐ کا ان کے درمیان رہتے ہوئے یوں یکا یک بدل جانا، آپؐ کی زبان و بیان کا ناقابلِ یقین شکوہ، فصاحت و بلاغت اور یہ احساس کہ آپؐ کے لائے ہوئے پیغام سے تو ہم ہمیشہ سے آگاہ تھے، بس نہ جانے کیوں اس سے

غافل ہو کر بیٹھ رہے تھے۔ شاید یہ سب باتیں دنیائے جدید میں رہنے والے ہم لوگوں کی بے جواز نفسیات بازی کے مترادف ہیں، اس لیے کہ آج کے انسان کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہے جس سے وہ یہ جان سکے کہ چودہ سو سال پہلے زندگی کرنے والے ان لوگوں کے دل و دماغ پر آخر کیا گذری تھی؟ ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہمیں یہ تک پتا نہیں ہوتا کہ ہمارے برابر کا پڑوسی کیا سوچ رہا ہے؟ سو اس تبدیلی پر بات کرتے ہوئے یہی سب سے بہتر طریقہ ہے کہ اچھے مسلمانوں کی طرح اسے ہدایتِ ربّانی اور اس سے جنم لینے والے ایمانِ انسانی سے منسوب کریں۔ مسلمان اہلِ علم اکثر ایمان کی تعریف انھی الفاظ میں کرتے ہیں کہ ''ایمان ایک نور ہے۔ اللہ جسے چاہتا ہے اس کے دل میں یہ نور ڈال دیتا ہے۔'' بنیادی نکتہ یہی ہے کہ اس راز کو کھولنا ممکن نہیں۔

مکہ کے زور آور لوگوں نے شروع میں تو یہ جانا کہ آنحضرتؐ کے دماغ میں خلل آ گیا ہے، لیکن پھر جب ان کے اپنے دوست اور عزیز رشتے دار بھی اس چھوٹے سے گروہِ مسلمین میں شامل ہونے لگے تو ان کو فکر ہوئی اور کچھ وقت گذرا تو وہ ان کو اپنے لیے خطرہ محسوس کرنے لگے۔ پھر ایسے کسی ستم سے ان کا ہاتھ نہ رکا جس سے وہ اسلام لانے والوں کی زندگی میں دکھ گھول سکتے تھے۔ آنحضرتؐ اور آپؐ کے اصحاب کو آزمائشوں اور تکالیف سے گذرنا پڑا۔

۶۲۲ء میں حالات میں ایک بڑی تبدیلی آئی۔ مکہ کے شمال میں تقریباً دو سو میل کی مسافت پر واقع یثرب کے شہر سے ایک وفد آنحضرتؐ کے پاس آیا۔ اپنے باہمی جنگ و جدال کے خاتمے کے لیے انھیں ایک صلح کروانے والے کی تلاش تھی اور آنحضرتؐ کی فراست اور دانائی کے بارے میں انھیں اچھی خبریں سننے کو ملی تھیں۔ یہ لوگ آپؐ کی نبوّت کو قبول کرنے پر تیار تھے، اگر آپؐ ان کے شہر میں بطور حاکم کے تشریف لے جائیں۔ اسی اثنا میں مکہ کے رئیس اس فیصلے پر پہنچ چکے تھے کہ اب محمدؐ کی تعلیمات چونکہ ان کے لگے بندھے نظام کے لیے روز افزوں خطرہ بن چکی ہیں، لہٰذا ان کو قتل کر دیا جائے۔ ان کی سازش ابھی عمل میں نہیں آئی تھی کہ چند گھنٹے قبل ہی آپؐ خاموشی سے حضرت ابوبکرؓ کو ہمراہ لے کر شہر سے نکل آئے۔ حضرت ابوبکرؓ آپؐ کے قریبی صحابی تھے اور آگے چل کر انھی کو آنحضرتؐ کی وفات کے بعد آپؐ کے خلیفہ کی حیثیت سے آپؐ کا سیاسی منصب بھی سنبھالنا تھا۔ تعاقب سے محفوظ رہنے کے لیے دونوں حضرات نے ایک لمبا راستہ اختیار کیا اور دس دن میں یثرب پہنچے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یثرب ''مدینة النبی'' کہلانے لگا، ''دیارِ نبی'' یا صرف ''المدینہ'' یعنی ''وہ خاص شہر''۔

آپؐ کا مدینہ منتقل ہونا ہجرت کہلایا۔ یہ آپؐ کی زندگی کا اہم موڑ تھا۔ اس دن سے لے کر چند معمولی واقعات کے علاوہ اسلام ترقی کرتا رہا۔ اسلام اب مستحکم ہو چکا تھا۔ ایک نئی تہذیب جنم لے چکی تھی، اسی لیے ہجرت کو اسلامی تقویم کا پہلا سال شمار کیا جاتا ہے۔ ہم اپنی تحریر میں دونوں تاریخیں ہجری اور عیسوی درج کریں گے۔ سو۱۰/۶۳۲ء میں آپؐ کا سانحۂ رحلت پیش آیا، قسطنطنیہ (جس کا نام جلد ہی استنبول ہو گیا) ۸۵۷/۱۴۵۳ء میں ترکوں کے قبضے میں آیا، نپولین کا مصر پر حملہ جس سے شمالی افریقہ میں نوآبادیاتی دور کا آغاز ہوا، ۱۲۱۳/۱۷۹۸ء میں عمل میں آیا۔

مدینہ میں آپؐ کے دس سال اسلام کے استحکام کا زمانہ تھا۔ آپؐ کی زندگی کے آخری دور میں مکہ بغیر قطرۂ خون گرائے مسلمانوں کے سامنے سرنگوں ہو گیا۔ ''شاعری'' نے ایک اور جنگ جیت لی تھی اور سارا جزیرہ نمائے عرب حلقۂ اسلام میں داخل ہو گیا۔

مدنی دور میں اسلام کو جو استحکام حاصل ہوا تو اس سے ایک تبدیلی یہ بھی آئی کہ اب قرآن کی جو آیات نازل ہو رہی تھیں، ان میں زور ان عملی اور ظاہری احکامات پر تھا جو حکمتِ خداوندی کے مطابق زندگی گذارنے کے لیے ضروری تھے۔ انجامِ بد کی وعید اور سعادتِ ابدی کا وعدہ ان آیات کا اوّلین موضوع نہ تھا۔ آنحضرتؐ سب مسلمانوں کے نبی و رسول بھی تھے اور سلطان بھی، قاضی بھی تھے اور ہدایتِ روحانی کا مرکز بھی۔ سو آپؐ کے پاس وحی آتی اور آپ لوگوں تک پہنچاتے، سماجی اور سیاسی معاملات میں احکامات صادر کرتے، جھگڑے تنازعہ کا فیصلہ کرتے، قانونِ خداوندی سے سرکشی کرنے والوں کے لیے سزا یا درگذر کا اعلان کرتے اور لوگوں کی رہنمائی فرماتے کہ قربِ خداوندی کے حصول کے لیے ہر شخص کو ذاتی طور پر کیا کرنا چاہیے۔

مختصر یہ کہ مدینے کے مسلمان اللہ کے احکامات کے مطابق زندگی گذارتے تھے۔ ان احکامات کی شرح و تفصیل آنحضرتؐ فرماتے تھے۔ بعد کے زمانوں میں اس دور کو اسلام کا عہدِ زریں کہہ کر یاد کیا جانے لگا۔ رسولِ خداؐ تشریف رکھتے تھے، سو الحق تک رسائی آسان تھی۔ آرا کا اختلاف وجود نہ رکھتا تھا کہ آنحضرتؐ خود قرآن کے معانی واضح کر دیتے تھے۔ ایک طرف اگر قرآن کا متن لکھا جاتا تھا، اس کی آیات یاد کی جاتی تھیں تو دوسری طرف لوگ آنحضرتؐ کی باتیں اور آپ کے طریقے بھی محفوظ کرتے تھے۔ آپؐ کا کہا ہوا اور آپؐ کا کیا ہوا (نیز آپ کی اجازت سے کیا ہوا) عمل بعد میں ''حدیث'' کے عنوان سے معروف ہوا۔ اقوال و افعال کے اس تمام مجموعے کا ہم احادیث کے نام سے حوالہ دیں

گے اوران میں الگ الگ قول یا روایت کوحدیث کہیں گے۔آنحضرتؐ کے اقوال جواحادیث میں نقل ہوئے اور آیاتِ قرآنی، دونوں ہی ابتدا میں آپؐ کی زبان پر جاری ہوئے تھے، تاہم آپؐ ہی نے ہمیشہ کلامِ خداوندی اور گفتۂ رسول کے درمیان احتیاط سے امتیاز قائم رکھا۔آج تک تمام مسلمان اس فرق کوملحوظ رکھے ہوئے ہیں کہ اس فرقِ مراتب کی اہمیت کے بارے میں جو کچھ بھی کہیے، کم ہوگا۔

کلامِ خداوندی ازلی اور غیر مخلوق ہے، جب کہ رسولِ خداؐ کا کہا ہوا اگر چہ بلاشبہ خدا کا الہام کردہ ہے، مگر اسے فرمانِ ایزدی سے بہرصورت الگ رکھنا چاہیے۔قرآن کی برتری اور مرکزی حیثیت مسلم ہے۔مسلمان جب قرآن کے بارے میں بات کرتے ہیں یا لکھتے ہیں تو یوں کہتے ہیں کہ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا''، لیکن جب اشارہ حدیث کی طرف ہوتو یوں کہا جاتا ہے کہ''اللہ کے رسولؐ نے فرمایا۔''
احادیث کی ایک خاص قسم وہ ہے جس میں آنحضرتؐ نے اللہ تعالیٰ کا فرمان بیان کیا ہے۔ان سے پہلے یہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں''حضور نے فرمایا کہ اللہ کا فرمان یہ ہے---- ''اس زمرۂ احادیث کو اکثر حدیثِ قدسی کہا جاتا ہے۔یہ احادیث قرآن سے کاملاً الگ حیثیت رکھتی ہیں، کیونکہ یہ اللہ کا کلامِ ازلی نہیں، بلکہ رسولِ خداؐ کے الفاظ ہیں، تاہم ان احادیث کو ایک خاص تعظیم دی جاتی ہے جیسا کہ ''حدیثِ قدسی'' کے الفاظ سے ظاہر ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرتؐ کو اللہ کے اس کلام کا علم الہامی طور پر حاصل تھا۔[9]

مدینہ میں اسلام ایک طرزِ زیست تھا جس میں انسانوں کی دنیا کا کوئی گوشہ احکامِ الٰہیہ سے باہر نہیں تھا۔بعض معاملات کو اگر چہ مباحات میں شمار کیا جاتا تھا اوران پر امر و نہی کا اطلاق نہیں ہوتا تھا، تاہم اس کا فیصلہ بھی اللہ اوراس کے رسول کے وسیلے سے ہوتا تھا۔بعد کے زمانوں میں یہ خیال کبھی مسلمانوں کے شعور سے جدا نہیں ہوا کہ زندگی کی ہر چیز کو دین کی بتائی ہوئی ہدایات کے تحت ہونا چاہیے۔اکثر ادوار ایسے تھے جن میں حکومتیں اپنی دنیاوی اغراض کی غلام بنی رہتی تھیں۔مسلمان اسے دنیا کی قباحتوں میں سے ایک کے طور قبول تو کر لیتے تھے، اس پر راضی کبھی نہیں ہوئے۔ہمارے زمانے میں اسلامی ممالک کی بہت سی سیاسی تحریکوں نے زمانوں پر پھیلے ہوئے اسی احساس کو اپنے حق میں استعمال کرنے کی کوشش کی کہ حکومت کو اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق چلانا چاہیے۔اسلامی حکومتوں کے کرتا دھرتا حضرات اسلامی اقدار کو سچ مچ نافذ کرنا چاہتے ہیں یا نہیں اور وہ اس کے نفاذ میں کامیاب ہوئے یا نہیں، یہ ایک جداگانہ معاملہ ہے۔

آنحضرتؐ کی وفات کے بعد اسلام کو داخلی کشاکش اور نشو ونما کے کتنے ہی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ ان میں سے سب سے نمایاں وہ اختلاف تھا جو آپؐ کی خلافت کے معاملے میں مسلمانوں کی اکثریت کو چندلوگوں کی طرف سے پیش آیا۔ جمعیتِ اسلام اس مسئلے پر دولخت ہوئی۔ ایک گروہ سنی اور دوسرا شیعی کہلایا۔

آنحضرتؐ کی رحلت کے وقت حضرت علیؓ اور ان کی اہلیہ، دخترِ رسول سیدہ فاطمہؓ، سے تعلق رکھنے والا ایک گروہ اس بات کا مدعی ہوا کہ آپؐ نے اپنی وفات کے بعد حضرت علیؓ کو امت کا امام بنانے کے لیے چن رکھا تھا۔ مسلمانوں کی اکثریت کی نگاہ میں اس دعویٰ کی کوئی حیثیت نہ تھی، سو ان کے سب بڑے یکجا ہوئے اور انھوں نے مل کر حضرت ابوبکرؓ کو جانشینِ رسولؐ چن لیا۔ ان کی ذمہ داری یہ ٹھہری کہ وہ مسلمانوں کے امیر ہوں گے اور خدا کے قانون کے مطابق ان کے معاملات کا فیصلہ کیا کریں گے۔ حضرت علیؓ کے حامی گروہ کی طرف سے شروع میں حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کو جائز تسلیم کرنے میں پس و پیش کیا گیا، مگر آخر کار جب حضرت علیؓ نے خود حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کر لی تو شیعانِ علیؓ۔[۱] نے بھی ان کی پیروی میں اسے قبول کر لیا، تاہم حضرت علیؓ نے اپنا یہ مطالبہ ترک نہیں کیا۔ شیعہ حضرات کے نقطۂ نظر کے مطابق خلافت کی صحیح ترتیب اس روز قائم ہوئی جب امتِ مسلمہ نے حضرت علیؓ کو ۳۵ھ/۶۵۶ء میں آنحضورؐ کا چوتھا خلیفہ منتخب کیا، لیکن پانچ ہی سال بعد ۴۰ھ/۶۶۱ء میں حضرت علیؓ کو سیاسی مخالفین نے شہید کر دیا اور اس کے بعد بڑی بڑی موروثی خلافتوں کا زمانہ شروع ہو گیا، پہلے بنوامیہ کی خلافت اور بعد ازاں خلافتِ عباسیہ۔ حضرت علیؓ کو شیعہ حضرات امت کا پہلا جائز امام قرار دیتے ہیں، جب کہ سنّی حضرات ان کو چوتھا خلیفۂ راشد سمجھتے ہیں۔ ان کے بعد اسلامی دنیا پر جو سلطنتیں حکمرانی کرتی رہیں، ان میں سیاست غلبہ حاصل کرتی گئی۔ اسلام کی تعلیمات حکمرانِ وقت کو سندِ جواز عطا کرنے کی حد تک تو ضرور کارفرما تھیں، مگر حکومت کے طور طریقوں کی اسلام کے مطلوبہ آدرش سے مطابقت رکھنا ایک لازمی امر نہ رہا۔

آنحضرتؐ کی وفات کے سو برس کے اندر اندر مسلمان مہذب دنیا کے بڑے حصے کے حکمران بن گئے۔ یہ علاقہ جنوبی سپین سے لے کر ہندوستان تک پھیلا ہوا تھا۔ سیاسی تسلط کے معنی یہ نہیں تھے کہ تمام محکوم اقوام دائرہ اسلام میں داخل ہو گئیں، ہرگز نہیں۔ قرآن کے بیان کردہ اُصول **"لا اکراہ فی الدین"**(۲:۲۵۶) (دین کے معاملے میں زبردستی نہیں) کا مطلب ہی یہ تھا کہ مقامی آبادی کو کسی طرح بھی دباؤ کے تحت زبردستی نیا دین اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ جزیرہ نمائے عرب سے

باہر اکثر لوگ یہودی، نصرانی یا زرتشتی تھے۔ انھیں اہلِ کتاب کی حیثیت حاصل تھی، یعنی ان پر بھی وحی کے ذریعے آسمانی کتابیں نازل ہوئی تھیں اور انھیں اپنے مذہبی معاملات اور مذہبی اداروں کو قائم رکھنے کی آزادی حاصل تھی۔ مسلم حکمران طبقے نے اپنی رعایا کے لوگوں کے قبولِ اسلام کی حوصلہ افزائی بھی کچھ خاص نہیں کی کہ اس طرح ان کی وہ مراعات کم ہو جاتیں جو بحیثیت مسلمان ان کو حاصل تھیں۔

تین چار صدیوں میں اسلام سب سے غالب سیاسی قوت بن چکا تھا۔ یہی نہیں بلکہ سپین اور شمالی افریقہ سے لے کر برصغیر ہندوستان تک پھیلے ہوئے وسیع علاقے کا سب سے مقبول اور غالب دین بھی اسلام تھا، تاہم یہ ایک الگ داستان ہے۔ اسے پڑھنا ہو تو تاریخِ اسلام پر لکھی جانے والی بہت سی کتب میں سے کوئی بھی اُٹھا کر دیکھ لیجیے۔

حدیثِ جبرئیل

وہ عقائد، اعمال اور مذہبی ادارے جن کی وجہ سے اسلام بڑے ادیان میں شمار ہوتا ہے، ان کی اگر شرح و وضاحت کرنا مطلوب ہو تو اس کے لیے ایسا نمونہ منتخب کرنا چاہیے جو جدید علمی دنیا کے لیے بھی قابلِ فہم ہو اور دوسری طرف اس کی جڑیں اسلام کے روایتی علوم میں پیوست ہوں۔ بہت سال پہلے جب ہم نے اسلام پر تعارفی کورس پڑھانا شروع کیا تو اس غرض سے ایک مشہور اور مستند حدیث کا انتخاب کیا جو مسلمان مفکرین کی کلاسیکی تصانیف میں انھی مباحث کی توضیح کے لیے بکثرت استعمال ہوئی ہے۔[11] عام طور پر ہم اپنے طالب علموں کو یہ حدیث یاد کروا دیتے تھے۔ روایتی اسلامی طرزِ تدریس میں بھی یونہی کیا جاتا تھا۔ اگر انھیں حدیث کی عبارت زبانی یاد نہ ہو سکے تو بھی کورس کے اختتام تک ان کے لیے اس حدیث کو فراموش کرنا آسان نہ رہتا تھا کہ اس ایک حدیث میں وہ سب کچھ ایک ایجاز کے ساتھ بند تھا جو انھوں نے سمسٹر کے دوران پڑھا تھا۔ یہی نہیں اس حدیث میں ان تمام مباحث کا خاکہ بھی موجود ہے جو ہماری اس کتاب میں شامل ہیں۔

حدیث کا متن درج ذیل ہے:

حدیثِ جبرئیل

حَدَّثَنِی أَبِی عُمَرُبْنُ الْخَطَّابِ قَالَ: بَیْنَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ ذَاتَ یَوْمٍ،إِذْ طَلَعَ عَلَیْنَا رَجُلٌ شَدِیدُ بَیَاضِ الثِّیَابِ،شَدِیدُ سَوَادِ الشَّعَرِ،لَا یُرَی عَلَیْهِ أَثَرُ السَّفَرِ، وَلَا یَعْرِفُهُ مِنَّا أَحَدٌ، حَتّٰی جَلَسَ إِلَی النَّبِیِّ ﷺ فَأَسْنَدَ رُکْبَتَیْهِ إِلَی رُکْبَتَیْهِ، وَوَضَعَ کَفَّیْهِ عَلَی فَخِذَیْهِ، وَقَالَ: یَا

مُحَمَّدُ! أَخۡبِرۡنِی عَنِ الۡإِسۡلَامِ؟ فَقَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: ((الۡإِسۡلَامُ أَنۡ تَشۡهَدَ أَن لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدًا رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ، وَتُقِيۡمَ الصَّلَاةَ، وَتُؤۡتِیَ الزَّكَاةَ، وَتَصُومَ رَمَضَانَ، وَتَحُجَّ الۡبَيۡتَ إِنِ اسۡتَطَعۡتَ إِلَيۡهِ سَبِيۡلًا)) قَالَ صَدَقۡتَ۔ قَالَ: فَعَجِبۡنَا لَهٗ، يَسۡأَلُهٗ وَيُصَدِّقُهٗ، قَالَ: فَأَخۡبِرۡنِی عَنِ الۡإِيۡمَانِ؟ قَالَ : ((أَنۡ تُؤۡمِنَ بَاللّٰه، وَمَلَائِكَتِهٖ، وَكُتُبِهٖ، وَرُسُلِهٖ، وَالۡيَوۡمِ الۡآخِرِ، وَتُؤۡمِنَ بِالۡقَدَرِخَيۡرِهٖ وَشَرِّهٖ)) قَالَ صَدَقۡتَ۔ قَالَ: فَأَخۡبِرۡنِیۡ عَنِ الۡإِحۡسَانِ؟ قَالَ: ((أَنۡ تَعۡبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنۡ لَمۡ تَكُنۡ تَرَاهُ، فَإِنَّهٗ يَرَاكَ)) قَالَ : فَأَخۡبِرۡنِی عَنِ السَّاعَةِ؟ قَالَ: ((مَاالۡمَسۡئُوۡلُ عَنۡهَا بِأَعۡلَمَ مِنَ السَّائِلِ)) قَالَ: فَأَخۡبِرۡنِی عَنۡ أَمَارَاتِهَا؟ قَالَ: ((أَنۡ تَلِدَ الۡأَمَةُ رَبَّتَهَا، وَأَنۡ تَرَى الۡحُفَاةَ الۡعُرَاةَ، الۡعَالَةَ، رِعاءَ الشَّاءِ، يَتَطَاوَلُونَ فِیۡ الۡبُنۡيَانِ)) قَالَ ثُمَّ انطَلَقَ، فَلَبِثۡتُ مَلِيًّا، ثُمَّ قَالَ لِی: ((يَا عُمَرُ! أَتَدۡرِی مَنِ السَّائِلُ؟)) قُلۡتُ: اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ أَعۡلَمُ قَالَ: ((فَإِنَّهٗ جِبۡرَءِيلُ، أَتَاكُمۡ يُعَلِّمُكُمۡ دِيۡنَكُمۡ))۔[12]

حضرت عمر بن الخطابؓ سے روایت ہے کہ ایک دن ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ ایک شخص ہمارے سامنے سے نمودار ہوا۔ اس کا لباس نہایت سفید تھا اور بال انتہائی سیاہ۔ اس پر سفر کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا تھا، اور ہم میں سے کوئی اسے پہچانتا بھی نہ تھا۔ (وہ چلتا ہوا آیا) یہاں تک کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھٹنوں سے گھٹنے ملا کر بیٹھ گیا اور اپنے ہاتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زانو پر رکھ دیے اور کہا: ”اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! مجھے اسلام کے بارے میں بتائیں۔“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اسلام یہ ہے کہ تم گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، اور یہ کہ نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو اور اگر وہاں جانے کی استطاعت ہو تو حج بیت اللہ کرو۔“

وہ بولا: ”آپؐ نے سچ کہا۔“ ہمیں یہ بات عجیب لگی کہ یہ شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرتا ہے اور پھر تصدیق بھی کرتا ہے کہ آپؐ نے سچ کہا!

(اس کے بعد) اس نے کہا: ”اب مجھے بتائیے کہ ایمان کیا ہے؟“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ایمان یہ ہے کہ تم ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر اور یوم آخر پر، اور یہ کہ تم یقین رکھو تقدیر پر اور اس کے خیر و شر پر۔“ ”سچ کہا آپ نے، اس نے کہا اور پھر استفسار کیا: ”اب مجھے بتائیے کہ احسان کیا ہے؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”احسان یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگرچہ تم اسے نہیں دیکھتے لیکن وہ تو تمھیں دیکھ ہی رہا ہے۔“

پھر اس شخص نے پوچھا: ''مجھے قیامت کے بارے میں بتائیے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس سے پوچھا جا رہا ہے، وہ خود پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔''

اس نے کہا: ''مجھے اس کی نشانیاں بتا دیجیے!'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کنیز اپنی مالکہ کو جنم دے گی اور تم دیکھو گے کہ جن کے پاؤں میں جوتا ہے نہ تن پر کپڑا، بھوکے ننگے اور بھیڑ بکریاں چرانے والے عمارتیں کھڑی کرنے کی دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کریں گے۔''

حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد وہ شخص رخصت ہو گیا۔ میں خاصی دیر تک منتظر رہا، آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: ''اے عمر! تمھیں معلوم ہے کہ وہ سوال کرنے والا کون تھا؟'' میں نے عرض کیا: ''اللہ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ جبرئیل تھے۔ تم لوگوں کو تمھارا دین سکھانے آئے تھے۔''

حدیثِ جبرئیل کے معانی کی وضاحت تو ہم اس کتاب کے آخر تک کرتے رہیں گے۔ سرِدست اس کے ضمن میں کچھ معلومات نذرِ قارئین کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس حدیث کے اصل مخاطبین کے لیے جو باتیں سامنے کی چیز تھیں، وہ صدیوں اور میلوں کی مسافت پر واقع آج کے قاری کے لیے مبہم بن گئی ہیں۔

ذرا صورتِ حال کا تصور کرنے کی کوشش کیجیے۔ روئے ارض پر اس وقت رسولِ خداؐ سے بڑی انسانی ہستی اور کوئی موجود نہیں تھی۔ یہ صرف صحابہ ہی کا خیال نہیں تھا بلکہ تاریخ بھی اس امر کی شاہد ہے۔ آپؐ اپنے صحابہ کے جلو میں نخلستان مدینہ کے کنارے تشریف فرما ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے آپؐ کا کہا اللہ کا فرمان ہے۔ ایسے میں اچانک ایک شخص نمودار ہوتا ہے جو سب کے لیے اجنبی ہے۔

مدینہ اس زمانے میں تھوڑی سی آبادی کا ایک قصبہ تھا اور صحرا کے وسط میں واقع تھا۔ آبادی چند سو یا چند ہزار نفوس پر مشتمل رہی ہو گی۔ ہر آدمی دوسرے آدمی سے شناسائی رکھتا تھا۔ آبادی مختصر ہو اور سفر دشوار تو پھر مسافر کی آمد ایک واقعہ ہوتی ہے۔ چند گھنٹوں میں ہر شخص کو نو وارد کی خبر ہو جاتی ہے۔ ذاتی تعلقات کا تانا بانا جو خاندانوں، قبیلوں اور دیگر رشتوں پر استوار تھا اس بات کو یقینی بنا دیتا تھا کہ ہر خبر فی الفور سب لوگوں میں پھیل جائے گی۔ آج کی دنیا میں شاید ٹی وی پر شام کی خبریں بھی اتنی خوبی سے یہ کام انجام نہیں دے سکتیں۔ اب دیکھیے کہ ایسے میں ایک شخص اچانک ظاہر ہوتا ہے، اسے کوئی نہیں جانتا، شہر میں کئی روز سے کسی مسافر کی آمد نہیں ہوئی۔ فلاں صاحب کے چچا البتہ آئے تھے اور حاضرین میں سے بہت سے لوگ ان سے مل چکے ہیں۔

صرف اتنا ہی نہیں کہ صحابہ اس نو وارد کو پہچاننے سے قاصر رہے، آنے والے پر کہیں سے سفر کے بھی کوئی آثار نہیں تھے اور یہ مزید اچنبھے کی بات ہے۔ اگر وہ شخص سب کے لیے اجنبی تھا تو پھر امکان یہی تھا کہ وہ تازہ واردانِ شہر میں سے ہوگا اور صحرا میں دنوں کی مسافت طے کرنے کے بعد کوئی بھی اتنی جلدی تازہ دم ہو کر نہیں آ سکتا، خواہ اس نے اونٹ پر اپنا سفر راتوں کو چل کر طے کیا ہو۔ (آپ کو چھ گھنٹے موٹر کار میں بیٹھنا پڑے تو اکتا کر شکایت کرنے لگتے ہیں۔ ذرا سوچیے کہ گرد و گرما میں جھلستے ہوئے چھ دن کا سفر کیسا ہوتا ہوگا جہاں اثنائے سفر میں کافی یا سوڈا پینے کے لیے کوئی مسافر نواز خنک ریستوران بھی راہ میں نہ پڑتا ہو)

ادھر وہ شخص مجلس میں داخل ہوا، ادھر سب لوگ سراپا توجہ بن گئے۔ یہ شخص کون ہو سکتا ہے؟ ہمیں اس کی آمد کا کیوں کر علم نہ ہوا؟ دوسری عجیب بات: یہ شخص رسولِ خداؐ سے بے تکلف بھی تھا۔ مجلس میں آ کر وہ سیدھا آپؐ کے سامنے گیا اور دو زانو ہو کر مقابل بیٹھ گیا۔ اس کے گھٹنے آپؐ کے گھٹنوں کو چھو رہے تھے۔ یاد رہے کہ آنحضرتؐ بھی دو زانو بیٹھے تھے، آج کے جدید مغربی لوگوں کی طرح عبادت کے لیے نہیں، بلکہ اس لیے کہ مشرق کے باسیوں میں بیٹھنے کا یہی قرینہ سادہ ترین اور آداب کے مطابق جانا جاتا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ گھروں میں بھی کرسیوں کا کوئی گذر نہیں تھا۔ لوگ باگ فرش پر نشست رکھتے تھے اور آج بھی دنیا کے بیشتر علاقوں میں ایسا ہی کیا جاتا ہے۔ ان علاقوں میں دنیا کے امیر ترین اور مہذب ترین خطے مثلاً جاپان شامل ہیں۔ دنیائے قدیم کے بیشتر علاقوں میں کرسی پر بیٹھنا حکمرانوں کا حق سمجھا جاتا تھا۔

آپ کسی دوسرے شخص کے پاس جا کر اس کے گھٹنے سے گھٹنا بھڑا کر تبھی بیٹھ سکتے ہیں کہ وہ آپ کا بھائی یا بہت قریبی دوست ہو۔ اگر ایسا نہ ہو اور صاحبِ مجلس کوئی دوسرا ہو تو قاعدے کی بات یہی ہوگی کہ اسے ادب سے سلام کیا جائے اور مناسب فاصلے پر بیٹھا جائے، مگر وہ اجنبی مردِ صحرا تو آنحضرتؐ سے یقیناً گہری شناسائی رکھتا تھا۔ جبھی تو اس نے آپؐ کے سامنے بیٹھ کر اپنے دونوں ہاتھ آپؐ کے زانو پر رکھ دیے۔ اگر مہمان اجنبی ہوتا تو یہ حرکت بڑی جسارت کی بات سمجھی جاتی۔ یہی نہیں، آنے والا شخص آپؐ کو نام لے کر مخاطب کر رہا تھا، جب کہ مدینے کے لوگ آپؐ کو آپؐ کے لقب یعنی ''رسول اللہ'' کے الفاظ سے مخاطب کرتے تھے۔ گفتگو بھی اس ہستی نے کسی تمہید کے بغیر اس طرح شروع کر دی گویا وہ اہلِ مجلس کی گفت و شنید میں پہلے سے شامل رہے ہوں۔

آنحضرتؐ نے ان کے پہلے سوال کا جواب دیا تو وہ صاحب بول اٹھے: ''آپؐ نے درست کہا۔'' حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ ''ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ شخص خود ہی سوال بھی کرتا ہے اور پھر خود ہی جواب کی تصدیق بھی کر رہا ہے۔'' حضرت عمرؓ کا یہ قول اس وقت کی کیفیت کو بہرحال پوری طرح بیان نہیں کر رہا۔ امکان اس بات کا ہے کہ صحابہ دنگ رہ گئے ہوں۔ آخر یہ کیا بے تمیزی ہے؟ اللہ کے بھیجے ہوئے رسول کے سامنے آ کر سوالات اٹھانا اور پھر اسے داد دینا گویا خدا کا نبی نہ ہوا، طفلِ مکتب ہوا! یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں، لیکن اس مرحلے پر صحابہ کو آپؐ کو دیکھ کر معاملے کو سمجھنا تھا۔ آپؐ اس سے اس طرح گفتگو فرما رہے تھے، گویا یہ سب کچھ بالکل روزمرّہ اور معمول کی بات ہو۔ اصحاب رسول آپؐ کی روش کا اتباع کرنے کے سوا اور کیا کر سکتے تھے؟

وہ صاحب مجلس سے رخصت ہو چکے تو آپؐ نے چندے توقف فرمایا کہ آپؐ کے صحابہ اس عجیب وغریب واقعہ پر کچھ غور کر سکیں۔ پھر آپؐ نے ان سے بیان کیا کہ ان کے سامنے کیا پیش آیا تھا۔ اسے وہ آسانی سے بھول نہ سکتے تھے اور ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ رات ڈھلے تک سارا شہرِ مدینہ حضرت جبرئیل کی آمد کا واقعہ جان چکا ہوگا۔ اس مہمانِ عزیز کو بھول بھی کون سکتا تھا کہ آنحضرتؐ نے لوگوں کے سامنے ان کے دین کو خلاصہ کر کے پیش کر دیا تھا۔ انھیں جب بھی اساسیاتِ دین کا علم حاصل کرنا ہوگا، وہ صرف یہ کریں گے کہ اس روز کے انوکھے واقعات کو یاد کر لیں۔

دین

حدیثِ جبرئیل سے ہمارے سامنے ایک تصویر کھنچ جاتی ہے جس سے ہم جان سکتے ہیں کہ سیدنا محمدؐ کے پیروکار جس دین پر عمل کرتے ہیں، وہ کیا ہے۔ پہلے تین سوالات اور ان کا جواب ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اسلام کی نظر میں دین کے تین مرکزی عناصر ہیں۔ ہم ان عناصر کی طرف دین کی تین جہات کہہ کر اشارہ کریں گے۔ چوتھا سوال ایک اور مبحث کو جنم دیتا ہے۔ اس پر نظر کرنا بھی ضروری ہے۔ سو ہم اس کے بارے میں بھی کچھ عرض کریں گے، تاہم اس سے قبل ہم یہ چاہتے ہیں کہ اسلام کو ایک سہ جہاتی حقیقت کے طور پر وضاحت سے آپ کے سامنے لے آئیں۔ چوتھے سوال سے پیدا ہونے والے مبحث کو ہم سردست الگ رکھے دیتے ہیں۔

اسلام کی جہتِ اوّل تسلیم واطاعت ہے جو ایک سلسلۂ اعمال میں ظاہر ہوتی ہے۔ عمل کے اس سلسلے میں کلمۂ شہادت ادا کرنا، نماز پڑھنا اور روزہ رکھنا سب شامل ہیں۔ تسلیم واطاعت کے لیے بھی

عربی کا وہی لفظ ''اسلام'' استعمال ہوتا ہے جو اس دین کے عنوان کے طور پر برتا گیا ہے۔ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ ''اسلام'' کے لفظ کے اور بھی معنی ہیں۔ موجودہ سیاق وسباق میں ''اسلام'' کا لفظ ان کاموں کے لیے استعمال ہوا ہے جو ایک مسلمان کو لازماً انجام دینا درکار ہے۔

دوسری جہت ''ایمان'' ہے۔ رسولِ خداؐ اپنے سامعین کو یہ نہیں بتا رہے ہیں کہ خود ایمان کیا ہے۔ اس کی وجہ بلاشبہ یہی ہوگی کہ انھیں معلوم ہے کہ ان کے مخاطب یہ جانتے ہیں کہ ایمان کیا ہے۔ انھیں بتایا یہ جا رہا ہے کہ ارکانِ ایمان کیا ہوں گے۔ انھیں کن چیزوں پر ایمان رکھنا چاہیے۔ جواب ہے اللہ پر ایمان، فرشتوں، کتابوں، صحیفوں، انبیا اور رسولوں پر ایمان اور دیگر باتیں۔

تیسری جہت کا تعلق خوبیٔ عمل یا احسان سے ہے، یعنی عمل کو حسین بنانا یا عمل میں زیبائی پیدا کرنا۔ یہاں آنحضرتؐ کے مدِّ نظر عمل نہیں ہے، بلکہ محرکِ عمل یا عمل کرنے کی نیت ہے۔ حسنِ عمل تبھی ممکن ہے کہ عمل خدا آگاہی سے انجام دیا جائے۔ اللہ ہی حسن، خیر، زیبائی اور درست وصواب کا حتمی معیار ہے۔

آنحضورؐ نے سوالات کے جواب میں جو ارشاد فرمایا، اس کے بارے میں ہم تفصیل سے بحث کریں گے اور یہ بھی سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ آخر تمام فرشتوں میں سے جبرئیل ہی کیوں اس موقع پر ظاہر ہوئے؟ اس سے قبل ہم ایک لفظ پر غور کرنے کی آپ کو دعوت دیں گے جو اس حدیث میں استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ پہ خصوصی توجہ دینا اس لیے ضروری ہے کہ اس لفظ کے وسیلے ہی سے ان عناصرِ سہ گانہ کو ایک کلیّت اور مشترکہ عنوان دیا گیا ہے۔ آنحضرتؐ نے چاروں سوالات کا جواب ارشاد کرنے کے بعد چاروں جوابات کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا کہ یہ ''تمھارا دین ہے۔'' آپؐ نے عربی کا لفظ ''دین'' استعمال فرمایا ہے۔[۳۱] ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ اس محل استعمال میں ''دین'' کا لفظ آنحضرت اور آپؐ کے سننے والوں کے لیے کیا معنویت رکھتا تھا۔

آنحضرتؐ جس عربی زبان میں کلام کرتے تھے، اس کو سمجھنے کے لیے ہمارے پاس اولین اور بنیادی مأخذ خود قرآن ہے اور اس کے بعد علما کی لکھی ہوئی قرآنی تفاسیر۔ آپؐ جب بھی کوئی ایسا لفظ بولتے جو قرآن میں موجود ہوتا تو آپؐ کے سامنے اس کے قرآنی معانی ہوتے تھے۔ لفظ ''دین'' کے لیے بھی ہم پہلے لغت میں اس کی تعریف دیکھیں گے اور پھر قرآن میں اس کے معانی پر نظر کریں گے۔

لفظ ''دین'' کا بنیادی اور اصل مفہوم ہے حکم ماننا، اطاعت کرنا، بندگی کرنا۔ اسی کے قریب ایک اور لفظ ہے جو عربی میں دین ہی کی طرح لکھا جاتا ہے یعنی ''دَین۔'' اس کا مطلب ہے ''قرض'' فرمانبرداری

اور قرض کے مابین جو تعلق ہے، اسے سمجھنا کچھ خاص دشوار نہیں ہے۔ اگر آپ کسی کو کچھ رقم ادھار دیں اور وہ شخص آپ کا دین دار ہو تو اس کا فرض ہے کہ آپ کو رقم واپس کرے۔ یاد رہے کہ ہمارا واسطہ ایک ایسے معاشرے سے ہے جہاں انسانی تعلقات ہی سبھی کچھ تھے اور یہ معاملہ کسی غیر شخصی چیز، مثلاً بینک سے قرضہ لینے سے مختلف بات ہے۔ یہاں قرضہ دینے والا آپ ہی کے معاشرے کا ایک فرد ہے اور ہر شخص کے علم میں یہ بات آ چکی ہے کہ اب آپ اس کے مقروض ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ اس طرح کی معاشرت میں آدمی کی بات ہی اس کا اعتبار ہوتی ہے۔ قول کا اعتبار اٹھ جائے تو پھر انسان کی عزت اور ساکھ بھی نہیں رہتی اور عزت جاتی رہے تو انسان گویا انسان سے کچھ فروتر ہو جاتا ہے۔ ان ذاتی شخصی تعلقات کا پاس ولحاظ، اپنی آبرو اور خاندان قبیلے کی عزت کا خیال آپ کو مجبور کر دیتا ہے کہ اگر آپ کسی کے زیر بار ہیں تو اس شخص کی تعظیم کریں، اس کی بات کو وقعت دیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر آپ کسی کے مرہونِ احسان ہوں تو کسی حد تک اس کی خواہش کے مطابق چلنا پڑتا ہے۔ دوسری طرف دیکھیے تو کسی کے سامنے سرِتسلیم خم کرنا بھی گویا اس بات کا اعلان ہے کہ آپ کسی طرح اس کے احسان مند ہیں۔

عربی کی لغات اُٹھا کر دیکھیے تو عربی کے لفظ ''دین'' کے بہت سے مترادف الفاظ مل جائیں گے۔ ان سے آپ کو اس لفظ کے دائرۂ معانی کی وسعت کا اندازہ ہوگا:۔[۱۴] اطاعت؛ فرمانبرداری؛ تذلّل؛ خوئے تسلیم؛ مذہب، یعنی خدا کی بندگی کا وسیلہ؛ وحدتِ خداوندی کا عقیدہ؛ دینِ اسلام؛ کوئی مخصوص قانون، قاعدہ ضابطہ یا حکم؛ رسوم ورواج وشعائر اور تہواروں وغیرہ کا نظام جو پچھلے لوگوں سے چلا آتا ہو؛ عرف وعادت؛ راستہ، طریقہ، راہِ عمل؛ تدبیرِ امور۔ ''دین'' کے لفظ کے کچھ معانی وہ بھی ہیں جو اسے ''دَین'' کے لفظ سے قریب لے آتے ہیں، چنانچہ یہ لفظ ''ادائی، عوضی رقم، بدلہ، معاوضہ، جزا یا صلہ، تلافی مافات، مکافات، ہرجانہ نیز پاداش یا کفارہ اور حساب کتاب اور یوم الحساب اور عالم اخروی میں حتمی فیصلہ وجزا وسزا'' کے معانی پر بھی دلالت کرتا ہے۔

دین کے لفظ میں معانی کی کچھ مزید تہ داری بھی موجود ہے، مگر اب تک ہم نے جن مفاہیم کی طرف اشارہ کیا ہے، ان سے یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ ترجمہ کرتے ہوئے اسے کسی ایک لفظ کے کوزے میں بند کرنے سے کیسے کیسے مسائل جنم لے سکتے ہیں۔[۱۵] جب آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ''وہ تم کو تمھارا دین سکھانے آئے تھے'' تو اس سے آپؐ کی مراد اصل میں کیا تھی؟ ہماری درج کردہ تعریفات اس ضمن میں معاون ہو سکتی ہیں۔ آپؐ کی مراد اولاً تو یہی تھی کہ ''تمھارا دین'' ''اسلام'' ہے، یعنی قرآن کے

بیان کردہ راستے کا نام اور عنوان۔ آپؐ کو یقیناً دین اور دین کے درمیان معنوی ربط کا بھی دھیان ہوگا کہ دین کے لفظ کو چن کر استعمال کرنے میں ایک قرینہ یہ بھی ملحوظ رہا ہوگا۔ دونوں الفاظ کا یہ ربطِ باہم ہی اس بیان میں ایک اخلاقی وزن پیدا کر رہا تھا جو آپؐ اپنے اصحاب کے سامنے پیش کر رہے تھے۔ مسلمان اسلام کو وہ ذمہ داری اور وہ قرض گردانتے ہیں جو اللہ کی طرف سے ان پر عائد ہوئی ہے اور قرض وہ شے ہے کہ جس کی ادائی کے وہ اخلاقی طور پر مکلّف ہیں۔ وہ اللہ کے مرہونِ منت ہیں، کیوں کہ اس نے پہلے ان کو وجود عطا کیا اور پھر ان کی ابدی فلاح کا سامان فراہم کر دیا۔ جب اسلام کو ''دین'' کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے تو اس میں ''لازم یا ضروری ہونے'' کا احساس بڑی شدت سے پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی تو سب سے بڑی اخلاقی ذمہ داری ہے، بلکہ انسان کے کرنے کا کام اور وصفِ انسانیت کا تقاضا ہی یہی ہے۔ جو شخص کسی کے قرض سے زیر بار ہو اور پھر حسبِ وعدہ ادا نہ کرے، وہ اپنا عزت و وقار کھو بیٹھتا ہے اور انسان کہلانے کے لائق نہیں رہتا، اسی طرح وہ آدمی جو دین سے پہلو تہی کرے، وہ بھی انسان کے رتبے سے گر جاتا ہے، قابل نفرین بھی نہیں رہتا۔ حدیثِ جبرئیل اگر ایک طرف ''تمھارے دین'' کا بیان کر رہی ہے تو ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ بھی بتا رہی ہے کہ وہ کون سا قرض ہے جو اللہ کی طرف سے ہمارے ذمے ہے۔ اللہ ہی تو حقیقت ہے۔ ہم عنقریب یہ دکھائیں گے کہ ''دین'' کے لفظ کی لغت میں بیان کردہ کتنی ہی تعریفیں ایسی ہیں جو اس چیز سے عین مطابقت رکھتی ہیں جسے مسلمان اسلام کہتے ہیں۔ پہلے ذرا یہ دیکھیے کہ قرآن میں دین کا لفظ کیسے اور کن معانی میں استعمال ہوا ہے، کیونکہ قرآن نے یہ لفظ ۹۰ مقامات پر برتا ہے۔

وسیع ترین مفہوم میں لیجیے تو قرآن اس اصطلاح کو قوانین وضوابط کے ایک مجموعے یا عملِ صحیح کے مثالی معیارات کے مجموعے کے معنی میں استعمال کرتا ہے۔ جن مقامات پر لفظ اس عام اور وسیع معنی ومفہوم میں استعمال ہوا ہے، وہاں ہمیں یہ پتا نہیں چلتا کہ مذکورہ دین صحیح ہے یا غلط، حق ہے یا باطل، تاوقتیکہ ہم لفظ کے سیاق وسباق پر غور نہ کریں۔ مثال کے طور پر حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی بن یامین کو مصر میں روکنے کے لیے ایک حیلہ کیا، کیونکہ ''مَا كَانَ لِيَأْخُذَ اَخَاهُ فِي دِيْنِ الْمَلِكِ" (۱۲:۷۶) (اس بادشاہ کے قانون و انصاف سے تو وہ اپنے بھائی کو ہرگز نہ لے سکتے)۔ مترجمین عموماً اس آیت کے ترجمے میں ''دین'' کو ''قانون'' (Law) کے لفظ سے ادا کرتے ہیں۔ اس سے وہ تفریق جھلکتی ہے جو مقدس اور غیر مقدس یا دینی اور دنیاوی کے مابین جدید دنیا میں عام ہو چکی

ہے، لیکن زمانۂ قدیم کے تصورات کے بارے میں عموماً اور مصر کے عہدِ عتیق کے تصورِ کائنات کے بارے میں بالخصوص ہمیں جو معلومات میسر ہیں، ان کی روشنی میں یہ کہنا کسی طرح روا نہ ہوگا کہ بادشاہ کا قانون اس کے دین سے باہر کوئی چیز تھا، یا اس کا دین اس کے قانون سے کسی طرح مختلف اور الگ تھا۔

اس اصطلاح کے عمومی استعمال کی ایک اور مثال وہ ہے جہاں قرآن نے اس سے آلِ فرعون کے طور طریقوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ قرآن میں مذکور سب سے اہم فسادی اور شرّ ی انسان فرعون ہے۔ فرعون اپنے مشیروں سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے:

وَقَالَ فِرعَونُ ذَرُوْنِی اَقتُل مُوسٰی وَلیَدعُ رَبّہ اِنّی اَخَافُ اَن یُّبَدِّلَ دِینَکُم اَو اَن یُّظہِرَ فِی الاَرضِ الفَسَادَ (۲۶:۴۰)

مجھے چھوڑو کہ میں موسیٰ کو مار ڈالوں اور وہ پڑا پکارے اپنے رب کو۔ مجھے ڈر یہ ہے کہ وہ یا تو تمھارا دین بگاڑ دے گا یا تمھارے ملک میں خرابی کی راہ نکالے گا۔

بالفاظِ دگر، اگر تم موسیٰ کے کہے پر کان دھرو گے تو اس دین کو چھوڑ بیٹھو گے جس کے ہم سب پیروکار ہیں اور پھر ہمارا سماجی تانا بانا درہم برہم ہو جائے گا۔ سماج کی یہ بُنَت، یہ سماجی ڈھانچا کیا تھا! وہ قاعدے ضابطے جن کو سماجی استحکام اور توازن برقرار رکھنے کے لیے مانا جاتا تھا۔

آگے بڑھیے تو دین کا لفظ قدرے خاص معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس مفہوم میں ''دین'' ایک جامع عنوان ہے اس پیغامِ خداوندی کے لیے جو سیدنا محمدؐ سمیت تمام انبیا لے کر آئے۔ چنانچہ قرآن سیدنا محمدؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کو ان الفاظ میں خطاب کرتا ہے۔ آیت میں صیغۂ واحد (لك) اور صیغۂ جمع (لکم) کا فرق قابلِ توجہ ہے۔ ہم نے اپنی تحریر میں ہر جگہ قرآن کے اسلوبِ بیان کو مثال بنا کر صیغۂ واحد حاضر اور جمع حاضر میں امتیاز کو باقی رکھا ہے، کیونکہ اس سے اکثر مقامات پر آیت کے معانی کی ایک اہم پرت کی طرف اشارہ مقصود ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت میں آپ دیکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے لیے واحد غائب (شَرَع) اور متکلم (اَوحَینَا) کے صیغوں کا ادل بدل کر استعمال بھی نظر میں رکھیے، کیونکہ یہ بھی قرآنی ندرتِ کلام کا خاصہ ہے:[16]

شَرَعَ لَکُم مِّنَ الدِّین مَاوَصّٰی بِہٖ نُوحًا وَالَّذِی اَوحَینَا اِلَیكَ وَمَا وَصَّینَا بِہٖ اِبرَاھِیمَ وَ مُوسٰی وَ عِیسٰی اَن اَقِیمُوالدِّینَ وَلَا

راہ ڈال دی تم کو دین میں، وہی جو کہ دیا تھا نوح کو، اور جو حکم بھیجا ہم نے تیری طرف، اور وہ جو کہ دیا ہم نے ابراہیم کو، اور موسیٰ کو

تَتَفَرَّقُوْا فِيه (۴۲:۱۳) اورعیسٰی کو، یہ کہ قائم رکھو دین، اور پھوٹ نہ ڈالو اس میں۔

یہ دین کیا ہے جس کو قائم کرنے کا فریضہ اللہ تعالیٰ نے نوحؑ و ابراہیمؑ، موسٰیؑ وعیسٰیؑ اور سیدنا محمد علیہ السلام پر عائد کیا؟ اسلام کے نقطۂ نظر سے یہ سب انبیا ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه'' کی شہادت دیتے رہے اور اس الٰہِ واحد کی عبادت کرتے رہے جو اس کلمۂ شہادت کا موضوع ہے۔ یہ شہادت وعبادت ''توحید'' کہلاتی ہے۔اس کے لفظی معنی ہیں ''اللہ کے ایک ہونے کا اعلان''۔''توحید'' ہماری کتاب کا ایک بڑا موضوع ہے۔قرآنِ مجید صراحت سے یہ بات بیان کرتا ہے کہ اللہ کے سب پیغمبر ''توحید'' ہی کی دعوت لے کر آئے تھے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِي اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (۲۱:۲۵)

اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا جسے یہ وحی نہ کی گئی ہو کہ بات یوں ہے کہ میرے سوا کوئی الٰہ نہیں، سو میری بندگی کرو۔

حضرت یوسفؑ کی اسیری کا قصہ قرآن میں بیان ہوا ہے۔آپ نے زنداں کے ساتھیوں کو جو نصیحت کی، وہ ذیل میں درج کی جارہی ہے۔ یہاں انھوں نے دینِ صحیح کو ''توحید'' ہی کہا ہے:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ۔ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَايَعْلَمُوْنَ (۱۲:۴۰)

حکومت نہیں ہے کسی کی سوا اللہ کے، اس نے فرما دیا کہ نہ پوجو مگر اسی کو۔ یہی ہے سیدھا، استوار دین، پر بہت لوگ نہیں جانتے۔

''اسلام'' کا لفظ بھی ''دین'' کی طرح بہت سے معانی میں استعمال ہوتا ہے۔اس کی تفصیل ہم آگے چل کر دیکھیں گے۔اپنے وسیع معنی میں یہ اس تسلیم پر دلالت کرتا ہے جو ہر نبی ورسول اللہ کے سامنے بجالاتا ہے۔سیدنا ابراہیمؑ تو بالخصوص اس وصفِ تسلیم میں کامل جانے جاتے ہیں:

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ۔ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهِيْمُ بَنِيْهِ وَ يَعْقُوْبُ۔ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۲:۱۳۲)

اس کو کہا اس کے رب نے، حکم بردار ہو۔ بولا میں حکم میں آیا جہان کے صاحب کے۔ اور یہی وصیت ابراہیمؑ اور یعقوبؑ اپنے بیٹوں کو کر گئے۔اے بیٹو! اللہ نے چن کر دیا ہے تم کو دین، پھر نہ مرنا مگر مسلمانی پر۔

ان آیات میں اور قرآن میں دیگر مقامات پر ''الدین'' کے لفظ سے توحید اور بالکل عام اور وسیع ترین مفہوم میں خوئے تسلیم و سرافگندگی مراد لی گئی ہے۔ یہاں یہ لفظ اسلام اور ماقبلِ اسلام کے مذاہب سب کا احاطہ کرتا ہے۔ ان آیات میں جو بات خاص طور پر اہمیت رکھتی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ دین اللہ کا قائم کردہ ہے اور مقاصدِ الٰہیہ کی تکمیل کا وسیلہ ہے۔ اسی سے ان بہت سی قرآنی آیات کا مفہوم واضح ہوتا ہے جو زور دے کر اعلان کرتی ہیں کہ دین لازماً اللہ ہی کے لیے ہے۔ بالفاظِ دیگر کوئی بھی دین، مثلاً قرآن میں مذکور فرعون کا دین، جو اللہ کا دیا ہوا نہ ہو، وہ سچا دین نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح اگر لوگ اللہ کے بتائے ہوئے طریقے سے کسی دین پر عمل کرتے ہوئے زندگی نہ گذاریں اور اپنی مرضی کرنے لگیں تو ایسا دین حقیقی دین نہیں رہتا:

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعاً وَّ كَرْهًا وَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ (۳:۸۳)	اور اسی کے حکم میں ہے جو کوئی آسمان اور زمین میں ہے، خوشی سے، یا زور سے، اور اسی کی طرف پھر جائیں گے۔
وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْۤا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ۔ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ۔ وَلَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِباً۔ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ (۱۶:۵۱-۵۲)	اور کہا اللہ نے، نہ پکڑو معبود دو۔ وہ معبود ایک ہے۔ سو مجھی سے ڈرو۔ اور اسی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں، اور اسی کا دین ہے ہمیشہ۔ سو کیا اللہ کے سوا کسی سے خطرہ رکھتے ہو۔
فَاعْبُدِاللّٰهَ مُخْلِصاً لَّهُ الدِّيْنَ۔ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ (۳۹:۲-۳)	سو بندگی کرو اللہ کی، خالص کر کے اس کے واسطے بندگی۔ سنتا ہے! اللہ ہی کو ہے بندگی نری۔

''دین'' کا لفظ اپنے خاص معنی میں دین کی اس شکل سے عبارت ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت محمدؐ کے ذریعے نازل کی۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِىْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْناً (۵:۳)	آج میں پورا دے چکا تم کو دین تمھارا، اور پورا کیا تم پر میں نے احسان اپنا، اور پسند کیا میں نے تمھارے لیے دین مسلمانی۔

حدیثِ جبرئیل میں یہ لفظ اسی مفہوم میں برتا گیا ہے۔ ''دین'' بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں ''الدین''

ان تعلیمات کا مجموعہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت محمدؐ اور ان کے پیروکاروں کے لیے مکمل کر دیا۔ توحید و اطاعت الٰہی بھی ان تعلیمات میں شامل ہیں۔ بالفاظِ دیگر ان کے دین پر خود اللہ کی طرف سے مہرِ تکمیل ثبت کی گئی ہے اور اللہ نے اسے اپنی پسند قرار دیا ہے۔

قرآن میں دین کے لفظ سے اسلام کے مخصوص اوامر و نواہی بھی مراد لیے گئے ہیں۔ مثال کے طور دیکھیے کہ آیتِ ذیل میں زنا کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے مقرر کردہ سزا کو ''خدا کا دین'' کہا گیا ہے:

الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَلَا تَأْخُذْكُم بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (۲:۲۴)	بدکاری کرنے والی عورت اور مرد، سو مارو ایک ایک کو دونوں میں سے، سو چوٹ پچھی، اور نہ آئے تم کو ان پر ترس اللہ کے حکم چلانے میں۔

اب تک کی تحریر کا خلاصہ یہ ہوا کہ جب آنحضرتؐ نے اپنے صحابہ سے فرمایا کہ ''جبرئیل--- تمھیں تمھارا دین سکھانے آئے تھے'' تو آپؐ سب سے پہلے یہ واضح کر رہے تھے کہ خود اسلام کی نظر میں ''اسلام'' کیا ہے۔ اسی کے ضمن میں آپؐ نے ہمیں یہ بھی بتا دیا کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے عمومی طور پر دین کا کیا مفہوم ہے۔ ہر مستند دین میں یقیناً یہ تینوں جہات موجود ہوں گی جو آنحضرتؐ نے بیان کیں۔ سو اگرچہ ہماری بحث کا مرکز یہ ہوگا کہ اسلام اپنے بارے میں کیا کہتا ہے، تاہم اس بات کو بھی ہم زیرِ بحث لائیں گے، کبھی صراحتاً اور کبھی کنایتاً، کہ ایک کائناتی حقیقت، یعنی ''دین'' کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے کہ اسلام خود اس حقیقت کے مظاہر میں سے ایک ہے۔

اسلام کی تین جہات Three Dimensions of Islam

ہم نے عرض کیا تھا کہ اسلامی نقطۂ نظر سے دین کی تین جہات ہوتی ہیں۔ اسلام (submission)، ایمان (faith)، احسان (doing what is beautiful)، ان تینوں اصطلاحات کا ترجمہ قدرے پیچیدہ معاملہ ہے، لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ان پر تفصیل سے بحث کی جائے۔ پہلے یہ دیکھ لیجیے کہ لفظ ''جہت'' (dimension) کے استعمال میں کیا استعارہ مضمر ہے!

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلام کی تین جہتیں ہیں تو ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ جیومیٹری (اقلیدس) کی اصطلاح میں بات کرنے سے اسلام پر غور کرنے میں سہولت ہوگی۔ حقیقتِ مکانی جس سے ہمیں ہمہ وقت سابقہ رہتا ہے، اس کی تین ابعاد یا تین جہتیں ہیں (چوتھی جہت کو سرِ دست نظر انداز کر دیجیے)۔

طبعی اشیا کو یا مادی اشیا کو یک رخی، دورخی یا سہ رخی کی اصطلاحات میں دیکھا جا سکتا ہے اور یہ ممکن ہے کہ ایک رخ کا، ایک جہت کا مطالعہ دوسرے سے الگ کر کے کیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ ہم مادی اشیا و اشکال کا جائزہ صرف خطوط کے حوالے سے بھی لے سکتے ہیں، سطح کے اعتبار سے بھی اور رقبے کے لحاظ سے بھی، اور یہ بھی کر سکتے ہیں کہ طول و عرض کے ساتھ عمق یا گہرائی کو بھی ملحوظ رکھیں۔

ہم اسلام کی تین جہات پر الگ الگ گفتگو کریں گے، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی اشارہ کرتے جائیں گے کہ یہ طریقِ کار صرف انکشافِ حقیقت میں مددگار ہونے کی وجہ سے اختیار کیا گیا ہے۔ نکتہ یہ ہے کہ اسلام اپنے بارے میں جو بیان کرتا ہے، اپنے آپ کو جس طرح پیش کرتا ہے، وہ یک رخی چیز نہیں ہے، بلکہ کئی عناصر سے مرکب ہے۔ لہٰذا اسے سمجھنے کے لیے پوری تصویر کے تمام رخ ایک ایک کر کے سامنے لانا ہوں گے۔ ان جہات کو جدا جدا کر کے بیان کرنے سے مقصود یہی ہے کہ قاری پر واضح ہو جائے کہ یہ جہات مل کر ایک کُل کی صورت گری کرتی ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے کہ اگر آپ لمبائی، چوڑائی اور گہرائی کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے غرض یہ بتانا ہوتا ہے کہ مکان (space) کا ٹھیک سے تصور کرنے کے لیے ان تینوں پر نظر کرنا ضروری ہے۔

ان تین جہات کی ترتیب ہم نے وہی رکھی ہے جس میں یہ حدیثِ جبرئیل کے اس متن میں وارد ہوئی ہیں جو ہم نے صفحاتِ ماقبل میں نقل کیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی ترتیب ممکن تھی۔[۱۷] موجودہ ترتیب کو ترجیح دینے کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے خیال میں یہ ایک بہت مناسب ترتیب ہے کہ اس میں آغاز اس جہت سے کیا گیا ہے جو بالکل سامنے کی چیز ہے اور اس تک رسائی آسان ترین ہے۔ ہاں یہ ہے کہ یہاں آ کر مکانی استعارہ کچھ زیادہ ممد و معاون نہیں رہ جاتا اور وجودِ انسانی کی تین جہات کے حوالے سے غور کرنا زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے۔

ہستیِ انسانی پر ہم تین بنیادی جہات یا اقالیم یا تین درجاتِ وجود کے حوالے سے غور کر سکتے ہیں۔ ان میں خارج کی جہت کا تعلق انسان کے ظاہر سے ہے۔ انسان مختلف کام کرتا ہے۔ اس عمل پر بحث ہو سکتی ہے اور عمل کرنے والے شخص کے حوالے سے اس کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں ہم صرف اس عمل پر بھی نظر کر سکتے ہیں، مثلاً ایک آدمی کسی عالمی کرکٹ سیریز میں فیصلہ کن چوکا لگاتا ہے اور جیت ہو جاتی ہے؛ کسی کی لاٹری نکل آئی؛ کسی نے اپنی تنخواہ وصول کی۔ یہاں جو چیز اہم ہے وہ ہے واقعہ یا عمل۔ شخصیات یا محرکاتِ عمل کا جائزہ لینا اگر ضروری ہو تو بعد میں لیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح

اگر ہم چاہیں تو انسان کی شخصیت کی داخلی جہات کو بھی زیرِ غور لا سکتے ہیں۔ اس ضمن میں دو سوال بنیادی ہیں جو کسی بھی شخص کے بارے میں پوچھے جا سکتے ہیں۔ پہلے سوال کا بیشتر تعلق علم سے ہے اور دوسرے کا نیت اور ارادے سے۔ جب ہم کسی عمل پر غور کرتے ہیں تو ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس عمل کے پیچھے کیا سوچ ہے اور یہ کام کیا سمجھ کر کیا گیا ہے؟ آپ نے بارہا سنا ہوگا، خاص طور پر والدین کی زبان سے یہ پھٹکار اکثر سننے کو ملتی ہے کہ ''ایسی بے وقوفی کی حرکت کیسے کر ڈالی تم نے!'' ایک شخص نے ایک کام کیا اور صاف نظر آ رہا ہے کہ اس سے یہ حرکت سراسر بے خبری میں سرزد ہوئی ہے اور اسے صورتِ حال کا بالکل علم نہیں تھا، لیکن جونہی ہم یہ سوال پوچھتے ہیں کہ ''کسی شخص کو اصل صورتِ حال کا علم کیسے حاصل ہوتا ہے؟'' تو ایک بڑا مسئلہ ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ''اصل صورتِ حال'' کو کس طرح متعین کیا جائے گا؟ اس کی تعریف اس شخص اور اس کے عمل کے حوالے سے کی جائے گی یا سماجی اور ثقافتی سیاق وسباق میں؟ حیاتیاتی مجبوریوں کے لحاظ سے یا اس لمحۂ تاریخ کے حوالے سے جس میں یہ عمل واقع ہوا؟ کائنات کے دروبست اور نفسِ انسانی کی ساخت کا بھی مذکور ہوگا یا نہیں؟ خدا، فرشتے، شیاطین کے بارے میں کیا کہا جائے گا؟ ان میں سے کس چیز کا علم ہمیں ''اصل صورتِ حال'' کو سمجھنے کے قابل بناتا ہے یا ان چیزوں کا اس سے کوئی جوڑ نہیں۔ مطلب یہ کہ انسانی تجربے کی یہ جہت ایسی ہے جو علم، فہم اور اندازِ نظر سے متعلق ہے۔ اسلام ان مباحث پر کلام کرتے ہوئے ایمان کی برتر سطح سے کلام کرتا ہے۔ اس کی وجوہات آگے چل کر واضح ہو جائیں گی۔

انسان کی داخلی جہت اور انسانی عمل کے بارے میں بالکل مختلف نوعیت کے کچھ اور سوالات بھی اٹھائے جا سکتے ہیں: محرکِ عمل کیا تھا؟ عمل کس نیت سے کیا گیا تھا؟ کوئی متبادل چناؤ ممکن تھا یا نہیں؟ ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوگوں کے پاس ضروری علم تو ہوتا ہے، مگر کرتے وہ پھر وہی ہیں جو دوسروں کی نظر میں ناقابل قبول ہوتا ہے۔ یہی نہیں، بسا اوقات ایسی حرکتیں جو ناگوار ہوں، کی ہی اس لیے جاتی ہیں کہ دوسروں پر گراں گزریں۔ نیت اور محرکِ عمل کا معاملہ عدالتوں میں بھی اکثر زیرِ بحث آتا ہے۔ کسی نے اگر ایک غلط حرکت عمداً کی ہو تو اسے جرم قرار دیا جاتا ہے، تاہم اگر ارتکابِ جرم کا ارادہ نہیں تھا تو پھر سارے معاملے کا تجزیہ زیادہ احتیاط سے کرنا لازم ٹھہرتا ہے۔

دین بھی ایک سیدھا اور صحیح راستہ ہے۔ حدیثِ جبرئیل یہی بتاتی ہے کہ اسلام کی رو سے دین، عمل کے صحیح طریقوں، سوچنے اور جاننے کے درست انداز اور عمل کے پیچھے صحیح نیت اور ارادہ کرنے

کے قرینے، ہر تین عناصر کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس حدیث میں رسول خداؐ نے عمل، فہم اور نیت کے صحیح اسالیب کو الگ الگ عنوان دیا ہے۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''اسلام'' دین کا وہ حصہ ہے جس کا تعلق عمل سے ہے، ''ایمان'' وہ حصہ ہے جو فکر و فہم سے متعلق ہے اور ''احسان'' وہ جزو ہے جو حسنِ نیت سے مربوط ہے۔ دین کی یہ تین جہات بہم مل کر اپنے امتزاج سے ایک حقیقتِ واحدہ بنتی ہیں جسے ہم اسلام کے نام سے جانتے ہیں۔

انسانی شخصیت ایک جیتی جاگتی واقعاتی حقیقت ہے، اس میں عمل، علم و فہم اور نیت کو الگ الگ کر کے دیکھنا ہم اپنی اغراض و مقاصد کے لیے کرتے ہیں۔ ہمارا واسطہ تو ایک انسانی شخصیت سے ہوتا ہے جس کے لیے ہوسکتا ہے کہ اس امتیاز میں کوئی معنی ہی نہ ہوں۔ لوگ باگ تو بس اپنی زندگی گذارتے ہیں، خواہ ہم دور کھڑے مبصرین کے طور پر اپنے دیکھے اور ان دیکھے کو مختلف انواع و اقسام میں کتنا ہی تقسیم کرتے رہیں۔

اسی طرح مسلمان اور دوسرے مذاہب کے ماننے والے اپنے اپنے مذہب کے مطابق زندگی گذارتے رہتے ہیں۔ علمِ کلام کے ماہرین، فلسفی، مورخین، ماہرین نفسیات اور دوسرے اہلِ علم اسے خانوں میں بانٹ کر دیکھتے ہیں اور ایسا کرنے میں وہ زندگی کی کلیّت کو مسخ کر دیتے ہیں، تاہم چیزوں کو تقسیم کر کے دیکھنے کے اس عمل میں ہمیں وہ چیز میسر آجاتی ہے جسے دوبارہ جوڑ کر اور اجزا کو اپنی جگہ رکھ کر ہم بہتر اور مکمل طور پر معاملے کو سمجھنے کے قابل ہوجاتے ہیں۔

اسلامی علوم

اسلام کے حوالے سے دین کی تعریف متعین کرتے ہوئے ہم نے اداروں کا ذکر نہیں کیا۔ اداروں سے ہماری مراد ہے ایک سلسلۂ پیشوائیت یا نظامِ کلیسا۔ آج کل بہت سے لوگ فقط کلیسا کی سرگرمیوں ہی کو دین کے مترادف سمجھتے ہیں، یا کلیسا کے عہدے داروں یا پادریوں کی مصروفیات کو دین قرار دیتے ہیں۔ اسلام میں نہ کلیسا ہے نہ پادری نہ پروہت۔

گرجوں کی جگہ اسلام میں مسجدیں ہوتی ہیں۔ مسجد وہ عبادت گاہ ہے جسے مقامی طور پر مسلمان قائم کر لیتے ہیں۔ اس کے پیچھے صاحبانِ اختیار کا کوئی مرکز نہیں ہوتا کہ ہم ''کلیسا'' کی طرح ''مسجد'' کو بھی ایک نظام یا ادارہ کہنے کا سوچ سکیں۔

پادریوں کی جگہ اسلام میں علما ہوتے ہیں۔ عیسائیت جیسے دین میں مذہبی پیشوا کو کچھ ایسے فرائض

انجام دینا ہوتے ہیں جو عوام الناس کے بس میں نہیں ہوتے۔ اسلام میں کوئی مذہبی فریضہ ایسا نہیں ہے جو معاشرے کا کوئی بھی عاقل بالغ فرد انجام نہ دے سکتا ہو۔ بایں ہمہ کچھ مسلمانوں کو دینی امور میں خاص مہارت ہوتی ہے۔ آپ نے ملاّ، علما یا آیت اللہ کے الفاظ سن رکھے ہوں گے۔ اس قسم کے الفاظ کی فہرست سازی کے بغیر ہم صرف اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ وہ افراد جو مذہبی معاملات میں کوئی خاص کردار ادا کرتے ہیں، ان کے لیے معروف لفظ ہے ''عالم'' (اس کی جمع ہے علما)۔ اس لفظ کا مطلب ہے ''صاحبِ علم''۔ وہ لوگ جو اسلامی علوم کے لیے اپنی زندگی وقف کر دیتے ہیں، انھیں مسلمانوں میں ایک خاص حیثیت حاصل ہو جاتی ہے، کیونکہ انھی کے ہاتھوں علم کی حفاظت ہوتی ہے اور یہی لوگ اسے منتقل بھی کرتے ہیں اور اسی سے دین کی روایت کو بقا ملتی ہے۔ بنیادی طور پر ان کا منصب کچھ اسی طرح کا ہوتا ہے جسے آج کی اصطلاح میں resource person کہا جاتا ہے۔ وہ اسلامی علوم کے ماہرین ہیں، یہ ان کا اختصاص ہے اور وہ اپنے علم کو اپنے لوگوں کی فلاح کے لیے استعمال کرنے کے خواہش مند ہیں۔ اس لحاظ سے ان کو پادریوں یا کلیسائی عہدہ داروں کی بجائے ربّیوں سے زیادہ مشابہ کہا جاسکتا ہے۔

طبقۂ علما میں شامل ہونے کے لیے کسی فرمان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کوئی بھی شخص علم حاصل کرکے اہلِ علم میں شمار ہوسکتا ہے، پھر جیسے جیسے آپ اپنا علم لوگوں پر کھولتے ہیں، آپ کو صاحبِ علم کے طور پر شناخت کرلیا جاتا ہے۔ آپ بھی عالم کہلانے لگتے ہیں۔ علما میں عورتوں کی تعداد کم ہی رہی ہے، تاہم مشہور اہلِ علم خواتین کی بہ کثرت مثالوں سے یہ ضرور ثابت ہوجاتا ہے کہ نظری طور پر عورتوں کے علم حاصل کرنے پر کوئی قدغن نہیں ہے۔ کچھ سماجی رکاوٹیں ضرور حائل رہی ہیں، لیکن ان کی بنا بھی دین کی بنیادی تعلیمات پر نہیں ہے۔

صاحبِ علم ہونا ایک اضافی معاملہ ہے۔ قرآن کے الفاظ میں "وَفَوقَ كُلِّ ذِىْ عِلْمٍ عَلِيم" (۱۲:۷۶) (اور ہر خبر والے سے اوپر ہے ایک اور علم والا)۔ ایک چھوٹے سے گاؤں کی مثال لیجیے۔ گاؤں کا ایک شخص کسی بڑے شہر کے لیے عزمِ سفر کرتا ہے اور دو ایک سال بعد قرآن و حدیث کے بارے میں ابتدائی علم حاصل کرکے لوٹ آتا ہے۔ دیہاتیوں کی نظر میں تو یہی شخص صاحبِ علم گردانا جائے گا۔ وہ بخوشی اسے اپنی نمازوں کا امام بنائیں گے اور زندگی گذارنے کے لیے قرآنی ہدایات معلوم کرنے کے لیے اس سے رجوع کریں گے۔

مسلمانوں کے علمی مراکز مثلاً قاہرہ، دمشق، بغداد، استنبول، نجف، دہلی وغیرہ میں علما کے بہت سے طبقات پائے جاتے تھے۔ ہر طبقے میں ایک طرح کی درجہ بندی پائی جاتی تھی۔ اس درجہ بندی کا کوئی خاص ضابطہ نہیں تھا، تاہم آپ آسانی سے یہ جان لیتے تھے کہ کون اچھا عالم ہے اور کس کا علم کچا ہے۔

علم کے عظیم مراکز کا انحصار مسلمانوں کے مذہبی اوقاف پر ہوتا تھا۔ ان میں سے اکثر میں ہر شخص کو تحصیلِ علم کی اجازت تھی اور مسندِ تدریس بھی ہر کسی کے لیے کھلی تھی۔ حصولِ علم کی حوصلہ شکنی کم از کم اسلام کی حد تک ناممکنات میں سے تھی کہ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا تھا کہ "**طلب العلم فریضة علی کل مسلم**"[۱۸] (طلب علم ہر مسلمان پر فرض ہے۔) طالب علم بننے کے لیے صرف اتنا ہی معلوم کرنا پڑتا تھا کہ درس کا کہاں اور کب اجرا ہوگا۔ اس کے بعد آپ درس میں شامل ہو جاتے تھے۔ اکثر اوقات حلقۂ درس کسی بڑی مسجد کے کسی مخصوص ستون کے پاس قائم ہوتا تھا۔ حلقۂ درس میں شریک ہونے کے بعد آپ پر کوئی نظر نہیں رکھی جاتی تھی تا آنکہ آپ خود کو نمایاں کرنے کی کوشش کریں۔ بحث میں شامل ہونے کی پوری آزادی تھی، لیکن اگر آپ کو اپنے موضوع سے شناسائی نہ ہو تو آپ نشانۂ تضحیک بن جاتے تھے یا دوسرے طلبا آپ کو خاموش کرا دیتے۔ آج کی طرح سندیں جاری کرنے کا رواج نہ تھا۔ ہاں اگر آپ نے کسی استاد کے ساتھ چند ماہ و سال گذارے ہوتے اور اس کے زیرِ تدریس کتاب پر عبور حاصل کر لیا ہوتا تو آپ کو اس کی طرف سے ایک تحریری سند عطا کر دی جاتی تھی جس کے بعد آپ اس کتاب کا درس دینے کے مجاز ہو جاتے تھے۔ علما کے بارے میں جب لوگ باگ پرکھ پرچول کرتے تو یہی سوال کیا جاتا کہ فلاں عالم کو کون کون سی اسناد اور اجازات حاصل ہیں اور کس کس کی طرف سے؟ اسناد و اجازات کا مأخذ بہت ہی اہم چیز گردانا جاتا تھا، کیونکہ بعض اساتذہ اپنے شاگردوں کو آسانی سے سندِ تحصیل دے دیتے تھے جب کہ کچھ علما اس معاملے میں سختی کرتے تھے۔

قصبوں اور دیہات کے اساتذہ اپنے بہت سے طالب علموں کو شہر کے کسی بڑے مدرسے میں پڑھنے کے لیے بھیج دیا کرتے تھے۔ اس کے لیے لیاقت اور استعداد شرط تھی۔ معروف اساتذہ کی طرف سے تعارفی خط داخلے اور قیام و طعام کی سہولتیں حاصل کرنے کے لیے کافی ہوتا تھا۔ پڑھانے کی کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی۔ جسے سفارش میسر نہ ہو، وہ بھی محروم نہیں رہتا تھا۔ کوئی بھی راہ چلتا آدمی کسی بھی مدرسے میں جا کر مالی امداد طلب کر سکتا تھا۔ اساتذہ کو اچھے لائق طالب علموں کی مدد کر کے خوشی ہوتی تھی اور اگر وہ اپنی قابلیت کا ثبوت دے دیتا تو اس کو ہر طرح کی مدد فراہم کی جاتی تھی۔

ہر شخص کو تحصیلِ علم کی آزادی تھی اور ہر شخص تدریس کے لیے آزاد تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر کس و ناکس کو مدرسے سے وظیفہ مل جاتا تھا۔ مراد یہ کہ آپ کسی بھی مسجد میں جا کر کسی ستون کے برابر نشست سنبھال کر کتاب کھول لیتے اور سننے والوں کو بتا دیتے کہ آپ درس دینے کی نیت سے آئے ہیں۔ اچھے اساتذہ کے گرد جلد ہی طالبانِ علم کا ہجوم ہونے لگتا تھا اور زیادہ دن نہ گذرتے تھے کہ انھیں وظائف ملنے لگتے۔ سیاسی جوڑ توڑ کی بات الگ ہے۔ اچھا استاد ہونے کے لیے پڑھا لکھا ہونا ضروری تھا اور مسندِ تدریس ہی پر علم کی آزمایش ہوتی تھی۔ علم کا کھوکھلا دعویٰ رکھنے والوں کی قلعی جلد ہی کھل جاتی تھی، پھر ان کے حلقۂ تدریس کی طرف کوئی بھی رخ نہیں کرتا تھا۔

ہماری اب تک کی گفتگو سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ شاید اسلامی علوم کی تدریس صرف مدارس اور مساجد تک محدود تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ درس و تدریس ایک ایسا غیر رسمی معاملہ تھا جو کسی بھی جگہ جاری رہ سکتا تھا۔ ڈگریاں دینے کا رواج نہ ہونے کی وجہ سے حصولِ علم کا مقصد اور محرک علم کا حصول ہی تھا۔[19] علم حاصل کرنے کو ایک مذہبی کام سمجھا جاتا تھا اور معاشرے کے ہر فرد سے اس عمل میں بساط بھر شریک ہونے کی توقع کی جاتی تھی۔ رسمی اداروں کی عدم موجودگی میں دین کا علم حاصل کرنے کے ذرائع کسی نہ کسی شکل میں ہر کس و ناکس کو میسر تھے۔ جوناتھن برکی (Jonathan Berkey) نے قاہرہ میں عہدِ وسطیٰ میں علمی سرگرمیوں پر ایک دلآویز تحریر مرتب کی ہے جس میں درس و تدریس کے اس عمل پر بڑی خوبی سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کے اختتامیے میں وہ رقم طراز ہے:

> عہدِ وسطیٰ میں تعلیم اداروں کی ڈگریوں پر مبنی کسی نظام کے سانچے میں مقید نہیں تھی۔ علومِ مذہبی کی تدریس کے لیے قائم مدارس کی بہتات کے باوصف درس و تدریس مخصوص اداروں تک محدود نہیں تھی۔ جہاں کسی عالم نے قیام کر لیا، وہیں سلسلۂ تعلیم و تعلم کا آغاز ہو گیا اور اس میں وہ سب لوگ شریک ہو گئے جو اس کے مخاطب تھے۔ تعلیم کا یہی شخصی اور زبانی اسلوب تھا جس کے کارن کسی نہ کسی شکل میں تعلیم ہر شخص کی دسترس میں تھی۔[20]

اسلامی علوم کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جو اسلام کی تین جہات کی نمایندگی کرتے ہیں۔ پھر ان علوم کو متعدد ذیلی اقسام میں بانٹا جا سکتا ہے۔ اسلام کی دوسری جہت پر اس کا اطلاق قدرے زیادہ ہوتا ہے۔ علما کی اکثریت تو عملِ صحیح (اسلام کی پہلی جہت) کی سطح سے آگے نہیں بڑھ پاتی، کیوں کہ یہ اپنی جگہ ایک نہایت مفصل اور تہ دار شعبۂ علم ہے۔ آپ چاہیں تو اپنی تمام عمر اسی شعبے کے لیے وقف کر سکتے ہیں۔ مزید براں وہ علما جو اسلام کی اس جہتِ اوّل میں خصوصی مہارت حاصل کرتے ہیں، انھیں بالعموم دنیاوی معاملات میں کہیں زیادہ الجھنا پڑتا ہے، کیونکہ انھیں یہ بتانا لازم ہوتا

ہے کہ لوگوں کے لیے صحیح کام کیا ہے اور غلط کیا۔ روایتی اسلامی معاشرے میں یہ علما ماہرینِ قانون اور قاضیوں کا منصب سنبھالتے ہیں۔ انھیں فقہا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ آج کی مغربی دنیا میں وکلا اور ماہرینِ قانون بہت طاقتور اور بااثر دیکھے جاتے ہیں۔ اسلامی معاشرے میں فقہا کو بھی یہی حیثیت حاصل تھی اور وہ اکثر بادشاہوں کے قانونی مشیر کا منصب سنبھالتے تھے۔ اسلامی معاشرے میں فقہا کا کردار اتنا اہم تھا کہ اکثر مسلمانوں کے لیے ''علما'' اور ''فقہا'' مترادف الفاظ کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں، جب کہ ''علما'' کی اصطلاح اپنے معانی میں اس سے کہیں وسیع ہے۔

تمام اسلامی علوم کی بنیاد قرآنِ مجید ہے۔ تفسیر یعنی قرآنِ مجید کی شرح و ترجمانی ایک الگ اختصاصی شعبۂ علم ہے۔ تفسیر میں عموماً ساری کتابِ خدا کی آیت بہ آیت شرح و وضاحت کی جاتی ہے، تاہم اکثر ایسی تفاسیر بھی دیکھنے میں آتی ہیں جو کسی عالم نے کسی خاص سورہ یا کسی حصۂ قرآن کے بارے میں تصنیف کی ہوتی ہیں۔ علما نے اپنے اپنے رجحان کے مطابق سبھی طرح کی تفاسیر لکھی ہیں۔ بعض تفاسیر میں صرف متنِ قرآن کے الفاظ کی شرح و وضاحت ملتی ہے۔ یہ تفاسیر عربی یا دیگر اسلامی زبانوں مثلاً فارسی یا ترکی میں تفصیلِ متن سے عبارت ہیں۔ دیگر تفاسیر وہ ہیں جن میں صرف و نحو، تاریخی پس منظر، فقہی مضمرات و احکام، کلامی مباحث و عقائد، اخلاقی تربیت، تمثیلی و مجازی معانی یا ان کے علاوہ دیگر موضوعات کو مرکزِ توجہ بنایا گیا ہے۔ تمام علما اپنے دائرہ اختصاص میں رہتے ہوئے قرآن کی تفسیر کرتے اور اپنے فہمِ قرآن کو بیان کرتے ہیں۔ جس طرح انھوں نے قرآن کو سمجھا اسے بیان کر دیا۔ ایک بات پر سب کا اتفاق تھا کہ قرآن کے معانی کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔[۲۱]

ایک لحاظ سے اگر صحیفۂ اسلام کے معانی کی تلاش و تفحص کو تفسیر کا نام دیا گیا ہے تو دوسرے اعتبار سے سارے اسلامی علوم قرآن ہی کی تفسیر قرار دیے جاسکتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھیے تو عمل کے بارے میں قرآنی تعلیمات کو منظّم انداز میں پیش کرنے کی ایک مثال فقہ ہے۔ سو فقہ کی ''اصل'' یا اوّلین مأخذ بھی قرآن ہی ٹھہرتا ہے۔ قرآنی تعلیمات پر بنیاد رکھ کر اور اس میں حدیث اور دیگر مأخذ سے استفادہ کے ذریعے اضافہ کر کے فقہا نے اسلامی علوم کے ایک بڑے شعبے کی بنا رکھی۔ یہی عمل علمِ عقائد اور اخلاقیات کے میدان میں بھی نظر آتا ہے۔ بعض شعبہ ہائے علم، مثلاً فلسفہ ایسے ہیں جن میں قرآن سے تعلق کچھ ایسا صریح نہیں ہے، تاہم ان کے ضمن میں بھی یہ بہرحال کہا جاسکتا ہے کہ ان علوم کو بھی بنیادی طور پر قرآن ہی کے فیض سے تحریک ملی ہے۔

جدید مغربی دنیا میں صحیفۂ خداوندی کو تہذیبِ نفس، خدا آگاہی اور صحیح اندازِ زیست اپنانے کا وسیلہ جانا جاتا ہے۔ اسلام کے حوالے سے دیکھیے تو قرآن ان سب عناصر کے علاوہ بہت کچھ اور بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ روایتی تعلیم کا اولین مقصد قرآن پڑھنا تھا اور اس کا آغاز بچپن ہی سے کروا دیا جاتا تھا۔ بچوں کے لیے قرآن کے معانی کے فہم کو خاص اہمیت نہیں دی جاتی تھی کہ بالغ افراد بلکہ بڑے بڑے علما تک قرآن کی کلّی معنویت کے چند تراشوں کے فہم کے سوا اور کیا اندوختہ رکھتے ہیں! تعلیم میں اہم بات یہ تھی کہ کلام اللہ کو ازبر کر لیا جائے۔ قرآن کے اصل الفاظ، گفتۂ حق کو زبانی یاد کر لیا جائے، اس طرح کہ کلامِ خداوندی کی تلاوت فطرتِ ثانیہ بن جائے۔

یہاں قارئین کرام کی توجہ اس نکتے کی طرف دلانا ضروری ہے کہ ہم نے اوپر ''تلاوت'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ متنِ قرآن کی تلاوت کی جاتی ہے، اسے محض باآوازِ بلند پڑھنا کافی نہیں ہوتا۔ قرآن کے الفاظ کو احتیاط سے صحیح طور پر ادا کرنا ضروری ہے اور اس حسنِ ادا اور تجوید کے مخصوص قاعدے ہیں۔ اسلامی دنیا میں آپ کو بڑی تعداد ایسے بچوں کی ملے گی جو سارا قرآن یا اس کی درجنوں سورتیں خوش الحانی سے تلاوت کر سکتے ہوں گے، مگر انھیں قرآنی الفاظ کے معانی کا سرے سے کوئی ادراک نہ ہوگا۔ اسلامی دنیا میں یہ قطعاً تعجب یا افسوس کی بات نہیں سمجھی جاتی۔ تعلیم کا آغاز ایک بنیاد استوار کرنے سے ہوتا ہے۔ اس بنیاد پر عمارت اٹھائی جاتی ہے، لہٰذا عمارت کی نیو دیکھ بھال کر مضبوطی سے رکھنا چاہیے۔ کتاب اللہ کو سمجھنے کے لیے بچوں کے آگے پوری زندگی پڑی ہوتی ہے۔ حقیقتاً یہ ہے کہ اگر ایسی دس زندگیاں بھی میسر آ جائیں تو بھی اس کتاب کے معانی کی پوری خبر لانے کے لیے کافی نہ ہوں گی، کیوں کہ یہ خدا کا لافانی اور لامحدود و بے پایاں کلام ہے۔

جدید مغربی دنیا میں اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ بچوں کو اپنی رفتار اور اپنی سطح کے مطابق سیکھنے کا موقع ملنا چاہیے۔ ان کو جو پڑھایا جائے وہ بچگانہ ہونا چاہیے۔ اسلام کے روایتی نظامِ تعلیم میں یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ بچوں میں یاد کرنے کی ایک غیر معمولی صلاحیت ہوتی ہے۔ یہ صلاحیت عطیۂ خداوندی ہے جسے بے کار، مہمل چیزیں پڑھا کر برباد نہیں کرنا چاہیے۔ زندگی یوں ہی لایعنی چیزوں سے پٹی پڑی ہے۔ بچے ان فضولیات سے خود ہی ضرورت بھر استفادہ کر لیں گے۔ رسمی تعلیم کے لیے وہ مقابلتاً نسبتاً تھوڑا سا وقت دے پاتے ہیں، سو اسے اس کام میں صرف ہونا چاہیے جو زندگی میں اہم ترین اور سب سے لازمی چیز ہے، ہدایتِ خداوندی جس پر فلاحِ اخروی کا دارومدار ہے۔

رٹے سے یاد کرنا کوئی مشکل کام بھی نہیں تھا، اچھا استاد اسے ایک دلچسپ چیز بنا دیتا تھا۔ بچے قرآن کو خوش الحانی سے پڑھنا سیکھتے اور اکثر مل کر ایسا کرتے۔ مراد یہ کہ جہاں تک بچوں کا تعلق ہے تو ان کے لیے یہ ایسا ہی تھا، گویا مزے کا ایک ترانہ یاد کر لیا یا کسی خوش آہنگ نغمے کا الاپ سیکھ لیا۔ مل جل کر دہرانے اور آواز میں آواز ملانے کا لطف اپنی جگہ رہتا تھا۔ دنیا بھر میں بچے یہ شغل کیا کرتے ہیں، مگر اسلام میں بچوں کو اپنے یاد کیے ہوئے اس سرودِ خوش آہنگ کا احترام کرنا سکھایا جاتا ہے۔ اس کی مذہبی نوعیت کے پیشِ نظر اسے سرود و صدا نہیں سمجھا جاتا، بلکہ تلاوت کا نام دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ کسی بھی طرح کا کوئی ساز شامل کرنا روا نہیں رکھا گیا حتیٰ کہ تالی کی سنگت کی بھی اجازت نہیں، لیکن تلاوتِ قرآن کی بہرحال اپنی ایک موسیقی ہے، اس کی خوش نوائی سُر سے لبریز ہے کہ انسانی آواز کے صوتی حسن سے بڑھ کر کوئی ساز خوش آہنگ نہیں ہوتا۔

قرآن سے بچوں کو آیندہ علم حاصل کرنے کی ایک پختہ بنیاد فراہم ہو جاتی ہے۔ روایتی نصاب تعلیم میں تدریجاً دیگر مضامین بڑھا دیے جاتے تھے جن کا دارومدار بھی قرآن کے متن ہی پر ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر قرآن کے معانی کا فہم حاصل کرنے کے لیے بچوں کو انبیا کے قصے پڑھائے جاتے۔ قرآن میں بیان ہونے والے قصصِ انبیا کی تفصیلی شکل عام مسلم ثقافت کا مقبول حصہ شمار ہوتی ہے۔ ان مفصل کہانیوں میں قرآن کے علاوہ ہر طرح کے دوسرے مآخذ سے لے کر بہت سا مواد شامل کر دیا جاتا ہے۔ سبھی مسلمان حضرت ابراہیمؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت عیسیٰؑ، سیدنا محمدؐ اور دیگر انبیا کی حکایات سن چکے ہوتے ہیں۔

رسمی تعلیم کی ایک اور سطح پر قرآن فہمی کے لیے عربی صرف ونحو یا گرامر کا جاننا ناگزیر تھا۔ ایک مرتبہ طلبا سارا قرآن یا اس کا کچھ حصہ یاد کر لیتے تو پھر صرف ونحو کے ہر قاعدے کی مثالیں ان کے حافظے میں ثبت ہو جاتیں جس سے اس پیچیدہ موضوع کے فنی مباحث اور باریکیوں پر عبور حاصل کرنا نسبتاً آسان ہو جاتا۔ طالب علم کے رجحان کو دیکھتے ہوئے دیگر مضامین کا تدریجاً اضافہ کیا جاتا، لیکن ایک بات ہمیشہ مدِنظر رہتی کہ رسمی تعلیم کا سب سے لازمی حصہ کلام اللہ کو زبانی یاد کرنا ہے، خواہ اس کے معانی گرفت میں آئیں یا نہ آئیں۔ اسی طرح کلام اللہ کے سب سے لازمی اجزا وہ ہیں جن کو یاد کیے بغیر شعائرِ دین کے بنیادی تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔ زور ہمیشہ ان اعمال پر دیا گیا ہے جو بدن کی حرکت سے انجام پذیر ہوتے ہیں کیونکہ انسانی بدن ہی تو ہر اس انسانی عمل کا ناگزیر سہارا ہے جس میں دل و دماغ دونوں شامل ہوں۔

چوتھی جہت

ہم نے حدیثِ جبرئیل کے آخری حصے پر ابھی تک گفتگو نہیں کی۔ آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ اس حصے میں آنحضرتؐ نے دنیا کے آخری زمانے کی نشانیوں کے بارے میں ایک رمزیہ انداز میں کچھ بیان کیا ہے، مثلاً لونڈی اپنی مالکن کو جنم دے گی۔ بہت سی دیگر احادیث اور بعض قرآنی آیات کا اسلوبِ بیان بھی اسی نوعیت کا ہے۔ یہاں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ یہ جاننا بھی دین کا حصہ ہے کہ زمانے کا ڈھنگ کس طرح بدلے گا اور یہ کیوں کر اپنے خاتمے کو پہنچے گا۔ سو یہ حوالہ بنتا ہے اسلام کے تصورِ تاریخ کا۔ چہار سمتوں کے اقلیدسی استعارے میں زمانہ چوتھی اُور سے عبارت ہے۔ اس نمونے کو سامنے رکھیے تو اسلام کے تصورِ زمان اور تصورِ تاریخ کے بارے میں ''الدین'' کی چوتھی جہت کے طور پر غور کیا جا سکتا ہے۔ ہستیِ انسانی کی مختلف سمتوں اور جہتوں سے زمانے کا کچھ نہ کچھ تعلق تو ہے ہی کہ ہر آدمی کی ایک ابتدا ہے اور ہر کسی کو اپنی انتہا کو پہنچنا ہے۔

اس کتاب کا بڑا حصہ اسلام کی وضاحت پر مشتمل ہے، اسلام بہ معنی تسلیم و اطاعت، از لحاظِ ایمان اور از روئے احسان۔ اختتامی حصے میں ہم البتہ اسلام کے تصورِ تاریخ سے برآمد ہونے والے چند نتائج پر نظر ڈالیں گے، تاہم یہ بحث ان جدید کتبِ تاریخ میں پائی جانے والی تاریخ سے بالکل الگ ہوگی جن کا تصورِ کائنات سر تا سر عقلیت پرستی کا اسیر ہے۔ اور عقلیت پرستی بھی اس قبیل کی جو حال ہی میں نمودار ہوئی ہے۔ ہمارے نقطۂ نظر سے تاریخ میں معنویت قدرتِ خداوندی کے حوالے سے پیدا ہوتی ہے، اسی سے ہمارے آغاز و ابتدا کا بامعنی بیان میسر آتا ہے اور اسی سے ہمارے حال و انجام پر حکم لگایا جا سکتا ہے۔

حصّہ اوّل

اسلام

اسلام

عربی میں ''اسلام'' کے معنی ہیں ''تسلیم کرلینا، اپنا آپ سپرد کردینا، سرافگندگی، کسی چیز کو مان کر قبول کرنا۔'' دینی اصطلاح میں کہیے تو اسلام اللہ کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے یا منشائے خداوندی کے سامنے جھک جانے کا ہم معنی ہے۔ لگ بھگ ستر آیات میں قرآن نے یہ لفظ یا اس سے بننے والے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ان میں سے صرف چند آیات کے بارے میں یہ دعویٰ ہوسکتا ہے کہ ان میں ''اسلام'' کا لفظ اپنے خاص معنی میں آیا ہے، یعنی اس سے مراد وہ دین ہے جو قرآنِ مجید اور سیدنا محمدؐ کی وساطت سے اس دنیا میں قائم ہوا۔

صفحاتِ سابق میں ہم یہ عرض کر چکے ہیں کہ قرآن و حدیث میں ''دین'' کا لفظ گوناگوں معانی میں استعمال ہوا ہے۔ اسلامی روایت اور قرآن میں اہم الفاظ کے استعمال کے سلسلے میں یہ ایک عام بات ہے۔ لوگوں کے مابین اکثر اسی کارن غلط فہمی جنم لیتی ہے کہ وہ ایک مشترک لفظ بول کر یہ سمجھتے ہیں کہ شاید وہ ایک ہی حقیقت کے بارے میں بات کررہے ہیں، جب کہ اصل میں ان کے درمیان صرف لفظوں کا اشتراک ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر جب غیر مسلم حضرات اسلام کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے ان کی مراد دینِ محمدی ہوتا ہے۔ مسلمان بھی اس لفظ سے اسی طرف اشارہ کرتے ہیں، تاہم ان کے ذہن میں اکثر اس اصطلاح کے دیگر مفاہیم بھی موجود ہوتے ہیں۔ اس طرح ایک دوسرے کی بات سمجھنے میں دشواری پیدا ہوجاتی ہے۔

''اسلام'' کے وسیع اور سب سے عام معنی ''اللہ کے سامنے سرافگندگی و اطاعت'' کے ہیں جو ہستی کی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ اگر یہ بات مان لی جائے کہ صحیح معنی میں حقیقی ہستی صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے، وہی اصل میں حقیقی ہے اور اسی کو حقیقت کہنا زیبا ہے تو پھر اس کے سوا ہر چیز اصل میں حقیقی نہ ہوگی۔ بالفاظِ دیگر، اس کے سوا ہر شے اپنی حقیقت کے لیے اس کی محتاج ہے۔ بات کو فلسفیانہ انداز میں کہنے کی بجائے اگر کلامی زبان میں بیان کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ دنیا اور دنیا کی ہر چیز اللہ کی تخلیق ہے۔ اللہ ہی نے کائنات اور اشیائے کائنات کو اس طور بنایا ہے، لہٰذا ان کا دارومدار مکمل طور پر اللہ ہی کی ذات پر ہے۔ بنابریں ہر شے اللہ کے سامنے سرافگندہ اور اُس کی مطیع ہے۔

مندرجہ ذیل آیات میں سے اوّلین آیت کا ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں۔اس میں اسلام کا لفظ اپنے وسیع اور عام معنی میں استعمال ہوا ہے۔آیت اس بات کا بیان ہے کہ سچا دین صرف اللہ ہی کا دیا ہوا اور قائم کیا ہوا ہے۔دیگر آیات میں قرآن کا یہ نقطۂ نظر بیان ہوا ہے کہ عالمِ طبیعی کی ہر شے اللہ تعالیٰ کی حمد اور تسبیح کرتی ہے۔تمام مخلوقات اپنی زبانِ ہستی سے، محض اپنے ہونے سے ہی، اپنے خالق کی عظمت اور تمجید کا مظاہرہ کررہی ہیں اور اس طرح وہ عمل سرانجام دے رہی ہیں جس سے ان پر اللہ کی حاکمیت کا اثبات ہورہا ہے:

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعاً وَّ كَرْهاً وَ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ (۳:۸۳)	اب کیا یہ اللہ کے دین کے سوا کچھ اور دین ڈھونڈتے ہیں؟ حالانکہ زمین و آسمان میں جو کوئی ہے، اسی کے حکم میں ہے، خوشی سے یا زور سے، خواستہ یا ناخواستہ، اور اسی کی طرف لوٹ جائیں گے۔
اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ (۲۴:۴۱)	تو نے دیکھا نہیں کہ جو کوئی بھی ہیں آسمان و زمین میں اور پر کھولے ہوئے اڑتے جانور سب اللہ کی یاد کرتے ہیں۔
اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ (۲۲:۱۸)	تو نے دیکھا نہیں کہ جو کوئی آسمان میں ہے اور جو کوئی زمین میں ہے اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ، درخت، جانور اور بہت سے آدمی بھی، اللہ کو سجدہ کرتے ہیں

غور فرمائیے کہ یہاں ذکر ہے ''کثیر من الناس''، یعنی انسانوں میں سے بہتیرے لوگوں کے سجدہ کرنے کا۔اس کا مطلب ہے کہ بہت سے لوگ اس کے سامنے نہیں جھکتے۔ایک نقطۂ نظر سے دیکھیے تو بنی نوع انسان بھی ''ارض وسما'' میں شامل ہیں، مخلوق خداوندی ہیں اور اس کے مطیع وفرمانبردار ہیں، جب کہ دوسرے اعتبار سے وہ بااختیار ہیں کہ اللہ کی اطاعت سے روگردانی کرلیں۔یہ ایک بڑا معما ہے۔اسی سے انسان کے مسائل جنم لیتے ہیں۔آدمی درخت اور پہاڑ کی مانند نہیں ہوتا کہ امر خداوندی کو قبول کرلے اور اس کے بارے میں کچھ نہ سوچے۔انسانوں کو ہر دم اپنی آزادیِ انتخاب اور اختیار کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔انھیں اگر کوئی کسی بات کا حکم دیتا ہے تو وہ ماننے یا انکار کرنے کے مابین

چناؤ کر سکتے ہیں، خواہ حکم دینے والا ربِّ کائنات ہو، والدین ہوں، حکومت وقت ہو یا کوئی اور۔ اگر انسان کے سامنے بساطِ احکامات میں سے انتخاب کی آزادی نہ ہوتی تو پھر سب سہل تھا کہ اس صورت میں کسی دوسری راہِ عمل کا تصور کرنے کی گنجایش ہی نہ رہتی۔

مذکورہ آیت میں قرآن نے ''انسانوں میں سے بہت سے لوگوں'' کے اللہ کے سامنے جھک جانے کا ذکر کیا ہے۔ انھیں قرآن نے اکثر ''مسلم'' کے لفظ سے یاد کیا ہے، یعنی وہ لوگ جو منشائے خداوندی کے سامنے جھک گئے۔ عام طور پر ''مسلم'' کے معنی اس شخص کے ہوتے ہیں جو قرآن کے لائے ہوئے دین کا پیروکار ہو، لیکن قرآن کے حوالے سے دیکھیے تو اس سے ان لوگوں کی طرف اشارہ مقصود ہوتا ہے جو اللہ کے نبیوں، رسولوں میں سے کسی ایک کی پیروی کرتے ہیں۔ درج ذیل آیات دیکھیے:

اِذۡ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسۡلِمۡ قَالَ اَسۡلَمۡتُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ (۲:۱۳۱)	جب اس کے رب نے اس سے کہا، حکم بردار ہو جاؤ۔ وہ بولا، میں پروردگار جہان کے حکم میں آیا۔
اَمۡ كُنۡتُمۡ شُهَدَآءَ اِذۡ حَضَرَ يَعۡقُوۡبَ الۡمَوۡتُ اِذۡ قَالَ لِبَنِيۡهِ مَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِىۡ قَالُوۡا نَعۡبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖۚ وَّنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ (۲:۱۳۳)	کیا تم اس وقت حاضر تھے جب یعقوب کی موت سامنے آ کھڑی ہوئی اور انھوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ تم میرے بعد کس کی پرستش کرو گے؟ وہ بولے کہ ہم بندگی کریں گے۔ آپ کے رب کی اور آپ کے باپ دادوں، ابراہیم واسمٰعیل واسحٰق کے رب کی، وہی ایک رب۔ ہم اس کے حکم پر ہیں۔
وَاِذۡ اَوۡحَيۡتُ اِلَى الۡحَوَارِيّٖنَ اَنۡ اٰمِنُوۡا بِىۡ وَبِرَسُوۡلِىۡ ۚ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا وَاشۡهَدۡ بِاَنَّنَا مُسۡلِمُوۡنَ (۵:۱۱۱)	اور جب میں نے حواریوں کے دل میں ڈالا کہ مجھ پر اور میرے رسول پر یقین کرو۔ بولے کہ ہم ایمان لائے اور تو گواہ رہ کہ ہم مسلمان ہیں۔

تمام انبیا منشائے ایزدی کو تسلیم کرنے والے اور اللہ کے اطاعت گذار تھے اور اس لحاظ سے ''مسلم'' تھے۔ اسی طرح وہ تمام لوگ جو نبیوں اور رسولوں کے لائے ہوئے ادیان کو مانتے ہیں انھیں مسلمان ہی کہا جائے گا۔ اس کے یہ معنی البتہ نہیں ہو سکتے کہ وہ سبھی قرآن کے بنا کردہ اس دین کے

پیروکار ہیں جو ساتویں صدی عیسوی میں سرزمینِ عرب میں ظہور پذیر ہوا۔ سو اگر اس لفظ کو اس کے خاص معنی میں لیں تو اس سے تاریخ کے اس مظہر کی طرف اشارہ مقصود ہوگا جو ہماری کتاب کا موضوع ہے، یعنی وہ دین جس کا عنوان ''اسلام'' ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ قرآن میں آٹھ مقامات پر لفظ ''اسلام'' آیا ہے۔ ان تمام آیات میں کہیں بھی اسلام کے لفظ سے کسی خاص دین کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا۔ ہر جگہ اس قرآنی اصطلاح کا وسیع پس منظر ملحوظ رہا ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اکثر مسلمان ان آیات سے تاریخی اسلام ہی مراد لیتے ہیں اور ان کی نظر اس لفظ کے وسیع تر معانی کی طرف منتقل نہیں ہو پاتی، لیکن جونہی ان آیات کا قاری اس وسیع سیاق وسباق سے آگاہی حاصل کرتا ہے جو قرآن کا مقصود ہے تو اس پر یہ بات کھلنے لگتی ہے کہ ان آیات کے ایک سے زیادہ معانی ہیں۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَاللّٰهِ الْاِسْلَامُ (۳:۱۹)	دین جو ہے اللہ کے ہاں سو یہی مسلمانی، حکم برداری۔
وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَالْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (۳:۸۵)	اور جو کوئی چاہے حکم برداری کے سوا اور کوئی دین، سو اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔

ان دو آیات میں مذکور الفاظ ''دین'' اور ''الاسلام'' کو کشادہ وتنگ ہر دو معنی میں لیا جا سکتا ہے۔ اکثر مسلمان اس کا مفہوم یہ لیتے ہیں کہ عملِ صحیح اور راست بازی کا اصل پیمانہ وہی ہے جس کو قرآن وحدیث نے مقرر کر دیا۔ دیگر قارئین کی فہم کے مطابق ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ ہر الہامی دین ''اسلام'' کی ایک شکل ہے جیسے تمام انبیا کا پیغام ایک ہی تھا، یعنی ''توحید'' دینِ خداوندی، یعنی تسلیم واطاعت کا پیغام، ''اسلام''، سبھی انبیا اور رسولوں پر نازل کیا گیا۔ اب اگر کوئی شخص اس دینِ خداوندی کو رد کرکے انسانوں کا گھڑا ہوا کوئی نسخہ اپنا لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے قبول نہیں کریں گے۔ انسان کے اختراع کردہ دین کا اللہ کے ہاں رد ہو جانا اور واصلِ جہنم ہونا ایک ہی بات ہے۔

جن آیات میں ''اسلام'' کا ذکر آیا ہے، ان میں سے چند مقامات پر اسے صراحتاً دینِ محمدیؐ ہی کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ آیات میں آپؐ کا ذکر موجود ہے:

يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ (۴۹:۱۷)	تم پر احسان رکھتے ہیں کہ یہ مسلمان ہو گئے۔ کہیے، مجھ پر اپنے مسلمان ہونے کا احسان مت دھرو، بلکہ اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تم کو ایمان کی راہ دکھائی۔

اَلۡيَوۡمَ اَكۡمَلۡتُ لَكُمۡ دِيۡنَكُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ نِعۡمَتِيۡ وَرَضِيۡتُ لَكُمُ الۡاِسۡلَامَ دِيۡنًا (۵:۳)

آج میں پورا دے چکا تم کو دین تمھارا، اور پورا کیا تم پر میں نے احسان اپنا، اور پسند کیا میں نے تمھارے لیے دین، مسلمانی۔

اسی طرح اور بھی کئی آیات ہیں جن میں ''اسلام'' یا ''مسلم'' کے الفاظ سے اشارہ اسلامِ تاریخی ہی کی طرف مقصود ہے۔ ایک آیت میں تو اس لفظ سے مراد ایک اور مفہوم ہے جو دیگر مفاہیم سے بھی محدود تر اور ایک خاص پس منظر کی طرف اشارہ کناں ہے۔ صحرانشین بدو قبائل کے افراد میں سے ایک گروہ نے یہ جان لیا تھا کہ نیا دین ان کے علاقے کی روز افزوں قوت بنتا جا رہا ہے اور اس سے سازگاری پیدا کر کے وہ بہت سے فوائد سمیٹ سکتے ہیں۔ وہ آنحضرتؐ کی خدمت میں پہنچے اور عربوں کے قدیمی انداز میں عہدِ اطاعت کا اعلان کر دیا۔ اب اسلام اپنے ماننے والوں سے کچھ ایسے تقاضے کرتا تھا جو ان بادیہ نشینوں کے لیے سراسر نامانوس تھے۔ ان پانچ ارکان کا ذکر حدیثِ جبرئیل میں آ چکا ہے۔ آنحضرتؐ سے بیعت کرنے کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ عہدِ اطاعت کرنے والا ان عبادات کی پابندی کا وعدہ بھی کر رہا ہے۔ بیعت ہو چکی تو یہ مردانِ صحرا آپؐ سے کہنے لگے کہ وہ اسلام پر ایمان لے آئے ہیں۔ بات یہاں تک پہنچتے ہی گفتگو میں ایک سمت سے روک آ جاتی ہے۔ اللہ کی طرف سے آنحضرتؐ پر وحی آ رہی ہے:

قَالَتِ الۡاَعۡرَابُ اٰمَنَّا قُلۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا وَلٰكِنۡ قُوۡلُوۡۤا اَسۡلَمۡنَا وَ لَمَّا يَدۡخُلِ الۡاِيۡمَانُ فِيۡ قُلُوۡبِكُمۡ وَاِنۡ تُطِيۡعُوا اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ لَا يَلِتۡكُمۡ مِّنۡ اَعۡمَالِكُمۡ شَيۡـًٔا (۴۹:۱۴)

یہ اعرابی گنوار کہتے ہیں ہم ایمان لائے۔ کہیے، تم ایمان نہیں لائے۔ ہاں یوں کہو کہ ہم مسلمان ہوئے۔ رہا ایمان تو اس کا ابھی تمھارے دلوں میں گذر بھی نہیں ہوا۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر چلو گے تو وہ تمھارے اعمال میں سے ذرا بھی کم نہیں کرے گا۔

اس آیت سے بالکل واضح ہے کہ اسلام اور ایمان ایک ہی چیز نہیں ہے۔ تسلیم و اطاعت تو خدا اور اس کے نبی کی فرمانبرداری کا نام ہے، لیکن ایمان اس سے گہری بات ہے، کیونکہ اس کا تعلق علم اور اخلاص فی العمل سے ہے۔ اس پر گفتگو آگے چل کر ہوگی۔ خدا اور اس کے رسول کا حکم ماننا دائرۂ عمل سے متعلق ہے، یہ اوامر و نواہی کی اقلیم ہے۔ آنحضرتؐ لوگوں کے لیے اللہ کی متعین کردہ ہدایات و احکامات لے کر آئے تھے۔ اگر وہ رسولِ خداؐ کی اطاعت کرتے ہیں تو اللہ کا حکم بجالاتے ہیں۔ "مَنۡ يُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ

اللّٰہ" (۸۰:٤) (جس نے حکم مانا رسول کا، اس نے حکم مانا اللہ کا) اور اللہ انھیں اس اطاعت کا اجر دے گا۔

لفظ ''اسلام'' کے یہ چوتھے معنی ہمارے اس باب کا موضوع ہیں۔ احادیث میں اس کی تفصیل بہت وضاحت سے موجود ہے، لہٰذا حدیثِ جبرئیل جب ''اسلام'' کی تعریف متعین کرتی ہے تو اس ضمن میں اعمال کی ایک فہرست سامنے آتی ہے، اگر انسان کو اللہ کا حکم بجا لانا ہے تو اُس کے لیے ان اعمال کو انجام دینا لازمی ہے:

> اسلام یہ ہے کہ تم گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور یہ کہ نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو اور اگر وہاں جانے کی استطاعت ہو تو حج بیت اللہ کرو۔

خلاصہ یہ کہ ''اسلام'' کے لفظ کے چار بنیادی مفاہیم ہیں' کشادہ ترین سے لے کر محدود و مخصوص ترین معنی تک۔

۱) تمام مخلوقات کی اپنے خالق کے سامنے سرافگندگی اور تسلیم و اطاعت۔

۲) انسان کا انبیا کے وسیلے سے نازل کردہ ہدایتِ خداوندی قبول کرنا۔

۳) رسولِ خدا کے ذریعے ہمیں جو ہدایتِ خداوندی نصیب ہوئی اسے تسلیم کرنا۔

۴) سیدنا محمدؐ کے پیروکاروں کا اللہ کے نازل کردہ عملی احکامات بجالانا۔

ان میں سے صرف تیسرے مفہوم کو ''اسلامِ تاریخی'' کا مترادف کہا جاسکتا ہے۔

یہ مت جانیے کہ مسلمانوں کے ذہن میں یہ چار مفاہیم اپنا الگ اور واضح مفہوم رکھتے ہیں۔ وہ لوگ جو دینی ماحول میں رہتے ہیں، ان کے ہاں یہ معاملہ اور بھی مبہم ہے۔ مسلمانوں میں یہ بہت عام بات ہے کہ وہ اسلام کو اپنے عمل کا مترادف سمجھتے ہیں اور دیگر ادیان کی عبادات و ارکان کو بھی اپنے اعمالِ دینی ہی کے مشابہ سمجھتے ہیں (کیونکہ سبھی ادیان ''اسلام'' ہیں)۔ اگر دوسرے ادیان میں دینی اعمال کچھ اور طرح کے ہیں تو اس کا سبب لازماً یہ ہے کہ ان میں بگاڑ اور فساد پیدا ہو گیا ہے۔ اسی طرح روایتی مسلمانوں میں یہ خیال بھی عام ہے کہ ان کے مراسمِ دینی ہی کائنات کے سب سے فطری اور معیاری دینی عمل ہیں، کیونکہ وہ بھی عالمِ مخلوقات کی ہر شے کی طرح دائماً مصروفِ اطاعت ہیں کہ ''زمین و آسمان میں جو کچھ ہے وہ اسی کا مطیع و فرمانبردار ہے۔'' بالفاظِ دیگر یہ کہیے کہ اس اصطلاح کے مختلف معانی آپس میں گتھے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے میں یوں باہم مدغم ہیں کہ ان معانی کو جدا کرنا ہمیشہ آسان نہیں ہوا کرتا۔[۲۲]

ارکانِ دین

ستون سہارا دیتا ہے۔ اس پر عمارت استوار کی جاتی ہے۔ عمارت دینِ اسلام ہے اور اس کی تین جہتیں ہیں۔ اگر اسلام کے پانچ بنیادی ارکان کو ''ستون'' کہا گیا ہے تو اس میں مضمر یہ ہے کہ ہر دوسری چیز کی بنا انھی ستونوں پر رکھی گئی ہے۔

عمل: اطاعت کی تجسیم

فعل و عمل جسم کا خاصہ ہے۔ حقیقت کی دنیا میں ہمارا تعین ہمارے جسم سے ہوتا ہے اور اس کی حدود اتنی وسیع ہیں کہ ایسے لوگ آپ کو ہمیشہ مل جائیں گے جن کا دعویٰ ہے کہ انسان کا بدن ہی ہستی کا حاصل ہے، اس کے علاوہ دنیا میں اور رکھا کیا ہے۔ اہمیت ہے تو اسی کی۔ قرآنِ مجید نے بسا اوقات اس قبیل کے لوگوں کی تنقید کا حوالہ دیا ہے۔ ان کی تنقید کا ہدف وہ لوگ تھے جو رسولوں اور انبیا کی پیروی کرتے تھے:

وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۝ اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ۝ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ۝ اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ (۲۳:۳۴-۳۷)

اور اگر کہیں تم اپنے جیسے ایک آدمی کے کہے پر چلے تو تم بے شک خراب ہوئے۔ کیا وہ تم سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ جب تم مر گئے اور مٹی اور ہڈیاں ہو گئے تو تم کو پھر سے نکالا جائے گا۔ کہاں ہو سکتا ہے! کہاں ہو سکتا ہے! یہ جو تم سے وعدہ ہو رہا ہے۔ دنیا میں بس یہی ہمارا جیون ہے۔ مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہم کو پھر اٹھنا نہیں۔

ہستیِ انسان کے لیے اگر جسمِ انسانی کی ایسی گہری اہمیت نہ ہوتی تو لوگ اس انداز میں سوچا نہ کرتے، لیکن ہمارا بدن ہی ان تمام انفرادی خصائص کو متعین کرنے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے جن

سے ہمارا تشخص جنم لیتا ہے۔ اپنے گرد و پیش سے ہمارے رابطے کا آغاز بدن ہی کے وسیلے سے ہوتا ہے۔ حواس اس کا واسطہ بنتے ہیں۔ اگر فلسفی اور علمِ کلام کے ماہرین غیر جسمانی موجودات کا ذکر کرتے ہیں تو بچوں اور ناسمجھ لوگوں کے لیے یہ بے معنی باتیں ہیں۔

معاشرے کی تعمیر ابتدا ہی سے اسلام کے پیشِ نظر رہی ہے۔ اسلام نے ہمیشہ یہ امر ملحوظ رکھا ہے کہ مشترکہ آدرش اگر لوگوں کو آپس میں متحد رکھتے ہیں تو اسی طرح عمل کا اشتراک بھی انھیں ایک دوسرے سے جوڑ دیتا ہے۔ سماجی اعتبار سے اسلام کا کام انسانوں کے عمل میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔

بدن ہر انسان کے لیے ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے، لیکن غیر مادی اور غیر جسمانی موجودات اکثر لوگوں کے لیے ناقابل فہم ہوتی ہیں۔ ان کا سوال ہوتا ہے ''ہمیں دکھاؤ، کہاں ہے یہ؟'' قرآن اس کے جواب میں صرف یہ کہتا ہے کہ نجاتِ اخروی ان لوگوں کو حاصل ہو گی جو ''ان دیکھے پر ایمان لاتے ہیں۔'' اس سطحِ اوّلین پر لوگوں سے غیب کو سمجھنے اور جاننے کا مطالبہ نہیں کیا گیا۔ انھیں صرف یہ ماننا چاہیے کہ عالمِ غیب بھی موجود ہے اور اس لحاظ سے عمل کرنا چاہیے، دین کے پانچ بنیادی ارکان کی پابندی کرنا چاہیے اور وحی کی ہدایت کے مطابق دیگر کام سرانجام دینا چاہییں۔

اکثر لوگوں کے لیے ان کا دین وہی ہوتا ہے جو پیدائشی طور پر ان کو ورثے میں ملا ہوتا ہے۔ اسلام اس بات سے آگاہ ہے کہ عملِ صالح سے لوگ مسلمان بنتے ہیں اور جہاں تک اکثریت کا تعلق ہے، عملِ صحیح ہی سے ایمانِ صحیح پیدا ہوتا ہے۔ مسلمان بچوں کو شاید ہی کبھی عقائد کا آموختہ یاد کروایا جاتا ہوگا۔ انھیں نماز پڑھنے اور دیگر شعائرِ دین کی پابندی کی تلقین کی جاتی ہے۔ وہ طہارت کے اصولوں کو سیکھتے ہوئے پروان چڑھتے ہیں کہ اسی سے بدن کی صفائی کی تربیت ہوتی ہے، نیز بچوں میں یہ بات بھی عام ہے کہ وہ اپنے بڑوں کی دیکھا دیکھی انھی کے طریقوں کی نقل کرتے ہیں اور اس میں مزا لیتے ہیں، سو اکثر اوقات آپ انھیں نماز کی نقل کرتے دیکھیں گے۔ ان کے والدین یا دوسرے افرادِ خانہ عبادت کر رہے ہوں تو وہ بھی شامل ہو جائیں گے۔ کسی کو اس بات کی فکر نہیں ہوتی کہ وہ ادھ بیچ میں نماز چھوڑ کر کھیل کود میں لگ گئے ہیں۔ مقصود صرف اتنا ہے کہ یہ دینی مراسم اور اعمال رفتہ رفتہ ان کے لیے فطری چیز بن کر انسانی ساخت و پرداخت کا جیتا جاگتا حصہ بن جائیں۔

عمل اور کثرتِ عمل پر جو اتنا زور دیا جاتا ہے تو اس کے پسِ پشت یہ احساس کارفرما ہے کہ قرآن ہمارے لیے گوشت پوست اور لہو کا جزو بن جائے۔ صرف اسے پڑھنا یا یہ جاننا کافی نہ ہو کہ قرآن کیا

کہتا ہے بلکہ مسلمان کو پیکرِ عمل ہونا چاہیے اور قرآن کو وہ حقیقت ہونا چاہیے جس سے اُس کے عمل (اسلام) اُس کی فکر (ایمان) اور اُس کی نیت (احسان) کی صحت کا تعین ہوتا ہو۔

رکنِ اوّل: شہادت

ارکانِ دین عمل کا حصہ ہیں، یعنی ان کی تعریف و توضیح بطورِ عمل کے کی گئی ہے اور انھیں عمل کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ آپ مسلمان ہونے کے لیے کیا کرتے ہیں؟ اس سوال کا تعلق نہ تو ایمان کی سطح سے ہے، نہ فکر و فہم سے اور نہ نیت کی معاملے ہی سے۔ اس سطح کے سوالات اسلام کی دوسری یا تیسری جہت کا موضوع ہیں، پہلی کے نہیں۔

رکنِ اوّل وہ بنیادی عمل ہے جس پر تمام اسلامی اعمال کا دارومدار ہے۔ یہ کیا ہے؟ یہ زبان سے اقرار ہے اس بات کا کہ ہم اللہ کی حقیقت اور سیدنا محمدؐ کی نبوّت کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں قرآن جسے سیدنا محمدؐ لے کر آئے، اسے سچا پیغام جانتے ہیں۔ اس رکن کو عربی میں ''الشہادۃ'' کہتے ہیں جس کا مطلب ہے تصدیق کرنا، گواہی دینا، اعلانیہ قبول کرنا۔

قرآن میں اس لفظ ''شہادۃ'' کا استعمال جس طرح ہوا ہے اس سے اس کی معنویت روشن ہو جاتی ہے۔ اس کا مطالعہ دلچسپ ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کے جو نام بیان ہوئے ہیں، ان میں سے ایک ہے۔ ''**عالم الغیب و الشهادة**'' (کھلے اور چھپے کا جاننے والا)۔ غیب کا مطلب ہے ''اوجھل، ان دیکھا، چھپا ہوا، مستور اور غیر مرئی۔'' ''شہادۃ'' اس سیاق و سباق میں ''مشہود، ظاہر اور دیکھے ہوئے'' کے معنی دیتا ہے۔ اسمائے الٰہی میں سے اس لفظ کو برت کر اور دیگر مقامات پر اور کچھ اسالیب کے استعمال سے قرآن حقیقت کو دو اقالیم میں، دو منطقوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ ایک وہ جو ہمارے حواس سے اوجھل اور ان کی گرفت سے باہر ہے اور دوسری اقلیم وہ جس کی شہادت ہمارے حواس کو میسر ہے۔ ہم صرف اپنے جہانِ مشہود کو جانتے ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ غیب اور شہود دونوں کا جاننے والا ہے۔ اقلیمِ غیب میں اللہ اور تمام موجوداتِ روحانی شامل ہیں۔ عالمِ شہادت میں جسم رکھنے والی تمام چیزیں شامل ہیں۔ اللہ تعالی کے ناموں میں سے ایک اور نام ''الشہید'' بھی ہے، یعنی شہادت دینے والا (The Witness) کہ اللہ تعالیٰ وقوع پذیر ہونے والی ہر شے کا شاہد ہے۔ قرآن کا بیان ہے:

وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (٥٧:٤) اور وہ تمھارے ساتھ ہے، جہاں کہیں تم ہو۔

اللّٰهُ شَهِيدٌ عَلىٰ مَايَفْعَلُوْنَ (١٠:٤٦) — اللہ ان کے ہر کیے ہوئے کا شاہد ہے۔

اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ شَهِيْدٌ (٤١:٥٣) — کیا تیرے رب کا ہر چیز پر گواہ ہونا کافی نہیں؟

قرآن میں ''شہادۃ'' کا لفظ اکثر شہادت دینے، گواہ رہنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے، مثلاً لوگوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ جب کوئی شخص قرض لے تو دو گواہ موجود رہیں اور سارے معاملے کو تحریر کر لیا جائے:

ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ (٢:٢٨٢) — اس میں اللہ کے ہاں خوب انصاف ہے اور اس سے گواہی درست رہتی ہے۔

توحیدِ الٰہی کی شہادت یا گواہی دینا مسلمانوں کا سب سے اساسی عمل ہے، اس شہادت کی ادائی انھیں اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کے عمل کا نقش اپنے اندر اتارنے کا موقع فراہم کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور ملائکہ بھی تو شہادت دیتے ہیں۔ اس طرح انسان ان ہستیوں کے زمرے میں شامل ہو جاتا ہے جنھیں علم عطا کیا گیا۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُو الْعِلْمِ قَآئِماً بِالْقِسْطِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (٣:١٨) — اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، اور فرشتوں نے اور علم والوں نے۔ وہی حاکم ہے انصاف والا ہے۔ اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں۔ زبردست ہے حکمت والا۔

اسلام کا رُکنِ اوّل اپنی مختصر شکل میں فقط اتنا ہے کہ آپ دو فقرے اپنی زبان سے ادا کر دیں ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه'' (اللہ کے سوا الٰہ اور کوئی نہیں) اور ''محمدٌ رسُول اللّٰه'' (محمدؐ اللہ کے رسول ہیں)۔ ان دونوں جملوں سے پہلے عموماً ''اشهد ان'' (میں گواہی دیتا ہوں کہ بلا شبہ) کے کلمات شامل کیے جاتے ہیں۔

نظری طور پر تو مسلمانوں کے لیے زندگی بھر میں ایک ہی مرتبہ کلماتِ شہادت کا زبان سے ادا کرنا ضروری ہے، مگر عملاً یوں ہوتا ہے کہ مسلمان ان کلمات کو کثرت سے وردِ زبان رکھتے ہیں۔ کچھ اس لیے بھی کہ یومیہ فرض نمازوں میں بھی ان کلمات کو شامل رکھا گیا ہے۔ روایتی طور پر نوزائیدہ بچے کے کان میں بچے کا والد کلمۂ شہادت پڑھتا ہے گویا بچہ اپنی زندگی کا آغاز ہی دین کے رکنِ اوّل سے کرتا ہے۔ مسلمان ہر طرح کے مواقع پر اس کلمہ کو ادا کرتے ہیں اور بچے کو اوائلِ عمر ہی میں کلمہ پڑھنا سکھا

دیا جاتا ہے۔ یہ توقع کسی کو نہیں ہوتی کہ بچہ کلمۂ شہادت کو سمجھ کر پڑھ رہا ہے۔ کلمہ پڑھنے کا عمل ہی ایک اہم کام ہے۔

کلمۂ شہادت کی اہمیت بہت بنیادی ہے اور اس بات سے عیاں ہے کہ کلمۂ شہادت پڑھنا ہی وہ مذہبی عمل ہے جسے انجام دے کر آپ اپنا آپ اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں، یعنی مسلمان ہو جاتے ہیں۔ اس رسم کو ادا کرتے ہوئے کلمہ عربی میں پڑھنا ضروری ہے، اس نیت سے کہ آپ اللہ کے حضور تسلیم و اطاعت کا اقرار کر رہے ہیں۔ اس عمل کے دو مسلمان گواہ ہونا بھی ضروری ہیں۔ اکثر مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ کلمۂ شہادت کا اعلان و اقرار اس بات کے لیے پوری طرح کافی ہے کہ آپ کو بارگاہِ الٰہی میں بطور مسلمان قبول کر لیا جائے، تاہم اس پر اتنا اضافہ ضروری ہے کہ اگر معاملہ صرف زبان تک محدود ہے تو آپ کا اسلام اخلاص، سچائی اور دیانت سے عاری کہلائے گا۔ کلمۂ شہادت پڑھنے سے باقی چار ارکان آپ پر فرض ہو جاتے ہیں۔ اب اگر آپ ان کے ادا کرنے میں کوتاہی کریں تو آپ کا اسلام نا قابلِ قبول نہ سہی تو ادھورا ضرور ہو گا۔

رکنِ دوم: نماز

کلمۂ شہادت پڑھنا اگرچہ مسلمان کا بنیادی عمل ہے تاہم نماز ادا کرنا ایک اعتبار سے کہیں زیادہ اساسی قرار دیا جا سکتا ہے۔ آنحضرتؐ نے نماز کو ''عماد الدین'' (دین کا مرکزی ستون) کا نام دیا ہے۔ گویا ایک خیمہ ہو جسے درمیان سے ایک اکیلے بانس نے اٹھا رکھا ہو اور اس کے علاوہ جو اڑ واڑ بھی خیمے کو دی گئی ہو، اس کی حیثیت ثانوی ہو۔ قرآن میں اور ہر کام سے بڑھ کر نماز ادا کرنے کا حکم آیا ہے اور احادیثِ نبویؐ سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کے عمل میں نماز اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسند ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ نمازِ باجماعت آج ٹی وی پر اسلام کی علامت کے طور پر دکھائی جاتی ہے۔ ٹی وی کے پروڈیوسر حضرات کے لیے تو شاید اس کی وجہ اتنی ہی رہی ہو گی کہ اس میں ایک مجمع نظر آ جاتا ہے، تاہم مسلمانوں کے لیے نماز ایک ایسا عمل ہے جو اور ہر کام سے بڑھ کر اسلام کو مجسّم کر کے سامنے لے آتا ہے اور دکھا دیتا ہے کہ مسلمان ہونے کا مطلب کیا ہے۔ مسلمانوں نے نماز کو ہمیشہ اسی حیثیت سے جانا ہے۔

قرآن کی دیگر اصطلاحات کی طرح ''**صلوٰۃ**'' کے بھی متعدد مفاہیم ہیں۔ عربی میں اس لفظ کے بنیادی معنی ہیں ''دعا'' یا ''برکت دینا'' (to pray or bless)۔ خدا اور اس کے فرشتے جس طرح شہادت دیتے ہیں، اسی طرح صلوٰۃ بھی ادا کرتے ہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے اتباع میں انسان اللہ کی

وحدانیت کی گواہی دیتے ہیں، اسی طرح اس کی پیروی میں نماز بھی ادا کرتے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ چار اسالیب میں برتا گیا ہے۔ اول: خدا اور ملائکہ ایک صلاۃ بھیجتے ہیں جس سے وہ بندگانِ خدا پر نزولِ برکات و رحمت کرتے ہیں۔

هُوَالَّذِی یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَمَلٰٓئِکَتُهٗ لِیُخْرِجَکُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْر (۳۳:۴۳)

وہی ہے جو تم پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے، تاکہ تم کو اندھیروں سے اجالے میں نکالے۔

دوم: ارض و سما کی تمام مخلوقات 'صلوٰۃ' ادا کرتے ہیں۔ جو گویا کائناتی اسلام کا اظہار ہے۔

اَلَمْ تَرَاَنَّ اللّٰهَ یُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِیْحَهٗ (۲۴:۴۱)

تم نے دیکھا نہیں کہ زمین و آسمان میں جو کوئی ہیں اللہ کی یاد کرتے ہیں اور پر کھولے ہوئے اڑتے جانور۔ ہر ایک نے اپنی طرح کی بندگی اور یاد جان رکھی ہے۔

سوم: ہر ''مسلم'' جو اپنے ارادہ و اختیار سے اسلام لایا، 'صلوٰۃ' ادا کرتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ یہاں اس اصطلاح کا اطلاق مراسمِ عبودیت کی ان مخصوص صورتوں میں سے ایک پر ہوتا ہے جو تمام انبیا پر نازل کی گئیں۔

وَنَجَّیْنٰهُ وَلُوْطاً اِلَی الْاَرْضِ الَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْهَا لِلْعٰلَمِیْنَ ۔ وَوَهَبْنَا لَهٗ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ نَافِلَةً وَکُلاًّ جَعَلْنَا صٰلِحِیْنَ وَ جَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْهِمْ فِعْلَ الْخَیْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَ اِیْتَآءَ الزَّکٰوةِ وَ کَانُوْا لَنَا عٰبِدِیْنَ (۲۱:۷۱-۷۳)

اور ہم اسے اور لوط کو بچا کر اس سرزمین کی طرف لے گئے جس میں ہم نے اہلِ جہان کے لیے برکت رکھی تھی۔ ہم نے اسحٰق اسے بخشا اور یعقوب اسے انعام میں دیا اور سب کو نیک بخت کیا، اور ان کو ہم نے پیشوا بنایا، ہمارے حکم سے راہ دکھانے والے، اور کہہ بھیجا ان کو نیکی کرنے کا، نماز قائم کرنے کا اور زکوٰۃ دینے کا، اور وہ ہماری بندگی میں لگے ہوئے تھے۔

آخرین: لفظ ''صلوٰۃ'' کا سب سے عام استعمال یہ ہے کہ اس سے عبادت کی وہ صورت مراد لی جاتی ہے جو اسلام کا دوسرا رکن ہے یعنی فریضۂ نماز۔ قرآن نے مسلمانوں کو نماز ادا کرنے کا حکم بار بار دیا ہے، مگر نماز پڑھنے کے لیے اصل میں کرنا کیا ہوتا ہے، اس کے بارے میں بہت کم مذکور ہے۔ نماز ادا کرنے کا طریقہ رسولِ خداؐ نے سکھایا۔ سو مسلمان کہیں کے بھی باشندے ہوں، آج بھی نماز بنیادی طور پر اسی طرح ادا کرتے ہیں جیسے آنحضرتؐ نے پڑھی اور جس طرح مسلمانوں کو پڑھنے کی تلقین کی۔ سطورِ ذیل میں ہم نماز ادا کرنے کا عمومی انداز بیان کریں گے۔ اس ضمن میں فقہِ اسلامی کے مکاتبِ فکر میں جو چند معمولی اور ضمنی اختلافات موجود ہیں۔ ان کی طرف یہاں اشارہ ضروری نہیں۔

نماز کی دو بنیادی قسمیں ہیں۔ فرض اور نفل نماز۔ فرض نماز دین کا دوسرا رکن ہے۔ نفل نمازیں مختلف مواقع کے لیے بتائی گئی ہیں۔ فرض نماز دن میں پانچ مرتبہ ادا کی جاتی ہے۔ اس کے اور بھی مواقع ہیں، مثلاً جمعہ کی نماز با جماعت۔ غروبِ آفتاب (جس سے یہودیوں کی طرح مسلمانوں میں بھی دن کا آغاز ہوتا ہے۔) کے بعد اور شفق سے روشنی کے آخری آثار مٹ جانے سے پہلے مغرب کی نماز ادا کی جاتی ہے۔ جو پانچ یومیہ نمازوں میں سے پہلی نماز ہے۔[٢٣]

دوسری رات کی یا عشا کی نماز ہے، جس کے اوقات نمازِ مغرب کے اختتام سے لے کر نمازِ صبح کے وقتِ آغاز تک ہیں۔ نمازِ صبح یا نمازِ فجر کا وقت طلوعِ سحر سے لے کر طلوعِ آفتاب تک رہتا ہے۔[٢٤] چوتھی نماز- ظہر- دوپہر اور سہ پہر کے درمیان پڑھی جاتی ہے۔ دوپہر یا نیم روز وہ ساعتِ آفتاب ہے جب سورج نصف النہار پر ہوتا ہے۔ گھڑی کا آدھا دن اور سورج کا نصف یوم الگ الگ ہوتے ہیں۔ سہ پہر کا تعین اس طرح ہوتا ہے کہ جب کسی چیز کا سایہ اس سے قدرے بڑھ جائے۔ پانچویں نماز یعنی نمازِ عصر کا وقت سہ پہر سے لے کر غروبِ آفتاب تک رہتا ہے۔

ہر نماز کی چند مقررہ رکعتیں ہوتی ہیں۔ شام کی نماز کی رکعتیں تین ہیں۔ نمازِ شب میں چار، نمازِ صبح کی دو، نمازِ ظہر کی چار اور نمازِ عصر کی رکعتیں بھی چار ہیں۔ ہر رکعت کچھ مخصوص افعال، قرآنِ مجید میں سے کچھ حصے کی تلاوت، نیز عربی زبان میں چند روایتی کلمات کی ادائیگی پر مشتمل ہوتی ہے۔

اگر آپ چند لوگوں کو باجماعت نماز پڑھتے دیکھیں تو آپ کے مشاہدے میں مندرجہ ذیل باتیں آئیں گی (ان میں علاقے علاقے کا معمولی سا فرق واقع ہو سکتا ہے)۔ نماز پڑھنے والے سب سے پہلے سیدھے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دو ایک منٹ بعد وہ پشت سیدھی رکھتے ہوئے آدھے دھڑ سے

جھک جاتے ہیں۔ چند سیکنڈ بعد دوبارہ سیدھے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ذرا دیر بعد وہ گھٹنے، ہاتھ اور ماتھا زمین پر ٹیک کر سجدہ کرتے ہیں۔ چند لمحے سجدے کی اس حالت میں رہ کر وہ اٹھ کر بیٹھتے ہیں اور پھر دوبارہ پیشانی زمین پر رکھ دیتے ہیں۔ یوں ایک رکعت ختم ہوئی۔

سجدے سے سر اٹھا کر وہ دوبارہ سیدھے کھڑے ہو جاتے ہیں اور دوسری رکعت کا آغاز کرتے ہیں۔ دوسری رکعت بھی عین پہلی کی طرح ہوتی ہے۔ دوسری رکعت کے آخر میں اٹھ کر کھڑا ہونے کے بجائے وہ بیٹھ جاتے ہیں اور رسولِ خدا اور اہلِ ایمان پر صلوات و سلام پڑھتے ہیں۔ یہاں انھیں کلمۂ شہادت ایک قدرے طویل صورت میں پڑھنا ہوتا ہے۔

نمازِ فجر کا معاملہ ہو تو ان دو رکعتوں کے ساتھ نماز ختم ہو جاتی ہے، اس کے اختتام کے لیے دائیں اور بائیں تحیات و سلامتی کے کلمات ادا کیے جاتے ہیں۔ اگر فجر کے علاوہ کسی اور نماز کا موقع ہو تو دوسری رکعت کے بعد نمازی حضرات تیسری رکعت کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ نمازِ مغرب تیسری رکعت پر ختم ہوتی ہے یعنی بیٹھ کر شہادت، صلوٰۃ اور سلام کے بعد۔ باقی تین نمازوں کی چار رکعتیں ہوتی ہیں۔ ان کی مثال یوں ہے کہ گویا ان میں نمازِ فجر دو مرتبہ دہرائی جاتی ہے۔

نماز کے جس حصے میں سیدھے کھڑے رہتے ہیں، اس میں مسلمان فاتحہ پڑھتے ہیں جو قرآن کی پہلی سورت ہے۔ اس کی سات مختصر آیات ہیں۔ پہلی دو رکعات میں فاتحہ کے علاوہ قرآن کی کوئی دوسری سورت یا کسی سورت کی چند آیات بھی پڑھتے ہیں۔

نماز ادا کرنے کے لیے شرعی طہارت (ritual purity) ہونا ضروری ہے۔ باعمل مسلمانوں کے لیے طہارت ایک معمول کی چیز ہے، کیونکہ اس کا تعلق بدن اور لباس کو خون اور بول و براز سے آلودہ ہونے سے بچانے سے ہے۔ مسلمانوں کے لیے آدابِ طہارت کا تعین طہارتِ شرعی کے قاعدے قانون سے ہوتا ہے۔ بچوں سے اگرچہ بلوغت سے پہلے نماز ادا کرنے کا تقاضا نہیں ہوتا، تاہم اپنے آپ کو صاف ستھرا رکھنے کی تربیت چھوٹے بچوں کو بھی اسی انداز میں دی جاتی ہے جو انھیں شرعی طہارت فراہم کر دے۔ صفائی کا یہ عمل بنیادی طور پر اس بات پر مشتمل ہے کہ بدن سے خارج ہونے والی تمام نجاست کو احتیاط سے بدن پر سے صاف کر دیا جائے۔ بہتر یہ ہوتا ہے کہ صفائی پانی سے کی جائے۔

نجاست (impurity) کی دو بڑی قسمیں ہیں اور اس کے دور کرنے کے لیے طہارت کے دو بنیادی طریقے ہیں، غسل اور وضو۔ غسل کی ضرورت جنسی اختلاط یا مادۂ تولید کے اخراج، حیض، نفاس اور میّت

کے چھونے کے بعد پڑتی ہے۔ جس شخص کے لیے غسل (major ablution) ضروری ہو، وہ نماز ادا نہیں کر سکتا اور اسے مسجد میں داخل ہونے یا قرآنِ مجید کو چھونے سے اجتناب کرنا ہوتا ہے۔ نماز پڑھنے کے لیے ہلکی نجاست سے بھی پاک ہونا ضروری ہے۔ نجاستِ خفیفہ (minor impurity) سونے، بیت الخلا جانے، ریاح خارج ہونے اور دیگر کچھ اور وجوہات سے پیدا ہوتی ہے، اسے دور کرنے کے لیے وضو (minor ablution) ضروری ہے۔

غسل کے لیے سر سے لے کر ایڑی تک سارے بدن کو دھویا جاتا ہے۔ اس طرح کہ کوئی حصہ خشک نہ رہے۔ وضو کے لیے بدن کے کچھ حصوں کو تر کرنے یا دھونے کی حاجت ہوتی ہے۔ اس کی ترتیب کچھ یوں ہے: پہلے ہاتھ، پھر منہ اور ناک، پھر دایاں بازو کہنی تک اور پھر بایاں بازو، سر، کان اور آخر میں دایاں نیز بایاں پاؤں۔ پانی اگر میسر نہ ہو یا بیماری یا کسی دوسری وجہ سے پانی کو چھونا ممکن نہ ہو اور نماز کا وقت آ جائے تو پھر وضو یا طہارت کی ایک سادہ شکل اختیار کی جاتی ہے جو صاف ریت یا پتھر کے استعمال سے انجام دی جاتی ہے جسے تیمّم کہتے ہیں۔ وضو اور غسل ہر دو کی جگہ تیمّم کیا جا سکتا ہے۔

تمام بالغ مسلمانوں پر نماز دن میں پانچ مرتبہ فرض ہے۔ وہ خواتین جو حیض میں ہوں یا بچے کی پیدائش کے بعد نفاس سے گذر رہی ہوں، وہ نماز ادا نہیں کرتیں۔ اگر کوئی شخص بہت ہی بیمار ہو جائے تو اسے نماز معاف ہے۔ ہاں، اگر اس میں اتنی سکت ہے کہ لیٹ کر یا بیٹھ کر نماز پڑھ سکے تو اسے نماز ادا کرنا چاہیے۔

نماز ادا کرنے کے لیے جس طرح وضو یا غسل کے ذریعے بدن کی پاکیزگی ضروری ہے، اسی طرح لباس اور جائے نماز بھی پاک ہونا چاہیے۔ کپڑے اگر انسانی یا حیوانی فضلے، پیشاب، منی اور خون سے آلودہ نہ ہوں تو ان کو پاک مانا جاتا ہے۔ آنحضرتؐ کی سنت کی پیروی میں مسلمان مرد پیشاب کی حاجت بیٹھ کر رفع کرتے ہیں تاکہ بدن اور لباس پر چھینٹ نہ پڑے۔ اگر لباس ناپاک ہو جائے تو اسے نماز کے لیے استعمال کرنے سے پہلے دھو کر نچوڑ دیا جاتا ہے۔

اسی طرح نماز پڑھنے کی جگہ بھی پاک رکھی جاتی ہے۔ مسلمان عام طور پر اپنے گھر پاک صاف رکھتے ہیں، اس لیے (مشرق بعید کے لوگوں کی طرح) وہ گھر میں داخل ہوتے ہوئے جوتے اتار دیتے ہیں۔ وہ گھر میں آزادی سے ہر پاک جگہ نماز ادا کر لیتے ہیں۔ گھر میں یا بیرونِ خانہ اگر کسی جگہ کے پاک ہونے میں شبہ ہو یا وہ جگہ پاک نہ ہو تو اس پر کپڑے کا ٹکڑا یا نماز کا غالیچہ یا جائے نماز بچھا لی

جاتی ہے۔ جسے نماز کے بعد تہ کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔ ایسے کپڑے یا غالیچے کو "سجّادہ" کہتے ہیں جس کا مطلب ہوتا ہے "بکثرت سجدہ کرنے کی جگہ۔"

عالمِ طبیعی کو از روئے تعریف پاک گردانا جاتا ہے، چنانچہ مسلم ممالک میں آپ کو سڑک کے کنارے کھیتوں میں نماز پڑھتے ہوئے لوگ عام نظر آتے ہیں۔ ناپاک کپڑے یا قالین کو پاک کرنے کا عام طریقہ تو دھونا ہی ہے، تاہم اگر نجس چیز کو صاف کر دیا گیا ہو تو ایسے کپڑے یا قالین کو دو تین دن تک دھوپ میں رکھنا بھی اسے پاک کر دیتا ہے۔

نماز کو جماعت سے پڑھنے کی بہت تاکید کی گئی ہے۔ آنحضرتؐ کے فرمان کے مطابق جماعت کی نماز کا تنہا نماز کے مقابلے میں ستر گنا زیادہ ثواب ہوتا ہے۔ جماعت کی تعریف یہ ہے کہ دو یا دو سے زیادہ لوگ مل کر نماز ادا کریں، چنانچہ میاں بیوی یا ماں بچہ مل کر جماعت کر سکتے ہیں، تاہم جماعت جتنی بڑی ہو اتنی ہی بہتر سمجھی جاتی ہے۔ یہ چیز اسلامی عبادات کے سماجی پہلو کے عین مطابق بھی ہے۔

اسلامی معاشرے میں اس جگہ کو "مسجد" کا نام دیا گیا ہے جہاں جماعت سے نماز ادا کی جاتی ہے۔ مسجد کے معنی ہیں "سجدہ کرنے کی جگہ۔" عبادت کے اس مشترکہ مرکز کو "سجدہ گاہ" اس لیے کہتے ہیں کہ سجدے کو نماز کا عروج جانا گیا ہے۔ یہ اللہ کے حضور بندے کی غایتِ تسلیم، اطاعت اور سرافگندگی کی علامت ہے۔

مردوں کے لیے ہفتے میں ایک مرتبہ جمعہ کی نماز باجماعت کے لیے مسجد جانا لازمی ہے۔ یہ نماز جمعہ کے دن ظہر کی نماز کی جگہ ادا کی جاتی ہے۔ عورتوں پر اس کی پابندی نہیں ہے۔ اہلِ تشیع کے ہاں جمعہ کی نماز واجب نہیں مانی جاتی۔ وہ اسے مندوب کہتے ہیں۔

ایک روایتی اسلامی معاشرے میں زندگی کرنے کا انداز پانچ یومیہ نمازوں سے متعین ہوتا ہے۔ آج بھی کسی اسلامی شہر میں جایئے تو اس لحن اور آہنگ کا احساس اذان سے ہوتا ہے جو ہر مسجد سے اہلِ ایمان کو نماز کے لیے بلانے کے لیے بلند ہوتی ہے۔ اذان کا پہلا فقرہ چار مرتبہ اور آخری فقرہ ایک مرتبہ دہرایا جاتا ہے۔ باقی ساری اذان دو مرتبہ دوہرائی جاتی ہے۔

اللہ سب سے بڑا ہے

میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں

میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں

لپکو نماز کی طرف
لپکو فلاح کی طرف
اللہ سب سے بڑا ہے
اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں

صبح کی اذان میں ''نماز نیند سے بہتر ہے'' کا فقرہ ''لپکو فلاح کی طرف'' کے بعد بڑھا دیا جاتا ہے۔

اذان دینے والے، یعنی مؤذن کا انتخاب خوش آواز اور بلند آہنگ ہونے کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ روایتی شہروں میں بہت سی مسجدیں ہوتی ہیں اور ایک دوسرے سے ان کا فاصلہ بھی زیادہ نہیں ہوتا، چنانچہ اذان کے وقت خوش الحان آوازوں کا ایک سازینہ گونج اٹھتا ہے۔ ہر آواز ایک دوسرے سے قدرے مختلف لے اور آہنگ میں اذان پکارتی ہے۔ صبح کی اذان کے وقت یہ سماں اور بھی دلآویز اور اثر انگیز ہوتا ہے کہ اذانِ سحر کے سوا سارا شہر خاموشی میں ڈوبا رہتا ہے۔

فی زمانہ مسجدوں کے کرتا دھرتا حضرات کی اکثریت حس تناسب اور احساسِ جمال سے عاری ہوتی جا رہی ہے۔ آج مسجدوں کے مینار سے خوش نوا آوازوں کی نو بہ نو صدائیں کان میں نہیں پڑتیں۔ لاؤڈ سپیکر کا شور اٹھتا ہے۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ ہر مسجد سے ایک ہی مؤذن کی ریکارڈ کی ہوئی آواز نشر کر دی جاتی ہے۔ مؤذن کیسا ہی خوش الحان کیوں نہ ہو، لاؤڈ سپیکر کے کارن حسنِ آواز کے بہترین نمونے بھی برباد ہو جاتے ہیں۔ اذان ایک الیکٹرونک مجبوری کی طرح ہم پر تھوپ دی جاتی ہے جو مسافروں کے لیے بھی خاصی بدمزگی کا باعث بنتی ہے اور ان مقامی لوگوں کے حسنِ سماعت پر بھی گراں گذرتی ہے جو ابھی ذوقِ سماعت سے محروم نہیں ہوئے۔

مسلمان کی زندگی میں نماز کی اہمیت کے بارے میں کہنے کو بہت کچھ ہے۔ یہاں ہم صرف اتنا عرض کریں گے کہ نماز کی پابندی سے انفرادی اور اجتماعی نفسیات پر ایک گہرا اثر مرتب ہوتا ہے۔ وہ معاشرہ جس میں لوگوں کی اکثریت دن میں پانچ مرتبہ اللہ کے سامنے حاضر ہوتی، ہو اس کا روپ رنگ ایسے معاشرے سے قطعی مختلف ہوتا ہے جس کے لوگوں کی زندگی میں خدا کا کوئی حصہ نہ ہو، ان کے پاس خدا کے لیے وقت نہ ہو یا جس معاشرے میں مذہب ایک نجی، ذاتی معاملہ ہو یا دینی معاملات کے لیے ہفتے میں صرف ایک دن رکھا گیا ہو۔ حدیثِ ذیل میں نماز کے اثرات کو نہایت ایجاز سے بیان کیا گیا ہے۔

رسولِ خدا نے فرمایا: ''اگر کسی کے گھر کے سامنے دریا بہتا ہو اور وہ دن میں پانچ مرتبہ اس میں نہائے تو بتاؤ کہ کیا اس کی کوئی گندگی باقی رہ جائے گی؟'' لوگوں نے جواب دیا: ''اس کی کوئی کثافت باقی نہ رہے گی۔'' آپ نے فرمایا: ''پانچ نمازوں کی مثال یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ گناہوں کو ان نمازوں سے دھو ڈالتا ہے۔''[٢٥]

تیسرا رکن: زکوٰۃ

زکوٰۃ انسان کے مال یا منافع میں سے ایک مخصوص فیصد حصہ ہر سال محتاجوں کو ادا کرنے کا نام ہے۔ قرآن کے مطابق (٩:٦٠) آٹھ طبقوں کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے — فقرا، مساکین، عاملینِ زکوٰۃ، جن کو اسلام کی طرف مائل کرنا ہو ان کی تالیفِ قلوب کی خاطر، قیدی، مقروض، راہِ خدا کے مجاہدین اور مسافر۔ زکوٰۃ وصول کرنے کے قوانین و احکامات خاصے مفصل ہیں۔ آپ کے اموال کی نوعیت کیا ہے اور اس کے حصول کی شرائط کیا ہیں؟ ان سب باتوں کو مدِّنظر رکھتے ہوئے زکوٰۃ کی شرح اڑھائی فیصد سے دس فیصد تک ہو سکتی ہے۔

زکوٰۃ کے لفظ کے اصلی معنی ''پاک کرنے'' کے ہیں۔ زکوٰۃ میں یہ تصور مضمر ہے کہ لوگ اپنی دولت کا کچھ حصہ اللہ کی نذر کریں اور یوں ان کا مال پاک ہو جائے۔ وضو بدن کو پاک کرتا ہے، نماز نفسِ انسانی کو پاکیزگی عطا کرتی ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ ہمارے اموال و املاک کو پاک کر کے اسے اللہ کے لیے پسندیدہ بنا دیتی ہے۔

زکوٰۃ معاشرے سے متعلق ایک چیز ہے۔ اس کی سماجی اہمیت واضح ہے۔ انفرادی اموال کا تزکیہ تبھی ہوتا ہے جب اس سے ایک فرد دوسروں کے کام آتا ہے۔ زکوٰۃ ادا کرنا ہو تو گرد و پیش میں بسنے والے دوسرے لوگوں کی خبر رکھنا پڑتی ہے اور محتاجوں ضرورت مندوں کی تلاش کرنا ضروری ٹھہرتا ہے۔ زکوٰۃ کی طرح نماز کی بھی ایک سماجی معنویت ہے، لیکن نماز کے لیے پڑھنا ضروری ہے۔ دوسرے کے ساتھ مل کر پڑھنا لازم نہیں۔ اس کے برعکس زکوٰۃ کا دارومدار سراسر سماجی لین دین پر ہے۔ کوئی فرد اپنے آپ کو تو زکوٰۃ ادا نہیں کر سکتا۔

زکوٰۃ ادا کرنے کا انحصار صرف زکوٰۃ کے مستحق لوگوں کے حالات پر ہی نہیں ہوتا اس کا تعلق زکوٰۃ دینے والے کے حالات سے بھی ہے۔ بالفاظِ دیگر زکوٰۃ اسی وقت ادا ہو گی جب اس کی شرائط پوری ہوں گی۔ صاحبِ نصاب کے پاس مال ہو گا، منافع ہو گا جبھی زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ یہ شرائط پوری نہ

ہوں تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ اپنی ضرورت کو پسِ پشت ڈال کر انفاق اور صدقہ کرنا یقیناً تعریف کی بات ہے لیکن یہ زکوٰۃ نہیں کہلائے گی کہ اس کے لیے شریعت کی بتائی ہوئی شرائط پوری نہیں ہوئیں۔

زکوٰۃ پر اس لحاظ سے نظر کیجیے تو اس بات کی مثال سامنے آتی ہے کہ اسلام اپنی ترجیحات کس طرح قائم کرتا ہے۔ کچھ چیزیں مطلقاً لازم ہیں جیسے کلمۂ شہادت اور نماز۔ دیگر امور حالات پر منحصر ہیں جیسے زکوٰۃ۔ غور کیجیے تو واضح ہوگا کہ لازمی اور واجب امور کا تعلق فرد سے ہے کہ ہر طرح کے حالات میں ایک ہستی، ایک فرد تو بہر حال موجود رہتا ہے جو اپنے رب کے روبرو کھڑا ہے۔ جو امور ثانوی حیثیت رکھتے ہیں، ان کا تعلق معاشرے سے ہے۔ کیونکہ یہ لازم تو نہیں ہے کہ ہر شخص ایک خاص سماجی ماحول کا حصہ ہو۔ خلاصہ یہ کہ اسلام کا تقاضا ہم سے یہ ہے کہ پہلے ہم اپنے آپ کو درست کریں۔ یہ کر چکیں تو پھر معاشرے کے دوسرے لوگوں کی طرف دیکھنے کی نوبت آئے گی اور وہ بھی اللہ کی دی ہوئی ہدایات کی روشنی میں۔

مختصر یہ کہ اللہ سے سچا تعلق قائم کرنا ہمارے لیے اولیت رکھتا ہے اور اس کا آغاز فرد کی ذات سے ہوتا ہے۔ صحت مند معاشرہ تبھی جنم لے گا جب اس کے افراد تندرست ہوں گے۔ معاشرے کی تعمیر افراد سے ہوتی ہے، اس لیے اسلام فرد پر اپنی توجہ مرکوز رکھتا ہے، تاہم اگر فرد کو مذہب کے پیمانے پر پورا اترنا ہے تو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ کسی نہ کسی حد تک سماجی ذمہ داری بھی قبول کرے۔ حضورؐ نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ ''نکاح نصف دین کے برابر ہے''۔ اس میں یہی اشارہ ہے کہ خاندان وہ خشتِ اوّل ہے جو معاشرے کی تعمیر کے لیے رکھی جاتی ہے۔ خاندان کی صحت کی شرط یہ ہے کہ افرادِ خانہ صحت مند ہوں اور اگر خاندان کی صحت اچھی ہوگی تو معاشرے کی صحت اچھی رہے گی۔

رکن چہارم: روزہ

دین کا چوتھا رکن یہ ہے کہ ''رمضان کے مہینے میں روزہ رکھا جائے۔'' رمضان اسلامی تقویم کا نواں مہینہ ہے۔ اسلامی سال قمری تقویم کے مطابق چلتا ہے۔ اس میں ۳۵۵ دن ہوتے ہیں۔ ہر ماہ کے ۲۹ یا ۳۰ دن ہوتے ہیں۔ مہینہ ۲۹ کا ہوگا یا ۳۰ کا۔ اس بات کا فیصلہ چاند ''دیکھنے'' سے کیا جاتا ہے۔ اسی سے یہ بات واضح ہوگی کہ ہمارے ہاں روز وشب کا آغاز غروبِ آفتاب سے کیوں کیا جاتا ہے۔ افقِ مغرب پر نیا چاند غروبِ آفتاب کی ساعت میں نظر آتا ہے اور پھر ڈوب جاتا ہے۔ اگر مطلع

ابر آلود ہو اور لوگوں کو ماہِ نو کے آغاز کے لیے دنوں کا حساب کرنا پڑے تو گذرے ہوئے مہینے کو ۳۰ دن کا شمار کیا جاتا ہے۔

رمضان کا آغاز اس روز سے ہوتا ہے جب چاند دیکھا جائے یا پھر گذشتہ مہینے کے تیس دن پورے ہو جائیں۔ روزے کا آغاز اگلی صبح طلوع سے پہلے ہوتا ہے۔ طلوعِ سحر کی تعریف یہ ہے کہ افقِ مشرق پر اجالے کے آثار ظاہر ہو جائیں یا قدرتی روشنی میں آپ سفید اور سیاہ ڈوری میں امتیاز کرنے کے قابل ہو جائیں۔ یہ اذانِ صبح کا وقت ہوتا ہے، یعنی افق سے آفتاب ابھرنے سے لگ بھگ ڈیڑھ گھنٹہ قبل۔ سورج غروب ہونے کے ساتھ ہی روزے کا وقت بھی ختم ہو جاتا ہے، یعنی اذانِ مغرب کے ساتھ روزہ کھل جاتا ہے۔

کھانے پینے سے گریز، تمبا کو نوشی سے اجتناب اور جنسی عمل سے الگ رہنے کا نام روزہ ہے۔ بلوغت کی عمر کو پہنچنے والے ہر مسلمان پر روزہ فرض ہے۔ روزہ نہ رکھنے کے کئی جائز، قابلِ قبول عذر ہو سکتے ہیں جیسے بیماری اور سفر۔ حاملہ خواتین اس رخصت سے فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔ ایامِ حیض میں روزہ رکھنا ممنوع ہے۔ جو روزے چھوٹ جائیں، ان کے لیے، بعد میں کسی بھی وقت، قضا روزہ رکھنا ضروری ہے۔ اس کے لیے روزہ دار کوئی بھی دن چن سکتا ہے۔

رمضان وہ زمانہ ہے جب خوش اطواری اور حسنِ عمل کا خاص دھیان رکھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر آنحضرتؐ نے فرمایا: ''روزہ دار کا روزہ پانچ چیزوں سے ٹوٹ جاتا ہے۔ جھوٹ، غیبت، بہتان، جھوٹی قسمیں کھانا اور بدنظری۔'' بالفاظِ دیگر ایک ایسے وقت میں جب کچھ جائز کام بھی ممنوع ہو چکے ہوں، ایسے اعمال روزہ دار کا روزہ اکارت کر دیتے ہیں جن کی عام دنوں میں بھی ہمیشہ مناہی کی گئی ہو۔

رمضان ایک قمری مہینہ ہے۔ اس حوالے سے چند دلچسپ امور کی طرف ہم توجہ دلانا چاہتے ہیں۔ خزاں اور بہار کے ان دنوں کے سوا جب شب و روز کے گھنٹے برابر ہوتے ہیں، روئے زمین پر مختلف مقامات پر سال کے مختلف ایام میں دن کی لمبائی الگ الگ ہوتی ہے۔ جون میں دن کی روشنی شمالی نصف کرۂ ارض میں دیر تک رہتی ہے۔ اس کے مقابلے میں جنوبی کرۂ ارض میں دن چھوٹا ہوتا ہے۔ اب آپ دیکھیے کہ کیا کوئی شمسی مہینہ ایسا ہو سکتا ہے جس میں دنیا میں ہر جگہ کے مسلمان ایک ہی جتنا لمبا روزہ رکھیں؟ یہاں یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ اسلام سے پہلے عربوں کی شمسی تقویم (کیلنڈر) یوں چلتی تھی کہ قمری کیلنڈر میں ہر تین سال بعد ایک مہینہ بڑھا دیا جاتا تھا ویسے ہی جیسے یہودی کیلنڈر میں

آج بھی کیا جاتا ہے، لیکن اگر آپ قمری مہینوں کے حساب سے روزہ رکھیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تمام مسلمان جو تینتیس سال تک روزے رکھتے رہے ہوں، ان کے روزہ رکھنے کی مجموعی مدت بالکل یکساں ہوگی خواہ وہ کسی بھی جگہ کے رہنے والے ہوں۔ قمری سال کی وجہ سے رمضان ہر شمسی سال میں لگ بھگ گیارہ دن آگے بڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۹۸ء سال عیسوی میں اگر یکم رمضان بیس دسمبر کو واقع ہوا تو اگلے سال ۱۹۹۹ء میں پہلا روزہ نو دسمبر کو پڑے گا اور سن دو ہزار میں نومبر کی ۲۸ تاریخ کو۔ اسی طرح آئندہ کا حساب کیا جا سکتا ہے۔ دنیا کے شمالی عرض بلد کے باسیوں کو دسمبر میں اگر آٹھ نو گھنٹے کا روزہ رکھنا ہوتا ہے تو انھی لوگوں کو آج سے ۱۷ سال بعد جب رمضان جون میں آئے گا، سترہ یا اٹھارہ گھنٹے کا روزہ رکھنا ہوگا۔ بنابریں اکثر مسلمانوں کی زندگی رمضان سے متعین ہونے والے ادوار میں سے گذرتی رہتی ہے جس میں پہلے تو رمضان کا زمانہ آسانی سے گذرتا ہے اور پھر روزے مشکل ہوتے جاتے ہیں۔

دین کے دوسرے ارکان کی طرح روزے کی بھی ایک مضبوط سماجی جہت ہے اور اس کے اثرات پورے معاشرے میں پھیلتے ہیں۔ جب فرد کی زندگی کا بنیادی ڈھنگ بدلتا ہے تو معاشرے میں بھی تبدیلی نظر آتی ہے۔ جہاں کہیں بھی مسلمان روایتی انداز میں زندگی بسر کرتے ہوں، وہاں کھانے پینے کی دکانیں رمضان میں دن کے اوقات میں بند رہتی ہیں۔ لوگ عموماً روزہ شروع ہونے سے پہلے صبح سویرے سیر ہو کر کھا لیتے ہیں، موسم کی رعایت سے اور اپنے اپنے رہن سہن کے مطابق۔ اس کے بعد لوگ یا تو جاگتے رہتے ہیں یا نمازِ صبح سے فارغ ہو کر دوبارہ سو رہتے ہیں۔ اس کے بعد دن بھر لوگ اپنی سرگرمیاں معمول کے مطابق انجام دیتے رہتے ہیں۔ جن لوگوں کو رمضان کے روزے کا کوئی تجربہ نہ ہو، وہ شاید یہ سوچتے ہوں کہ ناشتہ نہ ملا یا دوپہر کا کھانا نہ کھایا تو کیا بگڑے گا، لیکن آنکھ کھلتے ساتھ کافی کی طلب کا کیا ہوگا؟ گہری نیند سے جاگنے کے بعد پانی کا گھونٹ بھی بہت کچھ ہوتا ہے کہ اس سے جسم کا نظام حرکت میں آتا ہے۔ موسمِ سرما میں آٹھ گھنٹے کھائے پیے بنا رہنا کچھ ایسا مشکل نہیں، لیکن ذرا جون اور جولائی کے روزے کے بارے میں سوچیے۔ پھر یہ کہ ایک دن، دو دن تو شاید آسانی سے گذر جائیں، مگر ہفتہ، دو ہفتہ یہ سلسلہ کیوں کر چلے گا؟ اگر انسان کا ایمان پختہ نہ ہو تو پورے مہینے کے مسلسل روزے رکھنا، گرمی یا سردی میں، ایک ایسا کام ہے جسے نبھانا ممکن نہیں۔

رمضان کے روزے دشوار ہونے کا ذکر چلا ہے تو ہم یہ کہتے جائیں کہ اس کا مطلب یہ نہ جانیے کہ مسلمان اسے سختی کا زمانہ گردانتے ہیں۔ ان کے لیے تو عموماً رمضان سال کا سب سے پُرمسرت

زمانہ ہوتا ہے۔ گو رات ہونے تک اس کا احساس اُجاگر نہیں ہوتا۔ دن کے اوقات میں لوگ اس خوشی کے ظاہر کرنے میں ذرا دبے رہتے ہیں۔ روایتی اسلامی شہر رمضان کے دنوں میں دیکھنے کی چیز ہوتے ہیں، رات اور دن میں اتنا فرق ہوتا ہے کہ آپ اسے ایک دوسرے کا الٹ کہہ سکتے ہیں۔ رات کے مقابلے میں دن میں چہل پہل کم ہوتی ہے، بہت سی دکانیں بند رہتی ہیں اور لوگ باگ اکل کھرے نہ بھی ہوں تو بھی خاموشی کی طرف مائل رہتے ہیں، لیکن ادھر اذان کی آواز بلند ہوئی یا افطاری کا دھونسہ بجا، ادھر ساری فضا ہی بدل جاتی ہے۔ روزہ کھلنے کا سبھی کو بے تابی سے انتظار ہوتا ہے۔ نبی علیہ السلام کے طریقے کے مطابق دو ایک کھجوریں کھا کر یا پانی کے گھونٹ سے روزہ افطار کیا جاتا ہے اور پھر سب لوگ نمازِ مغرب ادا کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ بازاروں، قہوہ خانوں اور کھانے پینے کی دکانوں میں سورج ڈوبنے سے پہلے لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے، جو کھانے پینے کی چیزیں سامنے رکھے بڑے صبر سے بیٹھے رہتے ہیں۔ عالمِ اسلام کے بہت سے علاقوں میں تو ایک رواج سا ہو گیا ہے کہ روزہ کھلنے کے بعد خورد نوش کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ رمضان کی راتیں تو چھوٹے موٹے جشن کا سماں پیش کرتی ہیں اور رات ہوتے ہی گلی کوچوں میں زندگی کی وہ گہما گہمی شروع ہو جاتی ہے جو سال کے دوسرے مہینوں میں صرف دن کے اوقات میں نظر آتی ہے۔

اسلام کے شرعی قانون کے مطابق روزہ نہ رکھنا بڑا گناہ ہے۔ ایک دن کا روزہ جان بوجھ کر چھوڑ دینے کی پاداش میں دو ماہ کے روزے رکھنا ہوتے ہیں، تاہم، دیگر معاملات کی طرح، اس ضابطے کو نافذ کرنے کا بھی کوئی لگا بندھا طریقہ نہیں ہے۔ انسان اس معاملے میں صرف اپنے رب کے سامنے جوابدہ ہے، روایتی اسلامی معاشرے میں ہر شخص روزے کی پابندی کا دھیان رکھتا تھا۔ تنہائی میں البتہ لوگوں کو ہر طرح کی آزادی ہوتی تھی۔ اللہ کے سوا انھیں دیکھنے والا اور کون تھا!

آج عالمِ اسلام کے بڑے شہروں کو جا کر دیکھیے تو یہ گمان گذرتا ہے کہ شاید معدودے چند لوگ ہی روزہ رکھتے ہوں گے۔ ریستوران اور کھانے پینے کی دکانیں کھلی ہوئی اور زندگی اپنے معمول کے مطابق رواں، لیکن ایسا ہے نہیں۔ وہ مسلمان جو مغرب میں جا بسے ہیں اور ارکان اسلام کے پابند نہیں رہے، ان میں بھی اتنا ضرور ہوتا ہے کہ دو ایک دن کے روزے رکھ لیتے ہیں۔ (عیسائیوں میں بھی جو بچا کھچا دین رہ گیا ہے اس پر عمل کرتے ہوئے مسیحی لوگ سال میں ایک مرتبہ ایسٹر کے موقع پر گرجا جاتے نظر آ جاتے ہیں)۔ روزہ داری کے اس علامتی یا جزوی عمل کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ روزہ وہ

عبادت ہے جو سراسر بندے اوراس کے رب کا معاملہ ہے۔اس کے سماجی پہلو اپنی جگہ ہیں، لیکن روزہ رکھنے یا روزہ توڑنے اور چھوڑنے کا علم صرف خدا ہی کو ہوسکتا ہے، اسی لیے تو رمضان کے روزے کو عموماً ارکان اسلام میں سب سے زیادہ ذاتی اور روحانی عمل سمجھا جاتا ہے۔نماز دوسروں کی نظر میں آ جاتی ہے اور معاشرتی نظام کے گتھے ہوئے رشتہ و پیوند کے کارن ہر شخص کو دوسرے کے بارے میں پتا ہوتا ہے کہ اس کی نماز ادا کرنے کی کیفیت کیا ہے، لیکن اس بات کی نگرانی کوئی بھی نہیں کرسکتا کہ آپ نے دن بھر میں کب چھپ کر پانی کے چند گھونٹ حلق سے اتار لیے یا کھانے کی کسی چیز سے بھوک کو بہلا لیا۔ بہتیرے بے عمل لوگ یہی سوچ کر دو ایک دن کا روزہ رکھ لیتے ہیں کہ اپنے آپ کو اور اللہ تعالیٰ کو یہ تو جتا دیں کہ انھوں نے اسلام کو بالکل چھوڑ نہیں دیا۔

رکنِ پنجم: حج

اسلام کا پانچواں رکن ''بیت اللہ کا حج ہے، اگر آپ اس کی استطاعت رکھتے ہوں۔'' حج عبادات اور مناسک کا ایک سلسلہ ہے جو ہر سال مکہ اور اس کے گردونواح میں انجام دیا جاتا ہے۔اس کا آغاز قمری سال کے آخری مہینے ذوالحجہ (حج والا مہینہ) کی آٹھ تاریخ سے ہوتا ہے اور اختتام اسی ماہ کی تیرہ تاریخ کو ہوتا ہے۔ اسلام سے بہت پہلے مکہ کو ایک مقدس مقام کی حیثیت حاصل تھی۔ مسلمانوں کے اعتقاد کے مطابق حضرت آدمؑ نے مکہ میں ایک عبادت گاہ تعمیر کی تھی جس کی تعمیرِ نو بالآخر حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں ہوئی۔ظہورِ اسلام سے کہیں پہلے عرب قبائل کے لیے کعبہ ایک زیارت گاہ کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔قرآنِ مجید اور پیغمبر اسلامؐ نے کعبے کے گرد سرانجام پانے والی عبادات میں ترمیم وتبدیلی کی اوران کو پھر سے ایک تقدیس عطا کر کے ارکانِ دین کا مرتبہ دے دیا۔

مسلمانوں پر زندگی میں ایک مرتبہ حج کرنا فرض ہے، لیکن اس صورت میں جب ان کے پاس اس کے لیے وسائل موجود ہوں۔ حج کی معنویت جاننے کے لیے یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ہوائی جہاز، دخانی بحری جہاز اور بسیں وغیرہ ادھر سو سال سے استعمال میں آئے ہیں۔ تیرہ سو سال تک مسلمانوں کی اکثریت پا پیادہ یا گھوڑے اونٹ پر سوار ہو کر حج کرنے جاتی تھی۔اس زمانے میں یہ اتنا آسان نہیں تھا کہ آپ دو ہفتے کی چھٹی لے کر سفر پر روانہ ہوں اور آیندہ سوموار کو لوٹ کر دفتر حاضر ہو جائیں۔اس کے برعکس اکثر مسلمانوں کے لیے حج ایک دشوار گذار سفر تھا جو کئی ماہ پر پھیلا ہوا تھا اور بسا اوقات سال دو سال بھی لگ جاتے تھے۔ پھر جب سفر پر نکل کھڑے ہوتے تو واپسی کی عجلت کسے ہو

گی؟ لوگ مکہ یا مدینہ میں چند ماہ ٹھہرتے ،سفر کی کوفت دور کرتے ، واپسی کے سفر کی تیاری کرتے ، دنیا بھر سے آئے ہوئے دوسرے مسلمانوں سے میل ملاقات رہتی اور حصولِ علم کے مواقع فراہم ہوتے۔ اکثر یہ قیام سالوں پر محیط ہو جاتا تھا، کبھی یوں بھی ہوتا کہ لوگ اسی شہر میں اپنے دمِ واپسیں کے منتظر رہتے تھے، خواہ اس کا بلاوا کتنی ہی دیر میں کیوں نہ آئے۔

آج سفرِ مکہ چند گھنٹوں کی بات ہے، کہیں سے کیوں نہ ہو۔ کچھ لوگ امسال حج کے لیے عزمِ سفر اس لیے کریں گے کہ سال گذشتہ برمودا ہو آئے تھے۔ ماضی میں اکثر مسلمانوں کو اس سفر پر روانہ ہونے سے پہلے کڑی شرائط پر پورا اترنا ہوتا تھا، بلکہ یوں جانیے کہ وہ موت کا سامنا کرنے کی تیاری کر کے نکلتے تھے۔ وہ ایک طرح سے طے کر لیتے تھے کہ اب اس سفر سے واپسی نہیں ہونا ہے اور اس کے لیے ہر ضروری سامان کر کے ہی آغازِ سفر کیا جاتا تھا۔ حج کے سفر کی ایک شرط یہ تھی کہ آپ نے اپنے ذمہ ہر قرض ادا کر دیا ہو۔ ایک شخص حج کا ارادہ کیے ہو اور اس کی بیوی اس کی ہمسفر نہ ہو سکے تو اس پر لازم تھا کہ وہ اس کے رہن سہن اور خرچ کا انتظام اسی طرح کر کے جائے جیسا اپنی موجودگی میں کیا کرتا تھا، حاجی پر اپنی آل اولاد کی فکر بھی لازم تھی اور ان سب لوگوں کی بھی جن کی ذمہ داری اس کے کندھوں پر رہی ہو۔

روایتی طور پر حج راہِ خدا میں قدم رکھنے کی ایک مہتم بالشان عبادت سمجھی جاتی ہے، دنیا کے الجھیڑوں سے نکل کر خدا طلبی، اللہ سے لو لگانے کا عمل۔ حج کرنے کے لیے لوگ ان تمام چیزوں سے اپنے آپ کو یکسر کاٹ دیتے تھے جو ان کو صبح شام الجھائے رکھتی تھیں۔ وہ اپنے رب کی آواز پر لبیک کہنے کی تیاری کرتے جو انھیں بلاتی اور اپنے گھر آنے کی دعوت دیتی تھی۔ حج ایک طرح کی موت ہی تھا کہ قرآن میں موت کو بار بار اللہ کا سامنا کرنے، اس سے ملاقات کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے اور کعبہ خدا کا گھر ہے۔ خلاصہ یہ کہ حج ایک طرح سے موت اور خدا سے جا ملنے ہی کے مترادف تھا۔ اس طرح حج سے واپسی گویا نیا جنم لینا ٹھہرا۔ اس سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ سارے عالم اسلام میں حاجی کا لقب اتنا محترم کیوں گردانا جاتا ہے۔ حاجی کو ایسا شخص سمجھا جاتا ہے جو دنیائے دوں کی غلامی سے آزاد ہو چکا ہو۔ اسے تقویٰ اور روحانیت کا نمونہ جانا جاتا تھا اور بلاشبہ ان میں سے اکثریت اپنے لقب پر پوری اترتی تھی اور معاشرے میں وہی مثالی کردار اور ذمہ داری انجام دیتی تھی جو اس نام کا تقاضا ہے۔ معدودے چند لوگ ایسے بھی رہے ہوں گے جو اس نام سے ملنے والے عزت و احترام کا غلط فائدہ اٹھاتے ہوں گے۔

چھٹا رکن: جہاد و مجاہدہ

بعض علما کا خیال ہے کہ اسلام کا ایک چھٹا رکن بھی ہے: جہاد۔ انگریزی میں یہ لفظ بہت معروف ہو چلا ہے۔ اس کی وجہ موجودہ سیاسی حالات اور میڈیا کی طرف سے قتل و غارت اور تشدد کی خبروں پر خصوصی توجہ کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر بات صرف اسلام میں جہاد کی حیثیت کی ہوتی تو ہمیں اس موضوع پر زیادہ گفتگو کرنے کی کوئی ایسی ضرورت نہ تھی، لیکن اس لفظ سے لپٹے ہوئے تصورات کے کارن ہم قدرے تفصیل سے اس کا جائزہ لیں گے۔

''جہاد'' کے لفظ یا اصطلاح کے بارے میں پہلی بات تو یہ جان لیجیے کہ اس کے ترجمے کے لیے holy war کی جو ترکیب انگریزی میں چل نکلی ہے وہ بالعموم غلط اور اور نہایت گمراہ کن ہے۔ تاریخِ اسلام کے حوالے سے دیکھیے تو ہر وہ جنگ جو ''ہم'' کرتے آئے ہیں، اسے جہاد کا عنوان دیا گیا ہے۔ مغرب میں بھی ابھی کچھ زمانہ پہلے تک یہی صورتِ حال تھی۔ ہر لڑائی کو مقدس holy کہا جاتا تھا، اس لیے کہ [بزعم خود] اللہ کی حمایت ہمارے ساتھ ہوتی تھی۔ اس اصطلاح کے استعمال کرنے سے مسلمانوں کا مطلب یہ تھا کہ جنگ کے دوسرے فریق کو دشمنِ خدا کے درجے پر گرا دیا جائے۔ خلاصہ یہ کہ اس لفظ کو ہر جگہ ایک قومی نعرے کے طور پر برتا گیا۔ آج کی اصطلاح میں اس نعرے کو بدل کر کہیے تو جہاد کرنے کا مطلب ہے ''جمہوریت اور آزادی کی حفاظت کی جنگ۔'' جو بھلے لوگوں کے کرنے کا کام ہے۔

قرآن میں اس لفظ کو جس طرح برتا گیا ہے، وہ سیاسی معانی سے کہیں وسیع ہے۔ اس لفظ کے بنیادی معنی ہیں ''جہد و جہد، کوشش۔'' عام طور پر یہ لفظ جہاں استعمال ہوا ہے وہاں اس کے ساتھ ''فی سبیل اللہ'' (اللہ کی راہ میں) کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ ''اللہ کا راستہ' یقیناً صحیح راہِ عمل ہے جس کا تعین قرآن سے اور نبی علیہ السلام کے اسوۂ حسنہ سے ہوتا ہے۔

ایک طرح سے دیکھیے تو جہاد کی حیثیت محض اسلام (بہ مفہوم تسلیم و سرافگندگی islam) کے ایک تکمیلی عنصر کی ہے۔ ''اسلام'' کا لفظ مآل کار ''اطاعت و فرمانبرداری اور تسلیم و سرافگندگی'' ہی کے معنی رکھتا ہے۔ مغرب والے اسے ایک طرح کی انفعالی کیفیت سمجھتے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ یہ تسلیم و قبولیت اللہ کی مشیت اور اس کے حکم کی ہے اور اللہ کی مرضی یہی ہے کہ لوگ اس کی راہ میں جہد و جہد کریں۔ سو یہ جہد و جہد از خود تقاضائے اسلام بن جاتی ہے۔ حکمِ خداوندی کی قبولیت لوگوں سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنے اندر اور معاشرے میں پھیلے ہوئے تمام منفی رجحانات کے خلاف سرگرمِ عمل رہیں جو انھیں

خدا سے دور کرنے کا امکان رکھتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھیے تو تسلیم و سرافگندگی اور راہِ حق میں جہد و جہد ایک دوسرے سے ہم آہنگ معلوم ہوتے ہیں اور ایک سے دوسرے کی تکمیل ہوتی ہے۔

اسلامی سیاق وسباق میں دیکھیے تو یہ ایک بدیہی سی بات ہے کہ اللہ کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے کا تقاضا اس کی راہ میں کوشش اور محنت بھی ہے۔ نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج سبھی اعمال جہد وجہد مانگتے ہیں۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ یہ سب کام آسان ہیں تو ذرا آداب وقواعد کی پابندی کے ساتھ چند روز نماز پڑھ کر دیکھیے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ لوگوں کے لیے اللہ کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے میں سب سے بڑی روک رکاوٹ ان کی اپنی آلکس، سستی اور بے دھیانی ہی بنتی ہے۔ لمحۂ موجود کی آرا اور واقعات کی رَو انھیں اپنے ساتھ بہالے جاتی ہے اور وہ اس کی مزاحمت نہیں کرتے۔ ایک ایسے حکم وفرمان کی اطاعت کرنا جو نہ صرف ہماری پسند وناپسند کے میلانات پر روک لگاتا ہو، بلکہ انبوہِ مردم کی نقل کرنے کے معاشرتی دباؤ کی بھی مزاحمت کرتا ہو، بہت بڑی کاوش کا تقاضا کرتا ہے۔

اللہ کے ہاں جہاد کی کیا حیثیت ہے، اس کا اندازہ کئی امور سے کیا جا سکتا ہے۔ اس کی ایک واضح مثال دیکھیے۔ یہ آنحضرتؐ کے الفاظ ہیں۔ اللہ کے نئے دین -اسلام- کے دشمنوں سے ایک جنگ کے بعد آپؐ مدینہ واپس لوٹ رہے تھے کہ اس موقع پر آپؐ نے فرمایا ''ہم جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کی طرف لوٹ آئے ہیں۔'' اصحاب نے پوچھا ''اے خدا کے رسولؐ! کفار کے خلاف تلوار لے کر صف آرا ہونے سے بڑا جہاد اور کیا ہوگا؟'' آپؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا: ''اس دشمن کے خلاف جہاد جو تمھارے سینوں کے اندر ہے۔''[۲۶]

اسلامی تہذیب میں اس موضوع پر جو تحریریں مابعد کے زمانے میں ملتی ہیں ان میں اس باطنی جہاد کو مجاہدہ کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ از روئے قواعد مجاہدہ کا لفظ جہاد ہی سے نکلا ہے اور دونوں کے معنی بالکل ایک ہی ہیں، لیکن جہاد کا لفظ خارجی جنگ، یعنی اپنی ذات سے باہر ہونے والی لڑائی اور انسان کے اندرونی منفی میلانات کا مقابلہ کرنے کی جدوجہد دونوں کے لیے مستعمل رہا ہے جب کہ مجاہدہ کا لفظ صرف اور صرف جہادِ اکبر، داخل کے جہاد کے بیان کے لیے خاص ہوگیا ہے۔

وہ مسلمان اہلِ علم جو جہاد کو اسلام کا چھٹا رکن کہتے ہیں، ان کے ذہن میں یہی بات ہوتی ہے کہ خدا کی راہ میں کوشش و جدوجہد کرنا مسلمانوں کے لیے ایک لازمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اس چیز کا بھی ادراک رکھتے ہیں کہ یہ جدوجہد بسا اوقات دشمنانِ اسلام کے خلاف خارجی

جنگ کی شکل بھی اختیار کر لیتی ہے۔

تاہم یہاں ہم ایک بات پر زور دینا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ اسلامی ممالک کی عام روزمرہ زبان میں جہاد کا لفظ محض جنگ کے لیے استعمال ہوتا ہے، ویسے ہی جیسے اگر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کسی سے جنگ میں اُلجھ جائے تو امریکیوں کی اکثریت اسے ایک جائز لڑائی سمجھتی ہے۔ دوسری طرف اسلام کے احکامات کا ٹھیٹھ معنوں میں اطلاق کریں تو بہت سے جہاد بس نام کے جہاد نظر آئیں گے۔ کوئی بھی بادشاہ (یا کوئی آمر جیسا کہ ادھر کے زمانے میں دیکھا گیا) اعلانِ جہاد کر سکتا ہے اور اس کو علمائے وقت میں سے کوئی نہ کوئی مل بھی جائے گا جو اس کی حمایت میں بیان دینے پر تیار ہوگا، مثلاً شاہی مسجد میں شاہ کا مقرر کردہ واعظِ شہر و مفتیِ اعظم۔ علما کی اکثریت بہرحال ایسی رہی ہے جو کسی جنگ کی تائید صرف اس لیے نہیں کر دیتی کہ اس کا اعلان بادشاہِ وقت نے کر دیا ہو۔ ان کی طرف سے صرف اس جہاد کی حمایت کی جاتی تھی جو اسلام کی تعلیمات و احکامات کی سختی سے پابندی کرتے ہوئے کیا جائے۔ اس پیمانے پر دیکھیے تو شاید یہ کہنا درست ہوگا کہ گذشتہ صدی میں اگر ہوئے بھی تو چند ایک ہی صحیح اور جائز جہاد رہے ہوں گے۔ ادھر کے گذرے ہوئے کئی سو سال میں تو شاید کوئی بھی نہ ہوگا۔

شریعت اسلام

دین کے پانچ ارکان اسلام کے بنیادی اعمالِ عبادت ہیں۔ ان کا تعلق ہر مسلمان سے ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بہت سے لوگوں کے لیے زندگی بھر زکوٰۃ دینے کی نوبت نہیں آتی یا وہ حج نہیں کر پاتے، کیونکہ ان کے شخصی حالات نے اُنھیں ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی۔ ہر مسلمان کلمۂ شہادت پڑھ چکا ہوتا ہے کہ کلمہ پڑھ کر ہی تو انسان مسلمان ہوتا ہے۔ نماز ہر بالغ مسلمان پر روزانہ فرض ہے، اگرچہ اس میں خواتین کے لیے ہر ماہ کچھ دن کا استثنا کیا گیا ہے۔ رمضان میں روزہ رکھنا ہر مسلمان کا سالانہ معمول ہے، اگرچہ بعض جائز وجوہات کی بنا پر روزہ چھوڑا بھی جا سکتا ہے۔

قرآنِ مجید اور نبی علیہ السلام کے اور بھی بہت سے احکامات ہیں جن کو بجا لانا مسلمانوں کے لیے ضروری ہے۔ ان میں سے بہت سے احکامات کا تعلق اخلاقی ضابطوں سے ہے اور یہ اخلاقی ضابطے ایک عالمگیر اطلاق رکھتے ہیں۔ ممنوع کاموں (کی فہرست) میں چوری، قتل، زنا اور حرامکاری شامل ہیں۔ کچھ دوسرے احکامات ہیں جن کا تعلق ان شعبوں سے ہے جو آج کے جدید مغربی روزمرہ کے مطابق عموماً دین کے دائرہ کار سے بارہ پتھر باہر سمجھے جاتے ہیں، مثلاً میراث اور وراثت، شادی

بیاہ، کاروباری لین دین اور خوردنی و ناخوردنی غذائیں۔

قرآنِ مجید اور نبی علیہ السلام کے مقرر کردہ احکامات اور ضابطوں کا مجموعہ مرتب ہو کر شریعت کے طور پر سامنے آیا، یعنی ''پانی کے گھاٹ تک جانے کا کھلا راستہ''، صحیح راہِ عمل جس پر چلنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔ یہ پانی وہی آبِ ساوی ہے جو تزکیہ بھی کرتا ہے اور مغفرت و بخشش کا وسیلہ بھی ہے، وہی آبِ زلال جس کا ذکر قرآنِ مجید کی کئی آیات میں آیا ہے:

وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهِ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ (۸:۱۱)

وہ تم پر آسمان سے پانی برسا دیتا ہے تاکہ اس سے تم کو پاکیزہ کردے اور تم سے شیطان کی نجاست کو دور کردے۔

شریعت کے لفظ کا ترجمہ عموماً ''اسلامی قانون'' یا ''الہامی قانون'' کے الفاظ سے کیا جاتا ہے۔ اسلامی علوم کے اس شعبے کا مطالعہ ''فقہ'' کہلاتا ہے۔ اس شعبۂ علم کے ماہرین کو فقہا کہا جاتا ہے۔ اس کا تذکرہ ہم پہلے بھی کر چکے ہیں۔ عملاً تو تمام علمائے اسلام یعنی اسلام کے بارے میں معلومات رکھنے والے لوگ فقہ کا وسیع علم رکھتے ہیں۔ ان میں سے کچھ علما کو دوسرے شعبوں اور علوم میں بھی خصوصی مہارت ہوگی جیسے الٰہیات، فلسفہ یا تصوف۔ ہم پہلے بھی اس بات کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ اسلامی ممالک میں جن لوگوں کو علما یا مولوی، مُلّا کہا جاتا ہے، ان کی کثرت کثیرہ اصل میں صرف فقہ کے ماہرین پر مشتمل ہوتی ہے، کیونکہ انھیں اسلامی علوم کے دوسرے شعبوں کا یا تو سرے سے علم ہی نہیں ہوتا یا ہوتا ہے تو بہت کم۔ مطلب یہ ہوا کہ اسلام کی پہلی جہت کا علم حاصل کرنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے، لیکن دوسری اور تیسری جہت کا علم اتنا عام نہیں ہے گو کوئی اعتبار سے ان کی اہمیت پہلی جہت سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

اسلام میں عمل کی اہمیت بنیادی ہے۔ مسلمانوں کے لیے یہ بالکل فطری بات ہے۔ ہر انسان کا ایک بدن ہے اور بدن ہے تو اس کا عمل بھی ہوگا لہٰذا ہر شخص کو عمل کے لیے لائحۂ عمل اور اس کے لیے ہدایات کی ضرورت ہوگی۔ ہونے کو تو ہر انسان کا ذہن بھی ہے اور دل بھی، مگر انسانوں کی طبیعی ساخت ایسی ہے کہ ان کی اکثریت سوچ بچار کی زحمت کم ہی کرتی ہے۔ تزکیۂ قلب کی مشقت اور اصلاحِ نیت کی محنت کر کے خود کو مشاہدۂ خداوندی کے لیے تیار کرنے والے بھی کم ہی نکلتے ہیں۔ تاریخ کے معلومہ ادوار میں تو کم از کم ایسا ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ انسانی کاوش کی یہ قلمرو ہمیشہ سے ایک اقلیت سے آباد

رہی ہے۔اس معاملے میں اسلام کو کچھ ایسا استثنا حاصل نہیں ہے۔

Law یا قانون کا لفظ ''شریعت'' کے ترجمے کے لیے کچھ ایسا موزوں یوں بھی نہیں ہے کہ شریعت جن امور سے سروکار رکھتی ہے، وہ انگریزی کے لفظ کے مدلولات ومفاہیم سے مختلف ہیں۔اس سلسلے میں پہلے یہ دیکھیے کہ قانون کا لفظ انگریزی میں اوامر ونواہی کے لیے خاص سمجھا جاتا ہے مثلاً قانون کا تقاضا ہے کہ آپ ٹیکس ادا کریں اور قانونی ممانعت ہے کہ آپ دوسرے انسانوں کی جان لینے کی کوشش کریں۔ اس کے ساتھ ہی انسانی عمل کا ایک تیسرا میدان بھی ہے، وہ امور جن سے قانون کو سروکار نہیں ہے۔

اسلامی فقہ جہاں اِن تین اقالیم سے بحث کرتی ہے وہاں ان میں دو اور انواع کا اضافہ بھی کردیتی ہے۔ یہ دونوں قسمیں بھی اس کے لیے اہم ہیں۔شریعت ان کاموں کا بیان کرتی ہے جو لوگوں کو لازماً کرنا چاہییں یا بالکل نہیں کرنا چاہییں۔ نیز وہ کام جو کرنے کے ہیں اور جو کرنے کے نہیں ہیں۔ پھر وہ وضاحت سے یہ بھی بتا دیتی ہے کہ بہت سی چیزیں مباح ہیں جن سے شریعت کو غرض نہیں۔سو شریعت کی رو سے ہمارے سامنے عمل کی پانچ قسمیں ہیں:

- ضروری یا لازمی جن کے کرنے کا مطالبہ شریعت میں موجود ہے۔
- وہ کام جن کی ترغیب دلائی گئی ہے۔اصطلاح میں اسے مندوب، یعنی پسندیدہ کہا جاتا ہے۔
- وہ امور جن سے شریعت کا تعلق نہیں۔
- مکروہ، یعنی ناپسندیدہ کام
- ممنوع، یعنی وہ کام جن کے کرنے سے روک دیا گیا ہے۔

اس طرح سے تقسیمِ امور کیجیے تو شریعت کے دائرے میں بہت سی ایسی چیزیں بھی آجاتی ہیں جو آج کے جدید معنوں میں کسی قانونی نظام میں شامل نہیں ہوسکتیں، مثال کے طور ''مندوب'' اعمال ہی کو لے لیجیے۔ہم نے پہلے ذکر کیا ہے کہ پانچ ارکان دین سبھی لوازم کے زمرے میں آتے ہیں، لیکن روزانہ پانچ فرض نمازوں کے علاوہ ایک بڑی تعداد مندوب نمازوں کی بھی ہے۔مثال کے طور پر نمازِ صبح کی دو فرض رکعتوں سے پہلے دو اور رکعتیں پڑھنے کی ترغیب دلائی گئی ہے۔اس طرح سب یومیہ نمازوں کے لیے کچھ تعدادِ رکعات ایسی ہے جسے فرض نماز کے ساتھ اضافہ کرکے پڑھنے کو ایک مستحسن کام کہا گیا ہے۔

روزے کے سلسلے میں یوں تو سال میں ایک مرتبہ رمضان کے مہینے کے روزے رکھنا فرض ہیں، تاہم مسلمانوں کو ترغیب دلائی گئی ہے کہ سال کے دوران کچھ اور دنوں میں بھی روزہ رکھا جائے، ہر ماہ

کے کچھ خاص دنوں کا روزہ رکھا جائے، بلکہ ہر ہفتے کے بعض دنوں کو روزے کے لیے خاص کیا جائے۔ اسی طرح جو مسلمان زکوٰۃ دیتے ہیں، ان کو اپنے منافع پر ایک خاص شرح سے زکوٰۃ دینا لازم ہے، لیکن ساتھ ہی یہ ترغیب بھی دلائی گئی ہے کہ وہ اس کے علاوہ بھی اپنا مال خدا کی راہ میں دیا کریں۔ اسی طرح ضرورت مندوں کو قرض دینے کی بھی ترغیب دی گئی ہے۔ یہ قرض بلاسود ہونا چاہیے، کیونکہ اسلام میں سود لینا ممنوع ہے۔ بعض علما کا خیال ہے کہ خیرات کی بجائے قرض دینا زیادہ نیکی کا کام ہے کیونکہ قرض لینے والے شخص پر ایک اخلاقی ذمہ داری اس کے واپس کرنے کی عائد ہو جاتی ہے اور اس طرح اسے ایک مستقل ذریعہ آمدنی تلاش کرنے کا خیال رہتا ہے۔ دوسری طرف جب قرض کی رقم لوٹائی جاتی ہے تو رقم کا مالک اسے کسی دوسرے شخص کی حاجت روائی کے لیے صرف کر سکتا ہے۔ یوں اسے مزید نیکی کرنے کا موقع ملتا ہے۔

دین کے پانچویں رکن حج کی بھی ایک شکل ایسی ہے جو مندوب شمار ہوتی ہے، یعنی حج کے دنوں کے علاوہ بیت اللہ کی زیارت۔ اس عبادت کو عمرہ کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو عمرہ بھی کرنا چاہیے، اگر ان کو اس کی استطاعت حاصل ہو۔ چونکہ یہ ایک مندوب عمل ہے، لہٰذا اسے تمام تر تفصیل کے ساتھ شریعت کی درسی کتب میں بیان کیا گیا ہے۔

بہت سی چیزیں شریعت کی رو سے کراہت کے زمرے میں آتی ہیں، مثلاً طلاق، وضو میں ضرورت سے زائد پانی بہانا، نماز کے دوران بدن کھجانا، پرخوری کی حد تک کھاتے جانا۔

غذا کے معاملے میں شریعت جس طرح احکام دیتی ہے، وہ بسا اوقات مسیحی حضرات کو اچنبھے کی چیز معلوم ہوتی ہے (البتہ یہودیوں کے لیے یہ چیز اجنبی نہیں ہے)۔ مسلمانوں کے لیے نشہ آور مشروبات اور منشیات کا استعمال حرام ہے۔ خنزیر، کتے، پالتو گدھے اور مردار کا گوشت کھانا ممنوع ہے۔ مردار ہر اس جانور کا گوشت ہوتا ہے جسے شرعی قواعد کے مطابق ذبح نہ کیا گیا ہو۔ ذبیحہ کا شرعی طریقہ یہ ہے کہ جانور کی گردن کاٹتے وقت اس پر خدا کا نام لیا جائے۔ شرعی طریقے سے ذبح کیے ہوئے اس گوشت کو حلال کہا جاتا ہے۔ بعض فقہا کی رائے ہے کہ یہودی اور عیسائی لوگوں کا تیار کیا ہوا گوشت مسلمانوں کے لیے حلال ہے۔ دوسرے فقہا اس کے خلاف رائے دیتے ہیں۔ اس معاملے میں قرآن میں ایک عمومی حکم بیان ہوا ہے:

وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ (۵:۵) اور اہل کتاب کا کھانا تم کو حلال ہے۔

لیکن اس سے مراد یہی لیا جاتا ہے کہ یہ کھانا اگر گوشت کی شکل میں ہو تو اسے اللہ کا نام لے کر ذبح شدہ ہونا چاہیے۔ یہود کے ''کوشر'' طریقے سے ذبیحہ کا گوشت اس پیمانے پر پورا اترتا ہے۔ جانوروں کے گوشت کے بارے میں عمومی حکم یہ ہے کہ پنجے، ناخن اور تیز نوکیلے دانتوں والے ایسے تمام وحشی جانوروں کا گوشت کھانا ممنوع ہے جو اِن سے شکار کرتے ہیں یا اپنے دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں، مثلاً شیر ببر، شیر اور چیتا، بھیڑیا، ریچھ، ہاتھی، بندر اور بلی۔ فقہ کے ایک مکتب فکر کی رائے ہے کہ ان جانوروں کا گوشت کھانا مکروہ تو ہے، حرام نہیں ہے۔ فقہا میں چھوٹا موٹا اختلاف رائے ایک عام بات ہے۔ چنانچہ اکثریت کی رائے یہ ہے کہ سمندر میں پائی جانے والی تمام جاندار چیزوں کا کھانا حلال ہے، لیکن ایک مکتب فکر کے ہاں اس میں ایک استثنا ہے۔ وہ مچھلی کے علاوہ دیگر جانوروں، مثلاً کیکڑے، مگرمچھ، گھونگے اور فیل البحر کے گوشت کو حلال نہیں سمجھتے۔

تین کی جگہ پانچ انواع کی وجہ سے اسلامی قانون روزمرہ زندگی کی ہر طرح کی جزئیات پر نظر رکھتا ہے جو بصورتِ دیگر شاید زیر بحث نہ آسکتیں۔ فقہ اسلامی کے بہت سے شعبے اور ذیلی موضوعات ہیں جن میں مہارت حاصل کرنا سالوں کی محنت اور مطالعہ کا تقاضا کرتا ہے۔ بعض مسلمان شرعی قانون کو اتنی زیادہ اہمیت دیتے ہیں کہ ان کے لیے عملاً سارے کا سارا دین بس اسی تک محدود ہو کے رہ جاتا ہے، تاہم مسلمان اہلِ علم میں سے بہت سی عظیم ترین ہستیوں نے شریعت کے قانونی پہلوؤں کو کھنگالنے میں اتنی مشغولیت سے خبردار کیا ہے کیونکہ اس سے دین کی دوسری جہات نظر سے اوجھل ہو جاتی ہیں حالانکہ یہ جہات بھی اسلام کے لیے بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔

اسلامی علوم کے عظیم ماہرین میں سے ایک مشہور ترین شخصیت امام محمد الغزالی (م ۵۰۵/۱۱۱۱ء) کی ہے۔ ان کی رائے یہ تھی کہ ہر مسلمان کے لیے فقہ کا اتنا علم کافی ہے اس کی عملی زندگی کی ضروریات کو پورا کر سکے۔ اگر کسی مسلمان کو اپنے حالات کے مطابق کسی خاص حکم شرعی سے آگاہی کی ضرورت نہیں تو اس کے لیے اس کا علم حاصل کرنا ضروری نہیں۔ ایسے لوگ البتہ ہونا چاہییں جو فقہ کا علم حاصل کرنے کے لیے اپنی زندگی وقف کر دیں تاکہ حسب ضرورت ان سے کسی بھی معاملے میں فقہ کے احکامات معلوم کیے جا سکیں۔ اس سے معاشرے میں فقہا یا ماہرین فقہ و قانون کی ضرورت سمجھ میں آتی ہے۔ وہ لوگ جو ہر صورتِ حال کے مطابق مسلمانوں کو شرعی احکام کی تفصیلات سے آگاہ کر سکیں تاکہ عمل کرنے والوں کو ہر مسئلے پر فقہ کا حکم معلوم ہوتا رہے۔ ایک سادہ سی مثال لیجیے۔ جب کوئی بچہ نماز

سیکھنا چاہتا ہے تو کیا کرتا ہے؟ وہ خاندان کے کسی فرد سے کہتا ہے کہ مجھے نماز پڑھنا سکھایئے۔ اس کے لیے کتابیں دیکھنے کی ضرورت نہیں ہوا کرتی، کیونکہ اکثر لوگ نماز کے موٹے موٹے مسائل سے واقف ہوتے ہیں۔ ہاں البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص آپ کو ایک طرح سے ہاتھ باندھنے کو کہے جب کہ دوسرا شخص ہاتھ باندھنے کے اس سے مختلف انداز پر اصرار کرے۔ ایسے میں آپ کیا کریں گے؟ ظاہر ہے کہ تیسرے آدمی سے رائے لیں گے۔ اس طرح پوچھتے ہوئے آپ علاقے کی مسجد کے پیش امام کے پاس پہنچیں گے جو عموماً ان معاملات میں سب سے باخبر آدمی ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ امام مسجد بھی معاملاتِ فقہ میں مہارت نہ رکھتا ہو اور اگر آپ کا سوال ذرا گہرا ہوا تو وہ آپ کو کسی فقیہ کے پاس بھجوا دے۔ اس سے آپ مسئلے کی تفصیلات کا علم حاصل کرسکیں گے۔ ضروری نہیں کہ یہ حرفِ آخر ثابت ہو۔ فقہ کے ماہرین اور بھی ہوں گے اور دیگر علوم کے ماہرین کی طرح فقہ کے ماہرین میں بھی اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ ذمہ داری آپ کی ہے کہ سوال کرتے رہیں تا آنکہ جواب سے آپ کی تشفی ہوجائے۔

گناہ

شریعت نے صحیح عمل کے قواعد متعین کردیے ہیں۔ یہ قاعدے فرمانِ خداوندی پر مبنی ہیں جو قرآن میں بیان ہوا اور نبی علیہ السلام نے اس کی وضاحت فرمائی۔ قرآن اور حدیث شریعت کے دو بنیادی مآخذ ہیں۔ علما جب ان سے کسی مسئلے کے حل کے لیے رجوع کرتے ہیں اور سوال پھر باقی رہتا ہے تو گذرے ہوئے بڑے مسلمان علما کی رائے دیکھی جاتی ہے جو شریعت کے مسلّمہ ماہرین مانے جاتے ہیں۔ بنابریں اجماع (اتفاق رائے) کو شرعی احکام کا تیسرا مأخذ تسلیم کیا جاتا ہے۔ سنی مسلمانوں کے ہاں قیاس کو چوتھا مأخذ مانا گیا ہے جب کہ شیعہ حضرات عقل کو چوتھے مأخذ کا درجہ دیتے ہیں۔

اگر لوگ شریعت میں بیان کردہ ہدایاتِ خداوندی کو مان کر ان پر عمل پیرا ہوں تو اسے ''اطاعت'' کہا جاتا ہے۔ عملِ صحیح کا رِاطاعت ہے۔ اللہ یا اس کے رسول کا فرمان ہوتا ہے کہ ''یوں کرو'' یا ''یوں مت کرو''، اچھا مسلمان یہ ہدایات بجا لاتا ہے۔ قرآن نے اکثر ''اطاعت'' کا لفظ عملِ صحیح کے حوالے سے استعمال کیا ہے:

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (۳:۱۳۲)	اور اللہ اور رسول کا حکم مانو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُواالرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنَ (۵:۹۲)

اور حکم مانو اللہ کا، اور حکم مانو رسول کا اور بچتے رہو۔ پھر اگر تم پھروگے تو جان لو کہ ہمارے رسول کے ذمہ صرف یہی ہے کہ کھول کر پہنچادے۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَاالْاَنْهٰرُ (۴۸:۱۷)

اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانے گا اس کو اللہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے ندیاں بہتی ہوں گی۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ (۴:۶۹)

اور جو لوگ اللہ کے حکم پر چلتے ہیں، سو وہی ان کے ساتھ ہیں جن کو اللہ نے نوازا ہے۔

وَمَاكَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَامُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَوَرَسُوْلَهٗ فَقَد ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا (۳۳:۳۶)

اور کسی مومن یا مومنہ کا یہ کام نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں تو ان کے لیے اس میں کوئی اختیار باقی رہ جائے، اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے خلاف چلا، سو وہ کھلی ہوئی گمراہی میں پڑا۔

اگر فرمانبرداری واطاعت عملِ صحیح کے مترادف ہے تو نافرمانی یا معصیت غلط کام کے ہم معنی ہے۔ حکمِ خداوندی کے خلاف کرنے کا عمل حضرت آدمؑ سے شروع ہوتا ہے کہ انھوں نے شجرِ ممنوعہ کا پھل چکھ لیا تھا۔

وَعَصٰى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى (۲۰:۱۲۱)

اور آدم نے اپنے رب کا حکم ٹالا تو راہ سے بہک گئے۔

عصیان ان لوگوں کی صفت ہے جو خدا اور اس کے رسول کی اطاعت سے گریز کرتے ہیں۔ چونکہ شریعت اللہ اور نبی علیہ السلام کے احکامات کی مدون شکل ہے، اس لیے شریعت سے نافرمانی کا مطلب ہوگا اللہ کی نافرمانی اور اس کے حکم سے روگردانی۔ درج ذیل آیت سے جو معانی اخذ کیے گئے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے، کیونکہ ''اولوالامر'' کے الفاظ کو ان اہلِ علم کے معنی میں بھی لیا جا سکتا ہے جن کو اہل اسلام کے لیے شریعت کی شرح ووضاحت کرنے کی مطلوبہ استعداد اور مہارت حاصل ہو۔

يٰاَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِمِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ

ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور جو اختیار والے ہیں تم میں، اور اگر پھر

فِیۡ شَیۡءٍ فَرُدُّوۡہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوۡلِ (۴:۵۹) تمھارا کسی چیز میں جھگڑا ہو جائے تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو۔

قرآنِ مجید میں ''عصیٰ'' (نافرمانی، حکم عدولی) کا لفظ بہت سی آیات میں استعمال ہوا ہے۔ عموماً اس کا محلِ استعمال وہ مباحث ہیں جہاں گذشتہ نبیوں اور رسولوں کا انکار کرنے والوں کے طرزِ عمل کا ذکر آیا ہے۔ مسلمان کے لیے اس میں جو سبق ہے، وہ صاف ہے:

تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰہِ وَمَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ یُدۡخِلۡہُ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا وَذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ۔ وَمَنۡ یَّعۡصِ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ وَیَتَعَدَّ حُدُوۡدَہٗ یُدۡخِلۡہُ نَارًا خَالِدًا فِیۡہَا وَلَہٗ عَذَابٌ مُّہِیۡنٌ (۴:۱۳-۱۴) یہ اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حدیں ہیں اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر چلے گا، اس کو اللہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن میں ندیاں جاری ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یوں انھیں بڑی مراد ملے گی، اور جو اللہ اور اس کے رسول کی بے حکمی کرے گا اور اس کی حدوں سے بڑھ جائے گا اس کو اللہ آگ میں داخل کرے گا، رہے گا اسی میں اور اسے ذلت کی مار پڑے گی۔

اسلام کے بارے میں لکھنے والے عموماً ''معصیت'' کے لفظ کا ترجمہ ''گناہ'' (sin) کرتے ہیں اور یہ درست ہے کہ یہ لفظ اپنے عمومی مدلول کے طور پر گناہ کا مفہوم رکھتا ہے، لیکن معصیت ایک خاص طرح کا گناہ ہے، وہ گناہ جس کا تعین خدا کے اوامر و نواہی کے حوالے سے ہوتا ہے اور اس لفظ کے ساتھ ہی اس کا الٹ، یعنی ''طاعت'' کا لفظ ذہن میں ابھرتا ہے۔ قرآن نے اور بھی کئی الفاظ ایسے برتے ہیں جن کا ترجمہ ''گناہ'' کے لفظ سے کیا جاتا ہے۔ دیگر الفاظ کے علاوہ ذَنب، اِثم اور خَطِیۡئَة کے الفاظ اس معنی میں آئے ہیں۔ ان میں سے ہر لفظ میں معنی کی پرتیں اور رنگ ہیں جو انھیں ایک دوسرے سے الگ کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ sin کا لفظ اسلام کے تناظر میں معصیت کے لفظ کا ایک نہایت مبہم ترجمہ قرار پائے گا، کیونکہ اس میں کئی طرح کا عمل شامل ہو جاتا ہے۔

ان سب اصطلاحات میں ایک بات مشترک ہے۔ گناہ کا ذکر کرنے کا مطلب ہے انسانی عمل کے بارے میں فیصلہ دینا اور حکم لگانا اور یہ شریعت کی قلمرو ہے۔ شریعت نیتوں کے معاملے سے صرفِ نظر نہیں کرتی، لیکن نیت اور ارادے کی جانچ کے لیے اس کو تقریباً ہمیشہ ہی عمل سے جوڑ کر دیکھا جاتا

ہے۔ وہ علما جو نیتوں کے معاملے پر اسلام کی تیسری جہت کے تناظر پر غور کرتے ہیں، ان کے ہاں گناہ کے مسئلے سے جڑے ہوئے گہرے اخلاقی اور روحانی سوالات کا کہیں زیادہ وسیع شعور پایا جاتا ہے۔

گناہ اور معصیت کی اس بحث کو اختتام تک لے جانے کے لیے مناسب ہوگا کہ عملِ صالح کے عمومی قرآنی تصور کا بھی کچھ بیان کر دیا جائے، یعنی وہ نیک کام اور اچھے اعمال کیا ہیں جن کی بجا آوری انسان کو فرمانبردار بناتی ہیں، لیکن ہم یہ بحث کتاب کے حصہ سوم کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ اس حصہ تک پہنچیں گے تو ہماری تحریر کا پس منظر اتنا واضح ہو چکا ہوگا کہ عملِ صالح کو اسلام کی ہر تین جہات سے مربوط کر کے دیکھا جا سکے گا۔ اس جگہ صرف اتنا ذکر کیے دیتے ہیں کہ قرآن میں اچھے کاموں اور نیک اعمال کے لیے عموماً جو اصطلاح استعمال ہوئی ہے، وہ ہے ''صالحات۔'' اس کا ترجمہ انگریزی میں wholesome deeds کیا جا سکتا ہے۔ اردو میں کھول کر کہیے تو وہ عمل جو مفید و سودمند اور موافق ہو۔ جو لوگ صالحات پر عمل پیرا رہتے ہیں ان کو ''صالحون'' کا نام دیا جاتا ہے۔

جب قرآن یا اسلامی روایتی علوم میں ''صالحات'' یا نیک اعمال کا ذکر آتا ہے تو اس سے مراد ہوتی ہے وہ عمل جو فرمانِ خداوندی کی اطاعت کا مظہر ہو۔ صالحات میں سب سے بنیادی عمل پانچ ارکانِ دین ہیں جن کا ہم نے سابقہ صفحات میں بیان کیا ہے، لیکن ہر دوسرا نیک عمل بھی اس قبیل میں شامل ہے، یعنی وہ سب کام جن کو شریعت اچھا اور نیک عمل قرار دیتی ہے۔ مزید برآں اسلام کی دوسری اور تیسری جہت کے ماہر علما اس اصطلاح کے مفہوم کو پھیلا کر دیکھتے ہیں اور یوں ''نیکی'' اور ''خیر'' کی ایک وسیع تر تعریف اس میں شامل ہو جاتی ہے۔

''اسلام'' کا تاریخی پیکر

علما وہ لوگ ہیں جنھیں دین کا علم حاصل ہے۔ اس تعریف کے مطابق سب سے زیادہ علم رکھنے والی ہستی اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اللہ کے اسما میں سے ایک ''العلیم'' بھی ہے۔ نوع انسانی میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر انسان سے زیادہ علم کا حامل مانا گیا ہے۔ آپؐ نے خود فرمایا: ''مجھے زمین و آسمان کی ہر شے کا علم دیا گیا ہے۔'' سو فطری بات ہے کہ شریعت کی تعلیم دینے میں اوّلیت اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی علیہ السلام کو حاصل ہے۔ قرآن اور حدیث اسی عملِ تعلیم کے مظہر ہیں۔

قرآن اور سنت

اسلامی علوم کو ترتیب دینے میں رسولِ خداؐ کا جو کردار رہا ہے، اسے کم نہ جانیے۔ اصولی طور پر تو ہر چیز قرآن میں موجود ہے، لیکن اسلام اور اس کی عبادات کے بارے میں تفصیلات کی ایک کثیر تعداد صرف احادیث کے ذخیرے میں پائی جاتی ہے، مثلاً یہ دیکھیے کہ قرآن میں بار بار نماز ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور مختلف آیات سے یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ نماز کی ادائی کے لیے سیدھے کھڑے ہونا، جھکنا، سجدہ کرنا اور دو زانو بیٹھنا ہوتا ہے۔ اسی طرح قرآن سے یہ چیز بھی وضاحت سے سمجھ میں آتی ہے کہ نماز پڑھنے سے پہلے نمازی کو پاک ہونا چاہیے، لیکن قرآن میں کہیں بھی نماز کا اور وضو یا غسل کا تفصیلی طریقہ بیان نہیں کیا گیا، لہٰذا حضورؐ کی سنت یعنی آپؐ کا اسوہ و عمل دین کا علم حاصل کرنے کے لیے مطلقاً لازمی چیز ہو جاتی ہے۔ یہ سنتِ نبوی حدیث کے ذخیرے میں محفوظ کی گئی ہے۔ آنحضرتؐ ہی نے لوگوں کو سکھایا کہ انھیں نماز کے لیے کیسے کھڑے ہونا ہے، کیوں کر جھکنا ہے اور سجدہ کرنا ہے اور ان کے ساتھ کون سی قرآنی آیات کی تلاوت یا کلماتِ حمد و تسبیح کو ادا کرنا ہے۔

آنحضرتؐ کے قریبی اصحاب میں سے کئی حضرات نے شریعت کا علم سکھانے اور دوسروں تک منتقل کرنے میں نہایت ہی اہم کردار انجام دیا۔ ان اصحاب نے آپؐ کو مختلف مواقع پر خطاب کرتے اور عمل کرتے دیکھا۔ بعد ازاں ان حضرات نے آپؐ کے قول و فعل کو دوسرے لوگوں کے لیے بیان کیا۔ ان ساتھیوں میں آپؐ کی زوجہ محترمہ سیدہ عائشہؓ اور آپؐ کے عم زاد اور داماد سیدنا علیؓ سب سے

اہم ہیں۔ کتبِ حدیث میں آپؐ کے صحابہ سے سیکڑوں روایات محفوظ کی گئی ہیں۔

اسلام بنیادی طور پر ایک عملی روش، ایک اندازِ زیست اور خدا اور اس کی مخلوق سے ہم آہنگی و یگانگت استوار کرنے کا ایک قرینہ ہے۔ جس طرح اپنے وسیع کائناتی مفہوم میں اسلام عبارت ہے حکمت اور امرِ خداوندی کے سامنے ہر شے کی سرافگندگی اور تسلیم وفرمانبرداری سے، اسی طرح اس سے بھی زیادہ اپنے مخصوص انسانی معنوں میں اسلام کا مطلب یہ ہے کہ انسان اور انسانی معاشرہ، اللہ کے دیے ہوئے نقشے کے مطابق اپنے فرائضِ منصبی کو ٹھیک ٹھیک انجام دیں۔ زندگی کرنے کا یہ صحیح طریقہ اور قرینہ دیگر ہر چیز سے پہلے عمل اور طریقِ عمل میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ عمل کا دارومدار علم اور ارادے پر ہے، یعنی اس کا تعلق امکاناتِ عمل کو جاننے اور شعوراً ایک راہِ عمل پر گامزن ہونے سے ہے، لیکن یہ ایک الگ بحث ہے جس کا ذکر ہم مناسب مقام و محل پر کریں گے۔ سرِدست ہم یہ نکتہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ مسلمان ہونے کا پیمانہ اور معیار بنیادی طور پر وہ خارجی عمل ہے جو انسان کو انجام دینا ہوتا ہے۔

سو اچھا مسلمان ہونے کا مطلب رسول خداؐ کی سنت کی پیروی کرنا، یعنی ہر کام کو اس طرح کرنا جس طرح آنحضرتؐ نے اُسے انجام دیا۔ حضورؐ کا اہم ترین عمل یہ تھا کہ آپؐ نے اللہ تعالیٰ سے قرآن مجید حاصل کیا اور پھر اُس کی مدد سے دینِ اسلام کی بنیاد رکھی۔ آپؐ کے پیروکار قرآن کو اللہ سے براہ راست حاصل نہیں کر سکتے، وہ صرف آپؐ کے وسیلے اور وساطت سے بالواسطہ اُس تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اُن کی قرآن تک رسائی اور اس سے آگاہی قرآن سیکھنے، اسے یاد کرنے اور اس کی تلاوت کرنے سے عبارت ہے۔

حفظِ قرآن، یعنی قرآن کو زبانی یاد کرنا ایک مذہبی عمل کے طور پر سب سے زیادہ باعث اجر اعمال میں سے سمجھا جاتا ہے اور جب کہ ہم ذکر کر چکے ہیں، روایتی اسلامی تعلیم کی بنیاد ہی قرآن یاد کرنے کے عمل پر اٹھائی گئی ہے۔ ہر مسلمان قرآن کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور یاد کرتا ہے کہ سورۃ فاتحہ اور دیگر چند سورتوں کے یاد کیے بغیر نماز ادا کرنا ممکن نہیں۔ نماز سے مسلمانوں کے اندر ہر روز قرآن کی ایک تازہ بازگشت پیدا ہوتی ہے۔ انسان کے سامانِ ہستی میں نماز کو وحیِ قرآنی کی اولین اور اساسی تجسیم کی حیثیت حاصل ہے۔

انسانی زندگی میں عمل کی بنیادی حیثیت کو نظر میں رکھیے تو یہ بات باعثِ تعجب معلوم نہیں ہوگی کہ مسلمانوں کو اگر کسی شخص کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا ہو کہ وہ اسلام کو مانتا ہے یا نہیں تو اس کی جانچ اس کے عمل سے کی جاتی ہے۔ تاریخ کا جائزہ لیجیے تو یہ بات یقینی قرار پاتی ہے کہ دین کے تمام اساسی

اعمال عہدِ نبوی سے متواتر چلے آرہے ہیں۔ زندگی میں ہر ہر موقع پر کیا عمل، کس طور کیا جانا چاہیے، اس کے بارے میں مسلمان ہمیشہ ہی بہت چوکس اور بیدار رہے ہیں۔ وہ پوری توجہ اور احتیاط سے رسولِ خداؐ کی بات سنتے تھے، آپؐ کے عمل کو غور سے دیکھ کر یاد رکھتے اور جو سیکھتے تھے، اسے اپنی زندگی کے عملی سانچے میں ڈھال لیتے تھے۔ شریعت کی تفصیل و ترتیب کو بنیاد اور اساس اللہ کے انھی نیک طینت اور مخلص بندوں کے عمل نے فراہم کی تھی۔ یہ بندگانِ خدا اپنے ہر عمل کا نقشِ اوّل اس کی اوّلین مثال، نبی علیہ السلام کی سنت سے اخذ کرتے تھے۔

اسلام کے اعمالِ دینی کو تاریخ میں مسلمانوں نے عہدِ نبوی کے بعد کس طرح نسل بہ نسل منتقل و محفوظ کیا، اس کی تفصیلات ہمارا موضوع نہیں، اور نہ ہی یہ بہ تمام و کمال معلوم ہیں۔ جدید مورخین نے اس تاریخی عمل کا خاکہ ترتیب دینے میں بہت سر کھپایا ہے لیکن انھیں اس ضمن میں کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوسکی، تاہم سنت کے تواتر سے منتقل ہونے کا حاصل ہمارے سامنے ہے جس کی بدولت شریعت پر عمل کرنے کے کئی مسلمہ طریقے اور راستے ہمارے لیے متعین ہو چکے ہیں۔

مذاہبِ فقہ

جیسے جیسے وقت گذرتا رہا، سال صدیوں میں بدلتے رہے، سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی سنت انسانوں کے زندہ حافظے میں رفتہ رفتہ کمزور پڑنے لگی۔ سو یہ ضروری ٹھہرا کہ آپؐ کی زندگی اور آپؐ کے عمل کی تفصیلات و جزئیات کو تحریراً محفوظ کر دیا جائے، مبادا یہ معلومات ہمارے ذہن سے اوجھل ہو جائیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ تمام معاملات جن میں اسلام نے اپنا آپ مستحکم کر لیا تھا، انھی تمام مسائل کی زد میں آتے چلے گئے جو انسان کی ہست و بود کا خاصہ ہیں، یعنی اسلام کو بھی اختلاف رائے، اقتدار کی کشاکش، محبت اور نفرت اور قدرتی، نیز انسان کی لائی ہوئی آفات کا سامنا کرنا پڑا۔ بالفاظ دیگر، تاریخ کا دھارا اپنے معمول پر بہنے لگا، لیکن ایک فرق کے ساتھ۔ اب انسان اور انسان کے رشتے کو قرآن اور سنت کی رو سے طے ہونا تھا۔ قرآن اور سنت تاریخ میں اپنا مقام ثبت کر چکے تھے۔

آئینۂ ایام میں اس زمانے کا عکس گویا ہر زمانے کی صورت گری کر رہا تھا۔ اس سلسلے میں سیدنا علیؓ کا ایک قول تو ایسا ہے جو گویا مستقبل کے ہر مؤرخ کی تحریر کو سمیٹ کر بیان کر رہا ہے۔ آپؓ نے فرمایا: ''وقت دو طرح کا ہوتا ہے، ایک دن تمھارے ساتھ ہے تو دوسرے دن تمھارے برخلاف۔'' مگر انھوں نے صرف اتنا کہنے پر اکتفا نہیں کیا۔ ان کے سامنے قرآن کی مثال تھی جو تاریخی واقعات کا بیان ہی

اس لیے کرتا ہے کہ اس سے انسان اور اس کے رب کے مابین تعلق کے بارے میں ہمیں عبرت آموزی اور ہدایت کا سبق دے سکے، لہٰذا ساتھ ہی انھوں نے لوگوں کو یاد دلایا کہ دو بنیادی فضائل اخلاق، دو بنیادی رویے ہر انسان کو اپنے اندر راسخ کرنا چاہییں۔ ''جب زمانہ تمھارے ساتھ ہو تو خدا کا شکر ادا کرو اور جب زمانہ تم سے منہ پھیر لے تو صبر سے کام لو۔''

ابتدائے اسلام میں رسولِ خداؐ کی سنت کی پیروی کرنا اور مسلمان ہونا ایک ہی بات تھا۔ اپنے بڑوں کر دیکھ کر لوگ باگ سنت کی پیروی کا طریقہ سیکھتے تھے۔ اسی سے آپؐ کے اس ارشاد کے معنی اجاگر ہوتے ہیں جس میں آپؐ نے فرمایا: ''میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں، جس کسی کے بھی نقش قدم پر چلو گے ہدایت پاؤ گے۔'' صحابہؓ کے بعد تابعین (Followers) کا زمانہ آیا۔ ان حضرات نے صحابہؓ کی آنکھیں دیکھی ہوئی تھیں۔ اسلام جب تک ایک نسبتاً مختصر گروہِ مردم کا دین تھا اور مسلمانوں کی تعداد زیادہ نہیں ہوئی تھی، ہر ایک کا ایمان اور عمل، اخلاص اور شوقِ عمل سے معمور تھا۔ اس زمانے تک تو اچھا مسلمان ہونے کے لیے یہ بات کافی تھی کہ آپ اپنے ساتھیوں اور استادوں کو دیکھ کر دین سیکھیں اور ان کی مثال کو سامنے رکھیں، مگر رفتہ رفتہ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، اسلامی معاشرہ جس کی بنیاد اسلام کی تین جہات پر اٹھائی گئی تھی، پھیلتا اور وسیع ہوتا گیا۔ اسلام کی ابتدائی فتوحات سے معاشرے میں ہر طرف دولت کی ریل پیل ہونے لگی۔ کتنے ہی مسلمان ایسے رہے ہوں گے جن کی نظر دین کے اصل ہدف اور مقصود سے ہٹ کر کارِ دیگر میں الجھ گئی ہوگئی۔ اس نقطے پر آ کر دین کا علم سمٹنا شروع ہوا اور یہ بتدریج گنے چنے لوگوں تک محدود ہونے لگا۔ اہلِ علم کے اس طبقے نے مناسب یہ جانا کہ اپنے علم کو نسبتاً کم طلبا تک منتقل کر دیں، ایک آدھ کتاب لکھ دیں جس سے کم از کم علم کی اساسیات اور ضروری باتیں محفوظ ہو جائیں۔

خلاصہ یہ کہ ہوتے ہوتے سنت کا علم ایک خاص شعبۂ علم قرار پایا۔ مزید برآں یہ ہوا کہ جیسے جیسے اسلامی معاشرے کی حدود وسیع ہوتی گئیں، زندگی کے تقاضوں، حالات کے نشیب و فراز اور آنے والے وقت کے بطن سے پھوٹنے والے امکانات نے مسلمانوں کو ہر طرح کے انسانی تجربات کے روبرو لا کھڑا کیا۔ انھیں ان سب معاملات کا سامنا کرنا اور ان کے بارے میں اپنا رویہ متعین کرنا پڑا۔ اب اگر اسلام عملِ صحیح اور راہِ صواب سے عبارت ہے اور ساری دنیا، ساری زندگی اس کے دائرے میں شامل ہے تو اس کا مطلب لازماً یہ تھا کہ سنت پر عمل کرنے کے آرزومند اور کوشاں مسلمان ہر معاملے کو

اسی نگاہ سے دیکھیں اور کسی ایک بات کو بھی نظر انداز نہ کریں۔

اب اگر کسی ایسی صورتِ حال، کسی ایسے معاملے کا سامنا کرنا پڑے جو رسولِ خداؐ کی زندگی میں کبھی اٹھا نہ تھا تو پھر لوگ کیا کریں؟ دوسری طرف یہ بھی دیکھنا پڑا کہ اگر آپؐ کے عمل کے بارے میں دو یا اس سے زیادہ باتیں ان کے علم میں آئیں اور یہ روایتیں باہم مختلف ہوں تو پھر کیا راہِ عمل اختیار کی جائے؟ صحیح روایت اور درست خبر کا فیصلہ کیوں کر ہو؟ یہی مسائل تھے جن کی وجہ سے رفتہ رفتہ متعدد الگ الگ ''مذہب''[۲۷] (پگ ڈنڈیاں، پٹے ہوئے راستے) trodden paths وجود میں آگئے۔ ان میں سے ہر ایک قدرے مختلف اندازِ فہم کا نمایندہ تھا۔ رسول خداؐ کی سنت اصل میں کیا ہے اور اس کو انسانی زندگی اور معاشرے پر کیوں کر لاگو کیا جائے، اس بات کو جاننے اور سمجھنے کا ہر ایک کا ذرا الگ اسلوب تھا۔ ہم نے ''قدرے مختلف'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ یہ آج ہم کہہ رہے ہیں عہدِ جدید میں کھڑے ہو کر اور اس کے تناظر میں، ورنہ اپنے زمانے میں یہی اختلافات بہت بنیادی اختلافات کے طور پر ظاہر ہوتے تھے اور ایسا بھی ہوا کہ آرا کا تصادم بالآخر باقاعدہ لڑائی کی طرف لے گیا (لڑائی کے بارے میں البتہ یہ یاد رہے کہ اس کی نوبت مختلف سماجی اور سیاسی محرکات اور عناصر کو معاملے میں آمیخت کرنے سے ہی آتی تھی)۔ شروع زمانے میں یہ مکاتبِ فکر، یہ راہِ عمل بیسیوں کی تعداد میں تھے اور ان میں سے ہر ایک کا مرکزی نقطہ کسی بڑے اہلِ علم کی تعلیمات تھیں، کوئی ایسا شخص جسے سنت کا گہرا اور وافر علم میسر تھا۔ وقت گذرنے کے ساتھ یہ مکاتبِ فکر یا تو منظرِ عام سے اٹھ گئے یا ایک دوسرے میں مل کر یک نظر و ہم آہنگ ہو گئے۔ مآل کار ان میں سے چار مکاتبِ فکر کو سنیّوں میں یکساں طور پر مستند مکاتبِ فکر کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ مسلمان ان میں سے کوئی بھی راستہ اختیار کر سکتے ہیں اور یہ بھی کوئی غیر معمولی بات نہیں سمجھی جاتی، اگر آپ ایک راہِ عمل کو دوسری سے ملا دیں۔ ایک مسئلے میں کسی ایک مذہب کو اختیار کر لیں اور دوسرے معاملے میں دوسری راہ پر گامزن ہونے کو ترجیح دیں۔

رسولِ خداؐ کی سنت کے مختلف اسالیب کو بیان کرنے کے لیے جو لفظ استعمال ہوا وہ تھا ''مذہب''، جو ''ذھب'' یعنی 'جانا' سے نکلا ہے۔ ''مذہب'' ایک طریقہ اور انداز ہے جانے کا یا چلنے کا، ایک راستہ، پگ ڈنڈی، گذرگاہ، چلتا ہوا رستہ۔ اس کا ترجمہ بسا اوقات ''فقہی مکتبِ فکر'' (School of Jurisprudence) یا ''قانونی مکتبِ فکر'' (School of Law) کی اصطلاحات سے بھی کیا جاتا ہے۔ اسلام پر عمل کرنے کا ہر درست اور صحیح طریقہ شاہراہِ سنت پر ہی گامزن ہونے کے مترادف ہے۔ ان میں سے ہر ایک، شریعت

کی تعبیر وتشریح اوراس کے اطلاق کا ایک اسلوب اورانداز ہے۔

اہلِ سنت کے چار مذاہب ِفقہ اُن چار حضرات کے نام سے منسوب ہیں جنھیں ان مذاہب کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے ہاتھوں ان کے مکاتب ِفقہ کے اصول وقواعد مدوّن ہوئے اور ہر مکتب کو دوسرے مکاتب ِفقہ سے الگ ایک امتیازی حیثیت حاصل ہوئی۔ مذاہب ِفقہ کے چار بانی حضرات کے نام ہیں: امام ابوحنیفہ (م ۱۵۰ھ/ ۷۶۷ء)، امام مالک بن انس (م ۱۷۹ھ/ ۷۹۵ء)، امام الشافعی (م ۲۰۴ھ/ ۸۲۰ء) اور امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ/ ۸۵۵ء)۔شیعہ حضرات کی اکثریت پانچویں مذہب یا مکتب ِفقہ کی پیروکار ہے جسے ان کے چھٹے امام، یعنی امام جعفر صادق (م ۱۴۸ھ/ ۷۶۵ء) سے منسوب کیا جاتا ہے۔اتفاق یہ ہے کہ امام جعفر صادق امام ابوحنیفہ کے استاد بھی تھے۔

ان مذاہب میں باہمی فرق کوئی بہت بڑا نہیں ہے، کم از کم بہ نظر ظاہر تو کوئی بنیادی اختلاف نہیں پایا جاتا اور سردست ہمیں اسی نقطۂ نظر سے بات کرنا مقصود ہے۔ کسی ایسے غیر مسلم سے بات کیجیے جو شریعت سے آگاہ نہ ہو تو آپ دیکھیں گے کہ اسے ان مذاہب کے فرق کو سمجھنے میں سخت دشواری ہو رہی ہے، مثلاً اسے یہ پتا نہیں چلتا کہ الگ الگ فقہی مسلک کے مسلمان نماز پڑھنے میں ایک دوسرے سے کس طرح مختلف ہیں۔ فقہ اور اُصولِ فقہ کے ماہرین البتہ آپ کو نماز کے ہر ہر مرحلے اور نماز کے جملہ مراسم میں جزئیات کا باریک فرق بتا سکیں گے۔ مختلف مکاتب ِفقہ میں بعض مسائل اور نکات پر اتفاق رائے ملتا ہے اور دیگر معاملات میں ان کی رائے ایک دوسرے سے الگ ہے۔ جعفری یا شیعہ مکتب فقہ بھی اس اعتبار سے دوسرے مذاہب سے جدا نہیں ہے، بلکہ بہت سی باتوں میں اسے حنفی فقہ سے خاص طور پر قریب کہا جا سکتا ہے۔ دو معاملات البتہ ایسے ہیں جن میں جعفری مکتب ِفقہ کا معمول ایسا ہے جو اسے چاروں سنی مذاہب سے الگ کر دیتا ہے۔ پہلی چیز متعہ، یعنی وقتی نکاح کی اجازت ہے اور دوسری زکوٰۃ کی ایک خاص شکل کو جسے خمس (پانچواں حصہ) کہا جاتا ہے، امام کا حق گردانا جاتا ہے۔

اسلامی تاریخ کی ابتدائی صدیوں میں بہت سے مذاہب ِفقہ پائے جاتے تھے، لیکن آخر آخر آ کر سبھی سنی مسلمان چار مذاہب میں سے کسی ایک پر عمل پیرا ہو گئے۔ جب یہ مذاہب راہِ صواب اور صحیح اندازِ عمل کے طور پر معاشرے میں قائم ہو گئے تو اس کے بعد شریعت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اس بات میں اتنی صداقت ہے کہ اکثر یہاں تک سنا جاتا ہے کہ احکامِ شریعت طے کرنے کے ضمن میں ''اجتہاد کا باب'' اب بند ہو چکا ہے۔ تاہم بہت سے بڑے علما نے بابِ اجتہاد کے بند

ہونے کی اس رائے کو لائق اعتنا نہیں جانا اور معاملات شرعی میں اپنی صوابدید کے مطابق اجتہاد سے کام لیتے رہے۔ شیعہ حضرات تو اس رائے کو سرے ہی سے نہیں مانتے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ بابِ اجتہاد کے بند ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ کسی مرحوم عالم کی فقہی اور قانونی رائے پر عمل کرنے کا ویسے ہی کوئی جواز نہیں۔

اہلِ مغرب نے اسلام کے بارے میں جو تحقیق و تصنیف کی ہے، اس میں شروع میں ایک رجحان بہت عام تھا۔ بابِ اجتہاد کے بند ہونے کے حوالے سے بہت باتیں کی جاتی تھیں اور ان میں نیت یہ رہتی تھی کہ اس نکتے کو اسلامی قانون کے جامد ہونے کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جائے اور یہ باور کرایا جائے کہ اسلام کی وجہ سے قانونی اور فقہی سوچ بے کار اور بے اثر ہوگئی۔ مغربی اہلِ علم اپنی تحریروں میں عموماً یہ جتانے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ ان جیسے جدید انسان تو نہایت فعال، متحرک اور زیرک ہوتے ہیں جب کہ گذرے ہوئے وقتوں کے لوگ قدرے دوں نظر، کم فہم اور تیزیِ ادراک سے محروم تھے۔ آج کل کے لکھنے والے اس طرح نہیں سوچتے، بلکہ انھیں احساس ہے کہ ان پرانی تحریروں میں غیر مغربی معاشروں کے بارے میں صادر کیے گئے یہ فیصلے اپنی داد آپ دینے کے عملِ خودستائی کا شاخسانہ ہیں۔ بنیادی مآخذ کی دوبارہ پرکھ پڑتال آج کے اہلِ علم کا شیوہ ہونا چاہیے۔ نتیجہ یہ کہ اسلام کی قانونی اور فقہی فکر کے بارے میں اب یہ کہا جانے لگا ہے کہ اس کے کئی شعبوں میں بہت فعالیت اور فکری سرگرمی جاری رہی ہے بالخصوص جن معاملات میں نئے نئے سوالات اور تغیر پذیر حالات سے سابقہ پڑتا رہا ہے۔ تاریخ کے اتار چڑھاؤ اور عمل تغیر سے حالات میں تبدیلی واقع ہونا ایک فطری چیز ہے۔ بابِ اجتہاد کے بند ہونے کی رائے اگر کسی حد تک درست کہی جا سکتی ہے تو وہ دین کے پانچ ارکان کے بارے میں ہے — وہ پانچ بنیادی اور اساسی اعمال جو سنتِ نبوی نے متعین کر دیے ہیں۔

فقہ اور سیاست

اہلِ فقہ علما کا وہ طبقہ ہے جو شریعت میں خاص مہارت رکھتا ہے۔ ہر فقیہ کو عموماً کسی ایک فقہی مکتبِ فکر میں خصوصی مہارت حاصل ہوتی ہے۔ ان میں سے بعض علما دوسرے مکاتبِ فقہ کا بھی علم رکھتے ہیں۔ عیسوی ذہن سے سوچیے یا مابعد عیسائیت نقطۂ نظر سے غور کیجیے تو فقہ و قانون کا ''روحانیت'' (pirituality) سے کوئی ربط معلوم نہیں ہوتا۔ اس رائے میں کسی حد تک صداقت ہے اور کئی ایک

مسلمان علما نے بھی صدیوں تک ایسی ہی آرا کا اظہار کیا ہے، اس لیے کہ فقہا تمام جزئیاتِ عمل پر نہایت تفصیل سے نظر کرنے کے عادی ہوتے ہیں اور ان کے بارے میں معروف ہے کہ وہ وکیلوں کی طرح ایک ہی راگ الاپتے رہتے ہیں۔ فقہ وہ علم ہے جسے بال کی کھال نکالنے میں مزا آتا ہے۔ یہ ایک ضروری شعبۂ علم ہے، لیکن اگر سارا زور اسی پر صرف ہو جائے تو اسلام کی باقی دو جہتوں پر جو توجہ دینا چاہیے، اس میں کمی آ جائے گی۔

آج کے قانون دان حضرات کی طرح اسلامی قانون کے ماہرین میں سے بھی بہت سے علما کو سیاست سے گہرا شغف تھا اور وہ سیاسی معاملات میں حصہ لیتے رہتے تھے۔ پھر شریعت میں بہت سے احکامات اور قوانین ایسے بھی مقرر کیے گئے ہیں جن کی ایک عمومی سماجی حیثیت ہے، خاص طور پر وہ احکام جن کا تعلق لین دین کے معاملات اور باہمی معاہدوں سے ہے۔ مزید برآں قرآنِ مجید میں عدل و انصاف کو انسانی تعلقات اور معاملات میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہی نہیں بلکہ قرآن زکوٰۃ کے نظام کے ذریعے سرمایہ و دولت کی تقسیم کے لیے ٹھوس قاعدے مقرر کرتا ہے نیز انفاق وصدقات کی دیگر صورتوں کی بھی ترغیب دیتا ہے۔

قرآن اور صاحبِ قرآن نے بلاشبہ انسانی معاشرے کے لیے ایک لائحۂ عمل دیا ہے اور اسلام کی تاریخ اس لائحۂ عمل کی کسی حد تک کامیاب تعمیل کی شہادت بھی دیتی ہے تاہم قرآن اور حدیث دونوں میں حکومت چلانے اور کارِ جہانبانی کے طور طریقوں کی صراحت نہیں کی گئی۔ مسلمانوں میں شروع میں جو فلسفی ہوئے ان میں سے بعض کی طرف سے سیاسی نظریات پیش کیے گئے، لیکن یہ نظریات عملاً کبھی اثر انداز نہ ہو سکے۔ اسلام کی تاریخ میں ہوا یہ کہ اس وقت کے رائج الوقت سیاسی ادارے اور نظام جو بنیادی طور پر ملوکیت پر مبنی تھے، پہلے کی طرح چلتے رہے۔ بنو امیہ اور بنو عباس کی خلافتیں بظاہر تو اسلامی حکومت کے طور پر قائم تھیں مگر تھیں وہ موروثی بادشاہت ہی کی ایک صورت۔ خلفا چونکہ اپنی حکومت کا جواز اسلام ہی کے دامن میں تلاش کرتے تھے، لہٰذا اُنھیں لازماً شریعت ہی کو قانونِ وقت کے طور پر قبول کرنا پڑتا تھا۔ ان خلفا میں سے کئی حکمران اپنی ذاتی زندگی میں شریعت پر پوری دیانت سے عمل بھی کرتے تھے جب کہ کچھ ایسے بھی تھے جن کے بارے میں اس کے برعکس روایت کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت کا بہرحال یہی خیال تھا کہ بادشاہ اور خلیفہ کو اس وقت تک جائز حکمران تسلیم کیا جاتا رہے گا، جب تک وہ کھلم کھلا شریعت کو رد نہ کرے۔

عام طور پر سننے میں آتا ہے کہ اسلام میں نظامِ حکمرانی کو دین کے دائرے سے باہر نہیں رکھا گیا۔ یہ بالکل درست ہے۔ اسلام کی نظر میں دنیا کی کوئی چیز خداوند قدوس کی قلمرو سے باہر نہیں، لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اسلام کی تاریخ میں جو بھی حکومت گذری ہے، وہ نیک اور مخلص مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی اور وہ شریعت کی پابندی کا عندیہ رکھتے تھے۔ شاہان وسلاطین دنیائے دوں کی غلامی پر مائل لوگ تھے۔ یہی حال ان دیگر لوگوں کا بھی تھا جو عام طور پر کاروبارِ مملکت میں شمولیت اختیار کرتے تھے۔ مسلمانوں میں ہمیشہ یہ کہا گیا کہ حکومت کو شریعت نافذ کرنا چاہیے اور امورِ سلطنت کی باگ ڈور اچھے مسلمانوں کے ہاتھ میں رہنا چاہیے، لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ عموماً ایسا ہوتا نہیں۔ استثنا کی بات اور ہے۔ بعض مسلمانوں کی رائے یہ ہے کہ اسلامی معاشرے پر ایک نیک مسلمان کی حکمرانی کی آخری مثال خلیفۂ چہارم سیدنا علیؓ کے ہاں ملتی ہے ورنہ خلافتِ بنوامیہ سے لے کر آج تک اسلامی تعلیمات پر عمل کے معاملے میں حکومتوں کا کردار مسلسل زوال ہی کا شکار رہا ہے۔ آج کی جمہوری اسلامی ریاستیں بھی اس عمومی قاعدے سے مستثنیٰ نہیں۔ زیادہ تر تو یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ دین ان لوگوں کا جدید ترین حربہ بن گیا ہے جو خود ہوسِ اقتدار کے اسیر ہیں۔

علمائے اسلام میں سے بہت سی ہستیوں نے فقہا پر یہ طعن کیا ہے کہ ان میں مراکزِ اقتدار کے گرد جمع ہونے کا میلان رہا ہے۔ اہلِ فقہ کے پاس حکومتِ وقت کے عزائم اور کارکردگی پر کہنے کو ہمیشہ کچھ نہ کچھ ہوتا ہی ہے۔ اکثر اوقات تو وہ محض اپنا فرض ادا کر رہے ہوتے ہیں کہ آخر شریعت پر ٹھیک ٹھیک عمل کرنے کے لیے ہدایات اور رہنمائی فراہم کرنا انھی کی ذمہ داری ہے، لیکن ماہرین قانون تو ہر جگہ ایک سے ہوتے ہیں۔ فقہا کو بھی قانون کی تاویل اور اسے اپنے اغراض و مقاصد کے لیے برتنے کا فن آتا ہے اور ہر زمانے میں ایسے اہل فقہ ہو گذرے ہیں جو حکمرانِ وقت کے ہاتھوں اپنی متاعِ ہنر فروخت کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ ہر بادشاہ کو اِکا دُکا سرکاری مفتی وملّا ایسا میسر آ جاتا تھا جو اس کی خوشنودی کے لیے حسبِ ضرورت ہر وہ فتویٰ یا ''اسلام کا حکم'' جاری کرنے پر تیار ہو جاتا تھا جس سے حکومتِ وقت کی غرض پوری ہوتی ہو۔

دورِ جدید میں مسلمان اہلِ علم نے سیاسی نظریات، نظامِ حکومت اور علومِ سیاسیات پر غیر معمولی توجہ مبذول کیے رکھی ہے۔ ان کاوشوں کا محرک اکثر اوقات یہ رہا ہے کہ اسلام کو ''جمہوریت'' کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا جائے تاکہ وہ مغرب کے پیمانۂ جمہوریت پر پورا اُتر سکے (یادرہے کہ مارکسیت نے بھی ہمیشہ خود کو بہترین جمہوری نظام کی صورت میں پیش کیا ہے)۔ سیاست کے بارے

میں اسلام کے حوالے سے کتابیں بہت لکھی گئی ہیں۔ وہ قارئین جو اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہیں کسی بھی کتب خانے سے رجوع کر سکتے ہیں۔

ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ساری اسلامی تاریخ میں مسلمانوں کی بڑی اکثریت کے لیے سیاست کبھی کوئی زیادہ اہم معاملہ رہا ہی نہیں۔ بہت سے مسلمان مفکرین کو شریعت کی بنیاد پر سماجی ہم آہنگی، اتفاق، امی جہی اور توازن پیدا کرنے سے گہری دلچسپی رہی ہے، مگر ان کی نظر میں یہ کام حکومت کی طرف سے نہ تو ہوتا ہے اور نہ ہونا چاہیے۔ عوام کو شریعت کی پابندی کرنا چاہیے، اپنے آپ کو شریعت کے مطابق اور دین کی دوسری جہات کے مطابق ڈھالنا چاہیے۔ اگر یہ ہو گیا تو معاشرہ خود ہی سماجی توازن اور ہم آہنگی کی راہ پر پڑ جائے گا۔ قرآنِ مجید میں بار بار **امر با لمعروف** اور **نهی عن المنكر** bidding to honour and forbidding dishonour کا حکم آیا ہے۔ اس حکم کا مطلب ہمیشہ یہی سمجھا گیا ہے کہ انسان پر اپنے ماحول اور معاشرے کے سلسلے میں ایک سماجی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، لیکن یہ حکم بہت سے احکام میں سے صرف ایک ہے اور دوسرے احکام اس پر فائق ہیں۔ اس حکم کو یہ رنگ دینا مشکل ہے کہ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے چند اہلِ سیاست کو یہ قوت عطا کر دی ہے کہ وہ زمامِ کار سنبھال کر ان پالیسیوں پر عملدرآمد کا آغاز کریں جو ''معاشرے کی ضرورت'' ہیں۔

اسلامی زندگی کا آدرش ہمیشہ نامیاتی رہا ہے میکانیکی نہیں۔ اس امر کو محسوس کرنا ہو تو بہترین طریقہ یہ ہے کہ روایتی اسلامی شہروں کے تعمیری مزاج اور بناوٹ پر نظر کی جائے۔ انھیں دیکھ کر جنگل کے سبزہ و گل کی نمو نظروں میں پھرنے لگتی ہے۔ شہر کے جدید تصور کا آئیڈیل ۹۰ درجے کے زاویے پر کٹے ہوئے رقبے کی تقسیم ہے، ایک ''عقلی'' نظام جو شہر پر خارج سے لاگو کیا گیا ہو۔ اسلامی دنیا کے بہت سے علاقوں میں سیکولر حکومتوں نے پرانے شہروں پر یہی اقلیدسی تقسیم نافذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کوشش کا ایک مقصد تو یہی تھا کہ روایتی معاشرے کے سماجی تانے بانے اور نظام کو درہم برہم کر کے مغرب کے صنعتی معاشرے کے نمونے کے مطابق دوبارہ تشکیل دیا جائے۔ اس طرح مسلمانوں کے جدید سیاسی مفکرین بھی اگر نظامِ حکومت کے بارے میں روایتی تعلیمات کی عقلی توجیہات پیش کر رہے ہیں تو ان کے پیشِ نظر بھی کچھ خاص مقاصد ہیں۔ حدیثِ جبرئیل کے آخری حصے پر گفتگو کرتے ہوئے ہم اس امر کی طرف بھی اشارہ کریں گے کہ ایک خاص قبیل کی جدید عقلیت پرستی پر اتنا بے تحاشا زور دینے سے کیا نقصان ہو رہا ہے۔ اس کا صرف ایک ہی نتیجہ ہے، اسلامی اقدار اور اسلامی تصورِ کائنات کی بربادی۔

حصّہ دوم

ایمان

اسلام اور ایمان

حدیثِ جبرئیل میں رسول اللہؐ نے فرمایا تھا کہ ایمان یہ ہے کہ ''تم ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر اور یومِ آخر پر اور یقین رکھو تقدیر پر اور اس کے خیر وشر پر۔''

بادی النظر میں یوں لگتا ہے کہ یہاں ''ایمان'' کی تعریف متعین کی جارہی ہے، لیکن غور کیجیے کہ آپؐ کے قول میں ''ایمان'' کا لفظ دہرایا گیا ہے۔ کسی چیز کی اگر تعریف متعین کرنا مقصود ہو تو اس لفظ کی تعریف خود اسی لفظ سے نہیں کی جاتی۔ پس ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آنحضرتؐ ایمان کی تعریف نہیں کر رہے۔ انھیں معلوم ہے کہ ان کے مخاطب جانتے ہیں کہ ایمان کیا ہے۔ انھیں یہ بتانا ہے کہ کس چیز پر ایمان لانا درکار ہے۔ صرف ایمان لانا اور یہیں تک رک جانا کافی نہیں، نہ ہی صرف ''اللہ پر ایمان'' لاکر رہ جانا کافی ہے۔ ایمان کے دیگر ارکان بھی ہونا ضروری ہیں اور جب تک مذکورہ بالا تمام ارکان پر انسان کا ایمان نہ ہو، اس کا ایمان، ایمانِ اسلامی شمار نہیں ہوسکتا۔ یہ ایمان ہوگا، مگر کسی اور قسم کا ایمان۔

ایمانِ اسلامی کے ارکانِ ایمان پر بات کرنے سے پہلے ہمیں چاہیے کہ خود لفظ ''ایمان'' کی تعریف مقرر کرلیں، بلکہ یوں کہیے کہ عربی اصطلاح، ''ایمان'' کی تعریف متعین کرلی جائے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ''ایمان'' (Faith) کے بارے میں انگریزی میں جو تصورات عام طور پر پائے جاتے ہیں وہ ایمانِ اسلامی کے ضمن میں سراسر بے معنی ہوجاتے ہیں۔

انگریزی میں عموماً Faith اور Belief کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھا جاتا۔ ولفریڈ کینٹول سمتھ (Wilfred C. Smith) نے البتہ اس نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس لفظ کے عربی معانی سے اگر صرفِ نظر بھی کرلیں تب بھی اس بات کی ضرورت رہتی ہے کہ Faith (ایمان) کے انگریزی لفظ کو Belief (اعتقاد) سے الگ کرکے دیکھا جائے اور ان کے درمیان جو فرق ہے اس کو واضح کیا جائے۔[1]

انگریزی میں جب یہ کہا جائے کہ فلاں شخص اس بات پر اعتقاد رکھتا ہے (believes in) تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اس شخص کو اعتماد ہے کہ وہ بات درست ہے، لیکن کہنے کا مطلب اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کا یہ اعتماد غلط ہے اور وہ تمام قرائن کو نظر انداز کرکے ایک غلط خیال پر قائم ہے۔ اِس کے برعکس

اسلامی زبانوں میں جب ''ایمان'' کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس کا کوئی ایسا منفی مفہوم نہیں ہوتا۔ یہاں ایمان ایک اعتماد ہے ایسی صداقت پر جو حقیقی ہے، کوئی مفروضہ نہیں۔ یہاں اس بات کا شائبہ تک نہیں کہ اہلِ ایمان کسی باطل چیز پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کا ایمان جن چیزوں پر ہے، یعنی ارکان ایک معروضی حقیقت کی نمایندگی کرتے ہیں۔ مزید برآں ایمان کا مطلب یہ ہے کہ جب انسان یہ اعتماد کرلے تو پھر اس کی ذمہ داری بن جاتی ہے کہ وہ اپنے جانے ہوئے حق وصداقت کی بنیاد پر عمل پیرا بھی ہو اور وہی کرے جو اس کے ایمان کا تقاضا ہے۔

''ایمان'' کے بارے میں رسول اللہؐ نے فرمایا تھا کہ ایمان معرفتِ قلب، زبان سے اقرار اور اعضا و جوارح سے عمل کا نام ہے۔'' یعنی ایمان میں جاننا، زبان سے کہنا اور عمل میں لانا سب شامل ہے۔

اب جو شخص ایمان لاتا ہے وہ سب سے پہلے تو دل سے یہ مانتا ہے، جانتا ہے کہ یہ چیز حق ہے (''دل'' یا قلب کا لفظ ایسے ہی محلِ استعمال اور سیاق وسباق میں قرآن میں اکثر برتا گیا ہے) قرآن کے استعمال کے مطابق یہ لفظ بنیادی طور پر جذبات کی آماجگاہ نہیں۔ اس کے برعکس یہ ایک ملکہ یا قوت ہے یا ایک ایسا عضوِ روحانی ہے جو نوعِ انسانی کو دیگر غیر انسانی مخلوقات سے جدا کرتا ہے۔ عام طور پر ہم اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ''عقل'' (intelligence) کا لفظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ فلسفے کی زبان میں جب انسان کی تعریف ''حیوانِ ناطق'' کے طور پر کی جاتی ہے تو Rational کے لفظ کا جس چیز پر اطلاق ہوتا ہے، اُسے دل سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور یوں دل کی مماثلت نطق و گویائی اور ملکۂ فکر سے معلوم ہوتی ہے۔

قرآن مجید کے نقطۂ نظر سے حیوانِ ناطق وہ حیوان ہے جو دل رکھتا ہو۔ ایسا انسان جس کا دل اپنا کام نہ کرسکے، اپنے منصب سے گر جائے، وہ انسان نہیں حیوان ہے، بلکہ اس سے بھی بدتر۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے قرآن مجید کا فرمان ہے:

اِنْ هُم اِلَّا كَالْاَنعَامِ بَل هُم اَضَلّ (۲۵:۴۴) یہ تو بس چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔

''یہ لوگ تو بس ڈھور ڈنگر کی طرح ہیں بلکہ جانوروں سے بھی زیادہ حق سے دور ہیں۔'' دل صحت مند ہو تو وہ ماہیتِ اشیا کو جان لیتا ہے، لیکن کتنے ہی دل ہیں جو قرآن کی زبان میں ''بیمار'' ہیں، ''زنگ آلود'' ہیں یا ان پر ''تالے پڑے ہوئے ہیں۔'' دل صحت مند ہو، تبھی ایمان لاتا ہے اور ہر شے کو اس طرح دیکھتا ہے

جیسی کہ وہ ہے:

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا (۷:۱۷۹)
ان کے دل ہیں جن سے یہ سمجھتے نہیں۔

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ (۲۲:٤٦)
سو کچھ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں پر دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (٤٧:۲٤)
کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے یا دلوں پر ان کے تالے لگ رہے ہیں۔

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ (۲:۹-۱۰)
یہ لوگ اللہ کو اور ایمان والوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں، حالانکہ یہ خود اپنے آپ ہی کو دھوکا دے رہے ہیں اور اس بات کو جانتے نہیں۔ ان کے دلوں میں روگ تھا تو اللہ نے ان کے روگ کو بڑھا دیا۔

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۸۳:۱٤)
ہرگز نہیں، بلکہ ان کے دلوں پر ان کے عمل کا زنگ چڑھ گیا ہے۔

اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ (۵۸:۲۲)
یہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا ہے۔

هُوَ الَّذِىْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِىْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ (٤٨:٤)
وہی ہے جس نے ایمان والوں کے دل میں چین اُتارا تا کہ ان کے ایمان میں مزید ایمان کی افزونی ہو۔

پھر ایمان ''زبان سے اعلان و اقرار'' بھی ہے۔ انسان کو جو عقل کا ملکہ عطا ہوا ہے، وہ نطق و گویائی میں ظاہر ہوتا ہے اور یہ وہ ملکہ ہے جو صرف انسانوں کو ملا ہے، کم از کم ہماری اس دنیا میں تو اسی طرح ہے۔ دل نے حق کی جو شناخت کی ہے، اسے ظاہر کرنا لازم ہے اور اس کا پہلا اظہار خالص انسانی انداز میں ہونا چاہیے اور انسان کا خاصہ ہے گویائی۔ پس اظہارِ ایمان زبان سے ہوگا، یعنی انسان کے ملکۂ گویائی سے۔

اسلام کے نقطۂ نظر سے ملکۂ کلام اور قوتِ گویائی کو جیسی اہمیت حاصل ہے، اس کے بارے میں جو کچھ بھی کہیے کم ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات اپنے قول سے، اپنے کلام سے پیدا کی:

اِنَّمَاقَوْلُنَا لِشَیْ ءٍ اِذَآ اَرَدْ نٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (۱۶ : ۴۰) جب ہم کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو اس سے ہمارا کہنا یہی ہے کہ، اس کو کہیں ''ہوجا'' تو وہ ہوجاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے اس طرح ہدایت فراہم کی کہ انبیا کے وسیلے سے اس سے کلام فرمایا۔ پس سارے آسمانی صحیفے کلامِ خداوندی ہیں۔ قرآن مجید مسلمانوں سے اللہ تعالیٰ کا خطاب ہے اور اس پر اسلام کی ہر شے کی بنیاد ہے۔ دوسری طرف انسان اللہ کی طرف لوٹنے کے لیے اس سے ہم کلام ہونے کو وسیلہ بناتا ہے، یعنی دعا و عبادت کا سہارا لیتا ہے۔ ہم نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ کلمۂ شہادت جو اسلام کا پہلا ستون اور مسلمانوں کا بنیادی عمل ہے، گویائی کا عمل ہے، زبان سے بول کر ادا کیا جاتا ہے۔ صرف اتنا سوچ لینا کافی نہیں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمدؐ اس کے رسول ہیں۔ انسان کے لیے یہ زبان سے ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ اس عملِ گویائی کی حتمی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ صرف اس کلمے کو زبان سے ادا کرنا انسان کو مسلمان بنانے کے لیے کافی ہے۔ اسلام کا مرکزی ستون (**عمادالدین**)، یعنی نماز، جسم کی کچھ حرکات کا مجموعہ ہے جن کے ساتھ چند کلمات بھی ادا کیے جاتے ہیں اور اگر کسی مجبوری سے انسان ان جسمانی حرکات کو ادا کرنے سے قاصر ہو تو یہ کلمات زبان سے یا دل ہی دل میں کہہ لینے سے نماز ہو جاتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ "**اقرار باللسان**" (زبان سے اعلان و اقرار) وہ اہم ترین عمل ہے جو انسان انجام دیتا ہے۔ یہی اس کے انسان ہونے کی پہچان ہے اور اسی سے انسان اور خدا کے درمیان ایک رشتہ قائم ہوتا ہے۔

یاد رہے کہ محض زبان سے چند کلمات ادا کرنا یا گویائی کا استعمال ہی ایمان کا تقاضا نہیں۔ ہم میں سے ہر شخص ایسے لوگوں کو جانتا ہوگا جو کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ اور ہیں اور اسی لیے ہماری نگاہ میں ان کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔ قرآن اس ضمن میں صاف بتا رہا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ کو بھی انسان کی یہ خصلت پسند نہیں:

كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَ (۶۱:۳) اللہ کے ہاں یہ بات بڑی بیزاری کی ہے کہ تم کہو وہ چیز جو نہ کرو۔

رسولِ خداؐ نے ایمان کی جو تعریف فرمائی ہے، اس کا تیسرا جزو ہے: "**عمل بالجوارح**" یعنی ہاتھ پیر سے عمل کرنا۔ جب انسان یہ جان لے کہ ایک چیز حق ہے اور اس کی صداقت کا زبان سے اقرار کر لے تو پھر اسے اس حقیقت سے وفاداری کرنا بھی لازم ہے اور یہ تعلق اس کے عمل سے ظاہر

ہونا چاہیے۔ انسان جس حقیقت کی شناخت کر چکا، اب اس کی زندگی بھی اس کے مطابق ہونا چاہیے۔ ایمان کے مکمل ہونے کے لیے ''جوارح کے عمل'' کے ضروری ہونے سے اس بات کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے کہ بعض مسلم علما نے ''اسلام'' بمعنی سرافگندگی (islam) کو ''ایمان'' کے جزو کے طور پر کیوں شمار کیا ہے۔ اسلام کیا ہے، بعینہٖ یہی عمل بالجوارح، کوئی سا عمل نہیں بلکہ وہ عمل جس کا امر اللہ تعالیٰ نے کیا ہو یا جو قرآن کی صداقت پر استوار ہو۔

''ایمان'' کا تقاضا ''اسلام'' (islam) ہے، یہ ایک اہم نکتہ ہے۔ ایمان میں اللہ تعالیٰ کے احکامات کی تعمیل شامل ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ جو تعمیلِ حکم کر رہا ہو، وہ لازماً صاحبِ ایمان بھی ہو۔ بظاہر ایک مسلمان کی طرح عمل کرتے ہوئے بھی ایک شخص اس ایمان سے محروم ہو سکتا ہے جو رسولِ خداؐ نے حدیثِ جبرئیل میں بیان کیا۔ ضروری نہیں کہ ایسے شخص کا عمل رائیگاں جائے تاہم اس کی قدر و قیمت ضرور مشکوک ہو جاتی ہے۔

ایمان اور اسلام کے باہمی تعلق کو ایک سادہ مثال سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ آج امریکہ میں لاکھوں افراد مسلمان ہیں۔ ان میں سے اکثر یا تو ترکِ وطن کر کے وہاں آباد ہوئے ہیں یا تارکینِ وطن کی اولاد ہیں۔ وہ دوسرے امریکی شہریوں کی طرح عام سکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک مسلمان فرد کسی غیر مسلم کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اگر خاندان شریعت کا پابند ہے تو شادی اسلامی قانون کے مطابق انجام پائے گی۔ اگر لڑکا مسلمان ہے اور دلہن عیسائی یا یہودی ہے تو فقہا کی عمومی رائے کے مطابق شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی بشرطیکہ بچوں کو مسلمان کے طور پر پروان چڑھایا جائے، لیکن اگر کوئی مسلمان لڑکی کسی غیر مسلم سے شادی کرنا چاہے تو شریعت کا کہنا ہے کہ شادی جائز نہیں۔ ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ مسئلے کا سب سے عام حل تو یہ ہے کہ دولہا باقاعدہ اسلام قبول کر لے۔ اس کے لیے دو مسلمان گواہوں کے سامنے محض کلمۂ شہادت پڑھنا کافی ہے۔ اب شادی پر کوئی اعتراض نہیں رہے گا۔ عموماً دولہا کے بارے میں یہ پرسش کوئی نہیں کرتا کہ اسے اپنے کہے ہوئے پر ایمان بھی ہے یا نہیں، کیونکہ شریعت کو عمل سے سروکار ہے ایمان سے نہیں۔ آنحضرتؐ کی ایک مشہور حدیث ہے جس میں آپؐ نے ایک صحابی کو کسی شخص کے ایمان کو باطل قرار دینے پر فہمایش کیا تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ ''تم نے اس کے دل کو کھول کے دیکھا تھا؟''۔ ایمان خدا اور بندے کے درمیان ایک معاملہ ہے۔ ہمیں اس پر حکم صادر

کرنے کا حق نہیں۔ کسی کے عمل کا جائزہ تو لیا جا سکتا ہے اور اس پر رائے دی جا سکتی ہے، تاہم دلوں کے اندر کیا ہے اسے جاننا ممکن نہیں۔

''ایمان'' اور ''اسلام'' (islam) کے درمیان جو امتیاز ہے، وہ قرآن مجید کی درج ذیل آیات میں بیان ہوا ہے۔ ہم ان کی جانب پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں:

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْئًا اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۴۹:۱۴)

یہ اعرابی گنوار کہتے ہیں ہم ایمان لائے۔ کہیے، تم ایمان نہیں لائے۔ ہاں یوں کہو کہ ہم مسلمان ہوئے۔ رہا ایمان، تو اس کا ابھی تمھارے دلوں میں گذر بھی نہیں ہوا، اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر چلو گے تو وہ تمھارے اعمال میں سے ذرا بھی کم نہیں کرے گا۔

اِس آیت میں کئی نکات قابل غور ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ''اسلام'' اور ''ایمان'' دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اگر لوگ باگ احکاماتِ خداوندی کی تعمیل کرنے لگے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ انھیں ایمان بھی حاصل ہو گیا ہے۔ تعمیلِ حکم خوف کے مارے بھی ہو سکتی ہے، دوستی اور حمایت حاصل کرنے کے لیے بھی اور کسی لڑکی سے شادی کی نیت سے بھی۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ایمان دل میں ہوتا ہے۔ اس کا مسکن قلب ہے۔ قرآن مجید کی ایک اور آیت ہے:

يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ (۹:۸) یہ اپنی باتوں سے تمھیں راضی کر دیتے ہیں، لیکن ان کے دل اس سے ابا کرتے ہیں۔

قرآن مجید رسولِ خداؐ سے خطاب کر رہا ہے کہ بدوؤں کو بتا دیں کہ وہ ایمان والے نہیں ہیں، کیونکہ ان کے دل میں ایمان نہیں پایا جاتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان میں نہ تو حق وصداقت کی مطلوبہ شناخت ہے اور نہ اس سے وفا اور تعلق۔ پھر یہ بھی دیکھیے کہ آپؐ ان بدوؤں سے یہ بات اپنی رائے یا فیصلے کی بنیاد پر نہیں فرما رہے، بلکہ اللہ کے حکم کے تحت ان سے یہ کہہ رہے ہیں۔ لوگوں کے دلوں میں صرف اللہ تعالیٰ ہی جھانک سکتے ہیں اور وہی ان کی نیتوں اور خیالات کو جانتے ہیں:

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ (۳۳:۵۱) اور اللہ جانتا ہے جو تمھارے دلوں میں ہے۔

لیکن دوسرے شخص کے دل میں کیا ہے، یہ جاننا ہمارے بس میں نہیں۔

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ "اسلام" (سرافگندگی اور تسلیمِ حکم) اطاعت اور عمل کا میدان ہے۔ انسان اللہ کی اطاعت اس طرح کرتا ہے کہ اس کا حکم بجالاتا ہے۔ اگر عمل اس کے حکم کے مطابق ہے تو اس کے لیے اجروثواب ہے، خواہ اس کے عمل کے جلو میں اعترافِ حق اور اس سے سچا تعلق اور وفاداری مفقود ہو۔ ہماری مراد یہ نہیں کہ انسان چاہے تو کچھ بھی کیا کرے، اگر وہ حکمِ خداوندی کے مطابق نکل آیا تو اسے اجر ملے گا۔ یہاں ان اعمال کا ذکر ہے جو بنیادی شرطِ اطاعت کے طور پر قرآن مجید نے متعین کیے ہیں، یعنی ارکانِ اسلام۔ بدّو آئے اور انھوں نے فرمانبرداری کا عہد کرلیا۔ اس تسلیم نے انھیں مسلمان بنادیا۔ سوان کی نیت یہ تھی کہ دین کی پیروی کریں اور رسول خدا ؐ کی اطاعت کریں۔ ان کو ان کی نیت کا اجر ملے گا۔

ایمان کی اہمیت کے کچھ پہلو تب سمجھ میں آئیں گے جب ہم اس کی ضد، اس کے الٹ لفظ "کفر" پر غور کریں گے۔ اس لفظ کا انگریزی میں عموماً infidelity یا unbelief کے الفاظ سے ترجمہ کیا جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ روزمرہ کی زبان میں "کافر" وہ ہے جو "اسلام" کو تسلیم نہ کرے، لہٰذا اگر مسلمان believer ہیں تو کافر unbelievers یا Infidels ہوں گے۔ ہم اس سلسلے میں پہلے ہی عرض کر چکے ہیں کہ ایمان کے ترجمے کے لیے belief کا لفظ کوئی موزوں ترجمہ نہیں، پس کفر کے لیے بھی unbelief ایک ان گھڑ سا ترجمہ ہوگا۔ قرآن مجید میں کفر کا لفظ اور اس سے متعلق الفاظ جس طرح آئے ہیں، ان پر نظر کیجیے تو پتا چلے گا کہ اس کے معانی کی کچھ تہیں ایسی ہیں جہاں تک انگریزی ترجمے کی رسائی نہیں ہوتی۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھیے کہ قرآن مجید نے "کفر" کا لفظ صرف "ایمان" کے الٹ کے طور پر ہی استعمال نہیں کیا۔ یہی لفظ "شکر" کی ضد کے طور پر بھی آیا ہے۔ اسلام ہر چیز کو جس طرح دیکھتا ہے، اس کے مطابق اگر انسان اللہ کی مخلوق ہے اور اسے اپنی ہستی سے لے کر اپنی ہر قوت، ہر صلاحیت اور ہر نعمت اللہ کے عملِ تخلیق سے حاصل ہوئی ہے تو اسے اللہ کا شکرگذار ہونا چاہیے۔ اللہ کی عطا اور اس کا کرم نہ ہوتا تو انسان کا وجود تک نہ ہوتا۔ پس شکر پہلی صفت ہے جو انسان میں ہونا چاہیے۔ یہ اللہ کا حق ہے۔

بسم اللہ کے بعد قرآن مجید کے پہلے الفاظ ہیں "الحمدللہ۔" عربی کے یہ کلماتِ تشکر صرف عربی ہی میں نہیں، سب اسلامی زبانوں میں روزمرہ کے طور پر داخل ہیں ایسے ہی جیسے Thank you انگریزی کا

روزمرہ ہے۔ یوں کہیے کہ اللہ کا ہم پر جو احسان ہے اس کا شکر ادا کرنا ادب کا ایک اہم تقاضا ہے۔ اس ایک فقرے میں سارے قرآن کا رخ سمٹ آیا ہے اور قرآن کا پیغام اس کے کوزے میں سما گیا ہے۔

یاد رہے کہ یہ فقرہ ''الحمدللہ'' (Praise belongs to God) کوئی exclamation یا فجائیہ فقرہ نہیں ہے خواہ لوگ باگ اس کو اس معنی میں بھی بول لیتے ہوں۔ اسے انگریزی کے فقرے Praise be to God کا مترادف وہم معنی بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ انگریزی میں یہ فقرہ خاص خاص مواقع پر بولا جاتا ہے۔ عربی کا فقرہ ایک بیانِ واقعہ ہے۔ کسی اور کے لیے تعریف نہیں، کیونکہ اللہ کے سوا اور کوئی خیر اور نفع رسانی کا منبع نہیں۔ ہر مثبت اور قابلِ تعریف چیز اللہ کی طرف سے ہے خواہ انسان کے ہنر و مہارت یا سازگار موسم یا خوش بختی کو ہم اس کا فوری سبب قرار دیں۔ رسولِ خداؐ کی اس مختصر حمد یہ دعا میں یہی آیا ہے کہ ہر اچھی شے اللہ کی طرف سے ہے: ''الخير كله بيدك والشر ليس اليك''[۲] (خیر سب کا سب تیرے ہاتھ میں ہے اور شر تیری طرف نہیں لوٹتا)۔

اس نقطۂ نظر سے دیکھیے تو ناشکری کو سب سے گری ہوئی انسانی حرکت کہا جائے گا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ناک تلے کی چیز سے آنکھ بند کر لی جائے۔ اللہ تعالیٰ ہر خیر کا سرچشمہ ہے لہٰذا انسان کو اس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اللہ کے حضور ناسپاس گذار آدمی مسلمانوں کی نگاہ میں ایسا ہی ہے جیسا وہ شخص جسے ایک شاندار ضیافت میں بلایا گیا ہو۔ گو وہ اس قابل بھی نہ رہا ہو کہ اس جگہ قدم بھی دھر سکے۔ پھر بھی وہ آئے، دسترخوان پر پسر جائے، سیر ہو کر دعوت اڑائے اور ڈکار لیتا ہوا اٹھ کر چل دے۔ میزبان کا شکریہ ادا کرنے کا اسے خیال تک نہ گذرے۔

قرآن کے نقطۂ نظر سے اور مسلمانوں کے عمومی فہم کے مطابق ایمان اور شکر کے متضاد کے طور پر ''کفر'' کے دونوں معانی کو عملاً ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ایمان شکر کی ایک صورت کے سوا اور کچھ نہیں اور شکر ایمان ہی کی ایک شکل ہے۔ انسان کو اگر پیراہنِ ہستی عطا ہوا ہے تو یہ سراسر احسانِ خدا وندی ہے ورنہ انسان اس کے لیے کیا جواز رکھتا تھا۔ ''ایمان'' اس معجزۂ تخلیق کے جواب میں انسان کا فطری اور نارمل ردِّعمل ہے۔ جب انسان یہ دیکھتا ہے کہ اس سے بالاتر اور اس سے ورا ایک اور حقیقت ہے جس نے اسے وہ بنا دیا ہے جو وہ ہے تو پھر اسے اس حقیقت کا اعتراف اور اس کی شناخت کرنا چاہیے۔ اسے شکر گذار ہونا چاہیے کہ میزبان نے اس کو دعوت پر بلا لیا۔ اسے احساس ہونا چاہیے کہ اگر وہ شکریہ ادا کیے بغیر اُٹھ کر چل دیا تو اس کی خوش بختی زائل ہو جائے گی۔ یاد رہے کہ شہر بھر

میں یہی ایک جگہ ہے، جہاں مفت کی ضیافت میسر ہے، بلکہ یوں کہیے کہ شہر بھر کا کیا مذکور ہے، ضیافت ہے ہی صرف یہی لہٰذا ان کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ اظہارِ تشکر کرنا نہ بھولیں اور اپنے میزبان اور ولی نعمت کی خدمت میں حاضر رہیں کہ شاید وہ کوئی کام ان کے ذمہ کرنا چاہے۔

یہ نکتہ پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ ایمان حق کو دل سے شناخت کرنے یعنی معرفت قلب سے شروع ہوتا ہے۔ سو کفر کا مطلب ہوا دل سے انکارِ حق۔ مسلمانوں کے لیے جس طرح ایمان بعض بدیہی حقائق کے تسلیم و قبول اور ان سے تعلق کا نام ہے اسی طرح ان کی نظر میں ''کفر'' انھی حقائق کی تردید اور ان کے مطابق زندگی گذارنے سے انکار کرنے سے عبارت ہے۔ ولفریڈ کینٹول سمتھ نے مسلمانوں کے نظریۂ ایمان کو بڑی خوبی سے ان الفاظ میں سمیٹ دیا ہے۔ ''ارکانِ ایمان چونکہ ان کی نظر میں بدیہی اور ناقابل تردید ہیں، لہٰذا مسئلہ اب یہ رہ جاتا ہے کہ اب کرنا کیا چاہیے؟ ہمارا علم ہم سے کس عمل کا تقاضا کرتا ہے؟''[۳۱] پس بات یہ نکلی کہ کفر چونکہ ایسی چیزوں کے انکار کا نمایندہ ہے جو واضح، صریح اور ناقابلِ تردید ہیں، یعنی اپنا ثبوت آپ ہیں اور ان کو کسی طور جھٹلایا نہیں جا سکتا، اسی لیے کفر کو اتنی حقارت اور نفرت سے دیکھا جاتا ہے۔

''کفر'' کی اصطلاح کے اصلی معنی ہیں کسی شے کو چھپانا، ڈھانپنا۔ وہ لوگ جو ناشکرے ہیں وہ اس نیکی کو چھپاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان سے کی ہے، وہ اس خیر کا ذکر نہیں کرتے۔ وہ شخص جو ایمان نہیں لاتا، وہ ہستی کے بدیہی حقائق کو چھپا رہا ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ ''کفر'' کا مطلب ہے ان حقائق کو چھپانا اور ان پر پردہ ڈالنا جو ہم جانتے ہیں۔ پس یہ ضروری ٹھہرا کہ اگر اس لفظ کو انگریزی میں منتقل کرنا ہو تو unbelief اور infidelity کے لفظ سے ترجمہ کرنے کی بجائے ungrateful truth concealing (ناشکرے پن پر مبنی اخفائے حق) کے الفاظ استعمال کرنا ہوں گے۔

اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ unbelief ایک بہتر ترجمہ ہے، کیونکہ اس میں آپ دوسروں کے بارے میں کوئی رائے زنی یا فیصلہ صادر نہیں کرتے۔ کچھ لوگ یہ سوال بھی اٹھا سکتے ہیں کہ یہاں مسئلہ مسلمانوں کے ماننے، ان کے اعتقاد کا ہے معروضی حقائق کا نہیں، لیکن اگر مسلمان یہ تسلیم بھی کر لیں کہ یہ معاملہ فقط اعتقاد کا ہے تب بھی بات پھر لوٹ کر غیر مسلم ہی کے سامنے آ جائے گی کیونکہ یہ گویا غیر مسلم معترض نے مان لیا کہ بحث اصل میں ان اعتقادات کی ہے جو درست بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی، لیکن یہاں پر قباحت یہ ہے کہ اس طرزِ استدلال سے ''ایمان'' کے لفظ کے معنی غلط ہو جاتے ہیں،

کیونکہ اس کا مذکورہ معنی میں ''اعتقاد'' (belief) سے کوئی تعلق نہیں۔

ایک اور اعتراض بھی یہ کہ کر کیا جا سکتا ہے کہ ''میں تو ان 'حقائق' کو نہیں جانتا، نہ میں یہ مانتا ہوں کہ یہ حقائق ہیں تو پھر مجھے کیوں کر 'حق کو چھپانے والا' کہا جا سکتا ہے؟'' روایتی مسلمان اس کا جواب عام طور پر یہ دیتے ہیں کہ ان لوگوں نے سمجھا ہی نہیں کہ قرآن کیا کہ رہا ہے۔ اگر وہ اس کے پیغام کو ذرا غور سے سنتے تو جان لیتے کہ انھیں بخوبی معلوم ہے کہ ''لا الہ الا اللہ'' (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) انسانی سرشت وفطرت میں شامل ہے۔ انسان کو یہ حقیقت ہمیشہ معلوم ہوتی ہے۔ وہ شخص جو یہ کہتا ہے کہ اسے یہ حقیقت معلوم نہیں وہ گویا اپنے انسان ہونے کا انکار کر رہا ہے۔

غیر مسلموں کے نقطۂ نظر سے یہ جواب شاید اطمینان بخش نہ ہو، لیکن ہمیں چاہیے کہ اس کی تہ میں کارفرما منطق کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اگر آپ ایک مرتبہ یہ جان لیں کہ اسلام کا تصورِ خدا اور تصورِ انسان کیا ہے اور اس نے انسان اور خدا کو جس طرح سمجھا ہے اس کے مضمرات اگر آپ کی گرفت میں آ جائیں تو آپ خود بخود سمجھ لیں گے کہ مذکورہ بالا جواب ایک معقول جواب ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ اس کتاب کے حصہ دوم کے آخر تک پہنچتے پہنچتے قارئین پر کم از کم اتنا ضرور واضح ہو جائے گا کہ اسلام کا یہ تناظر ایک بامعنی اور مربوط تصورِ کائنات سے جڑا ہوا ہے اور اسی پر وہ اپنی ساری عمارت استوار کرتا ہے۔

''ایمان'' کے بارے میں اس بحث کے خلاصے کے طور پر ہم یہاں صرف اتنا عرض کر سکتے ہیں کہ ''ایمان'' قلب و ذہن کی ایک ایسی کیفیت کا نام ہے جس کا تعلق شناختِ حق، معرفتِ حق سے ہے، یعنی اپنی جانی ہوئی اس حق و صداقت سے عہدِ وفا اور اپنے اس تعلق اور comittment کے مطابق شیوۂ عمل ''ایمان'' ہے۔

ایمان کی بحث لازمی طور پر حق وصداقت کے بارے میں بحث کی طرف لے جاتی ہے۔ حق کیا ہے اور ہم اس کی معرفت، اس کی شناخت کیوں کر حاصل کر سکتے ہیں، اس سوال کا جواب دینا شاید سب سے مشکل ہے اور سرِدست ہمارے لیے تفصیلات میں جانا ممکن بھی نہیں اور تفصیل میں جائے بغیر ہم یہ واضح نہیں کر سکتے کہ مسلمانوں نے اس سوال کا جواب کیوں کر دیا ہے۔ یہاں ہمارا مقصد صرف اتنا واضح کرنا ہے کہ مسلمان اپنے ایمان کے وسیلے سے جس حقیقت، جس حق و صداقت کے اعتراف و شناخت تک پہنچتے ہیں، اسے انھوں نے کیوں کر سمجھا ہے، وہی حقیقت جسے رسولِ خداؐ نے حدیثِ جبرئیل میں مختصر الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

اُصولِ ثلاثہ

وہ صداقت جسے مسلمان مانتے ہیں اور اس سے اپنا تعلق استوار کرتے ہیں، اسے حدیثِ جبرئیل میں ارکانِ ایمان کی صورت میں بیان کیا گیا ہے، یعنی خدا، فرشتے، الہامی کتب، انبیا، یوم آخر اور تقدیر۔ بعد ازاں جب علمائے کلام اور فلاسفہ نے دینی علم کی اقسام مرتب کرنا شروع کیں اور اسے ایک منظّم درجہ بندی کی صورت دی تو ان چھ ارکانِ ایمان کو تین الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا، یعنی توحید، نبوّت اور معاد (یا آخرت)۔ ان کو اصولِ ثلاثہ یا دین کی تین بنیادیں کہا گیا۔

شیعہ علما عام طور پر ان میں دو شعبوں کا اضافہ کیا کرتے ہیں، یعنی "عدل" اور "امامت۔" یہاں ہم صرف ان تین شعبوں پر گفتگو کریں گے جو تمام مسلمانوں میں مشترک ہیں۔ شیعہ دینیات سے خاص باقی دو مباحث الگ بحث کا تقاضا کرتے ہیں۔ یہاں اتنا جان لینا کافی ہوگا کہ شیعہ علما نے توحید اور نبوّت کے مضمرات کو جس طور سمجھا اور جانا ہے، عدل اور امامت اسی اسلوبِ فہم سے تعلق رکھتے ہیں۔ بالفاظ دیگر ان کی نظر میں "عدل" سے توحید کی ماہیت متعین ہوتی ہے اور "امامت" سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ نبوّت کی بعض جہات ائمہ کرام کے وسیلے سے کیوں کر تاریخ میں ظاہر ہوئی ہیں۔

توحید کی تعریف ہم نے یوں کی تھی کہ انسان پہلے تو یہ تسلیم کرے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں (لا الٰہ الا اللہ) اور پھر اسی کی عبادت کرے۔ اُصولِ ایمان کے طور پر دیکھیے تو توحید یہ بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کیا ہے اور فرشتوں سمیت مختلف مخلوقات کا اس سے کیا تعلق ہے۔ نبوّت یہ واضح کرتی ہے کہ نبی کیا ہوتے ہیں اور ان کی الہامی کتابوں کا کیا کام ہے۔ معاد سے یومِ آخر کی وضاحت ہوتی ہے اور یہ پتا چلتا ہے کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا، اسی لیے اس لفظ کا انگریزی میں ترجمہ کرتے ہوئے اکثر eschatology کا لفظ برتا جاتا ہے جس کا مطلب ہے "آخری چیزوں کا علم۔"

توحید اسی لفظ سے نکلا ہے جس مادے سے "واحد" کا لفظ بنا ہے۔ واحد کا مطلب ہے "ایک۔" خدا ایک ہے اور توحید کا مطلب ہے: "اس بات کا اعتراف اور شناخت کہ خدا ایک ہے۔" اسی معنی میں بسا اوقات "وحدت" یا "وحدتِ خداوندی" کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ "وحدتِ خداوندی کا اعلان" یا "اللہ کے ایک ہونے کا اعلان" کے الفاظ اس کا درست تر بیان کہے جا سکتے ہیں، "توحید" صرف یہی نہیں ہے کہ اللہ ایک ہے۔ انگریزی کا کوئی ایک لفظ یا ترکیب توحید کے پورے معانی اور اس کے مفاہیم کی تہ داری کا پوری طرح احاطہ نہیں کر پاتی۔

مجموعی طور پر چھ ارکانِ ایمان میں سے تین رکن خدا، فرشتے اور تقدیر بنیادی طور پر توحید سے متعلق ہیں، لیکن یہ صرف آغاز ہے۔ توحید ان تینوں ارکان کے حوالے سے کیا معنی رکھتی ہے، اس بحث کا دامن بہت وسیع ہے۔

اسلام کی ہر شے کی بنیاد و ابتدا اللہ تعالیٰ ہے۔ فرشتے وہ مخلوق ہیں جو کائنات کے مراتب میں اللہ تعالیٰ کے قریب ترین ہیں اور انسان اور خدا کے تعلق میں ان کا ایک مرکزی کردار ہے۔ ''تقدیر، اس کا خیر اور اس کا شر'' اس جانب اشارہ کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات سے کیوں کر معاملہ کرتے ہیں۔ ہر شے کے لیے اللہ نے ایک محدود مقدار میں خیر معین کیا اور عین اسی عمل کے منفی نتیجے کے طور پر ایک خاص اندازۂ شر مقرر ہے۔ خیرِ محض، لامحدود خیر صرف اللہ کے لیے ہے اور خیر جب محدود ہوگا، اس میں شر کا شائبہ پایا جائے گا۔

کس شخص کو کیا ملے گا اور جو انسان کے لیے مقرر ہے، اس کے مقرر کرنے میں انسان کا بھی کچھ دخل ہے یا نہیں، یہ سوالات اٹھاتے ہی ہم مسئلۂ جبر و قدر کے خارزار میں داخل ہو جاتے ہیں۔ مزید برآں، خیر و شر کی بات نکلتی ہے تو جھٹ یہ سوال سامنے آ جاتا ہے کہ اس دنیا کا خالق اگر ایسا اچھا ہے تو اس نے یہ کیسی دنیا بنائی ہے جس میں اتنا شر بھرا ہوا ہے؟ یہ وہ اَنحل سوال ہیں جن سے انسان صدیوں سے الجھتا چلا آ رہا ہے اور ہم یہاں شاید ان کو حل کرنے میں کامیاب بھی نہ ہو سکیں، لیکن بے فائدہ نہ ہوگا اگر کسی حد تک یہ جاننے کی کوشش کی جائے کہ مسلمان ان مسائل کو کس نظر سے دیکھتے، اور ان کے حل کے لیے کیا سوچتے رہے ہیں۔

نبوّت کا تعلق انبیا اور الہامی صحیفوں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول کیوں بھیجے؟ انسانی معاشرے میں ان کا منصب کیا ہے؟ اسی بات کو اسلام سے خاص کر کے پوچھیے تو سوال یہ ہوگا کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کا کردار کیا ہے؟

''معاد'' توحید کے حوالے سے انسان کے انجام پر نظر کرتی ہے۔ انسان چونکہ الاحد سے آیا، لہٰذا اسے الاحد ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ لوٹنے کے اس عمل کا گہرا تعلق اس امر سے ہے کہ انسان نبوّت کے لائے ہوئے پیامِ ہدایت کو کس طرح قبول کرتا ہے۔ اسے جب انبیا کے پیغام کے ذریعے اللہ کے بارے میں پتا چل جاتا ہے تو اس کا ردِّعمل کیا ہوتا ہے؟ انسان اپنے اعمال کا، موت کے بعد، اگلے جہان میں کیا پھل پائے گا؟ موت کے ساتھ ہی جب انسان کی آنکھیں کھل جائیں گی، اس کی نگاہ

سے کورچشمی کے پردے اُٹھ جائیں گے اور وہ خود کو حقیقتِ خداوندی کے روبرو پائے گا تو پھر کیا ہوگا؟

اُصولِ دین میں سے نبوّت اور معاد ہر دو، اُصولِ اوّل یعنی توحید میں مضمر ہیں۔ توحید ایک ہمہ گیر تصور ہے، کیونکہ یہ جس حقیقتِ ربّانی کا اظہار و بیان ہے، وہ خود ہمہ گیر ہے۔ نبوّت اور معاد کی کوئی بھی گفتگو ہو، لازماً توحید کی جانب لوٹتی ہے۔ یاد رہے کہ قرآن و حدیث میں ان تین اُصولوں یا بنیادوں کو ترتیب دینے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ اس سے ہمارے ذہن میں یہ نکتہ واضح ہو جانا چاہیے کہ اُصولِ ثلاثہ کی یہ بحث ارکانِ ایمان کا تصور قائم کرنے کا ایک طریقہ ہے اور بس۔ اس اندازِ نظر کو کوئی حتمی حیثیت حاصل نہیں۔ اسلام کی تین اطراف یا تین جہات کے تصور پر ہم کتاب کے ''تعارف'' (Introduction) میں گفتگو کر چکے ہیں۔ اُصولِ ثلاثہ کا تصور بھی اسی طرح کا ہے۔ اس سے ہمیں ایک زاویۂ نگاہ میسر آ جاتا ہے اور ہم سب چیزوں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر دیکھ سکتے ہیں۔

اسلام کے یہ اُصولِ ثلاثہ ہزار ہا کتب کا بنیادی موضوع رہے ہیں اور یہ موضوع اپنی جگہ علم کی ایک دنیا ہے۔ بابِ ششم میں ہم یہ دکھانے کی کوشش کریں گے کہ اسلام کے تین بڑے مکاتبِ فکر انھی ارکانِ ایمان کو سمجھنے اور ان پر غور کرنے کے مختلف طریقوں کی وجہ سے پروان چڑھے۔ سر دست ہم ان تین اُصولوں کو سمجھنے کی ایک بنیاد فراہم کرنا چاہتے ہیں تا کہ قارئین حقیقت کے بارے میں اسلام کے اندازِ نظر سے آگاہ ہو سکیں۔

باب سوم

توحید

اسلام میں کلمۂ شہادت کی اوّلیت اور اہمیت پر ہم بات کر چکے ہیں۔ اس کے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح ''ایمان'' کے لیے بھی کلمۂ شہادت کی بنیادی اہمیت ہے، کیونکہ اس میں ایمان کے پہلے اور دوسرے اُصول مختصر طور پر بیان ہوگئے ہیں۔

پہلی شہادت

شہادت کے دو کلمات ہیں جو دو اعلانات پر مشتمل ہیں۔ ان کو ہم پہلا اور دوسرا کلمۂ شہادت کہہ سکتے ہیں۔ پہلے کلمہ سے انسان یہ گواہی دیتا ہے کہ ''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں'' اور دوسری شہادت میں اس بات کی گواہی ہے کہ ''محمد اللہ کے رسول ہیں۔'' پہلی شہادت توحید کا اعلان ہے تو دوسری نبوّت کا بیان۔ دوسری شہادت پر گفتگو کتاب کے اس حصے میں ہوگی جہاں ہم تصورِ نبوّت پر بحث کریں گے۔

مسلمانوں کی نظر میں پہلی شہادت کا دینِ محمدی سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے، بلکہ یہ ''اسلام'' کا اس کے وسیع ترین معنی میں بیان ہے۔ یہ اس بات کی وضاحت ہے کہ زمین وآسمان کی ہر شے اللہ تعالیٰ کی مطیع اور اس کے سامنے سرافگندہ کیوں ہے۔ یہی کلمہ اپنے محدود تر معنی میں اس دین کا عنوان بھی ہے جو سب انبیا لے کر آئے تھے۔ قرآن مجید میں اس بات کا سب سے واضح اشارہ درج ذیل آیت میں آیا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (۲۱:۲۵)	اور ہم نے تم سے پہلے جتنے رسول بھی بھیجے ان کو یہی وحی کرتے رہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری ہی عبادت کرو۔

تمام انبیا پیغامِ توحید ہی لے کر آتے رہے۔

پہلے کلمۂ شہادت کی یہ عالمگیر حیثیت غیر مسلموں کے لیے شروع میں قدرے اُلجھن پیدا کرتی ہے۔ 'الٰہ' اور ''اللہ'' کے الفاظ سن کر لوگ کیا سمجھتے ہیں؟ خاص طور پر آج کے زمانے میں جب لوگوں کے طرزِ فکر وفہم پر دین کے بحیثیت مجموعی نسبتاً کم اثرات رہ گئے ہیں۔ ہر شخص کے ذہن میں ''الٰہ'' کا

اپنا اپنا تصور ہے۔ ایک بات البتہ یقینی ہے اور وہ یہ کہ اس لفظ ''الٰہ'' یا ''خدا'' سے عام طور پر جو سمجھا جاتا ہے، وہ ان معانی کو گرفت میں لانے کے لیے چنداں مفید نہیں جو اسلام نے اس لفظ کو دیے ہیں۔

جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ ''میں خدا کو نہیں مانتا'' تو اپنی مذہبی تعلیمات کا فہم رکھنے والے مسلمان بآسانی یہ جواب دے سکتے ہیں کہ ''میں بھی اس خدا کو نہیں مانتا جسے تم نہیں مانتے۔'' لوگ کچھ ایسا غلط نہیں کرتے اگر اس خدا کو نہیں مانتے جو ان کی سمجھ میں آیا ہوتا ہے، کیونکہ وہ خدا اس حقیقت سے کوسوں دور ہے جس کی طرف پہلی شہادت اشارہ کر رہی ہے، اسی لیے یہ لازمی ٹھہرتا ہے کہ ہم اسلام کے تصورِ الٰہ کی شرح و وضاحت کے لیے اچھے خاصے صفحات صرف کر دیں۔

اس شہادت کی عالمگیر حیثیت کو سمجھنے میں دوسری دشواری جو غیر مسلموں کو پیش آتی ہے، وہ یہ ہے کہ ''اللہ'' کا لفظ مشترک طور پر استعمال ہوتا ہے۔ جب لوگ یہ لفظ سنتے ہیں تو فطری طور پر ان کا دھیان اس جانب جاتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مسلمان اپنے کسی ایک ''خدا'' کو مانتے ہیں جیسے پرانے یونانی زیوس کو یا بہت سے ہندو وشنو کو مانتے ہیں یا جیسے ہر قبیلے کا اپنا ایک خدا ہوتا ہے۔ اللہ کے بارے میں اس انداز سے سوچنے کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ یہ فرض کر رہے ہیں کہ یہودی اور عیسائی تو حقیقی خدا کو مانتے ہیں جب کہ مسلمانوں کا اپنا ایک مقامی خدا ہے، یا خدا کے بارے میں ان کا ایک جھوٹا تصور ہے۔

عربی میں ''اللہ'' کا مطلب ہے ''خدا'' (God)۔ قرآن و حدیث اور ساری اسلامی روایت یہ کہتی ہے کہ یہود و نصاریٰ اور اسلام کا خدا ایک ہی خدائے واحد ہے۔ عربی بولنے والے مسلمانوں کے لیے یہ ناقابل تصور ہے کہ وہ اس خدا کے لیے ''اللہ'' کے سوا کوئی اور لفظ بھی استعمال کر سکتے ہیں جس کی پرستش یہودی اور عیسائی کرتے ہیں۔ وہ عیسائی اور یہودی جن کی زبان عربی ہے، وہ بھی خدا کی عبادت کرتے ہوئے اللہ ہی کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

اس پہلی شہادت کی گفتگو ہو تو انگریزی میں ''اللہ'' (Allah) کے لفظ کا استعمال خاص طور پر گمراہ کن ہو سکتا ہے۔ اگر اس کا ترجمہ یوں کیا جائے کہ "There is no god but Allah" تو اس کی مراد بالکل بدل جائے گی اس ترجمے سے جو مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا گیا ہو "There is no god but God"۔ مثال کے طور پر اگر یوں کہا جائے کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم یہ تھی کہ "There is no god but God" تو یہ کوئی غلط بات نہ ہوگی، لیکن اسی مفہوم کو اگر انگریزی میں یوں کہا جائے کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم یہ تھی کہ "There is no god but Allah" تو بات مضحکہ خیز ہو کر رہ

جائے گی۔ انگریزی بولنے والے لوگ جو اسلام سے آشنا نہ ہوں، ''اللہ'' کے لفظ سے قدرتی طور پر یہی سمجھتے ہیں کہ یہ کسی باطل، اجنبی خدا کا نام ہے، ویسا ہی کوئی دیوتا جس کی پوجا بت پرست یا خدا کو نہ ماننے والے لوگوں، قبیلوں میں کی جاتی ہے۔

بہت سے مسلمان انگریزی بولتے ہوئے بھی Allah کا لفظ استعمال کرنے پر مصر رہتے ہیں۔ اس کے متعدد اسباب ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے اصلی نام کے طور پر قرآن میں آیا ہے، لہٰذا اس لفظ کی اپنی ایک خاص برکت ہے۔ دوسری بات یہ کہ اکثر انگریزی بولنے والے مسلمانوں کی مادری زبان انگریزی نہیں ہوتی، لیکن ان کے لیے یہ کاملاً واضح ہوتا ہے کہ اسلام ایک سچا دین ہے، لہٰذا ان کا خیال اس طرف کبھی جاتا ہی نہیں کہ انگریزی بولنے والے غیر مسلموں کے ذہن میں صرف یہ لفظ Allah سنتے ہی کیسی کیسی غلط فہمیاں سر اُبھارنے لگتی ہیں۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ بہت سے مسلمانوں میں اپنے دینی علوم اور الٰہیاتی مسائل پر گرفت بہت کم ہوتی ہے۔ سو ان کے سوچنے کا انداز کچھ ایسا ہوتا ہے کہ ''اللہ'' تو سچے خدا کا نام ہے، لیکن انگریزی میں God کا جو لفظ ہے اس سے اشارہ کسی جھوٹے خدا کی طرف ہے جس کی یہودی اور عیسائی عبادت کرتے ہیں۔ یہ مسلمان ایک طرح سے ان انگریزی بولنے والے لوگوں کا عکس کہے جائیں گے جو یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ God تو سچا خدا ہے، لیکن Allah کسی جھوٹے خدا کا نام ہے جس کی پرستش بُت پرستوں (Pagans) کے ہاں کی جاتی ہے۔

خدا

اسلام میں ایمان کا پہلا رکن خدا ہے، لیکن خدا کیا ہے، کون ہے؟ سارے مسلمان علما عملاً یہی مانتے ہیں کہ لفظ ''الہٰ'' یا خدا کا صحیح فہم اس وقت تک ناممکن ہے جب تک وحیِ خداوندی سے معلوم نہ ہو۔ بالفاظِ دیگر خدا کیا ہے، یہ اللہ تعالیٰ خود ہی انسان کو بتائے تو معلوم ہوگا۔ آخر دوسرے انسانوں کو سمجھنا بھی تو ایک اچھا خاصا مشکل کام ہوتا ہے، بلکہ اگر وہ گفتگو کے وسیلے سے اپنا اظہار نہ کریں تو سمجھنا تقریباً ناممکن ہو کر رہ جائے۔ دوسرے لوگوں کو ہم دیکھتے ہیں، چھو سکتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ہماری دید کی پہنچ سے دور ہے۔ اگر ہمیں یہ جاننا ہے کہ خدا کیا ہے تو لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ہمیں بتائے کہ اللہ کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ انسان کو اپنے بارے میں انبیا کے ذریعے سے بتاتا ہے، ان کے وسیلے سے انسان سے کلام کرتا ہے۔ اس کا کلام انبیا کی کتابوں، یعنی الہامی صحیفوں میں درج ہے۔ دوسرے ادیان کے ماننے والوں اور مسلمانوں میں فرق یہ ہے کہ مسلمان سیدنا محمدؐ کو اللہ کا رسول اور قرآن مجید کو

پیامِ خداوندی تسلیم کرتے ہیں، اس کے برعکس دوسرے ادیان کے پیروکار لوگ دوسرے انبیا کو مانتے ہیں (کم از کم روایتی اسلامی نقطۂ نظر یہی ہے)۔

تمام انبیا کا بنیادی پیغام ایک ہے، یعنی ''لا الہ الا اللہ'' خلاصہ یہ کہ مسلمانوں کی نظر میں ''خدا'' God کا مطلب ہے وہ حقیقت جو قرآن میں اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے، اور god کا لفظ ان کی فہم کے مطابق ہر اس شے کا عنوان ہے جس سے انسان نے وہ صفات غلط طور پر منسوب کر رکھی ہوں جو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے لیے بیان ہوئی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کو جاننا ہو تو سب سے پہلے قرآن کو سمجھنا ہوگا، لیکن قرآن کا سمجھنا آسان نہیں۔ یہ کوئی سہل سی کتاب نہیں ہے۔ بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان گذشتہ ۱۴سو سال سے قرآن کی شرح و تعبیر کرتے آرہے ہیں اور ابھی اس کے معانی کا بیان ختم ہونے کا آغاز تک نہیں ہو سکا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں جو بھی اور جتنا بھی کہ لیجیے، پھر بھی کہنے کو بہت کچھ رہ جائے گا۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں کیا کہا گیا ہے، اس کی طرف اشارہ کرنے سے پہلے آیئے ذرا ''الٰہ'' اور ''اللہ'' کے عربی الفاظ پر ایک نظر ڈال لیں۔ یہ ہماری بحث کے لیے مفید ہوگا۔ کتبِ لغت یہ بتاتی ہیں کہ ''الٰہ'' ہر وہ چیز ہے جسے پرستش، عقیدت اور اطاعت کا مرکز بنایا جائے۔ قرآن میں یہ لفظ منفی اور مثبت دونوں معنوں میں آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ لفظ جھوٹے خدا اور سچے خدا دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن نے اسے مثبت معنی میں بار بار استعمال کیا ہے، جیسا کہ درج ذیل آیات میں نظر آتا ہے:

وَمَامِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (۵:۷۳) حالانکہ نہیں ہے کوئی خدا، مگر ایک ہی خدا۔

اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (۴:۱۷۱) خدا تو بس تنہا اللہ ہی ہے۔

فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا (۲۲:۳۴) سو خدا تمھارا ایک اللہ ہے سو اسی کے حکم میں رہو۔

قرآن مجید نے ''الٰہ'' کا لفظ منفی معنی میں بھی استعمال کیا ہے اور اس سے مراد ہوتا ہے جھوٹا خدا، بت، اصنامِ خیالی۔ مثال کے طور پر قرآن میں جہاں بنی اسرائیل اور سنہری بچھڑے کا ذکر آیا ہے۔ وہاں لوگ حضرت موسیٰؑ سے کہ رہے ہیں۔

يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ (۷:۱۳۸) اے موسیٰ! ہمارے لیے بھی ایک بت بنا دو، جیسے ان لوگوں کے بت ہیں۔

حضرت موسیٰؑ جواب میں کہتے ہیں۔

اَغَيۡرَ اللّٰهِ اَبۡغِيۡكُمۡ اِلٰهًا (٧:١٤٠) کیا اللہ کے سوا کوئی اور معبود تم کو لا کر دوں؟

''الہٰ'' کی اگر یہ تعبیر اور یہ معنی ذہن میں رہے تو یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ ''لا الہٰ الا اللہ'' کا مطلب ہے وہ تمام ''الہٰ'' جن کی لوگ اللہ کے سوا عبادت کرتے ہیں جھوٹے خدا ہیں۔

قرآن مجید نے ''الہٰ'' کا لفظ اور بھی کئی منفی معانی میں استعمال کیا ہے، کیوں کہ ''الہٰ'' کوئی شے بھی ہو سکتی ہے، ہر وہ چیز جس کی انسان عبادت کرے، جس کی بندگی کرے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ ''الہٰ'' صرف ایک ہی ہے جس کی بندگی کی جا رہی ہے۔ انسان کے جھوٹے خدا بہت سے ہو سکتے ہیں اور قرآن مجید نے اکثر انسانوں کے اس عمل پر نکیر کی ہے۔ لازمی نہیں کہ آپ کا بت، آپ کا جھوٹا خدا خارج میں کوئی چیز ہو۔ ہمیں عموماً یہ خیال ہوتا ہے کہ ''الہٰ'' وہ ہے جو ''وہاں'' ہو، خارجی وجود رکھتا ہو، آسمانوں کے اوپر ہو، ہم سے بالاتر مرتبے کی ہستی ہو، لیکن عربی کے لفظ ''الہٰ'' میں ایسا کوئی تقاضا نہیں کیا گیا۔ آپ اس خدا کی پرستش بھی کر سکتے ہیں جو آپ کے اندر ہو اور اس کی بندگی بھی کر سکتے ہیں جو آپ سے فروتر ہو۔

قرآن مجید نے ان لوگوں کو بُری طرح لتاڑا ہے جو اپنے خیالات اور اپنے مزاج کی لہروں کی عبادت خدا کی طرح کرتے ہیں۔ یہاں قرآن نے جو لفظ استعمال کیا ہے، وہ ہے ''ھویٰ'' (خواہش)۔ انگریزی میں اسے caprice کے لفظ سے ترجمہ کیا جاتا ہے۔ ''ھویٰ'' (خواہش) کا لفظ جس لفظ سے نکلا ہے، اسے دیکھیے تو ''ھویٰ'' (خواہش) اور ''ھوا'' wind تقریباً ہم معنی ہو جاتے ہیں۔

''ھویٰ'' (خواہش) ہمارے اندر کی وہ ''ھوا'' ہے جو کبھی اِدھر سے اُدھر چلتی ہے اور کبھی اُدھر سے اِدھر۔ لحظہ گریزاں کا میلان، کبھی ایسے کبھی ویسے۔ آج ہم ایک چیز کی خواہش کر رہے ہیں، کل کسی دوسری شے کی آرزو کرنے لگیں گے۔ قرآن مجید کے مطابق ''ھویٰ'' (خواہش) بدترین خدا ہے۔ اگر آپ اس کی بندگی میں لگ گئے تو پھر آپ کو سر پیر کی خبر نہیں رہے گی۔ آپ کے خیالات، احساسات اور جذبات عملاً ہر روز تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ ہوا چلتی رہتی ہے اور قرآن نے یقین سے کہا ہے کہ اگر یہ ہوا آپ کو اڑا لے گئی تو پھر ہلاکت میں لے جا کر پٹخے گی۔ درج ذیل قرآنی آیات سے ہوا و ہوس کی اس رَو کی تصویر سامنے آ جاتی ہے:

وَاَمَّا مَنۡ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفۡسَ عَنِ الۡهَوٰى ۰ فَاِنَّ الۡجَنَّةَ هِىَ الۡمَاۡوٰى(٧٩:٤٠-٤١) اور جو کوئی اپنے رب کے سامنے پیش ہونے سے ڈرا اور جس نے اپنے نفس کو اس کے چاؤ اور خواہش سے روکا تو اس کا ٹھکانا بہشت ہی ہے۔

اَرَءَ یْتَ مَنَ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ(۲۵:۴۳) بھلا دیکھ تو اسے جو اپنی خواہش اور چاؤ کو معبود بنائے ہوئے ہے۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ(۲۸:۵۰) اور اس سے زیادہ بہکا ہوا کون ہوگا جو اللہ کی ہدایت کے بغیر اپنی خواہش کا پیرو بنا ہوگا۔

اَفَرَءَ یْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ (۴۵:۲۳) بھلا دیکھو تو اسے جس نے اپنی خواہش کو حاکم ٹھہرا رکھا ہے، جسے جانتے بوجھتے ہوئے اللہ نے راہ سے بھٹکا دیا۔

قرآن مجید نے ''ھویٰ'' کی جمع کو بھی اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔ سترہ مقامات پر یہ لفظ آیا ہے۔ ان میں سے سولہ جگہوں پر اس کے ساتھ فعلِ ''اتبع" to follow (پیروی کرنا) استعمال ہوا ہے۔ نادان لوگ اپنی ہوا و ہوس کی پیروی کرتے ہیں، ان چھوٹے چھوٹے خداؤں کی جو ان کے اندر چھپے ہوئے ہیں اور انجام کارِ جہنم میں پہنچ جاتے ہیں۔ پیغام بالکل واضح ہے۔ انسان کو جھوٹے خداؤں سے بچنا چاہیے، ہدایتِ خداوندی کے مطابق چلنا چاہیے جو نبوّت کی صورت میں انسان تک آئی ہے۔

بعد کے زمانوں میں یہی لفظ ''ھویٰ'' انحراف، بدعت اور گمراہ فرقوں کے لیے استعمال ہونے لگا۔ جو لوگ ان فرقوں کے رکن ہیں وہ اپنی خواہشات کی ہوا کی زد میں ہیں اور انبیا کے پیغام کو نظر انداز کیے ہوئے ہیں، یا پھر وہ اپنی یا اپنے پیشوا کی خام خیالی اور اوہام کی پیروی کرتے ہوئے الہامی کتب کو سمجھنے کی سعی کر رہے ہیں۔ ''ھویٰ'' کا لفظ ''فرقے'' کے معنی میں heresy کے لفظ کے مترادف ہے۔ heresy کی اصل یونانی ہے اور وہاں اس کا مطلب ہے ''انتخاب کرنا، چناؤ۔'' heresy وہ راستہ ہے جو ہدایتِ خداوندی کو چھوڑ کر اپنے لیے چن لیا جائے۔

اگر ''الہٰ'' (god) جھوٹا خدا یا سچا خدا ہوسکتا ہے تو God از روئے تعریف سچا خدا ہے۔ اگر الہٰ کوئی بھی ایسی چیز ہے جس کی عبادت اور بندگی ہو سکے تو پھر God وہ ہے جس کی عبادت لازم ہے۔ ''لا الہٰ الا اللہ'' کہنے کا مطلب ہے کہ کسی بھی طرح کی عبادت، کوئی اندازِ بندگی بھی اللہ کے سوا کسی اور کے لیے نہیں ہونا چاہیے کہ اللہ کے سوا ہر خدا جھوٹا خدا ہے۔

شرک

ایمان کا پہلا رکن ہے توحید، یہ اعلان کہ اللہ ایک ہے۔ توحید کا مفہوم نہایت ایجاز اور جامعیت کے ساتھ پہلے کلمہ کی پہلی شہادت میں بیان ہوگیا ہے۔ اس کلمے کو کلمۂ توحید کہا جاتا ہے۔ ''لا الہٰ الا اللہ'' کا مطلب

ہے کہ عبادت کا صرف ایک سچا اور لائقِ پرستش مرکز ہے، ایک ہی ہستی ہے اور وہ ہے اللہ کی۔ عبادت اور بندگی کا ہر دوسرا ہدف باطل ہے۔ کسی بھی دوسری شے کی بندگی کرنا گمراہی، خطا کاری اور شرک ہے۔

''شرک'' کا مطلب ہے ''شریک کرنا، حصہ دار بننا، کسی کو شریک بنانا، کسی کو کسی کا ساجھی بنانا، کسی کو کسی اور کا شریک کرنا۔'' دینی اعتبار سے دیکھیے تو شرک کا مطلب ہے کسی کو اللہ کا شریک بنانا اور اس میں چھپا ہوا یہ ہے کہ اگر شریک کیا ہے تو خدا کے ساتھ یا خدا کو چھوڑ کر اس کی عبادت بھی کی جائے گی۔ قرآن نے یہ لفظ ۷۵ آیات میں استعمال کیا ہے۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ ہوگا Associating others with God۔

وَاعۡبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشۡرِكُوۡا بِهٖ شَيۡـًٔـا (۴:۳۶)
اور اللہ ہی کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو مت ملاؤ۔

لَا تُشۡرِكۡ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِيۡمٌ (۳۱:۱۳)
اللہ کا شریک نہ ٹھہرانا بے شک شریک بنانا بڑی بے انصافی ہے۔

قُلۡ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِىۡ بَرِىۡٓءٌ مِّمَّا تُشۡرِكُوۡنَ (۶:۱۹)
کہ دو، وہی ہے معبود ایک اور میں ان کو قبول نہیں کرتا جو تم شریک کرتے ہو۔

قُلۡ اِنَّمَاۤ اُمِرۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ اللّٰهَ وَلَاۤ اُشۡرِكَ بِهٖ (۱۳:۳۶)
تم کہ دو کہ مجھے تو حکم ہوا ہے کہ میں اللہ ہی کی بندگی کروں اور کسی کو اس کا ساجھی نہ بناؤں۔

اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنے سے یعنی شرک سے بچنا پیامِ قرآنی کا مرکزی حصہ ہے، اس لیے کہ یہ ''توحید'' کا اُلٹ ہے۔ اگر کلمۂ توحید اسلام کا پہلا ستون ہے اور خود توحید اسلام کا پہلا اُصول ہے تو ہم با آسانی یہ جان سکتے ہیں کہ شرک کو اس شدت سے کیوں منع کیا گیا ہے اور اسے اتنا برا کیوں سمجھا گیا ہے اور قرآن میں یہ کیوں کہا گیا ہے کہ شرک ایک ایسا گناہ ہے جو معاف نہیں ہو سکتا:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغۡفِرُ اَنۡ يُّشۡرَكَ بِهٖ وَيَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ يَّشَآءُ (۴:۴۸، ۴:۱۱۶)
بے شک اللہ یہ نہیں بخشتا کہ اس کا شریک ٹھہرایا جائے۔ اس سے نیچے جس کو چاہے بخش دیتا ہے۔

اِنَّهٗ مَنۡ يُّشۡرِكۡ بِاللّٰهِ فَقَدۡ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِ الۡجَـنَّةَ (۵:۷۲)
جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک بنایا، اس پر اللہ نے جنت حرام کر دی۔

توحید کا فہم چونکہ اسلام کے لیے بنیادی اہمیت کا حامل ہے، لہٰذا شرک کی نوعیت پر قدرے مزید

غور کرنا مفید رہے گا۔ عربی کہاوت کے مطابق ''اشیا اپنی اضداد سے پہچانی جاتی ہیں۔'' دن کو ہم رات سے سمجھتے ہیں اور رات کو دن سے جانتے ہیں۔ اسی طرح ''توحید'' تب ہماری سمجھ میں آئے گی جب ہم یہ جان لیں گے کہ شرک کیا ہوتا ہے۔

شرک کے لفظی معنی سے یہ لگتا ہے کہ انسان کو اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک کرنے کے سلسلے میں ہوشیار رہنا چاہیے تا کہ شرک کا ارتکاب نہ ہو جائے، لیکن اگر میں کسی ہستی کو جانتا ہی نہ ہوں تو اس کے ساتھ کسی کو شریک کیوں کر بنا سکتا ہوں، اس کا ساجھی کیسے ٹھہرا سکتا ہوں؟ اس طرح انسان یہ دلیل گھڑ سکتا ہے کہ اگر ہمیں خدا کے بارے میں پتا ہی نہ ہو اور ہم کسی اور کی پرستش کرنے لگیں تو ہمیں شرک کا مجرم نہیں کہا جائے گا۔ یہ ذرا پیچیدہ مسئلہ ہے اور اس کے جواب کے کئی انداز ہو سکتے ہیں۔ ہم صرف ایک بہت بنیادی جواب پر اکتفا کریں گے اور اس سلسلے میں الٰہیات کے جو نازک مسائل اُبھرتے ہیں، ان سے گریز کیا جائے گا۔

اکثر مسلمان مفکرین کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ توحید کا علم انسان کا خاصہ ہے۔ اگر وہ انسان ہے تو اسے توحید کا علم اپنی سرشت میں ملے گا۔ یہ انسانی فطرت کا حصہ ہے، کیونکہ انسان ''لا الٰہ الا اللہ'' کے علم کے ساتھ خلق کیا گیا ہے۔ انبیا اس لیے بھیجے گئے تا کہ انسان کو اس چیز کی یاد دہانی کرائیں جو وہ پہلے سے جانتا ہے۔ پس اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا نوعِ انسانی کی سب سے بنیادی جبلت کی خلاف ورزی کرنا ہے، بلکہ یوں کہیے کہ یہ انسانی فطرت سے غداری ہے اور ایک طرح سے ہستیِ انسانی کے دائرے سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے۔ اسی سے یہ واضح ہوگا کہ شرک اتنا بڑا گناہ کیوں ہے: یہ اس چیز کو اُلٹ دینے کا نام ہے جس کی وجہ سے انسان انسان بنتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھیے تو توحید سے بے خبری کا دعویٰ کرنا ایسے ہی ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ میں تو انسان ہی نہیں ہوں۔ اگلے جہان میں جنت انسانوں کی سرزمین ہے، جب کہ جہنم اللہ کی مخلوق میں سے ان لوگوں کا ٹھکانا ہے جن کا آغاز تو انسان کے طور پر ہوا تھا، لیکن وہ اپنے مقامِ انسانیت سے گر گئے اور انسان کی سطح پر زندگی نہ گذار پائے۔

شرک کی بحث ہو تو ان چیزوں کی نوعیت کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے جن کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنایا جا سکتا ہے۔ یہاں صرف اللہ کے سوا کسی دوسری ہستی یا ہستیوں کی عبادت کا سوال یا محض لفظی اور سطحی معنی میں بت پرستی کا معاملہ نہیں ہے۔ یاد رہے کہ ''ھویٰ'' (خواہش) بھی ایک خدا ہے اور جو لوگ ''ھویٰ'' کی پیروی کرتے ہیں، وہ مشرک ہیں۔ پس اپنی رائے اور اپنے احساسات کا اتباع بھی

شرک ہی کی ایک شکل قرار پائے گی۔ بہت سے علما کی رائے کے مطابق یہ شرک کی بت پرستی سے بھی بری شکل ہے، کیونکہ بت پرستی صاف اور سادہ چیز ہے، لہٰذا اس پر قابو پانا اور اس کا علاج کرنا بھی نسبتاً آسان ہے، لیکن ہوا و ہوس کی بندگی سینوں میں چھپی رہتی ہے اور اکثر ایسے لوگوں میں بھی پائی جاتی ہے جو بظاہر بہت پارسا لگتے ہیں۔

شرکِ جلی یا کھلے شرک کا علاج یہ ہے کہ شریعت پر عمل کیا جائے۔ بالفاظِ دیگر جب انسان اسلام کی پہلی جہت پر عمل کرتا ہے تو وہ احکامِ خداوندی کی اطاعت کر رہا ہوتا ہے۔ اس طرح اس کا عمل درست سمت اور درست نہج پر آ جاتا ہے۔ تاہم شرکِ خفی ''اسلام'' کے دائرے سے متعلق نہیں، اس کا تعلق ایمان اور احسان سے ہے، یعنی دین کی دوسری اور تیسری جہت سے۔ اس کو پہچاننا اور اس کا مداوا کرنا کھلے شرک کے مقابلے میں کہیں زیادہ مشکل ہے۔ اب معاملہ صرف اتنا نہیں رہ جاتا کہ انسان بعض اعمال انجام دے کر ''توحید'' کی ظاہری صورت قائم کر لے، بلکہ شرکِ خفی سے بچنے کے لیے انسان کو اپنے خیالات، فہم و افکار، رویے اور اخلاقی صفات، سب کو ''توحید'' کے مطابق بنانا پڑتا ہے۔

رسولِ خداؐ نے فرمایا کہ انھیں حکمِ خداوندی ہے کہ وہ لوگوں سے جنگ کرتے رہیں، تاوقتیکہ وہ ''لا الٰہ الا اللہ'' کا اقرار نہ کرلیں۔ اس زبانی اقرار سے وہ مسلمان معاشرے کے فرد بن جائیں گے۔ تاہم اس معاشرے کے اچھے افراد بننے کے لیے ضروری ہے کہ وہ باقی پانچ ارکانِ دین پر بھی عمل پیرا ہوں۔ رسولِ خداؐ کا فرمان ہے کہ ''نماز چھوڑ دینے سے آدمی شرک اور کفر میں جا پڑتا ہے۔''[۴] اس سے ایک مرتبہ پھر نماز کی بنیادی اہمیت کا احساس اُجاگر ہوتا ہے، لیکن نماز کی پابندی کرنا ایک ظاہری عمل ہے اور اس سے لازماً یہ پتا نہیں چلتا کہ انسان کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ لوگ باگ شرعی احکام پر عمل کر رہے ہوتے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایمان ان کے دل میں اُتر چکا ہے۔ کتنی ہی احادیث ایسی ہیں جن میں آنحضرتؐ نے لوگوں کے رویوں اور ان کی سوچ کے بارے میں تشویش کا اظہار فرمایا ہے۔ آپؐ کے صحابہؓ میں سے ایک نے یوں روایت کی ہے:

> ہم آپس میں دجّال کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے کہ آنحضرتؐ اپنے گھر سے نکل کر ہمارے پاس تشریف لائے۔ آپؐ نے فرمایا، میں تمھیں ایک ایسی بات بتاؤں جو میرے لیے دجّال سے زیادہ خوفناک ہے؟ صحابہؓ نے کہا کہ اللہ کے رسولؐ فرمائیے۔ آپ نے کہا: شرکِ خفی، یا یہ کہ کوئی شخص نماز ادا کرے اور نماز کو خوب سنوار کر پڑھے محض اس لیے کہ ان لوگوں کو دکھا سکے جو اسے نماز پڑھتے دیکھ رہے ہوں۔[۵]

مندرجہ ذیل ایک اور حدیث سے تو یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ عام مفہوم میں بت پرستی یا Paganism ایسی اصطلاحات ہیں جو اس مسئلے کی گرد کو بھی نہیں پہنچتیں جو شرک کے عنوان سے زیر بحث آتا ہے:

مجھے اپنی امت کے لیے جس چیز کا سب سے زیادہ خوف ہے، وہ شرک ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ سورج کی پوجا کرنے لگیں گے، یا چاند کی یا بتوں کی پرستش کرنے لگیں گے۔ میرا کہنا یہ ہے کہ وہ عمل کریں گے، مگر ماسویٰ اللہ کے لیے اور چھپی ہوئی خواہشات سے۔[٦]

مختصراً یہ کہیے کہ مسلمانوں کی نظر میں خدا ہی وہ واحد ہستی ہے جو صحیح معنوں میں عبادت، اطاعت اور بندگی کے لائق ہے۔ اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کرنا اصل فطرتِ انسانی کے بنیادی داعیے (impulse) سے غداری کے برابر ہے۔ شرک صرف یہی نہیں ہے کہ انسان ایک سے زیادہ خداؤں کی پرستش کرے، بلکہ شرک یہ بھی ہے کہ انسان اپنی خواہشات کا اتباع کرنے لگے یا ہدایتِ خداوندی سے کمتر کسی اور شے کی پیروی کرے۔

بادی النظر میں ''توحید'' کا عملی اطلاق دیگر ہر شے سے بڑھا ہوا ہے، کیونکہ اس کا تعلق زندگی کے روزمرہ معمول سے ہے۔ اسی سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ ہمارے عمل کا محرک کیا ہونا چاہیے اور یوں اس کا اسلام کی تیسری جہت ''احسان'' سے بہت قریبی ربط بن جاتا ہے۔ سارے غلط محرکات کی تہ میں ایک ہی چیز کام کر رہی ہوتی ہے اور وہ ہے شرک۔ یہ ایک کی جگہ دو یا دو سے زیادہ چیزیں دیکھنے کا نام ہے اور اِسی سے ہر نوع کی گمراہی، غلط کاری اور خسران جنم لیتا ہے۔

اگر توحید کا مطلب ہے صرف اللہ کی عبادت کرنا اور شرک دوسرے خداؤں کی پرستش کا نام ہے تو ہم یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ہم اللہ کی عبادت کیوں کر کریں اور دوسروں کی عبادت سے کیوں کر بچیں؟ پہلا جواب ہوگا کہ ''اسلام'' — اپنے محدود معانی میں یعنی احکامِ شریعت — لیکن شریعت کا اطلاق صرف عمل پر ہوتا ہے۔ محرکات، رویوں، فہم اور سوچ کے انداز کا کیا ہوگا؟ ان کو کیوں کر تبدیل اور توحید سے ہم آہنگ کیا جائے؟ اس قبیل کے سوالات کا جواب دینے کے لیے لازم ہے کہ ہم یہ اچھی طرح وضاحت سے سمجھ لیں کہ جب ہم اللہ (God) کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد کیا ہوتی ہے، ہم کس حقیقت کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔ کتاب کے اس حصے کے باقی ماندہ صفحات میں ہم اسی موضوع پر گفتگو کریں گے۔

آیاتِ خداوندی

قرآن کلامِ خداوندی ہے، انسانوں سے اللہ کا خطاب ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ اس کا اپنا اظہار ہے۔ ایسے ہی جیسے ہم بات کرتے ہیں تو اپنا اظہار و ابلاغ کرتے ہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ ہم ایک کردار ادا کر رہے ہوں، لیکن یہ کردار بہرحال ہم نے خود اپنے لیے منتخب کیا ہے اور کوئی دوسرا شخص اس کردار کو ہماری طرح ادا نہیں کرسکتا۔ یہی نہیں بلکہ وہ کردار جو ہم ادا کر رہے ہیں، اس سے بھی کسی حد تک ہماری ذات کا اظہار ہوتا ہے۔

جب مسلمان علما قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ ہر سورۃ، ہر آیت، ہر لفظ اور ہر حرف کو اس نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ گویا اللہ تعالیٰ اپنا آپ ان آیات میں کھول کر بیان کر رہا ہو۔ قرآن میں کوئی چیز بھی بے اہمیت نہیں، کیونکہ جب خدا کلام کرتا ہے تو وہ اس امر سے کاملاً آگاہ ہے کہ وہ انسانوں سے کیا کہہ رہا ہے۔ انسانوں کا معاملہ مختلف ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے ہمیں یہ آگہی میسر نہ ہو کہ ہمارے الفاظ کیا کہہ رہے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ ہماری طرح بے خبر اور غافل نہیں۔ پس اسے ٹھیک ٹھیک معلوم ہے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ انسان اپنی اپنی بساط اور ہمت کے مطابق اس کے کلام کو سمجھ لیتے ہیں۔ اسلام میں مذہب کے، دین کے معنی ہی آخر الامر یہ ہیں کہ قرآن کو سمجھا جائے اور اس کے پیغام کو اپنی روزمرہ زندگی میں ایک مجسم صورت میں ڈھال دیا جائے۔

قرآن نوعِ انسانی کو اللہ کی خبر دیتا ہے، کیونکہ یہ اللہ کا وہ بامعنی اور ارادی کلام ہے جو انسان کو خطاب کرتا ہے۔ قرآن کی ہر شے اللہ کی طرف اشارہ ہے، اس کی نشانی ہے، اس کا پتا دیتی ہے۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ قرآن مجید نے اپنے فقروں اور الفاظ کو ''آیات'' (نشانیاں) کہہ کر کیوں یاد کیا ہے۔

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ (۲:۹۹)

اور ہم نے تیری طرف واضح اور روشن دلیلیں اُتاری ہیں۔ ان سے وہی منکر ہوں گے جو بے حکم فاسق ہیں۔

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ (۱۰:۱)

یہ آیات ہیں پکی کتاب کی۔

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا (۱۲:۱-۲)

یہ آیتیں ہیں واضح کتاب کی۔ ہم نے اس کو اُتارا ہے قرآن عربی زبان کا۔

قرآن اللہ تعالیٰ کا اظہار و بیان ہے، تاہم صرف یہی ایک بیان نہیں، دیگر صحائف بھی اس کا بیان کرتے ہیں اور اس کی مخلوق بھی یہی کام انجام دیتی ہے۔قرآن مجید نے ''آیت'' کا لفظ تقریباً چار سو مقامات پر استعمال کیا ہے۔اس کے بالکل عمومی معنی تو اس چیز کے ہوتے ہیں جو دوسری کسی چیز کی خبر دیتی ہو۔ذرا زیادہ خاص معنوں میں اس لفظ سے مراد ہے زمین و آسمان کی ہر شے بحیثیت اللہ کی نشانی کے۔ہر شے اللہ کا پتا دیتی ہے، کیونکہ ہر شے ''مسلم'' ہے یعنی اپنے وجود میں اللہ کے حکم کے سامنے جھکی ہوئی ہے۔ہر واقعہ جو رونما ہوتا ہے ہمیں عالم خلق میں، اللہ تعالیٰ کے کسی فعل کی خبر دیتا ہے۔اللہ کی نشانیاں صرف عالمِ فطرت یا تاریخی واقعات ہی میں نہیں ہیں، یہ نشانیاں ہمارے اندر بھی پائی جاتی ہیں:

وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ (۱۷:۱۲)	اور ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا۔
وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ (۳۶:۳۳)	اور مردہ زمین بھی ان کے لیے نشانی ہے کہ ہم نے اسے زندہ کیا اور اس میں سے دانہ اُگایا کہ اسی کو یہ کھاتے ہیں۔
وَ مِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ (۳۰:۲۲)	اور زمین و آسمان کا بنانا اس کی نشانیوں میں سے ہے اور تمھاری بھانت بھانت کی بولیاں اور رنگوں کا اختلاف بھی۔
وَ مِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ (۴۲:۳۲)	اور اس کی ایک نشانی ہے سمندر میں چلنے والے جہاز، جیسے نشانِ راہ۔
وَ فِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۔ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ (۵۱:۲۰-۲۱)	اور زمین میں بھی نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے لیے اور خود تمھارے اندر بھی۔کیا تم دیکھتے نہیں؟

قرآن مجید میں ''آیت'' کا لفظ اس سے محدود تر معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ان مقامات پر آیت کا لفظ ان معجزات اور الہامی کتابوں کی طرف اشارہ کرنے کے لیے آیا ہے جو انبیا کو اس بات کے ثبوت اور دلیل کے طور پر دیے گئے تھے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پیغام بر ہیں، پیغامات خداوندی لے کر آئے ہیں۔آیاتِ خداوندی کے ذریعے اللہ کے پیغمبر انسانوں کو تاریخ کی معنویت سے آگاہ کرتے ہیں۔اگر سب انبیا اور ان کے ماننے والے ''مسلم'' ہیں تو سب انبیا کا عمل، ان کا کارِ نبوّت اللہ کی

حکمت اور قدرت کی خبر دیتا ہے، اور اُس کی حکمت وقدرت کی نشانی ہے:

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ۔ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۲٦:۱۵۳ - ۵٤)	بولے، ضرور تم پر کسی نے جادو کر رکھا ہے۔ تم ہم ایسے ہی ایک آدمی ہی ہو۔ سو اگر سچے ہو تو کوئی نشانی لے کر آ ؤ۔
وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ (۱۱:۹٦ - ۹۷)	اور ہم نے موسیٰ کو فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس اپنی نشانیوں اور ایک واضح سند کے ساتھ بھیجا۔
فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى (۲۸:۳٦)	پھر جب موسیٰ ان کے پاس ہماری کھلی نشانیاں لے کر پہنچے تو وہ بولے، اور کچھ نہیں یہ جادو گھڑ لیا ہے۔
لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖٓ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ (۱۲:۷)	بے شک یوسف اور اس کے بھائیوں کی سرگذشت میں پوچھنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔

اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ان سب مفاہیم کے علاوہ قرآن مجید اپنے الفاظ کو بھی آیات کہتا ہے اور اس طرح یہ اصطلاح ہر سورت کے ذیلی اجزا کے عنوان کے طور پر بھی استعمال ہونے لگی۔

مختصر یہ کہ ''آیت'' نشانی (sign) کے لفظ کا اطلاق کسی بھی چیز پر ہو سکتا ہے۔ ہر شے ایک نشانی ہے، کیونکہ ہر شے اللہ کی مخلوق ہے۔ کائنات کی ہر شے آیتِ خداوندی (آیة اللّٰه) ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جدید سیاسی حوادث کی وجہ سے یہ خاص اصطلاح ایک اور انداز میں بھی زبان زدِ عام ہو گئی ہے اور اب اسے بعض علما کے لقب کے طور پر برتا جانے لگا ہے۔ ورنہ اصطلاحی معنی میں تو شیطان بھی اللہ کی ایک نشانی ہے اور جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ اس کی سرگرمی بھی عالمِ تخلیق میں حکمتِ خداوندی ہی کی مظہر ہے۔

''آیت'' کی اصطلاح پر گفتگو مکمل کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ میں مضمر بعض نکات کو کھول کر بیان کر دیا جائے۔ آیت یا نشانی اس لیے ہوتی ہے کہ انسان اسے پڑھ سکے۔ ہم نشانیاں اسی وقت مقرر کرتے ہیں یا اشارے اسی لیے کرتے ہیں کہ ہمیں ایک پیغام دینا ہوتا ہے۔ قرآن میں اس اصطلاح کا تین مفاہیم یا تین معنوں میں استعمال ہمیں اسلام کی ایک گہری معنویت

سے باخبر کرتا ہے اور یہ ایک ایسا نکتہ ہے جو مسلمانوں کے لیے اس قدر بدیہی ہے کہ اگر غیر مسلم اسے فوری طور پر گرفت میں لانے سے قاصر رہ جائیں تو مسلمان اکثر اس پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں۔ سارا عالمِ طبیعی اور الہامی صحیفے ہم سے براہِ راست کلام کرتے ہیں اور ان کا ایک خاص پیغام ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سے یہ چاہتے ہیں کہ ہم اس پیغام کو پڑھیں اور پھر اس کے مطابق مناسب عمل کریں۔ قرآن میں اللہ کی نشانیوں کا ذکر آتا ہے تو اس کے بعد عموماً اختتام ان کلمات پر ہوتا ہے کہ **"لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ"** (شاید تم سمجھو)، **"اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ"** (کیا تم کو عقل نہیں)، **"لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْن"** (شاید تم سوچو)، **"اَفَلَا تَتَفَکَّرُوْنَ"** (کیا تم سوچتے نہیں)، **"اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ"** (کیا تم دیکھتے نہیں)، **"لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْن"** (شاید تم یاددہانی حاصل کرو)۔ انسان کا بدترین عمل یہ ہے کہ وہ اس پیغام کو نظر انداز کر دے جو اس کی نگاہوں کے سامنے ہر سو پھیلا ہوا ہے، توحید کا پیغام:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ۔ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ (۱۲:۱۰۵-۶)	اور زمین و آسمان میں بہت سی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ ہو کر گذرتے ہیں اور ان پر دھیان نہیں کرتے اور ان میں سے اکثر اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، مگر اس طرح کہ ساتھ ہی اس کے شریک بھی ٹھہرائے ہوئے ہیں۔
وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا (۳۲:۲۲)	اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جسے اس کے رب کی باتوں سے یاددہانی کروائی جائے اور پھر وہ اس سے منہ موڑ جائے۔

تعبیرِ آیات

آیاتِ خداوندی سے تاریخ کے دائرے میں اللہ کی خبر ملتی ہے۔ آیاتِ خداوندی کی دو بنیادی قسمیں ہیں۔ آیاتِ نبوّت اور آیاتِ طبیعت یا رسولوں کی لائی ہوئی نشانیاں اور عالمِ طبیعی میں موجود نشانیاں۔ آیاتِ نبوّت کو زبانی یا تحریری نشانیوں (مذہبی صحیفے) اور جسمانی طبیعی نشانیوں، یعنی معجزات میں بانٹا جا سکتا ہے۔ آیاتِ طبیعی کو بھی دو قسموں میں بانٹا جا سکتا ہے، خارجی نشانیاں جیسے ہمارے گردو پیش کی دنیا کی نشانیاں خواہ وہ سماجی ہوں یا عالمِ طبیعی میں پائی جائیں اور داخلی نشانیاں جو ہمارے اندر کی دنیا سے تعلق رکھتی ہیں۔ آیاتِ نبوّت میں سے کچھ پر ہم آگے چل کر اس وقت گفتگو کریں گے

جب نبوّت کی بحث آئے گی۔ خارجی اور داخلی نشانیوں پر بھی تفصیل سے غور کیا جائے گا جب ہم انسان اور کائنات کے باہمی رشتے پر بحث کریں گے۔ سرِ دست ہم صرف ایک سوال اٹھانا چاہتے ہیں: آیاتِ خداوندی سے ہمیں ''اللہ'' کے لفظ کے فہم میں کیا مدد ملتی ہے؟

آیات یا نشانیوں کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ آیاتِ خداوندی ہی ہوتی ہیں۔ اگر ہم آیاتِ خداوندی کو سمجھ لیں تو اللہ تعالیٰ کے بارے میں بھی ہمارے فہم میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہوتا ہے۔ اللہ کی نشانیوں کو سمجھنے کی ایک راہ یہ بھی ہے کہ ہم عالمِ طبیعی پر نظر ڈالیں اور اس کی زبان کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ایک لحاظ سے یہی وہ کام ہے جو جدید سائنس کرتی ہے۔ سائنس عالمِ طبیعی اور اس کائنات کے پیغام کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے، تاہم سائنس میں حقیقت کی ماہیت کے بارے میں بعض مفروضات کام کر رہے ہیں اور اسی لیے وہ خدا کو معرضِ بحث سے خارج کر دیتی ہے: کیونکہ اس کی نظر میں سائنسی معاملات ایک الگ چیز ہیں اور خدا کا ان امور سے کوئی تعلق نہیں۔

عالمِ طبیعی کے بارے میں روایتی اسلامی نقطۂ نظر اور جدید سائنس کے نقطۂ نظر میں ایک بنیادی فرق ہے اور وہ یہ کہ مسلمان اس ایمان کے ساتھ آغاز کرتے ہیں کہ ''لا الٰہ الا اللہ'' مطلب یہ ہوا کہ مسلمانوں کو پتا ہوتا ہے کہ یہ آیات اور نشانیاں جو ہیں وہ اللہ کی نشانیاں ہیں، لیکن انھیں یہ سمجھنے کی کوشش کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام، اس کا خطاب ان سے کیا ہے۔ سائنس دانوں کا احساس یہ ہے کہ عالمِ طبیعی کے مظاہر کو سمجھنے کے عمل کا اس سوال سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ خدا کا وجود ہے یا نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ دو یکسر مختلف نقطہ ہائے نظر وجود میں آ جاتے ہیں جن کے درمیان فاصلہ ختم کر کے انھیں ایک دوسرے کے قریب لانا کوئی آسان کام نہیں۔

بات کو اسی رخ پر آگے بڑھانے کے بجائے ہم ایک تمثیل کے ذریعے اسلامی اور سائنسی اندازِ فکر کے فرق کو بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک تصویر کو بہت سے لوگ دیکھ رہے ہیں، مثلاً مائیکل اینجلو کی تصویر کو، اور یہ سمجھنے کے لیے کوشاں ہیں کہ مصور نے کیا کہا ہے۔ تصویر میں چھپے ہوئے پیغام کی تعبیر پر لوگوں کی آرا مختلف ہیں، لیکن ایک نکتے پر سبھی متفق ہیں کہ تصویر میں اہم ترین بات یہ ہے کہ مصور نے اس کے وسیلے سے کچھ کہنے کی کوشش کی ہے۔ دوسری طرف ہم اس تصویر کا مطالعہ بیسیوں سائنسی علوم میں سے کسی ایک کے نقطۂ نظر سے بھی کر سکتے ہیں۔ کینوس کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے، آب و رنگ کو جانچا جا سکتا ہے، پینٹ پر غور ہو سکتا ہے، تصویر میں دکھائے گئے مختلف اجزا کے درمیان

جو اقلیدسی ربط ہے، اس کا جائزہ لیا جا سکتا ہے وغیرہ۔ ان سب کاموں کے لیے طبیعیات، کیمیا، حیاتیات، جیومیٹری اور دیگر سائنسی علوم کا استعمال کرنا ہوگا۔ اسی کام کے لیے کچھ اور علوم کا زاویۂ نگاہ بھی برتا جا سکتا ہے، مثلاً سماجیات، تاریخ اور نفسیات، کیونکہ ان شعبوں میں جدید سائنسی علم کو درست اور حتمی تسلیم کر کے بات کی جاتی ہے۔ یہ سب ٹھیک اور درست ہے اور کسی شے پر اس انداز سے نظر کرنے اور اسلامی تناظر کے مطابق اس پر غور کرنے میں اس لحاظ سے کوئی تضاد نہیں ہے۔ اب فرض کیجیے کہ سائنس دانوں کا ایک گروہ یہ دعویٰ کرنے چلے کہ یہ تصویر خود بخود وجود میں آ گئی تھی، اس کا کوئی مصور نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو اس کا مقصد اس تصویر سے کسی چیز کا اظہار کرنا نہیں تھا۔ وہ تو بس کینوس پر بے تکے رنگ بکھیر رہا تھا، اور اگر اس کا کوئی پیغام، اس کی تصویر کشی کا کوئی مقصد رہا بھی تھا تو ہمارے پاس اسے سمجھنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

مسلمانوں کے لیے ''توحید'' کا ثبوت ہی یہ ہے کہ اشیائے کائنات ایک خاص ڈھنگ سے پائی جاتی ہیں، ایسے ہی جیسے اکثر لوگوں کے لیے تصویر کا وجود ہی مصور اور اس کے پیغام کا ثبوت ہے۔ جس طرح ہر باہوش اور عقل والے آدمی کے لیے یہ ایک بدیہی چیز ہے کہ عجائب گھر میں آویزاں تصاویر کا کوئی خالق تھا، اسی طرح روایتی مسلمانوں کے لیے یہ ایک بدیہی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات تخلیق کی ہے، اس کے لیے انھیں کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ مسلمانوں کے ہاں اس فطری بصیرت کو بسا اوقات ''بوڑھی عورتوں کا دین'' کہہ کر یاد کیا گیا ہے۔ اس سے اس نقطۂ نظر کی تحقیر مقصود نہیں ہے، صرف یہ بتانا درکار ہے کہ اتنا بے عقل کوئی بھی نہیں ہوتا کہ اس سامنے کی بات کو سمجھ نہ پائے۔ ''بوڑھی عورتوں کا دین'' کے الفاظ ایک قصے سے ماخوذ ہیں جو رسولِ خداؐ کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔

ایک روز رسول اللہؐ اپنے چند اصحاب کے ہمراہ بستی میں سے گذر رہے تھے۔ آپؐ کی ملاقات ایک ضعیف اور بوڑھی عورت سے ہوئی جو چرخے پر بیٹھی اون کات کر دھاگا بنا رہی تھی۔ آپؐ نے اسے سلام کیا اور اُس سے بات چیت کرنے لگے۔ آپؐ نے پوچھا کہ تم اللہ پر ایمان رکھتی ہو؟ اس نے کہا ہاں۔ آپؐ نے پوچھا کہ کیوں؟ بڑھیا نے جواب دیا کہ ایک چرخہ تک تو گھومتا نہیں، جب تک کہ اسے گھمانے والا ہاتھ نہ ہو تو پھر ان آسمانوں کو حرکت دینے والا بھی تو ہوگا جبھی تو یہ گردش میں ہیں۔ آنحضرتؐ نے اپنے صحابہؓ کی طرف دیکھ کر فرمایا: ''تم میں بوڑھی عورتوں ایسا ایمان ہونا چاہیے۔''[۷]

سوال یہ ہے کہ کائنات میں اللہ کی نشانیوں سے انسان کتنا سیکھ سکتا ہے؟ کئی ادیان میں یہ فلسفے

اور الٰہیات کا دائمی سوال رہا ہے اور اس سے ایک اور سوال جڑا ہوا ہے کہ انسان کو اللہ کی طرف سے وحی کی ضرورت ہے یا نہیں؟ مسلمانوں کی عمومی رائے یہی ہے کہ آیاتِ خداوندی کے فہم کے لیے اللہ کی مدد ضروری ہے۔ انبیا کی لائی ہوئی ہدایت کے بغیر آیاتِ خداوندی کو پڑھنا ایسا ہی ہے جیسے زبان جانے بغیر کسی کی بات سمجھنے کی کوشش کرنا یا سرے سے نطق و گویائی کی شناخت نہ رکھتے ہوئے بھی کلامِ انسانی کو سمجھنے کی سعی کرنا۔

کائنات، خدا اور انسان کے علم کے بارے میں مسلمانوں کا بنیادی نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسان جاہل ہے۔ کتنے ہی بھید اور گتھیاں ایسی ہیں جو انسانی عقل کبھی سلجھا نہیں سکے گی، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان سمجھنے کی کوشش ہی ترک کر دے۔ بے خبری اور بے علمی کا کسی حد تک درماں کیا جا سکتا ہے، لیکن اس درماں طلبی کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ انسان انبیا کی بات پر کان دھرے، اور بالخصوص اِس بات کا ادراک کرے کہ قرآن مجید خدا کا کلام ہے اور خدا کی نشانیوں سے بھرا ہوا ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے، اسے سمجھنے کا مطلب ہے وہ سب جان لینا جو اللہ تعالیٰ انسان کو اپنے بارے میں بتا رہا ہے۔ اس نقطۂ نظر کے ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اللہ کا ایک پیغام ہے: جسے قرآن کہتے ہیں۔ سیدنا محمدؐ یہ پیغام لے کر آئے ہیں۔ یہ پیغام ہم سے کیا کہتا ہے، یہ جاننا ہو تو اسے پڑھنا ہوگا، سمجھنا ہو گا۔ اس پیغام کا موضوع جیسا کہ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں سوائے توحید کے اور کچھ نہیں۔

عمومی تبصرہ اگر کسی حد تک مفید ہو سکتا ہے تو ہم یہ کہیں گے کہ جن مغربی اہلِ علم نے قرآن کا مطالعہ کیا ہے، انھوں نے تاریخ کے سیاق و سباق میں، تاریخی حوالے سے اس کی معنویت کی تلاش کی، قرآن کے پس منظر میں موجود یہودی اور نصرانی عناصر کا جائزہ لیا، سماجی تانے بانے اور رشتوں پر نظر کی، اقتصادی معاملات دیکھے اور زبان و بیان کے مسائل کو پرکھا۔ ان کا احساس یہ رہا ہے کہ اگر رسول خداؐ کی ذات اور ابتدائی مسلمانوں کے گرد و پیش پھیلے ہوئے سماجی اور تاریخی حالات دریافت کر لیے جائیں تو یہ ایک بنیادی اہمیت کی چیز ہوگی۔ جس آیت میں کوئی تاریخی واقعہ مذکور ہوا ہے اُسے اس واقعے ہی کے حوالے سے سمجھنا چاہیے۔

شرح و تعبیر کے اس جدید مغربی اندازِ نظر کے بعض اجزا ایسے ہیں جو مسلمانوں میں بہت شروع کے زمانے سے معروف رہے ہیں اور مغربی اہلِ علم اکثر اوقات اپنے پیشرو مسلمان مصنّفین ہی کے

نقش قدم پر چلتے رہے ہیں، تاہم روایتی اسلامی نقطۂ نظر اور اس مغربی طرزِ فکر میں ایک بہت بڑا فرق ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کی نگاہ میں کسی آیت کی تاریخی معنویت جان لینے سے اس کے معانی ختم نہیں ہو جاتے۔ اگر ان کو یہ دلیل دی جائے کہ قرآن کو تاریخی واقعات کے حوالے سے سمجھنا چاہیے تو مسلمان مفسرین یہ جواب دیں گے کہ تاریخ کے واقعات تو خود اللہ کی نشانیاں ہیں، اس لیے ان کی معنویت عام واقعاتی سطح سے بالاتر ہے۔ تاریخی حالات کو آپ کیوں کر سمجھ سکتے ہیں اگر آپ یہ نہ جان پائے کہ ان واقعات سے ''توحید'' کے بارے میں کیا پیغام ملتا ہے؟ مذہبی کتابوں میں پائی جانے والی آیاتِ خداوندی اور عالمِ طبعی میں اللہ کی نشانیوں میں فرق یہ ہے کہ کتابی آیات ہم سے کھلے، واضح انداز میں اور الفاظ میں یہ کہ دیتی ہیں کہ یہ اللہ کا پیغام ہے، تاہم تاریخ کی نشانیوں میں چھپا ہوا پیامِ ربّانی انسان کو اس وقت تک سمجھ نہیں آسکتا جب تک وہ مذہبی صحیفوں کی آیاتِ خداوندی کا فہم نہ حاصل کر لے۔

کتابِ خداوندی کی آیات اور تاریخی نشانیوں کی تفسیر و تعبیر کے سلسلے میں روایتی اسلامی طرزِ فکر اور جدید اندازِ نظر ایک بات پر متفق ہیں۔ دونوں کے نزدیک یہ طے ہے کہ تاریخ میں ایک معنی ہیں اور تاریخ کا یہ مفہوم تب سمجھ آتا ہے جب ہم یہ جان لیں کہ جو ہوا اس کے اسباب کیا تھے۔ جدید مذہبی طرزِ فکر میں اسباب و علل کا یہ سلسلہ ''نیچے سے اوپر'' کو حرکت کرتا ہے اور اس کے مطابق خدا، دین، معاشرہ، سماج، انسان اور تاریخ وغیرہ سب تصورات کے معنی ان عناصرِ ترکیبی میں تلاش کرنا ہوں گے جن سے مل کر ان تصورات کی تشکیل ہوئی ہے۔ یہ عناصرِ ترکیبی طبعی بھی ہو سکتے ہیں، ماحول سے متعلق بھی اور سماجی، نفسیاتی یا اقتصادی بھی۔ اس کے برعکس اسلامی طرزِ فکر ''اوپر سے نیچے'' کی طرف سفر کرتا ہے۔ اس کا آغاز ''توحید'' سے ہوتا ہے اور پھر توحید کی بنیاد پر وہ ہر دوسری شے کو اللہ سے جوڑ کر، اس کے حوالے سے اپنی جگہ پر رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہر شے کے ''معنی'' کو اس کی ''معنویت'' میں تلاش کیا جاتا ہے۔The meaning of a thing is found in its significance۔ ہر شے ایک نشانی ہے اور نشانی اللہ کا پتا دیتی ہے۔

مسلمانوں کو اس بات سے انکار نہیں ہے کہ تاریخی عناصر اہم ہوتے ہیں۔ خود قرآن نے ان کی اہمیت واضح کی ہے۔ جب قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو ''اپنی قوم کی زبان میں'' کلام کرتے ہوئے بھیجا (بلسان قومه)[۵] تو اس سے خاص طور پر اس تصور کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ جو پیغامِ ربّانی کسی قوم پر نازل کیا جاتا ہے، وہ اس کے ثقافتی، تاریخی اور لسانی حالات کے مطابق ہوتا

ہے، لیکن یہ کہ کر ہم اس امر کا بھی اثبات کرتے ہیں کہ یہ سب پیامِ خداوندی ہیں۔ خدا ان تنزیلات میں عربی، عبرانی، سنسکرت یا چینی زبان میں انسان سے کلام کر رہا ہے، انسان اس پیغام کا مخاطب ہے اور یہ پیغام سن رہا ہے۔ یہ نقطۂ نظر اس موقف سے بالکل ہٹ کر ہے کہ زبان انسان کی ایجاد ہے اور جیسے اس نے زبان گھڑی، اسی طرح خدا بھی گھڑ لیا۔

آیاتِ خداوندی کی شرح وتعبیر کے روایتی اسلامی نقطۂ نظر اور ان آیاتِ خداوندی کو تاریخ کے حوالے سے سمجھنے کے مختلف جدید اسالیب کو اختصار سے بیان کرنے میں یہ خطرہ ہے کہ بات کچھ پامال سی ہو جائے گی، تاہم اسے ہم انجیل کے اس قول کی مدد سے بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو رسول خداؐ کی زبانِ مبارک سے بھی مکرر نقل ہوا ہے: ''اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی صورت پر خلق کیا۔''[9] مسلمان علما نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ کائنات کی ہر چیز کو جس سے انسان کا رشتہ ناتا بنتا ہے، حقیقتِ ربّانی کے حوالے سے سمجھنا چاہیے کہ اسی حقیقت سے فطرتِ انسانی کا تعین ہوتا ہے۔ جدید اہلِ علم نے اس قول کو اُلٹ دیا ہے۔ اور اِس ضمن میں ان کا نقطۂ نظر بالکل مختلف ہے۔ ان کے نزدیک اس معاملے میں خدا کوئی فعال عملی کردار نہیں، بلکہ وہ (خدا) ایک ایسی چیز ہے جسے خود انسان نے گھڑ لیا ہے، لہٰذا آج کے اہل علم کا عقیدہ یہ ہے کہ ''انسانوں نے خدا کو اپنی صورت پر خلق کیا ہے، لہٰذا شروع سے لے کر آخر تک تاریخ کے تمام ادوار میں ہمیں مذہبی عقیدہ وعمل کا جو بے شمار تنوع نظر آتا ہے، اس کی توجیہ جدید اہلِ علم یہ کرتے ہیں کہ چونکہ مذہب انسان کی خودساختہ چیز ہے، لہٰذا اس میں اتنی رنگارنگی پائی جاتی ہے۔

اسلام نے ماہیتِ اشیا کو کس طرح پیش کیا ہے، اس کی منطقی ترتیب کیا ہے، یہ اگر جاننا ہو تو آج کے جدید آدمی کو ایک نکتہ ذہن میں رکھنا لازم ہے اور وہ یہ کہ مسلمان کے لیے ہر شے کا آغاز اللہ تعالیٰ سے ہے اور پھر معاملہ نیچے کی طرف سفر کرتا ہے۔ جب کہ ہم لوگوں کی (عام طور پر) سوچ یہ ہے کہ ہر شے کا آغاز انسان سے ہوتا ہے اور پھر بات اوپر کی جانب چلتی ہے، (بلکہ یوں کہیے کہ ہر سمت بکھر کے رہ جاتی ہے) آج کے جدید ذہنی پس منظر میں تو اوپر نیچے، بالا و پست کے الفاظ بھی الجھن سے خالی نہیں ہیں، کیونکہ اس کے لیے ہمیں کوئی نہ کوئی پیمانہ استعمال کرنا پڑتا ہے جس کے مطابق اوپر نیچے کی سمت کا فیصلہ ہو سکے اور ایسے کسی پیمانے پر لوگ آسانی سے متفق نہیں ہوتے۔

اسمائے الٰہیہ

قارئین پر اب یہ بات واضح ہوچکی ہوگی کہ خدا کا ایک کام چلاؤ تصور اسلام جیسے دین سے انصاف کرنے سے ہمیشہ قاصر رہے گا، کیونکہ اس دین میں اس کا اپنا ایک تصورِ خدا ہے اور یہ ایک حتمی اور مطلق مرکزی حیثیت رکھتا ہے جس سے ہر دوسری شے کو جانچا جاتا ہے۔ مسلمان خدا کو کیا سمجھتے ہیں، یہ جاننا ہوتو قرآن کی جانب لوٹنا ہوگا۔

قرآن چونکہ خود اللہ کا کلام ہے، لہٰذا اس میں جو کچھ ہے، وہ اسی کا اظہار ہے جیسے ہماری کہی ہوئی ہر بات، خواہ کسی کا قول ہی کیوں نہ دہرایا گیا ہو، یہ بتاتی ہے کہ ہم کون ہیں۔ لیکن جس چیز کو اللہ کی طرف سے اپنا اظہارِ ذات کہا گیا ہے، اسے سمجھنے کے لیے ہمارے پاس کوئی مضبوط نقطۂ آغاز ہونا چاہیے جس سے ہم اپنا جائزہ شروع کرسکیں۔ سب سے سامنے کی چیز دین کا رُکنِ اوّل یعنی شہادت ہے: ''اللہ کے سوا اور کوئی الٰہ نہیں۔''

یہ جو لفظ ''اللہ'' ہے، اس سے مراد کس قسم کی ہستی ہے؟ اسلام نے اس سوال کا عام طور پر جو جواب دیا ہے، وہ یہ ہے کہ سب سے پہلے تو وہ دیکھا جائے جو قرآن مجید نے ہمیں ''کھلے لفظوں'' میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں بتایا ہے، (اس لیے کہ یوں تو اس کی کہی ہوئی ہر بات کسی نہ کسی داخلی قرینے سے اللہ ہی کے بارے میں ہوتی ہے)۔ اس ضمن میں قرآن کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے۔

قرآن اللہ کے بارے میں کیا کہتا ہے، یہ جاننے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آپ بس اسے پڑھنا شروع کردیجیے، لیکن ہم عرض کرچکے ہیں کہ اس سلسلے میں جدید انسان کی راہ میں کئی رکاوٹیں حائل ہیں اور یہ راستہ اس کے لیے آسان نہیں ہے۔ یہ کام اس کے لیے سہل یوں بنایا جاسکتا ہے، اگر ہم اسلامی الٰہیات میں پائے جانے والے بعض مسلمہ بنیادی تصورات کی مدد سے اس کے لیے ان باتوں کی ایک درجہ بندی کردیں جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں کہی گئی ہیں۔

یاد رہے کہ قرآن مجید ایک ایسی کتاب ہے جو معانی سے معمور ہے۔ اس کی گہرائی بے پایاں ہے اور یہ صدیوں سے لاتعداد فلسفیوں، متکلمین اور علمائے الٰہیات، فقہا، شعرا اور اہلِ فن کے لیے منبعِ فیض رہا ہے۔ اس کے علاوہ ہر شعبۂ زندگی سے متعلق انسانوں پر اس کے جو اثرات رہے ہیں، ان کا تو یہاں مذکور ہی نہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم قرآن کی کسی چیز کا احاطہ نہیں کرسکتے۔ ہم کسی بھی موضوع پر جو کچھ بھی کہیں گے، وہ ہمیشہ ابتدائی نوعیت کا اور ایک نقشے خاکے کا اسیر رہے گا۔ قرآن کے

متن کو دیکھیے اور تاریخ کے منظر نامے پر جس طرح ارتقا ہوتا ہے، اسے دیکھیے تو معاملہ بہت زیادہ پیچیدہ نظر آئے گا۔ یہ حرفِ اعتذار ذہن میں رکھ کر ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کے بارے میں اپنی تعلیمات کو ''اسما الحُسنیٰ'' میں سمو دیا ہے۔ ''الحُسنیٰ'' کا لفظ ''حَسَن'' کا صیغۂ تفضیل ہے جس کا مطلب ہے ''بھلا، خوب صورت، حسین۔''

اللہ تعالیٰ کے ناموں کو ''سب سے حسین'' (الحُسنیٰ) کہنے سے قرآن کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ خود جمیل ہے، خیر ہے، اس لیے اس کے نام جن سے اس نے خود کو موسوم کیا ہے، وہ بھی اچھے اور حسین ہیں، کیونکہ ان میں جمالِ خداوندی کا اظہار ہوتا ہے اور چونکہ اللہ کی رحمت، خیر اور جمال اس کی مخلوق سے بے انتہا بڑھی ہوئی ہے، اس لیے اس کے اسما کا جمال بھی ہر دوسری شے کے نام سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا ہے۔

ایک معروف حدیث میں رسولِ خدا ؐ نے فرمایا تھا کہ ''اللہ تعالیٰ کے ۹۹ نام ہیں۔'' اسلام کی علمی روایت میں ۹۹ اسمائے خداوندی کے بارے میں لکھی جانے والی کتب نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کتابوں کے مصنّفین میں سے کئی ایک نے ذکر کیا ہے کہ ۹۹ کے عدد کو لفظی معنی میں نہیں لینا چاہیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ناموں کی کوئی فہرست بہ ہر لحاظ جامع اور مستند نہیں ہے۔ خود قرآن میں آپ ۹۹ سے زیادہ نام شمار کر سکتے ہیں۔ ان قرآنی الفاظ میں سے کون سا نام اسمائے حسنیٰ میں سے ایک قرار دیا جائے گا، یہ فیصلہ کچھ اہم دینی مضمرات رکھتا ہے۔ بہر کیف اس نکتے پر کسی کو اختلاف نہیں کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے بہت سے نام مذکور ہیں۔ قرآن میں اکثر آنے والے اسمائے خداوندی میں الرحمٰن، الرحیم، العلیم، الحي، القدیر، الخالق، الغفار، الودود شامل ہیں۔ یاد رہے کہ یہ نام ذاتی نام نہیں ہیں جیسے مشتری یا شِوٗ۔ اللہ تعالیٰ کے کوئی ذاتی نام نہیں ہیں سوائے شاید ''اللہ'' کے۔ ہم نے ''شاید'' کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ اسلام کی دینی فکر میں یہ مسئلہ اس انداز میں اٹھایا نہیں گیا۔

مسلم علمائے الٰہیات میں سے بہت سے حضرات کی رائے یہ ہے کہ ''اللہ'' ایک اسمِ عَلَم ہے جو خدا تعالیٰ نے اپنے لیے اختیار کیا ہے، لیکن انگریزی کے لفظ personal کا صحیح مترادف ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ اسمِ عَلَم کے طور پر ''اللہ'' کے لفظ کے کوئی مخصوص معنی نہیں ہیں جیسا کہ ''لندن'' کے لفظ کے کوئی خاص معنی نہیں ہیں کہ ہم کہ سکیں کہ لندن نام کے ہر شہر کی چند متعین صفات ہوتی ہیں۔ بعض دیگر علما نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ ''اللہ'' کے نام کو کئی مختلف بنیادی لفظوں سے ماخوذ مانا جائے۔ اس طرح انھوں نے اس کے کئی معنی مقرر کیے ہیں۔ اگر یہ رائے تسلیم کی جائے تو پھر

اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ''اللہ'' بھی العلیم، الرحمٰن اور القدیر کے مانند ایک نام ہوگا، مثال کے طور پر بعض علما کی رائے ہے کہ ''اللہ'' کا لفظ ''الٰہ'' سے نکلا ہے اور اس کا مطلب ہے ''ال الٰہ'' (The God)۔ دیگر علما کی رائے اس سے مختلف ہے۔ جدید ماہرین لغت عام طور پر یہی رائے درست قرار دیتے ہیں، لیکن یہ صرف علم لغت کا مسئلہ نہیں ہے۔ اس کے الٰہیاتی اور فکری مضمرات بھی سامنے رہنا چاہئیں۔ یہ نکتہ مدِنظر رہے تو اس بات کی بھی سمجھ آ جائے گی کہ بہت سے مسلمان مصنّفین نے ان تمام باتوں کو نظر انداز کیوں کیا ہے جو جدید اہلِ قلم کی رائے میں مسلّم اور بدیہی ہیں۔

جن ادیان میں تعددِ الٰہ کا تصور مروج ہے، ان کے ہاں عموماً ہر خدا یا دیوی دیوتا کی ایک شخصیت یا چہرہ ہوتا ہے جو ایک یا ایک سے زیادہ صفات کو جسمانی صورت میں ظاہر کرتا ہے۔ چنانچہ مثال کے طور پر ہندو دیو مالا میں برھما، وشنو، شِو کے اعمال اور تصرفات دکھائے گئے ہیں اور ان کا بیان اس انداز میں ہوا ہے کہ گویا یہ دیوتا الگ الگ شخصیات ہیں، لیکن ساتھ ہی ہندو یہ بھی اکثر کہتے ہیں کہ برھما ''خالق'' ہے، وشنو ''حفاظت کرنے والا (الحفیظ)'' ہے اور شِو ''مارنے والا (الممیت)'' ہے۔ پھر انھی سب خداؤں کی دیگر صفات بھی ہیں جو ان میں اور دوسرے خداؤں میں اکثر مشترک ہوتی ہیں۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ کے جو نام آئے ہیں، ان کا اسلام کے تصورِ کائنات میں ایک کردار ہے اور اسلام کے تناظر میں ان کی جو حیثیت ہے، وہ کچھ اعتبار سے اس کردار سے مشابہ ہے جو خدایانِ متعدد ان ادیان میں ادا کرتے ہیں جہاں تعددِ الٰہ کا تصور پایا جاتا ہے، لیکن ان میں اور اسلام میں ایک اہم اور بنیادی فرق یہ ہے کہ ہمارے ہاں اسمائے خداوندی کو کبھی شخصیات نہیں بنایا جاتا، نہ ان کو جداگانہ ہستیوں کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ یہاں ہر اسم ایک صفت کو، ایک وصف کو ظاہر کرتا ہے، کسی محسوس مادی چیز کو نہیں، مثال کے طور پر اسلام میں خدا کو کبھی ''باپ'' یا ''آسمان'' کہہ کر نہیں پکارا جاتا یا ''سورج'' یا ''چاند'' کبھی نہیں کہا جاتا۔

اللہ تعالیٰ کے اسما میں سے جو نام سب سے زیادہ concrete معلوم ہوتا ہے وہ غالباً ''المَلِک'' (king، بادشاہ) ہے، لیکن دوسرے اسمائے خداوندی کی طرح اس نام میں بھی یہ مضمر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کسی ٹھوس یا مادی شکل میں تصور نہ کیا جائے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ وہ حقیقت ہے جس میں صفاتِ شاہی اس درجے تک پائی جاتی ہیں کہ اور کسی ہستی کو اس نام سے موسوم کرنا زیبا نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ ''المَلِک'' ہے تو اس کا مطلب ہے کہ ساری قدرت، اختیار اور سروری اسی کی ہے اور سلاطین

ارضی، صدارتیں کرنے والے اور استبدادی حکمران اللہ کی قدرت اور اس کی بادشاہی کے مقابلے میں بس چند مٹے مٹے نقوش کہے جاسکتے ہیں۔

''توحید'' کا مطلب ہے کہ وہ صفات جو اللہ تعالیٰ کے اسما سے متعلق ہیں، وہ صحیح معنوں میں، حقیقت میں صرف اللہ کی صفات ہیں اور مخلوقات میں اگر یہ پائی جاتی ہیں تو ثانوی اور مجازی طور پر۔ اس بات کو یوں سمجھیے کہ کلمۂ توحید میں آپ چاہیں تو کوئی بھی اسمِ خداوندی رکھ کر پڑھ سکتے ہیں۔ ''لاالہ الا اللہ'' میں اسم ''الرحمٰن'' رکھیے تو یوں ہوگا کہ ''لا رحمٰن الا اللہ'' (اللہ کے سوا کوئی رحمٰن نہیں)۔ یوں پہلی شہادت ایک ایسا کلمہ بن جاتا ہے جسے آپ فی الفور ''توحید'' کے مختلف معانی و مضمرات بیان کرنے کے لیے استعمال کرسکتے ہیں۔

اگر اللہ تعالیٰ ''الرحمٰن'' ہیں تو ''الرحمٰن'' کے سوا اور کوئی خدا نہیں۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ خدا ''ہر وہ شے ہے جسے عبادت، عقیدت یا اطاعت کا موضوع و مرکز بنایا جائے۔'' ''الرحمٰن'' منبعِ رحمت ہے، یعنی، خیر، محبت، شفقت اور دوسروں پر مہربانی۔ الرحمٰن ہدفِ عبادت ہے، معبود ہے، مرکز اطاعت ہے، کیونکہ ہر شے کو اپنی بقا کے لیے رحمت کی احتیاج ہے۔ رحمت کے بغیر ہمیں خیر و خوبی نصیب ہوگی نہ شفقت و محبت، بلکہ یوں کہیے کہ ہم ہست سے نیست ہو جائیں گے کہ ہماری ہستی خود ایک عطائے خداوندی ہے جس پر سپاس گذاری واجب ہے۔ سو یہ شہادت ہمیں بتاتی ہے کہ رحمت ساری کی ساری ایک عطیہ ہے ''الرحمٰن'' کا۔ ''لا الٰہ الا الرحمٰن" کا مطلب ہے ''لا رحمة الارحمة الرحمٰن" (الرحمٰن کی رحمت کے سوا اور کوئی رحمت نہیں) یا ''لا رحمٰن الا الرحمٰن" (رحمت والا اگر کوئی ہے تو صرف الرحمٰن)۔ رحمتِ خداوندی اس کائنات کی ہر رحمت پر سایہ فگن ہے۔ اس کی رحمت سچی رحمت ہے۔ دوسری ہر رحمت بس نام کی رحمت ہے۔ درج ذیل حدیث میں رسول خداؐ نے یہی بات فرمائی ہے:

> جس روز اللہ تعالیٰ نے ارض و سما کو خلق کیا، اس روز اس نے سو رحمتیں بھی تخلیق کیں۔ ان میں ہر رحمت زمین و آسمان کو بھر سکتی تھی۔ ان میں سے ایک رحمت کو اللہ تعالیٰ نے دنیائے ارضی کے لیے رکھا۔ اسی رحمت سے ماں اپنے بچے کی طرف جھکتی ہے اور چرند پرند ایک دوسرے کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ قیامت کا دن آن لگے گا تو وہ اس ایک رحمت کو باقی رحمتوں سے مکمل کر دے گا۔[۱۱]

اللہ تعالیٰ ''الحمید'' (لائقِ تعریف، قابلِ ستایش) ہے۔ بالفاظِ دیگر قرآن مجید کی پہلی آیت ''الحمدللہ'' (تعریف اللہ ہی کے لیے ہے) کا مفہوم بھی یہی ہے۔ اس دنیا میں تعریف کے لائق وہی کچھ ہے جو، اچھا، سچا اور مناسب و موزوں ہے۔

مختصراً یہ کہ ہر وہ شے جو حقیقی ہے، یعنی ہر وہ شے جو حقیقت کے مطابق ہے، اور حقیقت خود اللہ تعالیٰ ہے جو خیر و رحمت ہے، صاحب جمال ہے، لائق حمد ہے۔ ''الحمد للہ'' کہنے کا مطلب ہے کہ ''الحمید'' کا نام صرف اللہ ہی کے لیے زیبا ہے۔

اللہ تعالیٰ ''العلیم'' ہے۔ "لا الٰہ الاالعلیم۔" ہر علم ''العلیم'' ہی سے آتا ہے۔ کسی کو کوئی علم نہیں سوائے ''العلیم'' کے۔ علم اگر ہے تو اللہ ہی کا۔ علمِ انسانی سارے کا سارا بس نادانی کے درجات کا نام ہے۔

اللہ تعالیٰ ''القوی'' ہے، قوت والا ہے۔ ''لاقوی الا القوی''(قوت والا اگر کوئی ہے تو فقط ''القوی'')۔ اللہ تعالیٰ کی لامحدود و بے انتہا قوت کے سامنے ہر جسمانی، دنیاوی، سیاسی اور کائناتی قوت ہیچ ہے۔

اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا (۲:۱۶۵)	سارا زور اور اختیار اللہ ہی کا ہے۔
لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ (۱۸:۳۹)	کچھ زور نہیں مگر جو اللہ نے دیا۔

رسول خداؐ نے یہی بات ان کلمات میں فرمائی ہے جو مسلمانوں میں زبان زد عام ہیں۔ "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِیِ الْعَظِيْمِ" (کوئی زور اور قوت نہیں، ہاں مگر وہ جو اللہ، علی و عظیم کی دی ہوئی ہو)۔[۱۱]

اللہ تعالیٰ ''الخالق'' ہے۔ "لاخالق الا اللّٰہ" اللہ کے سوا اور کوئی خلق نہیں کرتا۔ قرآن مجید نے اسے ایک استفہامیہ فقرے کی شکل دی ہے اور یہ پوچھا ہے کہ:

هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُاللّٰهِ (۳۵:۳)	اللہ کے سوا ہے کوئی اور بنانے والا؟

اللہ تعالیٰ ''الباقی'' ہے۔ "لا باقی الا اللّٰہ" (اللہ کے سوا سب فانی ہے)۔

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (۲۸:۸۸)	ہر شے فنا ہے، سوائے اللہ کی ذات کے۔
كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُوالْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ (۵۵:۲۶-۲۷)	روئے زمین پر جو کوئی ہے ختم ہو جانے والا ہے اور تیرے رب کی بزرگی اور عظمت والی ذات باقی رہے گی۔

اللہ تعالیٰ ''الغنی'' ہے۔ ''لاغنی الا اللّٰہ"۔ زمین و آسمان کی ہر چیز اپنی ہستی اور اپنی بقا کے لیے سراسر اللہ کی محتاج ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (۳۵:۱۵)	لوگو! تمھی اللہ کے محتاج ہو۔ اور اللہ وہی ہے بے نیاز سب خوبیوں سے سراہا گیا۔

اللہ تعالیٰ ''مالك الملك'' ہے۔(۳:۲٦) (بادشاہی کا مالک)۔ ہر شے کا مالک اللہ تعالیٰ ہے اور کسی شے کا کوئی اور مالک نہیں۔

لِلّٰہِ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡض(۵:۱۷) اللہ ہی کی ہے سلطنت زمین و آسمان کی۔ (۳:۱۸۹)

لَمۡ یَکُنۡ لَہٗ شَرِیۡکٌ فِی الۡمُلۡك(۱۷:۱۱۱) سلطنت میں اس کا کوئی ساجھی نہیں۔

تَبٰرَکَ الَّذِی بِیَدِہِ الۡمُلۡكُ وھُو علٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡر(۱۷:۱۱۱) بڑی برکت ہے اس کی جس کے ہاتھ میں ہے راج اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

اسی طرح ہم ننانوے اسمائے خداوندی کا ذکر کر سکتے ہیں، لیکن اس کے بجائے ہم صرف ایک اور اسمِ خداوندی کی وضاحت کر کے بات مکمل کرنا چاہیں گے۔ یہ اسمِ خداوندی دیگر اسما کے مقابلے میں توحید کے مفہوم کو ایک اعتبار سے زیادہ وضاحت اور سہولت سے بیان کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ نام ''الحق'' ہے۔ اللہ تعالیٰ ''الحق'' ہے۔''لاحق الا الحق''، الحق کے سوا اور کوئی شے حقیقی نہیں۔ اللہ کے سوا ہر شے، بے حقیقت، فانی، گزراں، مٹ جانے والی، سراب آسا اور نیست و ہیچ ہے۔ خلاصہ یہ کہ اشیا کی ہر صفت، ہر خاصیت جس کا کوئی مثبت پہلو ہے، اللہ تعالیٰ کی کسی صفت سے ماخوذ ہے اور اسی کی وجہ سے اپنا وجود رکھتی ہے۔ ہر اچھی، قابلِ تعریف، بقار کھنے والی اور حقیقی شے اللہ ہی کی ہے، اسی لیے ''الحمد للہ''، تعریف اللہ ہی کے لیے، کسی اور کو زیبا نہیں۔

کائنات یا عالَم کو عموماً ''ماسِوَی اللہ'' (اللہ کے سوا ہر شے) کے الفاظ سے بیان کیا جاتا ہے۔ کلمۂ شہادت یہ بتاتا ہے کہ کائنات بے حقیقت ہے۔ تجزیہ کرتے جایئے تو آخر میں نتیجہ یہی نکلے گا کہ الحق کے مقابلے میں یہ محض لاشئ ہے، لیکن یہ نقطۂ نظر لاشیئیت (Nihilism) کی طرف نہیں لے جاتا۔ لاشیئیت کا تصور یہ تقاضا کرتا ہے کہ ہماری ہستی کی نوعیت اگر نیستی کی ہے، اگر یہ ایک سراب، ایک فریب ہے تو اس سے ایک بے معنویت اور یاسیت کا احساس ابھرنا چاہیے، لیکن ''توحید'' ہمارے لیے اعتماد، ایمان اور خوشی کا راستہ کھول دیتی ہے۔

اگر یہ دنیا اور خود ہم بھی غیر حقیقی ہیں تو اس بات کو کیا کہیے گا کہ ہم نہ صرف اس لحۂ موجود میں جی رہے ہیں، بلکہ اپنی بے حقیقتی اور بے ثباتی کی آگہی بھی رکھتے ہیں۔''ہم بے حقیقت ہیں، غیر حقیقی ہیں'' یہ کہتے ہوئے ان الفاظ کا کہنے والا غیر حقیقی کیوں کر ہو سکتا ہے؟ ہمارا اپنا آپ، ہمارا کلام و گویائی

اور ہماری فہم، ہمارا علم کوئی نہ کوئی حقیقت تو رکھتا ہوگا ورنہ نفسِ انسانی نہ یہ سمجھ سکے گا اور نہ اس بات کو کہہ سکے گا کہ وہ بے حقیقت ہے۔ پس دنیا کی بے حقیقتی میں بھی ایک طرح کی حقیقت ضرور ہے۔ اگر دنیا سرے سے غیر حقیقی ہوتی تو اللہ تعالیٰ ہم سے خطاب کرنے، انسان سے کلام کرنے کی زحمت ہی کیوں کیا کرتا؟ ہاں یہ ہے کہ دنیا میں جو بھی حقیقت پائی جاتی ہے، وہ نہ ہماری ہے نہ اس دنیا کی۔ حقیقت اللہ کی ہے۔ ''الحمد للہ۔'' ہم بطور ''ہم'' بے حقیقت ہیں، لیکن جس حد تک اللہ تعالیٰ نے ہم پر رحمت اور کرم کیا ہے اسی قدر ہم اس رحمت و کرم کے نتیجے کے طور پر حقیقی ہیں۔

اس الجھن کو دور کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ اللہ کی حقیقت تو حقیقتِ مطلقہ ہے، لیکن ہماری حقیقت ایک اضافی حقیقت ہے۔ اللہ کی حقیقت دائمی اور غیر متغیر ہے، وہ پیمانہ جس سے ہر دوسری چیز کو جانچا جاتا ہے۔ دیگر تمام حقیقتیں حقیقتِ خداوندی کے عمل سے وجود میں آتی ہیں، پس اللہ کے سوا ہر شے کو صرف اللہ کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے، ان کی حقیقت اضافی حقیقت ہے۔ لا الٰہ الا اللہ کا مطلب ہے ماسِوَیٰ اللہ کو، اللہ کے علاوہ ہر شے کو اللہ کے حوالے سے سمجھا جانا چاہیے۔

ہر چیز کو سمجھنے کا حتمی اور آخری حوالہ ذاتِ خداوندی ہے۔ کسی شے پر غور کرتے ہوئے اگر اس نسبت اور اس حوالے کو فراموش کر دیا جائے تو پھر یہ ہوگا کہ ہم اس شے کو صرف اس جیسی دوسری غیر حقیقی اشیا کے حوالے سے سمجھ سکیں گے۔ ہمارا علم، غیر حقیقی، غیر یقینی، متغیر اور بے اعتبار رہ جائے گا۔ ہم شک، تذبذب اور حیرانی میں پڑے رہ جائیں گے۔ انسانوں کو یقینی علم تبھی میسر ہوگا جب وہ اس حتمی حوالے کا، اس نقطۂ مطلقہ کا ادراک حاصل کر لیں گے اور اس کا دارومدار ہے ''توحید'' پر۔ ''توحید'' سے ایک اور عہدِ وفا، ایک تعلق استوار ہوتا ہے جسے ایمان کہتے ہیں۔ یہاں آ کر ہم ایک مرتبہ پھر علم اور ایمان کی یکجائی اور مطابقت کے روبرو ہو جاتے ہیں۔

یہ کوئی اتفاقی بات نہیں ہے کہ قرآن مجید کی دوسری سورت کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ (۲:۲) یہ کتاب الٰہی ہے اس میں کچھ شک نہیں۔

اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ شک اور تردد صرف ''توحید'' سے دور ہوتا ہے جس سے انسان اس امر کی شناخت تک پہنچتا ہے کہ ہر ممکنہ صفت اپنی نہاد میں، اپنی اصل و اساس میں حقیقتِ مطلقہ سے منسلک ہے اور اسی سے اپنی حقیقت پاتی ہے۔

کلام

خدا اپنی آیات، کلام کے ذریعے سے ظاہر کرتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ مسلمان قرآن اور دیگر آسمانی کتابوں کو کلامِ خداوندی سمجھتے ہیں۔ اس کلام کے الفاظ اور جملوں کو آیات کہا جاتا ہے، تاہم جس طرح خدا کلام کے ذریعے سے کتابی آیات نازل کرتا ہے، اسی طرح کلام ہی کے ذریعے سے آسمانی اور زمینی آیات بھی ظاہر کرتا ہے۔ انجیلِ عبرانی میں اللہ تعالیٰ نے کلام ہی سے تخلیق کی ابتدا کی ہے اور آفرینش کے لیے کہا: ''روشن ہو جا!'' بہت سے مسلمان علما کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ تخلیق کا پورا سلسلہ اللہ کے کلام پر چل رہا ہے۔

قرآن کی کئی آیات ہیں جن میں اللہ کے کلام یا کلمات کا ذکر آتا ہے مثلاً یہ آیت دیکھیے:

وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۳۱:۲۷)

زمین میں جتنے درخت ہیں اگر وہ قلم ہوں اور سمندر، سات مزید سمندروں کے ساتھ، اس کی روشنائی ہوں، تب بھی اللہ کے کلمات/ باتیں ختم نہ ہو پائیں گی۔ بے شک اللہ زبردست ہے حکمتوں والا۔

پہلی نظر میں لگتا ہے کہ یہ آیت خدا کی کتاب کا بیان کر رہی ہے، لیکن بیشتر مفسرین اس کو اللہ کی تخلیقی قوت سے متعلق سمجھتے ہیں۔ ہر شے کلمۂ ''کُن'' سے وجود میں آتی ہے۔ اللہ کہتا ہے: ''ہو جا'' اور وہ موجود ہو جاتی ہے۔ پس ہر مخلوق ایک کلمہ ہے —— خدا کا کلمہ —— خدا کی تخلیقی قوت لامتناہی ہے، لہٰذا اس کی مخلوقات کے وجود میں آنے کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔

تخلیق بذریعۂ کلام کے قرآنی مضمون کو سند بنا کر کئی مسلمان مفکرین خدا اور کائنات کے تعلق کو سمجھنے کے لیے کلام کی تمثیل کو ایک ذریعے کے طور پر کام میں لاتے ہیں۔ انسانی کلام، الوہی کلام ہی کی ایک نشانی ہے۔ ہم لفظ کیسے ایجاد کرتے ہیں؟ خدا، مخلوقات کو اسی طرح پیدا کرتا ہے۔

ہم گفتگو کرتے ہیں تو اس امر کا آغاز بہر حال کچھ کہنے کی نیت اور ارادے سے ہوتا ہے، چاہے وہ نیت اور ارادہ خود ہم پر واضح نہ ہو۔ گفتگو کا عمل غیر ارادی نہیں ہوتا —— حتیٰ کہ اضطراری بول بھی کسی نہ کسی اندرونی احساس یا خیال، جیسے حیرت یا دُکھ کا اظہار ہوتے ہیں۔ ہم کسی خیال کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، سو بول پڑتے ہیں۔ تاہم ظاہر ہے کہ ہم انسان ہیں، ہر طرح کے نقائص میں گرفتار انسان، اس

لیے ہماری زبان سے نکلنے والے لفظ بھی اکثر اُدھورے اور بے تکے ہوتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جو کہنا چاہتے ہیں، کہ نہیں پاتے، البتہ خدا کا معاملہ دوسرا ہے۔ ہمارے حدود و قیود اس پر وارد نہیں ہوتے۔ وہ جو کہنا چاہتا ہے، کہ دیتا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم اس کے کلمات کو لازماً سمجھ بھی لیتے ہیں۔ قرآن لوگوں سے بار بار کہتا ہے کہ اللہ کی بات تک پہنچنے کے لیے آیاتِ ربّانی میں غور و فکر کرتے رہیں۔ اللہ کا کلام بالکل واضح اور روشن ہے، مگر سننے والے ایسے نہیں کہ سنتے ہی پوری بات سمجھ جائیں۔

انسانی کلام کو مثال بنا کر گفتگو کو اور آگے بڑھائیں تو ہمیں اس میں اور خدا کے کلام میں کئی دلچسپ مماثلتیں ملتی ہیں، مثلاً لفظ اور اس کے بولنے والے میں کیا نسبت ہے؟ یقیناً لفظ وہ نہیں ہے جو اس کا متکلم ہے۔ لفظ تو پل بھر کے لیے ہوتا ہے اور پھر غائب ہو جاتا ہے، لیکن ایسا بھی نہیں کہ یہ اپنے متکلم سے بالکل ہی الگ ہو، کیونکہ متکلم سے منقطع ہو کر تو کلام وجود ہی نہیں پکڑ سکتا۔ الفاظ اپنے وجود کے لیے مکمل طور پر متکلم کے محتاج ہیں۔ خدا کی تمام مخلوقات کا بھی یہی حال ہے۔ ان کی ہستی بھی (ابدیت کے نقطۂ نظر سے) بس ایک لمحے کی ہے اور وہ بھی اپنے وجود کے لیے سرتاسر خدا کے محتاج ہیں۔ خدا ایک کلمہ کہتا ہے جو ممکن ہے کہ ہمیں صدیوں پر محیط لگتا ہو، مگر اللہ کی نظر میں تمام چیزوں کا نظامِ ہست و بود یہ ہے کہ:

كُلُّ شَىْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (۲۸:۸۸) ہر شے فنا ہے، سوائے اس کی ذات کے۔

الٰہیات کے بعض علما کائنات کو ایک کتاب کی طرح سمجھتے ہیں جسے خدا نے تحریر کیا ہے۔ یہاں کی ہر شے ایک حرف ہے۔ حروف مل کر لفظ بن جاتے ہیں۔ پرندے، پھول، پتھر اور درخت، یہ سب حروف سے تشکیل پانے والے الفاظ ہی تو ہیں۔ مختلف لفظوں میں حرف یکساں ہو سکتے ہیں، مگر ان کا باہمی دروبست اتنا متنوع ہے کہ ان سے بننے والے الفاظ ایک سے نہیں ہوتے۔ ہم سر، دُم، بازو، ٹانگ، دل اور جگر کو ''حرف'' کہ سکتے ہیں۔ بیشتر جانور انھی حروف سے بنے ہیں، لیکن ان کی ترتیب میں اختلاف کی وجہ سے جانور آپس میں مختلف ہیں۔ اسی طرح نباتات اور معدنیات بھی ''الفاظ'' ہیں، مگر ان کے ''حروف'' حیوانات سے یکسر مختلف ہیں۔

حروف کے اپنے کوئی معنی نہیں ہوتے۔ انھیں ایک دوسرے سے جوڑا جائے تو وہ الفاظ بن جاتے ہیں، بامعنی الفاظ، تاہم کسی عبارت کے سیاق و سباق میں رکھ کر نہ دیکھا جائے تو لفظ بھی حقیقتاً بے معنی ہی ہوتے ہیں۔ سیاق و سباق سے ہٹ کر ہم کسی لفظ کے بارے میں پورے یقین سے نہیں کہ سکتے کہ اس کا یہ مطلب ہے، اور اگر ہم کوئی جملہ بنانا چاہتے ہیں، یعنی کسی بامعنی اظہار کے خواہاں

ہیں، تو پھر ہم یہ نہیں کر سکتے کہ اِدھر اُدھر سے کچھ لفظ اٹھا کر انھیں بلا سوچے سمجھے جوڑتے چلے جائیں۔ اللہ کے تخلیقی اور تکوینی کلمات کا بھی یہی معاملہ ہے، مثلاً ہاتھی، لہسن اور چیونٹی یہ خدا کے بولے ہوئے لفظ ہیں، لیکن انھیں طبعی دنیا کے سیاق وسباق سے کاٹ دیا جائے تو ان کے کوئی معنی نہیں رہتے۔

کائنات بطور کتاب کی تمثیل کو بڑھاتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر جملے کو کسی باب یا سورت میں ہونا چاہیے۔ سورت کا لفظی مطلب، جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، احاطہ ہے۔ کتاب کائنات کی سورتیں ایسی ہی ہیں جیسے ہماری کائنات میں پائی جانے والی دنیائیں، تاہم ہر دنیا دوسری دنیاؤں کے ساتھ کوئی نہ کوئی تعلق اور نسبت ضرور رکھتی ہے۔ جدید علم الافلاک کی اصطلاح میں تمام ستارے اور کہکشائیں باہمی تعلق رکھتی ہیں، چاہے اس تعلق کی کارفرمائی اور اس کی واقعی نوعیت کے بارے میں ہم کسی یقینی بات تک نہ پہنچ سکیں۔ اسلامی نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہر عالم اسی حد تک کوئی معنویت رکھتا ہے جس حد تک وہ اپنے اردگرد کے عالموں سے مربوط اور متعلق ہے، خواہ زمانی طور پر یا مکانی سطح پر۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ اسلامی کونیات میں ایک طرف تو ہماری دنیا ان بے شمار دنیاؤں میں سے ایک ہے جو زمانِ واحد میں موجود ہیں، اور دوسری جہت سے یہ اس سلسلے کی کوئی کڑی ہے جس میں دنیائیں ایک کے بعد ایک کر کے آپس میں جڑی ہوئی ہیں۔ ہماری دنیا کے پورے معنی اسی صورت میں سمجھے جا سکتے ہیں، جب ہم یہ جان لیں کہ دوسری دنیاؤں میں اس کی جگہ کیا ہے، بالکل اسی طرح جیسے کسی باب کی ساری معنویت اس کتاب پر منحصر ہوتی ہے، جس کا وہ ایک جزو ہے۔

مختصر یہ کہ مسلمان کائنات کو بھی کتابِ خداوندی کہتے ہیں، کیونکہ ان کے بقول یہ بھی ایک مجموعۂ آیات ہے جو اللہ کے پیغام پر مشتمل ہے، لیکن ہمیں بہر حال اس قابل ہونا چاہیے کہ اس پیغام کو سمجھنے کے لیے، آیات کو پوری کتاب کے سیاق وسباق میں دیکھ سکیں۔ اللہ کی اس کتاب کا مرکزی موضوع بلاشبہ توحید ہے، یعنی یہ اقرار اور اعلان کہ اللہ ہی وہ یکتا و یگانہ حقیقت ہے جو کائناتِ ظاہر کی اصل ہے۔

ذات وصفات

مسلمانوں کے پاس، قرآن کے بتائے ہوئے اسمائے الٰہیہ کی صورت میں، حقیقت کی ماہیت پر غور وفکر کا ایسا سامان موجود ہے جو ختم نہیں ہو سکتا۔ ان کے ہاں اسمائے الٰہیہ کی بحث کسی مجرد اور غیر متعلق کاوش سے جنم نہیں لیتی جس کو حقیقی دنیا سے کوئی سروکار ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے برعکس، اسمائے خداوندی کی نشانیاں ہمارے تمام افعال واحوال میں ظاہر ہیں۔ اگر کائنات اور ہمارا وجود، محض اللہ کی

نشانیوں کی جلوہ گاہ ہے تو پھر ظاہر ہے کہ یہ نشانیاں ہمیں بتاتی ہیں کہ اللہ کون ہے یا اس کے نام کیا ہیں!

چونکہ اسمائے الٰہیہ اوصاف وخصائص کی تعیین وتصریح کرتے ہیں، لہٰذا ان کا حوالہ صفات کے طور پر بھی دیا جاتا ہے۔ اللہ جود وکرم کی صفات رکھتا ہے، اس لیے الکریم اور العدل اس کے دو نام ہیں۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ زید سخی اور عادل ہے۔ ان دو باتوں میں فرق یہ ہے کہ خدا کی نسبت سے یہ صفات مطلق ہیں، جب کہ زید کے معاملے میں اضافی۔ اللہ کو سخی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی سخی نہیں، اور نہ ہی کوئی سخی کہلانے کا حقیقی استحقاق رکھتا ہے، لیکن زید کو سخی کہنے کا بس یہ مطلب ہے کہ وہ اکثر لوگوں سے زیادہ سخی ہے۔ اس بات کا مثال کے طور پر یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ زید ایک فارغ شخص ہے اور اسے دوسروں کی مدد کر کے خوشی ہوتی ہے، حالانکہ بیشتر لوگ دوسروں پر اس قدر توجہ صرف کرنے پہ راضی نہیں ہوتے۔

ہم اللہ کے بارے میں جو کچھ جان سکتے ہیں، اسے اچھی طرح واضح کرنے کی غرض سے مسلمان علما نے مختلف عنوانات کے تحت اسمائے خداوندی کی متعدد درجہ بندیاں کیں۔ مثال کے طور پر، ان اسما کو تین مجموعوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا مجموعہ یہ بتاتا ہے کہ اللہ کیا نہیں ہے، دوسرے سے یہ پتا چلتا ہے کہ وہ کیا ہے، اور تیسرے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کائنات سے کیسے متعلق ہے (یعنی کائنات کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہے)۔ انھیں اللہ کے ذاتی، صفاتی اور افعالی اسما کہا جا سکتا ہے۔

ذاتِ شے، حقیقتِ شے ہے، اس کی سب سے گہری اساس جس سے وہ پہچانی جاتی ہے، اور وہ جو کچھ بھی ہے، اسی کی بنیاد پر ہے۔ مثال کے طور پر ہم یہ سوال اٹھا سکتے ہیں کہ گائے کی ذات کیا ہے؟ اگر اس مسئلے پر غور کیا جائے تو ہم ایک واضح اور محکم بات تک پہنچ سکتے ہیں جس سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ گائے کے لیے وہ کون سی چیز مطلقاً ضروری ہے جس کی بنیاد پر وہ گائے ہے، گھوڑا یا گدھا نہیں۔

یہی سوال خدا کے بارے میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ خدا کی ذاتِ حقیقی کیا ہے؟ خدا کی حقیقتِ اصلی کیا ہے جس نے اسے کسی اور چیز کی بجائے خدا بنایا ہے یا جس کی بدولت خدا کائنات کی ہر شے سے الگ ہے؟ اس کا ایک عمومی جواب تو یہ ہے کہ خدا کسی شے سے مماثلت نہیں رکھتا، جب کہ کائنات کی تمام اشیا کسی نہ کسی سے مشابہ ہیں۔ وہ خاصہ جس کی وجہ سے خدا ہر چیز سے ممتاز اور منفرد ہے، ٹھیک سے بیان کیا جائے تو یہ ہے کہ وہ تمام اشیا سے مطلقاً اور قطعاً الگ ہے۔ ہر لحاظ سے ہر اعتبار سے، لیکن انسان، مثال کے طور پر، گایوں، گدھوں اور دیگر حیوانوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ بعض پہلوؤں سے

ان میں معدنیات کے خواص بھی پائے جاتے ہیں۔ کائنات کی ہر چیز انسانوں کے ساتھ کسی نہ کسی طرح کی مشابہت ضرور رکھتی ہے۔ زیادہ واضح اور صحیح لفظوں میں کہا جائے تو ہر چیز کسی نہ کسی لحاظ سے دوسری چیز سے مشابہ ہے۔ ایک خدا ہی ہے جو تمام چیزوں سے الگ ہے، چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کی ذاتی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی شے سے مماثلت نہیں رکھتا۔ مختصر یہ کہ

لَيۡسَ كَمِثۡلِهِۦ شَيۡءٌ (٤٢:١١)　　　　اس جیسی کوئی شے نہیں۔

ذات الٰہیہ وہی ہے جو وہ ہے اور وہ وہ نہیں ہے جو دوسری تمام چیزیں ہیں، مگر وہ ٹھیک ٹھیک ہے کیا؟ وہ کوئی متعین شے نہیں، ورنہ دوسری متعین چیزوں کی طرح کا ہو جائے گا، لیکن کوئی شے خدا کی مثل نہیں ہے۔

اس طرح کی گفتگو ہمیشہ کسی قدر الجھی ہوئی محسوس ہوتی ہے، کیونکہ یہ ایک پیچیدہ طریقہ ہے یہ بتانے کا کہ ہم نہیں جان سکتے کہ خدا کیا ہے، کیسا ہے، لیکن جب ہم خدا کی ذات کے بارے میں اپنی لاعلمی کا اعتراف کر لیتے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ ہم اپنے جہل کا علم رکھتے ہیں۔ اور پھر ذاتِ خداوندی کے بارے میں ہم جان بھی کیسے سکتے ہیں؟ کیونکہ قرآن کہتا ہے کہ کوئی چیز اس کی طرح نہیں۔ ہم چیزوں کو ان کی مماثلتوں سے جانتے ہیں۔ اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ وہ کسی سے مماثلت نہیں رکھتیں، تو ہم جان لیں گے کہ ہم انھیں نہیں جانتے۔ تاہم یہ جہل خود ایک معرفت ہے، کیونکہ اس کے ذریعے سے ہم توحید کا ایک بنیادی مفہوم سمجھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ **لاالٰہ الا اللّٰہ** کا مطلب ہے: ''خدا کے علم کے سوا کوئی علم نہیں''۔ اور ''حقیقی علم خدا کے سوا کسی کے پاس نہیں''۔ مسلمان علما نے یہی بات اس طرح کہی ہے: ''**لا یعلمہ الا اللّٰہ**'' (اللہ کو کوئی نہیں جانتا مگر خود اللہ)۔

لوگوں کا یہ جان لینا کہ وہ کچھ نہیں جانتے، مسلمانوں کی علمی اصطلاح میں جہلِ بسیط (سادہ لاعلمی) کہلاتا ہے۔ اس کے برعکس اپنی لاعلمی کا علم نہ رکھنا جہلِ مرکب (دہری جہالت) ہے۔ خدا کے بارے میں جہلِ مرکب میں مبتلا آدمی یہ سمجھتا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ خدا کیا ہے۔ جو شخص اپنے لیے یہ گمان رکھتا ہے، وہ لاالٰہ الا اللہ کے بنیادی نکتے سے بے خبر ہے، اور اپنی اس بے خبری کی وجہ سے دائرہ انسانیت سے باہر کھڑا ہے، اس لیے، جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں، اکثر مسلمانوں کے لیے ان لوگوں سے متفق ہونا آسان ہے جو صاف کہتے ہیں کہ ہم خدا کو نہیں مانتے، کیونکہ ان لوگوں سے اگر صرف اتنا ہی پوچھ لیا جائے کہ اس انکار کا کیا مطلب ہے تو یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ ایسے لوگ خدا کی ماہیت

کا ایک واضح اور قطعی تصور رکھتے ہیں، اور یہ تصور بہر حال (مسلمانوں کے لیے بھی) نا قابلِ قبول ہے۔

ہم نے اپنی گفتگو کا آغاز یہاں سے کیا تھا کہ کچھ نام ایسے ہیں جو ذاتِ خداوندی کے تسمیے کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ یہ وہ نام ہیں جو ہمیں بتاتے ہیں کہ خدا کیا نہیں ہے۔ چونکہ انسانوں کو خدا کی ذات اثباتی اصطلاحات میں نہیں سمجھائی جا سکتی، اس لیے سلبی اور منفی اسما لوگوں پر ان کی اپنی محدودیت واضح کرتے ہیں۔ سلبی نام کی ایک مثال 'قدّوس' ہے، جس کا ترجمہ عام طور سے، پاک اور مقدس (Holy) کیا جاتا ہے۔ عربی زبان میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا ان تمام عیوب و نقائص سے ماورا ہے جو مخلوقات کے لیے تصور کیے جا سکتے ہیں۔ ایک اور سلبی نام ''سُبّوح'' (Glorified) ہے، یعنی وہ ذات جس کی تسبیح کی جاتی ہے۔ بالفاظِ دیگر، خدا کی پاکیزگی، بزرگی وعظمت اور ماورائیت (تنزیہ) ایسی ہے کہ وہ مخلوق کے فہم و ادراک سے بالاتر ہے۔ خدا کا ایک ذاتی نام ''سلام'' بھی ہے جس کا مطلب ہے کہ وہ ہر قسم کے عیب اور عدمِ توازن، اور ہر طرح کے جنگ وجدال سے پاک ہے۔ اسی طرح ایک سلبی اسم ''غنی'' (بے نیاز اور بے پروا) بھی ہے۔ خدا، کائنات کی کسی چیز کا محتاج نہیں ہے، وہ ان تمام احتیاجات سے ماورا ہے جن سے مخلوقات کی طبیعت اور ان کی تنگ دامانی اجاگر ہوتی ہے۔

اسمائے ذات اگر ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ ''خدا کیا نہیں ہے'' تو اسمائے صفات سے یہ علم میسر آتا ہے کہ وہ کیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ خدا کی حقیقت تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، تاہم ہمارے لیے یہ جاننا ممکن ہے کہ کس طرح کی صفات کو اس نے اپنی آیات کے ذریعے ہم پر منکشف کرنا پسند کیا ہے۔ اس بات میں کوئی تضاد نہیں ہے کہ خدا کو جاننا ممکن بھی ہے اور محال بھی۔ یہی بات کسی انسان کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلاں شخص، مثلاً ایوب، زندہ ہے اور علم، ارادہ، طاقت، بصارت اور سماعت سے بہرہ ور ہے۔ خوب! لیکن دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ یہ ساری باتیں ایوب کی انفرادیت یا اس کی حقیقت کا کتنا علم فراہم کرتی ہیں؟ کیا ان اوصاف کی فہرست دیکھ کر خود ایوب بھی مطمئن ہو جائے گا کہ ہم نے اس کے بارے میں، جیسا کہ وہ حقیقتاً ہے، تمام ضروری امور کی نشان دہی کر دی ہے؟

انسان کی ایک مثال ایوب ہے، ذرا پھر دیکھیں کہ آخر وہ کیا چیز ہے جس کی بنیاد پر نوعِ انسانی کی حقیقی اور جامع و مانع تعریف متعین کی جا سکتی ہے؟ ایک زمانے میں بشریات کے ماہرین ہمیں یہ بتایا کرتے تھے کہ انسان ایک اوزار گر حیوان ہے، لیکن یہ ایک ادھوری اور ان گھڑ تعریف ہے۔ ہم میں

سے کوئی بھی یہ کہنے کو تیار نہیں ہوگا کہ ''ٹھیک ہے! میں اوزار بنانے والا حیوان ہوں اور بس۔ اس کے علاوہ میں جو کچھ ہوں، وہ آپ کو مبارک۔ میں تو اب اوزار ہی گھڑتا رہوں گا۔ میرا خاندان، میرے دکھ اور الجھنیں، میری محبتیں اور نفرتیں سب بیکار ہیں، میرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ انھیں آپ رکھ لیں۔'' ظاہر ہے کہ ہم چاہیں بھی تو اپنی ان نامطلوب چیزوں کو اس طرح لٹا نہیں سکتے، اور اس سب کے بعد بھی ہم نہیں جانتے کہ ہم کیا ہیں۔ اگر آپ خوب توجہ سے کام لیں تو کوئی دن ایسا نہیں گذرتا کہ آپ پر خود اپنی ہستی کے نئے نئے پہلو نہ کھلتے ہوں۔

مختصر یہ کہ ہم کسی شخص کے بارے میں یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ فلاں یہ ہے یا وہ ہے، لیکن ہم کچھ بھی کہہ لیں، اس شخص کی حقیقت کو بہ تمام وکمال بیان نہیں کر سکتے۔ بالکل اسی طرح یہ کہنا کہ خدا یہ ہے یا وہ ہے، اس کی حقیقت کا پورا اظہار نہیں ہے، بلکہ یہاں تو معاملہ بالکل برعکس ہے۔ خدا لامحدود، لامتناہی اور مطلقاً حقیقی ہے اور اس کے حقیقی ہونے کی کوئی حد نہیں۔ ہم جو محض اضافی طور پر حقیقی ہیں، اس کے بارے میں تھوڑا ہی جان سکتے ہیں۔ ہم حقیقت کو اتنا ہی سمجھ سکتے ہیں جتنا کہ ہم خود حقیقی ہیں۔ یہاں یہ سوال سر اٹھاتا ہے کہ ہم کتنے حقیقی ہیں؟ توحید، اسی سوال کا جواب ہے۔

انسانی علم کی نارسائیاں سائنسی میدان میں بھی واضح ہیں۔ مسلسل نت نئے انکشافات کے باوجود، چند ہی لوگ ہوں گے جو واقعی اس خیال میں ہوں کہ کائنات تقریباً سمجھ میں آ چکی ہے۔ نسلِ انسانی ابھی زمین کی سطح اور اس کی تہوں میں موجود ان گنت مظاہر کا بھی احاطہ نہیں کر سکی۔ مثال کے طور پر ہم خود اپنے سیارے یا اپنی کہکشاں یا کائنات میں پائی جانے والی کھربوں کہکشاؤں کا واقعی علم کس طرح حاصل کر سکتے ہیں؟ سائنسی حدود میں جتنا کچھ معلوم ہو سکتا ہے، اس کے مقابلے میں اس علم کو جو انسان نے اب تک حاصل کیا ہے، نرا جہل ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور جہاں تک خدا کا تعلق ہے، ''کوئی شے اس جیسی نہیں ہے۔'' کل کائنات کا علم بھی خدا کو سمجھنے میں لازماً ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔

اجمالاً یوں سمجھ لیں کہ صفاتی نام وہ نام ہیں جو کم از کم انسانی فہم کی عملی اغراض کے لیے اتنی صراحت کر دیتے ہیں کہ خدا کیا ہے۔ وہ اوصاف جن سے ابھی ہم نے ایوب کو موسوم کیا، خدا کے صفاتی نام بھی ہیں: الحیّ (زندہ)، العلیم (علم والا)، المرید (ارادہ رکھنے والا)، القوی (طاقت و قوت والا)، السّمیع (سننے والا)، البصیر (دیکھنے والا)۔ یہاں بھی وہی بات ہے کہ خدا اور ایوب میں فرق یہ ہے کہ خدا کی صفات حقیقی ہیں، جب کہ ایوب کے اوصاف، حقیقت کی ایک مدہم سی چھوٹ

سے زیادہ نہیں ہیں۔ انسانی زندگی کوئی حقیقی زندگی نہیں ہے، کیونکہ یہ دیکھتے دیکھتے غائب ہو جاتی ہے۔ لیکن حیاتِ خداوندی ازلی وابدی ہے۔ پس، ''کوئی شے اس جیسی نہیں'' کا اصول خدا کے اسمائے صفات کے بارے میں بھی وارد ہوتا ہے۔ خدا زندہ ہے! یہ کہتے ہوئے ہمیں یہ بھی یاد رکھنا ہے کہ اس کی زندگی نہ صرف یہ کہ ہماری زندگی کی طرح نہیں ہے، بلکہ زندگی کی کسی بھی ایسی قسم سے مشابہت نہیں رکھتی جو ہمارے فہم وادراک میں آ سکتی ہو۔

اسمائے خداوندی کی ایک تیسری قسم بھی ہے جسے اسمائے افعال (Names of Acts) کہا جا سکتا ہے۔ افعال، خدا کی مخلوق یا اس کی فعالیت کے نتائج ہیں۔ دو چیزیں اسمائے افعال کی پہچان ہیں: (۱) انھیں صرف مخلوقات کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے اور (۲) یہ اپنا متضاد بھی رکھتے ہیں جو خود ایک اسمِ خداوندی ہوتا ہے، مثلاً **المُحیی** (زندگی دینے والا) اور **المُمِیت** (موت دینے والا)، **المُعِز** (عزت دینے والا) اور **المُذِل** (ذلت دینے والا)، **العَفُوّ** (معاف کرنے والا) اور **المُنتقِم** (انتقام لینے والا)۔

اسمائے صفات کے معاملے میں مخلوق سے ان کی نسبت فرض کرنا ضروری نہیں۔ خدا زندہ ہے، لیکن اس کی زندگی یہ تقاضا نہیں کرتی کہ کسی اور کو بھی زندہ ہونا چاہیے۔ خدا علیم ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے جاننے کے لیے ایک کائنات بھی ہونا چاہیے۔ (اس معنی میں تو) شاید وہ خود ہی کو جانتا ہے۔ مزید براں، کسی صفاتی نام کی ضد کو خدا کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ وہ مردہ نہیں ہے، نہ جاہل ہے۔

دوسری طرف خدا کے فعلی نام مخلوق کے متقاضی ہیں۔ خدا خود کو زندگی نہیں دے سکتا، وہ تو زندہ ہی ہے۔ وہ خود کو مار بھی نہیں سکتا، کیونکہ اس کی زندگی کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ ازلی وابدی ہے۔ چنانچہ اسم ''المُحیی'' خدا کے فعل ہی کی نسبت سے بامعنی ہو سکتا ہے اور اسی طرح یہ بھی ہے کہ اگر وہ ایک کام کر سکتا ہے تو اس کے برعکس پر بھی قادر ہے۔ اگر وہ زندگی دے سکتا ہے تو واپس بھی لے سکتا ہے۔ وہ اپنی مخلوق میں کچھ کو عزت دیتا ہے تو کچھ کو ذلت میں بھی مبتلا کر دیتا ہے۔ بعض بندوں کے گناہ معاف کر دیتا ہے، مگر بعض سے نافرمانی کا بدلہ لیتا ہے۔

اس گفتگو کے اختتام پر، کسی ممکنہ غلط فہمی سے بچنے کے لیے، ہمیں پھر کہنے دیجیے کہ اسمائے خداوندی کی یہ درجہ بندی، ان پر غور وتدبر کرنے کے بہت سے امکانی راستوں میں سے ایک راستہ ہے۔ اس بات میں کوئی چیز آخری اور حتمی نہیں ہے، اور ہم نے تو اس طرح صرف اس طرزِ فکر کی ایک مثال پیش کی ہے جو مسلمان علما اس امرِ واقعہ پر غور کرتے وقت اختیار کرتے ہیں کہ اللہ قرآن میں متعدد ناموں کو اپنے آپ سے منسوب کرتا ہے۔

رحمت اور غضب

اسمائے افعال وہ اسما ہیں جن کی ضد بھی خدا کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ بہت سے لوگ یہ سن کر کہ خدا کو متضاد ناموں سے پکارا جاتا ہے، ایک سامنے کا سوال کرتے ہیں: ''ایک ہی خدا کس طرح متضاد صفات کا حامل ہوسکتا ہے؟'' وہ رحیم اور قہار دونوں کیسے ہوسکتا ہے؟ اس کا سادہ ترین جواب وہی ہے جو ہم نے ابھی بیان کیا۔ خدا تو بلاشبہ ایک ہے، لیکن اس کا واسطہ بے شمار مخلوقات سے ہے۔ تمام خلق کا انتظام چلانے اور اسے اپنے حکم کے تحت رکھنے والے مالک و حاکم کی حیثیت سے وہ ہر مخلوق کے ساتھ کئی طرح کا تعلق رکھتا ہے۔ مزید برآں وہ اپنی جس مخلوق کے ساتھ تعلق کے جو رنگ رکھتا ہے، وہ انداز اور شیوۂ عمل وقت گذرنے پر تبدیل بھی ہوتا رہتا ہے۔

خدا زندگی بھی دیتا ہے اور موت بھی، تاہم ایسا نہیں ہے کہ ایک ہی شخص کو جس لمحے میں زندگی عطا کرے، عین اسی لمحے واپس لے لے۔ دوسرے لفظوں میں، وہ کسی کو زندگی بخشتا ہے، اس زندگی کو ایک مدت تک باقی رکھتا ہے، اور پھر واپس لے لیتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ آنِ واحد میں کسی کو زندگی دے رہا ہو اور کسی کو موت۔

ہم جیسے جیسے غور کرتے جاتے ہیں، اپنی مخلوق کے ساتھ خدا کی نسبتیں زیادہ گہری، لطیف اور دقیق ہوتی جاتی ہیں۔ ہر پیدایش، ہر حیات بخشی ایک موت، ایک فنا کاری بھی ہے۔ ایک بچے کا دنیا میں آنا، عین اسی وقت اس کا رحمِ مادر سے کوچ کر جانا بھی ہے۔ ایک آدمی اس دنیا سے گذر جاتا ہے، لیکن دوسرے جہان میں آنکھ کھولتا ہے۔ بہرحال زندگی دینا اور موت کے گھاٹ اُتارنا، کچھ اتنی مختلف چیزیں بھی نہیں ہیں۔ تمام متضاد صفات آپس میں بڑی گہری نسبتیں رکھتی ہیں جو ہمیں یہ ثابت کرنے کے قابل بناتی ہیں کہ ان کا باہمی تضاد مطلق اور اٹل نہیں ہے، بلکہ اس تضاد کو کمال کے دو پہلو کہنا بہتر ہوگا۔ جونہی ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ دو متضاد نام فی الواقع ایک ہی سکّے کے دو رخ ہیں، ہم توحید کے قریب تر آ جاتے ہیں، یا (بالفاظ دیگر) یہ دکھانے کے لائق ہوجاتے ہیں کہ کثرت کی تہ میں بھی وحدت ہی پوشیدہ ہے۔

چونکہ بہت سے اسمائے خداوندی میں سے ایسے جوڑے بنائے جا سکتے ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں، لہٰذا انھیں اکثر دو طبقوں یا دستوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا دستہ پُرکشش اور مشفقانہ صفات پر دلالت کرتا ہے جو یہ احساس پیدا کرتی ہیں کہ ان کے حامل کا قرب خوشگوار ہوگا۔ انھیں مادرانہ

اوصاف کہا جا سکتا ہے، کیونکہ ان میں محبت کی آنچ اور آغوش میں سمیٹ لینے کی کیفیت ہے۔ **الرحیم** (رحم کرنے والا)، **الرحمٰن** (نہایت مہربان)، **الودود** (محبت کرنے والا)، **الرؤف** (شفیق)، **العفو** (درگذر کرنے والا) اور **الجمیل** (خوبصورت) ایسے اسما اس مجموعۂ صفات میں شامل ہیں۔[۱۲]

اسما کا دوسرا مجموعہ اتنا دل کھینچ لینے والا نہیں ہے، کیونکہ ان کے بارے میں سوچ کر ہیبت اور خوف طاری ہوتا ہے۔ اس مجموعے میں **القہار** (سب کو مغلوب رکھنے والا)، **المنتقم** (بدلہ لینے والا)، **الجبّار** (زبردست)، **الجلیل** (عظمت وجلال والا)، **العدل** (سراسر انصاف)، **الضّار** (ضرر پہنچانے والا) اور **المُمیت** (موت دینے والا) ایسے نام آتے ہیں۔

توحید کے بارے میں مسلم فکر کے لیے اسمائے خداوندی کی ان دو اقسام کی اتنی اہمیت ہے کہ اس کا پورا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ان اسما سے دو مختلف تناظر تشکیل پاتے ہیں، جن کی وجہ سے دنیا اور اہلِ دنیا سے خدا کے تعلق پر مسلمانوں کے دو موقف ہیں اور اس موضوع پر ان کی گفتگو انھیں دونوں کے درمیان گردش کرتی رہتی ہے۔ ایک نقطۂ نظر خدا کو ورا الورا اور قہار و جبار دیکھتا ہے اور دوسرا قریب اور مہربان۔ (ان دونوں نقطہ ہائے نظر کی بیک وقت موجودگی پر) ممکن ہے کسی شخص کا پہلا ردّعمل یہ ہو کہ آپ ایک بات طے کیوں نہیں کر لیتے؟

اس بارے میں آپ جتنا سوچیں گے، یہ بات اتنی ہی واضح ہوتی جائے گی کہ اہم ترین سوالوں کے جوابات محض ''ہاں'' یا ''نہیں'' میں نہیں دیے جا سکتے، اور اس معاملے میں ہم جس سوال سے الجھے ہوئے ہیں، وہ تمام سوالوں سے زیادہ نازک اور اہم ہے۔ اس کا تعلق خود حقیقت کی ماہیت سے ہے۔ روزمرہ کے معاملات کے بارے میں اگر بالعموم ''ہاں'' یا ''نہیں'' میں جواب دے دیا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم ''الحق'' کے بارے میں بھی ہمیشہ اسی صراحت سے بات کرنے کے قابل ہوں گے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ ہر شے اتنی سادہ اور سیدھی ہوا کرتی، بلا کسی الجھاؤ کے، لیکن زندگی اور معاملاتِ ہستی اتنے سیدھے سادے ہوتے نہیں۔ جو لوگ ان کے بارے میں یہ گمان رکھتے ہیں، وہ اکثر اپنے گردوپیش کی دنیا کے بڑے حصے سے کٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ بنیاد پرستی کی بہت سی شکلیں اسی سمت میں جاتی نظر آتی ہیں، لیکن جہاں تک اسلام کی فکری روایت کا تعلق ہے، یہ رویہ اس کے لیے ایک اجنبی رویہ ہے، کیونکہ اسلامی معقولات نے ان معاملات کی نزاکت اور نقطۂ ہائے نظر کے تنوع کو ہمیشہ ملحوظ رکھا ہے۔

قرب و بعد

توحید پر نظر کرنے کے دو بنیادی زاویے ہیں۔ پہلے نقطۂ نظر سے توحید کا مفہوم یہ ہے کہ ہر چیز جو حقیقی ہے اور اچھی ہے، وہ اللہ ہی کے لیے ہے۔ ''الحق کے سوا اور کچھ حقیقی نہیں ہے۔'' **لا الہ الا اللّٰہ** ''تمام تعریف اللہ ہی کے لیے ہے۔'' اس کے سوا ہر شے چونکہ ''ما سوی اللہ'' (غیر از خدا) ہے، لہٰذا غیر حقیقی ہے اور اسی سبب سے اس میں اپنی کوئی ذاتی خوبی نہیں۔

دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھیے تو توحید کا مطلب یہ ہے کہ ہم میں اور دنیا میں خوبی کا جو شائبہ اور حقیقت کی جو رمق ہے، وہ صرف خدا کی طرف سے ہے کہ وہی صحیح معنی میں حقیقی ہے۔ پہلے نقطۂ نظر کے مطابق اللہ تعالیٰ حقیقی ہے اور دنیا بے حقیقت۔ دوسرے اعتبار سے دیکھیے تو دنیا کسی حد تک اللہ کی حقیقت کا پرتو دکھائی دے گی۔

یہ دونوں نقطہ ہائے نظر یا دونوں تناظر اسمائے الٰہیہ ہی سے متعلق ہیں۔ اگر ہم جلالی ناموں پر غور کریں تو نظر آئے گا کہ ان میں اللہ کے حقیقی ہونے کا اثبات اور دنیا کے بے حقیقت ہونے کا اعلان ہے۔ اللہ تعالیٰ **الجلیل، المجید، العظیم، الکبیر** ہے، جب کہ دنیا ناچیز و دوں نہاد اور بے حیثیت ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ دائم و حقیقی ہے اور اس کی حقیقت کے مقابل دنیا محض ایک سایۂ گریزاں، ایک مٹتی ہوئی پرچھائیں ہو کر رہ جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ وہ بادشاہ ہے جس کی قدرت ہر شے کو گھیرے ہوئے ہے۔ حکمران بس وہی ایک ہے، مطلق و یکتا۔ وہ دنیاؤں سے غنی اور بے نیاز ہے کہ اسے کائنات کی کسی چیز کی احتیاج نہیں۔ کائنات ہر ہر بات کے لیے اللہ کی محتاج ہے کہ وہی اس دنیا کے لیے سامانِ ہستی فراہم کرنے والا، اس کے وجود کا منبع و مأخذ ہے۔

اسم '**المَلِك**' (بادشاہ) سے بات میں آج وہ زور پیدا نہیں ہوتا جو دورِ جدید سے پہلے تک اس لفظ سے خاص تھا، جب دنیا میں بادشاہ ہوا کرتے تھے۔ آئینی بادشاہ کو بادشاہ کہنا مشکل ہے۔ صدر اور مطلق العنان ڈکٹیٹر بھی بادشاہ سے الگ چیز ہیں۔ قدیم تناظر میں بادشاہ اس دنیا کی حتمی اور مطلق صاحبِ اختیار و اقتدار ہستی ہوتا تھا۔ اسلام میں یہ زاویۂ نگاہ موجود ہے اور اس بات میں مضمر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بادشاہ (**المَلِك**) کہا گیا ہے۔ بادشاہ کا فرمان حرفِ آخر ہوتا تھا۔ اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ جلاد تیغہ لیے بادشاہ کے پہلو میں کھڑا رہتا اور رعایا میں سے جس کی طرف بادشاہ انگلی کا اشارہ کر دیتا،

اس کا سر وہیں قلم کر دیا جاتا۔ بسا اوقات بادشاہ اپنی رعایا سے پردے میں رہتا تھا کہ اس کے قریبی لوگوں کے سوا اس کے چہرے پر نگاہ ڈالنے کا حق کسی کو نہیں ہوتا تھا۔ اجازت کے بغیر یا اتفاقاً اس کے چہرے پر نظر پڑ جاتی تو یہ دیکھنے والے کے لیے موت کا پروانہ ثابت ہوتا۔

خلاصہ یہ کہ بساطِ ہستی پر اللہ تعالیٰ کی فرمانروائی کی مضبوط علامتوں میں سے بادشاہوں کی تمثیل بھی ہے۔ عوام سے دور ہونا بادشاہ کا خاصہ تھا کہ اس کی ہیبت اور خوف لوگوں پر قائم رہے۔ ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ اللہ ایک زبردست، طاقتور، بادشاہِ عالَم ہے اور العلی، العظیم، المتعالیٰ، القدوس، العزیز جیسے اسما اسی کو زیبا ہیں کہ وہ سب سے ورا اور منزّہ ہے۔ مخلوق سے اپنا فاصلہ اور امتیاز برقرار رکھنے کے لیے بادشاہ اکثر قہر وغضب کا ہولناک مظاہرہ اپنی قدرت اور قوت کے ذریعے کیا کرتے ہیں۔ اپنے حکم سے سرتابی کرنے والوں کے خلاف اپنے لشکر روانہ کرتے ہیں اور بادشاہ کی دی ہوئی سزا یقیناً بہت ہولناک ہوتی ہے۔ جب لوگ اللہ کے بارے میں ان صفاتِ جلال وغضب کو مدِّنظر رکھ کر سوچتے ہیں تو قدرتی ردِّعمل دہلنے، دبکنے کا ہوتا ہے۔ اگر قرآن میں اللہ کے بارے میں بس اتنا ہی ہوتا تو اسلام ایک خوفناک قسم کا مذہب بن کر رہ جاتا، لیکن اللہ کے ناموں میں رحمت و جمال کے اسما بھی ہیں۔ اللہ کو اپنی مخلوقات میں سے ایک ایک کا خیال ہے، جیسے ایک ماں کے بہت سے بچے ہوں اور وہ ان میں سے ہر ایک کو سب سے اعلیٰ اور بہترین چیز فراہم کرنا چاہے۔

ایک روز رسولِ خداؐ چند اصحاب کے ہمراہ سفر کر رہے تھے۔ بدوؤں کا ایک پڑاؤ دیکھ کر سب لوگ رکے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ خیموں والے بدو مسلمان ہیں۔ آپؐ پڑاؤ میں استراحت کے لیے تشریف فرما ہوئے۔ زمیں میں گڑے ایک تنور میں ایک عورت روٹی لگا رہی تھی۔ بچہ پہلو میں لیے ہوئے تھی۔ تنور کی آگ کو ہوا دینے لگی تو اچانک شعلے بھڑک اٹھے۔ یہ دیکھ کر عورت پھرتی سے بچے کو اچک کر آگ کی لپیٹ سے بچانے کے لیے پیچھے ہٹی۔

چند منٹ بعد وہی عورت آنحضرتؐ کے پاس آئی اور پوچھنے لگی: ’’کیا آپؐ اللہ کے رسول ہیں؟‘‘ آپؐ نے فرمایا کہ ہاں میں اللہ کا رسول ہوں۔ وہ عورت بولی: ’’کیا یہ سچ ہے کہ اللہ ارحم الراحمین ہے؟ (سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے)۔ آپؐ نے فرمایا: ’’تم نے ٹھیک کہا‘‘۔ اس عورت نے کہا: ’’کوئی عورت اپنے بچے کو آگ میں کیوں کر پھینک سکتی ہے!‘‘

اللہ کے رسولؐ نے آبدیدہ ہو کر سر جھکا لیا۔ آپؐ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ چند لمحے بعد آپؐ نے سر اُٹھا کر اس عورت کو مخاطب کیا اور فرمایا: ’’عذابِ خداوندی صرف اس شخص کے لیے ہے جو

خدا کا باغی اور نافرمان ہو، اس کے خلاف سرکشی کرے اور 'لا الٰہ الا اللّٰہ' کہنے سے انکار کرے۔"[۱۳۹]

دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ رسولِ خداؐ کا فرمان ہے کہ اللہ کا عذاب صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو ''توحید'' کے منکر ہوں اور اللہ کی رحمت سے خود کو دور کر لیں، اس ضد پر اڑ جائیں۔ قرآن مجید میں آیا ہے:

لاتقنطوا من رحمة اللّٰه، اِنَّ اللّٰه یغفرالذنوب جمیعا (۳۹:۳۵)	اللہ کی رحمت سے آس توڑ نہ لینا۔ بے شک وہ سب گناہ بخش دیتا ہے۔

یہ قرآن کے پیغام کا دوسرا رخ ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ''ایک سخت گیر بادشاہ'' ہے تو ساتھ ہی گویا ''مادرِ مہربان'' بھی ہے۔ رحمت اور نرمی کے سبھی نام مخلوق سے اسی تعلق کی طرف اشارہ کرتے ہیں: **الودود، الغفور، الرحمٰن، التواب، العفو، المحیی**۔ یہ وہ صفات ہیں جو ہمیں یہ بتاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے قریب ہے، کبھی ان کو تنہا بے سہارا نہیں چھوڑتا:

وَنَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡدِ (۵۰:۱۶)	اور ہم اس سے اس کی دھڑکتی رگ سے زیادہ نزدیک ہیں۔
وَهُوَ مَعَكُمۡ اَیۡنَ مَا كُنۡتُمۡ (۵۷:٤)	اور وہ تمھارے ساتھ ہے، جہاں کہیں تم ہو۔
فَاَیۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡهُ اللّٰهِ (۲:۱۵۵)	سو جس طرف تم رخ کرو گے وہاں ہی اللہ کو پاؤ گے۔

خدا اگر ایسا ہو تو انسان فطری طور پر کیا کرے گا، خود کو اس کے قریب محسوس کرے گا، اس سے محبت کرے گا۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دو رخ ہیں! ایک رحمت کا رخ اور دوسرا غضب کا پہلو، ایک روئے محبت اور دوسرا روئے جلال، ایک قریب چہرہ اور دوسرا بعید۔ لوگوں کو روئے قہر و غضب سے خوف کھانا چاہیے اور روئے مہربان سے محبت کرنا چاہیے، لیکن ان احساسات کا اظہار کیوں کر ہو؟ عام طور پر یوں ہوتا ہے کہ جس چیز سے لوگ خوفزدہ ہوں، اس سے دور بھاگتے ہیں، لیکن خدا سے چھپنا روپوش ہونا ممکن ہی کب ہے کہ جدھر منہ کیجیے، ادھر تو ہی تو ہے، اس لیے قرآن کا حکم ہے: ''**فَفِرُّوۡٓا اِلَی اللّٰهِ**'' (۵۱:۵۰) (سو بھاگو اللہ کی طرف)۔ حضورؐ دعا فرمایا کرتے تھے:[۱۴۰] میں تیرے غضب سے تیری رحمت کی پناہ لیتا ہوں، تیرے عذاب سے تیری مغفرت کی پناہ لیتا ہوں اور تجھ سے تیری ہی پناہ میں آتا ہوں۔'' خدا سے ڈر کے آپ اس سے دور نہیں بھاگتے، اس کی طرف بھاگتے ہیں۔ اور جب آپ اللہ

سے پیار کرتے ہیں تو بھی اسی کی طرف دوڑتے ہیں۔ توحید میں یہی بات مضمر ہے۔ بات کسی جانب سے بھی شروع کیجیے، لوٹ کر اللہ ہی کی طرف آنا پڑتا ہے۔

دوری اور نزدیکی کے نقطہ ہائے نظر پر وحدت و کثرت یا یکتائی اور تعدد کے باہمی تعلق کے حوالے سے غور کرنا بھی مفید ہوگا۔ توحید اس بات کا اثبات ہے کہ اللہ ایک ہے۔ اب چونکہ اللہ تعالیٰ اس کائنات سے یکسر ورا ہے، لہٰذا یہ کائنات اس کی وحدت میں کسی طرح شریک نہیں ہو سکتی۔ سو نتیجہ یہ نکلا کہ کائنات کو لاتعداد حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں وحدت ہے، جب کہ دنیا عالمِ کثرت ہے۔ موخر الذکر نقطۂ نظر سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اللہ کی وحدت کائنات میں منعکس ہو رہی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ کائنات ایک کل ہے اور اس کے تمام اجزا ہم آہنگی، توازن اور اعتدال میں باہم شریک ہیں۔

تنزیہ اور تشبیہ

علمِ الٰہیات یا علمِ کلام کی اصطلاحی زبان کی جو نشو و نما ساتویں / تیرہویں صدی کے بعد ہوئی اس میں دو اصطلاحات بہت کثرت سے استعمال ہوئی ہیں۔ ان سے مقصود یہ ہے کہ اللہ کے قرب و رحمت اور بُعد و غضب کے تصور میں جو فرق ہے، اسے ظاہر کیا جا سکے۔ یہ اصطلاحات ہیں تنزیہ اور تشبیہ۔ تنزیہ کا مطلب ہے اللہ کے بے ہمتا و ماورا ہونے کا اعلان اور تشبیہ کا مفہوم ہے اللہ کی اپنی مخلوق سے مشابہت یا مخلوق کا اللہ کی مثال پر ہونے کا اثبات۔

تنزیہ کا لفظی مطلب ہے: ''کسی چیز کو کسی دوسری چیز سے بری، آزاد اور پاک قرار دینا۔'' یہ اعلان ہے اس بات کا کہ اللہ تعالیٰ مخلوقات میں پائے جانے والے تمام عیبوں اور کمی، کوتاہی سے پاک اور آزاد ہے۔ تنزیہ کے تناظر میں دیکھیے تو اللہ تعالیٰ اتنا مقدس اور پاک ہے کہ خلق کی ہوئی کسی چیز سے اس کو تشبیہ نہیں دی جا سکتی، تصورات سے بھی نہیں، کیونکہ ہمارے تمام خیالات اور تصورات بھی تو ذہنی مخلوقات ہی ہیں۔ قرآن کی جو آیت تنزیہ کو سب سے زیادہ وضاحت سے بیان کرتی ہے، یوں ہے "لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ" (۴۲:۱۱) (کوئی شے اس جیسی نہیں)

اسمائے الٰہیہ میں سے جن ناموں کو تنزیہ کے نام کہا جاتا ہے، ان کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ یہ ذاتِ الٰہی کے اسما ہیں، مثلاً القدوس، الغنی، المتعالی، السبوح، لیکن جلالی ناموں اور اسمائے غضب کو بھی تنزیہی نام کہا جا سکتا ہے، کیونکہ ان کا زور اس بات پر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے مختلف اور الگ ہے، یعنی یہ کہ وہ مخلوقات کے پست اور ادنیٰ معاملات سے یکسر ماورا ہے۔

''تشبیہ'' کا مطلب ہے کہ ''کسی چیز کو دوسری کسی شے سے مشابہ قرار دیا جائے''۔ یہ اس بات کا اعلان ہوا کہ خدا کی کوئی نہ کوئی مشابہت اپنی مخلوق سے ضرور ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مخلوق کا خدا سے تعلق کیوں کر پیدا ہوتا! کائنات میں خدا کی نشانیاں اور صحیفۂ خداوندی میں اس کی صفات بیان ہوئی ہیں، مثلاً حیات، علم، ارادہ، قدرت، رحمت، کرم، رزاقی۔ یہ سب خدائی صفات ہیں، مگر یہی صفات اللہ کی مخلوق میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اللہ کے تمام نام ایک طرح کی ''تشبیہ'' کا تصور پیدا کرتے ہیں، کیونکہ ان سے یہ سوچنے کی گنجایش نکلتی ہے کہ خدا ایسا ہوگا یا ویسا ہوگا۔ اگرچہ ہمیں معلوم ہے کہ ''اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے''، تاہم اللہ کے کسی نام کو سوچتے ہی ذہن میں اللہ کے بارے میں ایک تصور قائم ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جب ہم قرآن میں پڑھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ الرحمٰن ہے تو رحمت کا جو مفہوم ہمارے اندر ہے، اسے لے کر ہم اللہ کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں۔ یہی نہیں، بلکہ جب ہم اللہ کے کسی ذاتی نام، مثلاً الغنی کو سامنے رکھتے ہیں تو اس نام کو بھی ہم غنی اور بے پروا ہونے کے اپنے تصور ہی کے حوالے سے سمجھتے ہیں۔

یوں تو اسمائے الٰہیہ میں سے ہر اسم ایک نوع کی تشبیہ کی طرف اشارہ کرتا ہے، تاہم اسمائے جمال اور اسمائے رحمت کا زور ''تنزیہ'' کی نسبت ''تشبیہ'' پر زیادہ ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اسما جو ہمیں اللہ کے بارے میں یہ بتاتے ہیں کہ وہ مخلوق سے قریب ہے، اس پر مہربان ہے اور اس کی بھلائی چاہتا ہے، انھیں تشبیہی ناموں کا یا اسمائے تشبیہ کا عنوان دیا جا سکتا ہے۔ خدا اگر رحیم و ودود ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ہم سے دور نہیں ہے، لاتعلق نہیں ہے۔ اسمائے جمال و رحمت ایک ایسے خدا کا بیان ہیں جسے لوگ سمجھ سکتے ہیں اور جس سے محبت کر سکتے ہیں۔ ان اسما سے یہ پتا چلتا ہے کہ ایک شفیق اور مہربان ماں کی طرح خدا بھی اپنی مخلوق کے قریب ہوتا ہے اور اس کی ہر ضرورت اور احتیاج پر نظر رکھتا ہے۔ اگر کوئی شخص مجھ پر مہربان، میرا بھلا چاہنے والا، محبت دینے والا ہو تو میرا فطری جواب محبت اور بھلائی ہی کا ہوگا۔

''تنزیہ'' کا تناظر یہ ہے کہ وحدتِ خداوندی کا اثبات اس اعلان سے کیا جائے کہ اللہ ایک ہے اور صرف وہی اصل و حقیقی ہے۔ اس کے سوا ہر شے غیر حقیقی ہے، بے اہمیت ہے اور اعتنا کے لائق نہیں۔ خدا کی یکتا و بے ہمتا حقیقت کسی بھی غیر حقیقی پن سے کوئی نسبت نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس تشبیہ کے تناظر میں دیکھیے تو یہ معلوم ہوگا کہ اللہ کی وحدت ایسی جامع ہے کہ اس کی حقیقتِ واحدہ تمام مخلوقات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ دنیا جو غیر حقیقی اور سراب و فریبِ نظر لگتی ہے، وہ درحقیقت اس کے

سوا کیا ہے کہ الحق اور الاحد نے اس میں اپنی نشانیاں اور آثار ظاہر کیے ہیں۔ دنیا و مافیہا کو الگ کرنے کی بجائے اللہ کی وحدت ہر شے کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔

''تنزیہ'' اور ''تشبیہ'' کو اکثر ''**الظاھر**'' (آشکار، ہر شے سے ظاہر) اور ''**الباطن**'' (چھپا ہوا، ہر شے سے مخفی) کے دو اسمائے الٰہی سے متعلق کہا جاتا ہے۔ الحق جس حد تک ''**الباطن**'' ہے، ظاہر و آشکار تمام غیر حقیقی ہے اور وحدت صرف الحق ہی کا حصہ ہوگی، لیکن دوسری جانب جس حد تک اللہ تعالیٰ **الظاھر** ہے اسی قدر عالَم ظاہر بھی الحق ہے۔ پس کائنات اگر حقیقی ہے تو اللہ کی حقیقت کے وسیلے سے اور اگر واحد ہے تو اللہ کی وحدت کے سہارے۔

اللہ کی تنزیہ و تشبیہ ہر دو کو نگاہ میں رکھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ اگر ماورا ہے تو ساتھ ہی **القریب** بھی ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ **الجمیل** ہے اور اپنے جمال کی وجہ سے دلوں میں محبت جگا دیتا ہے، لیکن اس کا جمال مخلوقات کے حسن کی طرح نہیں ہے۔ لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡ۔ اس کے قرب میں بھی دوری ہے اور اپنی تشبیہ میں بھی وہ تنزیہ کی شان رکھتا ہے۔

تنزیہ کو سمجھنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ایک نہایت وسیع دائرے کا تصور کیجیے (نقش-۱)۔ خدا اس دائرے کے مرکز میں ہے۔ دائرے کا وہ مرکزی بلا جہت نقطہ جس سے دائرے کا ظہور ہوتا ہے۔ وہ دنیا جو ہمارے تجربے میں آتی ہے، اس دائرے کے محیط پر واقع ہے، مرکز سے بے انتہا دور۔ دنیائیں بہت سی ہیں۔ ان کا تصور یوں کیجیے کہ اس ایک مرکز کے گرد دائرہ در دائرہ ہم مرکز دائروں کا ایک سلسلہ پھیلتا چلا گیا ہے۔ ان میں سے کچھ خدا سے قریب ہیں، دوسرے ذرا دور ہیں۔ ان سب کا مرکز ایک ہے اور یہ سبھی مرکز سے کٹے ہوئے بھی ہیں کہ اللہ سب سے منزّہ و ماورا ہے۔ صرف مرکزی نقطہ ایسا ہے جو بلا جہت و بلا سمت ہے، ''لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡ'' ساتھ ہی ساتھ ہر ہم مرکز دائرہ دوسرے دائروں سے مشابہ ہے۔ مخلوقات اپنے خواص و صفات میں ایک دوسرے کی شریک ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ ان صفات میں سے کسی میں شریک نہیں ہے۔

1-7--2007\Suhail umer\Vision of Islam New\Figure 1.jpg not found.

نقش ۱: تنزیہ

''تشبیہ'' کی تصویر کشی کرنا ہو تو اسی نقطۂ بے جہت کو ایک اور انداز میں دیکھنا ہوگا۔ اب کی مرتبہ یوں تصور کیجیے کہ اس مرکز سے لاتعداد خط نکل کر گُرے یا دائرے کے محیط کی طرف باہر جا رہے ہیں۔ (نقش-۲) کائنات کی ہر مخلوق ان نصف قطری لکیروں میں سے ایک خط پر واقع ہے اور مرکز سے براہ راست جڑی ہوئی ہے؟ اسے اپنی حقیقت اسی مرکزی نقطے سے حاصل ہوتی ہے۔ نصف قطر کے ان خطوط، مرکز سے پھوٹنے والی ان شعاعوں کا مطلب ہے اللہ کا تعلق اپنی مخلوق سے محبت، رحمت، کرم، مہربانی اور درگذر کا ہے۔

1-7--2007\Suhail umer\Vision of Islam New\Figure 2.jpg not found.

نقش۲: تشبیہ

یاد رہے کہ ''تنزیہ'' اور ''تشبیہ'' دونوں ہی حقیقت کی مکمل تصویر پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ ادھورے نقوش ہیں۔ کائنات کو سمجھنا ہو تو دونوں تناظر بیک وقت نگاہ میں رکھیے (نقش-۳) تب ہمیں سجھائی دے گا کہ ہر شے بیک آن اللہ کے قریب بھی ہے اور اس سے دور بھی، اللہ کی شبیہ بھی ہے اور تشبیہ سے بری بھی۔ ہر شے کو بیک وقت رحمت وغضب، جلال و جمال، حیات آفرینی اور موت، انعام وعطا اور قبض وسلب، حقیقت وعدمِ حقیقت ہر دو کا سامنا رہتا ہے۔ یہ ہے ''توحید۔''

1-7--2007\Suhail umer\Vision of Islam New\Figure 3.jpg not found.

نقش۳: توحید

تشبیہ وتنزیہ کے یا خدا سے قرب و بعد کے یہ دو تناظر، یہ دو زاویہ ہائے نظر آپ کو اسلامی کتب میں اور مسلمانوں کی روزمرہ زندگی میں ہر جگہ ملتے ہیں۔ ایک سادہ سی مثال لیجیے: قرآن کی ترکیب ''الحمدللہ'' کا ہم نے پہلے ذکر کیا ہے۔ مسلمان یہ کلمات ہر طرح کے مواقع اور مختلف سیاق وسباق میں

استعمال کرتے ہیں کہ اس سے اللہ کے لیے شکر کا اظہار ہوتا ہے۔ اچھی صورتِ حال کا سامنا ہو تو لوگ الحمدللہ کہتے ہیں، کچھ کھائیں پییں تو الحمدللہ کہتے ہیں، کوئی چیز اچھی لگے تو الحمدللہ کہتے ہیں۔ کوئی شخص اگر عام لوگوں سے قدرے زیادہ سنتِ رسولؐ کا پابند ہوا تو وہ ہر بات پر اللہ کا شکر ادا کرے گا، کیا اچھی اور کیا بری، کیا دکھ اور کیا سکھ۔ وہ اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے جو کچھ بھی آئے، اس کو احساسِ تشکر کے ساتھ قبول کرنا چاہیے۔ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا: ''**الحمدللّٰہ علی کل حال**'' (تعریف اللہ ہی کے لیے ہے ہر حال میں)۔[۱۵]

حمد وتعریف کے یہ کلمات تمام نعمتوں کو لوٹا کر اللہ سے وابستہ کر دیتے ہیں، کائنات میں اور نفسِ انسانی میں جو نشانیاں ہیں یہ انھیں لے کر ان کی نسبت ان کے ربّانی ماٰخذ ومنبع سے قائم کر دیتے ہیں۔ یوں تناظرِ تشبیہ کا اثبات ہوتا ہے، اللہ کا قریب ہونا اور ہر عمل میں فعلِ خداوندی کی کارفرمائی، انسانوں کے لیے اللہ کی شفقت، خیرخواہی اور رحمت۔

''سبحان اللہ'' کے کلماتِ قرآنی بھی عموماً استعمال کیے جاتے ہیں۔ ''الحمدللہ'' کے برعکس ان کلمات کا زور ''تنزیہ'' پر ہے۔ یہ الفاظ ایسے موقعوں پر ادا کیے جاتے ہیں جب اللہ تعالیٰ یا اس کے کسی کام کے بارے میں کوئی وسوسہ ذہن میں گذر کرے یا کہیں اگر اس بات کا عندیہ پایا جائے کہ اللہ کے ہاں بھی انسانوں کی طرح کے محرکاتِ عمل پائے جاتے ہیں۔ قرآن میں اکثر یہ ترکیب اسی مفہوم میں برتی گئی ہے، مثلاً جب کبھی اسلام سے پہلے کی اقوام کی مختلف آرا کی تردید کا ذکر آیا۔ مثال کے طور پر دیکھیے:

وَجَعَلُوۡا بَيۡنَهٗ وَبَيۡنَ الۡجِنَّةِ نَسَبًا ؕ سُبۡحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوۡنَ (۳۷:۱۵۹)	اور انھوں نے خدا اور جنوں کے درمیان بھی ناتا جوڑ رکھا ہے۔ اللہ پاک ہے ان باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔

یہ دو تراکیبِ قرآنی ایسی ہیں جن کو مسلمان روزمرہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور اکثر ان کے معانی سے بےخبری میں غور کیے بغیر عادتاً بولتے ہیں۔ یومیہ زندگی میں یہ تشبیہ اور تنزیہ کا اظہار ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ دونوں ہی تراکیب ضروری ہیں۔ انسان کی اور اس کی زندگی کی حیثیت ہی ایسی ہے کہ اس کے لیے اللہ حاضر بھی ہے اور غائب بھی۔

خلاصہ یہ کہ ''تشبیہ'' و''تنزیہ'' توحید کے قطبین سے عبارت ہیں۔ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے یہ دونوں تناظر ہر اس گفتگو میں مدِنظر رکھنے ضروری ہیں جو کائنات میں انسان کی حیثیت اور منصب، نبوّت کی ماہیت اور معاد جیسے بنیادی موضوعات کے مباحث سے متعلق ہو۔

رحمت، غضب سے بڑھی ہوئی ہے

توحید کا تناظر اللہ کی وحدانیت پر زور دیتا ہے کہ اللہ ہی ایک سچی حقیقت ہے۔ اس کے مطابق کائنات کی ہر شے اللہ سے متعلق ہے۔ حقیقت سے کوئی ناتا نہ ہو تو اشیا معرضِ ہستی میں کیوں کر آسکیں گی۔ اس نقطۂ نظر کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ ہر شے سے لا انتہا دور اور ماورا ہے (تنزیہ)، لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ہر شے میں حاضر و موجود ہے (تشبیہ)۔

ہم نے عرض کیا تھا کہ اسمائے جلال و غضب کا تعلق ''تنزیہ'' سے زیادہ ہے اور تشبیہ سے کم، اس لیے کہ اللہ کے جلالی نام اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اللہ دنیا سے یکسر الگ اور کلیتاً ماورا ہے، بڑی قدرت والا ہے، عظمت و کبریائی کا حامل ہے، بزرگ و برتر ہے۔ **القہار، الجبار، القوی، المضل، الخافض، المانع، المقسط، المنتقم** اور **ذو عقابِ الیم** جیسے اسما ایک ایسے بادشاہِ عالم کی خبر دیتے ہیں جو اپنے بندوں سے دور ہے اور اپنی قلمرو میں جو چاہتا ہے کرتا ہے، اسے اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ میں یا آپ کیا سوچتے ہیں۔

اسی طرح اسمائے جمال و رحمت ''تنزیہ'' کی نسبت ''تشبیہ'' سے زیادہ قریبی تعلق رکھتے ہیں کہ ان میں ایک ایسی ہستی کی خبر پنہاں ہے جو روزمرہ زندگی کی معمولی سے معمولی تفصیلات تک کی خبر رکھتی ہے۔ اگر خدا ''**اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْد**'' (۵۰:۱۶) (شہ رگ سے بھی قریب تر) نہ ہوتا تو یہ کیوں کہتا "**اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ**" (۴۰:۶۰) (مجھے پکارو کہ میں پہنچوں تمھاری پکار پر)۔

اگر خدا کو ہم قریب بھی سمجھیں اور دور بھی، شفیق و مہربان بھی اور قہار و جبار بھی، بے نیاز بھی اور بندوں کا خیال رکھنے والا بھی تو ہوگا یہ کہ جلد ہی اللہ کے بارے میں ورطۂ حیرت میں پڑ جائیں گے۔ اس کی رحمت کی امید کریں یا اس کے غضب سے خوف کھائیں؟ جیسا کہ قبل ازیں ذکر ہوا، روایتی جواب یہ ہے کہ انسان کو بیم و رجا، خوف اور امید ہر دو سے بہرہ مند ہونا چاہیے۔ خوف اگر نہ ہو تو لوگ باگ دلیر ہو کر من مانی کرنے لگیں گے اور نتائج سے بے پروا ہو جائیں گے۔ امید ٹوٹ جائے تو انسان مرجھا کر موت کا شکار ہو جائے گا۔

خوف اور امید میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا چاہیے یا دونوں کو برابر برابر اہمیت دینا چاہیے؟ اگر اللہ تعالیٰ کے جلالی اور جمالی نام بالکل مساوی ہوتے تو ہم کہہ سکتے تھے کہ انسان کو خوف اور امید دونوں برابر رکھنا چاہیے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسلامی روایت کے مطابق جلال اور جمال ایک سطح کی چیزیں نہیں ہیں۔

ہم نے پہلے کہیں بیان کیا تھا کہ خوفِ خدا سے وہ ردِعمل پیدا نہیں ہوتا جو کسی مخلوق کے خوف سے پیدا ہوتا ہے۔ اس دنیا میں اگر آپ کسی چیز سے خوفزدہ ہوں تو اس سے دور بھاگتے ہیں، لیکن اگر اس سے کسی فائدے کی امید ہو تو اس کی طرف بڑھتے ہیں۔ تاہم معاملہ اگر خوفِ خدا کا ہو تو واحد منطقی راہِ عمل یہی رہ جاتی ہے کہ اس کے خوف سے اس کی جانب قدم بڑھائے جائیں کہ اس سے بھاگ کر کوئی کہاں جا سکتا ہے؟ خدا کا ہر نوع کا تعلق قربِ خداوندی کی آرزو کو جنم دیتا ہے۔ خدا اگر دور ہے تو انسان کا ردِعمل یہ ہونا چاہیے کہ اس بُعد سے پیچھا چھڑانے کے لیے قرب کا متلاشی ہو اور قربِ خداوندی کے احساس کا ردِعمل یہ ہوگا کہ وہ زیادہ قرب کی طلب کرے۔ قرب (یا اسم القریب) صفاتِ تشبیہ میں سے ہے، تنزیہی صفات میں سے نہیں۔

تنزیہ خداوندی کا پیغام یہ ہوا کہ انسان کو تشبیہ تک پہنچنے، اپنے اندر صفاتِ خداوندی سے مشابہت پیدا کرنے کی سعی و کاوش کرنا چاہیے۔ دوسری طرف تشبیہ کا پیغام یہ ہے کہ انسان کو زیادہ سے زیادہ تشبیہ کی جدوجہد کرنا چاہیے۔ مقصودِ نظر، مطلوبہ آدرش تشبیہ ہوا، نہ کہ تنزیہ۔

یہ درست ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں سے دور ہے، لیکن یاد رہے کہ یہ خدا ''توحید'' کا خدا ہے، آج کے مقبولِ عام معاصر کلچر کا پیدا کردہ خدا نہیں۔ ''توحید'' کا خدا علم و حیات، ارادہ، قدرت، نطق و کلام، خیر و رحمت اور ہر حقیقی شے کا منبع ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ دور ہے تو اس سے ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ لوگ حقیقت سے دور پڑے ہیں، کیونکہ ان کی زندگی، ان کا علم و ارادہ، قدرت اور دیگر تمام مثبت صفات بہت ہی مدہم اور مٹی ہوئی ہیں۔

لیکن اللہ قریب بھی تو ہے کہ حقیقت سے کون بھاگ سکتا ہے؟ انسان کہنے کا مطلب ہی حیات، علم، ارادہ وغیرہ کا اثبات ہے خواہ یہ صفات کتنی ہی عارضی، دھندلی کیوں نہ ہوں۔ اس سے فرار اختیار کر کے ہم ایک عدمِ مطلق میں پناہ نہیں لے سکتے، اس لیے کہ اوّل تو یہ صفات انسانوں کی صفات ہی نہیں ہیں۔ جو شے آپ کی ملکیت ہی نہ ہو، وہ آپ اٹھا کر پھینک کیسے سکتے ہیں؟ مذکورہ صفات اللہ کی صفات ہیں اور جب تک اس کا حکم ہوگا، یہ صفات ہمارے اندر موجود رہیں گی۔ آگے چل کر جب ہم معاد کی بحث کریں گے تو ذکر آئے گا کہ اسلام اس بات پر زور دیتا ہے کہ موت ایک مسکن سے دوسری جگہ منتقل ہونے کا نام ہے۔ حالات بدل جاتے ہیں، ہستی کے بنیادی خواص نہیں تبدیل ہوتے۔

کہنے کا مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ حقیقی ہے، جب کہ مخلوقات غیر حقیقی ہیں۔ مخلوقات کو جو حقیقت بھی

حاصل ہے، اللہ ہی کی دی ہوئی ہے اور یہ حقیقتِ مستعار اسی کی ہی قدرت اور تصرف میں ہے۔ اللہ کی عطا کردہ اس حقیقت سے گریز کا مخلوق کے پاس کوئی راستہ نہیں۔ الحق ہی سب کچھ ہے، جب کہ عدمِ حقیقت لا شے ہے۔ حقیقت اللہ کا خاصہ ہے۔ جو شے جتنی حقیقی ہو گی، خدا سے اتنی ہی قریب ہو گی۔ جتنی غیر حقیقی ہو گی اتنی ہی خدا سے دور ہو گی، لیکن خدا سے دور ہوتے ہوئے بھی اشیا اس سے نزدیک ہوتی ہیں، اس لیے کہ حقیقی ہونے کا مطلب ہے خدا کی نشانی ہونا، نورِ خداوندی کی ایک کرن۔

قرآن اور حدیث میں قرب اور بُعد کا ذکر عموماً اس اعتبار سے آیا ہے کہ ان صفات کے نتائج انسانوں کے لیے کیا نکلتے ہیں۔ اللہ سے دور ہونے کا مطلب ہے جلال اور قہر کی صفات کے زیرِ نگیں آ جانا اور یہ ایک تکلیف دہ صورتِ حال ہو سکتی ہے۔ قربِ خداوندی کا مطلب ہے کہ آپ رحمت و جمال کی صفات کے زیرِ اثر ہوں اور یہ آپ کے لیے خوب ہو گا۔ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ قرآن کس طرح جہنم کو اللہ سے دوری اور جنت کو اس کے قرب سے وابستہ کرتا ہے۔ یہاں صرف اس نکتے پر توجہ دلانا مقصود ہے کہ جلال اور قہر کے مقابلے میں جمال و رحمت کہیں زیادہ حقیقی ہیں، کیونکہ جمال اور رحمت قربِ خداوندی کی علامت ہیں۔ جو بھی اللہ سے قریب تر ہے، وہ اس سے زیادہ مشابہ ہے، لہٰذا زیادہ حقیقی ہے، جو دور ہے وہ اس کے برعکس۔ بنا بریں صفاتِ تنزیہ کے مقابلے میں تشبیہی صفات الحق کی بہتر نمایندگی کرتی ہیں۔

جلال اور غضب کے اسما کی نسبت جمال و رحمت کے نام اللہ کی حقیقی فطرت کی جانب زیادہ رہنمائی کرتے ہیں۔ اس بات کی طرف قرآن نے جس طرح اشارہ کیا ہے، اس کا ایک اندازہ اس آیت میں ملتا ہے جہاں اللہ کی رحمت کے ہر شے پر محیط ہونے کا ذکر ہے:

قَالَ عَذَابِیٓ اُصِیبُ بِہٖ مَنۡ اَشَآءُ وَرَحۡمَتِیۡ وَسِعَتۡ کُلَّ شَیۡءٍ (٧:١٥٦)	فرمایا: میں اپنے عذاب میں تو اسی کو مبتلا کرتا ہوں جس کو چاہتا ہوں اور میری رحمت ہر چیز کو عام ہے۔

قرآن کبھی یہ نہیں کہتا کہ خدا کا غضب ہر شے پر نازل ہوتا ہے۔ اس کا غضب صرف ان مخلوقات کے لیے ہے جو یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیں کہ اللہ ان کے قریب ہے اور اپنے فکر و عمل سے حقیقت کو للکار کر اس کے مقابلے پر اتر آئیں۔

رسولِ خداؐ نے خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے عرش پر لکھ رکھا ہے: "رَحۡمَتِی سَبَقَت غَضَبِی"[16]

(میری رحمت میرے غضب سے بڑھی ہوئی ہے۔) رحمت غضب پر غالب ہے۔ یہ سبقت، یہ بڑھا ہوا ہونا زمانی نہیں ہے، وجودی ہے۔ بالفاظِ دیگر رحمت غضب کے مقابلے میں زیادہ بنیادی حقیقت ہے۔ رحمت کا تعلق الحق کی ماہیت سے ہے۔ رحمت اس کی فطرت کا جزو ہے، جب کہ غضب ایک ثانوی وصف ہے جو بعض مخلوقات کی خاص حالت کی وجہ سے ابھرتا ہے۔

اللہ کی رحمت اس کے غضب سے بڑھی ہوئی ہے، یہ اسلامی فکر کے اہم ترین اصولوں میں سے ایک ہے۔ نظری اور عملی اعتبار سے اس کے بے شمار نتائج ہیں۔ ان کی طرف ہم اکثر اشارہ کریں گے۔ سردست یہ کہنا کافی ہے کہ اس اصول سے تنزیہ اور تشبیہ کے مابین ایک تعلق قائم ہوتا ہے۔ تنزیہ خداوندی ہستی کی ایک حقیقت ہے، لیکن اس کی تشبیہ زیادہ بنیادی حقیقت ہے۔ توحید یہ بتاتی ہے کہ خدا ہم سے مختلف ہے، لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتی ہے کہ خدا ہر اعتبار سے مختلف نہیں ہے اور یہ قولِ ثانی ہی قولِ فیصل ہے۔ رحمت غضب پر غالب ہے اور رحمت سے الحق کا قرب میسر ہوتا ہے۔

اسلام اپنا آغاز اس بات سے کرتا ہے کہ ہم مختلف ہیں۔ ہم اللہ سے مختلف ہیں اور اس سے دور ہیں۔ خدا ہم سے یکسر مختلف و ماورا ہے۔ مخلوقات سرے سے عاجز و بے سامان ہیں کہ ان کے دامن میں کوئی بھی مثبت صفت نہیں ہے۔ لیکن اسلامی تعلیمات کا مقصد یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو غضب کے نرغے میں (دوری میں) چھوڑ دیا جائے۔ اس کے برعکس وہ رحمت، (یعنی قربِ خداوندی) تک انسان کی رہنمائی کرتی ہیں۔ اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ انسان خدا سے اپنی دوریوں کے ازالے کے لیے کچھ کرے اور جب وہ ایسا کرتا ہے تو قربِ خداوندی کی سمت قدم بڑھاتا ہے۔ قرب ایک مطلوب اور پسندیدہ چیز ہے کہ یہ قرب ہر حقیقی، نفع بخش، پرمسرت اور خیر کی چیز کا قرب ہے۔

رحمت کو اگر مخلوقات میں اثر آفریں و کارفرما ایک صفتِ خداوندی کے طور پر دیکھیے تو اس کا مطلب ہوگا، اللہ کا ہر وہ عمل جو اس نے اس لیے کیا کہ اس کے بندے خیر و حقیقت سے بہرہ مند ہو سکیں۔ رحمت، اللہ تعالیٰ کے اساسی اور اصلی ارادے کی نمایندہ ہے، کیونکہ اللہ خود رحمت ہے۔ غضب ایک عارضی معاملہ ہے اور اسے آخرکار دور ہو ہی جانا ہے، کیونکہ غضب کا تعلق ان چیزوں سے ہے جو اللہ سے کٹی ہوئی ہیں اور اللہ سے صحیح معنوں میں کٹی ہوئی اور جدا بھلا کیا چیز ہو سکتی ہے؟ جیسے ہی قربِ خداوندی میسر ہوگا غضب محو ہو جائے گا۔

اسلامی فکر میں رحمت کا جو بنیادی کردار ہے، اسے بیان کر کے ہم اللہ کے اسما و صفات کی اس

بحث کو اختتام تک لے آتے ہیں۔ ہمارا یہ ہرگز مدعا نہیں کہ اس مبحث کا کبھی پوری طرح احاطہ کیا جا سکتا ہے، کیونکہ اسما و صفات پر گفتگو تو توحیدِ خداوندی کی شرح و توضیح کا صرف ایک وسیلہ ہے اور توحید اس امر کی وضاحت ہے کہ خدا کا اپنی مخلوق سے کیا تعلق ہے، وہ مخلوق جو لاتعداد آیاتِ خداوندی کی مصداق ہے۔ اللہ کی ہر نشانی سے اللہ کے بارے میں کچھ نہ کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ ہر نشانی سے فطرتِ الٰہی کے کسی پہلو کا علم حاصل ہوتا ہے، لیکن ان نشانیوں کا کوئی انت نہیں! انتہا ہو بھی کیوں کر۔ یہ کائنات کیا ہے؟ ماسوی اللہ کو، غیر از خدا ہر چیز کو کائنات کہتے ہیں اور یہ کائنات خود بے پایاں ہے۔

افعالِ خداوندی

اللہ تعالیٰ کی صفات پر بات کرنے کی ویسے تو کوئی انتہا نہیں ہے، لیکن عام طور پر ان کو ننانوے ناموں میں سمیٹ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح کائنات کے خواص کا مبحث بھی سخن ناپیدا کنار کے مترادف ہے۔ جدید سائنس اس کی مثال ہے، لیکن قرآن و حدیث نے ہمیں فکر کی تنظیم کرنے والے ایسے واضح تصورات دیے ہیں جن کے سہارے مسلمان علما نے کائنات کی تصویر کشی کچھ اس طرح کی ہے کہ دنیا اللہ کی نشانیوں کا ایک مربوط اور عظیم الشان مرقع نظر آتی ہے، یا آیاتِ خداوندی کا ایک وسیع مجموعہ جس میں آیات تو بہت سی ہیں، لیکن پیغام سب کا ایک ہے۔

اسلامی الٰہیات کی اصطلاحی زبان میں اشیائے مخلوقہ یا خلقِ خدا کو ''افعالِ خداوندی'' کے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ ہر شے اللہ کی خلق کردہ ہے اور اس کی صفات کی نشانی ہے۔ ہم نے پہلے ذکر کیا کہ ''افعال'' (Acts) کی اصطلاح دیگر دو اصطلاحات، یعنی ''ذات'' (Essence) اور ''صفات'' (Attributes) کے سیاق و سباق میں اور انھی کے حوالے سے استعمال ہوتی ہے۔ ذاتِ الٰہی تو اللہ کا اپنا آپ ہے، جس کی کنہ اور حقیقت کو صرف وہی جانتا ہے۔ صفاتِ خداوندی اللہ کے وہ اوصاف و خواص ہیں، وہ اسما ہیں جو اس نے اپنی نشانیوں کے وسیلے سے اپنی مخلوق پر منکشف کیے ہیں۔ یہ نشانیاں، یہ آیات اس کی کتابوں میں بھی ہیں اور عالمِ تکوین، یعنی اس کائنات میں بھی۔ اس تناظر میں افعالِ خداوندی کیا ہوئے؟ افعالِ خداوندی کائنات کی وہ اشیا اور حوادث و واقعات ہیں جو اللہ کی فعالیت کے آثار ہیں۔

ان تین اصطلاحات کا باہمی تعلق جاننا ہو تو اپنی ذات پر ان کا اطلاق کر کے دیکھیے۔ انسان کی ذات خود وہ انسان ہے بلا لحاظِ صفات، یعنی اس سے قطع نظر کہ وہ مرد ہے یا عورت، بوڑھا ہے یا جوان، خوش

مزاج ہے یا چڑ چڑا، ذہین ہے یا غبی، طاقتور ہے یا کمزور۔ صفات وہ اوصاف اور خاصیتیں ہیں جو اس انسان کو حاصل ہیں، مثلاً مرد ہونا، جوان ہونا، خوش مزاجی، ذہانت۔ افعال ہر وہ عمل ہے جو ایک شخص کرتا ہے یا اس سے ظاہر ہوتا ہے اور ہم اس عمل سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ وہ جوان، خوش مزاج اور ذہین ہے۔

یہاں ذرا غور کیجیے کہ افعال کا انحصار صفات پر ہے اور صفات کا دارومدار ذات پر۔ خدا کا ذکر ہو، انسانوں کا تذکرہ ہو، یا کسی بھی چیز کا معاملہ ہو، یہ ترتیب درست مانی جائے گی۔ ایک طالب علم اپنی جماعت میں حاضر ہوتا ہے، یہ ایک فعل ہے۔ اس فعل کا انحصار بہت سی صفات پر ہے، مثلاً حیات، علم، ارادہ، قوت اور گویائی کا ملکہ۔ ان سب صفات کا ہونا مشروط ہے اس بات سے کہ ان صفات کا حامل، صاحبِ صفات کوئی شخص بھی ہو، ایک ذاتِ انسانی۔ اگر ذاتِ انسانی یعنی کوئی شخص ہی موجود نہ ہو تو صفات پر گفتگو بھی ممکن نہیں رہے گی۔

ایک اور مثال لیجیے۔ آپ ایک بڑھئی ہیں اور مکان بناتے ہیں۔ ذات آپ خود ہیں۔ صفات میں چوبی تعمیر کا ہنر، مکان بنانے کا ارادہ اور ہتھوڑا، آری اٹھانے کی قوت شامل ہیں۔ افعال میں وہ سب کام شامل ہوں گے جو آپ مکان بنانے کے لیے انجام دیں گے۔ مآل کار مکان تیار ہو گا جیسے یہ ساری کائنات بن کر تیار ہوئی۔

خلاصہ یہ کہ جب ہم اللہ کی، توحیدِ خداوندی کی بات کرتے ہیں تو بات تین مختلف سطحوں پر کی جاتی ہے۔ سب سے پہلے ہم اس امر کا اثبات کرتے ہیں کہ ایک حقیقتِ واحدہ ہے (ذاتِ الٰہی) جو ظاہری اشیا کی کثرت کے پردے میں پنہاں ہے۔ اس کے بعد ہم یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ ایک (ذات) ہم پر کس طرح ظاہر ہوتی ہے۔ ہمارا یہ بیان صفات کہلائے گا۔ تیسرے درجے پر ہم یہ بتاتے ہیں کہ یہ اشیا جو ہماری آنکھوں کے سامنے عیاں ہیں، افعال ہیں اور ان کا عمل میں آنا منحصر ہے ان صفات پر جو ہم نے پہلے بیان کیں۔

افعالِ خداوندی کیا ہیں؟ وہ تمام اشیا جو اس نے زمان و مکان کے اندر اس کائنات میں تخلیق کی ہیں۔ یہ دنیا، یہ کائنات اپنے زمان و مکان کی ساری پہنائی و گیرائی سمیت ایک لامحدود فعلِ الٰہی کی طرح ہے۔ اس عمل سے، اس فعلِ خداوندی سے ہر وہ چیز جو اس دنیا کے بارے میں اللہ کے بے پایاں اور لامنتہا علم میں ہے، خارج میں ظاہر ہو جاتی ہے۔

ایک دوسرے زاویے سے نظر کیجیے تو یہ کہنے کی گنجایش ہے کہ بس دو ہی چیزیں وجود رکھتی ہیں۔

ذاتِ خداوندی اور فعلِ خداوندی۔ جب اس تناظر میں بات کی جاتی ہے تو عموماً یوں کی جاتی ہے کہ اللہ ہے اور یا پھر ماسوی اللہ۔ یوں ''ماسوی اللہ'' (اللہ کے علاوہ اور ہر شے) مترادف ٹھہرتا ہے کائنات کا، یعنی تمام افعالِ خداوندی کا مجموعہ اور حاصل۔ اس لحاظ سے دیکھیے تو خدا اور اس کائنات کے درمیان جو نسبت، جو رشتہ قائم ہوگا، اسے صفات یا اسما کا نام دیا جائے گا۔ صفات کی اپنی الگ ہستی نہیں ہے، بلکہ ان کے حوالے سے انسانی ذہن یہ جان لیتا ہے کہ افعالِ خداوندی کا ذاتِ خداوندی سے کیا تعلق ہے۔

اپنے آپ کی مثال لیجیے۔ بساطِ ہستی پر آپ ہیں یا پھر آپ کے سوا دوسرے لوگ۔ آپ کی صفات اس بساطِ ہستی پر، آپ سے اور آپ کے علاوہ دوسرے لوگوں سے الگ کوئی تیسری چیز نہیں ہیں۔ آپ کی صفات کئی ہوسکتی ہیں، مثلاً چھوٹا بڑا، ماں بیٹی، ذہین احمق، مضبوط یا کمزور، درگذر کرنے والا یا کینہ پرور وغیرہ۔ پہاڑوں، سیاروں اور ستاروں کے مقابلے میں آپ چھوٹے ہیں، کیڑے مکوڑوں، جرثوموں اور ایٹمی ذرات کے مقابلے میں بڑے۔ اپنی اولاد کے رشتے میں آپ ماں ہیں اور اپنی والدہ کے ناطے سے آپ ایک بیٹی۔ اپنے دوستوں میں سے کچھ لوگوں کے مقابلے میں یا اپنے پالتو کتے اور مکھیوں کے مقابلے میں ذہین ہیں۔ آپ کے شناسا لوگوں کے حلقے میں بعض لوگوں سے موازنہ کیا جائے یا ارسطو اور آئین سٹائین کے مقابلے میں رکھا جائے تو آپ کم عقل قرار پائیں گے۔ کتے کا پلا آپ کی ٹانگ پر منہ مار دے تو آپ اسے چھوڑ دیتے ہیں اور مچھر خون چوسنے لگے تو اسے مارنے پر تل جاتے ہیں۔

آپ کی تمام صفات کا دارومدار اس پر ہے کہ دوسری اشیا سے آپ کی کیا نسبت یا رشتہ قائم ہو رہا ہے۔ اسی طرح خدا کی صفات کا تصور بھی تبھی ہو سکے گا جب اللہ اور ماسوی اللہ، خدا اور غیرِ خدا کے تعلق کو سامنے رکھا جائے گا اور یہ دوسری اشیا وہی ہیں جنھیں ماسوی اللہ کہا گیا ہے یعنی اللہ کے آثارِ افعال۔

غیب وشہود

دنیا کے بارے میں قرآن جو بھی بتاتا ہے، اسے آپ افعالِ خداوندی کا بیان کہہ سکتے ہیں، لیکن قرآن میں دونوں طرح کے بیان ہیں، عمومی بھی اور خصوصی بھی۔ کچھ آیات میں بہت سے افعال یا سبھی افعالِ خداوندی کا ذکر ہے جب کہ دوسری آیات صرف ایک یا چند افعال کا تذکرہ کرتی ہیں۔ قرآن میں افعالِ خداوندی کے بیان پر غور وفکر کر کے اور احادیث کی مدد سے، نیز اپنے وقت کے تصورِ کائنات کے مطابق مسلم مفکرین اس نتیجے تک پہنچے کہ افعالِ خداوندی کو دو بنیادی اقسام میں بانٹا جاسکتا ہے۔

بہت سی قرآنی آیات یہ کہتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ "عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ" (دیکھے اور اَن دیکھے کا جاننے والا) ہے۔ صاف سی بات ہے کہ عالمِ ہستی میں جو کچھ ہے اسے یا تو ہم دیکھ سکتے ہیں یا نہیں دیکھ سکتے۔ ہمارے علم کی حدود وہی ہیں جو ہمارے دیکھنے، گرفت میں لینے، احاطہ کرنے، جانچنے پرکھنے اور تجزیہ کرنے کی حدود ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ عملاً ساری کائنات ہمارے علم سے باہر ہے، کیونکہ ہمارے پاس اسے دیکھنے اور اپنی گرفت میں لانے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ ہر شے کو جانتا ہے، خواہ ہم اسے دیکھ سکیں یا وہ ہمارے لیے اَن دیکھی چیز ہو۔

یاد رہے کہ قرآن جب ''الغیب'' (اَن دیکھا، غیر مرئی) کا ذکر کرتا ہے تو اس سے اس کی مراد وہ نہیں ہوتا جس تک ہماری نگاہ کی عملاً رسائی نہیں ہے، بلکہ وہ جس کی دید ہماری نظروں کے لیے اُصولاً ممکن نہیں۔ ہماری آنکھیں صرف مادی اشیا کو دیکھ سکتی ہیں جب کہ کائنات کو لیجیے تو نہ صرف مادی اشیا کی سطح پر اس کی حدود بے انتہا وسیع ہیں، بلکہ غیر مادی چیزوں کی اقلیم میں بھی اس کی وسعت کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔

قرآن کی دوسری سورت کے آغاز میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو اہلِ تقویٰ میں سے ہیں، اللہ کے معاملے میں احتیاط سے چلتے ہیں اور ''غیب پر ایمان رکھتے ہیں'' (يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ)(٢ : ٤)، چنانچہ اگر ارکانِ ایمان کو ایک لفظ میں سمیٹنا درکار ہو تو ہم اسے ''الغیب'' کہہ سکتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ اللہ کی کتابیں ہمارے لیے ایک تحریری صورت میں دکھائی دینے والی چیز ہیں، تاہم ان کے معانی ہمارے لیے غیب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مذہب کے ماننے والوں نے اپنی کتاب کے معانی کا فہم حاصل کرنے کے لیے وقت اور توانائی کا بیش از بیش سرمایہ صرف کیا ہے اور آج بھی اس سعی میں مصروف ہیں۔

خلاصہ یہ کہ مسلمانوں نے حقیقت کی دو بنیادی اصناف کا تعین کیا ہے، مرئی حقیقت اور اَن دیکھی حقیقت یا غیبی حقائق (غیب) absent اور مشہود حقائق (شہادۃ) یعنی حاضر و نظر آنے والے حقائق۔ غیب کو ہم دو بنیادی اقسام میں بانٹ سکتے ہیں، خدا اور فرشتے۔ خدا کو خدا کے سوا کسی نے نہیں دیکھا جب کہ فرشتوں کو دوسرے فرشتے، خدا تعالیٰ اور بعض خاص لوگ، مثلاً انبیا بھی دیکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ فرشتے انسانوں کی اکثریت کے لیے تو غیبی مخلوق ہیں، لیکن خود اپنے لیے اور اللہ تعالیٰ کے لیے مرئی ہیں، غیب نہیں ہیں۔

عالمِ مرئی وہ ہے جو ہمارے حواس کی گرفت میں آتا ہے۔ ہر وہ شے جسے ہم واقعی دیکھتے ہیں، یا اُصولی طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ عالمِ مرئی یا عالمِ حس و شہادۃ کی پھر دو اقسام ہیں۔ کچھ چیزیں تو وہ ہیں

جنھیں ہم سب دیکھتے ہیں اور دوسری قسم ان اشیا کی ہے جنھیں دیکھنے میں سب لوگ شریک نہیں ہیں، مثلاً خواب یا کابوس یا واہمہ۔ خواب صرف خواب دیکھنے والے کو نظر آتا ہے۔ دنیا کا دوسرا کوئی شخص اسے نہیں دیکھ رہا ہوتا۔ ہاں ہمارے خواب اللہ کے لیے غیر مرئی نہیں ہیں، نہ اُن فرشتوں کے لیے ہی یہ خواب اَن دیکھی چیز ہیں جن کا کام ہی خوابوں کی نگرانی کرنا ہے (اس لیے کہ اپنے فرائض کے اعتبار سے فرشتوں کی کئی قسمیں بتائی گئی ہیں)۔ مخلوقات کی کچھ اور قسمیں بھی ہیں جن کا تعلق نیم مرئی دنیا سے ہے، یہ ہستیاں اکثر اوقات نظر نہیں آتیں، لیکن بعض مواقع پر خود کو ظاہر کر دیتی ہیں۔ جنات کا تعلق اسی قسم سے ہے (آگے چل کر ہم ان کے بارے میں مزید گفتگو کریں گے۔)

ارض وسما

کائنات پر گفتگو ہو تو قرآنی اصلاحات کا ایک اور جوڑا بکثرت استعمال ہوتا ہے: ارض وسما (زمین اور آسمان)۔ آسمان کی بات ہو رہی ہو تو یہ اہم نکتہ سامنے رہنا چاہیے کہ آسمان اور بہشت الگ الگ چیزیں ہیں۔ اسلام میں جنت کے مقابل ہمیشہ جہنم یا دوزخ کا مقام ہے جب کہ آسمان کے مقابل اس کے اُلٹ، یعنی زمین کا ذکر آتا ہے۔ جنت دوزخ کا تعلق معاد یا آخرت سے ہے۔ ان کا پورا اور حتمی تجربہ تو یومِ آخرت سے پہلے نہیں ہو سکتا، جب کہ ارض وسما کائنات کی اس حالت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس میں وہ لحۂ آفرینش سے لے کر یومِ آخر تک رہے گی۔ جب وقتِ آخر آن لگے گا تو زمین وآسمان میں انقلاب آجائے گا، ان کی ماہیت بدل دی جائے گی:

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَالْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْالِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّار (۱۴:۴۸)	یاد رہے وہ دن جب یہ زمین ایک اور زمین سے بدلی جائے گی اور آسمان، اور لوگ نکل کر کھڑے ہوں گے اللہ کے سامنے، جو زبردست ہے، ایک ہے۔

قرآن میں سات آسمانوں کا ذکر ہے جن میں سے سات سیارے ہیں (سیارہ عربی اور یونانی اصطلاح میں ''متحرک اجرامِ فلکی'' کا ہم معنی ہے)۔ یہاں یہ اہم بات پیشِ نظر رہے کہ ان اجرامِ فلکی کو جدید فلکیات کے معنی میں سیارے نہیں سمجھنا چاہیے۔ مسلمانوں میں اگرچہ اعلیٰ درجے کا علمِ فلکیات بھی پروان چڑھا، لیکن قرآنی فلکیات ایک اور چیز ہے۔ یہ آیات وعلامات کی فلکیات ہے۔ دوربین وغیرہ کے بغیر انسانی آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے اسی کو عالمِ غیب کے اُمور، مثلاً خدا، فرشتے، آخرت کے بارے میں

کچھ بتانے کے لیے قرآن نے استعمال کیا ہے۔ بنابریں قرآن میں آسمانوں کا ذکر اسی سطح تک رہتا ہے جس حد تک ایک انسان اپنے گھر کے صحن میں کھڑا ہو کر شبِ تاریک میں آسمان کا مشاہدہ کرتا ہے۔

بہتر ہوگا کہ یہ بھی ذہن میں رکھیے کہ ان لوگوں کے لیے آسمانوں میں معانی کا ایک خزینہ ہوتا ہے جو عالمِ طبعی میں فطرت کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ پھر آسمان ان لوگوں کو صاف نظر بھی تو آتا تھا کہ نہ فضا اتنی کثیف اور آلودہ تھی، نہ انسان کی بنائی ہوئی تیز روشنیاں نظر کو چکا چوند کیے رکھتی تھیں۔ جدید دنیا میں سائنسی معلومات نے ہمیں عالمِ طبعی کے براہ راست تجربے سے دور کر دیا ہے۔ اب ہم چیزوں کو ویسے نہیں دیکھتے جیسی وہ ہمارے سامنے آتی ہیں۔ اس کے برعکس ہم ہر چیز کو اس نظر سے دیکھتے ہیں جو ہمیں گرامر سکول نے تعلیم کی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں، ہمیں اکثر کسی چیز کو دیکھنے میں دلچسپی ہی نہیں ہوتی کیونکہ ہمارا خیال ہوتا ہے کہ سائنسدان، ماہرین ان کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں اور رہے ہم تو ہم گردوپیش کی اشیا کے بارے میں کون سی پتے کی بات معلوم کر لیں گے! بہر کیف ہمارے ٹیلی ویژن سیٹوں کی سکرین پر کوندنے والی برقی روشنی ہمارے لیے کہیں زیادہ متحرک اور دلآویز ہے۔ ستارے ہمارا کیا دل لبھائیں گے جو بمشکل حرکت کرتے ہیں۔ (ٹیلی ویژن آنے سے پہلے لوگ رات میں کیا کیا کرتے تھے؟)

نیچے سے اوپر چلیے تو سات سیارے کچھ اس ترتیب میں ہوں گے: قمر، عطارد، زہرہ، شمس، مریخ، مشتری، اور زحل۔ ہر سیارہ اپنے اپنے فلک میں محوِ خرام ہے۔ روایتی طور پر ان افلاک میں دو افلاک اور بھی گنوائے جاتے ہیں، عرش و کرسی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ عرش و کرسی فلکِ ستارگان اور فلکِ بے اجرام کا دوسرا نام ہے۔ قرآن میں ''کرسی'' کا ذکر صرف ایک مرتبہ آیا ہے اور یہ آیت قرآن کی مشہور ترین آیات میں سے ہے۔ آپ نے اس آیت کو اکثر مساجد اور مزارات میں کندہ دیکھا ہوگا۔

اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ج اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّ لَا نَوْمٌ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ ط یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ ج وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ج وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ج وَلَا یَئُوْدُہٗ حِفْظُھُمَا ج	اللہ! اس کے سوا کوئی الہٰ نہیں۔ جیتا جاگتا، سب کو تھامنے والا۔ اس کو نہ اُونگھ آتی ہے نہ نیند۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں۔ کون ایسا ہے جو اس کے اذن کے بغیر اس سے کسی کی سفارش کر سکے؟ وہ جانتا ہے جو خلق کے روبرو ہے اور جو اس کے

وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ (۲:۲۵۵)

پیٹھ پیچھے، اور یہ اس کے علم میں سے کچھ بھی نہیں گھیر سکتے۔ سوائے اس کے جو وہ چاہے۔ سمائی ہے اس کی کرسی میں زمین و آسمان کی اور ان کے سنبھالنے سے وہ تھکتا نہیں اور وہی ہے سب سے اُوپر، بزرگ و برتر۔

ذرا غور کیجیے کہ قرآن ان آیات میں کائنات کے بارے میں کچھ نہیں کہہ رہا۔ بات صفاتِ خداوندی کی ہو رہی ہے۔ اللہ کو ہر شے کا علم ہے، لیکن انسانوں کو صرف اتنا ہی علم ہے جتنا اللہ نے اُنھیں بتایا ہے۔ بالفاظِ دیگر انسان کا علم متعین اور محدود ہے جب کہ علمِ خداوندی بے قیاس و بے کراں۔ اس کے بعد ان آیات میں کائنات کا یونہی ضمناً ذکر آیا ہے: ''السموات و الارض۔'' اور یہ کہا گیا کہ اللہ کی کرسی زمین و آسمانوں پر محیط ہے۔ ''کرسی'' وہ جگہ ہے جہاں اللہ کے ''قدم'' رکھے ہوئے ہیں۔ اگر اللہ کے ''قدم'' کائنات سے ورا پائے جاتے ہیں تو اس کا ''سر'' کہاں ہوگا؟ اللہ کا نہ سر ہے نہ قدم، کم از کم انسانوں کی طرح کے تو بالکل نہیں، لیکن اس تمثیل میں ہماری کائنات سے اس کی نسبت کا اشارہ ملتا ہے۔ اللہ کے ہاں جو چیز سب سے فروتر ہے، وہ کائنات کی ارفع ترین سطح سے بھی بلند تر ہے۔ انسانوں سے معاملہ کرنے کے لیے اللہ کو کہاں تک نیچے آنا پڑتا ہے، دوسری طرف انسان اگر خدا کی طلب میں نکلے تو اسے کتنا اوپر اٹھنا ہوتا ہے؟

کرسی کا مقام عرشِ خداوندی سے نیچے ہے۔ عرشِ خداوندی وہ ہے جہاں زمین و آسمان کی تخلیق کے بعد بادشاہِ عالم فروکش ہوئے۔ قرآن میں ۲۱ مقامات پر عرش کا تذکرہ ہے اور سبھی جگہ قدرتِ خداوندی اور اللہ کی بادشاہی کی طرف اشارہ ہے۔ شاید جلالِ بادشاہی اور قہرِ سلطانی کے تلازمات اور مفاہیم کو متوازن کرنے کی غرض سے ایسا کیا گیا ہے کہ قرآن میں صرف ایک اسمِ خداوندی کو براہِ راست عرش سے متعلق کہا گیا ہے، یعنی الرحمٰن۔

اللہ تعالیٰ دیگر بادشاہوں کی طرح نہیں ہے جن کی اوّلین خاصیت جلال وغضب نا کی ہوا کرتی ہے۔ اس کے برعکس اللہ وہ بادشاہِ عالم ہے جس کا کرم اس کے قہر پر غالب ہے۔ یاد رہے کہ عرشِ خداوندی پر لکھا ہوا ہے: ''رحمتی سبقت غضبی''۔ اللہ کا قانون اس کے بندوں کے لیے خیر کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس لیے قرآن میں عرش کا تصور ایسا ہے جس میں جلال و جمال کی صفات دونوں کا امتزاج

ہے۔ وہ شے جو ساری کائنات کا احاطہ کیے ہوئے ہو، اس کے لیے یہ نہایت مناسب ہے، کیونکہ کائنات پر دونوں طرح کی صفات کی فرمانروائی ہے۔

زنہار یہ نہ سمجھا جائے کہ قرآن میں جہاں آسمانوں کا ذکر آیا ہے، وہاں نظامِ شمسی کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔ ہر آسمان کا ایک سیارہ ہے اور یہ سیارہ دیکھا جاتا ہے، لیکن آسمان خود غیر مرئی ہیں۔ کچھ احادیث میں اس امر کی وضاحت ہوتی ہے، مثلاً وہ تمام احادیث جن میں آنحضرتؐ کے سفرِ معراج کا ذکر ہے۔ قرآن میں اس سفر کا تذکرہ تین جگہ آیا ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ (۱۷:۱)

پاک ذات ہے، جو اپنے بندے کو راتوں رات لے گیا اس ادب والی مسجد سے اُس ادب والی مسجد تک جس میں ہم نے خوبیاں رکھی ہیں تا کہ ہم اس کو اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔

''معراج'' کے لفظی معنی ہیں زینہ یا سیڑھی۔ حضرتِ یعقوبؑ نے جو سیڑھی زمین سے آسمان تک بلند ہوتی دیکھی تھی، جس سے فرشتے آتے تھے اور جاتے تھے (باب پیدایش ۱۲:۲۸) معراج کا مذکورہ تصور اس سے غیر متعلق نہیں ہے۔ رسول اللہؐ کو اس سیڑھی سے اللہ تک لے جایا گیا اور اسی سیڑھی سے آپؐ اپنے لوگوں میں واپس آئے تا کہ پیغامِ خداوندی کی تکمیل کریں۔

سفرِ معراج مختصراً یوں ہے کہ ایک رات آپؐ کو حضرت جبرئیل نے نیند سے جگایا اور ہمراہ لے چلے۔ آپؐ کو براق پر سوار کرایا۔ براق وہ پروں والا گھوڑا تھا جو ہر گام حدِ نگاہ تک کا فاصلہ طے کرتا تھا۔ اس مرکبِ تیز گام نے چند قدم میں یروشلم کے معبد تک پہنچا دیا جہاں آدمؑ سے عیسیٰؑ تک تمام انبیا یکجا تھے۔ اس معبد کو قرآن نے مسجدِ اقصیٰ کا نام دیا ہے۔ وہاں آپؐ نے نماز پڑھی۔ تمام انبیا نے آپؐ کی امامت میں نماز ادا کی۔

حضرت جبرئیل نے آپ کا ہاتھ تھاما اور آپؐ فلکِ قمر کی طرف بلند ہو گئے۔ جبرئیل نے درِ فلک پر دستک دی، آواز آئی: ''کون ہے؟'' جبرئیل نے بولنے والے کو یقین دلایا کہ ان کو بلوایا گیا ہے۔ اجازت ملنے پر حضور کو لے کر اندر داخل ہوئے۔ سیدنا آدمؑ آپؐ کے منتظر تھے۔ جبرئیل نے تعارف کرایا۔ حضرت آدمؑ نے فرمایا: ''مرحبا اے فرزندِ صالح اور رسولِ صالح''۔ جبرئیل اور محمد رسول اللہؐ اس سے آگے سفر جاری رکھتے ہیں۔ باقی کے تمام چھ افلاک میں ان کی ملاقات ایک یا ایک سے زیادہ انبیا

سے ہوتی ہے۔ سیرِ افلاک سے گذر کے آپؐ نے جنت وجہنم دونوں کو دیکھا۔ عہدِ حاضر کے چند اہلِ علم نے اشارہ کیا ہے کہ معراج نبیؐ کے بیان کے مطالعے سے دانتے کو طربیۂ خداوندی (*Divine Comedy*) میں جنت و دوزخ کی تصویر کشی کا خیال پیدا ہوا تھا۔

جنت کا آخری کنارا شاید عرشِ خداوندی سے ذرا ہی نیچے ہے۔ یہاں تک پہنچے تو جبرئیل نے کہا کہ اس مقام سے آگے رسولِ خداؐ کو بارگاہِ خداوندی میں تنہا جانا ہوگا۔ جبرئیل اگر اس سے آگے بڑھے تو ان کے پر جل جائیں گے۔ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس ماورائے قیاس نور کے سامنے حاضر ہو گئے جو بیان میں نہیں سما سکتا۔ اس کے بعد کی ہمیں خبر نہیں۔ واپسی پر جبرئیل پھر آپؐ کے ہمراہ ہوئے اور ہر آسمان پر رکتے ہوئے، اس فلک پر مقیم نبی کو الوداع کہہ کر واپس لوٹ آئے۔[۱۷]

سفرِ معراج کے اس بیان سے یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ افلاک کی اس بحث کا ان سیاروں سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے جن سے ہم آشنا ہیں۔ بعض مسلمان علما نے اس نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ بیانیہ علامتی حیثیت رکھتا ہے جس میں ہر فلک ایک الگ درجۂ وجود کا حوالہ ہے۔ مختلف افلاک جداگانہ مراتبِ ہستی کے نمایندہ ہیں اور ہر مرتبۂ ہستی میں مختلف صفاتِ الٰہیہ کا ظہور ہوتا ہے۔ سفرِ معراج میں سیدنا محمدؐ کی ملاقات جن انبیا سے ہوئی، ان میں سے ہر نبی مجموعی پیامِ خداوندی کے ایک جزو کا نمایندہ تھا یا یوں کہیے کہ ان آیاتِ خداوندی کی کلیّت کے ایک حصے کی نمایندگی کرتا تھا جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابوں یا کائنات میں ظاہر کی ہیں۔ کسی مسلمان کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ نہ آیا ہوگا کہ حضرت آدمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت ابراہیمؑ اور دوسرے انبیا ان سیاروں پر رہتے ہیں، کم از کم ان سیاروں پر تو ہرگز نہیں جو جدید علمِ فلکیات کے نظام میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے لیے تو آسمان میں آوارہ خرام یہ سیارے اللہ کی نشانیاں ہیں جو عالمِ ہستی کو پیغاماتِ خداوندی سے معمور رکھتے ہیں۔ افلاک ایک علامت ہیں اور ان بلند تر اقالیمِ ہستی کی نشان دہی کرتے ہیں جو سیر الی اللہ کے مسافروں کے راہ میں آتی ہیں۔ آگے چل کر ہم دیکھیں گے تمام اہلِ ایمان کو موت کے فوراً بعد انھیں تمام آسمانوں سے گذارا جاتا ہے۔ اس سفر کے بعد وہ اپنی قبر میں اتر کر روزِ محشر کا انتظار کھینچتے ہیں۔[۱۸]

زمین وآسمان کی بحث میں بنیادی نکتہ یہ ہے کہ اللہ کی تخلیق کردہ اس دنیا کی چیزوں کی باہمی نسبت کیا ہے، یا یوں کہیے کہ اللہ کے سامنے سرافگندہ و فرمانبردار اس کائنات میں کیا درجہ بندی اور نظامِ مراتب متعین ہوتا ہے۔ کائنات سے اللہ کی کیا نسبت اور تعلق ہے، اسے سمجھنے کے لیے ہم ایک

طرف تو اللہ کی صفات کو کائنات کے خواص کے برعکس دیکھتے ہیں (تنزیہ) اور دوسری جانب یہ دکھاتے ہیں کہ دونوں اطراف کے اوصاف و صفات میں کسی حد تک مشابہت پائی جاتی ہے (تشبیہ)۔اسی طرح مخلوقاتِ خداوندی کی باہمی نسبتوں کو جاننے کے لیے ہم تنزیہ وتشبیہ کے مذکورہ بالا تعلق سے کچھ نتائج اخذ کرتے ہیں اور اس قیاس کی بنیاد یہ ہے کہ زمین و آسمان کا باہمی تعلق ویسا ہی ہے جیسا خدا اور کائنات کا۔آسمان اور زمین میں ایک بہت چھوٹے پیمانے پر وہی نسبت ہے جو خدا اور کائنات کے درمیان پائی جاتی ہے۔

مسلمان مفکرین جب زمین و آسمان پر صفاتِ تنزیہ کے حوالے سے غور کرتے ہیں تو ان دونوں کو ایک دوسرے کے اُلٹ صفات سے موصوف کرتے ہیں: بلند و پست، روشن و تاریک، قوی اور کمزور، فعال و منفعل، دینے والا/پانے والا۔ جب وہ صفاتِ تشبیہ پر زور دیتے ہیں تو بیان کا رخ اس جانب ہوتا ہے کہ آسمان کی صفات زمین میں بھی پائی جاتی ہیں، البتہ ان میں آسمان والی بات نہیں ہوتی۔

اللہ تعالیٰ ''الخالق'' ہے۔

هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ (۳۵:۳) کوئی ہے بنانے والا اللہ کے سوا۔

سوال کا اسلوب خطابیہ ہے۔کسی کو اس امر میں شبہ نہیں کہ جواب نفی میں ہے۔آیت کا زور اللہ کی تنزیہ پر ہے۔دوسری جانب ایک اور آیت میں یوں آیا ہے۔

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ (۲۳:۱۴) سو بڑی برکت اللہ کی جو سب سے بہتر بنانے والا ہے۔

اس سے یہ پتا چلا کہ دوسری چیزیں بھی صفتِ تخلیق میں کسی حد تک شریک ہیں۔کائنات میں اگر کہیں صفاتِ تخلیق نمودار ہوئی ہیں تو آسمان ہی میں۔اس کے برعکس زمینی صفات کا انحصار آسمان کے فعل کی قبولیت پر ہے، تاہم آسمان کو بھی زمین درکار ہے کہ اگر زمین نہ ہو تو آسمان کو اپنا ہنر دکھانے کے لیے میدان ہی میسر نہ ہوگا۔

آسمان ایک مرتکز، مجمل اور غیر مادی قوت کا نمایندہ ہے جب کہ زمین منتشر، مفصل اور مادی علامات و آیات کا مجموعہ ہے جن سے آسمان کی اَن دیکھی قوت کا ظہور ہوتا ہے۔صفاتِ آسمانی کا قرآنی استعارہ آبِ زلال ہے، صاف اور بے آلایش پانی۔آسمان جب پانی برساتا ہے تو اس بارانِ سماوی سے زندگی کی ان گنت صورتیں جنم لیتی ہیں۔قرآن کے الفاظ میں:

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاۗءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (۳۱:۳۰) اور ہم نے پانی سے ہر شے کو زندہ کیا۔

بہت سے مسلمان مفکرین کی رائے یہ ہے کہ اس آیت کا مدلول صرف نباتات اور حیوانات ہی نہیں، بلکہ تمام مخلوقات ہیں، کیونکہ آسمان وزمین کی ہر چیز اللہ کے گن گاتی ہے جیسا کہ قرآن میں بارہا آیا ہے۔ جب تک کوئی شے ذی حیات نہ ہو، اسے تسبیح پر قدرت کیسے ہوگی؟

وَهُوَالَّذِیٓ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجۡنَابِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیۡءٍ (۶:۹۹)

اور اسی نے آسمان سے پانی اُتارا، پھر ہم نے اس سے ہر اُگنے والی چیز نکالی۔

وَتَرَى الۡاَرۡضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡهَا الۡمَآءَ اهۡتَزَّتۡ وَرَبَتۡ وَاَنۡۢبَتَتۡ مِنۡ كُلِّ زَوۡجٍۢ بَهِيۡجٍ (۲۲:۵)

اور تم زمین کو دیکھتے ہو دبی پڑی ہے پھر جہاں ہم نے اس پر پانی اُتارا، وہ تازہ ہو کر اُبھری اور اُگائیں بھانت بھانت کی خوشنما چیزیں۔

وَاَنۡزَلۡنَا مِنَ السَّمآء مآءً طَهُوۡرًا لِنُحۡيِىَ بِهٖ بَلۡدَةً مَيۡتًا (۲۵:۴۸)

اور ہم نے اُتارا آسمان سے ستھرا پانی کہ اس سے دھرتی کو جو مر گئی تھی پھر سے زندہ کر دیں۔

آسمان سے برسنے والا پانی اگر ”ماءِ طہور“ (نرمل، ستھرا پانی) ہے تو ساتھ ہی ساتھ اپنی اجمالی نوعیت کی بنا پر ”ایک“ بھی ہے۔ جب زمین یہ پانی پی جاتی ہے تبھی اس پانی سے کثرت اور تنوع کی نمو ہوتی ہے:

وَفِى الۡاَرۡضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنۡ اَعۡنَابٍ وَّزَرۡعٌ وَّنَخِيۡلٌ صِنۡوَانٌ وَّ غَيۡرُ صِنۡوَانٍ يُّسۡقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ (۱۳:۴)

اور زمین میں کئی کھیت ملے ہوئے، اور باغ ہیں انگور کے، اور کھیتی، اور کھجوریں جڑواں اور اکہری، سب کو پانی ایک ہی ملتا ہے۔

سو زمین اس جگہ کی نمایندہ ٹھہری جہاں آسمان کے خواص ظاہر ہوتے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے زمین و آسمان مل کر، (یعنی پوری کائنات) اللہ کی نشانیوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ آسمان اللہ سے قریب تر ہے، زمین دور افتادہ۔ پس آسمان ہمارے ذہن کو تشبیہ کی طرف لے جاتا ہے جب کہ زمین پر صفاتِ تنزیہ کا غلبہ ہے، لیکن زمین میں بھی اللہ کی صفات جمال و رحمت کی نشانیاں ہیں۔ ارضِ ثمر بار کی آغوش میں جتنی نعمتیں ہیں، وہ انھی صفات کا ظہور ہیں۔ چنانچہ زمین کو بھی تشبیہ کے نقطۂ نظر سے دیکھنا لازمی ٹھہرتا ہے۔ دوسری طرف آسمان ”تنزیہ“ سے آزاد نہیں ہے، کیونکہ **كُلُّ شَیۡءٍ هَالِكٌ الا وَجۡهه** (۲۸:۸۸) (ہر شے فنا ہے سوائے اس کی ذات کے۔) اِن مٹ جانے والوں میں زمین و آسمان سبھی شامل ہیں۔

زمین و آسمان میں اللہ کی نشانیاں کیوں کر ظاہر ہوتی ہیں، ہمیں اس موضوع پر قرآنی تعلیمات کا جائزہ لینا ہو تو بات کا کوئی کنارہ نہیں ہوگا۔ یہ مبحث سارے کا سارا توحید ہی کا بیان ہوگا، لیکن ہم فی الوقت ایک خاص تصور پر توجہ مرکوز کرنا چاہتے ہیں جو حدیثِ جبرئیل میں مذکور ہوا ہے، یعنی فرشتے۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ نبوّت و معاد کی نسبت فرشتوں کا تعلق ''توحید'' سے زیادہ ہے، اگرچہ ان دو اقالیم میں بھی ان کی ایک اہم حیثیت ہے۔ اب ہم یہ بیان کریں گے کہ ملائکہ کا قرآنی تصور کس طرح مسلمانوں کے تصورِ خدا، تصورِ کائنات اور تصورِ انسان کی صورت گری کرتا ہے۔

فرشتے

حدیثِ جبرئیل میں رسولِ خدا ؐ نے فرمایا تھا: ''اور تم ایمان لاؤ اللہ کے فرشتوں پر۔'' اللہ کا تصور نہ ہو تو اللہ پر ایمان لانا بے معنی ہے۔ اسی طرح جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ فرشتے ہوتے کیا ہیں، اس وقت تک ان پر ایمان لانے کے بھی کوئی معنی نہ ہوں گے۔ فرشتوں کا اسلامی تصور اگر سمجھنا ہو تو ہمارے معاشرے میں فرشتوں کے بارے میں چلتے ہوئے خیالات کسی طرح مددگار ثابت نہیں ہو سکتے جیسے تصورِ الٰہ کے فہم کے لیے لوگوں کے مروجہ خیالات پر انحصار کرنا بے سود رہتا ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ کندھوں سے پَر اُگائے، تیراندازی کرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے لڑکے یا رباب بجاتی ہوئی یونانی دوشیزاؤں کی قسم کی ذہنی تصویروں سے آغازِ کلام ہی میں پیچھا چھڑا لیا جائے۔

عربی کا لفظ ''مَلَك'' (عبرانی لفظ مَلْئَك کی طرح) وہی معنی رکھتا ہے جو یونانی لفظ angelos کے ہیں یعنی، فرستادہ، پیام بر۔ قرآن میں یہ اصطلاح، عموماً صیغۂ جمع میں اور لگ بھگ ۹۰ مقامات پر استعمال ہوئی ہے۔ بہت سے فرشتوں کا قرآن نے نام لے کر بھی ذکر کیا ہے۔ مثلاً جبرئیل، میکائیل، ہاروت و ماروت۔ اس کے علاوہ کئی طرح کے فرشتوں کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے کہ جن سے ان کے فرائض یا کارِ منصبی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس زمرے میں جو الفاظ آتے ہیں، ان میں مندرجہ ذیل اسما اور دیگر نام شامل ہیں۔

"تالیات"	(تلاوت کرنے والے)	"سٰبِحٰت"	(تیرنے والے)
"صٰفّٰت"	(صفیں باندھے ہوئے)	"زاجرات"	(ڈانٹنے والے)
"سٰبِقٰت"	(آگے بڑھنے والے)	"نٰشطات"	(چھڑا دینے والے)
"نازعات"	(گھسیٹ لانے والے)	"حافظین"	(حفاظت کرنے والے)
"کراماً کاتبین"	(معزز لکھنے والے)	"ملك الموت"	(موت کا فرشتہ)

"رِضْوَان"	(رضوان)	"حاملین"	(اٹھانے والے)
"مُقَرَّبُون"	(قریب کیے گئے)	"مُدَبِّرَات"	(تدبیر کرنے والے)
"ملقیات"	(ڈالنے والے)	"مُعَقِّبٰت"	(پیچھا کرنے والے)

قرآن میں ان فرشتوں کا ذکر یونہی گذرتے ہوئے ہوا ہے۔ ان کی شرح و وضاحت کے لیے قرآن کی تفاسیر دیکھنا ضروری ہوتا ہے۔ بہرکیف ایک بات شروع سے نظر میں رہنا چاہیے کہ قرآن میں فرشتوں کے بارے میں بہت کچھ بتایا گیا ہے۔

اپنے معاشرے پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ فی زمانہ کم ہی لوگ ایسے ہیں جو فرشتوں کو سنجیدگی سے مانتے ہیں، خواہ اس موضوع پر چلتی ہوئی کتابوں کی تعداد بڑھتی ہی کیوں نہ جا رہی ہو۔ عیسوی الٰہیات کے بہت سے ماہرین تو اس انداز میں سوچتے ہیں، گویا فرشتوں کا معاملہ پرانے وقتوں کی توہم پرستی کی ایک تلچھٹ ہے یا بہت ہوا تو اسے ایک علامتی چیز کہہ دیا جاتا ہے جواب زائد از ضرورت ہو چکی ہے۔ روایتی مسلمان کے ذہن میں فرشتے ایک ہر دم حاضر و موجود حقیقت ہیں اور جیسے جیسے ایک مسلمان علم و عمل کے وسیلے سے اپنے دین کے بارے میں زیادہ سے زیادہ آگاہی حاصل کرتا ہے، ویسے ویسے فرشتوں پر اس کا اعتقاد بھی پختہ ہوتا جاتا ہے۔ فرشتوں کے وجود کو مانے بغیر تو نماز بھی ادا نہیں کی جاسکتی۔ نماز ختم کرکے نماز پڑھنے والا شخص دائیں جانب منہ موڑ کر کہتا ہے: ''السلام علیکم''، خواہ وہ تنہا ہی نماز پڑھ رہا ہو۔ اس کا سبب یہ ہے کہ رسولِ خدا ؐ نے فرمایا کہ ان فرشتوں پر سلام بھیجنا بھی ضروری ہے جو ہر نمازی کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔

فرشتے ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ خدا کے حضور میں فرشتے ہیں جو اس کا عرش اٹھائے ہوئے ہیں یا جو اس کے عرش کے گرد گھوم کر اس کی حمد و تسبیح کرتے ہیں۔ فرشتے تخلیقِ آدم کے شاہد بنے اور ایک فرشتہ رحمِ مادر میں انسانی جنین کو روحِ انسانی سے بارآور کرتا ہے۔ انسان کا وقتِ آخر آن لگے تو مرنے کے بعد اسے سب سے پہلے جو نظر آتا ہے وہ فرشتے ہی ہوتے ہیں جن میں سے سب سے بڑے فرشتے، یعنی فرشتۂ اجل کا نام عزرائیلؑ ہے۔

فرستادگانِ غیب

فرشتے کرتے کیا ہیں؟ ان کا بنیادی کام ہے پیغام لانا۔ مزید یہ کہ وہ اللہ کے احکامات بجا لاتے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ ہم ''پیغام'' کے لفظ کو اس کے وسیع معنی میں استعمال کریں۔ وہ معنی جو اس کے

عنوان ''مَلَک'' میں مضمر ہیں۔ اسی طرح جیسے ''اسلام'' اور دیگر اہم اصطلاحات کو وسیع معانی میں برتنا ضروری ٹھہرتا ہے۔ پیغام بھی کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ ان میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں ہم عام طور پر پیغام نہیں سمجھتے، مثال کے طور پر فرشتوں کے لائے ہوئے معدودے چند پیغام ہی ایسے ہوتے ہیں جن میں کوئی تحریری یا زبانی صحیفہ دیا جاتا ہے۔ الواح اور کتابیں صرف انبیا کو عطا کی جاتی ہیں۔

اللہ کی کتابیں جو رسولوں کو دی جاتی ہیں، ان کو لانے کا فریضہ ایک خاص فرشتے کے سپرد ہے جس کا نام جبرئیل ہے۔ یہ فرشتۂ وحی ہیں۔ یہاں پھر یہ بات ملحوظ رہے کہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ جبرئیل اللہ کی کتابیں لانے پر مامور ہیں تو اس بات کو نرے لفظی معنی میں نہیں لینا چاہیے۔ صحیفۂ خداوندی کو اس کے وسیع معنی میں سمجھنا ضروری ہے۔ اللہ کی کتاب کلام اللہ یا کلمۃ اللہ ہے جو نوعِ انسانی کو سعادتِ ابدی کی منزل کی راہ دکھانے کے لیے اللہ نے منکشف کیا ہے۔ پس صحیفۂ خداوندی کو عام معنی میں کتاب ہونا لازم نہیں۔ اللہ کا کلام کسی بھی صورت و ہیئت میں ہو، اسے صحیفہ کہا جا سکتا ہے۔

پیامِ خداوندی چونکہ لازماً کتابی شکل میں نہیں ہوتا، لہٰذا ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ کا پیغام صورتِ بشری میں ظاہر ہو۔ قرآن کی جن آیات میں سیدنا عیسیٰؑ اور حضرت جبرئیل کے تعلق کا ذکر ہے، انھیں سمجھنے میں یہ نکتہ معاون ہوسکتا ہے۔ قرآن نے تمام انبیا اور رسولوں میں صرف سیدنا عیسیٰؑ کو ''کلمۃ اللہ'' (اللہ کا کہا ہوا) کے نام سے یاد کیا ہے، اس لیے ان کو صحیفۂ خداوندی سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ نیز فرشتوں کے ایک طبقے کو قرآن نے ''ملقیات'' (ڈالنے والے، Casters) کا نام دیا ہے، کیونکہ وہ لوگوں کو پیغاماتِ خداوندی کا القا کرتے ہیں، ان کے (دل میں) ڈالتے ہیں، چنانچہ فطری سی بات ہے کہ حضرت جبرئیل جو محمد رسول اللہؐ کے لیے قرآن لائے وہی فرشتہ تھے جن کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ نے اپنے کلمہ کو حضرت مریم علیہا السلام کے لیے القا کیا اور یہ جبرئیل ہی تھے جنھوں نے حضرت مریم کو ولادتِ مسیح کی خوشخبری دی تھی۔

فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (۱۹:۱۷)

ہم نے اس کے پاس اپنا فرشتہ بھیجا جو اس کے سامنے پورا آدمی بن کے آیا۔

اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ كَلِمَتُهٗ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ (۴:۱۷۱)

مسیح، عیسیٰ ابن مریم، اللہ کے رسول ہیں اور اس کا کلام جو اللہ نے مریم کی طرف القا کیا اور عیسیٰ ہیں روح اللہ کے ہاں کی۔

فرشتوں کے لائے ہوئے پیامِ ربّانی زیادہ تر کتاب کی بجائے واقعات یا حوادثِ مادی کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ ہم نے پہلے عرض کیا تھا کہ تمام مخلوقات کو کلماتِ الٰہی (اللہ کی بات) قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھیے تو ساری مخلوق اللہ کے بھیجے ہوئے پیغاماتِ الٰہی کے برابر ٹھہرائی جائے گی۔ بالفاظِ دیگر ہر شے اللہ کی ایک نشانی ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر شے ہمیں اللہ کے بارے میں کچھ بتاتی ہے۔ اللہ کی معرفت کوئی بے ترتیب و بے نظام چیز نہیں ہے۔ علم دینے والی ذات خود اللہ کی ہے جس نے یہ نشانیاں اسی غرض سے تخلیق کی ہیں کہ ان کے وسیلے سے اِسے جانا جائے، چنانچہ ''آیت'' یا نشانی کا لفظ جو طبعی مظاہر، صحائفِ خداوندی اور معجزات سبھی کی طرف اشارہ کرتا ہے، اسے ''پیام'' کا قریب قریب مترادف کہا جا سکتا ہے۔

اگر فرشتے اللہ کے پیغام لاتے ہیں تو ان کا کچھ نہ کچھ تعلق اللہ کی نشانیوں سے بھی ہوگا۔ ہر آیت، ہر نشانی، ہر مخلوق کی پشت پر ایک فرشتہ موجود ہوتا ہے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ ہر چیز کا ایک فرشتہ ہوتا ہے اور بارش کے ہر قطرے کے ساتھ ایک فرشتہ اترتا ہے۔ ایسا ہی ہونا بھی چاہیے، کیونکہ اگر فرشتے اللہ کے پیام بر ہیں، اس کے پیغامات لاتے ہیں اور ہر شے اللہ کے پیغامات میں سے ایک ہے تو پھر اس کے سوا کیوں کر ممکن ہوگا؟

خلاصہ یہ کہ ''توحید'' کی روشنی میں اللہ کی آیات پر غور کیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ فرشتے اس مرئی کائنات اور اللہ، یعنی خالقِ کائنات کے مابین وسیلے اور واسطے کا اہم فریضہ انجام دیتے ہیں، لیکن چونکہ فرشتے خود اَن دیکھی مخلوق ہیں، لہٰذا ان کا تعلق غیب کے عالَم سے ہے۔ پس فرشتے وہ آسمانی مخلوق ہیں جو الوہی دنیا اور زمینی دنیا کے بیچ میں ہیں۔

مسلمان مصنّفین نے اس معاملے میں قرآن و حدیث پر جو غور کیا ہے، اس کے نتیجے میں ان کے ہاں فرشتوں کے طبقات یا اقسام کے بارے میں کئی طرح کی درجہ بندی ملتی ہے۔ یہ وہ اقسام ہیں جن سے یہ کائنات معمور ہے۔ ایک مصنف نے، مثلاً چودہ بڑی اقسام یا چودہ طبقے بیان کیے ہیں اور ان میں کوئی باہمی تعلق بھی نہیں دکھایا گیا (مثلاً نمبر شمار دو سے سات تک کے طبقات کو مشترکہ طور پر مقرب فرشتے archangels کہا جا سکتا ہے):

۱- **"اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ"** (۴۰:۷) (جو اُٹھا رہے ہیں عرش)

۲- الروح، جسے بزرگ ترین فرشتہ کہا گیا ہے۔

۳- **اسرافیل،** جو دو مرتبہ صور پھونکیں گے، جب زمانے کا آخری وقت آن لگے گا۔ پہلی صدا پر زمین و آسمان میں جو بھی ہوگا بے ہوش ہو جائے گا۔ دوسری مرتبہ پھونکتے ہی سب لوگ اٹھا کر اپنے رب کے سامنے پیش کیے جائیں گے۔

۴- **جبرئیل،** فرشتۂ وحی

۵- **میکائیل (۲:۹۸)** جو جسم و جان کا رزق فراہم کرتے ہیں۔

۶- **عزرائیل،** موت کا فرشتہ

۷- **کرّو بیان،** جنھیں مخلوق کی کوئی خبر نہیں ہے اور وہ ہر آن مشاہدۂ حق میں غرق رہتے ہیں۔

۸- سات آسمانوں کے فرشتے

۹- محافظ فرشتے۔ "وَ اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۙ کراماً کاتبین" (۸۲:۱۱) ان میں سے دو فرشتے ہر شخص پر مامور ہوتے ہیں، ایک اچھے اعمال لکھتا جاتا ہے جب کہ دوسرا فرشتہ اعمالِ بد درج کرتا ہے۔

۱۰- نگران فرشتے۔ "لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ" (۱۳:۱۱) جو برکات نازل کرتے ہیں اور مخلوق کی خبر لے کر اللہ کی طرف لوٹتے ہیں۔

۱۱- منکر اور نکیر جو قبر میں مردے سے سوال کرتے ہیں۔

۱۲- سفر کرنے والے فرشتے جو دنیا میں گھومتے رہتے ہیں اور وہ جگہیں تلاش کرتے ہیں جہاں لوگ اللہ کی یاد کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے ہوں۔

۱۳- ہاروت و ماروت، دو فرشتے جو اہلِ بابل پر نازل کیے گئے تھے اور انھیں جادو سکھاتے تھے۔

۱۴- وہ فرشتے جو عالمِ ہستی کی ہر شے پر مامور کیے گئے ہیں، نظام برقرار رکھتے ہیں اور فساد سے بچاتے ہیں۔ ان کی تعداد کا علم صرف اللہ کو ہے۔[۱۹]

نور

رسول خداؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو نور سے پیدا کیا ہے۔ ''النور'' اللہ کا ایک نام ہے اور قرآن میں آیا ہے کہ "اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" (۲۴:۳۵) (اللہ ہی زمین و آسمان کی روشنی ہے)۔ فرشتے کیا ہیں؟ یہ سمجھنا ہو تو یہ جاننا ہوگا کہ نور کیا ہے؟ نور کو طبعی، مادی چیز کے طور پر لینا چنداں سود مند نہ ہوگا۔ اس کے بجائے اس بات پر غور کیجیے کہ جب ہم نور یا روشنی کا مشاہدہ کرتے ہیں تو کیا کیا نشانیاں ہمارے سامنے آتی ہیں۔

نور کو عام طور پر مرئی یا دکھائی دینے والی چیز سمجھا جاتا ہے جب کہ اصل میں نور غیر مرئی ہے۔ نور تبھی نظر آتا ہے جب اس میں تاریکی کی آمیزش ہو۔ تیرگی اگر نہ ہو اور صرف نور ہی ہو تو اس کی شدت سے نظر چندھیا کر رہ جائے گی۔ ذرا غور کیجیے کہ سورج ۹۳ ملین میل کے فاصلے پر ہے اور اس پر ہم زمین کے گرداگرد پھیلی فضا کو چیر کر نگاہ ڈالتے ہیں، اس کے باوجود سورج پر نظر جما کر دیکھیے تو کیا گذرتی ہے؟ اس فضا سے باہر نکل جائیں اور سورج سے صرف چند میل اور قریب ہو کر اسے دیکھنے کی کوشش کریں تو شاید ایک نگاہِ غلط ڈالنے کے خمیازے کے طور پر بینائی سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ یہ نور جسے ہم مرئی کہتے ہیں یہ تو ایک دھندلی سی چیز ہے۔ سورج کی کھری، اَن چھنی روشنی سے اس کا کیا مقابلہ۔ نورِ ربّانی کی تو بات ہی نہ کیجیے جس کے پرتو سے یہ ساری کائنات روشن ہے، اس لیے اسلام میں کہا گیا ہے اللہ کا نور اتنا تابندہ و درخشاں ہے کہ اس نے لوگوں کی نگاہ خیرہ کر رکھی ہے۔

خدا کو کسی نے دیکھا نہیں، فرشتے اَن دیکھی مخلوق ہیں اور نور غیر مرئی ہے۔ سو اس میں تعجب کیا کہ اگر اللہ اور فرشتے نور ہیں۔ آپ اعتراض اٹھا سکتے ہیں کہ ہم ہر طرف نور کی چمک دیکھتے ہیں، مگر ہم نے خدا یا فرشتے تو کبھی نہیں دیکھے۔ کیا واقعی؟ ''توحید'' کا مطلب ہے کہ آیاتِ ربّانی اللہ کی تنویر کے سوا اور کچھ نہیں ہیں اور ساری مخلوق اللہ کی قوتِ تخلیق کے خارجی آثار ہیں اور بس۔ ''اللہ زمین و آسمان کا نور ہے'' اور زمین و آسمان اسی نور کے پرتو یا اسی کی دمک اور ضوفشانی ہیں۔

نور غیر مرئی ہے، لیکن اس شے کے بنا ہم کچھ بھی دیکھنے کے قابل نہیں، سو نور کی تعریف یہ ٹھہری کہ نور وہ غیر مرئی شے ہیں جو دوسری اشیا کو مرئی بنا دیتی ہے۔ اسی طرح خدا اور فرشتے غیر مرئی ہیں، لیکن یہ نہ ہوں تو کائنات بھی نہ ہو۔ پس خدا اور فرشتوں کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ وہ اَن دیکھی چیزیں جو اس کائنات کو مرئی بنا دیتی ہیں۔

نور کا اُلٹ ہے ظلمت یا تاریکی۔ تاریکی محض نور کا غیاب ہے۔ دوسرے الفاظ میں نور ایک شے ہے، مگر تیرگی لاشَی۔ ہم دنیا کی اشیا اس لیے دیکھ پاتے ہیں کہ ان میں ایک لاشَی کو شے سے آمیخت کیا گیا ہے۔ اگر صرف نور ہی ہوتا یا صرف ظلمت اور تیرگی ہی ہوتی تو ہم کچھ نہ دیکھ پاتے۔ جب روشنی و تیرگی یکجا ہوں، تبھی کچھ سجھائی دیتا ہے، تبھی نظر اپنا کام کرتی ہے۔

اللہ نور ہے۔ نور کا متضاد تاریکی ہے جو کچھ بھی نہیں، نرا عدم ہے۔ بالفاظِ دیگر عالَمِ ہستی میں اللہ کا کوئی حقیقی متضاد نہیں ہے، اس لیے عدم صحیح معنی میں کوئی چیز نہیں ہے۔ اگر کچھ ہے ہی نہیں تو اُلٹ اور

متضاد کی بحث کیا؟ یہ درست ہے کہ لاشَی کو شے کا اُلٹ کہا جاتا، لیکن یہ لاشَی اپنا وجود نہیں رکھتی، یہ صرف ایک لفظ ہے، ایک مجازی اسلوبِ بیان ہے یا پھر یکے از مفروضات جسے شرح و بیان اور بحث مباحثہ کی غرض سے قبول کرلیا گیا ہو۔

تو پھر مخلوق کیا ہے، نور یا تاریکی؟ جواب ظاہر ہے کہ یہی ہوگا کہ نور اور تاریکی دونوں، یا پھر یہ کہ نہ نور نہ تاریکی۔ مخلوق اگر صرف نور ہی ہوتی، تو مخلوق نہ رہتی، خدا ہو جاتی اور اگر مخلوق نِری تاریکی ہی ہوتی تو اس کا وجود ہی نہ ہوتا۔ پس ساری مخلوق ایک ایسی ارضِ وہم وگمان میں بستی ہے جو نہ نور ہے نہ تیرگی۔

تشبیہ کے اعتبار سے مخلوقات نور ہیں، جب کہ تنزیہ کے لحاظ سے انھیں تاریکی کہا جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں جس حد تک خلق کو حق سے مشابہت ہے، وہ نورانی ہے اور جس حد تک مخلوق اپنے خالق سے مشابہ نہیں ہے، تاریک ہے۔ کچھ نہ کچھ نورانیت تو مخلوق میں ہونا ضروری ہے ورنہ اسے وجود ہی سے محروم ہونا پڑے گا۔

تیرگی میں بسر کرنا خدا سے دوری میں بسر کرنا ہے (مراد ہے اضافی تاریکی، کیونکہ تیرگیِ مطلق تو ہو ہی نہیں سکتی)۔ تیرگی کا مطلب ہے اللہ کی صفاتِ جلال وقہر کا غلبہ جو چیزوں کو اللہ سے دور رکھتی ہیں۔ نور میں ہونا خدا کے قرب میں زندگی کرنا ہے، اس کا مطلب ہے اللہ کی صفاتِ جمال ورحمت کا غلبہ، وہ صفات جو ہر چیز کو اللہ سے قریب لے آتی ہیں۔

نور ایک ہی ہے، نورِ خداوندی۔ تاریکیاں بہت سی ہیں کہ ہر مخلوق اللہ کی نسبت سے تاریکی ہی کی نمایندہ ہے۔ تاریکی جتنی گہری ہوگی، اللہ سے فاصلہ اسی قدر زیادہ ہوگا۔ مطلق تاریکی کا کہیں وجود نہیں، کیونکہ اس کا مطلب ہے اللہ سے ہر طرح منقطع ہو جانا۔ کسی شے کو جامۂ وجود حاصل ہی کیوں کر ہوگا، اگر الحق سے اس کا سرے سے تعلق ہی نہ ہو، کیونکہ وہی تو ہر صفت اور وصف کا منبع وماٴخذ ہے۔

خلق کی ہوئی اشیا کا مسکن اللہ سے دوری ہے، مختلف ہے، غیریت ہے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ اضافی تاریکی مخلوقات کا مسکن ہے۔ اضافی تاریکی کی کتنی ہی شکلیں ہیں، کئی طرح کے اسلوب ہیں، کیونکہ مخلوقات اللہ سے بے شمار طریقوں سے مختلف ہیں اور مختلف ہونے کے یہ انداز ان گنت ہیں۔ "لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ" اس جیسی کوئی شے نہیں ہے، لیکن ہر شے کا اللہ سے مشابہ نہ ہونے کا انداز جدا ہے اور اسی شے سے خاص ہے۔

شے کا مسکن اگر ''اختلاف اور جدائی'' ہو تو اس کا مطلب ہوگا کہ اللہ کو بہ لحاظِ تنزیہ سمجھا جا رہا ہے اور نتیجتاً غلبہ ہے صفاتِ قہر و جلال و غضب کا۔ دین کا مقصد ہے ''تنزیہ'' سے ''تشبیہ'' کی جانب سفر، دوری سے قربت کی طرف حرکت، اختلاف سے یگانگت اور کثرت سے وحدت کی جانب رجوع، غضب سے پلٹ کر رحمت کی سمت آنا، تاریکی سے نکل کر روشنی میں واپسی۔

قرآن میں بارہا اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ عالمِ خلق میں اللہ کا مقصدِ تخلیق وحدت پیدا کرنا ہے اور اس چیز کے بیان کے لیے قرآن نے اکثر نور اور ظلمت کی اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ ان آیات کی معنویت اور معانی کی وسعت تب واضح ہوتی ہے جب ہم توحید کے معانی کو گرفت میں لاتے ہیں۔ درج ذیل آیات پڑھتے ہوئے غور کیجیے کہ ان میں ہر جگہ نور ایک ہے، کیونکہ نور اللہ کی صفات میں سے ایک ہے جب کہ ظلمتیں متعدد ہیں، اس لیے کہ ظلمت ایک ایسی صفت ہے جو مخلوقات کی کثرت کے لحاظ سے کتنی ہی صورتیں اختیار کر لیتی ہے۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ اَمْ هَلْ تَسْتَوِى الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ (١٣:١٦، ٣٥:٢٠)

ذرا پوچھیے، کیا اندھا اور بینائی والا یکساں ہوں گے؟ یا کہیں اندھیرے اور اُجالا برابر ہوئے ہیں؟

هُوَالَّذِىْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (٥٧:٩)

وہی ہے جو اپنے بندے پر صاف صاف آیتیں اتارتا ہے تاکہ تمھیں اندھیرے سے اُجالے میں نکال لائے۔

اَفَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِىْ بِهٖ فِى النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِى الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا (٦:١٢٢)

ایک شخص مردہ ہو، پھر ہم اس کو زندہ کر کے روشنی دیں جسے لیے وہ لوگوں میں پھرتا ہے۔ بھلا یہ شخص اس کے برابر ہے جس کا حال یہ ہے کہ اندھیروں میں پڑا ہے، نکل نہیں سکتا۔

هُوَالَّذِىْ يُصَلِّىْ عَلَيْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (٣٣:٤٣)

وہی ہے جو تم پر اپنی رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی تاکہ تمھیں اندھیروں سے اجالے میں نکال لے۔

آخری آیت میں بات پھر فرشتوں کے موضوع پر لوٹ آتی ہے جو نور سے تخلیق ہوئے ہیں اور اسی لیے ان میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ مرئی دنیا کے ساکنوں، اس دنیا کی مخلوق میں اللہ کی طرف سے نور بانٹ سکیں۔

فرشتوں کی نورانیت

اللہ نور ہے۔ اللہ کے نورِ مطلق کا اُلٹ ظلمتِ مطلقہ یا مطلق تاریکی ہے جس کا وجود ہو نہیں سکتا، کیونکہ اللہ سے باہر کوئی حقیقت ایسی نہیں ہے جو ظلمتِ مطلقہ کو جامۂ ہستی عطا کر سکے۔

فرشتے ''زائیدگانِ نور'' ہیں، اسی لیے وہ اللہ سے مختلف ہیں جو نورِ غیر مخلوق ہے۔ فرشتوں کے نور کا متضاد ہو سکتا ہے، ظلمتِ مخلوقہ۔ یہ ظلمت، یہ تاریکی ظلمتِ مطلقہ نہیں ہے ورنہ اس کا وجود ہی نہ ہوتا، نہ اسے ایک تخلیق کردہ شے کہا جا سکتا ہے۔ فرشتوں کے نورِ مخلوق کا اُلٹ وہ ظلمت ہوگی جو ظلمت بھی ہو اور ملکوتی بھی نہ ہو، یعنی وہ شے جو فرشتوں کے نور کے مقابلے میں نسبتاً تاریک اور ظلمانی کہی جائے۔

قران نے نورِ مخلوق اور ظلمتِ مخلوقہ دونوں کا ذکر مندرجہ ذیل آیت میں کیا ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ (۶:۱)	سب تعریف اللہ کو جس نے زمین و آسمان بنائے اور ٹھہرایا اندھیرا اور اُجالا۔

غور فرمایئے کہ اس آیت میں خلق کردہ نور کا ذکر صیغۂ واحد میں کیا گیا ہے۔ اس سے اشارہ اس نکتے کی طرف ہے کہ آخرالامر ''لا نور الا اللّٰہ'' (اللہ کے سوا نور اور کوئی نہیں)۔ ہر نور اللہ ہی کے نور کی ضوفشانی ہے، پس سب نور آخر میں ایک ہی ہیں۔ اس کے برعکس ظلمتیں بہت سی ہیں، کیونکہ کائنات کی اشیا جس جس طرح اللہ سے مختلف اور اللہ سے دور ہوں گی، اتنی ہی طرح کی ظلمتیں بھی سامنے آئیں گی۔

اَن دیکھے، نورِ غیر مخلوق (اللہ) کا کوئی متضاد نہیں۔ نورِ مخلوق بھی غیر مرئی تو ہے، مگر اس کا ایک اُلٹ بھی ہے، یعنی ہر وہ شے جسے آنکھوں سے دیکھا جا سکے۔ آپ کہیں گے کہ سورج کی روشنی بھی تو آنکھوں سے دیکھی جاتی ہے۔ تو کیا اسے ظلمت کہا جائے گا؟ جواب اثبات میں ہے اور نفی میں بھی۔ نورِ ملکوتی سے مقابلہ کیجیے تو اسے ظلمت کہیں گے، مادی اشیا کے مقابل رکھیے تو نور قرار دیں گے۔ یاد رہے کہ مطلق صرف اللہ ہی کی ذات ہے جو نورِ مطلق ہے۔ جب بات عالمِ تخلیق کی ہو تو ہر شے اضافی ہوگی۔ دوسری مخلوقات کے مقابلے میں فرشتے نورانی ہیں، لیکن اللہ کے سامنے ظلمانی ہو جائیں گے۔ ایک ستارے کے مقابلے میں چاند کتنا چمک دار ہوتا ہے، لیکن سورج کے سامنے تاریک ہو جاتا ہے۔

فرشتوں کا نور اور طبعی روشنی الگ الگ چیزیں ہیں، تاہم ان میں بعض اوصاف مشترک ہیں۔ نور سے ظلمت دور ہو جاتی ہے، پرچھائیاں اور چھپی ہوئی چیزیں ختم ہو جاتی ہیں، نور روشن کرتا ہے، اجال

دیتا ہے، درخشاں وتابندہ ہوتا ہے، پردے اٹھاتا ہے، انکشاف کرتا ہے۔ نورِ مَلکی اور نورِ جسمانی ہر دو یہ سب کچھ کرتے ہیں، لیکن یہ دونوں اضافی طور پر بعض اہم باتوں میں مختلف بھی ہیں۔ نورِ مادی یا نورِ طبعی میں زندگی نہیں، جب کہ نورِ فرشتگاں ذی حیات ہے۔ نورِ جسمانی روشن کرتا ہے، مگر نورِ فرشتگاں منور کرنے کے ساتھ علم بھی عطا کرتا ہے۔ چراغ روشن کرنا ایک بات ہے اور فرشتے کا ظاہر ہو کر علم عطا کرنا ایک دوسری چیز ہے جیسا کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جبریئل کے ذریعے قرآن عطا ہوا۔ علم نور ہے اور قرآن "نور مبین" (۱۷۴:٤) (کھلی واضح روشنی)۔ یہاں علم بطور معلومات یا اطلاعات کا ذکر نہیں، علم بطور آگہی مراد ہے۔ جب مہاتما بدھ کو نروان ہوا اور وہ نورِ علم تک پہنچے تو انھیں روشنی نظر آئی، مگر یہ روشنی چراغوں کی بے جان اور بے دمک روشنی نہیں تھی، نورِ ماہتاب بھی نہیں، ضیائے آفتاب بھی نہیں۔ اسلامی اصطلاح میں کہیے تو یوں بیان ہوگا کہ مہاتما بدھ نے دیدِ دوست کا مرتبہ پایا تھا، خود "النور" کا مشاہدہ کیا تھا، وہ جو حیات، آگہی، اور علم وشادمانی کا منبع ومصدر ہے۔

ہم نے عرض کیا کہ خلق کردہ نور کا متضاد ہے خلق شدہ ظلمت۔ اگر نور وظلمت اضافی چیزیں ہیں تو مخلوقات میں سے ہر شے نور بھی ہے اور ظلمت بھی۔ انحصار اس بات پر ہے کہ آپ کس نقطۂ نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ اللہ کے مقابل رکھیے تو فرشتہ بھی ظلمت ہے اور عدم سے مقابلہ کیجیے تو پتھر بھی نورانی ہے۔ کائنات کی ہر شے نور بھی ہے اور ظلمت بھی اور اس بات کا "تشبیہ وتنزیہ" سے براہ راست تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ "النور" ہے۔ اگر ہم اسے بے انتہا دور اور مخلوق سے بالکل غیر مشابہ، منزہ جانیں تو پھر ہر شے ظلمت قرار پائے گی، مگر خدا اگر قریب بھی ہے اور مخلوق کو اس سے تشبیہ بھی ہے تو پھر ہر شے نورانی ہے۔[۲۰]

کائنات کی ہر چیز کی حیثیت میں یہی دورخا پن، یہ ابہام ہے۔ اسلامی روایات میں اس کا بیان کئی طرح کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر نبی علیہ السلام نے فرمایا: "**إِنَّ الدُّنْيَا مَلْعُوْنَةٌ مَلْعُوْنٌ مَا فِيْهَا إِلَّا ذِكْرُ اللهِ**"[۲۱] (یہ دنیا ملعون ہے، اس کی ہر چیز ملعون ہے سوائے اللہ کے ذکر کے)۔ ذکرِ خدا کے بارے میں مختصراً اتنا کہنا کافی ہے کہ ہر وہ چیز "ذکر" ہے جو انسان کو اللہ کی یاد دلائے، ہر وہ کوشش، ہر وہ عمل ذکر ہے جو یادِ خدا کو ذہن میں اجاگر کرنے کی غرض سے کیا جائے۔

یہ حدیث اس بات کا بیان ہے کہ اللہ کے سوا ہر شے کی، ہر چیز کی جس کا انسان کو دنیا میں تجربہ ہوتا ہے، کوئی مثبت حیثیت نہیں ہے، اس کی ذات میں کوئی خوبی اپنی نہیں ہے، کیونکہ یہ ظلمت ہے۔ اشیائے کائنات جس حد تک ظلمت ہیں، اس حد تک انسان کو ان سے دل لگانے سے بچنا چاہیے، تاہم

کائنات کی سب اشیا نور بھی ہیں، یعنی اگر انسان انھیں اللہ کی نشانی، اس کی آیات سمجھے اور ان کی اس معنویت کو "توحید" کی بنیاد بنائے تو اس اعتبار سے ان کو نورانی کہا جائے گا۔ یہ حدیث قرآن مجید کی ان آیات کی وجودی اور شخصی معنویت کی شرح و وضاحت کرتی ہے:

وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (۲:۲۲۱) — اور اپنی آیتیں لوگوں کے لیے واضح کرتا ہے تاکہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔

هٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا، قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ (۶:۱۲۶) — اور یہ ہے تیرے رب کی سیدھی راہ۔ ہم نے کھول دیں نشانیاں دھیان کرنے والوں کے لیے۔

اگر لوگ بانگ اللہ کی آیات کو نورِ ربّانی کی تابانی کے طور پر دیکھنے سے قاصر ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حقیقت سے ان کا رابطہ کٹ گیا ہے۔ ان کے لیے یہ دنیا تیرگی کا مسکن اور جائے لعنت ہے، کیونکہ اس سے اللہ کا پتا نہیں ملتا، یعنی یوں کہیے کہ یہ دنیا الحق سے منقطع ہو چکی ہے۔ اگر دنیا سے لوگوں کو توحید کا سبق نہ ملے تو باقی صرف شرک ہی رہ جاتا ہے۔

آیئے! اب ذرا فرشتوں کی طرف واپس چلیں۔ قرآن میں بہت سی جگہ ان کا ذکر اس طرح آیا ہے کہ ان کی ماہیت کے بارے میں اس سے اشارے اخذ کیے جا سکتے ہیں، لیکن قرآن کی آیات پر جب تک غور و تدبر نہ کیا جائے، ان اشارات کے معانی اجاگر نہیں ہوتے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل آیت لیجیے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ط يَزِيْدُ فِى الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ (۳۵:۱) — سب خوبی اللہ کو ہے جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے، جس نے بنائے فرشتے پیغام لانے والے، جن کے پر ہیں، دو دو، تین تین اور چار چار۔ وہ خلق میں جو چاہے بڑھاتا ہے۔

سو پتا چلا کہ فرشتوں کے پر ہوتے ہیں۔ اسلامی مصوری میں یا دیگر فنون میں اور اسی طرح عیسوی فنونِ لطیفہ میں بھی فرشتوں کو دو پروں والا دکھایا گیا ہے۔ ان کی تصویرکشی چار پروں کے ساتھ کرنا بھی کوئی ایسا مشکل نہیں، کیونکہ ہمارے سامنے تتلیوں اور دیگر اڑنے والے کیڑوں کی مثال موجود ہے، لیکن تین پروں والے فرشتے کی تصویر کیوں کر بنے گی؟ پھر یہ بھی معلوم ہے کہ فرشتے کسی بھی ایسی

پرِ دار مخلوق کی مانند نہیں ہیں جو روزمرہ زندگی میں ہمارے تجربے میں آتی ہے۔

پہلا سوال تو یہ ہے کہ آخر فرشتوں کو پروں کی حاجت کیا ہے؟ بظاہر تو یہ کہا جائے گا کہ پرواز کے لیے۔ اگر وہ خدا کے فرستادہ ہیں، اس کے پیامبر کے طور پر کام کرتے ہیں اور خدا کی تصویر ہمارے ذہن میں ایک بے انتہا دور دراز کے فاصلے پر مقیم ہستی کی ہے جسے اپنا پیغام ہم تک بھجوانا ہوتا ہے، تو پھر تو فرشتوں کو آمد و رفت کے لیے پرِ پرواز درکار ہوں گے۔ یہ امر کہ ان کے بال و پر ہیں، ہمارے لیے اس بات کا اشارہ ہے کہ ان کی حرکت ہم انسانوں سے بہت تیز ہے، کیونکہ ہمیں صرف پاؤں دیے گئے ہیں، پر نہیں۔

اس آیت کے معنی کی کچھ اور تہیں بھی ہیں۔ ایک پرندے یا کیڑے کو پروں کی ضرورت اس لیے رہتی ہے کہ اس کا وزن ہے اور اوپر اٹھنے کے لیے پر درکار ہیں۔ پر نہ ہوں تو وہ زمین سے بلند نہ ہو سکے گا۔ جب اسے زمین پر اترنا ہو تو وہ پر ہلانا بند کر دیتا ہے اور ہوا میں تیرتا ہوا نیچے اتر آتا ہے، مگر فرشتے تو نورانی ہیں، آسمان پر اللہ کے جوار و قرب میں سکونت رکھتے ہیں، وہ اپنی فطرت میں ہی اللہ سے قریب ہیں۔ انھیں پرندوں کی طرح اڑ کر اوپر جانے کے لیے پروں کی ضرورت نہیں۔ وہ اڑ کر نیچے اترنے کے لیے پر رکھتے ہیں۔ اپنا پیغام دے کر وہ اپنے قدرتی مسکن کی جانب تیرتے ہوئے لوٹ جاتے ہیں۔

اسلامی فلسفے کے اندازِ بیان کو استعمال کریں تو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ''بال و پر'' اشارہ ہے فرشتوں کی قوتوں یا ان کے ملکہ و صلاحیت کی طرف جن کے وسیلے سے وہ اپنے تفویض کردہ فرائض انجام دیتے ہیں۔ فرشتے بہت سی قسموں کے ہیں۔ ان میں سے کچھ کے ذمے سادہ سے معاملات ہیں، جب کہ دوسروں کے سپرد زیادہ پیچیدہ امور کیے گئے ہیں۔ اپنے علم اور اپنے کام کی مناسبت سے ان کے لیے کم از کم دو ''پر'' درکار ہیں، لیکن ان کے کام کو کئی انواع میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یاد کیجیے کہ مذکورہ بالا آیت کیا کہہ رہی ہے: ''**یزید فی الخلق مایشاء**'' (وہ خلق میں جو چاہے بڑھا دیتا ہے)۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کے پروں میں ان کے فرائضِ منصبی کے لحاظ سے اضافہ کر دیتے ہیں۔ اس کی تائید میں وہ اس حدیث کا حوالہ دیتے ہیں جس میں رسولِ خداؐ نے فرمایا کہ آپؐ نے جبرئیل کو سات سو پروں کے ساتھ دیکھا۔ اللہ کے سب سے اہم فرشتے کے فرائض کتنے ہوں گے۔ سات سو کا عدد اس کی معنویت سمجھانے کے لیے کافی ہے۔

طین [آدمِ خاکی، Clay]

قرآن میں گندھی مٹی (طین، Clay) کا لفظ جس طرح استعمال ہوا ہے، اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اسے بھی ''ظلمت'' کی طرح نور کا متضاد سمجھا جا سکتا ہے۔ طین (clay) آب وگل کے آمیزے کا نام ہے۔ فرشتے نور سے تخلیق ہوئے جب کہ انسانی قالب گارے سے بنایا گیا۔ یہاں اگر آپ آج کی جدید اصطلاح میں یہ سمجھیں کہ قرآن نے ایک طرح سے سائنسی معلومات پیش کی ہیں تو کہا جا سکتا ہے کہ مراد یہ ہے کہ انسانی بدن غذا سے نمو پاتا ہے اور انسانی غذا بنیادی طور پر پانی اور مٹی ہی ہے جو نباتات اور حیوانات کے ذریعے سے ہم تک پہنچتی ہے، چنانچہ جسم مٹی ہے۔ یہ درست ہے کہ قرآنی تعلیمات کا ایک مفہوم یہ بھی ہے، لیکن بات فقط اتنی ہی تو نہیں ہے۔ ہمیں یہ پوچھنا لازم ہے کہ قرآن اور اسلام کے تصورِ کائنات میں مٹی اور پانی سے، آب وخاک سے عموماً کیا مراد لیا گیا اور یہ بھی کہ گِل کے معنی کیا ہیں، کیونکہ گِل یا گندھی ہوئی مٹی، آب وخاک کے آمیزے کا نام ہے۔[۲۲]

صفات پر نظر کرنے سے ہمیں اشیا کی ماہیتِ ذات کا سراغ ملتا ہے۔ گارے کی صفات مٹی پانی کی صفات ہیں۔ اس پر مستزاد وہ اضافی چیز جو ان کو آمیخت کرنے سے ظاہر ہوتی ہے۔ مٹی بھاری ہے، ظلمانی ہے، خشک ہے اور اسے لامتناہی حد تک تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پانی بھی بھاری تو ہے، مگر اس میں روشنی نفوذ کر سکتی ہے۔ پس یہ اتنا تاریک نہیں ہے جتنا کہ مٹی۔ پانی کو بھی آپ جتنا چاہیں تقسیم کرتے جائیں، تاہم طبعی طور پر پانی ایک جسدِ واحد کی طرح ہوتا ہے۔ اگر آپ پانی اور مٹی کو ملا دیں تو ان کا آمیزہ ایک ایسی چیز ہوگا جو بھاری اور تاریک تو ہے، لیکن اس میں روشنی قبول کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے، کیونکہ اس میں پانی موجود ہے۔ نیز یہ آمیزہ جڑا ہوا یکجان رہتا ہے، خاص طور پر اگر اسے آگ میں پکا لیا جائے۔ قرآن کی ایک آیت میں کہا گیا ہے:

خَلَقَ الِانْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ (۵۵:۱۴) — اس نے آدمی کو بنایا کھنکھناتی مٹی سے جیسے ٹھیکرا۔

مٹی اور پانی کی مختلف خصوصیات ان اشیا میں ظاہر ہوتی ہیں جو گارے سے بنائی جاتی ہیں، مثال کے طور پر جسمانی یا مادی چیزیں رنگا رنگ کی ہوتی ہیں۔ انسان بھی رنگ رنگ کے ہوتے ہیں۔ یہ خصوصیت پانی اور مٹی ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ ذرا مندرجہ ذیل آیت پر غور کیجیے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرَاتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ

تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی اُتارا، پھر ہم نے اس سے رنگ رنگ

بِيضٌ وَحُمْرٌ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَ غَرَابِيبُ سُودٌ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا كَذٰلِكَ (۳۵: ۲۷-۲۸)

کے میوے اُگا دیے۔ اور پہاڑوں میں بھی دھاریاں ہیں سفید اور سرخ، طرح طرح کے ان کے رنگ اور بھجنگ کالی بھی۔ اور آدمیوں، کیڑوں اور چوپایوں میں بھی اسی طرح کئی رنگ کے ہیں۔

بعض اصحابِ رسولؐ نے زمین کے رنگ اور انسانوں کی رنگارنگی میں ایک معنی خیز تعلق کی جانب اشارہ کیا ہے۔ ان سے روایت ہے کہ جب اللہ نے تخلیقِ آدمؑ کا ارادہ کیا تو فرشتہ اسرافیلؑ کو زمین پر بھیجا گیا کہ وہ مٹی میں سے کچھ سمیٹ کر لے آئیں۔ زمین نے اس پر فریاد کی۔ اسے اپنی مٹی کے ذرے سے بھی جدا ہونا گوارا نہ تھا (زمینی مخلوق، خاص طور پر انسان بھی یہی افتادِ طبع رکھتے ہیں۔ انھیں اپنی، اپنے سالم وسلامت رہنے کی بہت فکر ہوتی ہے)۔ زمین نے اسرافیلؑ سے التجا کی اور اس طرح منت سماجت کر کے اپنا سوال کیا کہ انھیں زمین پر رحم آ گیا اور وہ لوٹ کر اللہ تعالیٰ کے پاس گئے۔ عرض کیا کہ زمین کی استدعا کا کیا جواب دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس میں کیا خاص بات ہے۔ کسی اور فرشتے کو بھجوا دیا جائے گا۔ سو حضرت میکائیلؑ کو بھیجا گیا۔ ان کے ساتھ بھی یہی ماجرا پیش آیا۔ وہ بھی خالی ہاتھ لوٹ آئے۔ ان کے بعد حضرت جبرئیلؑ بھیجے گئے، مگر وہی قصہ ہوا۔ آخر میں عزرائیلؑ روانہ کیے گئے اور انھیں خصوصی ہدایات دی گئیں۔ عزرائیلؑ نے زمین پر اتر کر اسے سمجھایا کہ ہم صرف تھوڑی مدت کے لیے ذرا سی مٹی چاہتے ہیں۔ اسے لوٹانے کی ذمہ داری ہم پر ہے۔ میں خود اس کی ضمانت دیتا ہوں کہ یہ خاکِ مستعار تمھیں لوٹا دی جائے گی۔ عزرائیلؑ کی یقین دہانی پر زمین مان گئی۔ پس عزرائیلؑ نے زمین کے چاروں کھونٹ سے ایک ایک مٹھی خاک اٹھا لی، سرخ، سپید، سیاہ اور زرد۔ اللہ تعالیٰ نے اس مٹی میں پانی ملا کر اسے خاکِ آدم کی صورت میں ڈھال دیا۔ انسانوں کے رنگ جدا جدا کیوں ہوتے ہیں۔ بیانِ بالا اسی کے سبب سے ہمیں آگاہ کرتا ہے اور اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ عزرائیلؑ کو موت کا فرشتہ کیوں مقرر کیا گیا ہے۔ انھی کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس خاکِ مستعار کو اس کی اصلی جگہ واپس پہنچائیں۔ اسی کارن انھیں آدمی کی جان نکال کر اس کی مٹی کو واپس مٹی کے مالک تک پہنچانا ہوتا ہے۔[۲۳]

ارواح واجسام

فرشتے نور سے تخلیق ہوئے اوراجسام گندھی ہوئی مٹی سے بنے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ فرشتے وہ نورانی اوراَن دیکھی مخلوق ہیں جو نورِ ربّانی کے ان خواص میں شریک ہیں: حیات،علم،قدرت۔اس کے برعکس مادی اجسام مرئی اور تاریک چیز ہوتے ہیں اور فرشتوں کے مقابلے میں انھیں نورِ ربّانی کے خصائص میں سے کچھ بھی نصیب نہیں ہوا۔مردہ، بےعلم اور کمزور اجسام۔اگر مادی اجسام زندگی سے عاری ہیں تو پھر ہمارے گردوپیش یہ گردشِ اجسام کیا ہے؟ نوعِ انسانی کے بارے میں تو قرآن مجید نے بتادیا کہ خاکِ آدم میں اللہ نے زندگی پیدا کردی کہ اس میں اللہ کی روح میں سے کچھ پھونک دیا گیا تھا:

بَدَاَ خَلْقَ الاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ۰ ثُمَّ سَوّٰہُ وَنَفَخَ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِہٖ(۳۲:۷-۹)

شروع کی انسان کی پیدایش ایک گارے سے، پھر اس کو برابر کیا اور اس میں اپنی جان میں سے پھونکا۔

جسدِانسانی کواس لیے زندگی ملی کہ وہ ذی روح ہے اوراس میں روحِ ربّانی نے حیات آفرینی کی ہے۔یہ روح نہ ہوتی تو جسدِانسانی صرف آب وگِل ہی رہتا۔جب عزرائیلؑ جان نکال لیتے ہیں تو جسمِ انسانی کی اصلیت کھلتی ہے اور جسدِخاکی پھر سے لوٹ کر پیوندِ خاک ہوجاتا ہے۔مسلمان مفکرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ انسانوں کے علاوہ دیگر جانداروں، بلکہ پودوں میں بھی جو یہ زندگی اور ارادہ وخواہش جیسی صفات پائی جاتی ہیں تو یہ روح کی وجہ سے ہیں جسم کی اپنی خاصیتیں نہیں ہیں۔

تو پھر روح کیا ہے؟ اس کے معنی کی طرف ایک اشارہ تو اس عربی لفظ ہی میں موجود ہے۔ ''روح'' کا لفظ اسی مادے سے ہے جس سے''ریح'' (ہوا) کا لفظ نکلا ہے۔ہوا وہ چیز ہے جس کی موجودگی تبھی سامنے آتی ہے، جب اس کے اثرات دوسری چیزوں پر ظاہر ہوتے ہیں۔ ہوا سے درختوں کی شاخیں ہلتی ہیں، ہوا سے مٹی کا غبار اُٹھتا ہے، ہوا کا تھپیڑا چہرے پر لگتا ہے۔ہمیں معلوم ہے کہ ہوا چل رہی ہے، مگر ہم اسے دیکھ نہیں سکتے، صرف اس کے اثرات دیکھتے یا محسوس کرتے ہیں۔ اسی طرح روح کو بھی دیکھا تو نہیں جاسکتا، تاہم وہ اپنے آثار واثرات سے انسان کو اپنا پتا دیتی ہے۔ آب وگِل کے ایک بدن میں زندگی کے سب آثار کا ظہور ہوجاتا ہے۔سوئے ہوئے انسان کا بدن یا مردے کا جسم دیکھنے کو تو ایک سا ہی لگتا ہے، لیکن ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے اور یہ فرق اسی اَن دیکھی چیز کی وجہ سے ہے جسے ''روح'' کہتے ہیں۔

ارواح بھی فرشتوں کے مانند ہیں۔ قرآن نے اس نکتے کو یوں واضح کیا ہے کہ اس میں کئی جگہ حضرت جبرئیل کو ''روح القدس'' [۲۴] کہا گیا ہے۔ ''الروح'' [۲۵] کا ذکر بھی آیا ہے جسے مفسرین نے بزرگ ترین فرشتہ بتایا ہے۔ اکثر علما کا خیال ہے کہ فرشتے بھی ایک نوع کی روح ہیں، لیکن روح کے معانی وسیع تر ہیں، کیونکہ ہر روح فرشتہ نہیں ہوتی۔ ارواح اور فرشتوں میں جو فرق ہے، اسے واضح کرنا ہو تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہر روح کسی بدن سے متعلق ہوتی ہے، لیکن ہر بدن کا مواد ایک جیسا نہیں ہوتا۔ اگر روح کسی ایسے جسم سے متعلق ہے جو نور سے تخلیق ہوا تو روح اور جسمِ نورانی کے اس مجموعے کو فرشتہ کہا جائے گا، لیکن اگر روح کا قالب خاک سے بنایا گیا ہے تو پھر وہ کسی انسان یا حیوان کی روح ہوگی۔ بعض علما نے کہا ہے کہ نباتات اور بے جان اشیا میں بھی روح ہوتی ہے، جب کہ کچھ حضرات کی رائے میں ان اشیا پر خاص فرشتے متعین کیے جاتے ہیں۔ جو بھی ہو، یہاں نکتے کی بات یہ ہے کہ مادی اشیا اس وقت تک اپنی ہستی برقرار نہیں رکھ سکتیں جب تک ان کے اور خدا کے درمیان کوئی حقیقتِ روحانی واسطے کا کام نہ کرے۔

روح کا بنیادی کام بدن کو چلانا اور اس پر حکومت کرنا ہے۔ کوئی مادی جسم روح یا فرشتے کے بغیر باقی نہیں رہ سکتا کہ اسی سے مادی اجسام کو جماؤ اور ربطِ باہم میسر آتا ہے، اسی سے ان کی سالمیت ہے۔ مادی اجسام بنے تو بہرحال مٹی ہی سے ہیں اور مٹی آسانی سے بکھر جاتی ہے۔ اس کی ذات میں خود سے وحدت نہیں پائی جاتی۔ آگ سے پکی ہوئی مٹی ٹھوس لگتی ہے، لیکن ایک ضرب اسے ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔ اس کے برعکس روحیں نور سے تخلیق پاتی ہیں۔ نور جس کی حقیقت ایک ہے، یعنی تنویرِ ربانی، ظہورِ خداوندی۔ نور صرف ایک ہے جیسا کہ قرآن نے بارہا کہا ہے۔ ظلمتیں، تاریکیاں، البتہ بہت سی ہیں۔ یہ ''بہت سی'' جو ہیں وہ خود کو جوڑ کر نہیں رکھ سکتیں، کیونکہ ان میں وحدت پیدا کرنے والی حقیقت نہیں پائی جاتی۔

قرآن میں ایسے اشارات ہیں جن سے خیال ہوتا ہے کہ کائنات کے نظام کے ہر درجے میں خاص خاص ارواح کی عمل داری ہے، ہر مرتبۂ کائنات کا انتظام کچھ مخصوص ارواح کا کام ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیے کہ انسانی روح کے بارے میں واضح ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنی روح میں سے جسدِ انسانی میں پھونکتے ہیں تو انسانی روح وجود میں آتی ہے۔ اسی انسانی روح سے بدن کے اعضا، خلیات اور دست و بازو کا مجموعہ ایک کلیّت بنتا ہے، ثابت و سالم رہتا ہے، لیکن اجزائے بدن میں سے سبھی کو

ایک طرح کی آزادی میسر ہے جو اعضائے بدن کی الگ الگ ارواح کی وجہ سے باقی رہتی ہے۔

اعضائے بدن کی اس آزادی کی جانب قرآن نے کئی آیات میں اشارہ کیا ہے، ان آیات میں یومِ قیامت کا ذکر ہے، جب لوگوں سے ان کے اعمال کے بارے میں سوال ہوگا جو وہ دنیا میں کرتے رہے۔ یہ ایک فیصلہ ہوگا، جیسے عدالت کا قانونی فیصلہ ہوتا ہے۔ اس کے لیے گواہ طلب کیے جائیں گے۔ شہادت دینے والوں میں فرشتے ہوں گے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ بدن کے اعضا و جوارح بھی اپنے مالک کے خلاف یا حق میں شہادت دیں گے۔ اس سے یہ نظر آتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو ایک طرح کی خودمختاری حاصل ہے اور اسلام کے حوالے سے اس نکتے کی توجیہ اس وقت تک نہیں ہوسکتی تا آں کہ ہر عضوِ بدن کی اپنی الگ روح نہ مانی جائے جو اس کے لیے تدبیر کنندہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۲۴-۲۳:۲۴)

اور ان کے لیے ایک بڑا عذاب ہے، اس دن جس دن ان کی زبانیں، ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان کے سامنے بتائیں گے وہ سب کچھ جو وہ کرتے رہے تھے۔

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰى اَفْوَاهِهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ وَاَلْسِنَتُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْن (۶۵:۳۶)

آج ہم مہر کر دیں گے ان کے منہ پر، اور بولیں گے ہم سے ان کے ہاتھ، اور ان کے پاؤں ان کے سامنے بتائیں گے جو کچھ وہ کرتے رہے۔

سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ تمام ارواح الگ الگ بھی ہوں اور ساتھ ہی ان کو بڑی ارواح نے اکٹھا بھی کر رکھا ہو۔ اس سوال کا ایک جواب اس طرح دیا جاتا ہے کہ نفسِ انسانی میں جو نشانیاں اور علامات ہیں ان پر غور کیجیے۔

وَفِى الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِلْمُوقِنِيْنَ وَفِىْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (۲۱-۲۰:۵۱)

اور زمین میں بھی نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے لیے، اور خود تمھارے اندر بھی۔ کیا تم کو سجھائی نہیں دیتیں؟

اس ساری کائنات کو اگر ایک کتاب سے تشبیہ دی جاتی ہے تو انسان کو بھی کتاب سے مشابہ کیا جا سکتا ہے جو حروف، الفاظ اور فقروں وغیرہ سے مل کر بنی ہے۔

بدن کے ہر خلیے کو ایک حرف کہیے۔ اب یہ دیکھیے کہ ہر حرف کی ایک مخصوص شکل ہوتی ہے جس سے وہ ایک معنی کا اظہار کرتا ہے۔ حرف کوئی اٹکل پچو لکیر نہیں ہوتا۔ حرف کی روح اس کی صورت گری کرتی ہے۔ اس سے اگلی سطح پر، حروف مل کر لفظ بناتے ہیں اور لفظوں کی اپنی کلیّت اور سالمیت ہوتی ہے جو انھیں ان کی ارواحِ متصرّ فہ سے عطا ہوتی ہے۔ ان الفاظ کا موازنہ ان ذیلی اکائیوں سے کیا جا سکتا ہے جو مل کر جسمانی اعضا کی تشکیل کرتی ہیں۔

بدن کا ہر عضو ایک خاص کام کے لیے بنایا گیا ہے۔ جسمِ انسانی کی تحریر میں ہر عضو ایک فقرہ ہے، جب کہ بدن کو ایک پیراگراف سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ یاد رہے کہ پیراگراف کا مفہوم صرف اس کے باب کے سیاق وسباق میں اجاگر ہوتا ہے۔ اگر انسان کا بدن پیراگراف ہے تو اس تحریر کا ایک باب انسانی خاندان کہا جائے گا۔ پھر پوری کتاب میں ہر باب کی ایک حیثیت ہوتی ہے۔ یہ کتاب نسلِ انسانی کی کتاب کہلائے گی۔ حروف، الفاظ، فقرے، پیرے اور کتابیں سبھی کا مطالعہ ان کی سطح پر بھی کیا جا سکتا ہے، لیکن ان میں سے ہر ایک کا معنی ومفہوم تبھی واضح ہوتا ہے جب اسے ایک وسیع تر سیاق وسباق میں رکھ کر دیکھا جائے۔ اپنی سطح پر حروف صرف حروفِ تہجی کا ملغوبہ ہوتے ہیں۔ جب ان سے لفظ بنائے جاتے ہیں تو ان کے معانی کھلتے ہیں، تاہم فقرے کی حدود سے باہر لفظوں کو صحیح طور پر مفاہیم حاصل نہیں ہوتے اور فقروں کو اگر ایک وسیع تر اکائی یعنی پیرے اور ابواب میں نہ رکھا جائے تو ان کی معنویت ادھوری رہ جاتی ہے۔

اسلامی تناظر میں دیکھیے تو یہ بات مہمل نظر آئے گی کہ اجزا کو تو تسلیم کر لیا جائے اور وہ کُل رد کر دیے جائیں جو اجزا کو باہم مربوط رکھتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک سطح تک رک جایئے تو معانی کی وسعت جاتی رہے گی۔ آخر الامر، ایک حرف کی پوری معنویت بھی تبھی کھلتی ہے، جب ہم پوری کتاب پڑھنے کے قابل ہو جائیں۔ جسدِ انسانی کی یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی تصنیف ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ''توحید'' ہی سے اس کتاب کے حتمی معانی کی گرہ کھلتی ہے۔ مصنف کو بُھلا کر ہم حروف، لفظوں اور فقروں کو سمجھ تو سکتے ہیں، لیکن اس طرح نہ تو کتاب کا پیغام ہاتھ آتا ہے نہ اسرارِ کتاب کا در باز ہوتا ہے۔ ہماری مثال ان فرضی ماہرین کیمیا کی ہوگی جن کے خیال میں مونا لیزا کے معانی کا انحصار ان رنگوں کے کیمیاوی اجزا پر ہے جو اس تصویر میں استعمال ہوئے ہیں۔ ربط ومعنی کی ہر سطح (مثلاً حروف، الفاظ اور فقرے) نظامِ ہستی کی بُنت میں شامل ہے۔ عقلِ انسانی ہر سطح کو اپنی گرفت میں لا سکتی ہے کہ

عقلِ انسانی خود اس روحِ ربّانی کا پرتو ہے جو روحوں میں عظیم ترین روح ہے اور جسے خاکِ آدم میں پھونکا گیا ہے۔ یہاں ایک نکتہ اور بھی بہت اہم ہے۔ غور کیجیے کہ مسلمانوں کی تحریروں میں روح کے لیے جو بہت سے مترادف الفاظ استعمال ہوتے ہیں، ان میں سے ایک ''معنی'' بھی ہے۔ روح وہ چیز ہے جس سے کسی شے کو معنی، وحدت، مفہوم اور شناخت حاصل ہوتی ہے، تاہم روح کے بھی بہت سے درجات ہیں اور ان میں فرق مراتب اس اعتبار سے قائم ہوتا ہے کہ کون سی روح اپنے سے فروتر درجۂ حقیقت کے حقائق کا کس حد تک فہم رکھتی ہے اور اس کا احاطہ کرتی ہے۔ خلیے کی روح ایک چیز ہے اور عضو کی روح دوسری۔ اسی طرح انسان کی روح (روحِ ناطق یا روحِ ربانی) وہ اُصولِ عالی ہے جو اپنے سے کم تر تمام روحوں کی تنظیم کرتی ہے اور انھیں باہم جوڑ کر یکجا رکھتی ہے۔

بدن کا حوالہ نہ ہو تو بدن سے الگ ارواح پر بات کرنا بے معنی ہے۔ روایتی اسلامی علوم میں ''جسم'' کا ذکر جب ہوا ہے ''روح'' کا مضمر حوالہ ساتھ رہتا ہے۔ اسی طرح ''روح'' کے ہر تذکرے میں ''بدن'' کا تصور شامل رہتا ہے۔ جس طرح تاریکی کے بارے میں بات کرنے کے لیے نور کا حوالہ ضروری ہے اور نور کو اس وقت تک دیکھا نہیں جا سکتا، جب تک تاریکی موجود نہ ہو، اسی طرح روح اور بدن ایک دوسرے سے الگ نہیں کیے جا سکتے، حتیٰ کہ جسدِ مردہ اور بے جان اشیا کی بھی نگران روح ہوتی ہے اور وقتِ مرگ بدن سے جو روح جدا ہوتی ہے، وہ بھی ایک لطیف جسمانی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

روح کی اوّلین صفت عام طور پر حیات کو کہا جاتا ہے۔ روح کا ذکر آتے ہی، اگر ذہن میں بدن کا خیال ابھرتا ہے تو ساتھ ہی روح کے تذکرے سے حیات کی طرف بھی دھیان جاتا ہے۔ فارسی کی مثال لیجیے تو اس میں ''روح'' اور ''زندگی/حیات'' ہر دو کے لیے ''جان'' کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اس کی وجہ صاف ہے۔ روح کے بغیر بدن مردہ ہو جاتا ہے یا یوں کہیے کہ روح کے بغیر تنِ خاکی محض مٹی کا ڈھیر ہے۔

مٹی میں جان پڑ نہیں سکتی، جب تک اللہ تعالیٰ اسے گوندھ کر، شکل صورت دے کر اس میں اپنی روح نہ پھونکیں۔ ظاہر ہے کہ گوندھنے کا یہ کام اللہ تعالیٰ خود تو نہیں کرتے۔ ان کے کام سرانجام دینے کے لیے وسیلے واسطے ہوتے ہیں۔ جانور کا معاملہ ہو تو عام طور پر مٹی گوندھنے کا عمل رحمِ مادر میں صورت پذیر ہوتا ہے۔ ایک حدیث کے مطابق حمل کے چوتھے مہینے تک بچے کا بدن ابھی ایسی صورت شکل میں نہیں ہوتا کہ روح کی سہار کر سکے۔ چار ماہ کے بعد ہی اللہ تعالیٰ جنین میں اپنی روح پھونکتے ہیں۔[۲۶]

روح خدائی چیز ہے جیسے کہ نور اور حیات خدائی چیزیں ہیں۔ حیاتِ الٰہی کے سوا اور کوئی حیات

نہیں اور نورِ الٰہی کے علاوہ اور کوئی نور نہیں۔ اسی طرح روح کے جملہ خواص اصل میں ربّانی صفات سے عبارت ہیں، وگرنہ اللہ تعالیٰ نے روحِ انسانی کو ''روحی" (میری روح) نہ فرمایا ہوتا، تاہم علمائے الٰہیات کی اکثریت نے روح کو مخلوق قرار دیا ہے۔ یہ اگرچہ خدائی چیز ہے، لیکن عین خدا نہیں ہے۔ اسی طرح نورِ فرشتگان اللہ ہی کے نور کی ضوفشانی ہے، مگر خدا نہیں ہے۔

روح کے خواص کو ذہن کی گرفت میں لانا اہم ہے۔ جب تک ہم یہ نہ جان لیں کہ روح کیا ہے یہ نہیں سمجھ سکتے کہ بدن کیا ہے، کیونکہ روح اور بدن ایک دوسرے کے تکملے کے طور پر زیرِ غور آتے ہیں اور ایک کی تعریف معین کرتے ہوئے دوسرے کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ روح نورانی ہے اور ذی حیات، نیز فرشتوں اور روشنی کی طرح غیر مرئی بھی ہے۔ غور کیجیے کہ ''النور'' اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور اس ضمن میں اکثر یہ کہا گیا ہے کہ ''النور'' اللہ تعالیٰ کے اسمائے ذاتیہ میں سے ہے، اس کی ذات کا نام ہے۔ خدا کیا ہے؟ نور۔ ایک مرتبہ رسولِ خداؐ سے پوچھا گیا کہ حضور کیا آپ نے خدا کو دیکھا ہے؟ آپؐ نے جواب میں فرمایا، ''وہ ایک نور ہے۔ میں اسے کیوں کر دیکھ سکتا ہوں؟''[۲۷]

اگر روح ایک نور ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ بہ اعتبارِ تشبیہ اس میں ذاتِ خداوندی کی ساری صفات پائی جاتی ہیں، یعنی وہ تمام خواص جو اسمائے الٰہیہ سے ہمیں معلوم ہوتے ہیں چنانچہ روح اپنے آپ میں زندہ بھی ہے ذی علم بھی۔ ارادہ و قدرت بھی رکھتی ہے اور صفتِ کلام و نطق بھی، نیز عدل و کرم، رحمت اور محبت وغیرہ کی صفات سے متصف بھی۔ یہاں یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ گو سبھی انسان ذی روح ہیں، لیکن ان میں سے اکثر عدل و انصاف، کرم اور سخاوت جیسی صفات سے عاری نظر آتے ہیں۔ اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ انسان صرف روح نہیں ہوتا، اس کے ساتھ بدن بھی لگا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی روح اس گندھی ہوئی مٹی میں پھونکی، سو انسان پیدا ہوا۔ تو پھر کیا انسان روح ہے؟ جواب نفی اور اثبات دونوں میں ہے۔ کیا انسان نور ہے؟ ہے بھی اور نہیں بھی۔ کیا وہ بس مجموعۂ آب و گِل ہے؟ ہے اور نہیں ہے۔ کیا انسان ذی علم ہے؟ ہے، مگر نہیں بھی۔ کیا انسان کریم النفس اور انصاف پسند ہے؟ ہاں رنہیں۔

خلاصہ یہ کہ جب ہم انسانوں اور دیگر مخلوقات میں نور اور خاک کے میل کا ذکر کرتے ہیں تو صرف اسلوبِ بیان مختلف ہوتا ہے۔ اصل میں بات ''تشبیہ'' اور ''تنزیہ'' کے انھی دو اُصولوں کی ہو رہی ہے جن کی وضاحت پہلے کی جا چکی ہے۔ اپنی روح کے لحاظ سے انسان کو خدا سے تشبیہ دی جا سکتی ہے، جب کہ بدن کے اعتبار سے ان میں خدا سے کوئی مشابہت نہیں پائی جاتی۔ اللہ تعالیٰ اس سے منزہ

ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ ایک اور زاویے سے اور دوسرے اعتبار سے دیکھیے تو روح بھی اللہ سے مشابہ نہیں ہے، جب کہ بدن میں تشبیہ کی رمق پائی جاتی ہے، لیکن سرِدست ہم صرف اسی قدر واضح کرنا چاہتے ہیں کہ روح اور بدن دونوں کی غالب خاصیتیں کون کون سی ہیں۔

روح پر ان خواص کا غلبہ ہے جو ''تشبیہ'' سے تعلق رکھتے ہیں، چنانچہ قرب، رحمت، جمال و کرم، احسان، شفقت اور نرمی ان صفات سے روح کا گہرا تعلق ہے۔ اس کے برعکس بدن پر صفاتِ تنزیہ کا غلبہ ہے، چنانچہ یہ قہر، جلال، غضب، دوری اور فاصلہ اور عدل کی صفات سے متعلق ہے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ جسم کا کام یہ ہے کہ وہ صفاتِ رحمت کے مقابلے میں صفاتِ غضب کو زیادہ ظاہر کرے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ بدن کی تحقیر کی جا رہی ہے۔ یہ تمام صفات جن کا تعلق بدن سے ہے، آخر الامر صفاتِ ربّانی ہی تو ہیں۔ یہ درست ہے کہ رحمت غضب سے بڑھی ہوئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ روح ایک معنی میں بدن سے افضل ہے، لیکن روح کے پاس جب تک بدن نہ ہو، وہ رحمت اور جمال کی صفات ظاہر نہیں کر سکتی۔ اگر انسانی بدن آب و گل کے بجائے نور کے بنے ہوئے ہوتے یا یوں کہیے کہ اگر بدن بھی روحانی ماہیت رکھا کرتا تو لوگ فرشتے ہو جاتے، نسلِ انسانی کے فرد نہ ہوتے۔ اور اگر وہ فرشتے ہوتے تو وہ اس عظمت اور بلند مرتبے کو چھونے سے قاصر رہتے جس کے لیے انھیں تخلیق کیا گیا ہے۔ (انسانوں کی تخلیق سے اللہ تعالیٰ کا مقصود کیا ہے، اس کے بارے میں ہم آگے چل کر گفتگو کریں گے۔)

وجودِ ناری Fire

نورِ مخلوق کا اُلٹ ہے ظلمتِ مخلوقہ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ روح کی صفات آب و گل کی صفات کے برعکس ہیں۔ روح کی صفات خدائی صفات ہیں۔ مخلوق کے حوالے سے جب صفاتِ ربّانی پر نظر کی جائے تو عام طور پر حیات، علم، ارادہ، قدرت اور کلام کی صفات بیان کی جاتی ہیں۔ روح کے اندر یہ صفات خلقی طور پر پائی جاتی ہیں، جب کہ بدن میں یہ صفات اس درجے میں نہیں پائی جاتیں کہ انھیں کسی طرح قابلِ لحاظ کہا جا سکے۔

روحانی مخلوق، مثلاً فرشتے اپنی فطرت و ماہیت کے اعتبار سے ہی ذی حیات، ذی علم، صاحبِ ارادہ و قدرت اور ناطق و گویا ہوتے ہیں، لیکن یہ بھی سامنے رہے کہ اللہ کے مقابلے میں ارواح کی حیثیت بے جان اور بے علم اشیا کی سی ہے اور مذکورہ صفات مطلق نہیں ہیں۔ جب ارواح کی بات ہو رہی

ہوتو ہم اپنے ذہن میں ان کا مقابلہ بدن سے کر رہے ہوتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ''روح'' اور ''بدن'' کے الفاظ مل کر ہمارے تصورات کا ایک ایسا جوڑا تشکیل دیتے ہیں کہ ایک کے بارے میں بات کیجیے تو دوسرے کا ذکر خود بخود نکل آتا ہے یا کم از کم ایک مضمر کنایہ تو ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔

اروح کے برعکس مادی اجسام، جیسے پتھر یا جسد مردہ، بے جان، علم سے عاری، ارادے سے محروم، کمزور اور گویائی کے بغیر ہوتے ہیں۔ جہاں تک زندہ اجسام کا تعلق ہے تو ان کو نرا جسم نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ان میں حیات کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ اس بدن کے اندر روح بھی پائی جاتی ہے۔ تاہم زندہ اجسام کی زندگی اور ان کے علم کا جب ارواح کے علمِ خالص اور حیاتِ محض سے مقابلہ کیجیے تو یہ خصوصیات ماند پڑ جاتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ روح اور بدن کے میل سے ایک تیسری چیز پیدا ہوتی ہے جو نہ روح ہے نہ بدن بلکہ ان دونوں کے درمیان کی چیز ہے۔ اس تیسری چیز کی ماہیت کو جاننا ہو تو نورِ فرشتگان اور تنِ خاکی کے آب و گل کے درمیان پائے جانے والے تضاد پر دوبارہ غور کرنا مفید ہوگا۔

فرشتے نور کی تخلیق ہیں جب کہ بدن آب و گل سے اٹھایا گیا ہے۔ قرآن میں ایسی ہستیوں کا بھی ذکر ہے جو نہ تو نوری صفات ہیں نہ خاکی نہاد۔ ان کی تخلیق آگ (النار) سے ہوئی ہے۔ یاد رہے کہ آگ بیک وقت روشن بھی ہے اور تاریک بھی۔ آگ آسمان کی جانب لپکتی ہے لیکن زمینی ہوتی ہے۔ آگ کو کبھی بھی آب و گل سے جدا نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اسے جلانے کے لیے ایندھن کی احتیاج ہوتی ہے۔ آگ اوپر اٹھتی ہے، گویا نور کی آزادی کی خواہاں ہے لیکن کبھی بھی آب و گل کے بندھن سے نکل نہیں پاتی۔ آب و گل سے بننے والے ایندھن کی ترکیب اگر بدل دیجیے تو آگ کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے۔ خشک لکڑی کی آگ اور طرح کی ہوتی ہے اور ہری لکڑیوں کی آگ کسی اور طرح کی ہوتی ہے۔ پٹرول سے اٹھنے والی آگ ان دونوں سے الگ ہوتی ہے۔ زمین سے نکلنے والی مختلف چیزوں اور مختلف نمکیات کو اگر باہم آمیخت کر دیا جائے تو آگ کا رنگ بآسانی بدلا جا سکتا ہے۔

وہ مخلوق جو آگ سے بنی ہے اسے قرآن میں ''جن'' کہا گیا ہے۔ اس اصطلاح کے لفظی معنی ہیں ''چھپا ہوا۔ پوشیدہ۔'' قرآن میں جنات کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے اور اگر صرف متعلقہ آیات پر ہی تحقیق کی جائے تو ایک پوری کتاب تیار ہو جاتی ہے۔ یہاں ہمیں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ جنات وہ مخلوق ہیں جن کے بارے میں ایک ابہام پایا جاتا ہے۔ ان میں کچھ باتیں انسانوں جیسی ہیں کچھ فرشتوں جیسی۔

جنات کی نسل کا سب سے مشہور فرد ابلیس ہے جسے شیطان بھی کہا جاتا ہے۔ جنات کے بارے میں جو ایک ابہام سا ہے وہ ابلیس کے ماضی اور اس کے کردار سے بخوبی آشکار ہو جاتا ہے۔ عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ وہ جنات میں سب سے پہلے تخلیق ہوا تھا۔ گویا نوعِ انسانی میں جو حیثیت سیدنا آدمؑ کو حاصل ہے وہی ابلیس کو جنات میں ملی تھی۔ تخلیقِ آدمؑ سے ہزاروں سال قبل سے ابلیس ایک نہایت ہی نیک اور پارسا ہستی کے طور پر موجود تھا اور اپنا سارا وقت عبادت اور حسنِ عمل میں صرف کرتا تھا۔

قرآن کا فرمان ہے کہ فرشتوں کی زندگی سراسر اللہ کی بندگی سے عبارت ہوتی ہے، حمد اور تسبیحِ مسلسل۔ فرشتے اللہ سے کبھی غافل نہیں ہوتے چنانچہ وہ ہر دم کلماتِ تشکر ادا کرنے میں کوشاں رہتے ہیں جن میں اللہ کی عظمت، جلال اور مہربانی کا ذکر ہوتا ہے۔ ابلیس جب تخلیق ہوا تو ایسا روشن سرشت تھا کہ اپنے آغازِ آفرینش ہی سے فرشتوں کی طرف مائل رہتا تھا اور انھی جیسے عمل کرتا تھا۔ اس کی کثرتِ عبادت اور یادِ خدا میں انہاک نے رفتہ رفتہ اسے خدا کی بندگی کرنے والوں کے ایک گروہِ خواص میں شامل کر دیا۔ اس کی تخلیق اگرچہ آگ سے ہوئی تھی لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت مل گئی تھی کہ وہ فرشتگانِ نوری نہاد سے گھل مل کر رہ سکتا ہے۔ معاملہ بخیر وخوبی چلتا رہا تا آنکہ تخلیقِ آدمؑ کا لمحہ آن پہنچا۔ ابلیس اس سارے عمل کا شاہد تھا کہ خاکِ آدم کیوں کر جمع کی گئی اور اللہ تعالیٰ نے اس مٹی کو چالیس روز تک کیسے خمیر کیا۔ لیکن یوں لگتا ہے کہ اس کی نظر سے وہ نکتہ اوجھل رہ گیا جو قصۂ آدم میں سب سے اہم تھا یعنی جب اللہ نے آدمؑ کے پتلے میں اپنی روح پھونکی۔ روح غیر مرئی ہے، خود اللہ تعالیٰ کہیں زیادہ غیر مرئی ہے تو پھر کیا عجب کہ غور سے دیکھنے والوں کی نظر سے بھی بعض لطیف پہلو اور نازک باتیں اوجھل رہ جائیں!

تخلیقِ آدمؑ ہو چکی تو اللہ تعالیٰ نے تمام فرشتوں سے فرمایا:

اَسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ (۲:۳٤، ۷:۱۱) آدم کو سجدہ کرو۔

اس گھڑی ابلیس بھی صفِ نوریاں میں شامل تھا۔ سبھی فرشتے اسی لمحے سجدہ ریز ہو گئے کیونکہ فرشتے تو ''وہی کرتے ہیں جس کا امر ہوتا ہے'' ''**یَفۡعَلُوۡنَ مَا یُؤۡمَرُوۡنَ**'' (۱۶:۵۰) ابلیس فرشتہ نہ تھا سوا سے حکم سے سرتابی کا یارا ہو سکتا تھا اور زندگی میں پہلی بار اس نے فیصلہ کیا کہ اسے حکمِ خداوندی سے انکار کرنا ہے اور وہ ایسا کر گذرا۔

اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے فرمایا:

مَامَنَعَكَ اَلَّا تَسۡجُدَ اِذۡ اَمَرۡتُكَ ۔ قَالَ اَنَا خَيۡرٌ مِّنۡهُ ۔ خَلَقۡتَنِىۡ مِنۡ نَّارٍ وَّ خَلَقۡتَهٗ مِنۡ طِيۡنٍ (۷:۱۲)

فرمایا کہ جب میں نے تجھے حکم دیا تو تجھے کس چیز نے روکا کہ تو نے سجدہ نہ کیا؟ بولا میں اس سے بہتر ہوں۔ مجھ کو تو نے آگ سے بنایا اور اسے خاک سے پیدا کیا۔

دوسری جگہ اس طرح بیان ہوا ہے کہ:

قَالَ يٰاِبۡلِيۡسُ مَامَنَعَكَ اَنۡ تَسۡجُدَ لِمَا خَلَقۡتُ بِيَدَىَّ ۔ اَسۡتَكۡبَرۡتَ اَمۡ كُنۡتَ مِنَ الۡعَالِيۡنَ ۔ قَالَ اَنَا خَيۡرٌ مِّنۡهُ خَلَقۡتَنِىۡ مِنۡ نَّارٍ وَّ خَلَقۡتَهٗ مِنۡ طِيۡن (۳۸:۷۵-۷٦)

فرمایا اے ابلیس تجھے اس چیز کو سجدہ کرنے میں کیا اٹکا ہوا جو میں اپنے ہاتھوں سے بنائی؟ یہ تو نے غرور کیا یا تو کوئی بڑے درجے والا تھا؟ بولا میں بہتر ہوں اس سے۔ مجھ کو تو نے آگ سے پیدا کیا اور اس کو تو نے مٹی سے بنایا۔

فارسی زبان کے عظیم شاعر اور حکیمِ دانا مولانا جلال الدین رومی (م:۱۲۷۴/۶۷۳) کا کہنا ہے کہ ابلیس یک چشم تھا۔ اس کی نظر اتنی کوتاہ تھی کہ اسے صرف خاکِ آدم ہی سجھائی دی۔ دوسری آنکھ، ایک اور طرح کی نظر میسر ہوتی تو آدمؑ کی روحِ ربّانی بھی دیکھ لیتا۔

قصۂ آدمؑ کا باقی حصہ معروف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو مردود کر دیا اور دھتکارا ہوا ابلیس جنت سے نکال دیا گیا۔ اس روز سے ابلیس نے اولادِ آدم کو بھٹکانے کا کسب اختیار کر لیا۔ ان واقعات کی طرف ہم بعد میں رجوع کریں گے کہ ان میں اسلام کے تصورِ انسان اور علمِ انسانیات کے فہم کی کلید مخفی ہے۔ سردست اتنا جان لینا کافی ہوگا کہ ابلیس میں فرشتوں کی سی سرشتِ روحانی بھی تھی اور ایک تیرہ نہاد، فریب کار اور انحرافی پہلو بھی جو صرف نور کے فقدان سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ سرشتِ ظلمانی اپنی ظلمت خاک سے اخذ کرتی ہے لیکن اس میں ایک چیز اور بھی ہے جو نہادِ خاک میں نہیں پائی جاتی۔

کچھ بھی کہیے گندھی ہوئی مٹی بہرحال اپنا کوئی معین رنگ ڈھنگ نہیں رکھتی۔ مٹی میں شر کا کوئی پہلو نہیں ہوتا۔ اگر آپ ظروف ساز ہیں تو برتن ڈھالنے کے لیے مٹی ایک اچھی چیز ہے۔ اور اگر آپ خدا ہیں تو اس سے جسمانی مادی چیزوں کی صورتگری بخوبی ہوسکتی ہے۔ مٹی میں کچھ کوتاہیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ یہ تاریک بھی ہے اور کثیف بھی سو اگر آپ جامِ سفال میں نورِ سیال انڈیل دیں تو اس کی

روشنی مخفی ہو جاتی ہے اور کچھ لوگ یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ شاید یہ ظرف کسی مظروف سے عاری ہے۔ لیکن اگر ظروف نہ ہوں تو ہمارے پاس نور کو سنبھالنے کا کوئی وسیلہ ہی نہ ہوگا۔ مٹی پرفریب اور گمراہ کن نہیں ہوتی۔ صرف ٹھس اور سست نہاد ہوتی ہے۔

جب نورانیتِ روحانی کا امتزاج ٹھس اور بے نفوذ مٹی سے ہوتا ہے تو اس کے نتیجے میں روشنی اور پرچھائیوں کا وہ کھیل جنم لیتا ہے جس پر کج روی، فریب اور انحراف کے سائے پھیلے رہتے ہیں، وہ کھیل جو ظلمت کے عالم میں اور دُور کھینچ لے جاتا ہے۔ ابلیس اس امکان کا نمایندہ ہے۔ تاہم آگ ہمیشہ خرابی کی جانب ہی نہیں لے جایا کرتی۔ قرآن میں وضاحت سے یہ بات کہی گئی ہے کہ جنات میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں اور اسلامی روایت میں عام طور پر صاحبِ ایمان جنات اور کافر جنات کے درمیان فرق تسلیم کیا گیا ہے۔ وہ جن جو کفر میں مبتلا ہیں انھیں شیاطین کا نام دیا گیا ہے۔ ان کا سردار ابلیس ہے جسے عربی میں ''الشیطان'' کہا گیا ہے۔

آگ ایک مبہم چیز ہے اگر اس کی سرشت میں نور کا غلبہ ہو جائے تو یہ فرشتوں سے مشابہ ہو جاتی ہے اور اللہ کی رحمت اور مہربانی سے حصہ پاتی ہے۔ اگر اس پر ظلمت غالب آ جائے تو پھر یہ مادی اجسام کی طرح اللہ سے دور ہو جاتی ہے اور قہر و غضب کے اسما کے آثار تلے آ جاتی ہے۔

آگ کا جھکاؤ بہر کیف قہر و جلال کی جانب زیادہ ہوتا ہے اور جمال و رحمت کی طرف کم تر۔ یہ اوپر اٹھتی ہے، اپنی قوت کو منواتی ہے اپنی طاقت جتلاتی ہے اور اپنی راہ میں آنے والی ہر چیز کو مٹا دینا چاہتی ہے۔ اسی بات کو اگر ایک انسانی (یا شیطانی) صفت کے طور پر لیجیے تو آگ خود رائی تکبر اور غرورِ ذات کے دعوے کے برابر ٹھہرتی ہے۔ ابلیس کہتا ہے "انا خیر منه" (میں اس سے بہتر ہوں) شیطان کا کھیل ہی انا کا کھیل ہے ''میں، میں، میں۔'' اپنی من مانی کرو، ہوا اور ہوس کی پیروی کرو اور عقلِ خداداد کو پسِ پشت ڈال دو۔

آگ کی یہ منفی سرشت قرآن کے بیان کردہ لفظ ''استکبار'' میں نہایت خوبی سے سمیٹ دی گئی ہے۔ اس لفظ کا مطلب ہے اپنے آپ کو بزرگ، برتر، عظیم اور نمایاں بنانے کی کوشش کرنا۔ اسی سہ حرفی کلمہ (کبر) سے اکبر کا لفظ نکلا ہے اس کے معنی ہوتے ہیں ''بڑا، بزرگ۔'' ''اللہ اکبر'' کے الفاظ مسلمان کے لبوں پر عام طور پر جاری رہتے ہیں اور نماز کی ہر حرکت سے پہلے اللہ اکبر کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ عظمت، بڑائی اور بزرگی اگر ہے تو صرف اللہ کی۔ ہماری آپ کی نگاہ میں

جو چیز بھی بڑی ہے اللہ کے سامنے بہت چھوٹی ہے۔عربی کے اسی سہ حرفی مادے سے اللہ کا نام ''المتکبر'' نکلا ہے۔اس کے معنی ہیں He who is great in Himself The Magnificent (کبریائی کا مالک، اپنی عظمت کا اظہار کرنے والا) اگر یہ صفت انسانوں میں پائی جائے تو اس کا مطلب ہوگا تکبر کرنے والا، مغرور اور گھمنڈی کیونکہ عظمت اور کبریائی صرف اللہ ہی کو زیبا ہے دوسرے کسی کا حق نہیں۔

ابلیس اور نوعِ انسانی کے وہ افراد جن میں ناری صفات پائی جاتی ہیں اپنے آپ کو بڑا بنانے کی، اپنی عظمتِ ذات کے خواہاں رہتے ہیں۔ آگ کے مانند وہ اپنی حقیقت منوانے اور دوسروں کو ملیامیٹ کرنے کے درپے رہتے ہیں۔قرآن مجید نے بڑائی جتانے اور اپنی عظمت و برتری منوانے کی اس صفت کو ابلیس، فرعون اور اس کے مشیروں سے منسوب کیا ہے اور کفار کو بھی عام طور پر اس میں مبتلا دکھایا گیا ہے۔ یہ سبھی دوزخ میں پھینکے جائیں گے کہ نارِ جہنم ٹھیک وہی آگ ہے جو ان کی سرشت کے عین مطابق ہے۔فرعون کو سمندر میں پانی کی قبر نصیب ہوئی۔اس جیسے آتشی دعوے کرنے والے کا اس دنیا میں ایسا ہی آبی انجام مناسب تھا۔

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۰ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۰ اِسْتَكْبَرَ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ (٣٨:٧٣ -٧٤)

پھر سارے فرشتوں نے اکھٹے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔اس نے غرور کیا اور انکار کرنے والوں میں سے بن گیا۔

وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَ جُنُوْدُهٗ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۰ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِى الْيَمِّ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ (٢٨:٣٩-٤١)

اور اس (فرعون) نے اور اس کی فوجوں نے زمین میں ناحق گھمنڈ کیا..... سو ہم نے ان کو پکڑ کر سمندر میں ڈبو دیا..... اور انھیں آگ کی طرف بلانے والوں کا سردار بنا دیا۔

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ (٧:٣٦)

اور جو ہماری آیات کو جھٹلائیں اور تکبر کرکے ان سے منہ موڑیں، وہی دوزخ والے ہیں۔

قرآن میں حرفِ استکبار اور دعویٔ عظمت کو اگر ابلیس اور اس کے پیروکاروں کی صفت بتایا گیا ہے تو دوسری بہت سی آیات میں فرشتوں کو ان صفات سے بری کہا گیا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ (٧:٢٠٦)

بے شک جو تیرے رب کے پاس ہیں وہ اس کی بندگی کرنے سے نہیں اکڑتے۔

الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۰ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ(۵۰-۴۹:۱۶)

فرشتے، اور وہ بڑائی نہیں کرتے۔ اپنے اوپر اپنے رب کا ڈر رکھتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جس کا حکم پاتے ہیں۔

نفس Soul

روح میں نوری صفات ہیں اور بدن میں آب و گل کے خواص۔ روح اور بدن دونوں ہی آگ نہیں ہیں کیونکہ آگ میں نور اور مٹی کی صفات یکجا ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ اگر نوعِ آدم کی مکمل تصویر کشی درکار ہو تو اس میں ایک آتشی عنصر کا اضافہ کرنا ہوگا۔ آدم کو جامۂ ہستی تب ملتا ہے جب گندھی ہوئی مٹی میں روح پھونکی جاتی ہے لیکن یہ آتشی عنصر نہ روح ہے نہ مٹی بلکہ ایک ایسی چیز ہے جو اس وقت پیدا ہوتی جب روح اور مٹی کو یکجا کیا جاتا ہے۔ یہ چیز عام طور پر ''نفس'' کہلاتی ہے اس کا ترجمہ Soul (نفس/رُواں) یا Self (خودی/انا) کے الفاظ سے کیا جاتا ہے۔ روح اور بدن کا میل ہونے سے پہلے نہ نفسِ انسانی ہوتا ہے نہ انسانی خودی۔ ان دونوں کے مل جانے کے بعد ایک شخصیت وجود میں آتی ہے۔ ایک ہستی، ایک شخص جو خود کو نہ تو بدن سمجھتا ہے اور نہ بطور روح کے اپنا ادراک کرتا ہے بلکہ خود کو محض نفسِ انسانی جانتا ہے۔

عربی میں نفس اور نَفَس ایک ہی طرح لکھے جاتے ہیں۔ نَفَس کا مطلب ہے ''سانس''۔ (عبرانی میں بھی nephesh کا مطلب ہے سانس)۔ سانس وہ ہوا ہے جس سے بدن جاندار بنتا ہے، اس میں زندگی آتی ہے۔ اسی طرح نفس وہ غیر مرئی قوت ہے جس سے کسی شے کو نَفَس حیات (زندگی کی سانس) نصیب ہوتا ہے۔ اس اصطلاح (نفس) کا جب یہ پہلو زیرِ غور ہو تو اسے بالعموم روح کے مترادف لفظ کے طور پر برتا جاتا ہے کیونکہ بدن کے مقابلے میں نفس کو روح کی تمام اساسی صفات حاصل ہیں یعنی حیات، علم، ارادہ اور قدرت۔

اکثر اوقات نفس کو اس نظر سے دیکھا جاتا ہے کہ اس میں اور روح میں کیا فرق ہے۔ نفس بدن میں غرق رہتا ہے اور اس بات سے غافل ہو جاتا ہے کہ بدن اس کی حقیقت نہیں ہے بلکہ اس کی حقیقت کی اصل و اساس روح ہے اور خدا ہے۔ نفس کو اگر اس اعتبار سے زیرِ غور لایا جائے تو اس لفظ کا استعمال ایک منفی معنی میں ہوتا ہے۔ اس معنی میں نفس اس ساری ظلمت اور تاریکی کا حوالہ بن جاتا ہے جو لوگوں کے اندر پھیلی رہتی ہے اور وہ اس کے کارن اللہ سے دوری میں، لاعلمی میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اسلامی علوم اور کتب میں ''نفس'' کی اصطلاح کا استعمال ابہام سے بھرپور ہے کیونکہ اس کی معنوی قربت آگ اور جن ہر دو سے موجود ہے۔ لیکن اگر نفسِ انسانی کی ایک جامع تصویر بنانا ہو اور یہ دیکھنا ہو کہ انسانی نفس کن چیزوں کا نمائندہ ہے تو ہمیں نفس کے مذکورہ بالا دونوں پہلو، دونوں طرفیں نظر میں رکھنا ہوں گی۔ نفس کو روحِ نورانی کے مقابل رکھ کر دیکھیے تو وہ تاریک، مردہ، بے علم اور کمزور نظر آئے گا۔ روح کی طرح نفس میں بھی ارادہ اور خواہش پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ بگڑے ہوئے کام اور خراب ارادوں اور خواہشوں کا مجموعہ ہے۔ فرشتہ اللہ کے سوا کچھ اور نہیں سوچتا، خدا کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہتا سو اس کی یہ خواہش نیک خواہش ہے۔ لیکن اپنے منفی معنی میں نفس اللہ کی طرف سے غافل اور اللہ کے سوا ہر چیز کا طالب رہتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے نفس ایک منفی چیز نظر آتا ہے اور اس کا تعلق تنزیہ سے قائم ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر نفس ایک ایسی چیز کے طور پر سامنے آتا ہے جس میں حقیقتِ ربّانی کا کوئی شائبہ کوئی مشابہت نہیں پائی جاتی۔

تاہم اگر نفس کو بدن کے مقابل رکھ کر دیکھا جائے تو اسے نورانی، ذی عقل، ذی ارادہ، طاقتور وغیرہ کہا جائے گا۔ یہ ربّانی صفات نفس کے اندر موجود ہیں جب کہ بدن ان سے عاری ہے۔ اس تناظر میں نفس کا رشتہ تشبیہ سے جڑ جاتا ہے۔

کسی ایک شخص کی مثال لیجیے تو صورت حال کچھ اس طرح کی نظر آئے گی۔ چند چھوٹے موٹے اختلافات کو چھوڑ کر اس کا تنِ خاکی دوسرے انسانی جسموں جیسا ہوگا۔ نور سے خلق کردہ اس کی روح بھی آخرالامر دوسری تمام انسانی ارواح ہی کی طرح ایک روح ہوگی۔ یہ بھی ایک خدائی راز ہے کیونکہ انسانی ارواح وہ خدائی روح ہیں جو بدن میں پھونکی گئی اور روحِ ربّانی تو بس ایک ہی ہے۔ لیکن ہر انسان، ہر فرد کی روح دوسرے افراد کی روح سے مشابہ بھی اور جدا بھی، ہر انسان کی شخصیت میں جو انفرادی شان پیدا ہوتی ہے وہ اللہ کی نشانیوں کا اس شخص میں وہ نادر امتزاج ہے جو اسی سے خاص ہے۔ بعض لوگوں کو اللہ کی صفتِ علم (عقل و آگہی) سے بہت کم حصہ نصیب ہوتا ہے جب کہ دوسرے لوگ اس سے زیادہ بہرہ ور ہوتے ہیں۔ دو آدمی کہیں بھی یکساں نہیں ہوتے۔ اسی طرح ہر صفتِ الٰہی بھی ہر فرد میں جداگانہ طور پر ظاہر ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر نطق و کلام اور گویائی کی صفت کو لیجیے۔ کلام سب سے کامل وہ ہے جو کلامِ خداوندی ہے، وہ جس کا ادراک ہم اس کی نشانیوں میں کرتے ہیں یعنی اس کائنات کی کتابِ تکوین اور اللہ کی بھیجی

ہوئی الہامی کتابیں۔لیکن انسانوں میں یہ صفتِ کلام مختلف درجے کی اور مختلف انداز کی پائی جاتی ہے کہیں زیادہ اور کہیں کم۔کسی میں وافر کسی میں ناقص۔مزید برآں ہر مرد و زن کو اپنی زندگی کے مختلف مراحل اور زمانوں میں گویائی کی یہ صفتِ الٰہی مختلف درجے میں حاصل ہوتی ہے۔ایک نوزائیدہ بچہ انسان کی قوتِ گویائی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا لیکن رفتہ رفتہ سیکھ جاتا ہے۔اس کے بارے میں یقین سے ہرگز کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ نشو و نما پا کر کیا بنے گا۔اس نوزائیدہ بچے میں ایک شاعر بھی پوشیدہ ہو سکتا ہے، ایک ناول نگار بھی، اپنے زمانے کا شیکسپیئر اور اقبال بھی اور ایک گنوار کندۂ ناتراش بھی۔کون جانے؟

صفتِ کلام اور صفتِ علم میں فطری طور پر ایک گہرا تعلق ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ سبھی صفاتِ خداوندی ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔جیسے جیسے آپ کھوج میں آگے بڑھیں گے یہ دیکھیں گے کہ چند صفات ایسی ہیں جن کا انحصار کچھ دوسری صفات پر ہے اور مآل کار سب صفات کا دارومدار ذاتِ خداوندی پر ہے۔یہی ''توحید'' ہے یعنی یہ دعویٰ کہ ہر حقیقت اپنی اصل میں ایک ہی ہستی سے منسلک ہے اور وہی ہستی ''الحق'' ہے۔چونکہ حقیقت واحد ہے، الحق یکتا و یگانہ ہے لہٰذا الحق کی صفات بھی ایک اعتبار سے یگانگت اور وحدت رکھتی ہیں۔

خیال Imagination

بہت سے مسلم مفکرین نے عربی کے لفظ ''خیال'' یا ''مثال'' کا لفظ استعمال کر کے نفس یا آگ کی درمیانی اقلیم کی جانب اشارہ کیا ہے۔قرآن و حدیث سے ان الفاظ کے استعمال کرنے کا خاصا جواز فراہم ہوتا ہے۔مثال کے طور پر قرآن میں جہاں سیدہ مریمؑ کے سامنے حضرت جبرئیل کے ظاہر ہونے کا واقعہ بیان ہوا ہے وہاں یوں کہا گیا ہے۔

فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (۱۹:۱۷) — پھر وہ اس کے سامنے پورا آدمی بن کے نمودار ہوا۔

یعنی وہ مریمؑ کے سامنے انسان کی صورتِ مثالی میں ظاہر ہوئے بلکہ لفظی ترجمے میں یوں ہوگا کہ ''وہ ان کے سامنے ایک بے عیب بشر کی صورت متمثّل ہوئے۔'' رسولِ خداؐ نے یہ لفظ ''تمثّل'' (imaginalize) بہت سی احادیث میں استعمال کیا ہے۔ان کا مطالعہ دلچسپی کا باعث ہوگا۔ان میں سے سب سے مشہور حدیث میں آپؐ نے فرمایا ''شیطان میری صورت میں متمثّل نہیں ہو سکتا''۔[۲۸] اکثر لوگ اس کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ اگر خواب میں کوئی شخص رسولِ خداؐ کی شبیہ دیکھے تو وہ واقعی آپؐ کی ہی

صورتِ مثالی ہے، شیطان کا دھوکہ نہیں ہے۔ ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا ''جنت اور جہنم میرے سامنے اس دیوار میں متمثّل کر دیے گئے۔'' [۲۹]

جب کوئی شے متمثّل ہوتی ہے Imaginalized تو وہ دیکھنے والے کے سامنے ایک صورتِ مثالی، ایک شبیہ کے طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ یہ شبیہ یا صورت ''عالمِ خیال'' کی یعنی Imaginal ہوتی ہے وہمی یا تخیلاتی Imaginary نہیں۔ کہنے کا مطلب یہ کہ اس میں بھی ایک طرح کی حقیقت ہے جو قابلِ توجہ ہے۔ ہم محض یہ کہ کر اسے ٹال نہیں سکتے کہ ''آپ خیالی باتیں کرتے ہیں یا خود سے چیز گھڑ لیتے ہیں'' مراد یہ کہ تمثّل کو مفروضہ یا وہم و تخیل کی کارفرمائی کہ کر چھوڑا نہیں جا سکتا۔

عالمِ خیال کی اشیا میں طرفین کی صفات پائی جاتی ہیں ایسے ہی جیسے نفس، روح اور بدن ہر دو کی صفات میں شریک ہوتا ہے۔ عالمِ خیال کی کسی شے (imagnial thing) کی مثال دیکھنا ہو تو اس کی سب سے عام اور حسی مثال آئینے کے عکس میں تلاش کی جا سکتی ہے۔ آئینے میں آپ کا عکس بیک وقت آپ کی ذات ہے اور نہیں ہے۔ ایک لحاظ سے اور کچھ عملی ضروریات کے پیش نظر آپ اسے اپنا آپ کہ سکتے ہیں مثلاً بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے۔ لیکن آئینے میں جھلکنے والا عکس خود آپ تو نہیں ہیں کیونکہ یہ عکس تو محض روشنی کی وہ شعاعیں ہیں جو آئینے کے ایک ٹکڑے سے ٹکرا کر منعکس ہو رہی ہیں۔

اب ذرا اپنے داخل پر نظر دوڑائیے۔ نفسِ انسانی کے دروں خانے میں اگر کہیں عالمِ خیال کی اشیا سب سے زیادہ پائی جاتی ہیں تو خوابوں میں۔ خواب میں طرح طرح کے لوگوں کی اور چیزوں کی ایک کثیر تعداد ہوتی ہے جو بیک وقت اپنا آپ ہیں بھی اور نہیں بھی، جو نظر آتے ہیں وہ ہیں بھی اور نہیں بھی بلکہ خواب میں تو خود ہم بھی گاہ وہ ہوتے ہیں جو ہم ہیں اور گاہے کچھ اور۔ خواب میں جو درخت ہمیں نظر آتا ہے وہ درخت ہی ہوتا ہے، مینڈک یا غبارہ نہیں ہوتا تاہم وہ بایں معنی درخت نہیں ہوتا کہ خواب کا درخت مادی دنیا کی مٹی سے اُگنے والا درخت نہیں ہوتا۔ یا یوں دیکھیے کہ خواب میں جو درخت آپ نے دیکھا ہے وہ آپ میں ہے اور نہیں بھی۔ چونکہ یہ ایک درخت ہے اس لیے یہ آپ سے الگ ہے جب کہ دوسری طرف یہ آپ ہی میں ہے کیونکہ یہ محض ایک درخت کی وہ تصویر ہے جو آپ کے خیال میں پائی جاتی ہے۔

یاد رہے کہ خواب کی سرزمین اقلیمِ نفس کا حصہ ہے۔ اس لیے نفس کو اکثر ''عالمِ خیالِ صغیر'' microcosmic world of imagination کہا گیا ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ عالم جس میں

جنات اور شیاطین بستے ہیں اسے ''عالمِ خیالِ کبیر'' کہا جاتا ہے۔ فردِ انسانی ایک چھوٹی سی کائنات، ایک عالمِ صغیر ہے جب کہ ''عالم کبیر'' یہ تمام کائنات ہے۔

جو اشیا عالمِ خیال میں وجود رکھتی ہیں ان کی سب سے اہم خاصیت ہے مسلسل تغیر، متواتر تبدیلی۔ خیال imagination دو لمحے بھی یکساں نہیں رہتا۔ اس درمیانی دنیا میں، اس عالمِ خیال میں کوئی شے ثبات ودوام نہیں رکھتی۔ خواب میں آنے والا ہر عکس، ہر شبیہ لحہ بہ لحہ کسی دوسرے عکس اور دوسری شبیہ میں منقلب ہوتا رہتا ہے اور یہ عمل خواب کے دوران مسلسل جاری رہتا ہے۔

نفس کے بارے میں گفتگو ہو تو یہ تغیر اور بے ثباتی کا عنصر نظر میں رکھنا بہت اہم ہوتا ہے۔ لوگ باگ عام طور پر نفس کو ایک جامد اور معین شے کے طور پر لیتے ہیں اور اس کی خاصیتوں کا قیاس بھی بدن پر کرتے ہیں۔ کیونکہ نفس اور بدن کا ذکر عموماً ایک جوڑے کے طور پر کیا جاتا ہے۔ معین اور جامد تو بدن بھی نہیں ہوتا تاہم نفس کے مقابلے میں بدن بہر حال ٹھوس اور مستقل چیز ہے بالخصوص جب بدن کا موازنہ خواب میں ابھرنے والے کسی عکس وشبیہ سے کیا جائے۔

ایک نسبتاً پکے اور ثبات رکھنے والے جسم اور نَفَسِ رحمانی کی یکجائی سے نفسِ انسانی جنم لیتا ہے۔ نَفَسِ خداوندی خالص اور غیر متغیر نورانیت ہے۔ پس نفس کے دونوں پہلو، اس کی دونوں اطراف نسبتاً مستقل حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن اپنے آپ میں نفسِ انسانی ایک سیلانِ مسلسل ہے، نقوش اور اثرات کا ایک متواتر بہاؤ، شعور اور آگہی کی ایک بہتی ہوئی رو۔ مسلمانوں میں علمِ کائنات کے ماہرین نے اکثر نفس کو ''بحرِ ناپیدا کنار'' کا نام دیا ہے۔ نفسِ انسانی سمندر کی طرح اس لیے ہے کہ سمندر کی گہرائیوں میں بھی نہ جانے کیا کیا چھپا ہوتا ہے اور سمندر بھی ہر دم حرکت میں رہتا ہے جو سطحِ سمندر پر اٹھتی لہروں سے پتہ چلتا رہتا ہے۔ تاہم سمندر کے برعکس نفس کی کوئی حد نہیں، پیدا نہیں بحر کا کنارہ۔ آگے چل کر جب ہم ''معاد'' اور آخرت پر بحث کریں گے تو یہ نکتہ سامنے آئے گا کہ نفس کا یہ غیر معین اور سیال ہونا اپنے دامن میں تکوینِ انسانی کے لیے اہم نتائج لیے ہوئے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ انسان این وآن کا پابند نہیں ہے لہٰذا وہ کچھ بھی بن سکتا ہے اور انسان اس دنیا میں جو بن جاتا ہے وہی صورت اگلی دنیا میں اس کے سامنے آتی ہے۔ دنیا کا کسب، عقبیٰ کی صورت گری کرتا ہے۔

خلاصہ

ہمارا مقدمۂ فکر یہ تھا کہ ''فرشتے اللہ کے پیغام بر ہیں'' اس نقطۂ آغاز سے ہم ایک لمبی مسافت طے کر کے اپنے مبحث کے انجام تک پہنچے ہیں لیکن اس سفر میں ہم ان نظریات اور تصورات سے کچھ زیادہ دور نہیں ہٹے جو مسلمانوں کے درمیان اس وقت زیر بحث آتے ہیں جب وہ فرشتوں کے بارے میں ایک سطحی ایمان و اعتقاد سے بڑھ کر کچھ اور بھی جاننا چاہتے ہیں۔ ان تصورات کی پرکھ پرچول، جائزہ، تجزیہ کا موقع ابھی نہیں آیا۔ ہماری آیندہ کی بحث میں ان تصورات پر مزید گفتگو ہوگی اس لیے کہ ''توحید'' کا تقاضا یہی ہے کہ ذرے سے خورشید تک ہر شے میں ایک باہمی ربط و تعلق ہو۔ آگے بڑھنے سے قبل ذرا ان نکات پر نظر ڈال لی جائے جو ہم نے فرشتوں کے بارے میں درج کیے ہیں۔

فرشتے ایک واسطہ ہیں مادی دنیا اور اللہ تعالیٰ کے درمیان۔ چونکہ فرشتے نور سے خلق کیے گئے ہیں لہٰذا ان کو اللہ سے قریب ترین چیز کا نمایندہ کہا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ النور ہے۔ نورِ فرشتگان کی بھی وہی صفات ہیں جو نورِ خداوندی کی۔ ہاں ان میں یہ فرق ہے کہ فرشتوں کا نور مخلوق اور حادث ہے جب کہ اللہ تعالی کا نور غیر مخلوق ہے اور قدیم و ازلی ہے۔ نور کے خواص کو سمجھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کا موازنہ ظلمت کے خواص سے کیا جائے۔ ظلمت کیا ہے۔ فقدانِ نور کا نام ظلمت ہے۔ نورِ مخلوق کا اُلٹ ظلمتِ مخلوقہ ہے۔ ظلمت مخلوقہ کی ایک قسم گندھی مٹی ہے جس سے تمام مادی اشیا مثلاً پتھر، پودے اور جانداروں کے بدن بنے ہیں۔

فرشتے ایک طرح کی روح ہیں اور روح آخرالامر نَفَسِ خداوندی (breath of God) ہے۔ جس طرح روشنی کو تاریکی کے حوالے سے جانا جاتا ہے اسی طرح روح کو بدن کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔ اشیائے ہستی کی تمام رنگا رنگی کے قطبین پر روح اور بدن واقع ہیں۔ ان میں سے ایک اللہ سے قریب ہے اور دوسرا اس سے دور۔ بدن اللہ سے دور سہی تاہم ایک اچھی چیز ہے کیونکہ بدن اللہ کی مخلوق ہوتے ہیں اور ان میں اللہ کی صفات کا ظہور ہوتا ہے خواہ صفاتِ جمال اور رحمت کے مقابلے ان میں صفاتِ جلال اور صفاتِ غضب زیادہ کھلے طور پر ظاہر ہو رہی ہوں۔ ارواح کی صفات کا تعلق ''تشبیہ'' سے زیادہ قوی ہے اگرچہ یہ تعلق صرف ''تشبیہ'' تک محدود نہیں ہے۔ اس کے برعکس بدن کی صفات کا تعلق ''تنزیہ'' سے زیادہ قوی ہے اگرچہ یہ تعلق صرف اس تک محدود نہیں ہے۔

اگر نور اور آب و گل کی متضاد صفات کا تجزیہ کیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ آگ میں دونوں قسم کی

صفات پائی جاتی ہیں۔ ہمارے خارج کی دنیا میں ایک مخلوق ایسی بھی ہے جو نہ روح ہے نہ بدن۔ اسے جن کہتے ہیں۔ ہمارے اندر کی دنیا میں ہماری ایک سمت، ایک جہت ایسی ہے جو نہ روح ہے نہ بدن۔ اسے نفس، خودی یا خیال کہا جاتا ہے۔ ہمارے نفس ہر دم متغیر اور مبہم ہوتے ہیں جیسے آگ یا خواب میں نظر آنے والے عکس اور شبیہیں۔ ہمارے نفس کی صفات نہ تو روح کی صفات ہیں نہ بدن کی۔ بلکہ اس میں طرفین کی صفات کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ جب بھی خیال اور عالمِ خیال کی بات کی جاتی ہے تو ایک ابہام در آتا ہے۔ زور اس بات پر ہوتا ہے کہ نور و ظلمت مل کر ایک آمیزہ بنا رہے ہیں اور یہ کہ ''تشبیہ'' و ''تنزیہ'' ایک دوسرے میں گتھی ہوئی رہتی ہیں۔

پیمانۂ تقدیر The Measuring Out

حدیثِ جبرئیل میں رسولِ خداؐ نے ایمان کے بارے میں فرمایا تھا کہ ایمان میں یہ بھی ہے کہ ''تم تقدیر پر ایمان لاؤ، اس کے خیر و شر پر۔'' ''قدر'' (تخمینہ، اندازہ، قیاس، ناپنا، ناپ تول کر حصہ دینا یا معین کرنا)۔ اس اصطلاح کا ترجمہ عموماً predestination کے لفظ سے کیا جاتا ہے اور کچھ سیاق و سباق میں یہ ترجمہ ٹھیک بیٹھتا ہے لیکن اس ترجمے پر انحصار کر لیا جائے تو لفظ کی اس وسیع معنویت کا ادراک نہیں ہو سکے گا جو قرآن و حدیث میں اس کے استعمال سے خاص ہے۔ کتاب کے زیرِ نظر حصے میں ہم اس اصطلاح کے معانی کی وسعت کو نمایاں کرنے کی کوشش کریں گے اور اس غرض سے اس اصطلاح کے ان مضمر معانی کو کھول کر بیان کریں گے جن پر عموماً مسلمانوں کے تصورِ تقدیر پر بات کرتے ہوئے توجہ نہیں کی جاتی اور ان مباحث اور موضوعات میں اس اصطلاح کی کارفرمائی کا جائزہ لیں گے جن پر شاذ و نادر ہی گفتگو کی جاتی ہے۔ اس تصور سے اگر انصاف کرنا ہو تو ضروری ہے کہ پہلے اس کا ربط ''توحید'' کے تصور سے واضح کیا جائے۔

قوتِ تخلیق

''قدر'' کا لفظ اسی بنیادی سہ حرفی مادے سے ہے جس سے ''القدیر'' بنا ہے۔ ''القدیر'' اللہ کے ناموں میں سے ایک ہے اور ہم اس کا ترجمہ powerful (قدرت والا، طاقتور) کے لفظ سے کرتے رہے ہیں۔ اس لفظ کا مصدر ''قدرت'' ہے جو اس صفتِ خداوندی کا عنوان ہے۔ قدرت کا لفظ ''قدر'' سے معنوی طور پر بھی قریب ہے اور لفظی اشتقاق میں بھی۔ قدرت رکھنے کا مطلب ہے کہ آپ کچھ

کرنے یا بنانے کی صلاحیت اور استعداد رکھتے ہیں، کسی عمل پر قادر ہیں، کس مقصد کو حاصل کر سکتے ہیں۔ قرآن میں بار بار آیا ہے کہ اللہ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔ ''**واللّٰہ علیٰ کل شیٔ قدیر۔**'' سو اس کی قدرت اور قوت، ہمارے برعکس، لامحدود ہے اور وسیع ہے۔

''قدر'' کو بعض اوقات ''قدرت'' کے مترادف کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ سو اس کے معنی ''قوت'' اور ''قابلیت وصلاحیت'' کے بھی ہوئے۔ لیکن ''قدر'' کا لفظ اس مادے کے بنیادی مفہوم پر زور دیتا ہے یعنی ناپنا، تخمینہ کرنا، کسی شے کی مقدار یا حجم کا اندازہ کرنا۔ یہ کام جسمانی طور پر بھی کیا جا سکتا ہے جیسے کسی پیمانے، مسطر یا فیتے کی مدد سے اور اسے ذہنی طور پر بھی انجام دیا جا سکتا ہے، حساب، گنتی اور جمع تفریق کے ذریعے۔ اس اصطلاح کا صرف اتنا ہی مفہوم نہیں ہے کہ ''کسی شے کے حجم کا تخمینہ، ناپ تول کا اندازہ کرنا'' یہی لفظ ''آنکنے یا کسی شے کے کردار، صلاحیت یا اعمال کا اندازہ، اس کی وسعت کی جانچ کرنے'' کے معنی بھی دیتا ہے۔ یہ مفہوم لیجیے تو مطلب ہوگا اس شے پر قابو، کنٹرول، اس کا اہتمام، اس پر قدرت یابی۔'' بات پھر ''قدرت'' کی طرف لوٹ آئی۔

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيۡءٍ قَدِيۡر۔ اللہ کی قدرت ہر شے پر محیط ہے جب کہ انسانوں کو ایک قدرے محدود قدرت حاصل ہے کیونکہ یہ قدرتِ خداوندی کا ایک عکس ہے۔ سامنے کی بات ہے کہ انسانوں کو اللہ پر کوئی قدرت نہیں۔ سورج کی کرن کا سورج پر بس کیوں کر چل سکتا ہے۔ یہی نہیں، انسان تو اللہ کی ہدایت کے بغیر صحیح معنی میں اسے سمجھ بھی نہیں سکتا کیونکہ کسی شے کا فہم، اسے جان لینا کسی حد تک ہمیں اس پر قدرت بھی دے دیتا ہے۔

وَلَا يُحِيۡطُوۡنَ بِشَيۡءٍ مِّنۡ عِلۡمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ (۲:۲۵۶)	اور یہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر جو وہ چاہے۔
مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدۡرِهٖۤ (۶:۹۱، ۲۲:۷۴، ۳۹:۶۷)	انھوں نے اللہ کو ویسے نہیں جانچا جیسے جانچنے کا حق تھا۔

قرآن میں ''قدر'' کا لفظ دس جگہ استعمال ہوا ہے۔ اسی کی بنیاد پر آگے چل کر اس عقیدے کی تشکیل ہوئی جسے قضا وقدر یا جبر وقدر کا عقیدہ کہا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں نے ''قدر'' کے تصور کو عموماً جس طرح سمجھا ہے اس میں علمِ کلام اور الٰہیاتی اندازِ فکر کے اثرات کم اور قرآنی آیات کی اثر آفرینی زیادہ رہی ہے۔ آیئے ان میں سے چند آیات پر نظر ڈالیں۔ ان آیات سے وہ بنیادی اسلامی تصورات

بہ سہولت سامنے آ جاتے ہیں جو انسان اور خدا اور خدا اور کائنات کے تعلق کو بیان کرتے ہیں۔

اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ (۵۴:۴۹)	ہم نے ہر چیز بنائی پہلے ٹھہرا کر۔
وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (۱۵:۲۱)	اور ہر چیز کے ہمارے پاس خزانے ہیں اور ہم ایک ٹھہرے ہوئے اندازے ہی پر اُتارتے ہیں۔

یہ دو آیات قرآن کے اساسی تصورات کا بیان ہیں کہ اللہ تعالیٰ علیم وقدیر اور خالقِ کائنات ہے۔ وہ ہر شے کا ماٴخذ ومصدر ہے پس اس کے پاس سب کچھ ہے۔ اشیا خواہ اس کے خزانۂ غیب میں مستور ہوں یا ہمارے روبرو عالمِ شہود میں دکھائی دے رہی ہوں وہ ان سب کا علم رکھتا ہے۔

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ، وَيَعْلَمُ مَا فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ، وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (۶:۵۹)	اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں۔ ان کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بحر و بر میں جو کچھ ہے اسے وہی جانتا ہے۔ کوئی پتا نہیں جھڑتا اس کے علم کے بغیر۔ اور نہ کوئی دانہ زمین کے اندھیروں میں اور نہ ہرا نہ سوکھا جو نہیں کھلی کتاب میں۔

اللہ تعالیٰ جب کسی شے کی تخلیق کرتے ہیں تو اس کو جامۂ ہستی عطا کرتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اللہ تعالیٰ وہ تمام خزانے اپنے پاس رکھتے ہیں جن سے کسی شے کو سامانِ ہستی نصیب ہوتا ہے۔ یہ خزانے، رحمت اور حق کی نمایندگی کرتے ہیں جو صرف اللہ ہی سے خاص ہیں۔ ''لا حق الا الحق" (اس ذات حقیقی کے سوا اور کوئی حقیقت نہیں)۔ مزید تفصیل میں جایئے تو یہ خزانے صفاتِ الٰہیہ کے خزانے ہیں جو اس کائنات میں ہر حقیقی اور اچھی صفت اور خاصیت کا منبع ہیں۔ چنانچہ اگر کسی شے کو زندگی ملتی ہے تو اللہ کے مخزنِ حیات سے، قوت حاصل ہوتی ہے تو اس کے مخزنِ قدرت سے اور رحمت کی توفیق ہوتی ہے تو اس کے خزانۂ رحمت سے۔

ان خزانوں سے اشیائے کائنات کو کیا ملے گا؟ اس بات کا فیصلہ کون کرتا ہے؟ خزانے کا مالک۔ اس فیصلے کو کیا کہتے ہیں؟ تقدیر measuring out (حصہ لگانا، ناپ تول کر معین کرنا) اللہ تعالیٰ علم، قدرت، رحمت، محبت، خیر اور دیگر صفات کو معین کر کے تقسیم کرتے ہیں۔ کسی مخلوق کا بس نہیں کہ ان

صفات میں اپنا نصیب یا حصہ خود مقرر کر سکے۔ ہر شے کو ان حقیقی صفاتِ ہستی میں سے وہی ملتا ہے، اسی حد تک شریک ہونے کی اجازت ملتی ہے جس حد تک الحق کی طرف سے، بارگاہِ حق سے اذن ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ دینے والے ہیں، مخلوقات تو صرف عطیۂ صفات کے لیے دامنِ طلب پھیلا سکتی ہیں۔ ''تنزیہ'' کا تقاضا ہے کہ حقیقت صرف اللہ ہی سے خاص ہو لیکن ''تشبیہ'' اس بات کی مقتضی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی حقیقت کا ایک پرتو مخلوق کو بھی عطا کرے، جس طرح بھی اسے منظور ہو۔ تقدیر سازی، مقدورات کا معین کرنا، قدر کا اختیار اللہ کے پاس ہے، ہمارا اس میں کوئی دخل نہیں۔

لَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِی الْاَرْضِ وَلٰكِنْ یُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا یَشَآءُ ۚ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِیْرٌۢ بَصِیْرٌ (۴۲:۲۷)	اور اگر اللہ اپنے بندوں کے لیے روزی کھول دے تو وہ زمین میں اودھم مچا دیں۔ لیکن وہ ناپ کر اتارتا ہے جتنا چاہتا ہے۔ بے شک وہ اپنے بندوں سے باخبر اور ان کو دیکھنے والا ہے۔

قرآن کی اہم اصطلاحات کی طرح ''عبد'' (جمع۔ عباد) بھی ایک تہ دار لفظ ہے اور اس کے معانی کی متعدد سطحیں ہیں۔ وسیع ترین معنی میں اس کو ''مخلوق'' کے ہم معنی و مترادف کہا جا سکتا ہے۔ ہر شے اللہ کی بندگی کرتی ہے کیونکہ اللہ نے اسے اپنا کام کرنے کے لیے تخلیق کیا ہے اور وہ اپنا کام کرتی رہتی ہے خواہ اس کا علم رکھتی ہو یا نہ رکھتی ہو، کرنا چاہتی ہو یا نہ کرنا چاہتی ہو۔ جس طرح زمین و آسمان کی ہر شے ''مسلم'' ہے کیونکہ وہ اللہ کے سامنے سرافگندہ ہے، اس کی اطاعت گذار ہے اسی طرح ہر شے خدا کا عبد ہے، بندہ ہے۔

اِنْ كُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّاۤ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا (۱۹:۹۳)	کوئی نہیں آسمان و زمین میں جو نہ آئے رحمان کا بندہ ہو کر۔

''عبد'' کی اصطلاح کے قدرے محدود معنی مراد لیے جائیں تو عبد وہ شخص ہو گا جو شعوری طور پر کسی نبی کی پیروی کرتے ہوئے اللہ کی بندگی کرتا ہو۔ محدود تر معنی میں عبد وہ انسان کہلائے گا جو پوری آگہی کے ساتھ اللہ کی کامل بندگی کرے اور یہ بندگی مکمل طور پر اختیاری ہو۔ موخر الذکر معنی میں ''عبد'' کا لفظ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بولا جاتا ہے اور یہ آپؐ کا سب سے جلیل الشان لقب سمجھا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا آیت (۴۲:۲۷) میں بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو جو کچھ دیتے ہیں اس کا اندازہ معین کر دیا جاتا ہے ورنہ مخلوقات اپنی حد سے تجاوز کرنے لگیں اور عالمِ خلق میں فساد پھیل

جائے۔آیت کو اگر وسیع معنی میں لیجیے تو مطلب یہ ہوگا کہ مخلوق کو جو صفات اللہ نے دی ہیں ان پر کچھ قیود اور پابندیاں ہیں اور انھی پابندیوں سے ان مخلوقات کو شناخت ملتی ہے۔

وَاٰتٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَه(۵۰:۲۰) اس نے ہر شے کو اس کی خلقتِ (خاص) عطا کی۔

اگر چاند کی روشنی حدِ افراط کو پہنچ جائے تو رات کی ساعتیں نایاب ہو جائیں۔اگر بلی کو مقررہ حد سے زیادہ طاقت حاصل ہو جائے تو نہ اسے پالتو جانور بنایا جا سکے گا نہ چوہوں کو ختم کرنے کا وسیلہ رہے گا۔یہ حکمتِ خداوندی ہے جو کائنات کے پس منظر میں رہ کر اس امر کا تعین کرتی رہتی ہے کہ سب مخلوقات کے حق میں بہتر کیا ہے۔فارسی کی ضرب المثل ہے کہ ''اللہ کو معلوم تھا جبھی اس نے گدھے کو سینگ نہیں دیے۔''

اب اس قرآنی آیت کو ذرا انسان اور انسانی معاشرے پر لاگو کر کے دیکھیے۔مفہوم یہ نکلے گا کہ سماجی نظام برقرار تبھی رہتا ہے جب انسانوں میں مفلسی، حاجت مندی اور دکھ تکلیف موجود ہوں۔اگر سبھی لوگ رئیس ہو جائیں تو نانبائی کون بنے گے؟ یا پھر فصلیں اُگانے کی محنت کون کرے گا؟ لوگوں کے درمیان تفاوت معاشرے کی بہبود کے لیے از حد لازمی ہے۔مزید براں اگر اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو غنی اور مالدار بنایا ہوتا تو وہ سب سے بنیادی انسانی کام سے روگردانی کرتے یعنی ''توحید'' کا اثبات۔اگر اللہ نے انسان کو ہر وہ چیز دے دی ہوتی جس کا تقاضا اس کی اسفل طبیعت lower nature میں پایا جاتا ہے تو اس کے پاس اپنی حاجت روائی کے لیے اللہ کی طرف دیکھنے اور اس سے مانگنے کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی؟ لوگ باگ اسی دنیا کو فردوسِ بریں سمجھا کرتے اور ''توحید'' سے غافل ہو جاتے۔اللہ کے باغی بن جاتے کیونکہ اب ان کے پاس دوسرے خداؤں کی پرستش کا سامان ہو جاتا، ان خداؤں میں سب سے بڑا خود انسان کی ہوا و ہوس ہے۔

خلاصہ یہ کہ ''قدر'' سے متعلق آیات میں ایک یہ مفہوم بھی مضمر ہے کہ اللہ نے انسان کو جو کچھ دیا ہے اس میں اللہ کی ایک حکمت ہے اور ایسا ایک مقصد سے کیا گیا ہے۔اس کے کاموں میں حکمت اور رحمت ہے خواہ ہم اس حکمت کا ادراک کرنے سے قاصر ہوں اور خواہ ہمیں اس بات کا دکھ ہو کہ مال و دولتِ دنیا میں سے ہمارے نصیب میں اتنا تھوڑا سا کیوں ہے۔

وَعَسٰی اَنْ تَکْرَهُوْا شَیْئًا وَّهُوَخَیْرٌ لَّکُمْ وَعَسٰی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّکُمْ وَاللّٰهُ

شاید تم کو ایک چیز بری لگے اور وہ بہتر ہو تمھارے لیے۔اور شاید تم کو خوش آئے ایک

يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۲:۲۱٦) چیز اور وہ بری ہو تمھارے لیے۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

مخلوقات کو جو خیر بھی، جو اچھی چیز ملتی ہے اللہ کے پیمانۂ تقدیر کے مطابق ملتی ہے۔ قرآن نے اس امر کی طرف ''پانی'' کی مثال سے اشارہ کیا ہے۔ بارش کا پانی جو آسمان سے زمین پر برسایا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ آسمان فرشتوں کا اور ارواح کا مسکن ہے۔ آسمان ہے تو مخلوق ہی مگر ساتھ ہی نور کا مأخذ بھی ہے، خالص، پاکیزگی اور بالیدگی کا منبع جس سے زمین پر اگنے والی ہر شے کو نمو ملتی ہے۔ پانی کے بغیر زندگی پنپ نہیں سکتی۔ آسمان کے بغیر زمین مردہ رہتی ہے۔ لیکن اگر زمین نہ ہو تو آسمان اپنے تحفے، اپنے انعامات کیسے اور کہاں ظاہر کرے گا؟ مندرجہ ذیل آیات کا بیان یہ ہے کہ قلمرو تخلیق میں ہر نعمت، ہر برکت جو اس زمین پر ہمیں نصیب ہوتی ہے اللہ کے نظام ''قدر'' کے مطابق ہوتی ہے، اس کے پیمانۂ تقدیر سے ناپ کر ملتی ہے۔

وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِى الْاَرْضِ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ۔ فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ (۱۹-۱۸ :۲۳) اور ہم نے آسمان سے پانی برسایا۔ پھر اس کو ٹھہرا دیا زمین میں۔ اور ہم اس کو واپس لے لینے پر قادر ہیں۔ پس ہم نے اس سے تمھارے لیے باغ اُگائے۔

وَالَّذِىْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا (۱۱:۴۳) اور جس نے آسمان سے پانی اُتارا ایک اندازے کے ساتھ۔ پس ہم نے اس سے پھر ابھار دیا مردہ زمین کو۔

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِ...... (۱۳:۱۷) اس نے آسمان سے پانی برسایا تو وادیاں اپنے اپنے ظرف کے مطابق بہ نکلیں......

زمینی مخلوق وہ خشک وادی ہے، وادی کی تلیٹی ہے جس میں نہ زندگی پائی جاتی ہے نہ علم، نہ ہی ارادہ، قدرت، رحمت اور دیگر مثبت صفات میں سے کوئی ایک، جب تک کہ آسمان سے اترنے والے پانی کا بہاؤ اسے سیراب نہ کرے۔ پھر ہر وادی، ہر طاس، بقدرِ وسعت، پُر آب ہو جاتی ہے۔ غور کیجیے کہ یہاں زور اس بات پر نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک معین اندازے کے مطابق پانی عطا کیا۔ لفظ وہی ''قدر'' کا استعمال ہوا ہے لیکن نکتہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ جب کسی شے کی شناخت معین ہو جاتی ہے، پیمانۂ

تقدیر طے ہو جاتا ہے تو پھر اس میں اسی ''قدر'' پانی کی سمائی ہوسکتی ہے جو اس کے لیے ''مقدر'' ہے۔

اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلقه	اس نے ہر شے کو اس کی خلقتِ خاص عطا کی۔
لَاتَبۡدِیۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰه (۳۰:۳۰)	اللہ کے بنائے میں تبدیلی نہیں۔

ہاتھی کبھی مکھی نہیں بنتا لیکن اولادِ آدم ذرا پیچیدہ مخلوق ہے۔ ابھی ہم نے تقدیر کے بارے میں جتنی باتیں کہیں اس سے بظاہر تو یہ واضح لگتا ہے کہ نوعِ انسانی کے پاس اپنا کچھ بھی نہیں۔ لیکن صورت حال اتنی سیدھی سادی نہیں ہے پہلی بات تو یہی دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے بقدرِ ظرفِ انسانی اسے آزادی واختیار بھی دے رکھا ہے بلکہ انسانوں کے حصے میں جتنا اختیار دے دیا گیا ہے وہ کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔

خیر وشر

ایمان بالقدر میں کوئی استثنا نہیں۔ حدیثِ جبرئیل میں یوں آیا ہے کہ تم ایمان لاؤ ''قدر پر، اس کے خیر پر اور اس کے شر پر۔'' خیر ہو یا شر جو بھی اس پیمانۂ تقدیر سے ناپ کر دیا جا رہا ہے اللہ ہی کا معین کردہ ہے۔ آج کے جدید طرزِ احساس کو یہ نکتہ خاص طور پر ناگوار گذرتا ہے۔ بھلا ایک رحمان و رحیم خدا شر کس طرح تقسیم کر سکتا ہے۔ یہ ردِعمل قابلِ فہم تو ہے لیکن اُدھوری معلومات پر مبنی ہے۔ اس طرح کا کوئی فیصلہ دینے سے پہلے ہمیں چاہیے کہ قدر کے اس تصور کو قرآن میں بیان کردہ اس کے سیاق وسباق میں رکھ کر دیکھیں اور اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں مسئلہ زیر بحث یعنی خیر وشر کی ماہیت کو گرفت میں لانا ضروری ہے۔

انگریزی میں خیر اور شر کا مترادف Good-Evil کے الفاظ ہیں۔ یہ دونوں اصطلاحات انگریزی میں بہت پھیلے ہوئے مفاہیم پر محیط ہیں۔ لیکن عام طور پر ان میں اچھے برے کا ایک فیصلہ ضرور مضمر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس قرآنی سیاق وسباق میں خیر اور شر عام طور پر صحیح اور غلط کا بیان کرنے کے لیے نہیں ہوا بلکہ اس سے اشارہ کسی شے کے فائدے یا نقصان کی طرف ہوا کرتا ہے۔

لَا یَسۡئَمُ الۡاِنۡسَانُ مِنۡ دُعَآءِ الۡخَیۡرِ، وَ اِنۡ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَیَئُوۡسٌ قَنُوۡطٌ (۴۱:۴۹)	انسان اپنا بھلا مانگتے ہوئے تھکتا نہیں اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچ جائے تو مایوس اور دل شکستہ ہو جاتا ہے۔
وَلَوۡ یُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسۡتِعۡجَالَهُمۡ	اگر اللہ لوگوں کو شتابی سے شر دے دیا کرتا

بِالۡخَیۡرِ لَقُضِیَ اِلَیۡہِمۡ اَجَلُہُمۡ (۱۰:۱۱) — ایسے ہی جیسے انھیں خیر مانگنے کی جلدی ہوتی ہے تو ان کی مدت تمام کردی گئی ہوتی۔

یہ خیر وشر جس کو بقدر اندازہ معین کرنے کا ذکر ہو رہا ہے اس کا تعلق ان چیزوں سے ہے جو یا تو انسان حاصل کرنا چاہتا ہے یا ان سے بچنا چاہتا ہے۔ یہاں مسئلہ زیر بحث اخلاقی معنوں میں خیر اور شر کا نہیں بلکہ اس چیز کے ملنے یا نہ ملنے سے متعلقہ فرد کو اضافی طور پر جس بھلائی یا برائی کا سامنا کرنا ہوتا ہے اس کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ حدیثِ جبرئیل میں جب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ''قدر'' کے خیر اور شر کی طرف اشارہ فرمایا تو آپ کو ایک انسانی صورتِ حال کے بارے میں فیصلہ دینا تھا۔ ہمیں ضرر و زیاں کا سامنا ہو جائے تو یہ ہمارے لیے شر ہے۔ ہمیں ایک فائدہ پہنچتا ہے یہ ہمارے لیے خیر ہے۔

عام طور پر آپ کا نقصان میرا فائدہ ہوتا ہے۔ جو چیز آپ کے لیے شر ہے وہ کسی اور شخص کے لیے خیر ہے۔ اور اس کے برعکس۔ اسی طرح آج جو چیز شر لگتی ہے وہ آگے چل کر خیر بن کر سامنے آ سکتی ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو ایسے تجربوں سے گذرنا ہوتا ہے جو آج دشوار اور صبر آزما لگتے ہیں لیکن وقت گذرنے کے بعد جب ہم لوٹ کر ان پر نظر دوڑاتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ ہاں واقعی یہ ہمارے لیے خیر کی بات تھی۔ یہی نہیں، موت جو ایک فرد کے لیے بظاہر شر لگتی ہے دراصل انسان کے لیے باعث خیر ثابت ہوتی ہے۔ ذرا غور کیجیے تو یہ جاننا بھی کچھ مشکل نہ ہوگا کہ موت اس دنیا کی عمومی بھلائی کے لیے کتنی ضروری ہے۔

قرآن نے بارہا متنبہ کیا ہے کہ خیر وشر کے بارے میں انسان کے فیصلے اکثر غلط ہوتے ہیں۔ ممکن ہے آپ سٹہ کھیل کر کوئی بڑی رقم جیتنے کو بھلا کام جانیں جب کہ اصل میں یہ آپ کے لیے باعثِ شر ثابت ہو۔ انسان جب اپنے معیار اور اپنے پیمانے سے خیر وشر کا فیصلہ کرنے چلتا ہے تو اکثر ٹھوکر کھاتا ہے۔

وَلَا یَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ یَبۡخَلُوۡنَ بِمَاۤ اٰتٰہُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ ہُوَ خَیۡرًا لَّہُمۡ ؕ بَلۡ ہُوَ شَرٌّ لَّہُمۡ (۳:۱۸۰) — اور جو لوگ بخل کرتے ہیں اس چیز میں جو اللہ ہی نے اِن کو اپنے فضل سے دی ہے، یہ نہ سمجھیں کہ یہ ان کے حق میں بہتر ہے۔ بلکہ یہ برا ہے ان کے لیے۔

انسان یوں سوچتا ہے کہ جو اس نے چاہا وہ اچھا ہے اور جو اسے ناپسند ہے وہ برا ہے۔ اکثر لوگ اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ اس دنیا کے مزے، اس دنیا کے فائدے اچھی چیز ہیں۔ لیکن قرآن اس

بات پر زور دیتا ہے کہ انسان کے لیے یہ چیزیں لازماً خیر کا سبب نہیں ہوتیں، خاص طور پر جب ان میں الجھ کر انسان اپنی انسانی ذمہ داری سے غافل ہو جائے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ (۳:۱٤)

لوگ ریجھے ہوئے ہیں مزے کی چیزوں کی محبت پر۔ عورتیں، بیٹے، سونے چاندی کے جوڑے ہوئے ڈھیر، اصیل گھوڑے، مویشی اور کھیتیاں۔

رسول اللہؐ کے زمانے سے لے کر آج تک اس فہرستِ مرغوبات میں بہت کم تبدیلی آئی ہے۔ اگر اسے آج کے اسلوب میں دوبارہ درج کرنا ہو تو پہلی شق کو مذکر مؤنث سے آزاد کر کے "lovers" (چاہنے والے) کر دیجیے اور آخری تین کو ''گاڑیاں، الیکٹرونک آلات اور املاک'' سے بدل دیجیے۔ انسان کی نظر میں یہ سب خیر کے اسباب ہیں اور اگر اللہ تعالی میں دانا والدین کی صفاتِ حکیمانہ نہ ہوتیں تو وہ اس دنیا کے ناسمجھ بچوں کے لیے ان کی من پسند چیزوں کی بھرمار کر دیتا۔ قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات سے یہی سمجھ میں آتا ہے۔ ان آیات میں رحمتِ خداوندی کا تذکرہ ہے اور رحمت کی اصطلاح کئی اعتبار سے خیر کے مترادف ہے۔ پس انسانوں کے مابین رحمت کی تقسیم اصل میں خیر کو بقدرِ ظرف و بقدرِ اندازہ معین کرنے کے برابر ہے۔ یہی پیمانۂ تقدیر ہے۔

اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ؕ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ؕ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ؕ وَلَوْ لَاۤ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّ مَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ؕ وَ لِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّ سُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ ؕ وَ زُخْرُفًا ؕ وَ اِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ (۴۳:۳۲-۳۵)

کیا تیرے رب کی رحمت کو یہی بانٹتے ہیں؟ دنیا کی زندگی میں ان کی روزی ان میں بانٹی ہے اور بعض کو بعض سے اونچے درجے پر رکھا تا کہ وہ ایک دوسرے سے کام لے سکیں۔ اور تیرے رب کی رحمت ان چیزوں سے بہتر ہے جو یہ سمیٹتے ہیں۔ اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ لوگ (ناشکری اور حق کو چھپانے کی وجہ سے) ایک ہی ڈگر پر چل پڑیں گے تو ہم ان لوگوں کے گھروں کی چھتیں چاندی کی کر دیتے جو رحمان کے منکر ہیں اور زینے بھی (چاندی

کے) جن پر وہ چڑھتے اور ان کے گھروں
کے دروازے ان کے تخت بھی (چاندی کے)
جن پر وہ ٹیک لگا کر بیٹھتے، بلکہ یہ (چیزیں)
سونے کی کر دیتے اور یہ سب کچھ نہیں، بس
جیتے جی ان کو برتنا ہے اور اگلی دنیا کا گھر
تیرے رب کے ہاں انھی کا ہے جو اللہ سے
ڈرتے ہیں۔

یہاں یہ اہم نکتہ ذہن میں رہے کہ قرآن مجید نے کئی مختلف اصطلاحات استعمال کی ہیں جن کا ترجمہ بالعموم ''خیر'' اور ''شر'' کے الفاظ سے کیا جاتا ہے۔ ان میں ''حسن'' اور ''سوء'' کے الفاظ کا جوڑا خاص طور پر نمایاں ہے کہ ان الفاظ میں ایک بھرپور کنایہ اخلاقی فیصلے کا پایا جاتا ہے۔ ہم نے ان الفاظ کو خیر اور شر سے الگ رکھنے کے لیے ان کا ترجمہ beautiful (خوب) اور ugly (ناخوب) سے کیا ہے۔ قرآن جب ''حُسن'' اور ''سُوء'' کے الفاظ لاتا ہے تو ان میں انسان کے عمل کے صحیح اور غلط ہونے کے بارے میں ایک فیصلہ جھلکتا ہے۔ یہاں انسان کے فہم میں آنے والے فائدے نقصان کا ذکر نہیں ہوتا۔ خیر اور شر کی اصطلاحات بسا اوقات ''حُسن وسُوء''، خوب اور ناخوب، کی اصطلاحات کے ہم معنی ہو جاتی ہیں کیونکہ بالآخر فائدے اور نقصان کا دارومدار صحیح یا غلط اعمال ہی پر ہوتا ہے۔

خیر وشر کی ماہیت کو سمجھنا ہو تو بات کو کلمۂ شہادت (لاالٰہ الا اللّٰہ) کے سیاق وسباق میں رکھ کر دیکھنا ہوگا۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ ہر خیر کی چیز، ہر نوع کا خیر، الحق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ناحق، غیر حقیقی اور شر کے مساوی ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ خیر روشنی ہے اور شر ظلمت ہے۔ جیسے ظلمت اصل میں فقدانِ نور کے سوا اور کچھ نہیں اسی طرح شر بھی خیر کے فقدان کے سوا اور کچھ نہیں۔ لا الٰہ الا اللّٰہ کا مطلب ہے کہ ''اللہ کے سوا اور کچھ خیر نہیں''، ہم کلمۂ شہادت میں ''شر'' کا لفظ نہیں داخل کر سکتے کیونکہ شر لاشئ ہے۔

رسولِ خداؐ نے اپنی مختصر دعائیہ حمد میں اللہ تعالیٰ سے خیر وشر کی نسبت کو یوں واضح فرمایا ہے ''الخیر کله بیدیك، والشرلیس الیك'' (خیر تو سب کا سب آپ ہی کے ہاتھ میں ہے، لیکن شر لوٹ کر آپ کی جانب نہیں جاتا) تو پھر شر کا مرجع کیا ہے؟ فقدانِ خیر، خیر نہ ہو تو شر، فقدانِ نور، فقدانِ حقیقت، صفاتِ خداوندی کی ناموجودگی۔ بالفاظ دیگر، شر کا تعلق ماسوی اللہ سے ہے جب کہ خیر صرف

اللہ تعالیٰ سے متعلق ہے۔ لا خیر الا اللہ۔ سیدنا مسیح علیہ السلام نے انجیل میں یہی فرمایا تھا ”Why do you call me good? No one is good but God alone (Mark 10:18) (تم مجھے خیر کیوں کہتے ہو؟ خیر تو بس وہی ایک ہے، اللہ)

تنزیہ کے لحاظ سے دیکھیے تو کائنات کی خِلقت ہی میں شر داخل ہے۔ اللہ تعالیٰ جس حد تک اس کائنات سے کاملاً ورا اور سوا ہے اسی حد تک کائنات میں کوئی خیر نہیں پائی جاتی کیونکہ خیر تو صرف اللہ ہی ہے۔ لیکن اس کائنات میں جہاں تک اللہ کے آثار، افعال اور نشانیاں پائی جاتی ہیں اسی حد تک کائنات میں خیر پائی جاتی ہے اور یہ خیر اللہ کی خیر ہی کی وجہ سے ہے۔

یاد رہے کہ جس سطح پر ہم گفتگو کر رہے ہیں وہاں خیر و شر کا اخلاقی معاملات سے کوئی تعلق نہیں اور جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا، خیر اور شر کی اصطلاحات اپنے بنیادی مفہوم میں اخلاقی معنوں میں اچھائی برائی سے الگ ہیں۔ کسی شے کو خیر کہنے کا مطلب ہے کہ اس چیز پر کسی درجے میں صفاتِ خداوندی کی چھوٹ پڑ رہی ہے۔ اور کسی چیز کو شر کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں کسی حد تک صفاتِ الٰہیہ کا فقدان ہے۔ اس لحاظ سے ہر شر خیر بھی ہے اور شر بھی۔ خیر تو صرف اللہ ہی، سو اس کے سوا ہر چیز شر ہے۔ لیکن ”تشبیہ“ سے ہمیں یہ معلوم ہوا ہے کہ اس کائنات کی چیزیں اللہ تعالیٰ سے مطلقاً الگ نہیں ہیں، اس کی غیر نہیں ہیں۔ اشیائے کائنات میں اللہ سے غیریت جتنی کم ہوں گی اتنا ہی ان میں خیر ہوگی۔ ہر شے میں خیر اور شر ملا جلا رہتا ہے، نور اور ظلمت، اعلیٰ و اسفل، علم اور جہل، قوت اور ضعف کا امتزاج ہوتا ہے۔

جب بعض مسلم مفکرین یہ کہتے ہیں کہ ساری کائنات عالمِ خیال ہے، تو ان کے پیشِ نظر اشیا کی ماہیت میں پایا جانے والا ایک ابہام ہوتا ہے۔ اس ابہام کی علت یہ ہے کہ خلق میں الحق نہ تو مکمل طور پر موجود ہے نہ اس میں سے مکمل طور پر مفقود ہے۔ کائنات کی ہر شے ہمارے سمیت عکسِ آئینہ کے مانند ہے۔ وہ چیز جو آئینے میں اپنا عکس ڈال رہی ہے حقیقتِ الٰہی ہے، جو ہر مثبت صفت کا ماٴخذ اور منبع ہے، وہ جو اپنی نشانیاں ظاہر کرتی ہے۔ یہ آئینہ عدم کا آئینہ ہے اور آئینۂ عدم کی کوئی ہستی نہیں، یہ تو صرف ایک تصور ہے جو ہماری سوچ کو ایک سہارا فراہم کرتا ہے۔ آئینے میں نظر آنے والا عکس اس لحاظ سے الحق کا عین ہے، الحق ہی ہے، کہ اس میں الحق کی صفات منعکس ہو رہی ہیں لیکن یہ الحق سے جدا اور سوا بھی ہے کیونکہ یہ عدم کے سہارے سے قائم ہے۔

آئینے میں انسانی عکس کی مثال پر غور کیجیے تو الحق اور عکسِ حق کا معاملہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ آئینے میں دکھائی دینے والا آپ کا عکس کس حد تک حقیقی ہے؟ اگر آئینہ چُور ہو جائے اور عکس غائب ہو جائے تو کیا آپ کو تشویش ہوگی؟ کیا عکس کا مٹ جانا آپ کے لیے افسوسناک ہوگا؟ یہ ''تنزیہ'' کا نقطۂ نظر ہے جو یہ بیان کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر طرح حقیقی ہے۔ کاملاً حقیقی ہے اور ہم نرے غیر حقیقی، بے حقیقت۔ لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوتی کیونکہ ''تشبیہ'' کے نقطۂ نظر سے دیکھیے تو ایک بہت بڑا فرق واقع ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے عکسِ جمال کی پرداخت کرتا ہے، شکستِ آئینہ اسے گوارا نہیں ہے۔ قرآن ہی کا فرمان ہے کہ وہ سب رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحمان و رحیم ہے۔ (وھو ارحم الرحمین) یہاں ہم اس نکتے پر زور دینا چاہیں گے کہ قرآن میں خیر اور رحمت کے تصورات ایک دوسرے سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ انگریزی کے لفظ Good کی طرح خیر کا لفظ مصدر بھی ہے اور صفت بھی، لیکن اس میں ایک تقابل کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ جب قرآن یہ کہتا ہے کہ

وَ رَحۡمَتُ رَبِّكَ خَيۡرٌ مِّمَّا يَجۡمَعُوۡنَ (۴۳:۳۲)	اور تیرے رب کی رحمت بہتر ہے ان چیزوں سے جو یہ سمیٹتے ہیں۔

تو اس میں اس امر کا اثبات پایا جاتا ہے کہ خیر اللہ کی رحمت ہے لیکن ساتھ ہی قرآن ہمیں یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ خیر صرف خیرِ الٰہی ہے۔ لوگ باگ اس دنیا میں حصول مسرت کے لیے جو کچھ جمع کرتے ہیں، دوستیاں، مال، اسباب یہ سب خیر کی عارضی، فانی اور موہوم شکلیں ہیں۔ ذرا مندرجہ ذیل آیت پر غور فرمائیے۔ اس میں ایک اور آیت کو ذرا کھول کر بیان کیا گیا۔ ہم اس آیت کا حوالہ خیر کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے پہلے بھی دے چکے ہیں۔

وَلَئِنۡ اَذَقۡنَا النَّاسَ مِنَّا رَحۡمَةً ثُمَّ نَزَعۡنٰهَا مِنۡهُ اِنَّهٗ لَيَـُٔوۡسٌ كَفُوۡرٌ (۱۱:۹)	اور اگر ہم انسان کو اپنی رحمت سے نوازیں اور پھر اس سے یہ چھین لیں تو وہ مایوس اور ناشکرا بن جاتا ہے۔

انسان کو رحمت کا ''ذائقہ چکھنے'' کو ملتا ہے۔ اس کا مالک بننے، اس کا ذخیرہ کرنے کی اسے اجازت نہیں۔ بالفاظِ دیگر، رحمت اللہ کی دین ہے، ان کی ملکیت نہیں ہے۔ رحمتِ خداوندی، اللہ کی صفت ہے اور وہ جس پر چاہتا ہے اپنی رحمت کرتا ہے۔

آزمایش Trial

قرآن مجید میں بارہا آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیمانہ تقدیر کے مطابق خیر و رحمت انسانوں میں اس لیے بقدرِ تعین تقسیم کرتا ہے کہ ان کے ایمان کی آزمایش کی جاسکے، انھیں اپنی فطرت کا ثبوت مل جائے۔ اللہ تعالیٰ کو اسے جاننے کی ضرورت نہیں کہ وہ تو اس فطرتِ انسانی سے پہلے ہی آگاہ ہے۔ انسان اپنی فطرت خود اپنے لیے آشکار کرتا ہے تاکہ جب اگلے جہان میں اپنی منزلِ آخر پر پہنچ کر اسے خدا کا سامنا کرنا ہو تو اعتراض کی گنجایش باقی نہ رہے، وہ لوگ جن کا تقدیر پر، اس کے خیر و شر پر ایمان ہے یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جو کرتے ہیں ٹھیک کرتے ہیں، خواہ انسان کی ذاتی خواہشات اور امیدوں کا مسلسل خون ہوتا رہے۔ اللہ کی عطا ہو تو اہلِ ایمان شکر بجالاتے ہیں اور اگر بندش ہو جائے، سلسلۂ عنایات رُک جائے تو صبر کرتے ہیں۔ یہی اہلِ ایمان کا شیوہ ہے، اسی سے ایمان کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کے برعکس اگر انسان کا ردِعمل اس انداز کا ہو جسے قرآن نے بار بار بدترین روّیہ کہہ کر ہدفِ تنقید بنایا ہے (اور اس کے لیے خیر و شر اور رحمت و غضب کے الفاظ استعمال کیے ہیں) تو پھر اس کے ایمان میں کسر رہ گئی۔

وَاِذَآ اَنۡعَمۡنَا عَلَى الۡاِنۡسَانِ اَعۡرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوۡسًا (۱۷:۸۳)	اور انسان پر جب ہم اپنا انعام کرتے ہیں تو وہ اعراض کرتا ہے اور پہلو بدل لیتا ہے اور جب اس کو مصیبت پہنچتی ہے تو آس توڑ بیٹھتا ہے۔

رحمت، خیر و برکت نصیب ہو تو انسان کو شکر گذار ہونا چاہیے اور اگر شر، تکلیف اور قہر کا سامنا ہو انسان کو چاہیے کہ صبر کرے اور ناامید نہ ہو۔ یہی صحیح انسانی رویہ ہے۔

خیر و شر کے فائدے نقصان کا میزان کرنا ہو تو قرآن میں بعض مقامات پر ''بلاء'' (امتحان، ابتلا) کا لفظ یا ''فتنۃ'' (آزمایش) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

وَنَبۡلُوۡكُمۡ بِالشَّرِّ وَ الۡخَيۡرِ فِتۡنَةً وَاِلَيۡنَا تُرۡجَعُوۡنَ (۲۱:۳۵)	اور ہم تمھیں پرکھنے کے لیے دکھ اور سکھ دونوں سے آزما رہے ہیں اور تم ہماری ہی طرف لوٹ کر آؤ گے۔

قرآن کا ارشاد ہے کہ انسان کو اس دنیا میں آزمایش کے طور پر بھیجا گیا ہے کہ اس پر اپنا جوہر آشکار ہو سکے، اپنا خوب اور ناخوب واضح ہو سکے۔ اس امتحان سے گذر کر ہی سب لوگوں پر یہ کھلے گا کہ ان کا آخری ٹھکانہ کیا ہے۔

وَقَطَّعْنٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اُمَمًا، مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ، وَ بَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّیِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ (۷:۱٦۸)

اور ہم نے ان کو زمین میں گروہ گروہ کر کے پھیلا دیا۔ بعض ان میں نیک ہیں اور بعض اور طرح کے۔ اور ہم نے ان کو خوشحالی اور بدحالی سے آزمایا شاید وہ لوٹ آئیں۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ

بے شک ہم تمھیں آزمائیں گے کچھ خوف اور بھوک سے اور مال، جان اور پھلوں کی کمی سے۔

وَالثَّمَرٰتِ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ(۱۵٦-۱۵۵:۲)

اور ان ثابت قدموں کو خوشخبری سنا دو جن کا حال یہ ہے کہ اگر ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں کہ بے شک ہم اللہ ہی کے ہیں اور ہمیں اسی کی طرف لوٹ جانا ہے۔

انسان کا امتحان اور آزمایش صرف شر، دکھ اور مصیبت ہی میں نہیں ہے لذتیں، فائدے اور آسایشیں بھی انسان کی آزمایش کرتی ہیں۔ دکھ تکلیف کے کارن یا عیش وطرب میں پڑ کر یادِ خدا نہ رہے تو انسان اس امتحان میں ناکام رہتا ہے۔ یہی نہیں، یادِ خدا بھی صحیح صورت میں ہونا ضروری ہے۔ اللہ کی طرف سے ملنے والے انعامات کی فہرست گنوانا کفایت نہیں کرتا۔ احساسِ تشکر کا ایمان سے چولی دامن کا ساتھ ہے اور ایمان کا تقاضا ہے شریعت کی پابندی، حکمِ خداوندی کی اطاعت۔ آیاتِ ذیل میں قرآن نے ان لوگوں پر نکیر کی ہے جو آڑے وقت میں، کسی مصیبت میں پڑ کر یا انعامات ِخداوندی پر اترانے کی وجہ سے اس امتحان کی کسوٹی پر پورے نہ اتر سکے۔ اس نکتے پر بھی غور کیجیے گا کہ اس آزمایش میں ناکام رہنے والوں کی خرابی کی طرف اشارہ کرنے کے فوراً بعد ان آیات میں ایسے اعمال صالحہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو ایمان کے ثبوت کے طور پر انجام دینا لازم ہیں۔

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَیَقُوْلُ رَبِّیْٓ اَكْرَمَنِ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَیْهِ رِزْقَهٗ فَیَقُوْلُ رَبِّیْٓ اَهَانَنِ، كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْیَتِیْمَ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰی طَعَامِ

لیکن یہ انسان، اس کا رب جب اسے آزماتا ہے، اور عزت بخشتا ہے اور نعمتیں عطا کرتا ہے تو کہتا ہے میرے رب نے میری شان بڑھائی ہے۔ اور جب وہ اسے آزماتا ہے اور اس کی

الْمِسْكِيْنِ ۰ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا وَّ تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (۲۰-۱۵:۸۹)

روزی تنگ کر دیتا ہے تو کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کرڈالا۔(نہیں یہ اس لیے نہیں ہوتا) ہرگز نہیں بلکہ (تمھیں آزمانے کے لیے ہوتا ہے اور تم اسے آزمایش سے بے پروا اس طرح زندگی بسر کرتے ہو کہ) یتیم کو عزت نہیں دیتے اور مسکینوں کا کھانا کھلانے کے لیے ایک دوسرے کو نہیں ابھارتے اور وراثت کو سمیٹ کر ہڑپ کر جاتے ہو اور مال کی محبت میں متوالے ہوئے رہتے ہو۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی آزمایش کرتے ہیں کہ ان میں سے کون ایمان رکھتا ہے اور اچھے عمل کرتا ہے اور کون لوگ ایسے ہیں جو حق کو چھپاتے ہیں اور فساد پھیلاتے ہیں۔

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (۱۸:۷)

جو کچھ زمین پر ہے ہم نے اسے زمین کی رونق بنایا ہے تا کہ لوگوں کو جانچیں کہ کون ان میں سے اچھا کام کرتا ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ نِ الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (۱۲:۶۷)

بہت بزرگ بہت فیض رساں ہے وہ (پروردگار) جس کے ہاتھ میں عالم کی بادشاہی ہے۔(وہی) جس نے موت وحیات کو پیدا کیا تا کہ تم کو آزمائے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔

مندرجہ بالا آیات میں جو نکتہ بیان ہوا ہے وہ قرآن میں بہت سے مقامات پر دہرایا گیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ انسان اکثر اپنی حیثیت اور اپنے اعمال کے مطابق اپنے درجے کو شناخت کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ اگر کوئی خیر نصیب ہو تو یوں سوچتا ہے کہ یہ اس کا حق تھا لیکن اگر بُرا وقت آن پڑے تو کہتا ہے کہ میرے ساتھ ظلم ہو گیا۔ یہ ''کفر'' ہے (یعنی ناشکری اور حق کو ڈھانپنا، کتمانِ حق)۔ یہ رویہ ایمان اور شکر گذاری دونوں کے خلاف پڑتا ہے۔

فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ بَلْ هِىَ فِتْنَةٌ وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۹:۴۹)

پس جب انسان کو کوئی دکھ پہنچتا ہے تو ہم کو پکارتا ہے پھر جب ہم اسے اپنی طرف سے کوئی نعمت بخشیں تو کہتا ہے کہ یہ تو مجھے میری تدبیر سے حاصل ہوئی۔ کوئی نہیں! یہ ایک آزمایش ہے لیکن اکثر لوگ یہ نہیں جانتے۔

توحید کا مطلب ہے کہ انسان کی کوئی مثبت چیز ایسی نہیں جو صحیح معنی میں اس کی اپنی ہو۔ معاملہ برعکس ہے۔ ہر خیر اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ لوگوں کو اگر خیر سے سابقہ پڑتا ہے تو یہ سراسر خدا کی دین ہے، انسان کا اس میں کوئی کمال نہیں ہے۔ اگر خرابی کا سامنا ہوتا ہے تو اس لیے کہ وہ اسی کے مستحق ہیں۔ اللہ کی رحمت اور اس کی برکت نہ ہو تو انسان ناچیز اور نابود ہو جائے۔ انسان کو اپنے اندر کے خیر اور نیکی کا جو زعم ہے اس کی تصویر کشی قرآن نے اسی طور کی ہے کہ یہ ماہیتِ اشیا کو غلط معنی دینے کا عمل ہے۔ انسان کے زعمِ باطل سے کسی کو کوئی ضرر نہیں پہنچتا۔ ہاں جھوٹے دعوے کرنے والے لوگ ضرور نقصان اٹھاتے ہیں۔ ''عدل'' اللہ کی ایک صفت ہے اس کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ ''کسی شے کو اس کا صحیح مقام دینا، اس کی درست جگہ پر رکھنا۔'' ''عدل'' کا اُلٹ ہے ''ظلم۔'' قرآنی استعمال کے مطابق ہم اس کا ترجمہ ''غلط کاری'' wrongdoing کر سکتے ہیں۔ غلط کاری انسان کا خاصہ ہے۔ اس کی تعریف یہ بتائی گئی ہے کہ ظلم کا مطلب ہے کسی شے کو غلط جگہ پر رکھنا، بے جگہ کرنا۔ انسان کی غلط کاریوں کو قرآن نے جا بجا ہدفِ ملامت بنایا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی ان لوگوں کا ذکر ہے جنھیں اس غلط کاری سے نقصان پہنچا ہے تو ان کے لیے قرآن مجید نے تقریباً ہر جگہ ''نفس'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ انسان خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ سورج کو مچھر کیا کاٹے گا۔ ہاں انسان جب کبھی بھی کسی شے کو بے جگہ کرے گا، بے جا کام کرے گا اسے نقصان ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ اس سے انسان کی اپنی فطرت مسخ ہو جاتی ہے اور وہ خود کو گمراہ کر لیتا ہے۔

مندرجہ ذیل آیت ان آیات کی ایک مثال ہے جن میں ''ظلم'' کا تذکرہ ہے، یہ آیت ان اقوامِ کہن کی تباہی کے قصے میں وارد ہوئی ہے جنھوں نے اپنے رسولوں کا انکار کیا تھا۔ یاد رہے کہ اللہ کے سوا جس شے کی پرستش کی جائے، جس کی بندگی کی جائے وہ خدا بن جاتی ہے۔ سب سے بڑا ''ظلم'' شرک ہے، ان اشیا کی بندگی کرنا جو اطاعت کے لائق نہیں، اللہ کی جگہ ماسوی اللہ کو دے دینا، اللہ کی

جگہ جھوٹے خداؤں کو خدا بنا لینا۔

وَمَا ظَلَمْنَا هُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِىْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَىْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ (۱۱:۱۰۱)

اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنی جان پر ظلم کر گئے اور پھر جب تیرے رب کا حکم آ گیا تو ان کے وہ دیوتا جن کو ہو اللہ کے سوا پکارتے تھے ان کے کچھ بھی کام نہ آئے اور انھوں نے ان کی بربادی کے سوا اور کسی چیز میں اضافہ نہ کیا۔

خلاصہ یہ کہ جب رسولِ خداؐ نے فرمایا تھا کہ ''قدر، خیرہ و شرہ'' تو ان کے پیشِ نظر یہی بات ہوگی جو لوگ سمجھتے تھے کہ انھیں جو کچھ دیکھنا پڑتا ہے، جو بھی پیش آتا ہے اس میں کچھ خیر ہوتا ہے اور کچھ شر۔ انسان کا اس بات پر ایمان ہونا چاہیے کہ اسے جو بھی درپیش ہوتا ہے وہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس میں انسان کو اپنا بھلا دکھائی دے یا برا، فائدہ نظر آئے یا نقصان اسے صبر اور شکر سے قبول کرنا چاہیے اور ہر آن یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ کی رحمت اس کے غضب پر بھاری ہے، اس کی مہربانی اس کے غصے سے بڑھی ہوئی ہے۔ انسان کو جو کچھ بھی پیش آتا ہے وہ اس کے ایمان کی آزمایش ہوتا ہے:

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ (۲۹:۲)

کیا لوگ اس گمان میں ہیں کہ وہ اتنا کہ کر چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور وہ آزمائے نہیں جائیں گے۔

آزادی و اختیار Freedom

تقدیر پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ انسان یہ سمجھ لے کہ ہر خیر اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ اللہ کے سوا ہر شے میں کسی نہ کسی لحاظ سے خیر کا فقدان ہے۔ وہ لوگ جنھیں یہ ایمان میسر ہے وہ خیر کی ہر بات پر اللہ کا شکر بجا لاتے ہیں اور اگر کسی اعتبار سے کوئی محرومی رہ جائے تو اللہ پر بھروسا رکھتے ہیں۔ انھیں یہ اعتماد ہوتا ہے کہ ''الحق'' جو ''الرحمٰن'' بھی ہے وہ ہر شے کو ایک قدر و انداز سے معین کرتا ہے، اس کا پیمانۂ تقدیر حکمت پر مبنی ہے اور اس میں ہر شے کی حتمی اور آخری بھلائی اور بہتری مقصود ہوتی ہے:

وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَؤُسًا (۱۷:۸۳)

جب اس پر مصیبت آتی ہے تو مایوس ہو جاتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَلِقَآئِهٖٓ اُولٰٓئِكَ يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۲۹:۲۳)

اور جن لوگوں نے اللہ کی آیات اور اس کے ملنے سے انکار کیا وہی لوگ میری رحمت سے نا اُمید ہوئے اور وہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے۔

اَوَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۔ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (۳۹:۵۲-۵۳)

کیا یہ لوگ نہیں جان سکے کہ اللہ ہی ہے جو رزق کو جس کے لیے چاہتا ہے پھیلا دیتا ہے اور تنگ بھی کر دیتا ہے۔ بے شک اس کے اندر بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لانے والے ہیں۔ کہ دو، اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی، اللہ کی رحمت سے آس نہ توڑو۔ بے شک اللہ سب گناہ بخش دیتا ہے۔ وہ جو ہے، وہی ہے معاف کرنے والا، مہربان۔

تقدیر کے بارے میں مختصر الفاظ میں جب بھی کچھ کہا جائے گا اس میں ایک منطقی تضاد کی جھلک پائی جائے گی۔ کیا خیر اور کیا شر اگر ہر شے بقدرِ اندازہ معین ہے تو پھر کیا اس کا صریحاً یہ مطلب نہیں کہ ہمارا اس میں اب کوئی عمل دخل نہیں، جو ہونا ہے وہ طے ہو چکا ہے؟ آخر رسولِ خداؐ ہی کا ارشاد ہے کہ ہر شخص کی منزلِ آخرین، اس کا آخری ٹھکانا اس کے لیے اسی وقت لکھ دیا جاتا ہے جب وہ ابھی رحمِ مادر میں ہوتا ہے۔[۳۰] اس صورت میں مذہب کی ضرورت ہی کہاں باقی رہتی ہے؟ ہر بات تو پہلے سے مقرر ہو چکی، ہر امر کا فیصلہ کر دیا گیا۔

یہ مسئلہ جبر و قدر کا ہے free will and predestination۔ اس سوال نے مختلف مذاہب کے علما اور مفکرین کو صدیوں سے چکرا رکھا ہے۔ فکرِ اسلامی نے اس کلامی اور فلسفیانہ مسئلے کے جو حل تلاش کیے ہیں وہ ہم ان صفحات میں پیش نہیں کر رہے۔ اس ضمن میں مسلمانوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن ہم اپنی تحریر میں صرف قرآن مجید میں بیان کردہ نکات تک محدود رہیں گے اور صرف اتنا عرض کریں گے کہ تمام اہم مسائل کی طرح اس مسئلے کا بھی کوئی سادہ صاف اور واضح حل نہیں ہے۔ قرآن نے جس

طرح اکثر مقامات پر اس بات کا اثبات کیا ہے کہ ہر شے اللہ کے پیمانہ تقدیر کے مطابق ظاہر ہوتی ہے نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ ہر شے کے وقوع میں آنے سے قبل اسے جانتا ہے اسی طرح یہ بات بھی اکثر جگہ کہی گئی ہے کہ انسان کا عمل، اس کی کوشش بے معنی اور بے مصرف نہیں ہے۔

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا (۱۷:۱۹)

اور جو آخرت کا طالب بنتا ہے اور اس کی شایانِ شان کوشش بھی کرتا ہے اور وہ مومن بھی ہے تو درحقیقت یہی لوگ ہیں جن کی سعی مقبول ہوگی۔

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۰ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى (۵۳:۳۹-۴۰)

اور یہ کہ آدمی کو وہی ملتا ہے جو کمایا اور یہ کہ اس کی کمائی عنقریب دکھائی جائے گی۔

قرآن کیا ہے، وہ کتاب جو انسان کو اللہ کی راہ میں جدوجہد پر ابھارتی ہے اور سعی وعمل کی تلقین کرتی ہے۔ قرآن جس طرح ''اسلامِ'' کائناتی اور ''اسلامِ'' اضطراری کے علاوہ اختیاری ''اسلام'' کا تقاضا کرتا ہے اسی طرح وہ انسان سے جہاد اور مجاہدے کا مطالبہ بھی کرتا ہے۔ اگر نوعِ انسانی محض کٹھ پتلیوں کی طرح ہوتی، اسے اپنے اوپر کوئی اختیار نہ ہوتا تو قرآن جیسی کتاب کے کوئی معنی نہ رہتے کہ کیونکہ وہ پتھروں سے یہ کہ رہا ہے کہ پرواز کر کے دکھاؤ۔

جبر اور اختیار کو اس طرح سمجھنا چاہیے کہ گویا انسان کی صورتِ حال بیان کرنے میں یہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ کسی ایک پر اکتفا کرنے سے پوری بات واضح نہیں ہوتی۔ ان دونوں تصورات کا باہمی ربط سمجھنے کا ایک مفید طریقہ یہ ہے کہ معاملے کو ''تشبیہ'' اور ''تنزیہ'' کی اصطلاحات کے حوالے سے دیکھا جائے۔

''تنزیہ'' کے نقطۂ نظر سے انسان محض بے حقیقت ہے۔ حقیقت اگر ہے تو صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ انسان کے پاس نہ تو علم ہے، نہ قدرت، ارادہ اور آزادی کہ یہ صفات اللہ کی صفات ہیں اور اللہ ہی ان صفات کا مالک ہے۔ ''تشبیہ'' کے لحاظ سے دیکھیے تو انسان میں ان صفاتِ خداوندی کا عکس پایا جاتا ہے۔ صفات اللہ کی ہیں لیکن ان کا اثر اور تاثیر انسانوں میں ظاہر ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ ''فعالٌ لِمَا یرید'' ہے (جو چاہتا ہے کرتا ہے) سو انسان بھی اپنے ارادے پر عمل کرسکتا ہے۔

لیکن انسان کی آزادی اور اختیار پر پابندیاں کس قدر ہیں، یہ سبھی جانتے ہیں۔ انسان کو نہ اپنی

جائے ولادت منتخب کرنے کا اختیار ہے نہ اپنے والدین، اپنی نسل،تہذیب وثقافت، مادری زبان اور اپنے بنیادی جسمانی خواص کے چناؤ کی آزادی۔ اس کے علاوہ بھی کئی چیزوں کا اختیار اسے میسر نہیں۔ یہ سب اسے دے دی جاتی ہیں لیکن ان سب دی ہوئی چیزوں کے اندر رہتے ہوئے اختیار اور چناؤ کی آزادی باقی رہتی ہے۔ یہ اختیار جس حد تک حقیقی ہے اسی حد تک انسان آزاد ہے۔

غور کیجیے کہ جبر predestination کا تعلق ''تنزیہ'' سے ہے اور صفاتِ جلال کی جانب۔ الٰہیات کے مباحث میں جو اہم ترین اصطلاحیں اس تصور کے لیے استعمال ہوتی ہے ان میں سے ایک ''جبر'' ہے اور قرآن مجید میں اللہ کا ایک نام ''الجبّار'' (The Irresistible,The All-Overpowering) ہے۔ یہ نام اسمائے جلال اور اسمائے غضب کی صف میں شامل ہے لیکن ہمیں معلوم ہے کہ اللہ کی رحمت اس کے غضب سے بڑھی ہوئی ہے۔ اسمائے جمال اور اسمائے رحمت کو اسمائے جلال اور اسمائے قہر پر غلبہ پانا ہے۔ محبت اور رحمت، جبر کو زیر کرلیں گی۔ اسمائے حسنٰی اللہ کے قرب کا موجب ہوتے ہیں اور انسان اللہ سے جتنا نزدیک ہوگا اسی قدر اللہ کے اختیار میں سے اسے حصہ ملتا جائے گا۔

آج کے جدید معاشرے میں ہم آزادی کے بارے میں بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں اور اسے زندگی کا ایک قابلِ قدر مقصد قرار دیتے ہیں۔ سامنے کی بات ہے کہ آزادی کے دو بنیادی اسلوب ہیں ''کسی چیز کی آزادی'' اور ''کسی چیز سے آزادی۔'' ہم سختی اور جبر وستم سے آزادی چاہتے ہیں اور ہم اظہارِ رائے کی، اپنی بات کہنے کی آزادی مانگتے ہیں، اپنی مرغوب چیزوں سے لطف اٹھانے کی آزادی چاہتے ہیں۔ انسانوں کے معاملات میں آزادی کے یہ دو اسلوب ایک دوسرے سے اکثر ٹکرا جاتے ہیں مثلاً اشیائے صرف کی بھرپور رنگارنگی سے لطف اندوز ہونے کی آزادی حاصل کرنے کی قیمت دنیا کے دوسرے خطوں میں بسنے والی اقوام کو کئی طرح چکانا پڑتی ہے۔ یہ اقوام ماحولیاتی تباہی اور قدرتی وسائل کے استحصال کی صورت میں اس کا خمیازہ بھگتتی ہیں۔ آزادی کے سکّے کی دوسری طرف غلامی کا پیغام بھی کندہ ہوسکتا ہے۔ آپ کے لیے جو چیز اچھی ہے خیر کا باعث ہے وہی شے کسی دوسرے کے لیے کئی قباحتیں پیدا کرسکتی ہے، باعثِ شر ہوسکتی ہے۔ آپ کی آزادی دوسرے کی غلامی ہوسکتی ہے بلکہ خود آپ ہی کو غلام اور پابند بنا سکتی ہے۔ ذرا ان لوگوں کے بارے میں سوچیے جو صرف آزادی کی خواہش میں اور مزے اڑانے کی خاطر اپنے آپ کو اتنا گرا لیتے ہیں کہ گھٹیا اور ذلیل نوکریوں اور کاموں کے غلام بن جاتے ہیں۔

مسلمان مفکرین نے دونوں طرح کی آزادی پر غور وفکر کیا ہے۔ ان کا تصورِ آزادی جدید تصور سے اس لحاظ سے الگ ہے کہ ان کے تصور کی بنیاد شہادۃ پر رکھی گئی ہے۔ "لَامُخْتَارَ اِلاَّ اللّٰه" (اختیار اگر کسی کو ہے تو اللہ ہی کو) اللہ ہر طرح کی خارجی پابندی اور مجبوری سے آزاد اور بری ہے۔ "فعلٌ لِمَا یُرِیْد" (۱۱:۱۰۷) (جو چاہے کر گذرنے والا ہے) "a sovereign doer of what he desires" کسی مخلوق میں یہ صفت موجود نہیں ہوسکتی۔ اللہ کے سامنے ہر مخلوق سراسر غلامی اور بندگی کی اسیر ہے۔ نوعِ انسانی کو آزادی واختیار حاصل کرنا ہو تو اسے اللہ کے اختیار وآزادی میں حصہ لینا پڑتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے آپ کے سوا ہر شے سے آزاد ہے۔ وہ سب عالموں سے بے نیاز ہے ''غَنِیٌّ عَنِ الْعَالَمِیْن'' (۳:۹۷)۔ انسان کبھی بھی اللہ سے آزاد نہیں ہوسکتا۔

یَاۤاَیُّھَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ اِلَی اللّٰہِ وَاللّٰہُ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ (۳۵:۱۵)	لوگو! تم ہو اللہ کے محتاج اور اللہ وہی ہے بے پروا، سب خوبیوں سے سراہا ہوا۔ ہر طاقت، حقیقت اور حمد وستایش صرف اللہ ہی کے لیے ہے۔

انسان کبھی بھی اللہ تعالیٰ سے بھاگ نہیں سکتا کہ وہ اپنی فطرت کے اعتبار سے ''مسلم'' اور ''بندہ'' ہے۔ سو اسے یہ نکتہ جان لینا چاہیے اور اپنے اختیار سے اللہ کی بندگی کرنا چاہیے۔ اس طرح وہ حقیقت کے سامنے گستاخانہ مقابل ہونے سے بچ جائے گا۔ اللہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے سے ہی انسان اللہ کے سوا ہر شے سے آزاد ہوتا ہے۔ ''اللہ'' کے لیے'' آزاد ہو کر ہی انسان کو ماسوی اللہ سے آزادی میسر آتی ہے اور ماسوی اللہ سے آزاد ہونے کا مطلب ہے ہر غیر حقیقی شے سے آزاد اور ''الحق'' کے لیے آزاد۔ اس کا مطلب ہے ہر نوع کے شرک سے بری ہونا اور ''توحید'' کا اثبات کرنا۔

پس اسلام کے نقطۂ نظر سے ''کسی شے سے آزادی'' کا مفہوم ہے ان پابندیوں اور قید وبند سے آزادی جو مخلوقات نے ہم پر عائد کر رکھی ہیں اور اس آزادی کے ساتھ اللہ کی بندگی۔ ''کسی شے کے لیے آزاد'' کا مطلب ہے ہر معاملے میں ''الحق'' The Real کو غیر حق، بے حقیقت اشیا پر ترجیح دینا۔ غیر حق کے لیے آزاد ہونا ایک بے معنی بات ہے کہ غیر حق تو معدوم ہے۔ لوگوں کی خواہش یہ ہونا چاہیے کہ وہ علم، ارادے، قدرت، خیر اور ہر مثبت شے کے لیے آزاد ہوں۔ الحق کے سوا کوئی اور حقیقت نہیں۔ پس غیرِ حق سے آزادی کا مآل کار مطلب ہے ''الحق'' کے لیے آزادی۔ اس میں کوئی تضاد نہیں۔ ہر دو توحید ہی کے مظاہر ہیں۔

کیا ہم آزاد و با اختیار ہیں؟ جواب اثبات میں بھی ہے اور نفی میں بھی۔ ہم اس حد تک آزاد ہیں جس حد تک ہم خدا سے مشابہ ہیں لیکن ہماری تشبیہ میں تنزیہ ملی ہوئی رہتی ہے۔ توحید، ''تنزیہ'' اور ''تشبیہ'' ہر دو کا تقاضا کرتی ہے۔ آزادی و اختیار وہ حقیقت ہے جس کے کئی درجات ہیں۔ انسان جس قدر اللہ کے قریب ہوگا اسی قدر آزاد ہوگا۔ اسلام کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو ایسی توحید کی راہ دکھائی جائے جس میں ''تنزیہ'' اور ''تشبیہ'' صحیح توازن کے ساتھ پائی جائیں۔ انسان ہونے کا مطلب ہے نسبتاً آزاد و با اختیار ہونا۔ لیکن انسان کو جتنی آزادی میسر آ سکتی ہے اس حد تک آزاد ہونے کے لیے ضروری ہے انسان میں پوری فرمانبرداری اور مکمل تسلیم و اطاعت پیدا ہو جائے۔

جبر و اختیار کے مبحث پر ہم ایک آخری نکتہ مزید عرض کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو قادرِ مطلق قرار دینے پر جب لوگوں کی طرف سے اعتراض اٹھایا جاتا ہے اور اس کے تضادات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے تو یہ غور کرنا ضروری ٹھہرتا ہے کہ ان اعتراضات کے پسِ پشت کیا نیت کارفرما ہے؟ دوسرے لفظوں میں ہم یہ سوال اٹھانا چاہتے ہیں کہ لوگ اعتراض کیوں کرتے ہیں؟ عام طور پر اس اعتراض کے پیچھے یہ نیت پوشیدہ ہوتی ہے کہ مخاطب پر اس کی حماقت ظاہر کی جائے اور یہ بتایا جائے کہ اللہ کے تصور یا انبیا کی ہدایت کا تصور رکھنا سادہ لوحی کی بات ہے۔ اس میں کوئی معنی نہیں ہیں۔

آج کی اصطلاح میں بات کیجیے تو یہ کہنا ہوگا کہ جب لوگ باگ تقدیر کے تصور کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں تو عموماً ہوتا یہ ہے کہ کچھ باتیں، کچھ منفی تعبیرات انھوں نے پہلے سے طے کر رکھی ہوتی ہیں اور انھی کے تحت عمل کر رہے ہوتے ہیں۔ احتجاج کرنے والے اپنے تئیں اس مسئلے کی بدترین صورت فرض کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس تصور کے پسِ پشت اصل مسئلہ اور اصل محرک حصولِ اقتدار وقوت ہے۔ وہ یہ سوچتے ہیں کہ اصل میں معاملہ کچھ یوں ہے کہ چند لوگوں نے مذہبی تعلیمات کو آلۂ کار بنا کر انھیں اپنے اقتدار اور قوت کے لیے استعمال کیا ہے تاکہ دوسروں کو اپنا غلام بنا کر رکھ سکیں۔

ہمیں اس بات سے انکار نہیں ہے کہ اس طرح کے لوگ اور مذہب کا غلط استعمال کرنے والے پائے جاتے ہیں لیکن بایں ہمہ ہمیں اس امر کا اثبات کرنا چاہیے کہ معاملے کو دیکھنے کا صرف یہی ایک ڈھنگ نہیں ہے۔ دوسرے انداز سے دیکھیے تو معاملہ کچھ اور نظر آئے گا۔ اسلام نے اس مسئلے کو ہمیشہ توکل اور اعتماد کی بنیاد پر دیکھا ہے۔ ہاں یہ ہے کہ یہ توکل اور بھروسا کسی انسان پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ پر کیا جاتا ہے۔ توکل (trust) کا ذکر قرآن میں ۴۰ آیات میں کیا گیا ہے اور ان میں سے ہر جگہ اللہ ہی

پر توکل کا ذکر ہے۔

وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (۳:۱۲۲)	اللہ ان کا مددگار ہے اور اللہ ہی پر چاہیے کہ اہلِ ایمان بھروسا کریں۔
اِنِّیْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّیْ وَرَبِّكُمْ ۚ مَامِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا اِنَّ رَبِّیْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۱۱:۵٦)	میں نے بھروسہ کیا اللہ پر جو رب ہے میرا اور تمھارا۔ جتنے بھی جاندار ہیں ان کی پیشانی اسی کی گرفت میں ہے۔ بے شک میرا رب نہایت سیدھی راہ پر ہے۔
اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ (۱۲:٦٧)	حکم تو بس اللہ ہی کا ہے۔ میرا بھروسہ اسی پر ہے اور بھروسہ کرنے والوں کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔
وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ (٦٥:۳)	اور جو اللہ پر بھروسہ رکھتا ہے تو اللہ اس کے لیے کافی ہے۔
اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (١٦:٩٩)	اس کا ان لوگوں پر کچھ زور نہیں چلتا جو ایمان لائے ہوئے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

ایک مشہور حدیثِ قدسی ہے کہ اللہ پر توکل کا مطلب یہ ہے کہ انسان ہمیشہ اس کے بارے میں اچھا گمان رکھے، اللہ کے کیے پر کبھی شک وشبہ نہ کرے۔ "انا عند ظن عبدی بی"[۱۳] (میں ویسا ہوں جیسا میرا بندہ میرے بارے میں رائے رکھتا ہے) انسان اگر اللہ سے خوش گمانی اور اچھی امید رکھے گا تو وہ بھی انسان سے اپنی رحمت، محبت اور کرم وشفقت کا معاملہ کرے گا۔

مسلمان اگر اللہ تعالیٰ سے اچھی امید رکھتے ہیں، اس سے خوش گمان رہتے ہیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ وہ یہ جانتے ہیں کہ وہ ''الحق'' ہے، اصلی حقیقت ہے اور حقیقت کا تقاضا یہ ہے کہ رحمت کو غضب پر غلبہ حاصل ہو۔ مسلمانوں نے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ قرآن نازل کرنے سے اللہ کا جو مقصد ہے وہ بالکل صاف اور واضح ہے۔ قرآن کے وسیلے اللہ تعالیٰ انسان کو حتمی سعادت اور فلاح ومسرت تک لے جانا چاہتے ہیں، اسے اس کے مقدر کی تکمیل اور حصول تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ جب قرآن یہ

دعویٰ کرتا ہے کہ ہر شے بہ اندازۂ تقدیر ہے تو اس کا سیدھا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہر شے اللہ کے اختیار میں ہے یعنی یہ کہ ''حقیقت'' جو اٹل ہے۔ اسے بدلنے کے لیے انسان کے بس میں کچھ بھی نہیں۔

آزادی و اختیار اور ہدایت بھی پیمانۂ تقدیر کے مطابق ملا کرتی ہیں۔ چنانچہ انسان اللہ کی دی ہوئی ہدایت کو قبول کرنے یا رد کرنے کے لیے آزاد ہے۔ اس پر ذمہ داری کا ایک بوجھ ہے اور اسے اس بات کی جوابدہی کرنا ہوگی کہ اسے جو آزادی ملی تھی اس کو انسان نے کیسے استعمال کیا اور اللہ کی ہدایت ملی تو اس کے سامنے اس کا رویہ کیا تھا۔ یہی انسان کی ذمہ داری کی آخری حد ہے۔ جن امور میں وہ آزاد نہیں تھا یا اس تک ہدایت نہیں پہنچی ان کے لیے اس سے باز پرس نہیں ہوگی۔[۳۲]

مخلوقات کا اصولِ تنوع

ہر شے اللہ کے پیمانۂ تقدیر کے مطابق ہوتی ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (۱۵:۲۱)

اور کوئی شے ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں لیکن ہم اس کو ایک معین اندازے کے ساتھ ہی اتارتے ہیں۔

تقدیر صرف اس مسئلے سے متعلق نہیں ہے کہ انسان کو آزادیِ اختیار حاصل ہے یا نہیں۔ معاملہ اس سے کہیں وسیع ہے، اس کے مضمرات دور تک پھیلے ہوئے ہیں کیونکہ یہ تو تخلیق کی اُصولی بنیاد ہے۔ عرصۂ ہستی میں کوئی چیز بھی ہو اسے اللہ تعالیٰ نے بِقدرِ معلوم بنایا ہے اور اس کی سرشت مقرر کی ہے۔

اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ (۲۰:۵۰) اس نے ہر شے کو اس کی خلقتِ خاص عطا کی۔

اس پیمانۂ تقدیر سے ناپ کر تخلیق کرنے کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا وسیع وعریض اور عظیم الشان کارخانۂ کائنات پیدا کیا ہے اور اس میں مخلوقات کی ایسی رنگارنگی رکھی ہے کہ انسان کے وہم وگمان سے باہر ہے۔ اللہ کی تخلیق کردہ چیزوں کو ایک ایک کر کے شمار کرنے بیٹھیے تو گنتی کبھی ختم نہ ہو پائے گی۔ تاہم عمومی انداز میں بات کی جائے تو کسی حد تک ممکن ہوگا کہ مخلوقات کو مختلف اصناف اور اقسام میں بانٹا جا سکتا ہے۔ یہ تقسیم ساری مخلوقات کا احاطہ تو نہیں کر سکتی لیکن ایک عمومی اندازہ اس بات کا فراہم کر سکتی ہے کہ چشمِ بصیرت ہو تو انسان بہت کچھ دیکھتا ہے اور دیکھ سکتا ہے۔

ہم عرض کر چکے ہیں کہ کائنات کی بنیادی تقسیم دو طرح کی ہو سکتی ہے، دیکھی اور ان دیکھی دنیا، عالمِ غیب اور عالمِ شہود۔ اسی کو بعض اوقات ''ارض وسما'' (زمین وآسمان) کہ دیا جاتا ہے یا عالمِ روحانی

اور عالمِ جسمانی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ بھی ذکر آیا تھا کہ ایک تیسری دنیا بھی ہوتی ہے جو ان دونوں دنیاؤں سے مشابہ بھی ہے اور مختلف بھی۔ اسے ''عالمِ خیال'' کہتے ہیں۔ اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا تھا کہ اگر ان تین دنیاؤں کو ملا کر اس کائنات کے عمومی ڈھانچے کی تشکیل کی جاسکتی ہے اور اسے عالمِ کبیر کہا جاتا ہے تو پھر انسان کو ایک چھوٹی سی دنیا، ایک عالمِ صغیر کہا جاسکتا ہے کیونکہ ہر فرد میں یہ تینوں متوازی اقالیم یا وجود کی سطحیں پائی جاتی ہیں، ہر انسان روح، نفس اور بدن کا مرکب ہے۔

اب ہم ذرا ان مادی اشیا کا جائزہ لینا چاہتے جو اس کائنات میں بکھری ہوئی نظر آتی ہے۔ مسلم مفکرین نے اس ضمن میں یونانی فکر کی معروف درجہ بندی کو اختیار کیا ہے جس میں تمام مرئی اشیا کو تین بڑی اقسام میں بانٹ کر دیکھا گیا ہے یعنی جمادات، نباتات اور حیوانات۔ ہمارے مبحث سے متعلق جو بات قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ ان تینوں اقسام کی مخلوقات میں اللہ کی نشانیاں کیوں کر ظاہر ہوئی ہیں۔

ہم نے عرض کیا تھا کہ اللہ کی نشانیوں کا مشاہدہ کرنے کا ایک ڈھنگ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ان صفات پر غور و فکر کیا جائے جو ان مخلوقات میں آشکارا ہو رہی ہیں۔ جمادات میں اللہ کی کون سی صفت ظاہر ہوتی ہے؟ اس سوال کا شاید سب سے بہتر جواب تو یہ ہوگا کہ جمادات میں اللہ کی صفات ظاہر ہونے کے بجائے مخفی ہو جاتی ہیں۔ بے جان اشیا ان صفات کا پردہ بن جاتی ہیں۔ ان سے ہمیں یہ سراغ نہیں ملتا کہ اللہ تعالیٰ کیا ہے صرف یہ پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کیا نہیں ہے۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ کائنات کی ہر شے، ایک شے ہونے کے کارن، ماسوی اللہ ہے، سو ہم ہر شے سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ یوں نہیں ہیں۔ یہ ہوا ''تنزیہ'' کا نقطۂ نظر۔

''تشبیہ'' کے پہلو سے بھی ہر شے ہم سے کچھ نہ کچھ کہتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھیے تو بے جان اشیا میں، جمادات میں، تشبیہ کی جہت سب سے مدہم اور کمزور ہوتی ہے۔ پتھر میں صفاتِ خداوندی کی جھلک پانا بہت ہی دشوار ہے اگرچہ سنگِ گراں کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کے ابدی، غیر متغیر اور باقی ہونے کا خیال ضرور ابھرتا ہے۔ لیکن زیادہ تر پتھروں سے پیغام ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے بے انتہا دور اور سراسر الگ ہے۔ پھر بھی پتھروں، بالخصوص بہت حجم والے پتھروں، ستاروں وغیرہ کو دیکھ کر یہ سبق ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ، ''القوی'' ''الجلیل'' اور ''الملک'' ہے جس نے یہ کوہِ گراں اور کتنے ہی سورج اور کہکشاں ریت کے ذروں کی طرح بکھیر رکھے ہیں۔

جمادات کے برعکس پودوں میں بہت سی صفاتِ خداوندی کی واضح اور صریح جھلک پائی جاتی ہے۔

سامنے کی بات ہے کہ پودوں میں جان پائی جاتی ہے اور زندگی یا حیات ''ائمہ سبعہ'' (the seven leaders) میں سب سے پہلی صفت ہے۔ یہ سات صفاتِ خداوندی کائنات میں دوسری سب صفات پر غالب ہیں۔ پودوں میں ایک طرح کا علم بھی ہوتا ہے۔ انھیں معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اپنی غذا کہاں سے ملے گی اور سورج کی روشنی کیسے حاصل ہوگی۔ ان میں خواہش و ارادہ بھی یقیناً ہوتا ہے۔ وہ پانی مانگتے ہیں، سورج کی روشنی مانگتے ہیں، کھاد اور غذائی عناصر تلاش کرتے ہیں۔ اگر آپ ان سے اچھا برتاؤ کریں گے، جو وہ چاہتے ہیں وہی ان کو فراہم کریں گے، مثلاً اچھی طاقت ور کھاد، تو وہ شکر گذار بھی ہوتے ہیں اور بھرپور فصل کے ذریعے اپنی ممنونیت ظاہر کرتے ہیں۔ پودے ناشکرے نہیں ہوتے، انکارِ حق نہیں کرتے، کفر میں نہیں پڑتے۔ پودوں میں قوت بھی ہوتی ہے اور وہ سنگ وخشت کو شکست دے سکتے ہیں لیکن اس کے لیے انھیں وقت درکار ہوتا ہے۔ یہ سب صفاتِ خداوندی نباتات میں پائی تو جاتی ہیں مگر ذرا کمزور، مدہم انداز میں۔ سو ''تشبیہ'' پر ''تنزیہ'' غالب رہتی ہے۔

اس کے برعکس حیوانات میں صفاتِ خداوندی کہیں زیادہ شدت سے ظاہر ہوئی ہیں۔ مزید براں یہ کہ حیوانات کی دنیا میں کچھ اور صفات کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ جو عالم جمادات میں مشکل ہی سے نظر آتی ہیں۔ حیوانات کو علم میسر ہے اور وہ غیر معمولی ہو سکتا ہے لیکن یہ علم ہمیشہ ایک خاص نوعیت کا ہوتا ہے۔ شہد کی مکھی اپنے چھتے کی سب مکھیوں کو یہ بتا سکتی ہے کہ بہترین شہد کہاں تلاش کیا جا سکتا ہے لیکن شہد کی مکھی کو سر کے کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ شاہ تتلی کو میکسیکو میں واقع اپنی وادی کا راستہ اور محل وقوع ٹھیک ٹھیک معلوم ہوتا ہے لیکن نیویارک شہر کا راستہ بتانے کے لیے اسے راہبر نہیں بنایا جا سکتا۔ جانوروں کی دنیا میں علم اور ہنرمندی کی ایک حیرت انگیز رنگارنگی اور ناقابل یقین تنوع نظر آتا ہے جو خاص نامیاتی اجسام کی ایک بڑی تعداد میں پایا جاتا ہے۔ جانوروں میں خواہش اور ارادہ پایا جانا بھی واضح ہے لیکن حیوانات کی تمام انواع میں یہ تقاضے الگ الگ ہوتے ہیں چنانچہ اس سے ایک بڑا طبعی اور قدرتی توازن جنم لیتا جس میں، مولانا روم کے الفاظ میں، ''ہر شے کھاتی بھی ہے اور کھائی بھی جاتی ہے''[۳۳]

نباتات اور حیوانات دونوں میں خاص خاص نشانیوں کی ایک بہت بڑی تعداد گوناگوں انداز میں ظاہر ہوئی ہے۔ ہر پودا اور حیوانات کی تمام انواع صفاتِ خداوندی کا ایک خاص مجموعہ ہوتی ہیں جو کسی دوسرے پودے یا کسی دوسرے جانوروں میں اسی طرح دوبارہ ہویدا نہیں ہوتی۔ چنانچہ شاہ بلوط کے درخت پر اسی کا پھل لگتا ہے اور شاہ بلوط سے سیب نہ اتریں تو کسی کو تعجب نہیں ہوتا۔ اگر شاہ بلوط پر

سیب لٹکنے لگیں تو ہم ضرور سوچیں گے کہ یہ تو انہونی بات ہوئی۔

جانوروں کی ہر نوع میں علم، ارادہ وخواہش، قوت اور دیگر صفاتِ خداوندی جدا جدا انداز میں پائی جاتی ہیں۔ یہ انداز اسی نوعِ حیوانات سے خاص ہوتا ہے اور اسی سے اس نسل کو دیگر جانوروں سے الگ پہنچانا جاتا ہے۔ چونکہ یہ صفات اسی نوعِ حیوانات سے مخصوص ہیں لہٰذا ہمیں یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ مور، ہاتھی یا بلی سے کیا سامنے آئے گا۔ اس معاملے میں کسی حد تک ایک اچنبھے اور حیرت کا عنصر بھی شامل رہتا ہے لیکن اس ضمن میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سبب یہ ہے کہ یا تو ہم جانوروں کی اس نسل سے بے خبر ہیں یا بعض خارجی عوامل کا ہمیں علم نہیں ہے۔ مثلاً کوئی بیماری وغیرہ جس سے معاملے کو سمجھنے میں الجھن پیدا ہو جاتی ہے۔

انسان بھی جاندار ہے۔ اس کا تعلق نوعِ حیوانات سے ہے اور اس میں اور حیوانات میں بہت سے خواص مشترک ہیں۔ لیکن اس میں ایک عجیب خاصیت ایسی ہے جو اسے دوسرے ہر جاندار سے الگ اور ممتاز کر دیتی ہے۔ ہر جانور جیسا ہے ویسا ہی ہے۔ اس میں گڑ بڑ یا تو ہوتی ہی نہیں یا اگر ہو بھی تو معمولی سی ہوتی ہے۔ ہمیں کبھی ایک بھونرے پر عقاب کا شبہ نہیں ہوتا نہ بلی کو کتا سمجھنے کی غلطی سرزد ہوتی ہے۔ لیکن اولادِ آدم کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ انسان میں نہ جانے کیا کیا دبا ہوا ہوتا ہے کہ ٹھیک پتا ہی نہیں چلتا کہ آدمی ہے کیا۔ عملی طور پر انسان کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

کتّا تو بس کتّا ہی ہوتا ہے لیکن آدمی میں سے کتّا بھی برآمد ہو سکتا ہے اور سوّر بھی۔ یہ الفاظ ہم عموماً گالی کے طور پر استعمال کرتے ہیں لیکن ان کے پیچھے ایک گہری دانش بول رہی ہے۔ ہر تہذیب نے اس حکیمانہ نکتے کا اثبات کیا ہے۔ جانوروں کی ہر نسل کے کچھ خواص ہوتے ہیں۔ اس پر کسی ایک یا کئی خصلتوں کا غلبہ ہوتا ہے۔ جانوروں کے لیے یہ تمام خصلتیں اچھی ہیں کہ ان سے اس کی سرشت و نہاد کا تعین ہوتا ہے لیکن یہی خصلتیں اگر انسان میں نمایاں اور غالب ہو جائیں تو اس کے لیے اچھا بھی ہو سکتا ہے اور برا بھی۔

کتّے میں کئی اوصاف ہوتے ہیں۔ کتّا وفادار جانور ہے۔ یہی صفت اگر انسانوں میں ہو تو وفا شعار ہونا اچھی بات شمار ہوگی۔ لیکن کتوں میں حرص، غارت گری اور خباثت بھی بڑی حد تک پائی جاتی ہے۔ جب لوگ باگ کسی کو کتّا کہہ کر گالی دیتے ہیں تو اس لمحے ان کے ذہن میں یہی بدطینتی گھوم رہی ہوتی ہے۔ انسانی شخصیت بہت تہ دار ہوتی ہے۔ کمرہ لوگوں سے بھرا ہو تو یہ بتانا مشکل ہوتا ہے کہ کیسے

کیسے انسان سے سامنا کرنا ہوگا۔ان میں خدادوست بھی ہو سکتے ہیں اور انسانی خون کے پیاسے بھی۔ ان میں امتیاز کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ کتّے کا، شیر کا یا گھونگے کا سامنا ہو تو ہمیں پتا ہوتا ہے کہ اب کیا ہوگا اور کیا کرنا چاہیے۔ معاملہ اولادِ آدم کا ہو تو یقینی طور پر کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔

نوعِ انسانی

تو پھر انسان کیا ہے؟ انسانوں اور دیگر حیوانات میں یہ بنیادی فرق کس چیز سے پیدا ہوتا ہے؟ مسلمانوں نے ان سوالات کے جواب کئی انداز میں پیش کیے ہیں۔ ہماری موجودہ بحث کے حوالے سے سب سے سہل بات یہ ہوگی کہ ہم انسان اور صفاتِ خداوندی کے مابین ربط وتعلق کی ماہیت جاننے کی کوشش کریں۔ انسان کے علاوہ ہر مخلوق اللہ کی ایک نشانی ہے جس میں اللہ کی صفات ایک خاص روپ اور ایک محدود اور معین وضع وشکل میں منعکس ہوتی ہیں۔ انسان میں خدا بطورِ خدا ظہور کرتا ہے۔ دوسری مخلوقات میں اللہ کی کچھ صفات ہمیشہ ظاہر ہوتی ہیں اور کچھ صفات مستقل طور پر مخفی رہتی ہیں۔ انسانوں میں سبھی صفاتِ الٰہی موجود ہوتی ہیں اور اگر حالات ومواقع سازگاری کریں تو اپنا ظہور کرتی ہیں۔

رسولِ خداؐ نے انسانوں کی اس انوکھی خصوصیت کا تذکرہ ایک حدیث میں فرمایا ہے۔ یہی موضوع انجیل کے ایک قول کا بھی ہے اور اس قول نے مسیحی اور یہودی فکر میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ انسان کیا ہے؟ اس نکتے کو سمجھنے کے لیے مسیحی اور یہودی حضرات نے کتابِ مقدس کے اس ارشاد کو بنیاد بنایا ہے۔ (God created Adam in His own image)۔ دوسری جانب حدیث کے الفاظ یہ ہیں ''خَلَقَ اللّٰہ الآدَمَ علیٰ صُورَتِه''[۳۴] (اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر خلق فرمایا)۔ بہت سے علما نے قرآن مجید کی آیت ''وَعَلَّمَ اٰدَمَ الاَسْمَآءَ کُلَّهَا'' (۲:۳۱) (اور سکھائے آدم کو نام سارے) سے بھی یہی معنی مراد لیے ہیں۔

یہاں یہ اہم نکتہ ذہن میں رہے کہ ''آدم'' پہلے انسان کا نام بھی ہے اور اسی لفظ کی توسیع کرتے جایئے تو نوعِ انسانی کے کسی بھی فرد بلکہ ہر انسان کو آدم کہا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید اور اسلامی روایت میں عام طور پر آدم کا لفظ ''انسان'' کے مترادف اور ہم معنی لفظ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا اطلاق مرد زن دونوں پر ہوتا ہے۔ مذکر بمقابلہ مونث یا مرد بمقابلہ عورت کے لیے اس کا استعمال خاص نہیں ہے۔ ہاں اگر سیاق وسباق میں حوّا کا لفظ آ جائے اور فقرے سے واضح ہو کہ آدم کی خصوصیات سے الگ کچھ صفات کا ذکر مقصود ہے تو اور بات ہے۔ ورنہ ''آدم وحوّا'' کا مطلب ہوتا

ہے ''نوعِ انسانی کے سبھی افراد، مرد اور عورتیں۔'' آدم وحوّا کے تعلق کے بارے میں ہم آگے چل کر وہاں گفتگو کریں گے جہاں باغِ بہشت سے انسان کے نکلنے کا مبحث شروع ہوگا۔

تخلیقِ آدمؑ کا قصہ قرآن میں جس طرح بیان ہوا ہے اس سے فطرتِ انسانی کا پتا چلتا ہے۔ انسان کی سرشت کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر جاننے کے لیے اس قصے کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ قرآن کے دیگر قصوں کی طرح یہ قصہ بھی کسی ایک جگہ یکجا بیان نہیں ہوا ہے۔ مختلف سورتوں سے اس کے ٹکڑے جوڑ کر کہانی مکمل کرنا لازمی ٹھہرتا ہے۔ قصۂ آدم کے اہم واقعات مختصراً درج ذیل ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ وہ زمین پر اپنا نمایندہ یا خلیفہ مقرر کریں۔ خلیفہ عربی کا لفظ ہے جس کا مفہوم ہے ''نائب، مختار، قائم مقام، تفویض کردہ اختیارات رکھنے والا'' اللہ تعالیٰ نے فرشتوں پر اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ عام طور پر تو فرشتے اللہ کا ہر فرمان مکمل تسلیم و رضا سے قبول کرتے ہیں لیکن اس معاملے میں فرشتے قدرے پریشانی کا شکار ہوگئے۔ ان کا علم دوسروں سے زیادہ تھا۔ اس خلیفہ کے خصائص پر نظر گئی تو ان میں سے کچھ چیزیں انھیں ناپسند ہوئیں۔ فرشتوں نے عرض کیا:

اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ (۲:۳۰) کیا تو اس میں اس کو خلیفہ مقرر کرے گا جو اس میں فساد مچائے اور خونریزی کرے؟

اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا:

اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ مجھ کو معلوم ہے جو تم نہیں جانتے۔

فرشتے خواہ کیسی ہی نظر رکھتے ہوں ان کا علم اللہ کی حکمتِ بے نہایت کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنے دونوں ہاتھوں سے سنوارا، شکل دی اور اس کے تنِ خاکی میں اپنی روح پھونکی۔ اس کو سب اسما کا علم دیا گیا۔ پھر آدم کو فرشتوں کے سامنے لایا گیا۔ اللہ کی صناعی کے اس نمونے کو فرشتوں کے سامنے رکھا گیا تو یہ تودۂ خاک ان کو کچھ متاثر نہ کرسکا۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ فرشتوں کا ردِعمل کیا ہوگا، یہ سب کچھ اللہ کی حکمت اور تدبیر کا حصہ تھا۔ سو اللہ تعالیٰ نے کائنات کی ساری مخلوق فرشتوں کو دکھائی۔ اس انبوہِ خلق کو دیکھ کر فرشتے دنگ رہ گئے۔ یہاں آکر فرشتوں کو اندازہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے کچھ مستور کر رکھا ہے۔ تب پھر دامِ خداوندی حرکت میں آیا۔ اللہ نے فرشتوں سے فرمایا:

اَ نۡبِئُوۡنِیۡ بِاَسۡمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ (۲:۳۱) — مجھ کو ان کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو

فرشتے سراسیمہ رہ گئے۔

قَالُوۡا سُبۡحٰنَكَ لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا (۲:۳۲) — بولے تو سب سے نرالا ہے، ہمیں تو بس اتنا ہی معلوم ہے جتنا تو نے سکھا دیا۔

بالفاظِ دیگر ''آپ جانتے ہیں کہ آپ نے ہمیں صرف چند اشیا کے نام عطا کیے ہیں۔ کائنات کی ساری مخلوقات کے ناموں کا علم ہمیں بھلا کیوں کر حاصل ہوگا؟

اللہ تعالیٰ آدم کی طرف متوجہ ہوئے۔ آدم ایک کنارے کھڑے تھے۔ فرمایا:

يٰۤاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ (۲:۳۳) — اے آدم ان کو ان کے نام بتاؤ۔

تب آدم نے ایک ایک کر کے ہر مخلوق کا نام گنوا دیا۔ (مفسرین نے اس پر یوں خامہ فرسائی کی ہے کہ آدم کو کائنات کی ہر شے کا نام رہتی دنیا تک کے لیے، اولادِ آدم کی ہر زبان میں معلوم تھا)۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے گویا تنبیہ کے لیے فرمایا:

اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ اِنِّىۡۤ اَعۡلَمُ غَيۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ (۲:۳۳) — کیا میں نے تم سے نہیں کہا کہ آسمانوں اور زمین کے بھید کو میں ہی جانتا ہوں۔

فرشتے اپنی حیثیت جان چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو آدم کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا۔ سبھی فرشتے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر حکم بجا لائے۔ آدم کے علمِ برتر کو تسلیم کرنا ان کے لیے باعثِ مسرت تھا۔ صرف ابلیس تھا کہ جس نے اللہ کے حکم پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔

اس نوع کے تمام بیانات کے مانند قصۂ آدم کو بھی کئی طرح سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کے معنی کی کئی سطحیں ہیں اور اس کا اطلاق انسان کی صورتِ حال پر کئی طرح سے کیا جا سکتا ہے۔ مختلف حوالوں سے اس کے کتنے ہی مفاہیم بنتے ہیں۔[۳۵] ہم چاہیں بھی، کوشش بھی کریں تو بھی اس قصے کی معنی ومفہوم کی تہ کا سراغ نہیں لگا سکتے۔ مسئلہ زیرِ بحث کے لحاظ سے قصۂ آدم سے چند سبق ایسے ملتے ہیں جو خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

آدم کو جملہ مخلوقات کے نام عطا ہوئے جب کہ فرشتوں اور دوسرے مخلوقات کو صرف کچھ مخلوقات کے ناموں کا علم دیا گیا تھا۔ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ ''اسم'' کا لفظ قرآن مجید کے اہم اصطلاحی الفاظ

میں سے ہے کہ قرآن کے سب سے بنیادی موضوعات میں سے ایک یہ ہے کہ ''وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنیٰ'' (۷:۱۸۰)۔ اللہ کا ہر نام اس کی حقیقت کا عنوان ہے، اس کی حقیقت کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ اللہ کے نام جان لینے کا مطلب ہے اس کی صفات اور اوصاف کا علم حاصل کرنا۔ پس کسی شے کے نام سے اس شے کی حقیقت اور اس کی نہاد و سرشت کی نشان دہی ہوتی ہے۔ بالخصوص جب یہ نام خود اللہ تعالیٰ نے تعلیم کیا ہو۔

یہ بات واضح رہے کہ آدم کو صرف اشیا کے نام ہی نہیں سکھائے گئے تھے ان کی معنویت بھی بتائی گئی تھی۔ اشیا کے اسم جان کر آدم نے یہ بھی جان لیا کہ وہ شے کیا ہے اور اس میں کیا خوبی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے کہا ''یہ بادام کا درخت ہے'' تو آدم نے یقین سے یہ جان لیا کہ اس درخت کو بادام کا پھل لگتا ہے، بادام کھانے میں مزیدار ہوتے ہیں اور ان سے روغن بادام نکلتا ہے جو بہت سے صحت بخش خواص رکھتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے کہا ''مگر مچھ'' تو آدم مگر مچھ کی ماہیت تک پہنچ گیا (اور کبھی مگر مچھ کے ساتھ پانی میں اترنے کی غلطی نہیں کرنے کا)۔

آدم کو اسمائے اشیا کا علم دے کر اللہ تعالیٰ نے اسے موسوم کی جانے والی اشیا پر قدرت عطا کر دی۔ آج بھی، نسل ہا نسل کے بعد، جب لفظ و معنی پر کتنے پردے پڑ چکے ہیں اور سبھی کچھ دھندلا ہو چکا ہے، علمِ اسما کے ذریعے قدرت و غلبہ کسی حد تک ہنوز باقی ہے۔ ذہن میں یا زبان سے جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ''یہ ایک درخت ہے''، تو ہمیں علم ہوتا ہے کہ ہم اسے کاٹ سکتے ہیں اور اس کا ایندھن بنا سکتے ہیں۔ اسم کو جاننا، اسم کی حقیقت کا، ماہیت کا جاننا ہے اور اس علم کے بغیر ہم نہ اشیا کو تصرف میں لا سکتے ہیں نہ ان پر قابو پا سکتے ہیں۔ علم قوت ہے، قدرت دیتا ہے اور ہمیشہ ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔

قصۂ آدم اس بات کا کنایہ ہے کہ خلقِ خدا پر آدم کو جو قدرت ملنا تھی وہ شروع ہی سے ایک نزاع کی صورت لیے ہوئے تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ وہ زمین پر اپنا خلیفہ مقرر کریں گے۔ خلیفہ وہ ہے جسے اختیار دیا گیا ہو اور جو کسی کے قائم مقام کی حیثیت سے حکومت کرنے کے وسائل رکھتا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جب آدم کو اشیا کے نام سکھائے تو گویا اسے اپنی قدرت میں سے ایک حصہ عطا کر دیا۔

اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کی قدرت میں جو تعلق ہے وہ اہم ہے۔ اس کا براہ راست تعلق اللہ تعالیٰ کی صفات سے ہے اور ان کے بارے میں ہمارے علم سے۔ وہ ہر شے کو جانتا ہے، ان کو بھی جو ابھی خلق نہیں کی گئیں۔ اپنے علم سے وہ اشیا کو تقدیر کے پیمانے کے مطابق مقرر کرتا ہے۔ ائمہ سبعہ

(سات اماموں) کی فہرست، یعنی سات بنیادی صفاتِ خداوندی میں، علم دوسرے درجے پر آتا ہے۔ سب سے پہلے ہے حیات یا زندگی۔ مردہ چیز صاحبِ علم نہیں ہوسکتی۔ پھر ہر شے کا علم رکھنے کے بعد اللہ تعالیٰ صاحبِ ارادہ بھی ہیں اور اس شے کو عالمِ ہستی میں ایک خاص وقت اور خاص جگہ پر وجود دینے کا ارادہ کرتے ہیں۔ اپنے ارادے کے مطابق وہ اپنی قدرت کو عمل میں لاتے ہیں۔ قدرت کو کارفرما کرنا بلا ارادہ نہیں ہوتا۔ اس کا ایک محرک ہوتا ہے۔ یہ ہوتو اللہ تعالیٰ امر فرماتے ہیں۔ وہ شے سے کہتے ہیں مثلاً ''کن'' (ہو جا) اور وہ موجود ہو جاتی ہے۔ انسان بھی اس انداز میں عمل پیرا ہوتا ہے۔ چونکہ اس میں بھی زندگی پائی جاتی ہے لہٰذا وہ علم رکھتا ہے۔ جب وہ ایک شے کو جان لیتا ہے تو پھر وہ اپنا اور اس شے کا تعلق کسی ڈھب سے تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ مثلاً اس شے کو دور کرنا چاہتا ہے یا نزدیک لانا چاہتا ہے۔ اس ارادے کی بنیاد پر وہ اپنی قوت کو استعمال کرتا ہے۔

دوسری ذی حیات مخلوقات بھی علم رکھتی ہیں اور اس علم کی بنیاد پر عمل کرتی ہیں۔ لیکن ان مخلوقات کو صرف چند اسما کا علم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کا علم خلقی طور پر ان کے گردو پیش کی چند چیزوں تک محدود ہوتا ہے۔ وہ لگے بندھے انداز میں چند مخصوص اور محدود اغراض کے لیے کام کرتی ہیں۔ فرشتے جو کائنات کی سب سے نورانی مخلوق اور اللہ سے سب سے زیادہ قرب رکھنے والے ہیں انھیں بھی چند مخصوص اشیا کے ناموں کا علم حاصل ہے۔ اسی لیے جب انھوں نے دیکھ لیا کہ آدم سب اشیا کے نام جانتا ہے تو انھوں نے بخوشی اس کی فضیلت کو تسلیم کر لیا۔

انسان کو مخلوقات پر جو قدرت حاصل ہے اس کا قرآن میں کئی جگہ ذکر آیا ہے اور ان مقامات کو دیکھنے سے واضح ہوتا ہے یہ معاملہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ آخر یہ انسان ہی تو تھا جسے سب مخلوقات میں اللہ کے نائب اور خلیفہ بننے کے لیے خلق کیا گیا تھا۔ سب مخلوقات میں سے صرف اسی کو تمام اسمائے الٰہی سکھائے گئے اور صرف انسان ہی صورتِ خداوندی پر تخلیق کیا گیا۔ پس کائنات کی ہر شے اسی لیے ہے کہ انسان اس پر حکمرانی کرے۔ انسان کی اس قدرت کی طرف قرآن نے بسا اوقات دیگر مخلوقات کی محکومی کی طرف اشارہ کر کے بیان کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ غلبہ اور یہ محکومی اللہ ہی کی پیدا کی ہوئی ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ (۲۲:٦٥)	کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے زمین کا سب کچھ تمھارے بس میں کر دیا ہے۔

اَلَمۡ تَرَوۡا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمۡ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ (۳۱:۲۰)

تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کی چیزوں کو تمھارے کام میں لگا رکھا ہے۔

اَللّٰہُ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَاَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجَ بِہٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزۡقًا لَّکُمۡ وَسَخَّرَ لَکُمُ الۡفُلۡکَ لِتَجۡرِیَ فِی الۡبَحۡرِ بِاَمۡرِہٖ وَسَخَّرَ لَکُمُ الۡاَنۡہٰرَ ۚ وَسَخَّرَ لَکُمُ الشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ دَآئِبَیۡنِ وَسَخَّرَ لَکُمُ الَّیۡلَ وَ النَّہَارَ ۚ وَاٰتٰىکُمۡ مِّنۡ کُلِّ مَا سَاَلۡتُمُوۡہُ وَ اِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ لَا تُحۡصُوۡہَا اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَظَلُوۡمٌ کَفَّارٌ (۱۴:۳۲-۳۴)

اللہ ہی ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین اور بادلوں سے پانی اتارا، پھر اس سے مختلف طرح کے پھل تمھارے رزق کے لیے پیدا کیے اور کشتی تمھارے کام میں لگائی کہ وہ سمندر میں اس کے حکم سے چلے اور دریاؤں کو بھی تمھاری نفع رسانی میں لگا دیا۔ اور سورج چاند تمھارے کام میں لگائے ایک دستور لیے ہوئے۔ اور دن اور رات کو بھی تمھارے کام میں لگا دیا اور تم کو ہر اس چیز میں سے دیا جو تم نے مانگی۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گنو تو شمار نہ کر پاؤ گے۔ بے شک آدمی بڑا بے انصاف اور ناشکرا ہے۔

مسلمانوں میں جب یونانی فکریات اور فلسفیانہ تحریریں متعارف ہوئیں تو انھوں نے عالمِ صغیر microcosm اور عالمِ کبیر macrocosm کی اصطلاحات وہاں سے مستعار لے لیں۔ ان سے مقصود یہ تھا کہ انسان اور باقی کائنات کے باہمی تعلق کو ایک طرح بیان کیا جا سکے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ انسان کے اندر سبھی کچھ موجود ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے ہر شے کے نام کا یا اس کی حقیقت کا علم عطا کیا ہے۔ ایک شے کا مکمل، پورا اور جامع فہم اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ نفسِ انسانی میں اس شے کی حقیقت موجود ہو۔ افلاطون کے ذہن میں کچھ ایسی ہی بات رہی ہوگی جب اس نے کہا تھا کہ حصولِ فہم یا علم حاصل کرنے کا سارا عمل اس چیز کی یاد آوری سے واقع ہوتا ہے جسے ہم پہلے سے جانتے ہیں۔ ہم اشیا کو تبھی جان سکتے ہیں جب ہمیں ان سے ایک طرح کی عینیت میسر ہو۔ روزمرہ گفتگو کا چلتا ہوا فقرہ It takes one to know one اپنے دامن میں ایک گہری حکمت اور پتے کی بات سمیٹے ہوئے ہے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ انسان کے اندر سبھی کچھ موجود ہے تو اس کو لفظی معنی میں نہیں لینا چاہیے۔ اس میں جو اصول کارفرما ہے اس کا سمجھنا آسان ہو جائے گا اگر ہم اسمائے الٰہی کی بحث پر دوبارہ نظر ڈالیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو اپنی نشانیوں کے مجموعے کے طور پر تخلیق کیا ہے۔ ان نشانیوں اور آیات سے فطرتِ خداوندی کا اسی حد تک علم ہوتا ہے جس حد تک اللہ تعالیٰ اسے کھولنا چاہتے ہیں۔ اس کا انکشاف کس حد تک ہوتا ہے؟ وہ اپنی صفات ظاہر کرتے ہیں جیسے، حیات، علم، قدرت اور کلام۔ ان سب صفات کے مل کر عمل کرنے سے خلق کردہ اشیا کی ایک لامحدود رنگا رنگی اور کثرت جنم لیتی ہے، لیکن تمام اشیا انھی صفات کے آثار اور نشانیاں ہیں جو اصل میں ''الحق'' کی صفات ہیں۔ کائنات اپنے سارے زمانی اور مکانی پھیلاؤ میں، یعنی غیر خدا ہر شے میں، اللہ کی صفات کا ظہور ہے۔ کائنات اللہ کی ظاہر صفات کی صورت گری ہے۔ اسی لیے کائنات اللہ کا پرتو ہے، تمثال ہے، اسی کا عکس اور شبیہ ہے۔

انسان کو بھی صورت خداوندی پر خلق کیا گیا، اس میں بھی سبھی صفاتِ خداوندی سمٹ آئی ہیں۔ انسان اور اس تمام کائنات میں فرق یہ ہے کہ کائنات میں اللہ کی نشانیاں اور آثار بے تحاشا بکھرے ہوئے ہیں جب کہ ہر فردِ انسانی میں اللہ کی نشانیاں ایک نکتۂ واحد پر پوری شدت سے مرکوز ہوگئی ہیں۔

انسان میں صفاتِ خداوندی کا ارتکاز ہی اسے خلیفۃ اللہ بناتا ہے یعنی وہ مخلوق جو وہی کر سکتی ہے جو کارِ خدائی ہے۔ ''تنزیہ'' کا فرق البتہ ہمیشہ ملحوظ رہے گا۔ انسان میں اللہ تعالیٰ کی تمام صفات جلوہ فرما ہیں لیکن ایک کمزور اور مدہم انداز میں۔ یہ دھندلاہٹ اور ضعف اس لیے ہے کہ اگرچہ انسان میں یہ صفات خدا سے مشابہ ہیں اور صورتِ خداوندی پر خلق ہوئی ہیں تاہم زمان و مکان کی قید میں آ کر محدود ہوگئی ہیں۔ خدا خدا ہے، انسانِ خاکی سے ماوراء، بے نہایت و بے پایاں۔

خلیفۃ اللہ کی حیثیت سے انسان کو اپنی رعایا پر ایک قدرت حاصل ہے کہ اللہ کے نائب کے طور پر ان پر حکومت کر سکے۔ کائنات کی مخلوقات انسان کی رعایا ہے۔ اسی سے یہ سراغ ملتا ہے کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے انسان اس دھرتی کی حفاظت بھی کر سکتا ہے اور اسے تاخت و تاراج بھی کر سکتا ہے۔ عہدِ جدید میں جتنے سماجی اور ماحولیاتی بحران نمودار ہوئے ہیں وہ اسی اختیار، اللہ کی خلافت اور قائم مقامی کے بے محابا غلط استعمال نے پیدا کیے ہیں۔

عبد اور خلیفۃ اللہ

ہم نے ذکر کیا تھا کہ بنیادی طور پر اسلام دو قسم کا ہے: وہ بندگی اور تسلیم وحوالگی (اسلام) جو عالمِ خلق کی ہر شے کو کرنا پڑتی ہے اور وہ اختیاری بندگی جو ان لوگوں کا خاصہ ہے جنھوں نے انبیا کی پیروی کا راستہ اپنایا۔ اسی طرح خلافت کی بھی دو بنیادی اقسام ہیں، ایک وہ جو ہر انسان کی حاصل ہے اور دوسری وہ جو صرف ان لوگوں کو ملتی ہے جنھوں نے اپنی مرضی سے اللہ کی بندگی اختیار کی۔

انسان میں ایک تو وہ فطری اور خِلقی خلافت ہے جو اللہ کی قوتِ تخلیق کے سامنے جھک جانے اور اسے قبول کر کے عالمِ ہست و بود میں موجود ہو جانے سے میسر آتی ہے۔ اللہ نے انسان کو اپنی صورت پر خلق کیا ہے اور انسان دنیا میں اس کی صفات کا مظہر ہے۔ اس کو تمام اسما سکھائے گئے، سو اسے تمام اشیا پر قدرت حاصل ہے۔ مؤخر الذکر نوع کی خلافت صرف انھی لوگوں کو ملتی ہے جو اپنی مرضی سے اللہ کی اطاعت وفرمانبرداری کرتے ہیں۔

چونکہ انسان آزادیِ اختیار رکھتا ہے لہٰذا وہ اپنی خِلقی خلافت کا آسانی سے غلط اور بے محل استعمال کر گذرتا ہے۔ یہ آزادیِ اختیار اگر راہِ خدا کے انتخاب میں صرف ہو، انبیا کی لائی ہوئی ہدایت پر عمل کر کے منشائے خداوندی کو مان لینے میں ظاہر ہو تو انسان فی الواقع اس دنیا میں اللہ کا سچا خلیفہ بنتا ہے۔ کسی کی نمایندگی کرنا ہو تو اس کے احکامات اور ہدایات کے مطابق چلنا تو ہوگا۔

محض احکامِ خداوندی پر عمل کرنا خلیفۃ اللہ بننے کے لیے کافی نہیں۔ ''اسلام'' کے کائناتی مفہوم میں تو ہر مخلوق اللہ کے فرمان پر چل رہی ہے۔ کچھوے، بھنگے، بچھو اور چوہے تک اللہ کے اتنے ہی فرمانبردار ہیں جتنا کوئی اور۔ وہ بھی اس کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں۔ لیکن خلافت ایک ایسا وصف ہے جو انسان سے خاص ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اس دنیا میں اسی لیے رکھا ہے کہ وہ اللہ کا خلیفہ بنے۔ (قرآن ۲:۳۰) سو خلافت کا تعلق ان ہدایات واحکام سے ہوا جو صرف انسان کو دیے گئے ہیں (جنّات کا معاملہ جداگانہ ہو سکتا ہے لیکن سر دست ہم انھیں دائرۂ بحث سے الگ رکھیں گے) یہ احکام و ہدایات وہ ہیں جو انبیا اور رسولوں کے لائے ہوئے پیغام میں موجود ہیں۔ انبیا کے پیغام کے روبرو انسان کے کرنے کا اصلی کام یہ ہے کہ ''اسلام'' لائے، بایں معنی کہ نبی کے پیامِ ہدایت کو قبول کر کے اللہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے یا اسلام لائے، بایں معنی کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے پیغامِ ہدایت کا اتباع اور پیروی کرے۔

صاف اور سیدھی بات ہے کہ اللہ کے فرمان اور اس کی ہدایات پر چلنا خاصا جوکھم کا کام ہے۔ اگر یہ ایسا ہی آسان ہوتا تو نہ سیدنا آدمؑ سے لغزش سرزد ہوتی نہ اولادِ آدم ان سب مسائل کا سامنا کرتی جس سے آج نسلِ آدم دوچار ہے۔ اس مشکل کام میں کامیاب رہنے والوں کو سرخرو ہونے پر اسلام نے بہت اعلیٰ درجات دیے ہیں۔ عموماً ایسے شخص کو ''عبد'' (بندۂ خدا) کا نام دیا گیا ہے اور بندگی یا عبدیت کو انسان کا اعلیٰ ترین اور سب سے زیادہ قابلِ تحسین مرتبہ قرار دیا گیا ہے۔ ایک اعتبار سے یہ مرتبہ خلافت اور نبوّت سے بھی بلند تر ہے کیونکہ اللہ کا نمایندہ ہو یا اللہ کا نبی وہ بندۂ خدا پہلے ہوگا تبھی خلافت یا نبوّت پائے گا۔ مسلمانوں میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ کثرت سے جس لقب سے یاد کیا جاتا ہے اور جسے ہر فرض نماز میں بھی پڑھا جاتا ہے وہ ہے ''عبدہ ورسولہ'' (اس کا بندہ، اس کا رسول) یہ محض اتفاقی ترتیب نہیں ہے کہ ''عبد'' پہلے ہے اور ''رسول'' بعد میں۔

''عبد'' کا لفظ اسلام کی اہم ترین اصطلاحات میں سے ایک ہے سو اس کے معنی ومفہوم اور اس کے مدلولات پر غور کرنا لازم ہے۔ اس لفظ سے عام طور پر مراد ہوتی ہے غلام یا خدمت گار۔ بہت سے لوگ یہ تقاضا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بندے سے جس نوع کی مطلق اطاعت اور فرمانبرداری کا مطالبہ کیا ہے اس کے پیش نظر اس اصطلاح کا ترجمہ غلام (slave) کے لفظ سے کرنا بہتر ہے بہ نسبت servant کے۔ تاہم آزادی سچے بندگانِ خدا کا ایک اہم وصف ہے۔ اگر یہ لفظ صرف اسی معنی میں برتا گیا ہوتا جو قرآن کے قبل ازیں مذکور آیت میں مراد تھے تب تو ''غلام'' (slave) ایک موزوں ترجمہ ہو سکتا تھا۔ آیت یہ تھی:

اِنْ كُلُّ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِى الرَّحْمٰنِ عَبْدًا(۱۹:۹۳)	کوئی نہیں آسمان وزمین میں جو نہ آئے رحمٰن کا بندہ ہوکر۔

معنی مذکور کے مطابق ''عبد'' ہونا ایک اضطراری بات ہے، اس میں انسان کے اختیار کی کوئی چیز نہیں۔ یہ کائناتی مفہوم میں ''مسلم'' ہونے کے ہم معنی ہے۔ پس وسیع ترین مفہوم میں ہر شے اللہ کا ''عبد'' ہے اس کا ''غلام'' ہے جو اللہ کے کارِ تخلیق کو سرانجام دے رہا ہے۔ لیکن ہم اس وقت جس نکتے پر غور کر رہے ہیں وہ اس لفظ کے محدود معنی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس معنی میں انسان اللہ کا ''بندہ'' (عبد) بننے کو قبول بھی کر سکتا ہے اور اس سے انکار بھی کر سکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اللہ کا بندہ بننے کا مطلب ہے اس کا حکم بجا لانا۔ اس کا حکم کیا ہے۔ وہ جو اللہ کے

صحیفوں اور انبیا کی کہی ہوئی باتوں میں موجود ہے۔ سو اللہ کا بندہ بننے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی مرضی و اختیار سے حکم خداوندی کو مان کر سر تسلیم خم کردے، ''مسلم'' ہوجائے، ''اسلام'' لے آئے۔

بندۂ خدا، خدا کی بندگی کرتا ہے۔ عربی میں اس کے لیے لفظ ہے ''عبادت۔'' لغات میں اس کے معانی ہیں ''پرستش کرنا، خدمت و چاکری کرنا، فرمانبرداری کرنا، عقیدت و محبت، سرافگندگی، اطاعت، حوالگی۔'' اسلام کی اصطلاحی زبان میں ''عبادت'' کے لفظ سے مراد ہوتا ہے وہ تمام فرض، واجب یا مندوب مراسمِ مذہبی اور معمولات جو مسلمان انجام دیتے ہیں۔ پس اسلام کے پانچ ارکان سب عبادات ہیں۔ ان کا ترجمہ ''اعمالِ عبودیت'' کے الفاظ سے کیا جاسکتا ہے۔ اللہ کا ''عبد'' ہونے کا مطلب ہے ارکانِ خمسہ اور شریعت کے دیگر احکام کی پابندی، نیز سنتِ رسول کی پیروی جس میں بہت سی مندوب عبادات شامل ہیں۔

اور ہر شخص سے بڑھ کر سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے (عبداللہ) ہیں۔ قرآن مجید نے خود یہ لقب آپؐ کو دیا ہے:

وَّ اَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبۡدُاللّٰهِ يَدۡعُوۡهُ كَادُوۡا يَكُوۡنُوۡنَ عَلَيۡهِ لِبَدًا (۷۲:۱۹) — اور جب اللہ کا بندہ صرف اللہ ہی کو کھڑا پکار رہا ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس پر پل پڑیں گے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ قرآن میں حضرت عیسیٰؑ کا قول یوں آیا ہے:

اِنِّىۡ عَبۡدُ اللّٰهِ اٰتٰنِىَ الۡكِتٰبَ وَجَعَلَنِىۡ نَبِيًّا (۱۹:۳۰) — میں بندہ ہوں اللہ کا، اس نے مجھ کو کتاب دی اور مجھ کو نبی کیا۔

اس لیے مسلمانوں کی نظر میں سیدنا عیسیٰؑ بھی اللہ کے کامل بندے ہیں۔

یاد رہے کہ قرآن میں مذکور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا عیسیٰؑ کا لقب ''عبداللہ'' وہ نام ہے جو اسلامی دنیا میں مردانہ ناموں میں سب سے زیادہ مقبول ہے۔ ہر شخص کے حلقۂ شناسائی میں کوئی نہ کوئی شخص عبداللہ (بندۂ خدا) کے نام کا ضرور ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے اسمائے معرفہ کے عمومی چلن کے مطابق اس نام سے بھی والدین کی بڑی اُمیدیں اور عظیم تمنائیں جھلکتی ہیں۔ بچے اپنے نام کے مطابق زندگی بسر کریں، اسم بامسمّٰی ہوں۔ اس امید میں سب سے زیادہ جو نام رکھے جاتے ہیں وہ انبیا کے نام ہوتے ہیں بالخصوص سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر۔ بچوں کا نام رکھنے کا ایک اور انداز یہ بھی

ہے کہ ''عبداللہ'' کے نمونے پر نام رکھے جاتے ہیں لیکن اس میں ''اللہ'' کی جگہ دیگر اسمائے الٰہی شامل کر دیے جاتے ہیں مثلاً ''عبدالحیّ'' (الحیّ کا بندہ) ''عبدالعلیم'' (العلیم کا بندہ) ''عبدالقدیر'' (القدیر کا بندہ) ''عبدالخالق'' (الخالق کا بندہ) وغیرہ۔ اس میں امید یہ ہوتی ہے کہ شخصِ موسوم اس اسمِ الٰہی سے برکت حاصل کرے گا۔

عبادت کا تصور اسلام کی تیسری جہت میں ایک کلیدی تصور کی حیثیت رکھتا ہے، اس جہت کی تعریف رسولِ خداؐ نے یوں فرمائی تھی کہ ''احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے اسے دیکھ رہے ہو۔'' لہٰذا ہم اس لفظ کے مضمرات اور مفاہیم پر گفتگو کتاب کے تیسرے حصے تک کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔

مختصر یہ کہ آدمؑ کو اللہ نے خلیفہ بنانے کے لیے تخلیق کیا۔ لیکن خلیفۃ اللہ بننے کے لیے آدم کو پہلے بندۂ خدا بننا ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر انسان کو روئے ارض پر اللہ کی نمایندگی کرنے کی غرض سے خلق کیا گیا۔ اس منصب کو نبھانے کے لیے، اس کا حق ادا کرنے کے لیے انسان کو لازم ہے کہ انبیا کے وسیلے سے معلوم ہونے والی منشائے ایزدی کے سامنے سرخم کردے۔ انسان پہلے بندۂ خدا بنے گا تو اسے خدا کی نمایندگی کا اعزاز حاصل ہوگا۔ اللہ کا بندہ بننے سے پہلے انسان صرف اپنی اغراض اور خواہشات کا نمایندہ ہوتا ہے۔ حکمتِ ایزدی کی رہنمائی کے بغیر انسان کی نظر ساری کائنات کے مفاد تک وسیع نہیں ہوسکتی اور اس کے نتیجے میں جو وہ کرتا ہے اس کا ضرر ان سب مخلوقات تک پھیلتا ہے جو اس کے زیرِ تسلط ہوتی ہیں اور جن پر اسے خلافتِ ارضی کا اختیار نافذ کرنا ہوتا ہے۔ نیز اسی سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انسان صرف اپنی جودتِ طبع اور اپنے نورِ بصیرت کے سہارے سماجی اور ماحولیاتی مسائل کیوں حل نہیں کرسکتا۔ انسان کی نگاہ ماہیتِ اشیا پر نہیں ہوتی، اس کی نظر اتنی وسعت نہیں رکھتی کہ حقیقت تک پہنچے۔ وہ حقیقت سے کٹی رہتی ہے اور ''الحق'' سے منقطع۔

خلافت سے پہلے عبودیت (بندگی) ہونا چاہیے۔ آپ کسی ایسے شخص کی نمایندگی نہیں کرسکتے جس کے احکامات پر آپ خود عمل پیرا و کاربند نہ ہوں۔ بادشاہ کسی اجنبی کو اپنا سفیر بنا کر روانہ نہیں کرتے۔ سفیر کا منصب وہی پاتا ہے جسے شاہِ وقت نے آزما کر دیکھ لیا ہو اور جس کے بارے میں وہ جانتا ہو کہ اس پر بھروسا کیا جاسکتا ہے۔

مہربان بادشاہ

عبد اور خلیفہ کے درمیان تعلق کے مضمرات کیا ہیں، انھیں سمجھنا ہو تو ''تنزیہ'' اور ''تشبیہ'' پر پھر غور کرنا مفید ہو گا۔ صفاتِ تنزیہ کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شے سے مشابہ نہ ہو، دور اور ماورا ہو، کسی کی رسائی میں نہ ہو۔ ہم نے پہلے عرض کیا تھا کہ اسمائے الٰہیہ میں سے ''المَلِک'' (بادشاہ) کا نام ایسا ہے جس میں ''تنزیہ'' پر زور دینے والے اسمائے خداوندی کے مضمرات و مفاہیم کا ایک نسبتاً زیادہ محسوس concrete نقشہ یکجا ہو کر ابھرتا ہے۔ بادشاہ اپنی رعایا پر مکمل اقتدار رکھتا ہے۔ فی الواقع اس کی رعایا اس کے غلاموں کی حیثیت رکھتی ہے۔ بادشاہ زور آور اور طاقتور ہے، اس کا رعب اور دبدبہ، جلالِ شاہی کی ہیبت دور دور تک ہے۔ شکوہِ سلطانی سے لوگ سہمے رہتے ہیں۔ اس تک کسی کی رسائی نہیں ہے۔ رہی اس کی رعایا، سو رعیت بے چاری بے حد خوار و زبوں حال۔

اب فرض کیجیے کہ یہ بادشاہ سچا بادشاہ ہے اور اپنے منصب کا اہل ہے۔ اس صورت میں بادشاہت پر جو ایک تہمت لگی ہوئی ہے وہ قدرے کم ہو جائے گی۔ مزید یہ فرض کیجیے کہ یہ شاہِ زمان خدائے رحمان و رحیم ہے کہ جس کے سوا اور کوئی حق ہے ہی نہیں۔ اب آپ کہہ سکتے ہیں لوگ باگ اصل میں اللہ کے بندے اور غلام ہیں کہ حکمراں ہے اک وہی باقی سب موہوم۔ نوعِ انسان اصل میں ''مسلم'' ہے خواہ اسے یہ گوارا ہو یا ناپسند۔ تو پھر وہ اس صورتِ واقعہ کو قبول کر کے، سرِ تسلیم خم کر کے اپنے جوہرِ طبع کو اس طرف مائل کیوں نہ کریں کہ اپنی جائز حدود سے تجاوز نہ کریں؟ یہ اسلامِ اختیاری ہے، انبیا کے پیام پر لبیک کہنا اور ان کی ہدایت پر عمل کرنا۔ لوگ خوشی سے، اپنی مرضی سے اللہ کا بندہ بننا قبول کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ عبودیت سے متعلق صفات کی قریبی نسبت ''تنزیہ'' سے ہے یا دوسرے لفظوں میں اللہ کی صفاتِ جلال، قہر اور بُعد سے۔ اس کے برعکس خلافت کی بحث انسان اور خدا کے تعلق پر ''تشبیہ'' کے حوالے سے نظر کرتی ہے اور اسی پہلو سے جائزہ لیتی ہے۔

اللہ کا خلیفہ اس کا نمایندہ ہوتا ہے۔ چونکہ اسے اللہ کی نمایندگی کرنا ہوتی ہے لہٰذا اسے اس کام کے لیے اللہ کے طرف سے منتخب کیا جاتا ہے۔ بادشاہ کو سفیر بنانا ہو تو وہ کوچہ و بازار میں سرگرداں انبوہِ مردم میں سے گرے پڑے لوگوں کو اٹھا کر سفارت کی ذمہ داری نہیں سونپ دیتا۔ سفیر کے منصب کے لیے وہی منتخب ہوتے ہیں جو خود کو سالہا سال تک دربار میں خدمت کے لیے وقف کیے رہے ہوں اور اپنی اہلیت کا لوہا منوا چکے ہوں۔

بندہ یا عبد ہونا کوئی ایک بار کی چیز نہیں ہے۔ ایسا ہوسکتا کہ انسان آج سرکش اور خدا کا منکر، حق چھپانے والا ہو اور کل ایک بندۂ اخلاص اور عبدِ خالص۔ غلط کاری اور باطل کی گم راہی سے حق کی پیروی تک کا سفر، یہ تبدیلی ایک طویل اور درجہ بدرجہ طے ہونے والا عمل ہے۔ یہاں ہم پھر دربارِ شاہی کی تمثیل کے ذریعے بات واضح کرنے کی کوشش کریں گے (اگرچہ واشنگٹن کی بیوروکریسی کی مثال بھی بامعنی ہوسکتی ہے)۔ لوگ بادشاہ کی ملازمت کا آغاز نچلے درجے کے کسی شاہی منصب دار کے عملے میں شامل ہو کر کرتے ہیں۔ خود اس منصب دار نے عمر بھر میں بادشاہ کو ایک بار بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ روابط اور دربار میں رسوخ کی ڈوریاں کیسے ہلائی جاتی ہیں یہ سمجھنے میں وقت لگتا ہے۔ رفتہ رفتہ انھیں یہ فن آجاتا ہے کہ ملازمت، خدمت اور سیاست میں آگے بڑھنے کی راہیں کیسے طے کی جاتی ہیں۔ بہت کم لوگ شاہی ملازمت کے نظام میں ترقی کرتے کرتے اپنی محنت سے دربار کے مقبول لوگوں میں شامل ہو پاتے ہیں۔ وزیرِ اعظم ہی وہ واحد شخص ہوتا ہے جو بادشاہ تک ہمہ وقت رسائی رکھتا ہے۔ یہی نظامِ اشیا کی اس تمثیل میں بھی مضمر ہے جو ''تنزیہ'' کو ظاہر کرنے کے لیے عموماً استعمال کی جاتی ہے۔ بندے سے مکمل خلیفۃ اللہ بننے کی تبدیلی ایک طویل عمل ہوتا ہے۔ ہر مقررہ مرحلے پر اس راہ کے مسافر کو کچھ حقوق اور اختیارات میسر آتے ہیں جو اس کی عبدیت اور بندگی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

یاد رہے کہ سب سے مشکل کام انھی کے لیے مخصوص ہوتے ہیں جو اللہ کے سب سے اچھے بندے ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہیے کہ بندگی کے ابتدائی مراحل نسبتاً آسان ہوتے ہیں اور خلافت کی ذمہ داریوں میں سے بھی بہت کم حصہ ان مراحل میں سامنے آتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ہر ''مسلم'' کسی نہ کسی درجے میں خلیفۃ اللہ ہوتا ہے۔ رسولِ خداؐ نے فرمایا تھا:[۳۶]

> تم میں سے ہر شخص گلّہ بان ہے اور تم میں سے ہر ایک پر اس گلّے کی ذمہ داری ہے۔ لوگوں کی رہنمائی کرنے والا (امام) بھی گلہ بان ہوتا ہے اور اسے اپنے گلّے کے لیے جوابدہ ہونا ہوگا۔ فرد اپنے اہلِ خانہ کے لیے گڈریے کی طرح ہے اور اس کا گلہ اس کی ذمہ داری ہے۔ خاتون خانہ اپنے شوہر کے گھر در اور اولاد کی گلہ بان ہے اور اس کے لیے جوابدہ ہے۔ خادم اپنے مالک کے مال کا رکھوالا ہے اور اس کے لیے جوابدہ ہے۔ بے شک تم میں سے ہر ایک گلہ بان ہے اور تم میں سے ہر ایک پر اس کے گلّے کی ذمہ داری ہے۔

راہِ عبدیت میں انسان جتنا سفر کرتا ہے اس کی ذمہ داری بڑھتی جاتی ہے۔ جب رسولِ خداؐ نے فرمایا کہ ''نکاح آدھے دین کے برابر ہے'' تو آپؐ کا اشارہ ان ذمہ داریوں کی جانب تھا جو اس نئے

رشتے کے قائم ہونے سے شوہر اور بیوی پر عائد ہوتی ہیں۔ اس وقت تک وہ اللہ کے بندے تھے۔ نکاح کے ساتھ سماجی معاملات سے متعلق فرائض کا ایک پورا سلسلہ ان کی بندگی اور منصبِ عبودیت کے جزو کے طور پر بڑھا دیا جاتا ہے۔ شادی سے قبل ان کو صرف اپنی ذات پر نظر رکھنا ہوتی تھی یا اپنے والدین کی ذمہ داری ادا کرنا مطلوب تھی۔ اب ان کو شریکِ حیات، اس کے خاندان، کنبے کے لوگ اور اولاد وغیرہ سبھی کی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونا درکار ہوگا۔ خلافت کا سب سے اونچا درجہ جس میں اللہ کے قائم مقام کے طور پر ساری کائنات پر حکمرانی کی ذمہ داری شامل ہوتی ہے، صرف ان بندگانِ خدا سے مخصوص ہے جو اس کے کامل ترین بندے ہوتے ہیں۔ اسی لیے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو انسانِ کامل کہا جاتا ہے، اللہ کا سب اعلیٰ و برتر خلیفہ اور اس کا سب سے عظیم بندہ۔

خلاصہ یہ کہ اللہ کے بارے میں دو نقطۂ نظر ہو سکتے ہیں: قرب کا اور بُعد کا، غیاب کا اور حضور کا، ''تنزیہ'' کا اور ''تشبیہ'' کا۔ انسان کی اللہ تعالیٰ سے جو دوہری نسبت ہے اس منصب کے حوالے سے انسان کے دو بنیادی کردار ہیں، اللہ کا بندہ اور خلیفۃ اللہ۔ قرب کا تعلق خلافت سے ہے۔ خلیفہ ہونے کے لیے ضروری ہے پہلے انسان اپنی بندگی کو تسلیم کرے اور اس کے تقاضوں پر عمل کرے۔ اللہ رحمان ہے۔ اس صاحبِ رحمت کی رحمانیت کا تقاضا ہے کہ انسان اس سے دوری میں نہ پڑا رہے، اس کا قرب حاصل کرے لیکن اس قرب کا انتخاب اسے اپنے ارادے اور مرضی سے کرنا ہوگا۔ اس آزادیِ اختیار کا راستہ یہ ہے کہ شریعت کی پابندی کی جائے، وہ کھلا اور صاف راستہ جو آبِ حیات تک لے جاتا ہے۔

مراتبِ تخلیق

''تنزیہ'' کے لحاظ دیکھیے تو صرف اللہ تعالیٰ ہی حقیقی اور دائمی ہے، اس کے سوا ہر شے بے حقیقت اور مٹ جانے والی۔ ''تشبیہ'' کے نقطۂ نظر سے تمام اشیا میں بھی کسی حد تک حقیقت ہے تاہم کچھ اشیا زیادہ حقیقی ہیں کچھ کم تر۔ حقیقی ہونے کا مطلب ہے خدا کی حقیقت سے بہرہ یاب ہونا یا اس سے قریب تر ہونا۔ یہاں قرب اور بُعد، نزدیک و دور کو فاصلے اور مکانیت کے معنی میں نہ لیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ مکانی in space نہیں ہے۔ اسی طرح فرشتے اور انسانی ارواح بھی کسی ''جگہ'' نہیں ہیں، مکانی نہیں ہیں۔ ہماری مراد کیفیت اور نوعیت میں نزدیک ہونا ہے۔ کیفیاتی قرب کے لحاظ سے ہی ہم نے کہا تھا کہ آسمان زمین کے مقابلے میں اللہ سے نزدیک تر ہے کیونکہ آسمان نورانی ہے اور زمین خاکدانِ

تیرہ۔اسی طرح آب و گل کے مقابلے میں فرشتے اللہ سے نزدیک تر ہیں اور روح بدن کے مقابلے میں اللہ سے قریب ہے۔آگ اور نفسِ انسانی کے قبیل کے حقائق چونکہ ایک گونہ مبہم سرشت رکھتے ہیں لہٰذا ان کا احتیاط سے جائزہ لینا ہوگا، قبل ازیں کہ ان کے مقام کے بارے میں کوئی رائے دی جائے۔

ہم یہ بھی عرض کر چکے کہ انسان ایک نظامِ مراتب کی چوٹی پر موجود ہے۔اس نظام میں بے جان جمادات سے لے کر درجہ بہ درجہ سبھی مخلوقات موجود ہیں۔ جمادات، نباتات اور حیوانات کے مقابلے میں انسان کے اندر صفاتِ خداوندی زیادہ قوت سے ظاہر ہوتی ہیں، ان میں صرف شدت ہی نہیں پائی جاتی بلکہ یہ بھی ہے کہ انسان میں سبھی صفاتِ خداوندی موجود ہیں جب کہ دیگر مخلوقات میں اکثر صفات مفقود ہوتی ہیں۔

فرشتے نورانی ہیں اور انسان، بہ نظرِ ظاہر، تاریک۔اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ فرشتے نوعِ انسانی سے افضل ہیں۔مسلمان علما نے اس نکتے سے بہت بحث کی ہے اور اختلافِ رائے بھی اکثر دیکھنے میں آیا ہے۔عموماً اس سلسلے میں ہوا یہ ہے کہ جس معیار اور پیمانے پر مدارِ فضیلت رکھا جا رہا ہوتا ہے وہ مختلف ہوتا ہے۔انسان اور فرشتے کی فضیلت کو اگر دو جدا جدا پیمانوں سے طے کریں تو جواب لا محالہ مختلف ہوگا۔مسئلے میں ایک اور پیچیدگی بھی ہے، انسان کتنی ہی طرح کے ہوتے ہیں اور فرشتوں کی بھی بہت سی مختلف اقسام ہیں۔دراصل ہر انسان صفاتِ خداوندی کے ایک نرالے امتزاج کا نمایندہ ہوتا ہے، چنانچہ اس کی مشابہت حیوانات کی نوع میں سے کسی ایک سے زیادہ ہوتی ہے کیونکہ یہ جانور بھی صفاتِ خداوندی کے ایک خاص امتزاج کا نمایندہ ہوتا ہے۔

فرشتوں کی طرح انسان کو بھی کئی اصناف اور اقسام میں بانٹا جا سکتا ہے۔عام طور پر انسانوں کی پانچ بڑی اقسام بتائی جاتی ہیں۔اللہ تعالیٰ کے مقرب ہونے کے اعتبار سے بالترتیب ان کی فہرست یوں ہے: منکرینِ حق truth concalers، مؤمنین، خدا دوست (اولیا اللہ) انبیا اور رسول۔

منکرینِ حق خدا کے بندے تو ہیں مگر اضطراری طور پر جب کہ مؤمنین اپنی خوشی اور رضا سے اللہ کی بندگی کو قبول کرتے ہیں۔لیکن مؤمن کو سچا خلیفۃ اللہ بننے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ اللہ کے خلفا کا تعلق مؤخرالذکر تین درجات سے ہوتا ہے یعنی خدا دوست، انبیا اور رسول۔ جب مسلمان علما میں سے کچھ حضرات یہ کہتے پائے جاتے ہیں کہ انسان فرشتوں سے افضل ہے تو ان کے ذہن میں انسان کی یہی تین قسمیں ہوتی ہیں بلکہ شاید صرف آخری مرتبۂ انسانی۔ان کے پیش نظر

عام انسان نہیں ہوتے جو اوّل الذکر دو قسموں سے تعلق رکھتے ہیں۔

انسان کے افضل ہونے پر قرآن و حدیث سے بہت سے دلائل دیے جاتے ہیں۔ آدم کے سامنے فرشتوں کے سجدہ ریز ہونے ہم کا پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ رسولِ خداؐ کی ایک حدیث بیان کی گئی ہے ''قیامت کے دن اولادِ آدم سے برتر اور کوئی نہ ہوگا''۔[۳۷] لوگ یہ سن کر حیران ہوئے اور کسی نے سوال کیا ''یا رسول اللہ، کیا فرشتے بھی اس سے بالا تر نہ ہوں گے؟'' آپؐ نے فرمایا، ''نہیں فرشتے بھی نہیں۔ وہ تو مہر و ماہ کی طرح مجبور ہیں۔'' جیسا کہ پہلے بیان ہوا، فرشتوں کو کوئی آزادیِ عمل حاصل نہیں ہے۔ وہ چاہیں بھی تو اللہ کے حکم سے باہر نہیں ہو سکتے۔ پس انھیں ویسا ہی رہنا ہے جیسے کہ وہ ہیں۔ لیکن انسان اپنی کمزوریوں اور مجبوریوں پر غالب آتا ہے اور دوری، بُعد (تنزیہ) سے قرب اور نزدیکی (تشبیہ) تک کا سفر طے کرتا ہے۔ ایک اور حدیث میں بھی یہی بات مذکور ہوئی ہے:[۳۸]

> اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو عقل و ہوش سے تخلیق کیا اور جانوروں کی میل و شہوت سے۔ انسان کی تخلیق عقل اور شہوت دونوں سے ہوئی ہے۔ جب انسان کی عقل اس کی شہوات پر غالب آتی ہے تو وہ فرشتوں سے بڑھ جاتا ہے لیکن جب اس کی شہوت اس کی عقل کو مغلوب کر لیتی ہے تو وہ بہیمیت میں جانور سے بھی نیچے گر جاتا ہے۔

اولادِ آدم اپنے مرتبے سے گر کر جانوروں سے بھی پست ہو سکتی ہے، یہ ہم سب کا تجربہ ہے۔ بلّی چوہے کو ہڑپ کر جائے یا کتا بلّی پر جھپٹ پڑے تو کسی جانب سے ملامت کی آواز نہیں اٹھتی (بلّی کا مالک البتہ جزبز ہوگا)۔ یہ کتے کی سرشت میں شامل ہے اور کتا بہرحال کتا ہے۔ لیکن انسان کتے کی سی حرکتیں کرنے لگے تو یہ بری بات ہوگی اور جب انسان اس سطح تک گر جائے تو وہ کتے سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ اخلاقی ابتری اور بدچلنی صرف انسان کا خاصہ ہے۔

انسان فرشتے سے برتر ہو سکتا ہے۔ اس امر کا تجربہ ہر ایک کو نہیں ہوتا بالخصوص ہمارے دور میں تو یہ نایاب چیز ہے۔ اس سے یہ سمجھنا آسان ہوگا کہ بہت سے لوگ آج کل یہ ماننے لگے ہیں کہ بدکرداری اور خباثت انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر بدکار اور اخلاق باختہ انسان اس فیصلے کا خیر مقدم کرے گا کیونکہ اس کے بعد وہ یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہوگا کہ اس کی ساری حرکتیں درست ہیں کہ یہی انسانی سرشت ہے اور یہی دنیا کا دستور۔

انسان کی فرشتوں پر فضیلت کے سلسلے میں قرآن کی جن آیات کو پیش کیا جاتا ہے ان میں سے

ایک ہاروت و ماروت نام کے دو فرشتوں کا قصہ بھی ہے۔ ہم اس کا ذکر پہلے کر چکے ہیں۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ تخلیقِ آدمؑ کے بعد بھی زائیدگانِ نور یعنی آسمان کے فرشتوں کی بے اطمینانی رفع نہ ہو سکی۔ بین السطور شاید یہ کہا جا رہا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اپنے قول کا ذکر کرتے رہے:

اَتَجۡعَلُ فِيۡهَا مَنۡ يُّفۡسِدُ فِيۡهَا وَ يَسۡفِكُ الدِّمَآءَ (۲:۳۰) کیا تو اس میں اس کو خلیفہ مقرر کرے گا جو اس میں فساد مچائے اور خونریزی کرے۔

گویا وہ کہہ رہے تھے ''بارِالٰہ، تو نے دیکھا، ہم نے کیا کہا تھا۔ یہ انسان کیسا بدطینت اور فسادی ہے، ہر دم لڑائی جھگڑا اور خون ریزی۔

فطرتِ الٰہیہ کا تقاضا یہی تھا کہ فرشتوں کی باتیں سن کر صبر کر لیا جائے (آخر اللہ تعالیٰ ''الصبّور" بھی تو ہے)۔ آخر الامر اللہ تعالیٰ نے سوچا کہ شکایات بہت بڑھتی جا رہی ہیں بہتر ہوگا کہ فرشتے خود دیکھ لیں کہ اللہ نے جو کیا وہ ٹھیک تھا اور اسے خوب معلوم تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ اللہ نے فرشتوں کو جتلایا کہ اگر وہ روئے زمین پر زندگی بسر کر رہے ہوتے تو جو انسانوں سے ہو سکا اتنا بھی نہ کر پاتے۔ فرشتوں کا اضطراب یہ سن کر اور بڑھ گیا۔ ان کی صدائے احتجاج اُٹھی کہ وہ ہوتے تو کبھی حکمِ خداوندی سے سرتابی نہ کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمھیں اس کا ثبوت دینا ہوگا۔ فرشتوں نے اپنے ساتھیوں میں سے دو سب سے زیادہ عبادت گذار اور عجز والے ساتھیوں کا انتخاب کیا۔ ان کا نام ہاروت اور ماروت تھا۔ ان کو زمین پر بھیجنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے احکامات سے آگاہ کیا۔ انھیں شراب نوشی نہیں کرنا تھی، زنا، خون بہانے اور شرک سے بچنا تھا۔

قصے کو مختصر کیا جائے تو یوں ہوگا کہ دونوں فرشتوں کو زمین پر بسنے کے لیے انسانی بدن کا قالب دیا گیا۔ وہ دونوں ایک بہت خوبرو لیکن مکار اور چالباز عورت کے دامِ اُلفت میں گرفتار ہو گئے۔ شروع میں تو وہ اللہ کے سب احکامات کی پابندی کرتے رہے لیکن اس عورت نے انھیں باور کروا دیا کہ ایک جرعۂ مے میں مضائقہ نہیں۔ اس کے بعد کیا ہوا ہوگا، یہ سامنے کی بات ہے۔ اس عورت کی خاطر انھوں نے انسانی خون سے ہاتھ رنگنے اور مآل کار اسی عورت کے دیوتا کی پرستش کرنے لگے۔

جب اللہ تعالیٰ نے معاملات کو اس حد بگڑتے دیکھا تو ان فرشتوں کو سرزنش کی۔ ہوش و حواس درست ہوتے ہی فرشتے مغفرت طلب کرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمھیں اختیار ہے، اپنی سزا اسی دنیا میں بھگتو یا اگلے جہان میں سزا پاؤ۔ فرشتے احمق نہیں تھے انھوں نے اسی دنیا میں سزا پانے کو ترجیح

دی۔سو آج دن تک وہ بابل کے ایک کنویں میں اُلٹے لٹکے ہوئے ہیں۔ادھر نوریانِ آسمان پرواز اپنے ساتھیوں کے انجام سے عبرت حاصل کر چکے تھے۔اس واقعے نے انسان کی افراط وتفریط کی سب شکایات کا خاتمہ ہوگیا۔وہ ازسرِنو، پوری سرگرمی سے اپنے فرائض انجام دینے میں مشغول ہوگئے۔ ان کے بنیادی کام ہیں اللہ کی تمام مخلوقات کی بہبود کا خیال رکھنا اور گناہگاروں کو بھی فراموش نہ کرنا۔

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ يَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِى الْاَرْضِ (٤٢:٥)	اور فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح اور زمین والوں کے لیے استغفار کرتے رہتے ہیں۔

یہاں اس نکتے پر غور فرمایئے کہ انسان کی فضیلت اس امر سے وابستہ ہے کہ اس کا بدن مشتِ خاک سے تخلیق ہوا لہٰذا صفاتِ خاک اور نہادِ آب وگل اس کے نفس میں تاثیر کرتی ہیں۔ ہاروت و ماروت سے اس وقت تک گناہ سرزد نہیں ہوا اور نہ ہوسکتا تھا جب تک ان کو تنِ خاکی نہ مل گیا۔ جب خاصیتِ خاک کو نور سے آمیخت کر دیا جائے تو ظلمت و تاریکی، بُعد اور دوری اور قہر وغضب بھی میزانیے میں شامل ہو جاتے ہیں۔مٹی پر غضبِ الٰہی اس لیے ہوتا ہے کہ اس کا شیوۂ وجود ہی یہی ہے، فقدانِ نور سے دبتے چلے جانا۔ اللہ سے دور ہونے کا مطلب ہے ''تنزیہ'' سے نسبت پیدا کرنا اور اسی لیے جلالِ خداوندی کے روبرو رہنا، قہرِ الٰہی اور غضبِ خداوندی کا سامنا کرنا۔اس کے برعکس فرشتوں کے عناصرِ تخلیق میں خاک کا دخل نہیں، وہ صرف نور سے خلق کیے گئے پس وہ اللہ تعالیٰ سے اس قدر دور نہیں ہو سکتے۔ یہ درست ہے کہ بعض فرشتے اللہ تعالیٰ کی صفاتِ جلال وغضب کا مظہر ہوتے ہیں لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان مخلوقات سے بہت دور اور ماورا ہوتے ہیں جن سے انھیں معاملہ کرنے پر مامور کیا گیا ہوتا ہے۔مثال کے طور پر دوزخ کے نگران فرشتے ایسے فرشتے ہیں جو غضب کا مظہر ہیں لیکن ان میں جس غضب کی جلوہ گری ہے وہ اللہ تعالیٰ کی صفت غضب ہے۔ آگے چل کر ہم معاد وآخرت کے حصے میں گفتگو کریں گے کہ غضب اور اللہ سے دوری ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔

سرسری دیکھیے تو بدن ایک منفی شے محسوس ہوگا کیونکہ یہ اپنے اندر ظلمت وتیرگی کو اور اس کے نتیجے میں نافرمانی اور گناہ کو جگہ دیتا ہے۔ بدن ہی کے راستے انسان کے عناصرِ تعمیر میں معصیت کو راستہ ملتا ہے۔لیکن غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہی تاریکی اور ظلمت تو ہے جس کی وجہ سے نور کی پوری تابانی اور چمک دمک دیکھنا ممکن ہوتا ہے۔جس طرح روشنی کو تاریکی کے بغیر لاتعداد رنگوں میں منعطف نہیں کیا

جا سکتا (یعنی تاوقتیکہ ہر رنگ کے لیے کچھ طول موج کی لہریں ہٹا نہ دی جائیں) اسی طرح خاکِ آدم میں پھونکی گئی روحِ ربّانی کو ظلمتِ بدن کے بغیر اولادِ آدم کے بے شمار افراد کی خوبیوں اور اوصاف میں منعطف نہیں کیا جا سکتا۔ بدن اگر نہ ہو تو انسان فرشتہ ہو جائے اور اگر انسان فرشتہ ہو جائے تو پھر وہ نہ تو اللہ تعالیٰ سے دور ہو سکتا ہے نہ اس کا مزید قرب حاصل کر سکتا ہے۔ وہ اپنے مقام پر اٹکا رہ جائے گا جیسے آسمان پر فرشتے اور زمین پر مینڈک، انجیر اور پتھر۔ قرآن میں فرشتے اپنے بارے میں کہتے ہیں:

وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ (٣٧:١٦٤) — اور ہم میں سے ہر ایک کے لیے بس ایک مقام معین ہے۔

فرشتے اور انسان کے سوا تمام مخلوقات ایک ''مقامِ معلوم'' رکھتے ہیں، ان کا مقام مقرر ہے اور ہستی غیر مبدّل۔ لے دے کے صرف انسان ایک ایسی مقدارِ نامعلوم ہے جسے یہ آزادی ملی ہے کہ اپنے مقدر کی صورت گری کر سکے۔

ہم نے پہلے بھی ایک آیت کا ذکر کیا تھا، اس میں انسان کی سب سے الگ اس صورتِ حال کا بیان کیا گیا ہے جب ابلیس نے حکمِ خداوندی سے انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے سوال کیا:

مَامَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ (٣٨:٧٥) — اس چیز کو سجدہ کرنے سے تجھے کیا مانع ہو گیا جسے میں اپنے دو ہاتھوں سے بنایا تھا۔

بہت سے مفسرین کا خیال یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ کے ''دو ہاتھوں'' کا جو ذکر ہے ان سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کی صفات کی دو بنیادی اقسام، جلال و جمال، رحمت و غضب، تنزیہ و تشبیہ۔ پس آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ کہ آدم کو صورتِ الٰہی پر خلق کیا گیا۔ اسی میں یہ اشارہ بھی ہے کہ دیگر تمام مخلوقات ''ایک ہاتھ'' سے خلق کی گئیں یا ہاتھ کے بجائے صرف ''کُن'' سے تخلیق ہوئیں۔ ایک حدیث سے بھی اس تفسیر کی تائید ہوتی ہے۔[۳۹]

> فرشتوں نے اللہ تعالیٰ سے کہا 'یارب آپ نے اولادِ آدم کی تخلیق کی اور اس کے لیے یہ دنیا بنائی، سو ہمارے لیے اگلا جہان مقرر کر دیجیے۔'' اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا، ''میں اپنے نیک بندے کو جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا، اس کی طرح نہیں کروں گا جس کو میں نے کہا ''ہو جا اور وہ ہو گیا۔

پس فرشتے اللہ کے حرفِ ''کُن'' سے پیدا ہوئے جیسا کہ دوسری اشیا وجود میں آئیں۔ بعض

مفسرین کی رائے ہے کہ رحمت کے فرشتے اللہ تعالیٰ کے دائیں ہاتھ اور غضب کے فرشتے اللہ کے بائیں ہاتھ سے تخلیق کیے گئے۔ اسی طرح ابلیس اور شیطانوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بائیں ہاتھ سے تخلیق کیا۔ معاملہ جو بھی رہا ہو، اس طرح کے مباحث سے ایک ہی بات نکھر کر سامنے آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کا جو مرتبہ ہے اور تمام مخلوقات میں جو حیثیت ہے اس کی دوسری کوئی مثال نہیں۔ اس کی یہ انوکھی اور بے نظیر حیثیت اس لیے ہے کہ انسان کو تمام اسما کا علم دیا گیا۔ اسی انوکھے پن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ انسانوں کے لیے انبیا بھیجتے ہیں۔ فرشتوں یا حیوانات میں نبی نہیں بھیجے جاتے۔ (جن چونکہ ایک مبہم مخلوق ہے لہٰذا وہ انسانی نبیوں کی پیروی کر لیتے ہیں)۔ نبوّت کی بحث کتاب کے اگلے حصے میں کی جائے گی، نبوّت کا بیان اصل میں سرشتِ انسانی کی بنیادی ذمہ داریوں اور حقوق کا بیان ہے۔ اس میں جو بنیادی سوال اٹھایا جاتا ہے اور جس کا جواب دینا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ انسان صحیح معنی میں ''انسان'' کیسے بنتا ہے؟ بالفاظِ دیگر انسان خدا کا بندہ اور خلیفۃ اللہ کیسے بنتا ہے؟

باب چہارم

نبوّت Prophecy

شہادتِ ثانی انبیا کا پیغام

حدیثِ جبرئیل کا تقاضا ہے کہ مسلمان ''اللہ کی کتابوں اور رسولوں'' پر ایمان لائیں۔ اسلام کا رکنِ اوّل شہادت ہے۔ کلمۂ شہادت میں یہ بھی شامل ہے کہ انسان زبان سے اس بات کی شہادت دے کہ ''محمد اللہ کے رسول ہیں۔'' پس حدیث جبرئیل ہم سے تمام انبیا کو ماننے کا تقاضا کرتی ہے اور کلمہ شہادت کا دوسرا حصہ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لانے کو لازم قرار دیتا ہے۔ اس میں بظاہر جو ایک تضاد نظر آتا ہے وہ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لائے ہوئے پیغام سے دور ہو جاتا ہے۔ جب مسلمان یہ مان لیتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں تو مسلمان قرآن کی صداقت کو بھی تسلیم کر لیتا ہے اور قرآن بار بار اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ اللہ کی سب کتابیں اور اس کے تمام رسول سچے ہیں۔

مسلمانوں کے ہاں کلمۂ شہادت کے پہلے حصے (**لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه**) کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کلمے میں ایک کائناتی صداقت بیان ہوئی ہے، ایک ایسی صداقت جو ہر انسان اپنے وجدان میں جاگزیں پاتا ہے، کیونکہ انسان کو صورتِ الٰہی پر خلق کیا گیا تھا اور اسے تمام اسما کا علم دیا گیا تھا، لیکن شہادتِ ثانی مختلف ہے۔ اس کا تعلق مسلمانوں سے خاص ہے، کیونکہ اس میں سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوّت کا اعلان ہے اور قرآن کی صداقت کا اثبات۔ تمام سچے دین اس شہادتِ اوّل کا اثبات کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہر سچے دین میں اس کی مخصوص تعلیمات متعین کی جاتی ہے جو اس کے پیروکاروں کو اس دین کے لانے والے یا انبیا کے وسیلے سے عطا ہوتی ہیں۔

ہر نبی اس زبان میں کلام کرتا ہے جو ان لوگوں کے لیے موزوں ہوتی ہے جن میں اسے بھیجا گیا ہوتا ہے۔ یہ زبانِ خطاب اس کی قوم اور سامعین کے ذہنی پس منظر اور تصورِ کائنات سے مناسبت رکھتی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ:

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ (١٤:٤) اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا، اس کی قوم کی زبان میں بھیجا۔

اسی لیے ہر پیغمبر کے لائے ہوئے پیامِ ہدایت کی تفصیلات جداگانہ ہوتی ہیں۔

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجاً وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً (۵:۴۸)

ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک دستور اور ایک راستہ ٹھہرایا اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو ایک ہی امت بنا دیتا۔

لیکن اللہ کی منشا یہ نہیں ہے۔ اس نے یہ کائنات رنگا رنگی اور تنوع کے لیے بنائی ہے۔ پس اس میں بہت سی قومیں، متعدد امتیں خلق کی گئیں۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَّاحِدَةً (۱۱:۱۱۸)

اگر تیرا رب چاہتا تو لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا۔

کلمۂ شہادت چونکہ تمام انبیا کا پیغام ہے، اس لیے فرق واختلاف کلمۂ شہادت کے حصۂ آخر کی اقلیم میں نمودار ہوتا ہے۔ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مخصوص تعلیمات —— ان کی ''شرع ومنہاج'' —— اس راہ ورسم اور شرع ومنہاج سے مختلف ہیں جو موسیٰؑ وعیسیٰؑ، کنفیوشس اور مہاتما بدھ کے ہاں پائی جاتی ہیں۔ فی الواقع روایتی مسلمان اسی خیال کے حامل ہیں کہ ہر نبی یہی پہلی شہادت لے کر آتا ہے جب کہ دوسرا کلمہ ہر نبی کے پیامِ نبوّت سے خاص ہوتا ہے۔

نبی اور رسول

ہم نے پہلے عرض کیا تھا کہ ''اسلام'' کے ایک معنی ہیں انبیا کے ذریعے نازل ہونے والی منشائے خداوندی کو مان کر قبول کر لینا۔ پس انبیا کے لائے ہوئے دین کو ماننے والے ''مسلم'' ٹھہرے۔ بعض مسلمان اس بات پر اعتراض کریں گے کہ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے علاوہ دیگر انبیا کے لائے ہوئے دین بگڑ کر خراب ہو چکے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر یہ درست ہے تو پھر وہ لوگ جو اس بگڑے ہوئے دین پر عمل پیرا ہیں، وہ کسی نبی کے لائے ہوئے دین کی پیروی نہیں کر رہے، بلکہ اس کی ایک بگڑی ہوئی شکل پر عمل کر رہے ہیں۔ یہاں اتنا مزید کہنا ضروری ہے کہ اسلام کے سوا اور تمام ادیان میں فساد کا تصور کوئی عالمگیر اسلامی عقیدہ نہیں ہے، اگرچہ بہت سے مسلمان کچھ اسی انداز میں سوچتے ہیں۔ اس نکتے پر قرآن کی اصل تعلیمات اتنی سادہ نہیں ہیں کہ ان سے سفید وسیاہ کے فیصلے صادر کیے جاسکیں۔ ان میں معانی کی لطیف سطحیں ہیں۔ اس نکتے پر گفتگو آگے چل کر ہوگی۔

نبوّت کی بحث کا مدار نبی کے تصور پر ہے۔ یہ لفظ ''نبی'' جس سہ حرفی مادے سے نکلا ہے، اس کے دو بنیادی مفہوم ہیں: ''آواز نکالنا'' اور ''کسی شے کا بلند ہونا، اوپر اٹھنا۔'' اکثر علما نے اس لفظ کے معانی کو اس کے اوّل الذکر مفہوم کے حوالے سے متعین کیا ہے۔ کتا جب بھونکتا ہے تو ہمیں پتا چل جاتا ہے کہ کوئی غیر معمولی بات ہو رہی ہے۔ اسی مادے سے جو افعال بنتے ہیں، ان کا مطلب ہے: ''خبر دینا، اطلاع پہنچانا۔'' پس نبی وہ شخص ہے جو لوگوں کو اللہ کے بارے میں بتاتا ہے۔ بعض علما کی رائے یہ ہے کہ نبی کے لفظ کے معنی اس سہ حرفی مادے کے دوسرے مفہوم سے متعین ہوئے ہیں۔ نبی وہ شخص ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بلند درجہ دیا ہو، رفعت عطا کی ہو۔ بہر کیف یہ دونوں مفاہیم اسلام کے تصورِ نبوّت میں موجود ہیں۔ وہ شخص جو نبی بنتا ہے، کوئی عام آدمی نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس، انبیا بہت غیر معمولی انسان ہوتے ہیں، ان کا چناؤ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور وہ اللہ کا پیام لاتے ہیں۔ عام طور پر نبی کا منصب یہ ہوتا ہے کہ پیغامِ الٰہی لوگوں تک پہنچائے، تاہم کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ یہ پیغام شخصی نوعیت کا ہو۔

انگریزی میں نبوّت کے لیے جو لفظ Prophecy ہے، اس میں مستقبل کے واقعات کی پیش بینی اور پیش گوئی کا مفہوم بھی شامل ہے۔ عربی کے لفظ نبی میں ایسا کوئی اشارہ نہیں ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ بعض پیغامات اور اعلاناتِ نبوّت مستقبل سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن اسلام کے تصورِ نبوّت میں اور تاریخی واقعات کی پیش گوئی کرنے کے درمیان کوئی لازمی تعلق نہیں ہے۔ قرآن کی بہت کم آیات کو اس طرح کی تاریخی پیش گوئی سے متعلق سمجھا جاتا ہے۔ ہاں بہت سی آیات ایسی ہیں جو ان واقعات کا بیان کرتی ہیں جو آخرِ زمانہ میں پیش آئیں گی اور پھر جب آخری وقت آن لگے گا تو زمانے کے اختتام پر قیامت آ جائے گی۔

احادیث میں آیا ہے کہ سیدنا آدمؑ سے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیا آئے (بعض جگہ دو لاکھ چوبیس ہزار کی تعداد بھی آئی ہے)۔ ان میں سے ہر نبی نے اپنی ملت کی تشکیل نہیں کی، تاہم انبیا کی تعداد اتنی ہے کہ وہ سارے ادیان جو جدید ماہرین تاریخ کو معلوم ہیں، ان کے بانی کے طور پر ایک ایک نبی مان کر بھی بہت سے نبی بچ رہتے ہیں۔

قرآن نے انبیا کے لیے چار کلیدی لفظ استعمال کیے ہیں: نبی، رسول، مرسل، اولوالعزم (صاحبِ عزم)۔ بعض علما کے نزدیک رسول اور مرسل ایک دوسرے کے ہم معنی و مترادف ہیں۔ قرآن میں ان اصطلاحات کا استعمال یہ بتلاتا ہے کہ نبی کا لفظ رسول کے مقابلے میں زیادہ وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ حدیثوں

سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جن میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تین سو تیرہ یا تین سو پندرہ رسول بھیجے۔

قدرے اختلاف رائے کے باوجود مندرجہ ذیل امتیازی نکات ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ہر وہ شخص جو اللہ کے پیغامبر کے طور پر چن لیا جائے، وہ نبی ہوتا ہے۔ انبیا میں نسبتاً کم تعداد میں حضرات کو نئے دین کے قیام کے لیے منتخب کیا جاتا ہے اور ان کو رسول کہا جاتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ رسول وہ نبی ہوتا جس کو دیا گیا پیغام اتنا مفصل تھا کہ اسے تحریری یا زبانی صحائف کی صورت محفوظ کیا جا سکتا تھا۔ انبیا کے ذریعے ان ادیان میں ترمیم و اصلاح کی جاتی ہے جو رسولوں نے قائم کیے تھے، یا پھر انبیا ان ادیان کے صحیفوں کے معنی و مفہوم کی وضاحت کرتے ہیں، مثلاً حضرت ابراہیمؑ رسول تھے جب کہ یعقوبؑ اور یوسفؑ نبی تو تھے، مگر رسول نہیں تھے۔ پہلے نبی اور رسول سیدنا آدمؑ تھے اور آخری نبی و رسول سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ پہلے اور آخری نبی کا ایک ہونا بہت اہم نکتہ ہے کہ اس سے ماہیتِ اشیا اور کائنات کے اسلامی تصور پر روشنی پڑتی ہے۔ اس پر آگے چل کر گفتگو ہوگی۔

اولوالعزم انبیا کے بارے میں کئی آرا ہیں۔ سب سے عام رائے یہ ہے کہ اولوالعزم انبیا سے مراد وہ پانچ رسول ہیں جن کے ذریعے تاریخ انسانی کے بڑے مذاہب صورت پذیر ہوئے، یعنی سیدنا نوحؑ، سیدنا ابراہیمؑ، سیدنا موسیٰؑ، سیدنا عیسیٰؑ اور سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ (البتہ یہ ذہن میں رہے کہ یہاں تاریخ صرف یہودیت، مسیحیت اور اسلام کی دنیا کی تاریخ تک محدود ہے)۔

امانتِ الٰہی The Trust

اسلام کا تصورِ نبوّت جاننا ہو تو اس کے لیے اسلام کے تصورِ انسان پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ دونوں تصورات کا فہم ایک دوسرے پر موقوف ہے۔ اسی طرح انسان کو سمجھنا اس وقت ممکن نہیں، جب تک ہم یہ نہ جان لیں کہ تاریخ میں انبیا کا کیا منصب اور کردار رہا ہے۔

مسیحیت اور یہودیت کی طرح اس قصے کا آغاز بھی سیدنا آدمؑ سے ہوتا ہے، لیکن قرآن میں قصۂ آدمؑ کی تفصیلات اس قصے سے کافی مختلف ہیں جو عہد نامۂ قدیم میں بیان ہوا ہے۔ فرق خاصا اہم ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سرشتِ انسانی کی جو شرح و تعبیر سامنے آتی ہے، وہ ان لوگوں کے لیے خاصی تعجب انگیز، بلکہ بسا اوقات ہلا دینے والی ہوتی ہے جن کی معلومات کا دائرہ ہبوطِ آدم کے بارے میں صرف چند عیسوی تعبیرات تک محدود ہوتا ہے۔

تخلیقِ آدمؑ کا واقعہ قرآن میں جس طرح بیان ہوا ہے اس کی کچھ تفصیلات ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں۔ اب ہم ان تفاصیل میں کچھ اور نکات کا اضافہ کریں گے۔ اس طرح اسلام کے تصورِ انسان کی مزید وضاحت ہو سکے گی۔ یاد رہے کہ حضرت آدمؑ پہلے انسان تھے اور نسلِ انسانی کے مورثِ اعلیٰ۔ آدمؑ کے بارے میں جو بھی کہا جائے گا، وہ ایک حد تک نوعِ انسانی کے ہر فرد کا بیان ہوگا۔

یہ بات پہلے عرض کی جا چکی ہے کہ انسان کے چند مخصوص اوصاف ہیں جو اسے دوسری مخلوقات سے الگ کرتے ہیں۔ ایک مشہور آیت قرآنی میں ان تمام اوصاف کے مجموعے کو سمیٹ دیا گیا ہے۔ اس مجموعۂ اوصاف کو ''**الامانة**'' The Trust کا نام دیا گیا ہے:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۖ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (۳۳:۷۲)	ہم نے اپنی امانت دکھائی آسمان کو اور زمین کو اور پہاڑوں کو۔ پھر سب نے اسے اٹھانا قبول نہ کیا اور اس سے ڈر گئے۔ انسان نے اسے اٹھا لیا۔ یہ ہے بڑا بے ترس، نادان۔

اس آیت کا مفہوم جاننے کے عمل کا آغاز کرنے ہی میں ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ امانت وہ قیمتی چیز ہوتی ہے جسے کوئی شخص کسی دوسرے کو بحفاظت رکھنے کے لیے سپرد کرتا ہے۔ معاملۂ مذکور میں بھی اللہ تعالیٰ نے ایک چیز انسان کے سپرد کی ہے اور اسے اس چیز کا امین بنایا ہے۔ مناسب موقع پر یہ چیز انسان کو واپس کرنا ہوگی کہ امانت کے لفظ میں اس کے لوٹانے کا عندیہ بھی موجود ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا (۴:۵۸)	اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے حق داروں تک پہنچاؤ۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے امانت کے طور پر کیا سپرد کیا ہے؟ دوسری تمام مخلوقات کی طرح انسان کے پاس جو کچھ بھی ہے، اللہ ہی کا دیا ہوا ہے۔ خیر کی ہر شے اس کی اپنی نہیں کہ **اَلْخَيْرُ كُلُّهٗ بِيَدِكَ**'' (خیر، سب کا سب، تیرے ہی ہاتھ میں ہے) جلد یا بدیر ہر وہ شے جو ان کے پاس ہے، وہ انسان کو لوٹانا پڑے گی۔ یہی زمانے کا دستور ہے، یہی انسان کی تقدیر، تاہم اس نوعیت کی ''امانت'' کا لوٹانا تو ہر مخلوق کی مجبوری ہے۔ اس معاملے میں انسان دوسری مخلوقات سے کسی طرح مختلف نہیں ہے۔ ''عبد'' اور ''مسلم'' کے عمومی مفہوم کے مطابق تو ہر مخلوق عبد بھی ہے اور مسلم بھی۔ سو یہاں جبری یا اضطراری امانت کا مسئلہ زیرِ بحث نہیں ہے کہ اس میں انسان کے اختیار کو سرے سے دخل نہیں۔ آیتِ امانت میں

بظاہر ایک طرح کی آزادیِ اختیار کا ذکر ہو رہا ہے اور اس سے ایک بات بالکل واضح ہے کہ اس میں جس کا چیز کا تذکرہ ہے، وہ انسانوں سے خاص ہے۔

زمین نے، آسمانوں نے اور پہاڑوں نے اس بارِ امانت کو اٹھانے سے انکار کر دیا۔ ''آسمان'' استعارہ ہے کائنات کی ارفع و نورانی اشیا کا اور زمین اشارہ ہے ظلمانی اور اسفل اشیا کا۔ پہاڑوں سے وہ چیزیں مراد ہوں گی جو نہ ارفع ہیں نہ اسفل۔ ان تین اصطلاحات سے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ان میں انسان کے سوا تمام اشیا کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ نوعِ انسانی نہ فرشتوں کی طرح ارفع و آسمان پرواز ہے، نہ معدنیات کی طرح پست اور زمین گیر، نہ پودوں اور جانوروں کے مانند درمیانی حیثیت والی۔ یا یوں کہیے کہ اس میں تینوں اوصاف پائے جاتے ہیں۔ اپنی روح میں وہ بلند و ارفع ہے، بدن میں پست اور نفس کے لحاظ سے بین بین۔ ایک چھوٹی سی دنیا، عالمِ صغیر جس میں آسمانوں، زمین اور پہاڑوں، سبھی کی سمائی ہے۔

مختصر یہ کہ اکثر علما کے نزدیک امانت سے مراد ہے اللہ کی خلافت۔ صرف انسان ہی اس امانت کا متحمل ہو سکتا تھا، کیونکہ خلافت منحصر ہے اسما کے علم پر اور وہ صرف انسان کو دیا گیا ہے۔ اس بارِ امانت کو اٹھانے کے لیے صرف انسان ہونا کافی نہیں۔ انسان کو اپنے اختیار سے اللہ کا بندہ بننا ہوگا، خلیفہ بننے کی نوبت تبھی آ سکے گی۔ پس بارِ امانت کا تعلق انسان کی آزادیِ اختیار سے ہے۔ جبری ''مسلم'' — زمین و آسمان اور پہاڑ اسے اُٹھانے سے قاصر ہیں۔ اللہ کی ہدایت کو تسلیم کرنا اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اختیاری ''مسلم'' ہو۔

آیتِ امانت کا آخری حصہ یہ بتاتا ہے کہ انسان ''ظلوم جہول'' (بہت ظالم، بڑا نادان) ہے۔ ان منفی اوصاف کی شرح میں جو بات سب سے پہلے سامنے آتی ہے وہ یہ کہ ان سے اشارہ اولادِ آدم کے ان افراد کی طرف ہے جو اس ''امانت'' کا حق ادا نہیں کرتے۔ اولادِ آدم کے ہر فرد کو اس امانت کا امین بنایا گیا ہے، گو ان میں سے اکثریت یوں رہتی ہے، گویا اسے اپنی صورتِ حال کا سرے سے علم ہی نہ ہو، انھیں اس بات کی خبر ہی نہ ہو کہ وہ، دراصل، اللہ کے خلیفہ ہیں۔ انسان ''ظلوم'' اس لیے ہے کہ وہ چیزوں کو ان کی جگہ سے بے جگہ کر دیتا ہے، صحیح اور غلط کی حدیں پھلانگ جاتا ہے۔ وہ خلافت کے اختیارات و حقوق کو اپنے ذاتی حقوق و مراعات کے طور پر برتنے لگتا ہے اور جو صفاتِ خداوندی اس کو بطور امانت دی گئی ہیں، ان کو امانت کی طرح سنبھال نہیں پاتا۔ اس کے برعکس وہ یوں عمل کرتا

ہے، گویا یہ صفات اس کی ذاتی ہیں اور ان صفات کو جس ڈھب سے بھی استعمال کیا جائے، روا ہے۔

مسلمان مفکرین نے قرآن کی بیان کردہ اس صورتِ احوال کے جواز وتشریح کے لیے کئی انداز اپنائے ہیں، لیکن ہم اپنے آپ کو صرف ایک آیت تک محدود رکھیں گے۔ جو اس تناظر میں اکثر بطور دلیل پیش کی جاتی ہے۔ تخلیقِ آدم ہو چکی تو اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ آدم اور اولادِ آدم پر یہ امر کھول دیا جائے کہ ان کا مقصدِ تخلیق کیا ہے۔ سو اللہ تعالیٰ نے تمام اولادِ آدم کو یکجا کیا اور ان سے خطاب کیا۔ یہ واقعہ قرآن میں یوں بیان ہوا ہے:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِىٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِ هِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۚ قَالُوْا بَلٰى ۚ شَهِدْنَا (۷:۱۷۲)

اور یاد کرو جب نکالا تمھارے رب نے بنی آدم سے، ان کی پیٹھوں سے، ان کی اولاد کو، اور ان کو گواہ ٹھہرایا خود ان کے اوپر۔ پوچھا کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ بولے: ہاں! ہم اس کے گواہ ہیں۔

یہ آیت ایک دیومالائی انداز میں یہ بتلاتی ہے کہ اپنے نفس کی گہرائیوں میں کہیں نہ کہیں، ہر انسان خدا کی ربّانیت کی گواہی دے چکا ہے۔ یہاں عربی کا جو لفظ استعمال ہوا ہے، وہ ہے "**شہدنا**" (ہم گواہی دیتے ہیں)۔ اسی سے شہادت کا لفظ نکلا ہے۔ اس آیت میں جس واقعے کی طرف اشارہ ہے، وہ عام طور پر ''عہدِ الست'' کہلاتا ہے۔ ''الست'' کا مطلب ہے: ''کیا میں نہیں ہوں؟ (تمھارا رب)۔'' اس ساعت میں تمام نوعِ انسانی نے اللہ تعالیٰ سے ایک عہد کیا، توحید کا اقرار کیا اور تسلیم کیا کہ وہ اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہیں کریں گے۔

یہاں اس بات پر زور دینا درکار ہے کہ انسان کا یہ وجدانی علم اصل میں توحید کا علم ہے۔ ''راہِ صواب اور کھلے راستے'' کا علم نہیں۔ مؤخر الذکر راستہ انبیا کی تعلیم سے میسر آتا ہے۔ بالفاظِ دیگر اس کا تعلق کلمۂ شہادت کے پہلے حصے سے ہے، دوسرے سے نہیں۔ دوسرا حصۂ شہادت ان خاص ہدایات واحکامات پر محیط ہوتا ہے جو انبیا لے کر آتے ہیں۔ پہلا حصۂ شہادت ہر ایک کو معلوم ہے، اگرچہ عموماً ہوتا یہ ہے کہ اس کے یاد دلانے اور دھیان میں لانے کی ضرورت رہتی ہے۔ اس کے برعکس دوسرا حصۂ شہادت جن حقائق پر مشتمل ہے، انھیں کسی پیغامِ ربانی سے اخذ کرنا اور سیکھنا پڑتا ہے۔

آیتِ ''الست'' آگے چل کر وہ غرض وغایت بھی بیان کرتی ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر

انسان کو شہادت دینے کے لیے روبرو کیا تھا:

اَنۡ تَقُوۡلُوۡا یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنۡ هٰذَا غٰفِلِیۡنَ اَوۡتَقُوۡلُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَشۡرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنۡ قَبۡلُ وَكُنَّا ذُرِّیَّةً مِّنۡ بَعۡدِ هِمۡ ۚ اَفَتُهۡلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الۡمُبۡطِلُوۡنَ (۷:۱۷۲ -۷۳)

مبادا قیامت کے دن تم یہ کہو کہ ہم کو اس کی خبر نہ تھی۔ یا یہ عذر کرو کہ شرک تو ہمارے باپ دادا نے پہلے کیا تھا، ہم تو ان کی اولاد میں بعد میں ہوئے ہیں۔ کیا تو ہم کو ایسے کام پر ہلاک کر دے گا جو خطا کرنے والوں نے کیا تھا؟

اس آیت کی تفاسیر مختلف ہیں، تاہم بہت سے علما کا کہنا ہے کہ روزِ حساب انسان کو توحید کی صداقت کی شناخت کے لیے جواب دہی کرنا ہوگی، خواہ ان تک کسی نبی کا پیغامِ ہدایت پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو۔ ہاں ان خاص احکامات وتعلیمات کی باز پرس ان سے نہیں ہوگی جو کسی نبی کو دی گئیں اور ان کو اس کی خبر نہ ہو سکی۔

بنیادی فطرتِ انسانی Innate Human Nature

انسان کے باطن میں خلقی طور پر توحید کی شناخت موجود ہے۔ اس تصور کو بیان کرنے کے لیے اکثر ''فطرت'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کو عام طور پر انگریزی میں Primordial Nature یا Innate Disposition کے الفاظ سے ادا کیا جاتا ہے۔ فطرت کے لفظ کے بنیادی اور ابتدائی معنی ہیں ٹکڑوں میں پھاڑنا، شگاف کرنا۔ اس میں کھلنے اور باہر نکلنے کا مفہوم شامل ہے۔ اسی فعل میں پیدا کرنے، ظاہر کرنے کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے اور روزمرہ کی زبان میں اس کا مطلب ہے گوندھنا، خمیر کرنا۔ قرآن نے اللہ تعالیٰ کو ''فاطر السموٰت والارض'' (زمین وآسمان کو پھاڑ کر بنانے والا) کہا ہے۔ عام طور پر ترجمہ کرنے والے لفظ فاطر کے ترجمے میں ''خالق'' یا ''ابتدا کرنے والا'' لکھتے ہیں، لیکن عربی کے لفظ فاطر کے معنی ان نسبتاً مجرد اصطلاحات کے مقابلے میں کہیں زیادہ ٹھوس اور محسوس ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس لفظ کا مطلب ہے ''زمین وآسمان کو پھاڑ کر الگ کر دینے والا''۔ یہ تعبیر اس دوسری آیت میں بیان کردہ تمثیل سے بھی مل جاتی ہے جس میں زمین وآسمان کو چاک کر دینے کا ذکر کیا گیا ہے:

اَوَلَمۡ یَرَالَّذِیۡنَ كَفَرُوۡۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ

کیا ان منکروں نے نہیں دیکھا کہ آسمان و

كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (۲۱:۳۰)

زمین دونوں منہ بند تھے، پھر ہم نے ان کو کھولا، اور ہم نے پانی سے ہر چیز کو زندہ کیا۔

''فتق''، یعنی پھاڑ کر ٹکڑے کرنے، چاک کرنے کی اس آیت اور فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" کی آیت سے جو تصویر ہمارے سامنے ابھرتی ہے، وہ عالمگیر ہے۔ ساری دنیا میں ہر تہذیب میں آفرینشِ کائنات کا نقشہ اسی طرح کھینچا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین آسمان کو الگ الگ کر کے کائنات پیدا کی۔ ان کے جدا جدا ہونے سے پہلے ہر شے ایک ہی سی اور بے امتیاز تھی۔ یونانی فلسفے کے اسلوب بیان میں یوں کہیں گے کہ اس آن صرف chaos تھا، آشوب وآشفتگی تھی، یعنی نہ کوئی ترتیب ونظام نہ حسن و جمال۔ یونانی زبان کے لفظ Cosmos میں بھی یہی دو مفاہیم پائے جاتے ہیں۔ (جس سے انگریزی کا لفظ Cosmetics بنا ہے،) زمین وآسمان کو الگ الگ کر کے اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو اس کی جداگانہ ہستی عطا کر دی۔

ہم نے پہلے بھی کئی مرتبہ عرض کیا ہے کہ آسمان استعارہ ہے ہر بلند وارفع، نورانی، لطیف اور فعّال چیز کا، جب کہ زمین حوالہ ہے ہر پست، ظلمانی، کثیف اور منفعل شے کا۔ جب یہ دونوں الگ ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اقلیمِ بالا سے آبِ حیات نازل کرتے ہیں اور اس اقلیمِ زیریں میں جاندار اشیا وجود میں آ جاتی ہیں۔ زمین وآسمان کی اس تفریق سے پہلے، ان کے الگ الگ کیے جانے سے قبل جدا جدا اور علیحدہ ممیّز اشیا ظہور پذیر ہو نہیں سکتی تھیں۔

قرآن مجید میں ''فطرۃ'' کا لفظ صرف ایک مرتبہ آیا ہے۔ اس کی فعلی صورت بھی استعمال ہوئی ہے۔ ہم نے اس کا ترجمہ ''نکالنا، سامنے لانا، برآمد کرنا'' کے الفاظ سے کیا ہے۔ قرآن مجید کا خطاب یہاں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور پھر آپ کی وساطت سے ہر مسلمان سے ہے:

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۳۰:۳۰-۳۱)

سو تم سیدھا رکھو اپنا رخ دین پر، ایک طرف کے ہو کر، وہی فطرت اللہ کی جس پر اس نے لوگوں کو تراشا۔ اللہ کے بنائے کو بدلنا نہیں۔ یہی ہے سیدھا دین، لیکن بہت لوگ نہیں سمجھتے۔ اسی کی طرف متوجہ ہو کر، اسی سے ڈرتے رہو اور نماز کا اہتمام رکھو اور ان میں سے نہ بنو جو اس کے شریک بناتے ہیں۔

اس آیت میں قرآن نے دین کو فطرت سے جوڑ دیا ہے، وہ فطرتِ ازلی جس پر اسے خلق کیا گیا تھا۔ انسان ہونے کا مطلب ہے ''امانت'' کو قبول کرنا اور ''عہدِ الست'' میں شامل ہونا۔ انسان کو اسی لیے اسما کا علم دیا گیا، صورتِ الٰہی پر خلق کیا گیا اور خلیفۃ اللہ بننے کے لیے سب مخلوقات پر فوقیت دی گئی، لیکن اس مقام پر انسان کی آزادیِ اختیار بھی ایک مسئلہ کو جنم دیتی ہے۔ ہر انسان نے اگرچہ ''بارِ امانت'' اٹھانے کی ہامی بھری تھی، تاہم اولادِ آدم کی اکثریت اس سے روگردانی کر کے **"ظلوماً جھولاً"** بن جاتی ہے۔ ان میں سے اکثر یہ نہیں جانتے ہیں کہ ''امانت'' کی پاسداری ہی سچا دین ہے، یہی راہِ صواب ہے اور انسان کے چلنے کے لیے یہی درست اور صحیح راستہ ہے۔

اختیاری ''مسلم'' بننے کے لیے انسان کو اپنا چہرہ، اپنا رخ (وجہ) اللہ کی طرف موڑنا لازم ہے۔ عربی میں چہرے کے لیے جو لفظ ہے، یعنی ''وجہ''، وہ کسی شے کی حقیقت، اس کی ذات کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرآن یہاں کہہ رہا ہے کہ انسان کو چاہیے کہ اپنی پوری توجہ اور سارے وجود سے اللہ کی طرف رخ کرے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اللہ سے انسان کو رشتۂ توحید قائم کرنا چاہیے اور کسی کو اللہ کا شریک نہیں ٹھہرانا چاہیے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ دین کے پانچوں ارکان پر عمل کیا جائے۔ ارکانِ دین کی نمایندگی اس آیت میں ''صلوٰۃ'' سے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اسلام کی تیسری جہت کو واقعی طور پر زندگی کا حصہ بنانا بھی درکار ہے۔ اس ضرورت کی جانب آیت کے الفاظ **"وَاتَّقُوْہ"** (اسی سے ڈرتے رہو) اشارہ کر رہے ہیں۔

رسولِ خداؐ نے ''فطرۃ'' کا لفظ ایک مشہور حدیث میں بھی استعمال فرمایا ہے جس میں اس اصطلاح کے اسلامی فہم کا بیان سمٹ کر آ گیا ہے۔[۲۴] **"مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ اِلَّا یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَۃِ فَاَبَوَاہُ یُنَصِّرَانِہٖ اَوْیُھَوِّدَانِہٖ اَوْیُمَجِّسَانِہٖ"** (ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے والدین اسے عیسائی، یہودی یا مجوسی بنا دیتے ہیں)۔ یہ قولِ رسول ہمیں بتلاتا ہے کہ انسان کی خلقی سرشت وفطرت اور اسلام اصل میں ایک ہی ہیں۔ ''امانتِ'' الٰہی اور ''عہدِ الست'' کی وجہ سے انسان اس دنیا میں ''توحید'' کی شناخت لے کر آتا ہے، پھر ان کی تربیت اور ماحول ان کی اس سرشتِ اصلی میں بگاڑ لے آتے ہیں اور وہ الٰہِ واحد کا بندہ بننے کی بجائے دوسری حقیقتوں کو اس کا شریک ٹھہرانے لگتا ہے۔ چنانچہ اگر انسان اپنی اصلی کھری فطرت پر لوٹ آئے تو وہ خود بخود ''توحید'' کی طرف واپس آ جائے گا۔

اس حدیث سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ اسلام کی نظر میں ہر غیر مسلم حق کو چھپانے والا

(Truth concealer) ہوتا ہے۔ رسولِ خداؐ کے فرمان میں یہ تو یقینی طور پر مضمر ہے کہ یہ تینوں مذکورہ ادیان ''توحید'' کے جادۂ مستقیم سے ہٹ کر راہِ انحراف پر پڑ گئے ہیں، لیکن اگر غیر مسلموں کے بارے میں اسلام کی تعلیمات کا کوئی حتمی جائزہ لینا ہو تو اس کے لیے دیگر احادیث اور قرآنی آیات کو بھی دیکھنا ہوگا، تب کہیں جا کر آخری بات کہی جا سکے گی۔ آیندہ ابواب میں سے ایک باب میں ہم یہ دیکھیں گے کہ ان نکات پر کوئی واضح عقیدہ موجود نہیں ہے اور ہو بھی نہیں سکتا، کیونکہ غیر مسلم مسلمانوں ہی کی طرح اچھے بھی ہو سکتے ہیں اور برے بھی، صاحبِ ایمان بھی اور حق کو چھپانے والے بھی، راہِ راست کے مسافر بھی اور خطا کار بھی، لیکن ایک عمومی قاعدے کلیّے کے طور پر مسلمان بھی دیگر کسی اور مذہب کے ماننے والوں کی طرح یہی خیال قائم کر لیتے ہیں کہ ہمارا ہی نقطۂ نظر، ہمارا تناظر ہی صحیح ہے، دیگر کوئی نقطۂ نظر اس کی برابری نہیں کر سکتا۔ ایک دین کے لیے یہ بات اتنی ہی فطری ہے جتنا یہ امر کہ ہم جب ''میں'' کا لفظ ادا کرتے ہیں تو ہمارے اندر یہ خیال جاگزیں ہوتا ہے کہ میری ''انا'' میرے برابر والے انسان کے مقابلے میں زیادہ حقیقی اور زندگی کے لیے زیادہ بامعنی ہے۔ ایسے میں وہ لوگ جو مزید فاصلے پر ہیں ان کی زبان سے ادا ہونے والا لفظ ''میں'' اور بھی کم معنویت کا حامل محسوس ہونے لگتا ہے۔ سیدنا عیسیٰؑ کی ہدایت ''اپنے ہمسائے سے اپنے جیسی محبت کرنا'' ایک ایسا مشکل کام ہے جس پر پورا اترنے کے لیے عظمتِ انسانی کا ایک غیر معمولی بلند معیار درکار ہوتا ہے اور اگر معاملہ ان لوگوں کا ہو جنھیں آپ نے کبھی دیکھا تک نہیں تو پھر کام اور بھی دشوار ہو جاتا ہے۔

آدم اور ابلیس

امانت، عہدِ الست اور فطرت، یہ تینوں الفاظ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ نوعِ انسانی کو اللہ کی طرف سے ایک بھاری ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ جس کے لیے وہ خدا کو جواب دہ ہیں اور مخلوقِ خدا کو بھی۔ قصۂ آدمؑ کی جو صورت اسلام میں بیان ہوئی ہے، اس سے یہی تصویر ابھرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کو جملہ اسما تعلیم کیے اور فرشتوں کو اس کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ عندیہ یہ تھا کہ علمِ اسما کی بنا پر آدمؑ فرشتوں سے بھی برتر، بلکہ مخلوقاتِ خداوندی میں بہت سے بلند اور ارفع ترین منصب پر فائز ہو چکا تھا۔

قرآن میں حوّاؑ کی تخلیق کا ذکر نہیں ہے۔ احادیث میں، البتہ انجیل ہی کی طرح یہ بتایا گیا ہے کہ حوّاؑ کو آدمؑ کی پسلی سے پیدا کیا گیا۔ قرآن میں یہ ذکر البتہ آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ اور حوّاؑ کو

جنت میں مقام عطا کیا اور انھیں بتا دیا کہ انھیں وہاں کس طرح رہنا ہے۔

وَقُلْنَا يٰاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۔ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ (۲:۳۵-۶)

اور ہم نے کہا، اے آدم! جنت میں بس تم اور تمھاری بیوی۔ اس میں جہاں سے چاہو فراغت سے کھاؤ اور اس درخت کے پاس نہ پھٹکنا، ورنہ بے انصاف ہو گے۔ تو شیطان نے ان کو وہاں سے پھسلا دیا اور ان کو نکلوا چھوڑا اس سے جس میں وہ تھے۔

جنت میں آدمؑ وحوّاؑ کا ''اسلام'' یہ تھا کہ اللہ کی ہدایات پر عمل کریں۔ وہ اپنی خواہش سے عمل کرنے میں آزاد تھے، ہاں اس درخت کو چھونے کی اجازت نہ تھی۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اپنے آغازِ آفرینش ہی سے انسان کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے آزادی ملی تھی اور ہدایت وراہنمائی بھی۔ اسی آزادیِ اختیار میں اللہ کی ہدایت کو نظرانداز کرنے کا امکان بھی پوشیدہ تھا۔ ادھر ابلیس بھی تاک میں تھا، سو اس نے آدمؑ اور حوّاؑ دونوں کو بھٹکا دیا۔

یاد رہے کہ ابلیس نے آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے اس انکار پر باز پرس کی، تو اس نے کہا:

اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۔ خَلَقْتَنِىْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (۷:۱۲)

میں اس سے بہتر ہوں، مجھے تو نے آگ سے خلق کیا اور اسے مٹی سے۔

ابلیس کی نافرمانی پر اللہ تعالیٰ نے اسے زمین پر اتار دیا۔ اس مرحلے پر ابلیس اور اللہ تعالیٰ کے مابین جو گفتگو ہوئی ہے، وہ بہت اہم ہے کہ اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میں ابلیس کے کردار کے بارے میں اسلام کیا کہتا ہے۔ اس مکالمے پر غور کیے بغیر ہم جنت سے آدمؑ کے ہبوط کے واقعے کی پوری اہمیت کو گرفت میں نہیں لا سکتے۔ اللہ تعالیٰ اور ابلیس کے مکالمے کی باقی تفصیل درج ذیل ہے:

قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ۔ قَالَ اَنْظِرْنِىْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۔ قَالَ اِنَّكَ مِنَ

کہا، تو اتر یہاں سے۔ تجھے یہ حق نہیں کہ تو اس میں تکبر کرے۔ نکل جا! تو یقیناً ذلیلوں میں سے ہے۔ بولا، اس دن تک کے لیے

الْمُنْظَرِيْنَ ۔ قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۔ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ؕ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۔ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ؕ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ (۱۸-۱۳:۷)

مجھے مہلت دے دے جس دن لوگ اٹھائے جائیں گے۔ کہا، تجھ کو فرصت ہے۔ بولا، چونکہ تو نے مجھے گمراہی میں ڈالا ہے، اس وجہ سے میں تیری سیدھی راہ پر ان کے لیے گھات میں بیٹھوں گا۔ پھر ان پر آؤں گا، آگے سے اور پیچھے سے، دائیں سے اور بائیں سے اور تو ان میں سے اکثر کو شکرگذار نہ پائے گا۔ فرمایا، نکل یہاں سے خوار اور کھدیڑا ہوا۔ ان میں سے جو کوئی تیری راہ پر چلا تو میں تم سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔

اس مکالمے کی اور تفصیلات بھی قرآن میں دیگر مقامات پر ملتی ہیں۔ ہماری موجودہ بحث کے حوالے سے مندرجہ ذیل اقتباس اہم ہے:

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۔ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ۔ قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ۔ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۔ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ (۴۳-۳۹:۱۵)

بولا: اے رب جیسا تو نے مجھے راہ سے کھویا، میں زمین میں ان سب کو بہاریں دکھاؤں گا اور تیرے چنے ہوئے بندوں کے سوا ان سب کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔ فرمایا، یہ ایک سیدھی راہ ہے مجھ تک پہنچانے والی۔ میرے بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا بجز ان کے جو گمراہوں میں سے تیرے پیروکار بن جائیں۔

اس بیان سے یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ شیطان کی انسان دشمنی کا آغاز کیوں کر ہوا۔ اس عداوت کا سبب تھا تکبر، غصہ اور حسد۔ شیطان کو اپنے آتشِ نہاد ہونے پر غرور تھا اور مخلوقات میں اپنے بلند مرتبے کا گھمنڈ۔ اسے غصہ اس بات کا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ایک مشتِ خاک کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم کیوں دیا۔ آدمؑ سے حسد کرنے کی وجہ یہ تھی کہ آدمؑ پر اللہ کی خاص عنایت سب کے لیے عیاں تھی۔ اس پر طرّہ یہ کہ ابلیس کی نگاہ اس بات پر کبھی نہ گئی کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ جانتے ہیں، وہ شاید

ابلیس کو معلوم نہیں۔ وہ اس چیز کے ادراک میں ناکام رہا کہ اس سے بھی غلطی سرزد ہو سکتی ہے، اس لیے وہ اپنے کیے کا اور اپنے انجام کا الزام اللہ تعالیٰ کو دیتا رہا۔

قرآن میں ابلیس و آدمؑ کا قصہ جس طرح بیان ہوا ہے، اس کا ایک دلچسپ حصہ وہ سودا بازی ہے جو ابلیس اللہ تعالیٰ سے کرتا ہے۔ اس نے کہا کہ قیامت کے دن تک اس کو چھوٹ دی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے مطالبے کو پورا کر دیا۔ اس کے بعد ابلیس کہتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سب بندوں کو گمراہ کرے گا۔ یہاں ابلیس نے وہی لفظ استعمال کیا ہے جو اس نے اس سے پہلے اس وقت کیا تھا، جب اس نے یہ کہا تھا کہ ''تونے مجھے گمراہ کیا، بھٹکا دیا'' (اَغْوَیْتَنِی)۔ اس مقام پر قرآن نے ابلیس کی کمزوری اور گمراہ کرنے کی قوت نہ رکھنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ابلیس کا اپنا قول ہے: ''میں تیرے سب بندوں کو گمراہ کروں گا، سوائے ان کے جو اہلِ اخلاص ہیں۔'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابلیس جو چاہے کرے، اچھے ''مسلمانوں'' پر اس کا کوئی زور نہ چل سکے گا۔ مختصر یہ کہ ابلیس جو چالیں چلے گا، جو دام بچھائے گا، اس قضیے میں اللہ تعالیٰ آغاز ہی سے شامل ہیں۔

شیطان کے بارے میں مسیحیت کے بیانات پڑھیے تو اکثر اوقات یوں لگتا ہے کہ گویا شیطان پر کسی کا زور ہی نہ چلتا ہو، گویا اس نے اللہ سے سرکشی کر کے بغاوت کی اپنی ایک الگ قلمرو بنالی ہو جس میں اللہ کے قانون کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا گیا ہو۔ بعض مواقع پر تو معاملہ ایسا خراب نظر آتا ہے گویا ابلیس نہ ہو، بدی کا کوئی دیوتا ہو جسے آخر کار تو شکست ہو جائے گی، لیکن فی الحال وہ اپنی من مانی کرنے کے لیے آزاد ہے۔

اسلام میں تصورِ ''توحید'' کا ایسا غلبہ ہے کہ ابلیس کے لیے کسی طرح کے بھی خودمختار کردار کی گنجایش نہیں بنتی۔ ابلیس تک کو ''مسلم'' مانا گیا ہے۔ اگرچہ وہ صرف ایک بہت وسیع معنی میں ''مسلم'' ہے۔ وہ اللہ کا بندہ تو ہے، مگر مجبوری اور اضطرار میں۔ وہ اختیاری بندۂ خدا نہیں ہے۔ اس کا تکبر، گھمنڈ اور خود پسندی، اس کا زعم کہ "انا خیر منه" (میں اس سے بہتر ہوں) اسے یہ دیکھنے ہی نہیں دیتا کہ وہ بھی دوسری ہر مخلوق کی طرح اللہ ہی کا بندہ ہے۔

قصۂ ابلیس کو آیاتِ قرآنی کے مکمل سیاق وسباق میں غور سے پڑھیے تو یہ آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ یہاں انسان کی آزادی اختیار کا مسئلہ ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ سب سے پہلے یہ دیکھیے کہ ابلیس خطا وعصیان اور گمراہی کا نمایندہ ہے۔ اس کے بغیر غلط فیصلے، نادرست چناؤ ممکن نہیں، بلکہ یوں کہیے

کہ انتخاب اور چناؤ ہی ممکن نہیں۔ انسان کے لیے ابلیس کا وجود ہی صحیح اور غلط، حق اور باطل، خوب اور ناخوب، ہدایت اور گمراہی، فوز و فلاح اور انجام بد سب کے درمیان ایک خطِ امتیاز قائم کرتا ہے۔ اگر راہِ انحراف نہ ہوتی تو راہِ صواب کیسے سامنے آتی۔

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ تخلیقِ کائنات کے لیے اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان، بلند و پست، نور و ظلمت، روشن و تاریک، لطیف و کثیف اور ثقیل اور ہلکے کو ایک دوسرے سے الگ الگ کر دیا۔ ان میں امتیاز کے بغیر ایک چیز کو دوسری سے جدا کرنا، ممیّز کرنا ممکن نہیں، نہ اس عمل کے بغیر کوئی مخلوق جامۂ ہستی میں آ سکتی ہے۔ نور اور ظلمت، روشنی اور تاریکی کا فرق ایک مادی مفہوم تو رکھتا ہی ہے، لیکن اس میں ایک غیر مادی اور غیر محسوس معنی بھی ہیں۔ نور حوالہ ہے تمام صفاتِ خداوندی کا، جب کہ تیرگی اور ظلمت اشارہ ہے انھی صفات کے فقدان کا۔ نور کی ایک روحانی معنویت بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نور کا تعلق ہے تابندگی اور چمک سے، علم سے، ہدایت اور نجاتِ اخروی سے۔ اس کے برعکس ظلمت کا تعلق ہے جہل سے، گمراہی اور ضلالت سے اور خسران و نقصان سے۔ بعض مسلمان مفکرین نے لکھا ہے کہ جب وقتِ آخر آن لگے گا تو آگ کو دو حصوں میں بانٹ دیا جائے گا۔ اس کا روشن اور نورانی حصہ بلند ہو کر جنت میں چلا جائے گا جب کہ اس کی گرمی اور تمازت بہ کر جہنم میں داخل ہو جائے گی۔ دوزخ ایک ایسا ٹھکانا ہے جس میں اذیت ناک اور جلا ڈالنے والی تیرگی ہے۔ جنت اقلیمِ نجات و آزادی ہے، حیاتِ نو دینے والی روشنی۔

مختصر یہ کہ ابلیس ظلمتِ خطا و عدوان کی تجسیم ہے، مجسم جہل، تکبر اور ظلم کی تیرگی ہے۔ ابلیس جن قوتوں کا نمایندہ ہے اس کے بغیر اخلاقیات کی دنیا برقرار نہیں رہ سکتی۔ غلط اگر نہ ہو تو صحیح کیسے جانا جائے گا، نادرست ہی سے تو درست کا امتیاز قائم ہوتا ہے۔ انسان کو نجاتِ اخروی کیسے حاصل ہو گی، اگر خطا و خسران اور غلط اور نقصان کے ذریعے Salvation اور Damnation کی نوعیت متعین نہ ہو۔ ہم روشنی میں داخل ہی کیوں کر ہوں، اگر تاریکی نہ پائی جائے جس سے نکل کر ہم نور میں قدم رکھیں۔ ہمارا تو وجود ہی نہ ہو، کیونکہ ہماری ہستی کا دارومدار ہی ہماری انسانی صورتِ حال کے اس ابہام پر ہے۔ اس کی حیثیت کیا ہے؟ اس کی تعریف متعین کیجیے تو یہ نکتہ سامنے آئے گا کہ ہم نور و ظلمت کے درمیان معلق ہیں، زمین و آسمان کے بیچ، روح اور بدن کے درمیان۔

ابلیس بدی اور ستم گری کا نمایندہ ہے، لیکن مسلمان یا کم از کم سمجھدار مسلمان جانتے ہیں کہ اسے

اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لیے پیدا کیا تھا جو وہ انجام دے رہا ہے۔ وہ محض اپنا فرضِ منصبی پورا کر رہا ہے۔ عالمِ خلق میں اس کا کردار یہی ہے، گستاخی، گھمنڈ، غصہ اور حسد۔ اللہ کے پیمانۂ تقدیر نے اس کے لیے صفاتِ الٰہیہ میں سے قہاریت، جباریت اور عظمت و کبریائی جیسی صفات قہر وغضب کا تو بڑا حصہ مقدر کر دیا، لیکن حکمت، شائستگی اور حسنِ تناسب سے تقریباً تہی دامن رکھا۔ قرآن مجید نے بھی کئی آیات میں اس جانب اشارہ کیا ہے۔ وہ آیت جس میں ابلیس کے قسم کھا کر اپنے ارادۂ اغوائے انسانی کے اعلان کا ذکر ہے، وہ یوں ہے:

قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ (۳۸:۸۲) اس نے کہا قسم ہے تیری عزت کی میں ان سب کو گمراہ کر کے رہوں گا۔

یہاں اس کا ربط اللہ کے نام ''العزیز'' (The Almighty, The Inestimably Precious) سے قائم ہوتا ہے۔ اسی طرح جب قرآن یہ کہتا ہے کہ ابلیس نے اپنی بڑائی جتائی (استکبار کیا) تو وہ اسے اللہ کے نام ''المتکبر'' (The Grand,The Proud) سے جوڑ دیتا ہے۔ ابلیس ایک ایسی خدمت کر رہا ہے جو اسمائے غضبیہ سے ایک قریبی تعلق رکھتی ہے۔

سرشتِ ابلیس پر مزید گفتگو کرنے سے پہلے ذرا آدمؑ وحوّاؑ کی طرف واپس چلتے ہیں ہم نے قصہٗ آدم وہاں چھوڑا تھا جہاں ابلیس کی وجہ سے جنت میں ''ان سے لغزش سرزد ہوئی۔'' لوگ اکثر یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ جنت میں ابلیس کا کیا کام؟ اب تک یہ بات واضح ہو چکی ہوگی کہ انسان ہونے کا مطلب ہے خطا وصواب، درست و نادرست اور اطاعت و معصیت کے درمیان ایک چناؤ کا سامنا کرنا۔ اللہ تعالیٰ آدمؑ کو شجرِ ممنوعہ سے الگ رہنے کا حکم ہی نہ دیتے، اگر ان کی مشیت میں آدمؑ کی غلط روی کا امکان موجود نہ ہوتا۔ اس حکم میں اس امر کا اثبات مضمر تھا کہ اللہ تعالیٰ اور ابلیس کے درمیان ایک معاملہ طے پا چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ ابلیس انسانوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرے گا (اور ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ، ابلیس کو کم از کم ایک حد تک اس میں کامیابی ہوگی)۔

جب آدمؑ وحوّاؑ نے اس شجر سے پھل کھا لیا تو ان پر اپنی برہنگی عیاں ہوئی اور وہ درختوں کے پتوں سے اپنے بدن کو ڈھانپنے لگے۔ انجیل میں بھی یہ قصہ اسی طرح مذکور ہوا ہے اور قرآن و انجیل دونوں سے یہ واضح ہے کہ یہ شجرِ ممنوعہ اصل میں خیر وشر کے علم کا درخت تھا۔

ممنوعہ پھل کھا کر آدمؑ نے کیا کیا؟

وَعَصٰى آدَمَ رَبَّهٗ (۲۰:۱۲۱) آدم نے اپنے رب کے حکم کی خلاف ورزی کی۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے آدمؑ وحوّاؑ سے کہا:

اَلَمۡ اَنۡهَكُمَا عَنۡ تِلۡكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلۡ لَّكُمَاۤ اِنَّ الشَّيۡطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيۡنٌ (۷:۲۲) کیا میں نے تمھیں اس درخت سے روکا نہیں تھا اور یہ نہیں کہا تھا کہ شیطان تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے؟

آدمؑ وحوّاؑ کا جواب ایسا ہے جیسے خواب سے چونک کر اٹھنے والے کسی شخص کا ہوتا ہے۔ وہ یک لخت ششدر رہ گئے کہ ان سے یہ کیا ہو گیا اور پھر وہ دونوں ایک آواز ہو کر بولے:

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا وَاِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَ تَرۡحَمۡنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ (۷:۲۳) بولے، اے ہمارے رب، ہم نے خراب کیا اپنی جان کو۔ اور اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ کیا تو ہم نامراد ہو جائیں گے۔

قرآن میں اس عمل کا الزام نہ تو صرف حوّاؑ پر رکھا گیا ہے نہ تنہا آدمؑ پر۔ دونوں سے لغزش ہوئی، دونوں نے اپنی غلطی کا ادراک کر لیا اور دونوں اپنے رب سے مغفرت کے طالب ہوئے۔

اس مرحلے پر اللہ تعالیٰ نے آدمؑ وحوّاؑ کو زمین پر اتار دیا اور انھیں بتا دیا کہ یہاں ان کو باہمی عداوت کا منہ دیکھنا ہوگا:

قَالَ اهۡبِطُوۡا بَعۡضُكُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ وَ لَكُمۡ فِى الۡاَرۡضِ مُسۡتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيۡنٍ ۰ قَالَ فِيۡهَا تَحۡيَوۡنَ وَ فِيۡهَا تَمُوۡتُوۡنَ وَمِنۡهَا تُخۡرَجُوۡنَ (۷:۲۴-۵) فرمایا: اترو، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمھارے لیے زمین میں ایک خاص وقت تک رہنا ہے اور برتنا ہے۔ فرمایا: اسی میں تم جیو گے، اسی میں تم مرو گے اور اسی سے نکالے جاؤ گے۔

ہبوطِ آدم The Fall

مسیحی تحریروں میں Fall کا جو لفظ استعمال ہوا ہے، اس میں قدرے ایک منفی مفہوم پنہاں ہے۔ عربی کی وہ اصطلاح جو اس واقعہ کو بیان کرنے کے لیے استعمال ہوئی ہے، وہ ہے ''ہبوط۔'' یہ لفظ ان آیات میں استعمال ہوا ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے آدمؑ وحوّاؑ سے خطاب کر کے انھیں ''نیچے اترنے'' کا حکم دیا ہے (اِهۡبِطُوۡا)۔ مسلمان مفکرین نے اس واقعہ کے منفی پہلوؤں کو بھی دیکھا اور مانا ہے کہ بہرحال

اس کی نوبت اسی لیے آئی کہ آدمؑ وحوّاؑ اللہ کے حکم سے باہر ہو گئے۔ یہ لغزش شیطان کی وجہ سے ہوئی تھی۔ مسلمان مفکرین کی تحریروں میں اس بات کا اشارہ شاذ و نادر ہی ملتا ہے کہ ہبوطِ آدم کے واقعہ سے کسی طرح کے original sin یا ''گناہِ اصلی'' کا بھی کوئی تعلق ہے۔ یہ تصورِ مسیحیت سے خاص ہے۔ آدمؑ وحوّاؑ سے لغزش ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو کہا کہ جنت سے نکل کر زمین پر اتر جاؤ۔

اسلام کے نقطۂ نظر سے یہ کہنا، یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ اگر آدمؑ وحوّاؑ سے لغزش نہ ہوتی تو ان کے لیے بہتر تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ ہر شے بقدرِ اندازۂ خداوندی معین ہے۔ اللہ کی رحمت وحکمت اس امر کی ضامن ہے کہ ہر چیز میں خیر ہوتی ہے۔ دوسرا نکتہ یہ کہ تخلیقِ آدمؑ کے آغاز ہی میں اللہ نے کہا تھا:

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (۲:۳۰) میں زمین پر خلیفہ بنا رہا ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو جنت کے لیے نہیں، اس دنیا کے لیے بنایا تھا۔ ''نیچے اترو'' (اِهْبِطُوْا) کا مطلب ہے نیچے اتر کر دنیا میں پھیلنا۔ جنت کہیں اور واقع تھی اور بظاہر دنیا سے بالاتر کسی جگہ پر۔ جو شے بھی دنیا سے بلند تر ہو، اس میں آسمانی خواص ہوں گے، زمینی اوصاف نہیں پائے جائیں گے، وہ ارفع ہوگی، نورانی ہوگی اور لطیف ہوگی۔

آدمؑ کے زمین پر آنے کو اسلام نے کس نظر سے دیکھا ہے اور کیوں کر اس کی تعبیر کی ہے اسے جاننا ہو تو مندرجہ ذیل حدیث پر غور کیجیے جس میں ساری بات بہت خوبصورتی سے سمیٹ کر بیان کر دی گئی ہے:[۱۹]

سیدنا موسیٰؑ نے کہا: ''پروردگار، مجھے دکھایے آدمؑ کون تھا جس نے ہمیں اور خود کو جنت سے نکلوا دیا''۔ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کی رویت کروائی۔ سیدنا موسیٰؑ نے کہا: ''آپ ہی ہمارے جدِاعلیٰ آدم ہیں؟'' آدمؑ نے اثبات میں جواب دیا۔ سیدنا موسیٰؑ نے کہا: ''آپ ہی تھے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی روح پھونکی، جسے تمام اسما کا علم دیا، اور جس کے سامنے اس نے فرشتوں کو سجدہ کرنے کا امر کیا اور وہ سجدہ ریز ہوئے!'' آدمؑ نے کہا، ہاں۔ اس پر سیدنا موسیٰؑ نے کہا: ''یہ کیوں کر ہوا کہ آپ خود بھی جنت سے نکلے اور ہمیں بھی نکلوا دیا؟'' آدمؑ نے جواب میں پوچھا: ''تم کون ہو؟''۔ موسیٰؑ نے بتلا دیا۔ آدمؑ نے کہا: ''تم بنی اسرائیل کے وہ نبی ہو جس سے اللہ تعالیٰ نے پردے کے پیچھے سے خطاب فرمایا اور جسے اللہ نے اپنی مخلوقات میں سے اپنا رسول بنایا؟'' موسیٰؑ نے کہا، جی ہاں۔ آدمؑ نے کہا: ''تم نے دیکھا نہیں کہ میری تخلیق سے بھی پہلے میری (یہ لغزش) کتابِ خداوندی میں درج تھی؟'' موسیٰؑ نے کہا کہ ہاں ایسا ہی تھا۔ اس پر آدمؑ نے کہا: ''تو پھر مجھے اس بات کا دوش کیوں دیتے ہو جو عرصۂ ہستی میں آنے سے پہلے ہی میرے لیے امر فرما دیا گیا تھا''

رسولِ خداؐ نے اختتامِ کلام کے طور پر زور دے کر تین مرتبہ دہرایا: ''سو اس طرح آدمؑ نے موسیٰؑ سے گفتگو کی بازی جیت لی۔'' ہم اس سے نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ عام طور پر مسلمانوں کا اعتقاد یہ ہے کہ ہبوطِ آدم کے کچھ منفی نتائج بلاشبہ رہے ہوں گے، تاہم یہ سب اللہ تعالیٰ کی حکمت اور منصوبۂ الٰہی کا حصہ تھا۔ ہبوطِ آدم کے بغیر آدمؑ کو اس زمین پر خلیفۃ اللہ کی حیثیت کیوں کر ملتی؟ مسیحی اصطلاح میں کہیے تو یوں ہوگا کہ شجرِ ممنوعہ کا پھل کھانا اصل میں ایک ''لغزشِ مسعود'' (fortunate sin) کے مترادف تھا۔

یاد رہے کہ خلافت کا مدار عبودیت پر ہے۔ اور عبودیت اور بندگی کا انحصار اس بات پر ہے کہ اسمائے تنزیہ اور جلال سے آپ کا رشتہ اور تعلق درست اور صحیح ہو۔ اللہ کا سچا اور صحیح بندہ بننے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اللہ سے اپنے فاصلے کو سمجھے اور اس کے غضب، قہر، عظمت، کبریائی، اور اس کے بالائے ادراک ہونے کو قبول کرے، تاہم اگر انسان کی نظر صرف اللہ کی رحمت پر رہے اور وہ فقط اس کے روئے مہر و محبت ہی کو دیکھا کرے تو اس کے لیے ممکن نہ ہوگا کہ وہ ان صفاتِ جلال و غضب کو جان سکے، اسی لیے بعض مسلم مفکرین نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ و حوّاؑ کو باغِ بہشت میں اسی لیے رکھا تھا کہ وہ ان سختیوں اور مصائب کی سہار پیدا کرلیں جو اس لمحے یلغار کریں گی جب ان کو اللہ سے بہت دور، اس زمینی دنیا کو اپنا مسکن بنانا ہوگا۔ جنت میں تھے تو اللہ کے قرب میں تھے، گاہ گاہ اللہ تعالیٰ ان سے کلام فرماتے تھے۔ اللہ کا قرب، جمال اور رحمت ہی آدمؑ و حوّاؑ کا سرمایہ تھا۔ روئے ارض پر وارد ہونے کے بعد وہ اللہ سے دور ہوگئے۔ اب انھیں اللہ کی صفاتِ جلال و غضب کے عواقب کا سامنا کرنا تھا۔ کمالِ انسانی کے سارے امکانات سے بہرہ یاب ہونے کے لیے ضروری تھا کہ انھیں قرب و بعد، دوری اور نزدیکی سبھی کا ذائقہ چکھنے کا موقع ملتا۔ ''توحید'' کی بنا رکھنے کے لیے لازم ہے کہ صفاتِ ''تشبیہ'' اور صفاتِ ''تنزیہ'' دونوں ہی انسان کا تجربہ بن جائیں۔

عام مسیحی تناظر میں ہبوطِ آدم کے منفی نتائج کو ''گناہِ اصلی'' کے تصور کے ذریعے بیان کیا جاتا ہے۔ اللہ کی نافرمانی کرنے اور شجرِ ممنوعہ کا پھل کھانے سے آدم کی سرشت میں ایک ایسا بنیادی فساد پیدا ہوگیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ضروری ہوا کہ وہ مسیح علیہ السلام کی صورت میں خود کو مجسم کرکے اللہ کے تصور کی اصلاح اور تصحیح کرے۔ اس کے برعکس اسلام میں ''گناہِ اصلی'' Original Sin کا کوئی تصور نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے شجرِ ممنوعہ کا پھل چکھنے پر آدمؑ و حوّاؑ کو اسی وقت معاف کردیا تھا۔ صرف اسی قدر نہیں، بلکہ ''ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ'' (پھر اس کے رب نے اسے نوازا)، یعنی آدم کو اللہ کا نبی مقرر کیا گیا۔

اس لیے قرآن میں آیا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى اٰدَمَ وَنُوحًا وَّ اٰلَ إِبْرٰهِيمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِينَ (۳:۳۳)	بے شک اللہ نے آدم، نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کو اہل دنیا کی رہنمائی کے لیے منتخب کیا۔

یہ وہ نکتہ ہے جس پر اسلام اور مسیحیت میں بنیادی اختلاف پایا جاتا ہے۔ انسان کی سرشت و نہاد کے بارے میں اسلامی اور مسیحی تصورات میں بنیادی فرق ہے۔ پہلے انسان سے لغزش ہوئی، وہ گر پڑا۔ ہم سب سے ایسا ہو جاتا ہے، لیکن ہمارے برعکس اس سے صرف ایک ہی مرتبہ لغزش ہوئی۔ مزید برآں یہ کہ اس نے اسی ساعت توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے اسے معاف کر دیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو نبی بنایا اور ان کو خطا وعصیاں سے معصوم بنا دیا۔ آدمؑ ہمارے لیے مسبب المصائب نہیں، بلکہ کمالِ انسانی کا نمونہ ہیں۔ اگر انسان اپنے باپ آدمؑ اور اپنی اماں حوّاؑ جیسے بن سکیں تو کیا کہنے، پھر نہ ان کے لیے حزن ہوگا نہ کسی شے کا خوف۔ روئے ارض پر آدمؑ کا بطور خلیفۃ اللہ خدا کے نبی کی حیثیت سے ظاہر ہونا اس بات کا اشارہ ہے کہ اللہ کی رحمت اس کے غضب سے بڑھی ہوئی ہے اور ہدایتِ خداوندی شیطان کی پھیلائی ہوئی گمراہی پر غالب رہتی ہے۔

غفلت

اسلام میں اگر ''گناہِ اصلی'' کا تصور نہیں ہے تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ مسلمان یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ سب کچھ درست ہے اور لوگ باگ جیسے ہیں ویسے ہی چلتے رہیں، یونہی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ایسا ہی ہوتا تو اللہ تعالیٰ کو ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟ ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ تھی، کوئی چیز اصلاح طلب تھی جسے درست کرنا درکار تھا۔

یہ درست ہے کہ فطرتِ انسانی کا ایک تقاضا اعترافِ ''توحید'' ہے، لیکن بہت سے لوگ اللہ کے شریک بنانے لگتے ہیں۔ تو پھر مسئلہ کیا ہے؟ ایک جواب ہے ''ابلیس''، لیکن اس جواب کو سمجھنے کے لیے قدرے توضیح درکار ہے۔ اس کی طرف ہم چندے بعد رجوع کریں گے۔ اس سوال کا ایک اور جواب منصبِ نبوّت پر غور کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ انبیا کی کوشش کیا ہوتی ہے؟ کارِ نبوّت کیا ہے؟ اگر ہم نے یہ سمجھ لیا تو حل طلب مسئلہ زیرِ غور بھی صاف ہو جائے گا۔

ہم نے پہلے عرض کیا تھا کہ انبیا کے پیغام کی دو سطحیں ہوتی ہیں جن کو اسلام کی اصطلاح میں ''شہادتین''، یعنی دو شہادتوں سے موسوم کیا گیا ہے۔ انبیا کا اوّلین اور مرکزی پیغام ''توحید'' ہوتا ہے۔ ثانوی پیغامِ ہدایت یہ ہے کہ انسان اللہ کے نازل کردہ احکام پر پوری طرح عمل کرے تا کہ اس کی زندگی میں ''توحید'' کے جملہ مضمرات اور تقاضے پوری طرح ثبات حاصل کرسکیں۔

اگر سرشتِ انسانی میں ''توحید'' پہلے سے موجود ہے، تو پھر انبیا کو اس پر اتنا زور دینے کی کیا ضرورت ہے؟ اس سوال کا یک لفظی جواب ہے ''غفلت۔'' قرآن میں اس لفظ کا استعمال تقریباً ''نسیان'' forgetfulness کے مترادف کے طور پر ہوا ہے۔ ابلیس کی سرکشی اس کے گھمنڈ اور تکبر کی وجہ سے تھی۔ لغزشِ آدم کا باعث نسیان (بھول، فراموش گاری) تھا۔ آدمؑ سے بھول ہوئی:

وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا (۲۰:۱۱۵)	اور ہم نے اس سے پہلے آدم پر ایک عہد کی ذمہ داری ڈالی تو وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم کی پختگی نہیں پائی۔

آدمؑ و ابلیس کا بنیادی فرق دیکھنا ہو تو اس ردعمل میں دیکھیے جو دونوں کی جانب سے عتابِ خداوندی کے جواب میں ظاہر ہوا۔ اللہ کے حکم سے باہر ہونے پر، اللہ کی نافرمانی پر جب ان سے باز پرس کی گئی تو ابلیس کا رویہ کچھ اور تھا، آدمؑ کا جواب اور۔ ابلیس نے یہ ماننے ہی سے یکسر انکار کر دیا کہ اس سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہے، بلکہ الٹا اللہ تعالیٰ کو اپنی گمراہی کے لیے قصوروار ٹھہرانے لگا۔ آدمؑ و حوّاؑ نے فوراً اس بات کا اعتراف کرلیا کہ ان سے خطا ہوئی، سو وہ دونوں اللہ سے مغفرت اور عفو و درگذر کے طالب ہوئے۔ پس انسان کی بھول چوک ایک اور شے ہے، شیطان کا انکار دوسری چیز۔ کسی معاملے میں بھول ہو جانا اور اپنی کوتاہی کا اعتراف کرنے سے انکار کرنا دو مختلف باتیں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ غفلت اور نسیان، لاپروائی اور بھول چوک میں کوئی خرابی نہیں۔ اس کے برعکس یہ نوعِ انسانی کی بنیادی خامی ہے۔ پس اسلام کے تصورِ انسان میں غفلت و نسیان جو کردار ادا کرتے ہیں، وہ بعض اعتبار سے مسیحیت کے ''گناہ اصلی'' سے مشابہت رکھتا ہے۔ اللہ کو بھولنے کا مطلب ہے توحید فراموشی اور ''توحید'' کے بغیر انسان کے لیے نجاتِ اخروی ممکن نہیں۔

پہلے ذکر ہو چکا کہ قرآن کے مطابق اللہ تعالیٰ ہر بات معاف کر دیتے ہیں سوائے ''شرک'' کے، دوسری کسی ہستی کو اللہ کا شریک قرار دینے کی کوئی معافی نہیں۔ اللہ کو فراموش کر کے انسان اس کا مقام

کسی دوسری چیز کو دے دیتے ہیں۔ اس کی صفات کی نسبت اپنی ذات سے کرنے لگتے ہیں یا ان صفات کو عالمِ طبیعی اور معاشرے کی قوتوں سے منسوب کر دیتے ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ساری کائنات اللہ کی تسبیح کرتی ہے اور اس کی نشانیاں ظاہر کرتی ہے۔ سو، غفلت ہو یا نسیان، ایک لحاظ سے، شرک ہی کے برابر ہیں۔ مندرجہ ذیل قرآنی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان انسانوں اور جنّات کا ذکر کیا ہے جو جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ ان کا گناہ، ان کا جرم ہے ''غفلت'':

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهاَ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (۷:۱۷۹)

اور ہم نے جنوں اور انسانوں میں سے بہتوں جہنم کے لیے پیدا کیا۔ ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں، ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں۔ یہ چوپایوں کے مانند ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو بالکل بے خبر ہیں۔

غور کیجیے کہ ان لوگوں کو دیکھنے اور جاننے بوجھنے کے سارے وسیلے میسر تھے، لیکن وہ ان کا کوئی استعمال نہیں کرتے تھے۔ انھیں کیا دیکھنا تھا، کیا سننا تھا؟ اللہ کی نشانیاں، اس کی آیات۔ ایسے لوگ عالمِ طبیعی پر نظر ڈالتے ہیں، لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ قدرت کی ہر شے اللہ کی نشانی ہے۔ وہ مقدس کتابوں کی قراءت سنتے ہیں، لیکن یہ نہیں جانتے کہ کتاب پڑھنے والا انھیں اللہ کا کلام سنا رہا ہے، اللہ ان سے مخاطب ہے:

وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ (۱۰:۹۲)

اور بے شک بہت سے لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہی رہتے ہیں۔

الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ٭ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۱۰:۷-۸)

جو ہماری نشانیوں سے غافل ہیں۔ انھی لوگوں کا ٹھکانہ دوزخ ہے، ان کے اعمال کے پاداش میں۔

جب انسان اللہ کی نشانیوں کا ادراک کرتا ہے تو اسے ہستیِ انسانی کی پوری حدود اور سارے احکام کا شعور ہوتا ہے۔ اُسے یاد رہتا ہے کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور کدھر جا رہا ہے۔ اگر وہ ان نشانیوں کو نظرانداز کر دے تو پھر وہ اس دنیا، اس سرائے فانی کے ظاہر میں، اس کی نمودِ ظاہری میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ (۳۰:۷)

وہ اس دنیا کی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں اور آخرت سے بالکل ہی بے خبر ہیں۔

ہم نے ذکر کیا تھا کہ موت کیا ہے، حقیقت سے دوچار ہونا، شعور کی ایک عظیم بیداری۔ لمحۂ موت کے بعد انسان اپنے دیکھے اور سنے کو اس کے صحیح معنی میں دیکھنے اور سننے سے روگردانی نہیں کر سکتا۔ پھر وہ اپنی بے خبری میں مگن رہنا چاہے بھی تو نہیں رہ سکتا۔ وہ کتنی ہی کوشش کرے کہ جہل و شادمانی کی سابقہ حالت پر لوٹ جائے، اس کے لیے ممکن نہ ہوگا۔ اب اُس کے لیے حقائقِ اشیا سے نظریں چار کرنا لازمی ہوگا۔ دو فرشتے اسے حضورِ خداوندی میں لے جائیں گے:

وَجَآءَ تْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّ شَهِيْدٌ ۝ لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآئَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْد..... اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ۝ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبِ ۝ نِ الَّذِيْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَاَلْقِيٰهُ فِى الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ (۵۰:۲۱-۲۶)

اور ہر جان اس طرح حاضر ہوگی کہ اس کے ساتھ ایک ہانکنے والا ہوگا اور ایک گواہ۔ تو اس سے غفلت میں پڑا رہا تو ہم نے تجھ سے تیرا پردہ ہٹا دیا۔ تو آج تو تیری نظر بہت تیز ہے.... تم جھونک دو جہنم میں ہر ناشکرے حق پوش، معاند، خیر سے روکنے والے، حدود کو توڑنے والے، مبتلائے شک کو، جس نے اللہ کے ساتھ دوسرے خدا بنا لیے۔

قرآن و حدیث میں نارِ جہنم اور غفلت کا گہرا تعلق کئی طرح سے بیان کیا گیا ہے۔ متعدد آیات میں غفلت اور آگ میں جلنے کا باہمی ربط صراحت سے بیان ہوا ہے:

وَقِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا وَمَاْوٰكُمُ النَّارُ وَمَالَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ (۴۵:۳۴)

اور حکم ہوا آج ہم تم کو بھلا دیں گے جس طرح تم نے اپنے اس دن کی ملاقات کو بھلائے رکھا اور تمھارا ٹھکانا دوزخ ہے۔

فَذُوْقُوْا بِمَانَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَاكُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۳۲:۱۴)

تو اب چکھو مزا اس بات کا کہ تم نے اس دن کی پیشی کو بھلائے رکھا۔ ہم نے بھی تم کو بھلا دیا اور تم اپنے کیے کی پاداش میں اب ہمیشگی کا عذاب چکھو۔

ہم نے عرض کیا تھا کہ غفلت اور نسیان بنیادی خامیاں ہیں، کیونکہ ان سے توحید کی نفی ہو جاتی ہے بلکہ اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ خدا فراموشی کا مطلب ہے خود فراموشی، کیونکہ انسان صورتِ الٰہی پر خلق کیا گیا۔ اللہ سے تعلق جاتا رہا تو گویا انسان کا اپنی حقیقت سے ناتا ٹوٹ گیا اور وہ بے حقیقتی کے گڑھے میں جا پڑا۔ اور اس کا مطلب ہے ہر حقیقی اور اچھی چیز سے ایک اذیت ناک جدائی اور دوری کا تجربہ۔ قرآن نے اس صورتِ حال کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا ہے:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (۵۹:۱۹)

ان کی طرح نہ ہو جاؤ جو خدا کو بھول بیٹھے تو اللہ نے ان کو خود ان سے غافل کر دیا۔ یہی لوگ اصلی نافرمان ہیں۔

ذکر

اگر غفلت اور نسیان انسان کی بنیادی خامیاں ہیں تو ذکر کو اس کی وہ خوبی کہا جا سکتا ہے جو ہر خامی کی تلافی کر دیتی ہے۔ جس طرح خدا فراموشی انسان کو اس عذابِ الیم تک لے جاتی ہے جہاں اللہ تعالی بھی اسے بھلا دیتے ہیں، اسی طرح اللہ کی یاد انسان کو اس مقام تک پہنچا دیتی ہے جہاں اللہ تعالیٰ بھی اسے یاد کرنے لگتے ہیں:

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ (۲:۱۵۲)

تو تم مجھے یاد رکھو، میں تمھیں یاد رکھوں گا۔

تاہم ذکر سے مراد صرف یہی نہیں ہے کہ انسان اللہ کے سامنے اور اس کی ہدایت پر کیوں کر عمل پیرا ہو۔ ذکر عنوان ہے منصبِ نبوّت کا۔ کارِ نبوّت ذکر ہی سے عبارت ہے۔

ذکر کے لفظ کے تین بنیادی مفہوم ہیں: تذکرہ کرنا، یاد کرنا، اور یاد دلانا۔ کسی شے کا زبان سے ذکر کرنا ایسا ہے جیسے اسے یادداشت میں لانا۔ اسے یاد کرنا، ذہن میں لانا۔ اگر اس لمحے دوسرے لوگ بھی موجود ہوں اور وہ اس شے کے بارے میں پہلے سے کچھ جانتے ہوں تو انھیں بھی وہ شے دوبارہ یاد آ جائے گی۔ انگریزی کا لفظ remembrance دونوں مفہوم رکھتا ہے ''اپنے ذہن میں تازہ کرنا، یاد آوری'' اور ''دوسرے شخص کو یاد دلانا۔''

اللہ تعالیٰ انبیا بھیجتے ہیں کہ انسانوں کو ''عہدِ الست'' کی یاد دہانی کروائی جائے۔ انبیا یہ کام کس طرح کرتے ہیں، آیاتِ خداوندی کی تلاوت کر کے، اس کی نشانیاں بتا کر اور یہ یاد دلا کر کہ انسان پر اللہ کی عنایت کا کتنا بوجھ ہے۔ انسان کو چاہیے کہ انبیا کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اللہ کو یاد کرے۔

ذکرِ خداوندی کا یہ عمل تقاضا کرتا ہے کہ انسان حمد و تسبیح میں اسے یاد کرے، (یعنی ''تنزیہ'' اور ''تشبیہ'' دونوں کا اثبات کرے)۔ اس انداز میں عمل کرنے والے اہلِ ایمان ہوتے ہیں کیونکہ ایمان کا مطلب ہے دل میں ''توحید'' کا اقرار اور یادداشت، زبان سے اس کا ذکر اور انبیا کے ذریعے ملنے والے احکاماتِ خداوندی کی پیروی کے وسیلے اس کا اپنے عمل میں نفاذ۔

وہ لوگ جو درست جواب نہیں دیتے، صحیح ردِّعمل سے قاصر رہ جاتے ہیں وہ حق کو چھپانے والے ہیں، حق پوش ہیں Truth Concealers۔ وہ دل ہی دل میں اگرچہ حق کو پہچانتے ہیں، لیکن زبان سے اس کا انکار کرتے ہیں اور انبیا کی تعلیمات پر عمل کرنے سے گریزاں رہتے ہیں۔ مختصراً یہی وہ چیز ہے جسے ہم کارِ نبوّت اور انسانی جواب، نبی کی دعوت اور انسانی ردِّعمل کا رزمیہ کہہ سکتے ہیں۔ قرآن میں یہ سب کچھ ایک واضح انداز میں یا تو ''ذکر'' کے لفظ سے منسلک نظر آتا ہے، یا ان الفاظ سے جو اسی مادے سے مشتق ہیں، مثلاً ''ذکریٰ'' ''تذکرہ'' اور ''تذکّر''۔ مثال کے طور پر بہت سی قرآنی آیات میں سے چند آیات ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔ پہلی دو آیات اس تصور کو واضح کرتی ہیں کہ انسان کے لیے اللہ کا پیغام اصل میں یاددہانی ہوتا ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْهُدٰى وَاَوْرَثْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ ۰ هُدًى وَّذِكْرٰى لِاُولِى الْاَلْبَابِ (۴۰:۵۳-۵۴)	اور ہم نے موسیٰ کو ہدایت عطا فرمائی اور بنی اسرائیل کو کتاب کا وارث بنایا اہلِ عقل کی رہنمائی اور یاددہانی کے لیے۔
اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ (۳۶:۶۹)	یہ تو بس یاددہانی اور نہایت واضح قرآن ہے۔

اللہ کی طرف سے آنے والی یاددہانی کا درست جواب یادِ خدا اور ذکرِ الٰہی ہونا چاہیے۔ قرآن نے بہت سی آیات میں ذکرِ خدا یا اسمِ خداوندی کے ذکر کا حکم دیا ہے۔ اسمِ خداوندی کا ذکر نماز میں اللہ کے نام کا ذکر کرنے ہی کی طرح ہے۔ ذکرِ الٰہی کا ثمر صرف یہی نہیں کہ اگلے جہان میں اللہ تعالیٰ ذکر کرنے والے انسان کو یاد کریں گے۔ بلکہ ذکر کا حاصل یہ ہے کہ انسان کو اسی دنیا میں سکونِ قلب نصیب ہو جاتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا وَسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا (۳۳:۴۱)	اے ایمان والو! تم اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو۔ اور اس کی تسبیح کرو صبح وشام۔
وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۰ وَمِنَ الَّيْلِ	اور اپنے رب کا نام صبح اور شام یاد کرو اور

فَاسْجُدْلَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا (۷۶:۲۵-۲۶)	رات میں بھی اسے سجدہ کرو اور اس کی تسبیح کرو رات کے طویل حصے میں۔
فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِى الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا (۶۲:۱۰)	پھر جب نماز ختم ہو چکے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل ڈھونڈو اور اللہ کو بہت یاد کرو۔
وَيَهْدِىْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ (۱۳:۲۸-۲۹)	اللہ اپنی طرف رہنمائی ان لوگوں کی فرماتا ہے جو اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جو ایمان لائے اور جن کے دل اللہ کی یاد سے مطمئن ہوتے ہیں۔ سن لو کہ اللہ کی یاد میں ہی دل چین پاتے ہیں۔ جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے، ان کے لیے خوشخبری ہے اور اچھا ٹھکانا ہے۔

انبیا کی دعوت اور ان کی یاد دہانی کا غلط جواب، غلط انسانی رویّہ یہ ہے کہ پیغامِ خداوندی کی صداقت کا انکار کر دیا جائے اور اپنے کاروبارِ دنیا میں مگن رہا جائے۔ ذرا مختلف نقطۂ نظر سے دیکھیے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اپنے روزمرہ کے دنیاوی معاملات اور ذمہ داریوں میں بے تحاشا انہماک اور مشغولیت سے انسان یقینی طور پر غفلت میں پڑ جاتا ہے۔ دنیا میں زیادہ الجھاؤ غفلت شعاری کو جنم دیتا ہے:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا (۱۸:۵۷، ۳۲:۲۲)	اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جس کو اس کے رب کی آیات سے سمجھایا جائے اور وہ اس کی طرف سے منہ پھیر لے۔
فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (۳۹:۲۲)	سو خرابی ہے ان کے لیے جن کے دل اللہ کی یاد کے معاملے میں سخت ہو چکے ہیں۔
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَ اَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ ۔ اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (۶۴:۱۴-۱۵)	اے ایمان والو! تمھاری اولاد اور تمھاری بیویوں میں سے بعض تمھارے لیے دشمن ہیں ..... تمھارے مال اور تمھاری اولاد (تمھارے لیے) امتحان ہیں۔

اللہ کو فراموش کرنے کا مطلب ہے شیطان کے چھل فریب میں آ جانا، اس کے پھندوں میں گرفتار رہنا، کیونکہ انسان کو غفلت شعار بنانا ہی شیطان کی ساری کاوشوں کا حاصل ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی سامنے رہے کہ اس معاملے میں بھی شیطان اللہ کے حکم سے باہر خود مختار ہو کر کچھ نہیں کر سکتا، کیونکہ غفلت شعار انسانوں کو اللہ تعالیٰ خود اس کے اور اس کی ذرّیات کے حوالے کر دیتے ہیں:

وَمَنۡ يَّعۡشُ عَنۡ ذِكۡرِ الرَّحۡمٰنِ نُقَيِّضۡ لَهٗ شَيۡطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيۡنٌ (٤٣:٣٦)

اور جو کوئی الرحمٰن کی یاد سے آنکھیں چراتا ہے تو ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں جو اُس کا ساجھی بن جاتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَاالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُلۡهِكُمۡ اَمۡوَالُكُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُكُمۡ عَنۡ ذِكۡرِاللّٰهِ ۚ وَمَنۡ يَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ (٦٣:٩)

اے ایمان والو! تمھارا مال اور تمھاری اولاد تمھیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں۔ اور جو لوگ یہ کام کریں تو وہی لوگ ہیں جو گھاٹے میں پڑے۔

اس نکتے پر زور دینا شاید یہاں ضروری ہے کہ ان آیات میں جو مسئلہ بیان ہوا ہے، اسے سمجھنے کے لیے انسانی سرشت کے اسلامی تصور پر دوبارہ غور کر لینا چاہیے۔ انسان ہونے کا مطلب ہے فطرت پر پیدا ہونا، یعنی ''توحید'' کی خِلقی اور پیدایشی شناخت۔ اس اعتراف و شناختِ توحید کو تمثیل کے طور پر ''عہدِ الست'' اور ''بارِ امانت'' کے قصوں میں بیان کیا گیا ہے۔ اس فطرت، اس سرشتِ انسانی میں اوپر سے یا خارج سے کوئی اور چیز ایزاد نہیں کی گئی، یہ وہی چیز ہے جس سے انسان انسان بنتا ہے، لیکن یہ فطرتِ انسانی اس کی تربیت اور ماحول کی وجہ سے دھندلا جاتی ہے، اس پر گردِ غفلت کی تہ جم جاتی ہے اور پھر انسان انسان سے فروتر ہو جاتا ہے، مرتبۂ انسانی سے گر جاتا ہے۔ پھر وہ ''گونگا، بہرہ، اندھا ہو جاتا ہے۔ ڈھور ڈنگر کے مانند، بلکہ ان سے بھی بدتر، گمراہ تر۔'' ذکر وہ اہم ترین اور موثر ترین علاج ہے جو انسان کی اصل سرشت اور فطرت کو بحال کرتا ہے اور اسے حقیقت بناتا ہے۔ ذکر بیک وقت غفلت کے تدارک کے لیے اللہ کی رحمت سے ملنے والا وسیلہ بھی ہے اور اللہ کی رحمت پر لبیک کہنے کا انسانی اسلوب بھی۔

ذکر کی اہمیت کا خلاصہ کرنے کے لیے ہم آخر میں چند قرآنی آیات مزید درج کر رہے ہیں۔ ان آیات کی ایک خاص معنویت ہے، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا وہ خطاب ہے جو آدمؑ کو زمین پر بھیجنے سے

پہلے کیا گیا۔ یہ آیات ان ابتدائی ہدایات کا تذکرہ ہیں جو اللہ کے بندوں اور اس کے نائبین کو زمین پر اتارنے سے قبل جاری کی گئیں۔ اس میں انبیا کی دعوت اور ان کے پیغام کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر اور قرآن مجید کے مشمولات کو سمیٹ کر بیان کر دیا گیا ہے:

ثُمَّ اجۡتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيۡهِ وَهَدٰى • قَالَ اهۡبِطَا مِنۡهَا جَمِيۡعًا بَعۡضُكُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ فَاِمَّا يَاۡتِيَنَّكُمۡ مِّنِّىۡ هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَاىَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشۡقٰى • وَمَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِكۡرِىۡ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيۡشَةً ضَنۡكًا وَّ نَحۡشُرُهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ اَعۡمٰى • قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرۡتَنِىۡۤ اَعۡمٰى قَدۡ كُنۡتُ بَصِيۡرًا • قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتۡكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيۡتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الۡيَوۡمَ تُنۡسٰى (۲۰:۱۲۲-۱۲۶)

پھر اس کے رب نے اس کو نوازا، اس کی توبہ قبول کی اور اسے راہ پر لایا۔ حکم ہوا کہ تم سب یہاں سے اُترو، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے! پس اگر تمھارے پاس میری ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کی پیروی کرے گا نہ وہ گمراہ ہوگا نہ محروم رہے گا۔ اور جو میری یاد سے منہ پھیرے گا تو اس کی گذران تنگی میں ہوگی اور قیامت کے دن ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا کہ اے رب! تو نے مجھے اندھا کیوں اُٹھایا، میں تو بینا تھا۔ کہا جائے گا: اسی طرح دنیا میں تیرے پاس ہماری آیات آئیں اور تو نے ان کو بھلا دیا، سو آج تو بھی اسی طرح بھلا دیا جائے گا۔

آیاتِ خداوندی کے روبرو

رسول اور نبی اللہ کی آیات اور نشانیاں لے کر آتے ہیں، ایسے ہی جیسے زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی ہر شے سے اللہ کی نشانیاں ہویدا ہوتی ہیں۔ اللہ کی نشانیوں کے روبرو صحیح انسانی رویّہ ہے اللہ کو یاد رکھنا۔ قرآن مجید میں بہت سے دوسرے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں جن سے اشارہ ملتا ہے کہ ذکر اور یادِ خدا کیا ہے۔ یہ لفظ ہیں: ''سننا''، ''دیکھنا''، ''سوچنا''، ''تدبر''، ''تفکر''، ''تعقل۔'' سب میں ایک نکتہ مشترک ہے کہ انسان وہ ہے جو نمودِ ظاہری سے دھوکا نہ کھائے۔ انسان کو چاہیے کہ اس دنیا کو ''توحید'' کے سیاق وسباق میں دیکھے۔ انبیا کا پیغام ساری ہستی کا پیغام ہے اور وہ یہ کہ انسان کو اللہ کا

بندہ اور خلیفۃ اللہ بننے کے لیے تخلیق کیا گیا تھا۔

آیاتِ خداوندی کے روبرو صحیح انسانی رویے اور عمل کے لیے قرآن نے جتنے لفظ استعمال کیے ہیں ان میں سے ہر ایک میں کچھ خاص مفاہیم مضمر ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں ہم ان سب الفاظ کا تجزیہ نہیں کر سکتے، تاہم قرآن کے اسلوبِ بیان اور اس کے معانی کی ایک جھلک دکھانے کے لیے چند نمایندہ آیات پیش کی جاتی ہیں:

وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا، قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيَاتِ لِقَوْمٍ يَذَّكَّرُوْنَ (٦:١٢٦)	اور یہ تیرے رب کی راہ ہے سیدھی۔ ہم نے اپنی آیتیں تفصیل سے بیان کر دیں ہیں ان لوگوں کے لیے جو دھیان کرنے والے ہیں۔
كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ (٧:٥٨)	یوں ہم اپنی آیات پھیر پھیر کر بتاتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو شکر کرنے والے ہیں۔
كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ (٢:٢٦٦)	یوں اللہ تم کو اپنی آیات سمجھاتا ہے کہ شاید تم غور کرو۔
قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ (٣:١١٨)	ہم نے اپنی آیات تم کو جتا دیں اگر تم کو عقل ہے۔
اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ (٦:٦٥)	دیکھو ہم اپنی آیات کس کس طرح مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھیں۔
قَدْ فَصَّلْنَا الاٰ يٰتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُوْنَ (٦:٩٧)	ہم نے اپنی نشانیاں ان لوگوں کے لیے تفصیل سے بیان کر دی ہیں جو جاننا چاہیں۔
قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ (٦:٩٩)	ہم نے اپنی نشانیاں ان لوگوں کے لیے کھول کر سنا دی ہیں جو سمجھیں۔
اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ (١٠:٦)	بے شک دن اور رات کے بدلنے میں اور زمین و آسمان میں مخلوقاتِ خداوندی میں، ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو ڈر رکھتے ہیں۔
هُوَالَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ	وہی ہے جس نے تمھارے لیے رات بنائی تاکہ

والنَّهَارَ مُبْصِرًا اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ (۱۰:۶۷)	تم اس میں چین پاؤ اور دن دیا دکھانے والا۔ اس میں نشانیاں ہیں ان کے لیے جو سنتے ہیں۔
يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ (۱۳:۲)	وہ کھول دیتا ہے اپنی آیات تاکہ تم اپنے رب سے ملاقات کا یقین کرو۔
أَنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (۱۴:۵)	بے شک ان کے اندر ثابت قدم رہنے والوں اور شکر کرنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔
وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِى الْعُمْىِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۲۷:۸۱)	اور نہ تم اندھوں کو گمراہی سے پھیر کر راہ پر لانے والے بن سکتے۔ تم تو بس انھی کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں۔ پس وہی فرماں بردار بنیں گے۔

یادِ الٰہی، ذکرِ خدا اور اللہ کی نشانیوں پر غور کرنا اگر اہلِ ایمان کی شناخت ہیں تو اللہ کی آیات کو نظر انداز کرنا، ان سے روگردانی، ان سے اعراض وہ چیزیں ہیں جن سے منکرینِ حق پہچانے جاتے ہیں۔ فطرتِ انسانی کی جملہ مثبت صفات ذکرِ خدا کے وسیلے سے ظہور کرتی ہیں اور تمام منفی اوصاف غفلت اور انکار کے کارن اُبھرتے ہیں:

وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ (۱۰:۹۲)	بے شک بہت سارے لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہی رہتے ہیں۔
وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْن (۲:۹۹)	اور ہم نے تم پر نہایت واضح دلیلیں اتاری ہیں۔ ان کا انکار صرف عہد شکن لوگ ہی کر سکتے ہیں۔
اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (۵:۷۵)	دیکھو کس طرح ہم ان کے سامنے اپنی نشانیاں کھول کر بیان کر رہے ہیں، پھر دیکھو کہ وہ کس طرح اوندھے ہوئے جا رہے ہیں۔
فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا (۶:۱۵۷)	تو ان سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کی آیات کو جھٹلائیں اور ان سے (دوسروں کو) پھیریں۔

وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعۡرَضَ عَنۡهَا وَ نَسِيَ مَا قَدَّمَتۡ يَدٰهُ (۱۸:۵۷)

اور ان سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جن کو ان کے رب کی نشانیوں کے ذریعے سے یاددہانی کی جائے اور وہ اس سے منہ پھیر لیں اور اپنے کیے کو بھول جائیں؟

وَيۡلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيۡمٍ ۙ يَّسۡمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتۡلٰى عَلَيۡهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسۡتَكۡبِرًا كَاَنۡ لَّمۡ يَسۡمَعۡهَا (۴۵:۷-۸)

ہلاکی ہے ہر اس لپاٹیے گناہ گار کے لیے جو اللہ کی آیتیں سنتا ہے کہ اس کو پڑھ کر سنائی جارہی ہیں۔ پھر وہ استکبار کے ساتھ اپنی روش پر ضد کرتا ہے، گویا اس نے سنی ہی نہیں۔

وَالَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّ بُكۡمٌ فِى الظُّلُمٰتِ (۶:۳۹)

اور جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا، یہ بہرے اور گونگے تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَاسۡتَكۡبَرُوۡا عَنۡهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمۡ اَبۡوَابُ السَّمَآءِ (۷:۴۰)

بے شک جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور تکبر کر کے ان سے منہ موڑا، ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے۔

ہدایت اور گمراہی Guidance and Misguidance

کارِ نبوّت اور اس کے جواب میں صحیح انسانی رویے کی نمایندگی اگر ''ذکر'' سے ہوتی ہے تو ''ہدیٰ'' (ہدایت) Guidance وہ صفتِ خداوندی ہے جو انبیا میں مجسم ہو جاتی ہے۔ اس ایک لفظ میں دونوں پہلو، دونوں مفہوم سمٹ آئے ہیں، یعنی انبیا کو بھیجنے سے اللہ کی غرض اور اس دنیا میں انبیا کا کام۔ اسی طرح اگر ''ذکر'' کا متضاد ''غفلت''، ''نسیان'' ہے تو ''ہدایت'' کا متضاد ہوگا بہکانا، بھٹکانا (اِضلال) misguidance اور گمراہ کرنا (اغوا) leading astray۔ جس طرح انبیا اللہ کی طرف سے ہدایتِ مجسم ہوتے ہیں، اسی طرح شیاطین خطا اور گمراہی کی صفت کی تجسیم کہے جا سکتے ہیں۔

انسان کے لیے ہدایت فراہم کرنے کا مطلب ہے اسے کوئی راہ دکھانا اور اس راہ پر چلا کر منزل تک لے جانا۔ یہاں جس راستے کا ذکر ہے، اس سے مراد ہے وہ خاص احکام اور تعلیمات جو ہر نبی کو دی جاتی تھیں، بالخصوص وہ احکام اور شریعت جو سیدنا محمدؐ پر نازل کی گئی۔ وہ منزل جس کی طرف یہ راستہ انسان کو لے جاتا ہے، نجاتِ اخروی اور جنت کی منزل ہے۔

نجات اور فلاحِ اخروی کیا ہے، اس پر تفصیل سے گفتگو وہاں ہوگی جہاں ہم ''معاد'' یا آخرت کی بحث کریں گے۔ اس وقت یہ عرض کریں گے کہ نجات کا مطلب ہے اپنی فطرتِ حقیقی کی بنیاد پر انسانی مسرت وسعادت۔ خوش ہونے کا مطلب ہے پوری طرح اپنا آپ بن جانا۔ انسان کی تعریف اور شناخت صورتِ خداوندی کے حوالے سے ہوتی ہے، کیونکہ انسان کو صورتِ الٰہی پر خلق کیا گیا۔ پس خوشی اور تکمیلِ سعادت ان اسما کو جاننے پر اور ان کے تقاضوں کے مطابق زندگی گذارنے پر منحصر ہے جو آدمؑ کو تعلیم کیے گئے۔

اسمائے الٰہیہ میں سے ایک نام ''الہادی The Guide'' بھی ہے۔ چنانچہ کلمۂ توحید یہ تقاضا بھی رکھتا ہے کہ **"لاھادی الا اللّٰہ"** سب ہدایت اللہ کی ہے اور انبیا فقط اس کے نمایندوں کے طور پر کارِ نبوّت انجام دیتے ہیں۔ قرآن اور دوسری مقدس کتابیں اللہ کی ہدایت کی زبانی اور تحریری صورت ہیں:

اِنَّ اللّٰہَ لَھَادِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْآ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۲۲:۵٤)	اور اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں ضرور صراطِ مستقیم کی ہدایت فرمائے گا۔
وَ کَفٰی بِرَبِّکَ ھَادِیًا وَّنَصِیْرًا (۲۵:۳۱)	اور تیرا رب راہ دکھانے اور مدد کرنے کے لیے کافی ہے۔
قُلْ اِنَّ ھُدَی اللّٰہِ ھُوَ الْھُدٰی (۲:۱۲۰)	ان سے کہو: اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے۔
مَنْ یَّھْدِ اللّٰہُ فَھُوَ الْمُھْتَدِیْ (۷:۱۷۸)	جسے اللہ راہ دکھائے، وہی راہ پانے والا بنتا ہے۔
وَاَنْزَلَ التَّوْرٰةَ وَالْاِنْجِیْلَ مِنْ قَبْلُ ھُدًی لِّلنَّاسِ (۳:٤)	اور اتاری تھی تورات اور انجیل اس سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لیے۔
تِلْکَ اٰیٰتُ الْقُرْاٰنِ وَکِتَابٍ مُّبِیْنٍ ھُدًی وَّ بُشْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ (۲۷:۲)	یہ آیتیں ہیں قران اور کھلی کتاب کی۔ ہدایت اور خوش خبری ایمان والوں کو۔
اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّ بِّھِمْ وَرَحْمَةٌ وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُھْتَدُوْنَ (۲:۱۵۷)	یہی لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی عنایتیں ہیں اور رحمت، اور یہی لوگ راہ یاب ہونے والے ہیں۔

ہدایتِ خداوندی کا تعلق اس کی رحمت سے ہے جیسا کہ مؤخر الذکر آیت سے ظاہر ہے۔ جب اللہ تعالیٰ انسان کو ہدایت دیتے ہیں تو اسے اسمائے رحمت و جمال کی تاثیر تلے لے آتے ہیں۔ ہدایت

کا نتیجہ ہے اللہ کا قرب۔ قرآن میں جنت کے اعلیٰ ترین درجات کے باسیوں کو ''المقربون'' (جو قریب کیے گئے) کہا گیا ہے۔ قربِ خداوندی کا دارومدار ''توحید' پر ہے جس سے انسان کا الحق سے صحیح تعلق استوار ہوتا ہے۔

ہدایت کے برعکس، گمراہی اور ضلالت کا قریبی تعلق قہر وغضب سے ہے۔ وہ جو گمراہ ہیں وہ اللہ کی طرف رخ کرنے کے بجائے اس سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ اس طرح وہ اللہ سے دور اور دور تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان پر سرگردانی و حیرت، کثرت، جدائی، انتشار، لاتعلقی، بے اعتدالی اور زوال غلبہ پاتے چلے جاتے ہیں۔ اللہ سے دور ہونے کا مطلب ان اسمائے الٰہیہ کے زیرِتاثیر آنا، جو اس کی تنزیہ، ماورائیت اور دنیا سے الگ، دور ہونے اور اس سے غیریت پر دلالت کرتے ہیں۔

گمراہی اور ضلالت کا منبع کیا ہے؟ بہ نظرِ ظاہر تو یہی کہا جائے گا کہ شیطان اس کا سبب ہے جو انسان کا کھلا اور بڑا دشمن ہے۔ قرآن مجید میں حضرت موسیٰؑ کا قول یوں آیا ہے:

هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ (۲۸:۱۵)

یہ ہوا شیطان کے کام سے۔ بے شک وہ کھلا دشمن ہے اور بہکانے والا ہے۔

قرآن ہی میں ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ گناہ گار لوگوں کو حکم دیں گے کہ وہ اللہ سے اسی دوری اور بُعد میں پڑے رہیں جو انھوں نے اپنے لیے اختیار کی تھی:

وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ. اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ. وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ. وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ. هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (۳۶:۵۹-۶۳)

اور اے مجرمو! آج الگ ہو جاؤ۔ اور اے آدم کے بیٹو! کیا میں نے تمھیں کہ نہیں رکھا تھا کہ شیطان کی بندگی نہ کرنا۔ وہ تمھارا کھلا دشمن ہے، اور یہ کہ میری ہی پرستش کرنا، یہی سیدھی راہ ہے، اور وہ تم سے ایک خلقِ کثیر کو بہکا لے گیا۔ پھر کیا تم کو سمجھ نہ تھی؟ یہ ہے وہ دوزخ جس سے تم کو ڈرایا جاتا رہا ہے۔

ضلالت وگمراہی کے اسباب شیطان کے سوا اور بھی بتائے گئے ہیں۔ ان میں ہوا و ہوس Caprice بھی ہے۔ اس وصفِ بد کا پہلے بھی ذکر ہوا تھا کہ ہوائے نفس تمام جھوٹے خداؤں میں سے بدترین ہے۔

وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (۳۸:۲۶)

اور نہ چل جی کی چاہ پر کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے ہٹا دے۔

قرآن میں ہوا و ہوس کا جس طرح نقشہ کھینچا گیا ہے، اس کو مجموعی طور پر نظر میں رکھیے تو یہ کہنا ممکن ہے کہ ہوا و ہوس ہمارے اندر کے شیطان کی نمایندگی کرتی ہے۔ ہم میں سے ہر شخص کو اپنی ہوائے نفس کا تجربہ ہے جو ہمیں کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر اڑا لے جاتی ہے اور کسی سمت میں بھی لے جائے، اللہ کی ہدایت سے ہمیشہ دور ہی کرتی ہے۔ ہوائے نفس کا الٹ ہے ''عقل'' Intelligence۔ عقل ہمارے اندر کی وہ نورانی اور ملکوتی قوت ہے جو اللہ کی ہدایت کو دیکھتے ہی شناخت کر لیتی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ نفسِ انسانی کا بھی ایک نبی ہوتا اور وہ ہے عقل۔

قرآن مجید نے انسانوں میں سے ایک شخص کو سراپا گمراہی کے طور پر پیش کیا ہے اور وہ ہے فرعون، اور اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، کیونکہ قرآن کا فرعون ہر وہ صفت لیے ہوئے ہے جو شیطان سے خاص ہے بالخصوص غرور۔ فرعون تکبر کی پوٹلی تھا۔ قرآن میں اگر حضرت موسیٰؑ کو نام لے کر ایک سو چھتیس مرتبہ یاد کیا گیا ہے تو ان کے سب سے بڑے دشمن فرعون کا نام بھی چوہتر دفعہ آیا ہے۔ قرآن میں دوسرے انبیا سے زیادہ حضرت موسیٰؑ کا ذکر ہے اور ظالموں اور مجرموں میں سے سب سے زیادہ تذکرہ فرعون کا کیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن میں فرعون کے جن اعمال کا ذکر ہے، انھیں ایسی تمام بری خصلتوں کا خلاصہ کہا جا سکتا ہے جو کسی انسان میں پائی جا سکتی ہوں۔ فرعون کے خلاف اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ اس نے اپنے لیے یہ کہ کر خدائی کا دعویٰ کیا:

اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (۷۹:۲۴) میں ہوں رب تمھارا سب سے اُوپر۔

لیکن ہر وہ انسان جو اپنی ہوائے نفس کو اپنا خدا بنا لیتا ہے، اصل میں یہی دعویٰ رکھتا ہے، کیونکہ جس چیز کو اس نے اپنا خدا بنایا، وہ اس کا اپنا نفس ہی تو ہے۔

ہوائے نفس اور فرعون سے گمراہی کی نسبت کرتے ہوئے قرآن دراصل ان دونوں کو شیطانی صفات سے منسوب کرتا ہے، کیونکہ ہوائے نفس اور فرعون میں ساری شیطانی صفات مجسم ہو گئی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ہوائے نفس انسان کے باطن میں شیطان کی غمازی کرتی ہے اور فرعون انسانی معاشرے میں شیطان کا نمایندہ ہے۔

قرآن نے یہ بات صاف صاف بتا دی ہے کہ شیطان انسانوں کا سب سے بڑا اور کھلا دشمن ہے۔ شیطان کے لیے قرآن کی درجن بھر آیات میں ''عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ'' (کھلا دشمن) کے الفاظ آئے ہیں، تاہم یہ بات خاصی اہم ہے کہ قرآن نے شیطان کو کبھی اللہ کا دشمن کہ کر نہیں پکارا، اگرچہ آیات کا مفہوم

اسی بات پر دلالت کرتا ہے کہ شیطان اللہ کا دشمن ہے، کیونکہ قرآن ہی میں منکرینِ حق کو "اَعْدَآءُ اللّٰہ" (اللہ کے دشمن) کا نام دیا گیا ہے۔ قرآن بآسانی شیطان کو اللہ کا دشمن بھی کہہ سکتا تھا، کیونکہ کتنی ہی جگہ اسے انسان کا دشمن کہا گیا ہے۔ اس سے اشارہ یہ ملتا ہے کہ یہاں قرآن مجید ایک ایسے نکتے کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہے جس کا ہم قبل ازیں ذکر کر چکے ہیں۔ ابلیس نے اگرچہ اللہ کی نافرمانی کی، لیکن وہ آج بھی اللہ ہی کی ایک خدمت انجام دے رہا ہے کہ اسی کی وجہ سے ہمارے لیے خیر اور شر میں چناؤ کا امکان پیدا ہوتا ہے۔ انسان کا شیطان سے بڑھ کر اور کوئی دشمن نہیں ہوسکتا، کیونکہ وہ اس کے لیے جہنم کا راستہ کھولتا ہے، لیکن جہنم بھی تو اللہ ہی کی ایک مخلوق ہے اور اس کی تخلیق کا بھی ایک مقصد ہے۔ قرآن مجید میں صاف آیا ہے کہ جہنم کے اپنے کچھ حقوق ہیں:

يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَئْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْد (۵۰:۳۰)	جس دن ہم جہنم کو کہیں گے "کیا تم بھر چکی" اور وہ بولے گی، کچھ اور بھی ہے؟

شیطان نہ ہوتا تو دوزخ کو اہلِ دوزخ کیوں کر فراہم ہوتے۔ اسی طرح اگر شیطان کے پیدا کردہ چناؤ کا امکان نہ ہوتا تو اخلاقیات کی ساری قلمرو وجود میں نہ آتی، کیونکہ اس صورت میں خیر اور شر کے درمیان امتیاز ہی قائم نہ ہوسکتا۔ دراصل قرآن گمراہی اور ضلالت کی صفات کو صراحتاً خود اللہ تعالیٰ کے حوالے سے دیکھتا ہے۔ صرف پانچ آیات ایسی ہیں جن میں گمراہی کی نسبت براہ راست شیطان کی طرف کی گئی ہے، جب کہ تیس سے زیادہ آیات ایسی ہیں جن میں گمراہ کرنے کے فعل (اضل، یضل) کا فاعل اللہ تعالیٰ کو بتایا گیا ہے۔

يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ (۷٤:۳۱)	اللہ گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور راہ دکھاتا ہے جسے چاہتا ہے۔
فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ (١٤:٤)	پس اللہ جسے چاہے گمراہ کرے اور جسے چاہے ہدایت دے۔
مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِىْ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۷:۱۷۸)	جسے اللہ راہ دے وہی راہ پائے اور جنھیں وہ بھٹکا دے وہی ہیں جو زیاں میں ہیں۔
مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِىَ لَهٗ (۷:۱۸٦)	جسے اللہ بھٹکا دے اسے کوئی نہیں راہ دینے والا۔

بعض مسلمان علمائے الٰہیات کی طرف سے ہمیشہ یہ کوشش ہوتی رہی ہے کہ ان آیات میں جو

بھٹکانے کی نسبت اللہ تعالیٰ سے کی گئی ہے، اس کی تفسیر اس انداز میں کی جائے کہ ان کے قائم کردہ تصورِ خوب وناخوب کا تحفظ کیا جا سکے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے کیا چیز موزوں ہے اور کیا نامناسب، اس کا ان علما کے یہاں ایک اپنا تصور ہے۔ بظاہر یہ لگتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا دفاع کرنے چلے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو لوگوں کے ذہن میں اٹھنے والے شکوک وشبہات سے بچانا لازم ہے یا پھر ان کا مسئلہ صرف اتنا ہے کہ چونکہ اللہ کے کلام کا یہ حصہ ان کے اپنے تصورِ اخلاق اور معیارِ اخلاقیات کے خلاف پڑتا ہے، سو وہ یہ کہنے لگتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو کہا اس کا مطلب کچھ اور ہے، لیکن ابتدائی زمانوں کے بہت سے مسلمان مفکرین اس بات میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے تھے کہ قرآن جو کہہ رہا ہے، وہی سمجھا جائے، بلکہ ان کے یہاں تو یہ نتیجہ بھی ملتا ہے کہ ''الہادی'' اللہ کا نام ہے تو ''المضل'' (گمراہ کرنے والا) بھی اسی کا نام ہے۔ اس نکتے سے الٰہیات کے کئی نازک مسائل یقیناً جنم لیتے ہیں اور چونکہ یہ نکتہ زیرِغور آ ہی چکا ہے، لہٰذا ہمارے لیے ان مباحث پر گفتگو کرنا ناگزیر ٹھہرتا ہے، لیکن اس بات کو چھیڑنے سے پہلے ذرا یہ دیکھ لیجیے کہ قرآن میں اضلال اور بھٹکانے کی نسبت اللہ تعالیٰ سے کس انداز میں کی گئی ہے۔

ہدایت وہ صفت ہے جو اللہ تعالیٰ سے خاص ہے۔ اللہ کے سوا کوئی ہادی نہیں۔ انبیا جو دعوت دیتے ہیں اور جو پیغام لاتے ہیں، اس میں بھی یہی صفتِ خداوندی اپنا ظہور کرتی ہے، لیکن انبیا کو اپنے طور پر انسان کی ہدایت کے لیے کوئی طاقت نہیں دی گئی۔ اگر انبیا خود سے کسی کو ہدایت نہیں دے سکتے تو انبیا سے کمتر درجے کے فانی انسانوں کو دوسرے لوگوں کی ہدایت کا مرتبہ کیوں کر حاصل ہو سکتا ہے؟ انبیا خدا کے فرستادہ ہوتے ہیں۔ اس کی بات لوگوں تک پہنچاتے ہیں، لیکن ہدایت دینا خود اللہ تعالیٰ کا کام ہے:

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (۵:۹۲)	حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور بچتے رہو۔ پھر اگر تم پھروگے تو جان لو کہ ہمارے رسول کا ذمہ یہی ہے کہ کھول کر پہنچا دے۔
وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ (۳:۲۰)	پھر اگر وہ ہٹ جائیں تو تمھارا ذمہ یہی ہے، پہنچا دینا۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سیدنا محمدؐ اور دیگر انبیا ہادی نہیں ہیں۔ وہ یقیناً ہادیانِ نوعِ انسانی ہیں:

وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۴۲:۵۲)	اور بے شک تم ایک سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کر رہے ہو۔

تاہم رسولِ خدا ؑ اللہ کے نبی کے طور پر لوگوں کے لیے سامانِ ہدایت فرماتے تھے، ایک عام آدمی کی حیثیت سے نہیں جسے اپنی ذاتی خواہش کی تکمیل مطلوب ہو!

فَمَنْ يَّهْدِیْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ (۲۸:۲۹)
سو کون سمجھائے جسے اللہ نے بھٹکایا۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِیْ مَنْ يَّشَآءُ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ (۲۸:۵۶)
تم جن کو چاہو، راہ پر نہیں لا سکتے، بلکہ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے راہ پر لاتا ہے اور وہی خوب جانتا ہے جو راہ پر آئیں گے۔

اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِی الْعُمْیَ وَمَنْ كَانَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۴۳:۴۰)
تو کیا تم بہروں کو سناؤ گے یا اندھوں کو راہ دکھاؤ گے یا صریح غلطی میں بھٹکتوں کو؟

اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا (۴:۸۸)
کیا تم چاہتے ہو کہ ان کو راہ پر لاؤ جن کو بچلایا اللہ نے؟ اور جس کو اللہ راہ نہ دے تم اس کے لیے کوئی راہ نہ پاؤ گے۔

قرآن اگر ایک طرف بھٹکانے، بچلانے کی نسبت اللہ تعالیٰ سے کرتا ہے تو دوسری جانب وہ گمراہی کے لیے خود ان لوگوں کو موردِ الزام ٹھہراتا ہے جو بہک کر گم کردہ راہ ہو گئے، کیونکہ اللہ صرف ان لوگوں کو گمراہ کرتا ہے جو غلط کار اور ظالم ہوتے ہیں۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ (۹:۱۱۵)
اور اللہ ایسا نہیں کہ کسی قوم کو راہ پر لا کر پھر سے گمراہ کر دے جب تک وہ ان پر وہ چیزیں کھول نہ دے جن سے ان کو بچنا ہے۔

كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ (۴۰:۷۴)
اسی طرح اللہ منکروں کو بھٹکاتا ہے۔

كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابٌ (۴۰:۳۴)
اسی طرح بھٹکاتا ہے ان لوگوں کو جو زیادتی کرنے والے، شک میں پڑے ہوتے ہیں۔

پس اللہ تعالیٰ انھیں گمراہ کرتا ہے جو ایمان نہیں رکھتے، جو جان بوجھ کر اور عملی طور پر انبیا کے پیغام کی صداقت کا انکار کرتے، اسے چھپاتے ہیں اور اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو جھٹلاتے اور ان کی ناشکری کرتے ہیں۔ ظالمین اور اہلِ خطا اپنی گمراہی کا دوش اللہ کو نہیں دے سکتے، نہ اس کے لیے شیطان کو ہدفِ ملامت بنا سکتے ہیں۔ قرآن کا بیان ہے کہ قیامت کے روز شیطان اپنے پیچھے چلنے والوں سے

ان الفاظ میں خطاب کرے گا:

اَنَّ اللّٰہَ وَعَدَکُمْ وَعْدَالْحَقِّ وَ وَعَدْتُّکُمْ فَاَخْلَفْتُکُمْ وَمَا کَانَ لِیَ عَلَیْکُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُکُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِیْ فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَکُمْ (۱۴:۲۲)

بے شک اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے وعدہ دیا، پھر اس کے خلاف کیا اور میری تم پر حکومت نہ تھی۔ بس میں نے تمھیں دعوت دی اور تم نے مان لیا۔ سو مجھے الزام مت دو، اپنے آپ ہی کو ملامت کرو۔

ظلم Wrongdoing

انسان کو اگلے جہان میں اگر بدبختی اور انجام کی خرابی کا سامنا کرنا پڑے تو اس کی ذمہ داری خود اسی پر ہوگی۔ قرآن میں یہ موضوع بار بار آیا، مثال کے طور پر ''ظلم'' کے تصور کو لیجیے۔ یہ وہ لفظ ہے جو قرآن میں سب سے زیادہ وارد ہونے والی اصطلاحات میں سے ایک ہے۔ قرآن اس لفظ کو عام طور پر ان تمام بری حرکتوں کی طرف اشارہ کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے جو اولادِ آدم سے سرزد ہوا کرتی ہیں۔ ہم پہلے عرض کر چکے کہ ''ظلم'' عدل کا الٹ ہے اور عدل کا مطلب ہے ہر شے کو اس کی مناسب جگہ پر رکھنا۔ پس ''ظلم'' کی تعریف یہ ٹھہری کہ چیزوں کو بے جگہ کرنا، انھیں وہاں رکھنا جہاں انھیں نہیں رکھا جانا چاہیے، مثلاً اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا۔ اللہ کے سوا کوئی شے مقامِ خدائی پر نہیں رکھی جا سکتی۔ ظلم کی ایک اور مثال یہ ہے کہ ہم جھوٹے لفظوں کو سچے لفظوں کی جگہ دے دیں، یا کسی اور کا مال اپنے مال کی جگہ رکھ لیں، یا کسی حرام یا مباح کام کو فرض قرار دے دیں، جیسے نماز پڑھنے کی بجائے فریضۂ صلوۃ کے طور پر کوئی اور کام انجام دینا۔

انسان ظلم کس پر کرتا ہے؟ پہلی بات تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کے خلاف کسی کے لیے بھی ظلم کرنا ممکن نہیں۔ ہر شے اس کی مخلوق ہے اور ہر چیز کارِ خداوندی کی بجا آوری میں مشغول ہے۔ پس ظلم ایک ایسا کام ہے جس کی زد میں انسان ہی آتے ہیں، تاہم آپ یہ سوال کر سکتے ہیں کہ میں اگر ایک وقت نماز نہ پڑھوں تو اس سے کسی انسان پر کیا ظلم ہوگا؟ نماز تو میرے اور خدا کے درمیان ایک چیز ہے۔ اگر نماز نہ پڑھنا ظلم ہے تو پھر کیا اس معاملے میں نماز نہ پڑھ کر میں اللہ کے ساتھ ظلم کر رہا ہوں۔ قرآنی نقطۂ نظر کے مطابق معاملہ سرے سے یوں ہے ہی نہیں۔ نماز نہ پڑھنے کی صورت میں ظلم کا شکار صرف وہی شخص ہوتا ہے جس نے نماز ترک کی ہو۔

اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے بے نیاز ہے۔ مخلوق اس کی ضرورت نہیں۔ اس کا اس میں کیا فائدہ ہے کہ چند لوگ گروہ بنا کر ایک جگہ اکھٹے کھڑے ہو جائیں، اکٹھے جھکیں اور اپنی زبان سے کچھ الفاظ دہرائیں جنھیں وہ خود بھی نہیں سمجھتے۔ اللہ تعالیٰ نے شریعت اپنے کسی فائدے کے لیے نازل نہیں فرمائی، انسان کے فائدے کے لیے مقرر کی ہے۔ اس کے وسیلے سے انسان کی مدد کی جا رہی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو درجہ بدرجہ خیر کی جانب اور حقیقت سے سازگاری کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں۔ جب انسان اس کے احکامات پر عمل کرنے سے گریز کرتا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ ناشکری اور کفر کر رہا ہے۔ یہی وہ ظلم ہے جو انسان اپنے ساتھ روا رکھتا ہے۔

قرآن میں جن ۲۵۰ مقامات پر ظلم یا ظالم کے الفاظ آئے ہیں، ان میں سے صرف ۲۵ جگہوں پر قرآن نے اس چیز کا ذکر کیا ہے جس پر ظلم کیا گیا۔ ایک آیت میں لوگوں کے ظلم کا نشانہ بننے کا ذکر ہے:

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ (٤٢:٤٢)

الزام ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں بغیر کسی حق کے سرکشی کرتے ہیں۔

ایک اور آیت میں ظلم کا ہدف آیاتِ خداوندی یا اللہ کی نشانیاں ہیں۔ عالمِ طبیعی میں ہوں یا اللہ کی کتابوں میں، اللہ تعالیٰ اپنی نشانیاں انسان کی ہدایت کے لیے ظاہر کرتے ہیں۔ جب انسان ان نشانیوں سے روگردانی کرتا ہے، انھیں نظر انداز کرتا ہے تو گویا ان پر ظلم کرتا ہے۔ ان آیاتِ خداوندی سے ظلم کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔ یہ بات وہ روزِ قیامت اچھی طرح جان لے گا جب نتیجہ اس کے سامنے آئے گا اور اس کے اعمال میزان میں رکھے جائیں گے۔

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ۨالْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۞ وَ مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ (٧:٨-٩)

اس دن وزن دار صرف حق ہو گا، پھر جن کے پلڑے بھاری ٹھہریں گے سو وہی لوگ ہیں جن کا بھلا ہوا۔ اور جن کے پلڑے ہلکے ہوئے سو وہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا، اس لیے کہ وہ ہماری آیات سے زبردستی کرتے تھے۔

باقی کی ۲۴ آیات میں جہاں جہاں ظلم کا ذکر آیا ہے، وہاں بتا دیا گیا ہے کہ ظلم کرنے والے محض

اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی قرآن بار بار اس بات کو زور دے کر بیان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ اگر انسان اپنی غلط کاری اور اعمالِ بد کے نتیجے میں برے نتائج سے دوچار ہوتے ہیں، دکھ جھیلتے ہیں تو اس میں اللہ تعالیٰ کا دوش نہیں۔ وہ اپنے لیے خود باعثِ وبال بنتے ہیں، اپنے سر مصیبت خود لاتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ قرآن نے خاص خاص مثالیں دے کر یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ انسان کے ہاتھ سے ہونے والے ظلم کا کوئی اثر اللہ تک نہیں پہنچتا۔

وَمَا ظَلَمُوْ نَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۲:۵۷) — اور انھوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا، اپنا ہی نقصان کرتے رہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَّ لٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۱۰:۴۴) — اللہ لوگوں پر ذرا بھی ظلم نہیں کرتا، بلکہ لوگ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے ہیں۔

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ (۱۱:۱۰۱) — اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا، بلکہ وہ خود ہی اپنی جان پر ظلم کر گئے۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْيَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِاللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۴:۱۱۰) — اور جو کوئی گناہ کرے یا اپنا برا کرے، پھر اللہ سے بخشش مانگے تو وہ اللہ کو بخشنے والا، مہربان پائے گا۔

قرآن کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسان کو یہ جاننا لازم ہے کہ وہ جو کچھ کرتا ہے، اس کا نتیجہ یا تو اس کے خلاف جاتا ہے یا اس کے حق میں۔ وہ کچھ بھی کر لے، اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور اس کا کوئی عمل اللہ کے لیے کسی منفعت کا سبب نہیں بنتا۔ وہ "غنی عن العالمین" ہے اور کسی مخلوق کا کیا ہوا کوئی کام اس کے لیے کوئی تاثیر نہیں رکھتا۔ ثواب اور عتاب، کامیابی اور ناکامی، نجات اور گرفتاری کا کھیل انسان صرف اپنے فائدے نقصان کے لیے کھیلتا ہے۔

اس معاملے میں گویا اللہ تعالیٰ انسان کو میدانِ عمل میں اتار کر اسے تماشائی کی حیثیت سے دیکھ رہے ہیں اور اپنی رحمت اور کرم سے اسے ہمت دلا کر اس کا حوصلہ تو بڑھاتے ہیں، لیکن میدانِ عمل میں فیصلہ کرنا اور صحیح اور غلط میں چناؤ انسان پر چھوڑ دیتے ہیں۔ انسان کو جو ''بارِ امانت'' دیا گیا ہے، وہ جب تک اس کے کندھوں سے اٹھا نہ لیا جائے، اسے صحیح فیصلہ کرنے اور درست چناؤ کے لیے مجبور نہیں کیا جا سکتا اور اگر یہ ''بارِ امانت'' اٹھا لیا جائے تو پھر انسان انسان نہیں رہتا۔ اس بارِ امانت کے بنا

انسان زمین، آسمان اور پہاڑوں کی طرح ہو جائے گا جو اس امانت کی تاب نہ لا سکے اور اس بارِ گراں کو اٹھانے سے گریزاں ہو گئے:

وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ (٤:١١١)	اور جو کوئی گناہ کماتا ہے تو اس کا وبال اسی پر آتا ہے۔
فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِىْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا (١٠:١٠٨)	سو جو کوئی راہ پر آئے تو وہ اپنے بھلے کو راہ پاتا ہے اور جو کوئی بھولا پھرے، سو وہ بھولا پھرے گا اپنے برے کو۔ اور میں تمھارا ذمہ دار نہیں ہوں۔
وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّىْ غَنِىٌّ كَرِيْمٌ (٢٧:٤٠)	اور جو شکر کرتا ہے تو اپنے ہی لیے شکر کرتا ہے اور جس نے ناشکری کی، سو میرا رب بے پروا ہے، کریم ہے۔
وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِىٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ (٢٩:٦)	اور جو کوئی محنت اُٹھاتا ہے تو اپنے ہی واسطے اُٹھاتا ہے۔ اللہ دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔

قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات ان تمام نکات کو نہایت خوبصورتی سے سمیٹ کر بیان کر دیتی ہیں جو ہم نے گذشتہ سطور میں آپ کے سامنے پیش کیے۔ آیات کا مفہوم پوری طرح واضح کرنے کے لیے ہم نے ہر آیت کے بعد اس کی مختصر شرح بھی درج کر دی ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِىُّ الْحَمِيْدُ ۔ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ (٣٥:١٥-١٧)	اے لوگو! تمھی اللہ کے محتاج ہو اور اللہ وہی ہے بے پروا، سب خوبیوں سے سراہا۔ اگر وہ چاہے تو تم کو لے جائے اور ایک نئی خلقت لے آئے، اور یہ اللہ کے لیے ذرا مشکل نہیں۔

اللہ تعالیٰ کو مخلوق کی کوئی احتیاج نہیں۔ مخلوقات ہر چیز میں اللہ کی محتاج ہیں۔ اللہ چاہے تو ساری کائنات کو نیست و نابود کر کے اس کی جگہ ایک اور دنیا خلق کر دے۔ یہ مٹی کے ذرے، یہ گردِ راہ، جو خود کو بہت اہم اور لابدی گردانتے ہیں، اللہ کے لیے کسی مصرف میں نہیں، اللہ کو ان کی کوئی ضرورت نہیں۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ	اور کوئی اٹھانے والا دوسرے کسی کا بوجھ نہ اٹھائے

اِلٰی حِمْلِھَا لَا یُحْمَلْ مِنْہُ شَیْءٌ وَّ لَوْ کَانَ ذَا قُرْبٰی (۳۵:۱۸)

گا اور اگر کوئی بوجھوں مرتا اپنا بوجھ بٹانے کے لیے کسی کو پکارے تو اس میں کوئی کچھ نہ اٹھائے گا خواہ اس کا قریبی ہی کیوں نہ ہو۔

ہرانسان اپنے کیے کا خود ذمہ دار ہے۔ انسان کے عمل کی ذمہ داری نہ اللہ پر ہے نہ نبیوں پر نہ دوسرے کسی انسان پر۔

اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَیْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَمَنْ تَزَکّٰی فَاِنَّمَا یَتَزَکّٰی لِنَفْسِہٖ وَاِلَی اللّٰہِ الْمَصِیْرُ (۳۵:۱۸)

تم تو بس انھی لوگوں کو ڈرا سکتے ہو جو غیب میں رہتے، اپنے رب سے ڈرتے اور نماز کا اہتمام کرتے ہیں، اور جو پاکی حاصل کرتا ہے اپنے لیے کرتا ہے۔

سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کا پیغامِ ہدایت لے کر آئے، لیکن ان کی بات پر کان دھرنے والے وہی لوگ ہیں جو ایمان لائے اور جنھوں نے دین کے پانچ ارکان کی پابندی کی۔ ہر وہ اچھا کام، وہ نیک عمل جو وہ کریں گے، وہ انھیں برائی اور ظلمت سے پاک کرنے کی تاثیر رکھے گا اور اس کا سارا فائدہ صرف انھی کو پہنچے گا۔

وَ اِلَی اللّٰہِ الْمَصِیْرُ. وَمَا یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ. وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ. وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ. وَمَا یَسْتَوِی الْاَحْیَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ اِنَّ اللّٰہَ یُسْمِعُ مَنْ یَّشَآءُ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِی الْقُبُوْرِ (۳۵:۱۸-۲۲)

اور اللہ کی طرف سب کی واپسی ہے۔ نابینا اور بینا دونوں یکساں نہیں ہوں گے اور نہ تاریکی اور روشنی، اور سایہ اور دھوپ یکساں ہیں، اور نہ زندہ اور مردے یکساں ہوں گے۔

ہستیِ انسانی کا سارا رزمیہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھلتا پھیلتا اور اپنے انجام کو پہنچتا ہے کہ اللہ ہی ہر حقیقت، حکمت، خیر اور عدل کا منبع اور مصدر ہے۔ انسان اپنی حقیقی صورت حال، سے کیسا ہی بے خبر کیوں نہ ہو، اسے بہت جلد اس حقیقت سے آنکھیں چار کرنا ہوں گی۔ اس لمحے وہ جان لے گا کہ الحق، دیکھنے والی آنکھ اور دیکھے کو اَن دیکھا کرنے والے کور چشم کو ایک دوسرے سے چھانٹ کر کیسے الگ الگ کر دیتا ہے کہ بصارت صفاتِ خداوندی میں سے ہے اور بے بصری عدمِ حقیقت کا وصف ہے۔ انسان اگر آج الحق کو دیکھنے کی صلاحیت حاصل نہ کر سکا تو اپنی ہستی کی آیندہ منزلوں میں بھی اندھا ہی رہے

گا۔ اسی طرح اگر انسان آج نور سے بہرہ یاب نہ ہوا تو آیندہ بھی تیرگی اور ظلمت میں گھرا رہے گا۔ اگر اسے وہ راحت بخش اور خنک سکون وسلامتی نصیب نہ ہوں جو اعتدال، سازگاری اور توازن سے جنم لیتے ہیں تو انسان اس جھلسا دینے والے زوال و ہلاکت کا شکار ہو جاتا ہے جو بے اعتدالی اور عدمِ توازن سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر اسے وہ زندگی نہ مل سکے جو حق کی آگہی کے وسیلے سے حاصل ہوتی ہے تو انسان ہمیشہ جہالت کی مردنی میں مبتلا رہتا ہے۔

آخر الامر یہ سارا رزمیہ لوٹ کر اللہ کی ہدایت اور عدمِ ہدایت کی طرف واپس آ جاتا ہے۔ انسان کی آزادیِ اختیار ایک بہت حقیقی چیز ہے اور انسان کے لیے اس کی اہمیت حتمی اور لابدی ہے، تاہم سب تجزیہ اور جائزہ ہو چکے تو کہنا یہی پڑتا ہے کہ ہر فرد کے لیے پیمانہ تقدیر میں کیا معین کیا گیا ہے، اس کا فیصلہ الحق کی طرف سے ہوتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ۔ اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ (۳۵:۲۲-۲۳)

اللہ ہی جس کو چاہتا ہے سناتا ہے، اور تم ان کو سنانے والے نہیں بن سکتے جو قبروں میں پڑے ہیں۔ تو تم بس ڈرا کر خبر دینے والے ہو۔

لوگ اگر حق کے لیے مردہ ہو چکے ہوں تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کو پھر سے زندہ نہیں کر سکتے۔ مارنا اور جلانا الحق کا کام ہے۔ وہی زندگی دیتا ہے اور وہی اسے ختم کر دیتا ہے۔

دستِ قدرت God's Two Hands

گمراہ کرنے کے فعل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنے سے گہرے اور نازک سوالات جنم لیتے ہیں۔ اسلامی علوم کے روایتی نظام میں اس نوع کے سوالات کو عموماً ان ماہرین سے مخصوص سمجھا جاتا ہے جو طلبِ علم کی بلند ترین منزلیں طے کر رہے ہوں۔ یہ منتہی جویائے علم ہی ان مشکل سوالوں سے نبرد آزما ہونے کے قابل سمجھے جاتے ہیں۔ اکثر لوگوں کے لیے تو یہ نکتہ سمجھ سے باہر ہوتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ رحمٰن ورحیم ہے تو پھر وہ انسان کو گمراہ کیوں کر سکتا ہے، تاہم اس سوال کو ہم کسی اور شخص سے جواب حاصل کرنے کے انتظار میں مؤخر نہیں کریں گے اور یہ عرض کرنے کی کوشش کریں گے کہ مسلمان مفکرین نے ہدایت اور گمراہی دونوں کو کس طرح اللہ تعالیٰ سے منسوب کیا ہے اور اس الجھن کا کیا حل پیش کیا ہے۔ یہ دکھانا آسان ہے کہ اس معاملے میں قرآن کا بنیادی موقف ''توحید'' کی اساس میں کارفرما تصورات، یعنی ''تشبیہ'' و ''تنزیہ'' سے پوری مطابقت رکھتا ہے۔

اِضلال و ہدایت کے مسئلے سے متعلق جتنے مباحث ہیں، ان پر اگر بے لاگ انداز میں غور کرنا مقصود ہو تو اس عام فکری رجحان سے پیچھا چھڑا کر سوچنا مفید ہوگا جس کے تحت اللہ تعالیٰ کو انسانی معیارِ خوب و ناخوب کے حوالے سے دیکھا جاتا ہے اور صحیح اور غلط کا یہ پیمانہ بالعموم اپنے زمانے کی سوچ اور اسی کے اندازِ فکر سے متعین کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں انسان کے خیالات وتصورات کو اسلام جس نظر سے دیکھتا ہے، اسے مختصراً یوں بیان کیا جاسکتا ہے: ہم اللہ تعالیٰ کے بارے میں اپنی فہم اور سمجھ بوجھ سے کوئی فیصلہ نہیں دے سکتے کہ اللہ تعالیٰ اپنی تنزیہ اور ماورا ہونے کے سبب ہماری استعدادِ فہم سے بے انتہا دور ہے۔ ہماری سوچ اس تک نہیں پہنچ سکتی۔ ہاں اللہ کے پیمانے پر، اس کے مقرر کردہ معیار پر انسان کو جانچنا ممکن ہے، کیونکہ وہ ساری کائنات کا خالق ہے، رب العالمین ہے۔ معیار، جانچ اور پرکھ کے یہ پیمانے مسلمانوں کے پاس قرآن مجید اور احادیثِ رسولؐ کی صورت میں موجود ہیں۔

یہ کہ کر کہ اللہ تعالیٰ کسی شے سے مشابہ نہیں، منزہ ہیں، لہٰذا انسان کے لیے خدا کو پوری طرح سمجھنا ممکن نہیں، ہم پردۂ اسرار کی اوٹ میں چھپنے کی کوشش نہیں کر رہے، اور نہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس معاملے میں مسلمان کو بے چون و چرا تسلیم کر کے خاموش رہنا چاہیے۔ بات کو سمجھنے کی کوشش کرنا، فہم کی گرفت میں لانے کی سعی کرنا اچھی بات ہے، بشرطیکہ انسان کو اپنی نارسائی کا احساس ہو، اور وہ سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے صحیح مآخذ سے رجوع کرے۔

وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا (۲:۱۸۹) گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہو۔

ہم نے گزشتہ صفحات میں عرض کیا تھا کہ تخلیق آدمؑ کے وقت جب ابلیس نے اللہ کے حکم سے سرتابی کی تو اللہ تعالیٰ نے اس سے پوچھا کہ تو نے اس ہستی کے سامنے سجدہ کرنے سے کیوں انکار کیا، ''جسے میں نے اپنے دو ہاتھوں سے بنایا تھا'' (لما خلقت بیدی)۔ قرآن میں اللہ کے ''دو ہاتھوں'' کا ذکر دو جگہ آیا ہے۔ ان میں سے ایک یہ آیت ہے جو ہم نے درج کی۔ بہت سے مفسرین کی ان آیات کے بارے میں رائے یہ ہے کہ ان آیات میں ایک ایسے تصور کی جانب اشارہ ہے جس کے مضمرات اور معانی کی چھوٹ ساری کائنات پر پڑتی ہے اور جو مسئلہ خیر وشر کی تمام سطحوں کو متاثر کرتی ہے۔

اللہ کے یہ ''دو ہاتھ'' کیا ہیں؟ قرآن مجید کی سورت ۵۶ کی جن آیات میں ''اصحاب الیمین'' (۵۶:۲۷) اور ''اصحاب الشمال'' (۵۶:۴۱) کا ذکر آیا ہے، ان سے اس نکتے کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

''اصحاب الیمین'' (دائیں ہاتھ کے ساتھی) اہلِ جنت ہیں اور ''اصحاب الشمال'' (بائیں ہاتھ والے) اہلِ دوزخ۔ ایک تیسرا گروہ بھی ہے جسے ''السابقون'' The Foremost (سب سے آگے بڑھے ہوئے) لوگ کہا گیا ہے (۵۶:۱۱)۔ یہ لوگ اصحاب الیمین اور اصحاب الشمال دونوں پر سبقت لے گئے اور ان لوگوں کی صفات میں شامل ہوگئے جنھیں قریب کیا گیا ''اَلْمُقَرَّبُوْن۔''

بہت سے مسلم مفکرین کی رائے ہے کہ اللہ کے دو ہاتھ، جن سے اللہ نے آدمؑ کی تخلیق کی، کنایہ ہیں صفاتِ خداوندی کی ان دو بنیادی اقسام کا جو انسان کی تشکیل اور صورت گری میں کارفرما ہوئیں۔ یہ دو اقسامِ صفات ہیں۔ صفاتِ جمال اور صفاتِ جلال یا صفاتِ رحمت اور صفاتِ غضب یا ''تشبیہ'' اور ''تنزیہ''۔ ''اصحاب الشمال'' جہنم میں اس لیے ہیں کہ ان پر صفاتِ جلال کا غلبہ ہے جس کا تقاضا ہے اللہ کی ان سے دوری۔ اصحاب الیمین جنت میں بستے ہیں، کیونکہ ان کی تخلیق میں جو صفات غالب رہی ہیں وہ اسمائے رحمت و جمال ہیں اور یہ اللہ کے قرب کی موجب ہیں۔[۴۲]

سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلوقات میں سے بعض کو اپنے سے دور کیوں رکھتے ہیں کہ وہ تکلیف میں پڑیں۔ یہ ایسا ہی ہے کہ یہ پوچھا جائے کہ اللہ کے دو ہاتھ کیوں ہیں، دایاں ہاتھ اور بایاں ہاتھ۔ یاد رہے کہ سوال کے دو حصے ہیں اور سوال کا دوسرا حصہ اصل میں پہلے ہی کی تکرار ہے۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کو تکلیف میں کیوں رکھتے ہیں؟ یہ سوال ہم معنی ہے اس سوال کا کہ اللہ تعالیٰ مخلوقات میں سے بعض کو اپنے سے دور کیوں رکھتے ہیں۔ اللہ سے دور ہونے کا مطلب ہے بنیادی صفاتِ خداوندی کے پرتو سے محروم ہونا، یعنی وحدت، حقیقت، کمال، اتمام، رحمت اور نورانیت کا فقدان۔ ہر وہ شخص جو ان صفات سے محروم ہو، اس پر کثرت، تفرقہ، عدمِ توازن، بے حقیقتی، شر اور ظلمت چھا جاتی ہے۔ ان صفات کو اگر نفسِ انسانی کی کیفیات کا بیان بنا کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ سب صفات بے اعتدالی، عدمِ توازن، انتشار، بکھراؤ، تکلیف، بلکہ دیوانگی تک کا تقاضا کرتی ہیں۔

پس اِس سوال کی تہ سے ایک اور سوال ابھرتا ہے کہ کوئی شے اللہ سے دور کیوں ہوتی ہے؟ پہلا جواب ''تنزیہ'' کا جواب ہے: ہر شے اللہ سے دور ہے، کیونکہ اللہ کے سوا اور کوئی الٰہ نہیں (لا الٰہ الا اللہ)۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی حقیقی ہے، نورانی ہے، اللہ کے سوا ہر شے بے حقیقت بھی ہے اور ظلمانی بھی۔

''تشبیہ'' کے پہلو سے دیکھیے تو یہ نظر آئے گا کہ کائنات کی اشیا کی نسبتیں اور رشتے اللہ تعالیٰ سے گونا گوں ہیں۔ ان میں سے کچھ اللہ سے قریب ہیں اور کچھ اللہ سے دور۔ اللہ سے مطلقاً قریب کوئی

بھی نہیں کہ یہ صرف خود اللہ ہی کا مرتبہ ہے۔ اللہ سے مطلقاً دور بھی کوئی نہیں، کیونکہ ایسی کوئی شے وجود ہی نہیں پا سکتی۔ اسے حقیقت ہی نصیب نہ ہو سکے گی، کیونکہ حقیقت اوّل و آخر اللہ ہی کی ہے۔

نزدیکی اور دوری کی شناخت کیسے ہوتی ہے۔ قرب اور بُعد کا فیصلہ کیوں کر ہوتا ہے؟ اللہ کی صفات کو منعکس کرنے والا، اس کی صفات کا مظہر اللہ سے قریب ہے۔ فرشتے اللہ کے قریبی ہیں کہ وہ نور سے خلق کیے گئے، جب کہ جسمانیت رکھنے والی مادی اشیا اللہ سے دور تر ہیں کہ ان کی تخلیق آب و گل سے ہوئی۔ سوال کیا جا سکتا ہے کہ آخر ہر شے کو نور سے کیوں نہیں تخلیق کیا گیا؟ جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ ایسا ہی ہوا ہے۔ ہر شے کی تخلیق تو نور ہی سے ہے فرق صرف یہ ہے کہ نور کہیں زیادہ ہے کہیں کم۔ نور کی تابندگی الگ الگ ہے۔ نور جب بہت مدھم ہو جائے تو اسے آگ کہتے ہیں۔ جب نور دھیما ہوتے ہوئے اتنا کم ہو جائے کہ آپ اسے نور کے طور پر بمشکل پہچان سکیں تو اسے مٹی کہ دیا جاتا ہے، لیکن دراصل نور کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں، کیونکہ ظلمت محض فقدانِ نور کا نام ہے۔ پس عرصۂ ہستی کی ہر شے نور کی ایک کرن، نور کی ایک جھلک کی نمایندہ ہے۔ ظلمت کہیں نہیں پائی جاتی۔

قارئین کو اگر نور کی تمثیل پر مبنی جواب تسلی بخش معلوم نہ ہو تو ہم اسمائے صفاتی میں سے کسی ایک نام کو لے کر یہی استدلال قائم کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ فرشتے اللہ سے قریب اور اجسامِ مادی اللہ سے دور ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم کا بلا واسطہ مظہر ہیں، جب کہ اجسام مادی میں کوئی علم ہے ہی نہیں جس کا ذکر کیا جا سکے۔ تاہم آخری تجزیے میں یہ کہنا پڑتا ہے کہ پتھروں تک میں علم ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ ظہورِ علم کے درجات الگ الگ ہیں، پس ہمیشہ ایسا ہوتا رہا ہے کہ ایک شے (یا ایک شخص) کو زیادہ علم میسر ہے، جب کہ دوسرے کسی کو تھوڑا علم دیا گیا ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

وَفَوْقَ كُلِّ ذِىْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ — اور ہر علم والے سے بالاتر ایک علم والا ہے۔

پس ہر صاحبِ علم سے فروتر کوئی اور بھی ہوگا جو اس جتنا علم بھی نہیں رکھتا۔ آپ اعتراض کے طور پر پوچھ سکتے ہیں کہ بھلا پتھر میں کیا علم ہوگا، جواباً ہم یہ کہیں کہ پتھر کو بخوبی علم ہے کہ اسے اپنی جگہ کیسے جما رہنا ہے۔ یہی نہیں پتھر کا شمار بھی اس ''ہر شے'' میں ہوتا ہے جس کے بارے میں قرآن کا ارشاد ہے:

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۵۷:۱) — زمین و آسمان کی ہر شے اس کی تسبیح کرتی ہے۔

جس شے کو اللہ کا علم ہی نہ ہو، وہ اس کی تسبیح کیا کرے گی؟ یہ مانا کہ پتھر کا علم ہمارے علم کے مانند

نہیں ہے، لیکن ہمارا علم بھی تو اللہ کے علم کی طرح نہیں ہے اور اس کے باوجود ہم اپنے لیے بھی یہی علم کا لفظ بولتے ہیں اور اللہ کے لیے بھی۔

اپنے اصل سوال کی طرف لوٹ کر دیکھیں کہ آخر اللہ تعالیٰ بعض مخلوقات کو اپنے سے دور کیوں رکھتا ہے؟ گذشتہ بحث کی روشنی میں اگر یوں کہا جائے تو باعثِ تعجب نہ ہوگا کہ اس سوال کا اصل مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو ایک سی نورانیت، ایک سے علم، یکساں حیات یا یکساں قوتِ گویائی کے ساتھ کیوں نہیں پیدا کیا؟ پہلا جواب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ یوں کر دیتے تو پھر مخلوقات کی یہ رنگا رنگی اور تنوع کیوں کر پیدا ہوتی، پھر تو صرف ایک ہی مخلوق ہوا کرتی۔ نتیجہ کیا ہوتا؟

اللہ تعالیٰ اگر دو چیزیں تخلیق کرے تو دونوں مخلوقات ایک دوسرے سے کسی نہ کسی خاصیت کے لحاظ سے مختلف ہوں گی۔ اگر مختلف نہ ہوں تو پھر ایک دوسرے سے الگ، دو جداگانہ مخلوقات کیوں کر ہوں؟ جس لحاظ سے ان میں اختلاف ہے اس کو حوالہ بنا کر ہم ان کا ایک دوسرے سے تقابل کرتے ہیں۔ ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان میں سے ایک زیادہ روشن ہے اور دوسری روشنی میں فروتر یا دوسرے لفظوں میں کہیے تو یوں ہوگا کہ ایک مخلوق روشن و منور ہے، جب کہ دوسری تیرہ و تاریک۔ یہ سچ ہے کہ تاریک مخلوق بھی نور کے مکمل فقدان کے مقابلے میں قدرے حاملِ نورانیت ہے جیسا کہ دیا سلائی کی ایک جلتی ہوئی تیلی شبِ تاریک کے مقابلے میں روشن تر ہوتی ہے، لیکن یہ تیلی بجلی کے کوندے کے مقابلے میں تاریک ہے، ۱۰۰ واٹ کے بلب، چاند کی روشنی، سورج کی شعاعوں وغیرہ کا تو ذکر ہی کیا! روشن ہونا اور تاریک ہونا اضافی معاملہ ہے۔ جیسا کہ علم اور جہل، موت و حیات، گویائی اور خاموشی، طاقت اور کمزوری، سعادت و شقاوت سب اضافی معاملات ہیں۔

اب آیئے اپنے نقطۂ آغاز کی طرف۔ ہدایت اور گمراہی کا مسئلہ۔ اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں کو ہدایت کیوں دیتے ہیں اور بعض لوگوں کو گمراہی میں کیوں چھوڑ دیتے ہیں؟ پوچھنے کو تو یہ سوال بھی کیا جا سکتا ہے کہ آخر اللہ تعالیٰ میں صفاتِ تشبیہ اور صفاتِ تنزیہ دونوں کیوں ہیں؟ وہ رحمٰن و رحیم اور صاحبِ قہر و غضب ہر دو کیوں ہے؟ آخر وہ صرف رحمت والا اور مہربان کیوں نہیں ہے؟ جواب واضح ہے، ایسا ہوتا تو پھر وہ خدا کہاں رہتا!

خدا وہ حقیقت ہے جس میں ہر حقیقی، مثبت، اچھی اور مفید چیز موجود ہے اور جو اس لامحدود کائنات کی تخلیق میں اپنی یہ صفات ظاہر کرتا ہے۔ کائنات کی ہر شے ''ماسوی اللہ'' ہے اور اس لحاظ سے اللہ

کے بائیں ہاتھ کے زیرِ فرمان ہے، اللہ سے دور اور اللہ تعالیٰ کی نسبت اس سے تنزیہ، جلال، قہر، غضب اور ماورا اور نارسا ہونے کی ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ کائنات کی ہر چیز اللہ کے دائیں ہاتھ کے زیر فرمان ہے، اللہ کے قریب ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ کی نسبت اس سے تشبیہ، جمال، رحمت، مہربانی اور قابلِ رسائی ہونے کی ہے۔

اگر ایک چیز کو دوسری چیز سے مختلف ہونا ہے تو پھر یہ نہیں ہوسکتا کہ اللہ کے دونوں ہاتھوں کا تعلق اس چیز سے ایک جیسا ہو۔ اگر دونوں ہاتھوں کا معاملہ کوئی سی دو چیزوں کے ساتھ یکساں ہو جائے تو وہ دو نہیں رہیں گی، ایک ہو جائیں گی، لیکن چونکہ ہر چیز دوسری سے مختلف ہے، اس لیے دستِ خداوندی ہر شے سے الگ الگ انداز سے معاملہ کرتا ہے۔ کچھ مخلوقات، مثلاً اجسامِ مادی اور شیاطین میں اللہ تعالیٰ کے بائیں ہاتھ کی صفات اپنے آثار واثرات زیادہ نمایاں طور پر ظاہر کرتی ہیں، جب کہ دوسری اشیا مثلاً نورانی اشیا اور فرشتوں میں اس کے دائیں ہاتھ کی صفات کا غلبہ ہوتا ہے۔

انسان اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھوں سے خلق ہوا، اس طرح کہ نہ دایاں ہاتھ بائیں پر غالب ہے نہ بایاں دائیں پر، لیکن اس کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو مکمل انسان ہوتے ہیں۔ جو صورتِ خداوندی کو اس کے مکمل ظہور کے ساتھ حقیقت بناتے ہیں، اور ایسے لوگ کم ہی ہوا کرتے ہیں۔ اکثر انسانوں میں یا تو دایاں ہاتھ غالب رہتا ہے یا بایاں ہاتھ غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔ اسی سے اس امر کا تعین ہوتا ہے کہ کوئی شخص اصحابِ شمال میں ہو کر اپنے انجام کو پہنچے گا یا اصحابِ یمین کا گروہ اس کی منزل ہوگی۔ بالفاظِ دیگر اس کا ٹھکانا دوزخ ہوگا یا وہ اہلِ جنت میں ہوگا۔ رسولِ خداؐ کی ایک حدیث میں اس پوری صورتِ حال کا نقشہ یوں بیان ہوا ہے:[۳۴]

> اللہ تعالیٰ نے آدم کو خلق کیا جب خلق کیا۔ پھر اس کے دائیں کندھے پر ضرب لگائی اور اس کی ذرّیت نکل آئی، سفید گویا سفوف۔ پھر بائیں کندھے پر ضرب لگائی اور اس کی ذرّیت نکالی، کوئلے کی طرح سیاہ۔ پھر جو دائیں ہاتھ میں تھے انھیں کہا ''جنت میں، اور مجھے پروا نہیں۔'' اور وہ جو بائیں ہاتھ میں تھے، ان سے کہا آگ میں، اور مجھے پروا نہیں۔

ایسی صورت میں انسان کو کیا کرنا زیبا ہے؟ مسلمان اس صورت حال میں کیا کرتے ہیں، اللہ کے دستِ غضب سے بچنے کی کوشش اور اس کے دستِ رحمت کی طلب۔ شیطان سے ان تمام مواقع پر دور رہنے کی سعی جہاں جہاں اس سے سابقہ پڑ سکتا ہے، یعنی گمراہی کی صفت سے گریز خواہ وہ ابلیس میں

ظاہر ہو، فرعون میں نمو کرے یا ہوا و ہوس کی صورت اختیار کرے۔ اس کا مطلب ہوا، انبیا کی لائی ہوئی ہدایت کی پیروی اور عقل کی رہنمائی۔ قرآن میں دیے گئے احکام کے مطابق شیطان سے اللہ کی پناہ مانگنا۔

وَ اِمَّا يَنۡزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ (۳۶: ۴۱)	اور اگر کبھی تم شیطان کی اکساہٹ سے چوک جاؤ تو اللہ کی پناہ ڈھونڈو۔

وہ لوگ جن کی نگاہیں ہر سطح پر ''توحید'' کی تاثیر سے آشنا ہیں اور ''توحید'' کو ہر معاملے میں شناخت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں، ان کے نزدیک اس معاملے میں صحیح انسانی رویّہ یہ ہے کہ رسولِ خداؐ کا اتباع کیا جائے اور ان کی طرح یہ مانا جائے کہ اللہ کے دو ہاتھ ہیں اور انسان کو دستِ راست اور دستِ چپ ہر دو سے الگ الگ معاملہ کرنا چاہیے۔ ہم نے پہلے درج کیا تھا کہ رسول اللہؐ یہ دُعا کیا کرتے تھے: ''میں تیرے غضب سے تیری رحمت کی پناہ لیتا ہوں، تیرے غضب سے تیری مغفرت کی پناہ لیتا ہوں اور تجھ سے تیری ہی پناہ میں آتا ہوں۔''[۴۴] بالفاظِ دیگر آپؐ فرما رہے ہیں کہ ''اے میرے رب! میں تیرے بائیں ہاتھ سے تیرے دائیں ہاتھ کی پناہ میں آتا ہوں۔'' آخری بات یہی ہے کہ حقیقت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے تو اس کے سوا اور کون ہے جس سے انسان پناہ مانگے اور جس کے دامن میں پناہ تلاش کرے۔

فطری بات ہے کہ ہماری بیان کردہ توجیہ اور اس کے مذکورہ استدلال سے ہر پڑھنے والے کی تشفی نہیں ہو سکے گی۔ سوال باقی رہے گا کہ آخر انسانوں کی مختلف قسمیں کیوں ہوتی ہیں اور ان میں سے کچھ جہنم میں کیوں جائیں گی اور کچھ جنت میں کیوں جائیں گی؟ عام طور پر ایسے مباحث میں فی الفور صدائے احتجاج بلند کی جاتی ہے کہ ''آخر یہ نزلہ مجھی پر کیوں؟'' یہ واویلا قبل از مرگ ہے۔ کیا جانیے کہ آپ کی منزلِ آخرین کون سی ہے، اصحابِ یمین یا اصحابِ شمال۔ دستِ راست یا بایاں ہاتھ! اگر جنت میں مقیم ہوتے تو یقیناً شکایت نہ کرتے، لیکن ابھی سے یہ فرض کرنا بھی مناسب نہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو دوزخ ہی میں ڈالے گا، یہ اللہ کی رحمت سے مایوسی ہے اور ایسا سوچنا کوئی دانشمندی کی بات نہیں۔ ہمیشہ یاد رکھیے کہ گیا گذرا بدترین گناہ گار بھی اپنے کیے سے توبہ کر سکتا ہے اور نیکوں کا نیک (مثلاً ابلیس) کسی لمحے بھی ذلت کے گڑھے میں گر سکتا ہے۔ یہ ہم سبھی کا حال ہے، انسان جو ٹھہرے۔ اوروں کا کیا مذکور ہے، خود نبی علیہ السلام کو یہ کہنے کا حکم دیا گیا ہے:

قُلۡ لَّاۤ اَمۡلِكُ لِنَفۡسِىۡ نَفۡعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا	کہیے کہ میں اپنی جان کے برے بھلے کا مالک

مَا شَآءَ اللّٰہُ وَ لَوۡ کُنۡتُ اَعۡلَمُ الۡغَیۡبَ لَاسۡتَکۡثَرۡتُ مِنَ الۡخَیۡرِ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوۡٓءُ اِنۡ اَنَا اِلَّا نَذِیۡرٌ وَّ بَشِیۡرٌ لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ (۷:۱۸۸)

نہیں ہوں، مگر جو اللہ چاہے۔ اور اگر میں جانا کرتا غیب کی بات تو خیر کا بڑا خزانہ جمع کر لیتا اور مجھے کوئی گزند نہ پہنچتا۔ میں تو بس ان لوگوں کے لیے ایک ہوشیار کرنے والا اور خوشخبری دینے والا ہوں جو ایمان لائیں۔

دوسری طرف یہ بھی یاد رہے کہ ہم میں سے کسی کو یہ معلوم نہیں کہ ہمارا انجام کیا ہونا ہے۔ پس اپنی راہِ عمل کے انتخاب میں اور صحیح اور غلط کے درمیان چناؤ کے لیے میں بھی اتنا ہی آزاد ہوں جتنا کوئی اور شخص۔ اللہ کے پیمانۂ تقدیر پر اور ہر شے کو معین کرنے پر جو لوگ معترض ہوتے ہیں، ان کی نیت عموماً صاف نہیں ہوتی۔ اعتراض کے پسِ پردہ کچھ اور مقصد کارفرما رہتا ہے۔ وہ ہمیں اس بات پر قائل کرنا چاہتے ہیں کہ اس معاملے میں منطقی رویّہ یہ ہے کہ انسان یوں کہا کرے کہ ''ٹھیک ہے اگر یہ سب مقرر ہو چکا اور طے کر دیا گیا تو پھر اب میں آزاد ہوں، جو چاہے کرتا رہوں کہ اس سے کوئی فرق تو پڑے گا نہیں۔ اگر مجھے دوزخ میں پڑنا ہے تو میں اسے ٹالنے روکنے کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا اور اگر جنت میں جانا طے ہو چکا ہے تو اس تک پہنچنے میں بھی میرا کوئی عمل سودمند نہیں ہو سکتا''، لیکن یہ طرزِ استدلال، یہ دلیل بازی صرف ایک بہانہ ہے جس کی آڑ لے کر انسان اپنے انجام، اپنی منزل اور اپنے آخری ٹھکانے کے بارے میں کچھ سوچنے، کرنے سے خود کو بری کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مولانا روم نے اس اندازِ فکر پر نہایت وضاحت سے اپنے مخصوص طنزیہ اسلوب میں تبصرہ کیا ہے۔ ان کی رائے اس شعر میں سمٹ آئی ہے۔[۴۵]

انبیا در کارِ دنیا جبری اند کافراں در کارِ عقبیٰ جبری اند
انبیا را کارِ عقبیٰ اختیار جاہلاں را کارِ دنیا اختیار

بالفاظِ دیگر وہ لوگ جو قرآن کے دیے ہوئے سبق سے آگاہ ہو جاتے ہیں، وہ یہ بات جان لیتے ہیں کہ اس دنیا میں اپنی حالت سدھارنے کے لیے ان کے بس میں کچھ بھی نہیں۔ پس وہ اپنی جدوجہد کا رخ اگلے جہان میں اپنی حالت سدھارنے کی طرف کر دیتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ لوگ جو جبر و اختیار کے بارے میں بال کی کھال نکالنے میں لگے رہتے ہیں، ان کی ساری کاوش اپنی دنیاوی حالت بہتر بنانے میں صرف ہوتی ہے۔ نبیوں کے لائے ہوئے امر و نہی کے احکام نظر انداز ہوتے رہتے ہیں جب کہ

یہی احکام ان کے مستقبل اور اگلے جہان کی زندگی کو بہتر بنا سکتے تھے۔

چونکہ ہر چیز پہلے سے مقدر ہے، لہٰذا انسان کے کسی عمل سے اس کے لیے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اس دعوے کے اندر خود ایک تضاد پنہاں ہے۔ یہ تضاد فلسفیانہ سطح پر نہیں ہے، کیونکہ اس سطح پر تو اس استدلال میں کوئی معنی بھی ہیں۔ تضاد تو نفسیاتی اور عملی سطح پر پیدا ہوتا ہے۔ اس تضاد کی نوعیت کو سمجھنا ہو تو بحث کو ذرا نیچے اتار کر ایک ٹھوس مثال کی سطح تک لانا مفید ہوگا۔

فرض کیجیے کہ آپ کالج میں طبعیات کا ایک دشوار ترین نصاب پڑھنا شروع کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی فرض کیجیے کہ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہر شے اللہ کے پیمانۂ تقدیر کے مطابق ہوتی ہے۔ اس سے آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ دورۂ تعلیم کے اختتام پر جو نمبر آپ کو ملیں گے، وہ پہلے سے مقدر ہیں۔ اس کے بعد کیا آپ یہ فیصلہ بھی کریں گے کہ کمرۂ جماعت میں آنے نہ آنے، لیکچر سننے نہ سننے اور نصاب کی کتب پڑھنے یا ایک طرف پھینک دینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا؟ آپ کا امتحان میں کامیاب ہونا اور ناکام ہونا مقدر بھی ہو چکا ہو، تب بھی اگر آپ کلاس میں جانا ترک کر کے دعوتوں، ضیافتوں میں خوش اوقاتی کرتے رہیں گے تو امتحان میں کامیابی کے امکانات ہی تلف ہو جائیں گے۔ اگر آپ امتحان میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو اس کے لیے آپ کو لیکچر سننے کی اور مطالعۂ کتب کی زحمت کھینچنا ہوگی۔ اس کے باوجود یہ ہوسکتا ہے کہ آخری امتحان میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑے، تاہم زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ اگر آپ کورس کے تقاضے پورے کر لیں تو امتحان میں کامیاب رہیں گے۔ جب کامیابی کے مرحلے سے گذر چکے ہوں گے، تب آپ پر کھلے گا کہ آپ کا کامیاب ہونا تو مقدر تھا۔ اگر آپ پڑھائی چھوڑ کر آوارگی کرتے رہے ہوتے تو اس لمحے آپ پر عیاں ہو جاتا کہ آپ کا ناکام ہونا مقدر تھا۔

مختصر یہ کہ عملی سطح پر انسانی آزادی اور تقدیر کے مابین کوئی تضاد نہیں، ہدایت اور گمراہی میں کوئی ٹکراؤ نہیں، رحمت اور غضب میں کوئی تصادم نہیں۔ انسان نہیں جانتا کہ اس کا ٹھکانا کون سا ہے، وہ کس گروہ کا آدمی ہے، پس وہ اپنی راہِ عمل کے چناؤ میں آزاد ہے۔ انسان جانتا ہے کہ روزمرّہ کی زندگی میں وہ آزاد ہے، یہی نہیں بلکہ اپنے ہر ہر عمل سے وہ اسے ثابت بھی کرتا ہے۔ اسلام کا کہنا یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ وہ انسان کے صرف ان فیصلوں کی باز پرس کرے گا جو اس نے اپنے اختیار سے اور اپنی مرضی سے کیے ہوں گے۔ جو امور اس کے لیے ناممکنات میں سے تھے، ان

کے لیے اسے جواب دہی نہیں کرنا پڑے گی۔ انسان اگر ہر دعوے سے دستبردار ہو بھی جائے (اور یہی اسلام کے معنی ہیں۔ الحق کے سامنے سرِتسلیم خم کرنا) تب بھی رسولِ خداؐ کے دیے ہوئے نمونۂ زندگی اور اسوۂ حیات کو ایک عملی حقیقت بنانے کے لیے انسان کو ہر سعی اور ہر کاوش کرنا پڑتی ہے۔ اسلام میں جو ''جبریت'' یا ''مقدر ہونے'' کا تصور ہے، اس سے کسی طرح بھی کم ہمتی، آلکس اور سست روی کی افزایش نہیں ہوتی۔ یہاں تو معاملہ بالکل الٹ ہے۔ اس تصور سے جدوجہد اور سعیِ پیہم کو جلا ملتی ہے۔ ہاں یہ ہے کہ اس کوشش و کاوش کا ہدف، اس کا محور یہ دنیائے امروز نہیں رہتی۔ اس کی جدوجہد کا رخ اگلے جہان کی سمت ہو جاتا ہے۔ اب اس کی سمتِ سفر انتشار اور ''شرک'' سے ہٹ کر ارتکاز اور ''توحید'' کی جانب متعین ہو جاتی ہے۔

اسلام اور دیگر ادیان

نبوّت عام اور نبوّتِ خاص

نبوّت وہ ذریعہ ہے جس سے اللہ کی ہدایت انسانی وسیلوں کے توسط سے نوعِ انسانی تک پہنچتی ہے۔ جس طرح اللہ کی رحمت اس کے غضب سے بڑھی ہوئی ہے اور غضب کی نوعیت کا فیصلہ کر دیتی ہے، اُسی طرح اللہ کی ہدایت بھی اس کے بھٹکانے سے بڑھی ہوئی ہے۔ ہدایت کا مقتضٰی ہے کہ گمراہی بھی موجود ہو۔ شیطان جس گمراہی کی تجسیم ہے، اگر اس کا وجود نہ ہو تو انبیا کے پیغام میں کوئی معنی نہ رہیں۔ دوری کے بغیر نزدیکی نہیں ہوتی، غلط کے بغیر کوئی صحیح نہیں ہے اور ظلمت کے بغیر نور کا ادراک نہیں ہو سکتا۔ یہ کائنات من و تو کے جس امتیاز پر کھڑی ہے، یہ رنگا رنگی اور تنوع جس کی وجہ سے اس کا وجود ہے، وہ صرف اس لیے ہے کہ اللہ کی صفات اس میں نو بہ نو انداز اور مفصل طور پر ظاہر ہوئی ہیں۔ اخلاقی اور روحانی سطح پر یہ تنوع، یہ اختلاف ہدایت اور گمراہی کے راستوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ انبیا ہدایت کے نمایندے ہیں اور شیاطین گمراہی کے نقیب۔

جہاں جہاں انبیا رہے ہیں، وہاں شیاطین بھی ہوئے ہیں۔ قرآن نے ''شیاطین'' کا لفظ بعض جنّات اور بعض انسانوں کے لیے استعمال کیا ہے۔ شیطان وہ ہے جو انبیا کا دشمن ہو اور گمراہی کی تجسیم:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ	اسی طرح ہم نے انسانوں اور جنوں میں
الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ	سے شیاطین کو ہر نبی کا دشمن بنایا جو دھوکہ

زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ وَلَوْشَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ (٦:١١٣)

دینے کے لیے ایک دوسرے کو پرفریب، ملمع شدہ باتیں کرتے ہیں، اور اگر تیرا رب چاہتا تو وہ یہ نہ کر پاتے، سو چھوڑ دو ان کو، وہ جانیں اور ان کا جھوٹ۔

پہلے نبی اور ہمارے جدامجد، حضرت آدمؑ کو ابلیس کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ہم بھی ابلیس، اس کی اولاد اور اس کے پیروکاروں کا سامنا کرتے ہیں۔ گمراہی ایک کائناتی چیز ہے۔ گمراہی باہر کی دنیا میں بھی ہوتی ہے اور ہمارے اندر بھی۔ اس طرح ہدایت بھی ایک کائناتی چیز ہے۔ دوسرے لفظوں میں نسلِ انسانی کا تصور انبیا اور شیاطین کے بغیر ممکن نہیں ہے، کیونکہ انسان کی شناخت ہی اس آزادیِ اختیار سے ہوتی ہے جو اسے اس وقت دی گئی تھی جب اسے صورتِ خداوندی پر خلق کیا گیا تھا۔ وہ صفاتِ خداوندی میں انتخاب کرنے کے لیے آزاد ہے، کیونکہ تمام صفاتِ خداوندی انسان کے اندر پائی جاتی ہیں۔ وہ ہدایت کی پیروی کر کے اللہ کے دستِ راست کا انتخاب بھی کر سکتا ہے اور اپنے لیے گمراہی کا راستہ چن کر اللہ کے بائیں ہاتھ کا انتخاب بھی۔ اگر یہ آزادیِ انتخاب واختیار نہ ہوتی تو وہ ''بارِامانت'' کو قبول کرنے میں آزاد نہ ہوتا۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ انبیا کا بنیادی پیغام ہے ''توحید۔'' اسلام کے تناظر میں دیکھیے تو سبھی انبیا توحید کی شہادت (لاالہ الااللہ) لے کر آئے تھے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (٢١:٢٥)

تم سے پہلے ہم نے جتنے بھی رسول بھیجے، ان کی طرف یہی وحی کرتے رہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری ہی عبادت کرو۔

پہلی شہادت اس ہدایتِ ربّانی کا عنوان ہے جو تمام انبیا میں مجسم ہوتی رہی ہے۔ اس کے برعکس دوسری شہادت کا تعلق اللہ کے اس خاص پیغامِ ہدایت سے ہے جو سیدنا محمدؐ لے کر آئے تھے۔ دوسرے تمام انبیا کا اپنا اپنا پیغام تھا اور اسی کے مطابق کلمۂ شہادت کا دوسرا حصہ۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ (١٠:٤٧)

اور ہر اُمت کے لیے ایک رسول ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ (١٤:٤)

اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا، اس کی زبان میں بھیجا۔

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا (۵:۴۸) تم میں سے ہر ایک کو ہم نے ایک دستور اور ایک کھلی راہ دی۔

قرآن مجید نے اس بات کی تاکید کی ہے کہ مسلمانوں کو اللہ کے نبیوں میں ہرگز فرق نہیں کرنا چاہیے کہ ہر نبی بہرحال اللہ ہی کا پیغامِ ہدایت دے کر بھیجا گیا اور انبیا میں سے ہر ایک کا اوّلین اور اساسی پیغام ایک تھا:[۴۶]

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (۲:۱۳۶)

کہو ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس چیز پر ایمان لائے جو ہم پر اُتاری گئی اور جو ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب اور ان کی اولاد کی طرف اتاری گئی اور اس چیز پر ایمان لائے جو موسیٰ وعیسیٰ کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔

قرآن متعدد آیات میں یہ بتاتا ہے کہ پچھلے انبیا اپنے سے پہلے آنے والے نبیوں کے پیغام کا اثبات کرنے اور اس کی یاد دلانے کے لیے آتے تھے:

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ (۶۱:۶)

اور یاد کرو جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا، اے بنی اسرائیل! میں تمھاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔ سچا کرتا ہوں تورات کی ان (پیش گوئیوں کو) جو مجھ سے پہلے موجود ہیں اور خوشخبری دیتا ہوں، ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ (۳:۳)

اس نے تجھ پر کتاب اُتاری حق کے ساتھ، ثابت کرتی ہے اس کو جو پہلے سے موجود ہے۔ اور اس سے پہلے اس نے تورات اور انجیل اتاری تھی لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر۔

اس کے ساتھ ہی قرآن مجید صراحت سے یہ بھی بتا دیتا ہے کہ انبیا کے لائے ہوئے پیغام کی تفصیلات ایک دوسرے سے مختلف رہی ہیں۔ اگر انبیا میں کوئی امتیاز قائم کیا جا سکتا ہے تو وہ اسی بنیاد پر ہوگا کہ ان کے پیغام میں کس قدر باہمی فرق پایا جاتا ہے:

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ وَ اٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَ يَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (۲:۲۵۳)

یہ رسول جو ہیں ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی۔ ان میں سے کوئی وہ ہے جس سے اللہ نے کلام کیا اور بعض کے درجے بلند کیے اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو کھلی کھلی نشانیاں دیں اور روحِ پاک سے ان کی تائید کی۔

وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰی بَعْضٍ وَّ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا (۱۷:۵۵)

اور ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی۔

ہر نبی ایک ایسا پیغامِ ہدایت لے کر آتا ہے جس کا خصوصی تعلق اس قوم سے ہوتا ہے جس کا اسے نبی بنایا گیا اور یہ پیغام اپنی تفصیلات میں دوسرے پیغامات سے مختلف ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے دل و دماغ میں یہ خیال بہت پختگی سے جاگزیں رہتا ہے اور اسی خیال کا عکس ان تمام القابات میں دیکھا جا سکتا ہے جو تمام بڑے انبیا کے لیے اسلامی کتابوں میں استعمال کیے گئے ہیں۔ ہر لقب کسی ایک خاص صفت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ صفت جو اس نبی کو دوسرے انبیا سے ممتاز کرتی ہے، چنانچہ یہ دیکھیے کہ ابھی ہم نے جو آیات درج کی ہیں، ان میں سے ایک آیت میں اس کا ذکر ہے: ''جس سے خدا نے کلام کیا۔'' اکثر مفسرین کی رائے کے مطابق یہاں اشارہ سیدنا موسیٰؑ کی طرف ہے جنھیں اسلامی مآخذ میں ''کلیم'' (بات چیت کا ساتھی) کا لقب دیا گیا ہے۔ اس لقب کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے جبرئیل کے واسطے کے بغیر طورِ سینا پر کلام کیا۔ اور اس لیے بھی کہ قرآن کا ارشاد ہے:

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا (۴:۱۶۴)

اور دوسرے (بھی بہت سے) رسولوں پر ہم نے وحی بھیجی جن کا حال ہم تم کو پہلے سنا چکے ہیں اور کتنے ہی رسول ہیں جن کا احوال ہم نے تم کو نہیں سنایا اور موسیٰ سے تو اللہ نے بول کر کلام کیا ہے۔

لیکن مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ ممکن ہے یہاں اشارہ حضرت آدمؑ کی طرف ہو جن سے اللہ تعالیٰ نے باغِ بہشت میں خطاب کیا اور یہ بھی کہ اس سے مراد سیدنا محمد صلی اللہ وعلیہ وسلم کی ذات ہو جن سے اللہ تعالیٰ سفرِ معراج کے دوران ہم کلام ہوئے۔ اسی طرح سیدنا عیسیٰؑ کو عموماً ''روح اللہ'' (اللہ کی روح) کے لقب اور سیدنا ابراہیم کو ''خلیل اللہ'' (اللہ کا دوست) کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

اسلامی ممالک میں اور خاص طور پر وہاں کے ان لوگوں میں جن پر ابھی جدید تعلیم کی چھاپ نہیں لگی، یہ اعتقاد عام ہے کہ تمام ادیان پہلی شہادت کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن ہر دین کی ایک خاص دوسری شہادت ہے جو مسلمانوں کی دوسری شہادت سے مختلف ہے، چنانچہ یوں کہا جا سکتا کہ عیسائیوں کا کلمہ یہ ہے: ''لا الہ الا اللہ عیسیٰ روح اللہ''، جب کہ یہودی اسے یوں پڑھتے ہیں: ''لا الہ الا اللہ موسیٰ کلیم اللہ۔''

قرآن اس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ اگرچہ پہلی شہادت کبھی تبدیل نہیں ہوتی، تاہم دوسری شہادت کی قلمرو ہر نبی کے پیغام کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے، چنانچہ مثال کے طور پر وہ قوانین جو یہودیوں کے لیے مناسب ہیں، لازم نہیں کہ عیسائیوں کے لیے بھی موزوں رہے ہوں، نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی شریعت کے احکامات ایک کائناتی حیثیت رکھتے ہیں۔ (بعض مسلمان البتہ اسی خیال کے حامل ہیں)۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل آیت میں قرآن مجید نے یہ بتایا ہے کہ یہودیوں کے ہاں بعض چیزوں کی ممانعت ہے، جب کہ یہی چیزیں مسلمانوں کے لیے ممنوع نہیں:

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ ۖ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَا إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ (٦:١٤٧)	اور ہم نے یہود پر سارے ناخن والے جانور حرام کیے اور گائے اور بکری کی چربی حرام کی، بجز اس کے جو ان کی پیٹھ یا انتڑیوں سے وابستہ کسی ہڈی سے لگی ہوئی ہو۔

اسی طرح مندرجہ ذیل الفاظ کو قرآن مجید نے حضرت مسیحؑ کے منہ سے کہلوایا ہے، جب کہ ان کے مخاطب یہودی ہیں۔ اشارہ اس جانب ہے کہ مسیحی شریعت حضرت موسیٰؑ کی شریعت سے مختلف ہے۔

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ (٣:٥٠)	اور میں تصدیق کنندہ ہوں اپنے سے پیشتر آئی ہوئی تورات کا اور اس لیے (آیا ہوں) کہ بعض ان چیزوں کو تمھارے لیے حلال ٹھہراؤں جو تم پر حرام کر دی گئی ہیں۔

قرآن مجید کی دوسری سورت کے آخر میں ایک دعا ہے جو بکثرت پڑھی جاتی ہے،اس کے الفاظ ہیں۔

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا (۲:۲۸۶)

اے ہمارے پروردگار! ہمارے اوپر اس طرح کا کوئی بار نہ ڈال جیسا تو نے ان لوگوں پر ڈالا جو ہم سے پہلے ہو گذرے۔

مفسرین کا کہنا ہے کہ اس سے مراد ہے تورات جو مسلمانوں کی شریعت کے مقابلے میں ایک بارِ گراں محسوس ہوتی ہے کہ شریعتِ اسلام کو حدیث کے الفاظ میں ''سہل اور گوارا'' (سهل و سمح)[۲۴۷] کہا گیا ہے۔ مختلف انبیا کو جو الگ الگ پیغامات سونپے گئے، ان کے سب سے خوش کن بیانات میں سے ایک وہ بیان ہے جو رسول خداؐ کے سفرِ معراج کے ذیل میں تمام مستند مآخذ میں مذکور ہوا ہے۔ اس ضمن میں ہم نے پہلے عرض کیا تھا کہ آسمانوں کا سفر کرتے ہوئے رسول اللہ نے کئی انبیا سے ملاقات فرمائی تھی۔ جب آپ بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو آپ کی امت کے لیے کچھ احکام دیے۔ نیچے آتے ہوئے رسول اللہؐ ہر فلک پر انبیا کو الوداع کہنے کے لیے رکتے ہوئے تشریف لائے۔ چھٹے آسمان پر ساتویں آسمان کے عین نیچے آپ کی ملاقات سیدنا موسیٰؑ سے ہوئی۔ سیدنا موسیٰؑ نے آپؐ سے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے امت کے لیے آپ کو کون سی عبادات کا حکم فرمایا۔ رسول اللہؐ نے جواب دیا کہ اللہ نے یومیہ پچاس نمازوں کا حکم فرمایا ہے۔ سیدنا موسیٰؑ نے ان سے کہا کہ آپ واپس جائیے اور اللہ تعالیٰ سے اس بوجھ کو کم کرنے کی درخواست کیجیے۔ انھیں یہ افسوس ناک تجربہ ہو چکا تھا کہ لوگ باگ اتنے مشکل حکم پر عمل نہیں کر پائیں گے۔ رسولِ خداؐ فرماتے ہیں: ''میں واپس ہوا، اللہ تعالیٰ نے دس نمازیں کم کر دیں۔ لوٹ کر موسیٰؑ کے پاس آیا تو انھوں نے وہی کہا جو پہلے کہا تھا۔ پس میں پھر واپس ہوا اور اللہ تعالیٰ نے مزید دس نمازیں کم کر دیں۔ میں لوٹ کر موسیٰؑ کے پاس آیا......''[۲۴۸] آخر کار جب رسولِ خداؐ کئی مرتبہ لوٹ کر اللہ تعالیٰ کے پاس اور پھر سیدنا موسیٰؑ کے پاس آئے تو نمازوں کی تعداد کم ہو کر پانچ رہ گئی۔ اس پر سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے رسولِ خداؐ سے فرمایا:

تمھاری قوم پانچ نمازوں کی پابندی نہیں کر پائے گی۔ میں نے تمھارے زمانے سے پہلے کے لوگوں کو آزمایا ہے اور بنی اسرائیل پر غالب آنے کی پوری کوشش کی ہے، سو اپنے رب کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ تمھاری قوم کے لیے اور آسانی فرما دے۔

لیکن اب وہ نقطہ آ چکا تھا کہ بار بار تخفیف کی درخواست کرنے سے رسولِ خداؐ خجل ہونے لگے

تھے، سو آپؐ نے فرمایا: ''میں اپنے رب سے اتنی مرتبہ درخواست کر چکا کہ اب شرم دامن گیر ہوتی ہے۔ اب میں مطمئن ہوں اور حکمِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں۔''

نبوّت کے بارے میں اسلامی تعلیمات پر بحث و مباحثہ کا موقع ہو تو آج کے مسلمانوں کے جذبات فوراً بیدار ہو جاتے ہیں۔ اس کا مرکزی سبب غالباً یہ ہے کہ بہت سے اسلامی ممالک میں مذہب روزمرہ زندگی میں ایک بہت بڑا کردار ادا کرتا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں ایسا نہیں ہوتا۔ چنانچہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ سیاسی آرا کو بھی مذہبی اصطلاحات میں ڈھال دیا جاتا ہے، اور دوسرے ممالک کی پالیسیوں کی تنقید دوسرے ادیان پر تنقید کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

نبوّت کی بحث میں زیادہ جذباتیت یوں بھی پیدا ہوتی ہے کہ جدیدیت زدہ مسلمان مغرب کے بہت سے لوگوں کی طرح یہ روّیہ ظاہر کرنے لگتے ہیں کہ ان سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوسکتی۔ کمی کوتاہی اگر ہے تو دوسرے لوگوں میں ہے، لہٰذا مسئلہ کیسا ہی کیوں نہ ہو، اس کا دوش ہمیشہ فریقِ مخالف ہی کو دیا جائے گا۔ یہ رویہ ساری دنیا میں عام ہے۔ وہ لوگ جو قصہٴ آدم کی صداقت کا اعتراف کرتے ہیں، ان کے لیے یہ نکتہ نہایت معنی خیز ہے کہ ابلیس وہ پہلی ہستی تھی جس نے دوسرے کو الزام دینے کا وطیرہ اپنایا تھا۔ وہی تو تھا جس نے کہا تھا:

قَالَ فَبِمَآ اَغۡوَیۡتَنِیۡ لَاَقۡعُدَنَّ لَهُمۡ صِرَاطَكَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ (۷:۱٦)

چونکہ تم نے مجھے بھٹکایا ہے اس وجہ سے میں تیری سیدھی راہ پر ان کے لیے گھات میں بیٹھوں گا۔

اگر انسان آدمؑ اور حوّاؑ کے طریقے پر چلے تو اس کی نگاہ اپنی خامیوں پر جائے گی اور وہ یہ اعتراف کرنے کی گنجایش دیکھے گا:

رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا وَ اِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَ تَرۡحَمۡنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ (۷:۲۳)

اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہماری مغفرت نہ فرمائے گا اور ہم پر رحم نہ فرمائے گا تو ہم نامرادوں میں سے ہو جائیں گے۔

یہ مت سمجھیے کہ ابلیس کا یہ روّیہ صرف سیاست میں نظر آتا ہے۔ یہ تو ہم سب کا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ مثال کے طور پر یہ دیکھیے کہ جب طالب علموں کے لیے امتحان کے نتیجے کا اعلان ہوتا ہے تو وہ کیا کرتے

ہیں۔ اکثر آپ انھیں یہ کہتا پائیں گے: ''فزکس میں تو مجھے A گریڈ ملا ہے لیکن انگلش کے اس بے ہودہ ٹیچر نے مجھے C دے دیا ہے۔'' یہ ابلیس کا ردِّ عمل ہے، یعنی میں تو نورانی ہوں اس نے مجھے گمراہ کر دیا۔ میں تو بھلا آدمی ہوں یہ خرابی برائی کسی اور کی غلطی کا نتیجہ ہے۔ ایسے کسی موقع پر آدمؑ اور حوّاؑ ہوتے تو یوں کہتے: ''فزکس کے استاد کی مہربانی ہے مجھے A گریڈ مل گیا، لیکن انگلش میں، مَیں نے گڑبڑ کر دی، اسی لیے میرا C گریڈ آیا ہے۔ اب میں پہلے سے زیادہ محنت کروں گا تا کہ اس کمی کوتاہی کی تلافی ہو جائے۔''

مختصراً یہ کہ معاصر صورتِ حال میں نظریاتی بحثوں کو عموماً اس انداز میں پیش کیا جاتا ہے گویا خیر و شر میں معرکہ آرائی ہو رہی ہے۔ صورت حال اس طرح کی ہو تو پھر ان لوگوں کی بات پر کان دھرنے والے کم ہی نکلتے ہیں جو قرآن مجید کے پیغام کی کائناتی اور عالمگیر حیثیت پر زور دے رہے ہوں۔ دوسرے شخص کو قصوروار اور خود کو بے خطا جاننا بہت آسان کام ہے۔ اس طرح سوچنا ہو تو پہلے یہ بھولنا پڑتا ہے کہ اللہ کی رحمت ساری مخلوقات پر پھیلی ہوئی ہے۔ انسان کو اگر یاد رہے کہ اللہ کی رحمت اس کے غضب سے بڑھی ہوئی ہے تو وہ اپنے گریبان میں بھی جھانکنے کی کوشش کیا کرے، اپنی کوتاہیوں پر بھی غور کرے اور دوسروں کو اللہ کے سپرد کر دے۔ پھر انھیں شاید یہ قبول کرنا پڑے کہ C بھی ایک انعام سے کم نہیں تھا، وہ تو فیل ہونے کے لائق تھے۔

یہودیت اور عیسائیت

تاریخ انسانی میں انبیا کا کردار جس طرح مذکور ہوا ہے وہ بہت پُر معنی اور تہ دار ہے۔ اس میں معانی کی کتنی ہی سطحیں ہیں۔ قرآنی آیات کی بنیاد پر نہ تو یہ دعویٰ کرنا ممکن ہے کہ پیغام حق پر اسلام کی اجارہ داری ہے، نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دوسرے ادیان ایک غیر مشروط انداز میں وسیلۂ نجات valid ہیں۔ معاملہ یوں ہے کہ سبھی انبیا اللہ کی طرف سے پیغامِ حق لے کر آئے، لیکن ان کے پیروکاروں نے ان کی لائی ہوئی تعلیمات پر عمل کرنے میں اکثر کوتاہی کی۔ ابتدائی عہدِ اسلام کے مسلمانوں کو جن دو مذاہب کے ماننے والوں سے سابقہ پڑا تھا، ان پر قرآن نے اکثر تنقید کی ہے۔ قرآن کا کہنا ہے کہ بہت سے یہودیوں اور عیسائیوں نے اس پیغامِ حق کے مطابق زندگی نہیں گذاری جو ان کو اللہ کی طرف سے عطا ہوا تھا۔ تاریخ کے ہر دور میں عیسائی اور یہودی مصلحین نے اپنی اپنی قوم کو یہی ملامت کی ہے۔

بہت سے مسلمان اسی بات کے سہارے دیگر تمام ادیان کے بارے میں یہ عالمگیر فیصلہ صادر کر دیتے ہیں کہ اب روئے ارض پر صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو اللہ کا نازل کردہ اور قابلِ عمل

(valid) ہے اور یہ نکتہ بھول جاتے ہیں کہ ہمارے پاس یہ فرض کر لینے کی کوئی واقعی بنیاد موجود نہیں کہ اسلام کو بھی زوال اور انحراف کی انھی صورتوں کا سامنا نہیں کرنا ہوگا جو اس سے پہلے کے ادیان کو درپیش ہوئیں۔ بعض مسلمان اس طرح کی تنقیدی آرا سے اتفاق نہیں رکھتے جو ہر کینڈے کے بنیاد پرست اپنے مزعومہ دشمنوں کے خلاف ظاہر کرتے رہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ آج کے مسلمان ہوں یا گذرے ہوئے وقتوں کے، ان میں اسلام اور دوسرے ادیان کے مسئلے پر کوئی اتفاق رائے نظر نہیں آتا، تاہم قرآن مجید اور مستند تفاسیر میں ایک ایسے نقطۂ نظر کی وافر گنجایش ملتی ہے جو مسئلے کی نزاکت اور تہ داری کو پوری طرح ملحوظ رکھ کر اس پر کلام کرتا ہے۔ قرآن مجید میں دو مقامات پر انبیا کے لائے ہوئے ادیان کے بارے میں عمومی تبصرہ ملتا ہے۔ آیت یوں ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡ وَالَّذِیۡنَ هَادُوۡا وَالنَّصٰرٰی وَ الصّٰابِئِیۡنَ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ وَ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَلَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ (۲:۶۲، ۵:۶۹)

بے شک جو لوگ مسلمان ہوئے، اور جو لوگ یہودی ہوئے اور عیسائی اور صابئین، جو کوئی یقین لایا اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور جس نے نیک کام کیے تو ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لیے نہ کوئی ڈر ہے نہ وہ کسی بات کا غم کھائیں گے۔

قارئین اب تک کی معروضات کی روشنی میں یہ اندازہ بخوبی کر سکتے ہیں کہ ان آیات میں کلیدی مسئلہ اللہ پر ایمان کا ہے۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے ایمان باللہ کا تقاضا ہے ''توحید'' اور ''توحید'' تمام انبیا کا پیغام ہے۔ ''توحید'' کا اثبات جتنا مستحکم ہوگا، آخرت کی کامیابی اتنی ہی یقینی ہوگی۔ پہلی شہادت جس کے وسیلے سے ''توحید'' کا اظہار و بیان عمل میں آتا ہے، اس قدر اہم ہے کہ مستندترین مآخذ میں سے ایک میں پائی جانے والی مندرجہ ذیل حدیث میں یوں آیا ہے: مَنۡ مَاتَ وَ هُوَ یَعۡلَمُ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الۡجَنَّةَ (جو شخص یہ جانتے ہوئے موت سے ہم کنار ہوا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں تو وہ جنت میں داخل ہوگا)۔ [۴۹]

غور کیجیے کہ حدیث میں ایمان کا مذکور نہیں ہے۔ ''توحید'' کا ''علم'' رکھنا کافی ہے۔ ایک اور حدیث میں یہی نکتہ بیان ہوا ہے۔ روز قیامت اللہ تعالیٰ کے سامنے میزان میں اچھے برے اعمال تولے جائیں گے۔ ترازو کے ایک پلڑے میں ہر شخص کے اچھے اعمال اور دوسرے پلڑے میں برے

عمل رکھے جائیں گے۔ فیصلے کے لیے ایک ایسا شخص لایا جاتا ہے جس کے نامۂ اعمال کے ننانوے دفتر برے کاموں سے بھرے ہوئے ہیں:

''اللہ تعالیٰ فرمائیں گے، تجھے کوئی شکایت تو نہیں۔ میرے لکھنے والوں نے تیرے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں کی؟

وہ جواب دے گا: ''نہیں میرے رب۔''

اللہ تعالی پوچھیں گے کہ تمھارے پاس اس بداعمالی کا کوئی عذر ہے؟ اس پر وہ شخص کہے گا کہ نہیں میرے مالک۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہمارے حساب میں تمھارا ایک نیک عمل لکھا ہوا ہے اور آج کے دن تم پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔

پھر ایک نامۂ اعمال لایا جائے گا جس میں لکھا ہوگا: ''اشہدان لا الٰہ الا اللہ واشہدان محمد عبدہ ورسولہ۔''

اللہ تعالی کہیں گے میزان کے لیے آگے بڑھو۔ وہ شخص اپنے رب سے استفسار کرے گا کہ اس کے دفترِ عمل کے ساتھ یہ ایک لکھا ہوا نامۂ عمل کیا ہے اور اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ''تم پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔'' اس کے دفترِ عمل کو ایک پلڑے میں رکھا جائے گا اور دوسرے پلڑے میں وہ نامۂ عمل رکھ دیا جائے گا۔ بدعملی کے ۹۹ دفتر ہلکے اور وہ ایک نامۂ عمل بھاری نکلے گا کہ اللہ کے نام کے برابر اور کسی شے کا وزن نہیں ہوسکتا۔''[۵۰]

جب قرآن مجید دوسرے ادیان کے ماننے والوں پر تنقید کرتا ہے تو اس کا ہدفِ تنقید یہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے ہاں ''توحید'' مسخ صورت میں نظر آرہی ہے۔ یہ تنقید کرتے ہوئے قرآن مجید یہودیت اور عیسائیت کی ان تعلیمات کا حوالہ دیتا ہے جن کو ان ادیان کے سب پیروکار لازماً تسلیم نہیں کرتے۔

ایک سادہ مثال لیجیے۔ عام بات ہے کہ قرآن مجید نے عیسوی تصورِ تثلیث کی تردید کی ہے۔ تثلیث میں جس حد تک ''توحید'' کا انکار پایا جاتا ہے، اس حد تک یہ بات درست ہے، لیکن ہر عیسائی یہ نہیں کہتا کہ تثلیث ''توحید'' کے منافی ہے۔ معاملہ برعکس ہے۔ تصورِ تثلیث کی اکثر تعبیرات اور بیان اس طرح کیے جاتے ہیں کہ اس سے ''توحیدِ خداوندی'' پر زد نہ پڑے۔ اگر ''تین ہونے'' کو وحدت پر ترجیح دی جائے تو قرآن کا اعتراض وارد ہوتا ہے، لیکن یہ نکتہ ایسا ہے کہ تین اور ایک کے تعلق پر عیسائیوں کے اپنے اندر ایک مسلسل مناظرہ چلا آرہا ہے۔ قرآن کی وہ آیات جو تثلیث کے رد میں پیش کی جاتی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ (۵:۷۳)	بے شک کافر ہوئے جنھوں نے کہا کہ اللہ ہے تین میں کا۔

عیسوی عقائد کا ابتدائی علم بھی میسر ہو تو یہ دیکھنا آسان ہے کہ وہاں اللہ تعالیٰ ''تین میں سے ایک'' نہیں ہے، بلکہ وہ بیک آن ایک بھی ہے اور تین بھی۔ جس اعتبار سے وہ تین ہے اس لحاظ سے وہ مخلوقات کے سامنے خود کو تین اقانیم میں ظاہر کرتا ہے۔ باپ، بیٹا اور روح القدس۔ ایک اور قرآنی آیت میں بھی اس سے ملتی جلتی بات کہی گئی ہے:

اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَكَلِمَتُهٗ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِهٖ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ اِنَّمَا اللّٰہُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (۴:۱۷۱)

مسیح، عیسیٰ ابن مریم تو بس اللہ کے ایک رسول اور اس کا ایک کلمہ ہیں جس کو اس نے مریم کی طرف القا فرمایا اور اس کی جانب سے ایک روح ہیں۔ پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور تثلیث کا دعویٰ نہ کرو۔ باز آ جاؤ یہی تمھارے لیے بہتر ہے۔ الٰہ واحد تو اللہ ہی ہے۔

یہاں یہ دیکھیے کہ حضرت عیسیٰؑ کو ان آیات میں ایک نہایت ارفع حیثیت دی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ ان جیسے اوصاف دوسرے انبیا میں نہیں ہیں،[۵۱] لیکن اس آیت میں بھی زور اسی بات پر ہے کہ خدا صرف وہی الٰہ واحد ہے۔ اگر حضرت عیسیٰؑ پر ایمان تین خداؤں کے اعتراف تک لے جائے تو قرآن اسے رد کر دیتا ہے، لیکن یہاں بھی مسئلہ یہ ہے کہ اصل عیسائی موقف نہایت پیچیدہ اور لطیف ہے اور شاید ہی کوئی عیسائی ایسا ہوگا جو یہ ماننے پر آمادہ ہو کہ وہ ایک خدا کے سوا کسی اور پر ایمان رکھتا ہے۔

بعض مسلمان مفسرین نے لکھا ہے کہ اگر ''تین میں سے تیسرا'' ہونے کا عقیدہ نہ رکھا جائے تو ''تین'' کہنے میں کوئی حرج نہیں۔ اگر کسی نے یوں کہا کہ اللہ تعالیٰ ''دو'' کے علاوہ تیسرا ہے تو یہ درست ہوگا۔ قرآن میں آیا ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ يَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ

کیا جانتے نہیں کہ اللہ جانتا ہے اس سارے کو جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے؟ نہیں ہوتی کوئی سرگوشی تین کے درمیان مگر ان کا چوتھا اللہ ہوتا ہے اور نہ پانچ کے مابین مگر چھٹا وہ ہوتا ہے اور نہ اس سے کم یا زیادہ

الْقِيٰمَةِ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ (۵۸:۷) کی مگر وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جہاں بھی وہ ہوں۔ پھر وہ ان کو ان کے سارے کیے سے آگاہ کرے گا، قیامت کے دن۔ بے شک اللہ ہر بات کا علم رکھنے والا ہے۔

ایک اور عیسوی تصور پر قرآن نے شدید اعتراض کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ مسیحؑ کو اللہ کا بیٹا کہا جائے۔ تثلیث کے رد میں جو آیت ہم نے ابھی درج کی، اس میں آگے چل کر یوں آیا ہے:

سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ (۴:۱۷۱) وہ اس سے پاک ہے کہ اس کے اولاد ہو۔

ایک اور مقام پر قرآن میں اس طرح کہا گیا ہے:

اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۶:۱۰۲) اس کے اولاد کہاں جب کہ اس کی کوئی بیوی نہیں۔ اور اس نے ہر چیز پیدا کی اور وہ ہر چیز سے باخبر ہے۔

قرآن میں اس لفظ کا استعمال اور مسلمانوں کا عمومی فہم اس بات پر دال ہے کہ ''بیٹا'' کے لفظ کو مسلمان کسی استعاراتی یا مجازی اور علامتی معنوں میں نہیں سمجھتے۔ اس کے لیے ان کے معنی ہیں صلبی فرزند، جسے ماں نے جنم دیا، یعنی وہ خدا کی مفروضہ مؤنث ساتھی سے پیدا ہوا ہو۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ بعض عیسائی یہی عقیدہ رکھے ہوئے ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے کوئی زوجہ منتخب کر لی یا یہ کہ اس سے کسی طرح سیدہ مریمؑ کو حمل ٹھہرا اور بچے کی ولادت ہوئی، لیکن عیسوی دینیات میں کسی عالمِ دین نے آج تک اس طرح نہیں سوچا۔ ان کے لیے حضرت عیسیٰؑ کا بیٹا ہونا حقیقت ہے، مگر اس کو ایک جسمانی مفہوم میں لینا ممکن نہیں۔ سیدہ مریمؑ کو اکثر ''مادرِ خداوند'' Mother of God کہا جاتا ہے۔ اس سے بھی مسلمانوں کے ذہن میں الجھن بڑھ جاتی ہے کہ ان کے سامنے یا تو صرف قرآن کی آیات ہوتی ہیں یا ایک اجنبی مذہب کے بارے میں عوامی غلط فہمیوں کا مجموعہ۔

یہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ بیٹا ہونے کا مطلب مسلمان بالکل لفظی معنی میں لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن مجید کی مختصر ایک سو بارہویں سورۃ دیکھیے جسے اکثر ''سورۃ توحید'' بھی کہا جاتا ہے۔ ولدیت اور فرزندی کے بارے میں جو بھی غور کرے گا، جلد ہی یہ سمجھ لے گا کہ یہ دونوں اصطلاحات اضافی ہیں۔ ہر فرزند (کم از کم امکان کی حد تک) والد بھی ہے، اور ہر باپ باپ ہونے کے علاوہ بیٹا

بھی۔اس سے صرف ایک استثنا ہے: حضرت آدم علیہ السلام۔غور کیجیے کہ اس سورۃ میں توحید کا اثبات کرتے ہوئے قرآن مجید نے صرف یہ خیال ہی رد نہیں کیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں، بلکہ اس سے جڑے ہوئے ایک دوسرے غلط عقیدے کی نفی بھی کردی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کا جنا ہوا ہو سکتا ہے، مسلمان کی نگاہ میں یہ ایک سراسر لغو اور بے ہودہ خیال ہے:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ، اَللّٰهُ الصَّمَدُ، لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَد، وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (۱۱۲)

تم اعلان کرو، اے پیغمبر کہ وہ اللہ سب سے الگ ہے، اللہ سب کا سہارا ہے۔ وہ نہ باپ ہے نہ بیٹا اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے۔

یہودیوں اور عیسائیوں کو قرآن مجید میں ایک اور بات کے لیے اکثر ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے۔ان کا جرم یہ بیان ہوا ہے کہ انھوں نے اپنی مقدس کتابوں میں تبدیلیاں کر دیں اور اس طرح انبیا کے لائے ہوئے پیغامات کو بے نتیجہ اور خراب کر کے رکھ دیا۔قرآن مجید کی آیات سے دیگر آسمانی کتابوں کے بارے میں جو بات سامنے آتی ہے، وہ اس سے کہیں زیادہ پہلو دار ہے جتنا کہ مسلمان عموماً تسلیم کرتے ہیں۔عربی کا کلیدی لفظ جو اس ضمن میں استعمال ہوا ہے، وہ ہے ''تحریف۔'' اس کا مطلب ہے کسی چیز کو اس کے صحیح راستے سے ہٹا دینا، مسخ کرنا، بدل دینا۔ذرا دیکھیے کہ مندرجہ ذیل قرآنی آیات کا اشارہ آسمانی کتابوں کے اصلی ''متن'' کی جانب ہے یا اس سے مراد ان صحیفوں کی ''شرح و تعبیر'' لی جا رہی ہے۔مفسرین قرآن نے دونوں موقف اختیار کیے ہیں، لہٰذا آیات کی معنویت کو سمجھنے کے لیے مسلمانوں کے پاس مختلف آرا پائی جاتی ہیں۔

مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا......وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ (٤:٤٦)

یہود میں سے ایک گروہ، زبان کو توڑ مروڑ اور دین پر طعن کرتے ہوئے، الفاظ کو ان کے موقع و محل سے ہٹا دیتا ہے اور ''سمعنا وعصینا'' (ہم نے سنا اور نہ مانا) کہتا ہے۔.... اگر وہ ''سمعنا واطعنا'' (ہم نے سنا اور مانا) کہتے تو ان کے حق میں بہتر ہوتا۔

غور کیجیے کہ اس آیت میں قرآن مجید نے کوئی عمومی فیصلہ صادر نہیں کیا، بلکہ یہودیت کے ماننے والوں میں سے ''بعض لوگوں'' پر تنقید کی ہے۔اگر معاملہ شرح و تعبیر ہی کا ہے تو اس قول کی صداقت

سے کسے انکار ہوسکتا ہے، کیونکہ ہر دین کے ماننے والے اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے ہم مذہبوں میں سے کچھ لوگ اپنی کتاب کے معنی ومفہوم میں گڑ بڑ کر دیتے ہیں۔ اس ضمن میں قرآن مجید کی ایک آیت درج ذیل ہے:

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا (۵:۱۳)

پس ان کی عہد شکنی کی وجہ سے ہم نے ان پر لعنت کر دی اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔ وہ کلام کو اس کے موقع ومحل سے ہٹاتے ہیں اور جس چیز کے ذریعے سے ان کو یاددہانی کی گئی تھی اس کا ایک حصہ وہ بھلا بیٹھے۔

اس آیت میں قرآن مجید نے ہدایت اور گمراہی کو صحیفۂ خداوندی کے متن میں تحریف کرنے سے متعلق کیا ہے۔ یہود میں سے وہ جو اللہ سے وعدہ کر کے اس سے پھر گئے تھے، ان کے دل عذابِ الٰہی کی وجہ سے سخت ہو گئے۔ دل کا سخت ہونا وہ اصطلاح ہے جو قرآن مجید نے ان تمام نتائج اور خرابیوں کی طرف اشارہ کرنے کے لیے استعمال کی ہے جو اللہ سے روگردانی کرنے والے لوگوں کا مقدر ہو جاتی ہے۔ عام طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے مراد ہے عقل کا کند ہو جانا اور اللہ تعالیٰ کی رحمت، کرم اور جمال کی صفات سے تعلق کمزور پڑ جانا۔ وہ جن کے دل سخت ہو جاتے ہیں وہ اللہ سے مزید دور ہو جاتے ہیں اور زیادہ گمراہی میں دھنس جاتے ہیں۔ پس وہ اپنے صحیفوں کے معانی میں تحریف کرنے لگتے ہیں۔ انبیا ان کو اللہ کی یاد دلانے کے لیے آئے تھے، لیکن ان لوگوں نے انبیا کے پیغام کا کچھ حصہ فراموش کر دیا۔ فراموش گاری کے اس عمل کا ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کی مقدس کتاب کا کچھ حصہ ضائع ہو چکا، لیکن زیادہ امکان یہ ہے کہ اس سے اشارہ صرف اس امر کی طرف ہے کہ یہ سخت دل لوگ ذکرِ خداوندی کے معانی کو ''سمجھنے'' سے محروم ہو چکے تھے، یعنی یہ بھول گئے کہ پیامِ خداوندی اسی صحیفے کے قالب میں عطا ہوا ہے۔

اسی موضوع کی ایک اور آیت میں قرآن مجید نے رسولِ خداؐ کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آپ کے اردگرد جو یہود ہیں، وہ اگر آپ کے پیغامِ ہدایت پر کان نہیں دھر رہے تو آپ ان کے لیے دلگیر نہ ہوں:

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْ

کیا تم لوگ یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ لوگ تمھاری بات مان لیں گے اور حال یہ ہے کہ ان میں

بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ (۲:۷۵) سے ایک گروہ اللہ کے کلام کو سنتا رہا ہے اور اس کو سمجھ چکنے کے بعد اس کی تحریف کرتا رہا ہے اور وہ جانتے ہیں۔

اس آیت میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اگر صحیفۂ خداوندی میں اپنے من چاہے معانی تلاش کرنے کی پرانی عادت ترک نہ کی جائے تو اسلام قبول کرنا کافی نہیں ہوگا، لیکن یہاں بھی وہی معاملہ ہے کہ آیت میں موردِ عتاب ''ان میں ایک گروہ'' ہے۔ سارے یہود اس کے مخاطب نہیں ہیں۔

بعض مسلمان علمائے الٰہیات کی مناظرے کی حس قدرے زیادہ بیدار تھی۔ ان حضرات نے تورات وانجیل میں اس نظر سے تحقیق کی کہ یہود ونصاریٰ کے تحریفِ صحائف کے ثبوت تلاش کیے جائیں۔ اس سلسلے کا پہلا مفصل اور منظّم تحقیقی کام اندلس کے مشہور عالم ابن حزم (م ۴۵۶ھ/۱۰۶۴ء) نے انجام دیا تھا۔ خدا کی کتاب کا تصور اسلام اور یہود و نصاریٰ میں مختلف ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ عیسوی اور یہودی مصاحف میں طرح طرح کی بہت سی کتب شامل ہیں جو الگ الگ زمانوں میں اور مختلف نقطہ ہائے نظر سے لکھی گئیں۔ ان دونوں امور کو سامنے رکھیے تو یہ دیکھ کر تعجب نہیں ہوگا کہ مسلمان علما کو جرح ونقد کا بہت سا مواد دستیاب ہوا۔ مزید برآں یہ ناقدین اکثر انھی باتوں کو دہراتے رہے ہیں جو عیسائی فرقوں کے باہمی مناظرات کی تحریروں میں پہلے سے ملتی تھیں یا پھر انجیل کے ان ناقدین کی لکھی ہوئی تھیں جن کی اکثریت اسلام سے پہلے ہو گذری تھی۔ ان میں Samaritans، یہود کا پس منظر رکھنے والے۔ عیسائی، Gnostics، Karaites، یونانی فلاسفہ اور مانویت کے ماننے والے سبھی شامل تھے۔ اسلام کے بارے میں لکھنے والے بعض مورخین نے تو یہاں تک کہا ہے کہ عہدِ جدید میں انجیل کے جو تنقیدی مطالعات ہوئے ہیں اور جو انجیل کے بارے میں مسلمانوں سے بڑھ کر شدت سے تنقید کرتے رہے ہیں، ان کے بہت سے خیالات کا ماٴخذ مسلمانوں کی یہی مناظرانہ تحریریں ہیں۔[۵۲]

قرآن مجید میں پیغمبروں کے ذریعے آنے والے پیغامِ خداوندی کو بالعموم ''کتاب''، یعنی مصحف یا صحیفہ کا نام دیا گیا ہے، اس لیے کسی ایک نبی کے ماننے والوں کو ''اہلِ کتاب'' کے عنوان سے یاد کیا جاتا ہے۔ قرآن میں تیس مقامات پر اہلِ کتاب کا لفظ استعمال ہوا ہے اور ان میں سے اکثر آیات کو پڑھنے سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اشارہ یہود ونصاریٰ کی طرف ہے کہ یہی دو وادیان ایسے تھے جن کے ماننے والوں سے ابتدائی زمانے کے مسلمانوں کا سامنا ہوا تھا۔ دو آیات میں اسی مفہوم کو ادا کرنے

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۔ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِىْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَمَاۤ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۳:۶۴-۶۵)

کہ دو: اے اہلِ کتاب! اس چیز کی طرف آ ؤ جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں مشترک ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی اک دوسرے کو اللہ کے سوا رَب ٹھہرائے۔ اگر وہ اس سے منہ موڑیں تو کہ دو کہ گواہ رہو کہ ہم تو مسلم ہیں۔ اے اہلِ کتاب! تم ابراہیم کے بارے میں کیوں حجت کرتے ہو، درآنحالیکہ تورات اور انجیل نہیں نازل کی گئی مگر اس کے بعد! کیا تم اس بات کو نہیں سمجھتے؟

قرآن مجید کی بہت سی اور آیات میں بھی یہودیت اور مسیحیت کا مذکور ہے، مگر ان سب کا جائزہ ایک الگ کتاب کا تقاضا کرتا ہے۔ اس ضمن میں ایک عمومی تصویر کھینچنے کے لیے جس قدر درکار تھا، وہ ہم نے پیش کر دیا ہے۔[۵۳]

عیسوی اور اسلامی نقطۂ نظر کے درمیان فرق واضح کرنے کے لیے ایک نکتے پر البتہ کچھ اور وضاحت درکار ہو گی۔ عیسائیوں کے لیے ''کلمۃ اللہ'' the Word حضرت عیسیٰؑ کی ذات ہے — ''اللہ کا کلمہ بدن کے قالب میں'' (Word made flesh)۔ اناجیلِ مقدس وہ الہامی کتب ہیں جو سیدنا عیسیٰؑ کے بارے میں لکھی گئیں۔ عہد نامۂ جدید سارے کا سارا کلمۂ خداوندی کا رنگ لیے ہوئے ہے، لیکن سیدنا عیسیٰؑ کے مقابلے میں یہ سب کتب ثانوی حیثیت رکھتی ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کلمۂ مجسّم ہیں۔ عہد نامۂ جدید کے بغیر عیسائیت کا تو تصور کیا جا سکتا ہے جس کو زبانی روایتِ مصحف کا سہارا میسر ہو، لیکن عیسائیت ہو اور حضرت عیسیٰؑ نہ ہوں یہ نا قابلِ تصور ہے۔

مسلمانوں کے لیے کلام اللہ قرآن ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پیغمبر۔ یہ درست ہے کہ وہ کامل انسان، خلیفۃ اللہ اور وہ نمونہ اور اسوہ ہیں جس کے اتباع کے لیے اللہ نے لوگوں کو حکم دیا ہے، مگر یہاں اللہ کا پیغام اولین حیثیت رکھتا ہے، اس کا لانے والا نہیں۔ اسلام کا تصور رسولِ خداؑ کے

بنا تو ممکن ہے، لیکن قرآن کے بغیر اسلام کا تصور کرنا بعید از خیال ہے۔

مسلمان دوسرے مذاہب کو اسلام کے پیمانے پر پرکھتے ہیں جو ان کی نگاہوں میں دین کامل ہے۔ دوسرے مذاہب کے ماننے والے ظاہر ہے کہ اپنے نقطۂ نظر سے نگاہ کرتے ہیں۔ یہ وصف مسلمانوں ہی سے خاص نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو توقع ہوتی ہے کہ دوسرے ہر مذہب کی بھی قرآن کی طرح کی کتاب ہوگی۔ یہ خیال قرآن مجید کی وجہ ہی سے ان میں پروان چڑھتا ہے، کیونکہ قرآن میں تورات وانجیل کا بار بار ذکر آیا ہے، لیکن غور کیجیے کہ قرآن میں انجیل کا ذکر ہمیشہ صیغہ واحد میں آیا ہے، جمع میں نہیں۔ قرآن نے یہ بات بار بار دہرائی ہے کہ سیدنا مسیحؑ پیغمبرِ خدا، انجیل کا پیغامِ ہدایت لے کر آئے تھے، ایسے ہی جیسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید دیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان اناجیلِ اربعہ (Four Gospels) کا ذکر آتے ہی فوراً کھٹک جاتے ہیں۔ صحیفۂ خداوندی سے متعلق انسانی اور ربّانی عناصر کے بارے میں نقطۂ نظر کا بھی فرق ہے جس سے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان ختم نہ ہونے والی غلط فہمیوں کا سلسلہ چلا آ رہا ہے۔

دیگر ادیان بالخصوص یہودیت اور عیسائیت کے بارے میں اسلام کے نقطۂ نظر کو بطور خلاصہ بیان کرنا ہو تو یوں کہا جا سکتا ہے: قرآن مجید پڑھتے ہوئے بہت سے مسلمان ان آیات پر زور دیتے ہیں جن میں دوسرے ادیان پر تنقید کی گئی ہے اور وہ آیات نظر انداز کر دیتے ہیں یا ان کی تاویل کر لیتے ہیں جن میں دیگر ادیان کے بارے میں تعریفی کلمات آئے ہیں۔ اس بات سے انکار نہیں ہے کہ بعض قرآنی آیات سے اسلام کے واحد دینِ برحق کا مفہوم پوری شدت سے ظاہر ہوتا ہے، تاہم کتنی ہی دیگر آیات ایسی ہیں جن کے مفہوم میں اتنی وسعت ہے کہ دیگر مذاہب کے لیے ایک کھلے رویّہ کی گنجایش اور سمائی ہو سکتی ہے۔ اس مسئلے پر مسلمانوں کے جو موقف سامنے آتے ہیں، ان کا دارومدار بڑی حد تک اس بات پر ہوتا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ کی حقیقت کے بارے میں ان کا فہم کیسا ہے۔ وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ کی رحمت اس کے غضب سے واقعی بڑھی ہوئی ہے اور ان سب لوگوں کو اپنے دامانِ رحمت میں سمیٹے ہوئے ہے جو ہدایتِ خداوندی کی پیروی کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے لیے تمام ادیان کو ربّانی پیغامِ ہدایت کے طور پر دیکھنا کوئی مشکل نکتہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس وہ لوگ جو اللہ کا تصور ایک سخت گیر، متلوّن اور مزاج دار آقا کے طور پر کرتے ہیں، ایسا آقا جو احکام صادر کرتا رہتا ہو اور ان احکامات کی فوری تعمیل اور بے چوں و چرا پابندی کا منتظر ہو، انھیں یہ خیال زیادہ راحت بخش محسوس ہوتا

ہے کہ صرف وہی (ان کا مذہبی گروہ، ان کی سیاسی جماعت) اللہ کے ہاں مقبول ہیں۔

پیغامِ حق کی اجارہ داری کے دعووں کے مقابل بسا اوقات بہترین رویّہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا سامنا ایک خندۂ وافر سے کیا جائے اور معاملے کو اللہ پر چھوڑ دیا جائے۔ اسی نیت سے ہم اس حصے کا اختتام ایک حکایتِ لطیف پر کرتے ہیں۔ اس کے راوی ایک عالمِ دین ہیں جن سے برسوں پہلے ہم نے یہ حکایت سنی تھی۔

دو ایرانی علمادین پر گفتگو کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے دوسرے سے سوال کیا: ''تو پھر آخرالامر کون جنت کا حقدار ہوگا؟'' دوسرے صاحب شاعر تھے اور اپنی حسِ مزاح کے لیے بھی معروف تھے۔ وہ جواب میں گویا ہوئے: ''بھئی، یہ تو بہت سادہ سی بات ہے۔ اسلام کے سوا دیگر تمام ادیان جھوٹے ہیں، لہٰذا ان کو تو چھوڑیے ایک طرف۔ رہ گیا اسلام، اب اسلام میں بعض سنّی مسلمان ہیں بعض شیعہ۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ سنّی راہِ راست سے بھٹک گئے ہیں، لہٰذا ان سبھوں کو جہنم میں ڈالا جائے گا۔ باقی بچے شیعہ مسلمان۔ اب ان میں دو طرح کے لوگ ہیں، عوام اور علما۔ سب جانتے ہیں کہ عوام اللہ سے غافل اور دین سے لاپروا ہوتے ہیں، سو ان کو تو آگ میں جلایا جائے گا۔ رہ گئے علما سو وہ عالم بنے ہی اس لیے ہیں کہ عوام پر حکم چلا سکیں تو جہاں پر جاو وہاں راجا۔ باقی بچے تم اور میں۔ سو تمھارے بارے میں بھی ٹھیک سے کچھ کہنا مشکل ہے۔''

کیا آپ کو یہ طرزِ استدلال مانوس نہیں لگتا؟ کچھ بہت غلط نہ ہوگا، اگر ہم یہ کہیں کہ ہمارے معاصرین میں سے بہت سے لوگ اسی انداز میں سوچتے ہیں خواہ وہ مسلمان ہوں، عیسائی اور یہودی ہوں، علما اور سائنس دان ہوں، سیاست دان ہوں یا کچھ اور۔ یاد رہے کہ یہ موقف ابلیس کے موقف سے خاصا ملتا جلتا ہے جس کا دعویٰ تھا ''انا خیر منہ'' (میں اس سے بہتر ہوں)۔

القرآن The Quran

اس کتاب کے آغاز ہی سے ہم قرآن کی خاص حیثیت پر زور دیتے آئے ہیں۔ اسلام کے معنی اور اس کے مراسم و عبادات کو متعین کرنے میں قرآن مجید کا جو حصہ ہے، وہ حتمی اور ناگزیر ہے۔ قرآن پیغامِ حق ہے اور پیغامِ حق اسلام ہے، لیکن اگر اس پیغام کو چند لفظوں میں بیان کرنا ہو تو کیسے کیا جائے گا۔

قرآن اپنے بارے میں جو کچھ کہتا ہے، اپنی تعریف جس طرح متعین کرتا ہے اس سے اسلام کے تصورِ نبوّت کی اساسیات کے بارے میں ایک نظر پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک طرف تو قرآن نے اپنے

بارے میں جو کچھ کہا ہے، اس کا اطلاق الہامی کتابوں پر بھی ہوتا ہے اور دوسری جانب قرآن اپنے آپ کو دیگر تمام کتب سے برتر قرار دیتا ہے۔ پس اپنے بارے میں قرآن نے جو کچھ کہا، اس سے دونوں تصورات کو بنیاد ملتی ہے کہ اللہ کے پیغامِ ہدایت عام اور عالمگیر ہوتے ہیں اور ان میں بعض اپنی ایک خاص شان بھی رکھتے ہیں۔ قرآن نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا ہے، اسے سمجھنا ہو تو بہترین طریقہ یہ ہے کہ قرآن نے اپنے لیے جو اسما و صفات برتے ہیں، ان کے مفاہیم اور مدلولات پر غور کیا جائے۔

قرآن کے متن میں خود ''قرآن'' کا لفظ ستر دفعہ آیا ہے۔ اس کا مصدر وہ مادہ ہے جس کے دو بنیادی معانی بظاہر ایک دوسرے سے غیر متعلق لگتے ہیں۔ ایک معنی ہیں ''پڑھنا'' اور دوسرے ''یکجا کرنا، اکٹھا کرنا۔'' عام طور پر ''قرآن'' کے نام کے معنی ''پڑھنا، قراءت'' بتائے جاتے ہیں۔ ایک معروف روایت کے مطابق قرآن کا پہلا لفظ جو رسول خدا پر وحی کے طور پر اترا، وہ تھا ''اقرا'' (پڑھیے)۔ یہ لفظ اسی سہ حرفی مادے سے امر کا صیغہ ہے:

اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِىۡ خَلَقَ ، خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ ، اِقۡرَاۡ وَرَبُّكَ الۡاَكۡرَمُ ، الَّذِىۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ ، عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ يَعۡلَمۡ (۹۶:۱-۵)

انھیں پڑھ کر سناؤ (اے پیغمبر)! اپنے اس پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا ہے۔ لہو کی ایک پھٹکی سے انسان کو پیدا کیا ہے۔ انھیں پڑھ کر سناؤ اور واقعہ یہ ہے کہ تمھارا رب بڑا ہی کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے (یہ قرآن) سکھایا انسان کو اس میں وہ علم دیا جسے وہ نہیں جانتا تھا۔

ان چند آیات سے ہمیں نہ صرف ''قرآن'' کے نام کی جڑ بنیاد کا پتا چل جاتا ہے، بلکہ انسان اور خدا کے مابین جو ایک لازمی اور اساسی تعلق ہے، اس کا نقشہ بھی سامنے آ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کا خالق ہے جس نے اپنے کرم اور رحمت سے انسان کو اس کی منزلِ آخرین کی حقیقت کا علم دیا اور اس طرح اسے راہِ تکمیل کے لیے ہدایت فراہم کی۔

اس نام ''قرآن'' میں ایک اور اہم نکتہ مضمر ہے جس کی معنویت کو جدید دنیا میں رہنے والوں کے لیے گرفت میں لانا دشوار ہے۔ قرآن سب سے پہلے ایک ''تلاوت کردہ'' کتاب ہے، ''کتابِ خواندگی'' ہے۔ اسے پڑھ کر سنایا گیا۔ اس کا لکھنا، اس کی تحریری صورت تو محض سہولت کے لیے اور

انسانی کمزوری کی رعایت رکھتے ہوئے وجود میں آئی ہے۔ قرآن کو خدا کے فرشتے حضرت جبرئیل نے رسولِ خداؐ کو پڑھ کر سنایا۔ آپؐ نے اسے یاد کرلیا اور اپنے ساتھیوں کے سامنے پڑھا۔ صحابہؓ نے آپؐ سے سن کر یاد کیا۔ جو لوگ لکھنا جانتے تھے، انھوں نے لکھ بھی لیا۔ وہ جن کے حافظے ابھی لکھے ہوئے حرف پر انحصار کرنے سے بے قوت نہیں ہوئے تھے، قرآن کو زبانی یاد کرتے رہے۔ اس زمانے کے عربوں کو اپنی یادداشت پر اتنا ناز تھا اور انھیں ہر اہم بات کو یاد رکھنے کی ایسی پختہ عادت تھی کہ ان میں سے اکثریت نے متنِ قرآنی کو کبھی کاغذ پر لکھنے کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔ رسولِ خداؐ کی وفات کے کئی سالوں بعد لوگوں نے اس جانب توجہ کی کہ اسلام کا ماحول تیزی سے بدل رہا ہے اور نئے حالات میں خطرہ تھا کہ قرآن کے متن کے کچھ حصے ضائع ہو جائیں یا ان میں غلطیاں در آئیں۔ لہٰذا مسلمانوں کے رہبرِ وقت نے قرآن مجید کے تحریری نسخے تیار کر کے عالمِ اسلام کے مختلف مقامات پر ارسال کرنے کا حکم دیا تا کہ ان سرکاری نسخوں سے ملا کر سب لوگ اپنے نسخے درست کر سکیں۔

آج ہم جس معاشرے میں زندہ ہیں، وہ قوتِ حافظہ کھو چکا ہے۔ ہمارا تمام تر انحصار تحریر پر ہے یا پھر ہم سیکھنے سکھانے اور معلومات فراہم کرنے کے لیے برقی (الیکٹرونک) آلات کے محتاج ہیں۔ ساری دنیا میں تحریری زمانے سے پہلے کے تمام معاشروں میں لوگوں کی قوتِ حافظہ ایسی ہوتی تھی کہ آج اسے سوچ کر بھی دماغ چکرا جاتا ہے۔ یہی نہیں آج ہم خود سے یہ بھی کہتے ہیں کہ چھوڑیے صاحب، یہ کیا لغویت ہے، یادداشت میں محفوظ کرنے کے لیے اتنی مشقت کرنے کا بھلا کیا فائدہ ہے!

ہم بہت سے ایسے حقائق فراموش کر بیٹھے ہیں جن کو گذرے وقتوں میں اسلام ہی میں نہیں، دوسرے معاشروں میں بھی بدیہی سمجھا جاتا تھا۔ ان میں سے ایک حقیقت یہ تھی کہ ہم وہی ہیں جو ہم جانتے ہیں۔ یعنی ہماری شناخت ہمارا علم ہے۔ زندگی کا ایک مقصد ہے اور انسان اس مقصد کے حصول کے لیے اس دنیا میں آیا ہے، لیکن اگر اس مقصد کو جانا ہی نہ جائے تو منزلِ مقصود تک رسائی شاید ہی ممکن ہو۔ اپنے انسان ہونے کے بارے میں جاننا ہو تو اس کے لیے لازمی ہے کہ ماضی کی ہدایتِ خداوندی کو اپنے اندر جذب کیا جائے۔ اس ہدایت کو اپنی آیندہ کی نسل تک منتقل کرنے کا اس سے آسان تر اور کوئی طریقہ نہیں کہ اسے سینہ بہ سینہ یادداشتِ انسانی میں ثبت کر دیا جائے۔ اگر اس ہدایت کو ان کے سینوں میں محفوظ کرنے کے بجائے صرف حیطۂ تحریر میں بند کر دیا جائے گا تو گویا ہم نے تعلیم و تربیت کے فریضے کو خیر باد کہہ دیا۔ اب یہ یقینی ہے کہ سمجھ بوجھ رکھنے والے لوگوں کی اکثریت

جواس پیغام کو قبول کر سکتی تھی، دوسرے کاموں میں الجھ جائے گی اور ایسے کام ان کو اپنی طرف کھینچ لیں گے جو انسانی زندگی کے مقصد سے سرے سے لگّا نہ کھاتے ہوں گے۔ ہم یہ بھی بھول چکے ہیں کہ کسی چیز کو زبانی یاد کرنا کتنا آسان ہوتا ہے۔ خاص طور پر جب اس یادداشت کے طریقے انسانی رہن سہن اور تہذیب میں پہلے سے اپنی جگہ بنائے ہوئے ہوں۔ سبھی لوگ جانتے ہیں کہ بچے اسفنج کی طرح ہوتے ہیں۔ وہ بہت کچھ زبانی یاد کر سکتے ہیں اور کر لیتے ہیں، بلکہ ان کو جس رسمی تعلیم اور پڑھائی کا بوجھ مجبوراً اٹھانا پڑتا ہے، اس کے باوجود بھی وہ اتنا کچھ یاد کر لیتے ہیں۔ اگر ان کی ذہنی پرورش ناقص غذا پر کی جائے تو ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ مزاحیہ کتب کے کرداروں کی نقالی کرنے لگتے ہیں۔ جدید تہذیب سے باہر نکل کر دیکھیے تو بہت سی دیگر تہذیبوں میں بچوں کی ذہنی پرورش کے لیے نہایت اعلیٰ درجے کا روایتی ادب ابتدائے عمر ہی سے پڑھایا جاتا تھا اور وہ یہ سوچتے اور جانتے ہوئے پروان چڑھتے تھے کہ انھیں اپنی زندگیاں رحمت اور حکمت کی عظیم انسانی مثالوں کے نمونے پر ڈھالنے کی ضرورت ہے۔ یہ کتابیں ان کے رگ وپے میں اتر جاتی تھیں اور ساری عمر ان کے لیے ایک کبھی نہ ختم ہونے والے خزانے کا کام دیتی تھیں جس سے وہ ہمیشہ نشاطِ فکر حاصل کرتے رہتے۔

روایتی اسلامی ماحول میں تعلیم کا آغاز قرآن مجید یاد کرنے سے ہوتا ہے کہ یہی حکمت کا بلند ترین درجہ ہے۔ اس کے بعد علم کے کسی بھی شعبے کا انسان رخ کرے، یہ اس کے لیے ایک لازوال سرچشمۂ الہام کا کام دیتا رہتا ہے۔ اسلامی تہذیب کے عظیم ترین اور دانا ترین افراد نے ہمیشہ یہ اعتراف کیا ہے کہ انھیں جو کچھ آتا ہے وہ قرآن مجید کے بحرِ بیکراں کے چند قطروں سے زیادہ نہیں۔

قرآن کے الفاظ کو یاد کرنے اور اس کو اپنے جزوِ ہستی بنانے کا ایک اشارہ تو خود لفظِ قرآن کے معنی میں ملتا ہے۔ قرآن کو پڑھا نہیں جاتا، اس کی قراءت کی جاتی ہے، اس کی تلاوت ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہیے کہ قرآن کو آواز کے ساتھ اس طرح پڑھا جاتا ہے کہ اس کے قدرتی آہنگ کا ظہور ہو سکے۔ پڑھنے والا اس کے زیر و بم کے ساتھ ساتھ آگے پیچھے جھومتا بھی رہتا ہے۔ کسی عالمانہ کتاب کا ایک پیراگراف یاد کرنے کے مقابلے میں ایک گیت یاد کرنا کتنا آسان ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (۵٤:۱۷)

اور ہم نے قرآن کو یاددہانی کے لیے آسان بنایا ہے، تو ہے کوئی سوچنے والا؟

قرآن کو یاد کرنے میں آسانی اس لیے بھی ہو جاتی ہے کہ اس کی آیات میں ایک حسین صوتی

آہنگ اور تناسب پایا جاتا ہے۔قرآن کے ترجمے میں یہ بات پیدا نہیں ہوتی۔

مسلمان یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ قرآن کا ترجمہ نہیں ہوسکتا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان سے عربی میں کلام کیا ہے اور عربی زبان کلمۃ اللہ کا، اللہ کے کلام کا قالب ہے۔جیسا کہ علما نے لکھا ہے اسلام میں کلمۃ اللہ کی تجسیم Incarnation (گوشت پوست میں ڈھلنا) قالب اختیار کرنا enfleshment کا کوئی ذکر نہیں ہوسکتا، یہاں کلام اللہ کتاب کی صورت اختیار کرتا ہے۔اسے ہم ''انکتاب'' enbookment کہہ سکتے ہیں۔اسلام میں کلمۃ اللہ نے گوشت پوست کا قالب اختیار نہیں کیا۔اس کا ''اوتار'' بدنِ انسانی میں نہیں، بلکہ کلمۃ اللہ یعنی کتاب کی صورت میں ظاہر ہوا۔پھر یہ کتاب ان گنت کتب خانوں میں پھیلتی چلی گئی، تاہم اصل کتاب لکھی ہوئی نہیں تھی، اسے پڑھا اور سنا گیا تھا اور ایسی کتاب جس کی تلاوت کی جاتی ہوئ جسے قراءت کے وسیلے جانا جاتا ہو، وہ انسانوں کا جزوِ بدن بن جاتی ہے۔تلاوت کے صوت و آہنگ کا انسانی بدن پر براہ راست اثر ہوتا ہے۔قرآن کی تلاوت سے انسان اسے اپنے اندر اتار لیتا ہے۔پھر کتاب کا یہ اوتار بالواسطہ طور پر کلمۃ اللہ کی ''تجسیم'' کر دیتا ہے۔کتاب اللہ کو اس طرح مجسّم کرنے کی اعلیٰ ترین مثال خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے جن کی سنت وہ آدرش، وہ اسوۂ کامل ہے جس تک پہنچنے کی ہر مسلمان آرزو رکھتا ہے۔آپؐ کی رحلت کے بعد آپؐ کی زوجہ محترمہ سیدہ عائشہؓ سے کسی نے آپؐ کے اخلاق کی بابت استفسار کیا۔سیدہ عائشہؓ نے فرمایا: ''کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا؟'' سوال کرنے والے نے کہا: ''بے شک پڑھا ہے۔'' حضرت عائشہؓ نے کہا: ''کان خلقه القرآن'' [۵۴] (آپ سراسر قرآن منش تھے)۔

آپؐ نے اپنے اصحاب کو جو دعائیں تعلیم فرمائی تھیں، ان میں سے ایک میں یہ الفاظ آئے ہیں: [۵۵]

> خداوندا! تجھ سے سوال کرتا ہوں — کہ تو قرآن کو اور علم کو میرا رزق بنادے، اور میرے گوشت پوست میرے خون، میرے چشم و گوش کو قرآن میں رنگ دے اور میرے بدن کو اس میں مشغول کر دے۔

ہم اس بات سے انکار نہیں کر رہے کہ قرآن کے پیامِ ہدایت کی ایک فکری، استدلالی اور عقلی جہت بھی ہے جس کو جاننے کے لیے تلاوتِ متن کے سوا بھی کوشش کی جاسکتی ہے، اسے فہمِ انسانی کی گرفت میں لایا جاسکتا ہے۔اگر یہ بات نہ ہوتی تو ہم یہ کتاب لکھنے کی زحمت نہ کرتے۔تاہم یہ کہنا بعید از صداقت ہوگا کہ قرآن کا پیغام محض مطالعۂ کتابِ خداوندی سے پوری طرح جذب کیا جاسکتا ہے۔ہم نے عرض کیا تھا کہ اسلام میں ایمان کا لازمی تقاضا عمل بھی ہے۔تمام اسلامی عبادات میں

سب سے بنیادی عبادت نماز ہے اور نماز مجموعہ ہے بدن کی دہرائی جانے والی حرکات، سکنات اور تلاوتِ قرآن کا۔ یہ سب چیزیں قرآن مجید کو نماز ادا کرنے والے شخص کا جوہرِ ہستی بنا دیتی ہیں۔ مسلمان جس حد تک اپنی زندگی میں اپنے دین کو ایک حقیقت بناتا ہے، اُسی حد تک قرآن مجید اس کے دل، اس کے دماغ اور اس کے ''بدن'' کی حقیقت بنتا چلا جاتا ہے۔

ہم نے عرض کیا تھا کہ بدن بھی نور کے ایک وسیلے کے طور پر کام کرتا ہے، بلکہ دور تک تجزیہ کریں تو بدن بھی نور ''ہی'' ہے۔ ہم اسے تیرگی اور ظلمت صرف اس لیے کہتے ہیں کہ روح کے نور کے مقابل یہ تیرہ و تاریک معلوم ہوتا ہے، لیکن اگر اس امر پر نظر رکھی جائے کہ خود بدن بھی نور ہی کا ایک مظہر ہے تو پھر یوں بھی ہوسکتا ہے کہ اس کی نورانیت میں اضافہ ہوجائے۔ اس میں ظاہر ہونے والا نور درخشندہ تر اور روشن تر ہوجائے۔ تلاوتِ قرآن (مطالعہ نہیں) کا یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے کلام کی نورانیت کے لیے گویا انسان کے ہر بُنِ مو کو کھول دیتی ہے۔ روایتی اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق اسی بات سے مسلمان ممالک میں دیکھی جانے والی ایک عام چیز کی وضاحت ہوتی ہے۔ ان ممالک میں اکثر اور دیگر جگہوں پر بھی یہ مشاہدہ کیا گیا ہے کہ بہت سے لوگ، کیا مرد کیا عورت، بڑھتی عمر کے ساتھ حسین تر ہوتے جاتے ہیں۔ اسلامی زبانوں میں ایسے لوگوں کے بارے میں عام طور پر یوں کہا جاتا ہے کہ فلاں صاحب یا صاحبہ، بڑی ''نورانیت'' لیے ہوئے ہیں۔ ان کے وجود میں جاری و ساری نورِ خداوندی نے اللہ سے ان کے قرب کی وجہ سے ان کے بدن کو بھی منقلب کر دیا ہے۔ جن ممالک میں بدھ مت کا چلن ہے، وہاں ایسے لوگوں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ان میں ''خالی ہونے کی صفات'' نمودار ہوئی ہیں یا یہ کہ ہم سب انسانوں میں جو ایک سرشتِ گوتم (Buddha nature) مخفی ہے، وہ اپنا ظہور کر رہی ہے۔

قرآن خود نور ہے جیسا کہ اس کی بہت سی آیات میں بیان ہوا ہے۔ اور ایمان و عمل کے وسیلے قرآن مجید کو مجسم کرنے کا مطلب ہے اس نور سے اپنی قلبِ ماہیت کرنا۔ اس نور کی روشنی میں اپنا آپ بدل ڈالنا اور نور کی ساری صفات کو واقعی اپنے اندر پیدا کرنا۔ نور کی صفات اللہ کی صفات ہیں۔

جدید دنیا میں رہتے ہوئے سوچیں تو اس بات کا تصور دشوار محسوس ہوتا ہے کہ ایک کتاب اس قدر اہم کیسے ہوسکتی ہے۔ اپنی ساری زندگی اس کتاب کو عملِ مجسم کی صورت دینے میں صرف کر دینا ہمیں ایک خوفناک حد تک محدود کر دینے والا تجربہ، ایک قید و بند محسوس ہوتا ہے۔ ہم یہ سوچتے ہیں کہ ہستیِ انسانی کی کتنی ہی اہم سمتوں اور جہات سے خود کو کاٹ کر ہمیں اس تنگنا میں اپنی سمائی کا اہتمام کرنا ہوگا، لیکن

اس طرح کی سوچ اور اس نوعیت کے فیصلے صرف ایک جدیدیت زدہ ذہن میں اُبھرتے ہیں جس کے پاس کتاب کے مغربی تصور کے سوا اور کوئی تصور نہ ہو۔ کتاب کیا ہوتی ہے، مغرب اسے نہیں جانتا کہ آج کے جدید انسان کے پاس کتاب کے نام پر دو ہی چیزیں ہیں، ناول اور سکول کا نصاب۔ اگر قرآن مجید میں کسی ناول یا نصابی کتاب سے مشابہت کا شائبہ بھی پایا جاتا تو ہم یہ تنقید گوارا کر سکتے تھے۔

یہ کتاب آخر ہے کیا چیز؟ یہ سوال اس استفسار کے مترادف ہے کہ یہ دین آخر کیا ہے، یہ کتاب ہی دین ہے اور یہ دین ہی کتاب۔ اور ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ دوسرے ادیان کے بارے میں بھی یہی بات سچی ہے۔ اسلام اس معاملے میں دوسرے ادیان سے الگ ہے۔ خاص طور پر جب ہم یہ بات زور دے کر کہہ رہے ہیں کہ قرآن مجید ایک کتاب ہے۔ ہاں، اگر ہم اپنی اصطلاحات کو ذرا وسیع اور عالمگیر معنی میں استعمال کریں اور یہ کہیں کہ قرآن کلمۃ اللہ ہے، اللہ کا کلام ہے اور اللہ کا کلام وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے خود کو ظاہر کیا ہے تو پھر دوسرے ادیان میں اس سے مشابہ اور ہم معنی تصورات تلاش کرنا کہیں آسان ہو جائے گا۔ روایتی یہودیوں کے لیے اپنے وسیع ترین معنوں میں تورات کا یہی کردار تھا اور روایتی عیسائیوں کے لیے حضرت مسیح علیہ السلام کلمۃ اللہ کی تجسیم تھے، اور اسی سے عیسوی روایت کو اپنی پوری حقیقت میسر آئی تھی۔

اسلام کے تناظر میں رہتے ہوئے دیکھیے تو یہ قطعاً کوئی جبر یا پابندی نہیں ہے کہ انسان قرآن مجید کو اپنے عمل میں مجسم کرنے کے لیے عمر بتا دے۔ اس کے برعکس انسانوں کی ہر وہ کدوکاوش جو اس کے سوا ہوگی، اس سے انسان کے امکانات سے صرفِ نظر ہو جائے گا اور ہمارے دل اور ہمارے دماغ اپنے آپ کو اس حقیقت سے بیگانہ کر دیں گے کہ ہم کیا ہیں، انسان کیا ہے۔ قرآن کے معنی کے بارے میں یہ نقطۂ نظر تبھی سمجھ آئے گا جب ہم اسلام کے تین اصولوں کو پیش نظر رکھیں گے۔ اگر ہم نے قرآن کو سمجھنے کے لیے سماجیات، تاریخ، فلسفہ یا جدید علوم میں سے کسی اور نقطۂ نظر کو اختیار کیا تو پھر زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ ہمارے ہاتھ میں ایک اجنبی کا مرتب کردہ جائزہ رہ جائے گا جو اس عجیب سی چیز کو بنظرِ تماشا دیکھ رہا ہوگا۔ بہت ہوا تو ہم یہ کہہ سکیں گے کہ دوسری تہذیبوں اور ثقافتوں میں بھی ایسے ہی ملتے جلتے تصورات پائے جاتے ہیں، لیکن اگر یہ دریافت کرنا ہو کہ اسلام اپنے آپ کو کس نظر سے دیکھتا ہے، اس کا تصور اپنے بارے میں کیا ہے تو ہم پر لازم ہے کہ ایک مرتبہ پھر اس بات پر غور کریں کہ خدا کیا ہے، انسان ہونے کا مطلب کیا ہے اور خدا اور انسان کے مابین سب سے بہتر اور مطلوب رشتہ کیا ہونا چاہیے۔

قرآن مجید اللہ کا کلام ہے جس میں اس نے اپنا آپ ظاہر کیا ہے۔اسی طرح انسان صورتِ خداوندی ہے، لہٰذا اس کا اظہارِ ذات، لیکن قرآن لفظ اور آواز کے وسیلے سے ظاہر ہوتا ہے، جب کہ انسان جسم اور روح کی صورت میں۔ قرآن کی صورتِ ظاہری مکمل طور پر ظاہر ہو چکی، یعنی یہ کہ قرآن ایک مرتبہ نازل ہو چکا اور اب کبھی تبدیل نہیں ہوگا، لیکن انسانوں میں سے کوئی ایسا نہیں جو اپنی پیدایش سے لے کر موت تک اس دنیا میں پوری طرح موجود ہو۔ قرآن سارے کا سارا ہمارے سامنے ہے، لیکن ہم میں سے کوئی انسان بھی تماماً یہاں نہیں ہے۔ ہمارا عہدِ طفلی گذر چکا اور ہمارا بڑھاپا ابھی وارد نہیں ہوا۔ یہ کیسے تصور کیا جائے کہ وہ شیر خوار بچہ جو کل تھا اور وہ خستہ و درماندہ پیرِ ناتواں جو کل ہوگا، ایک ہی ہستی ہیں، لیکن واقعہ یہی ہے۔ اس بات کو بیان میں لانا ذرا مشکل ہے۔

اس عمرِ دراز (ان شاءاللہ) کے اس سارے پھیلاؤ کے بیچ آپ کی اصلی ذات کہاں واقع ہے۔ یہ مقامِ غور ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ حقیقت میں جو کچھ ہیں، آپ کا اصلی اپنا آپ، زندگی کے اس راستے کے ہر ہر قدم پر اس کی ایک تجسیم اور اس کی ایک نہ ایک صورت موجود رہتی ہے، لیکن آپ کی حقیقتِ ذات ہمیشہ ایک راز بنی رہتی ہے۔ ایک خدائی بھید جس کی نسبت، جس کا ناتا روحِ خداوندی کے ساتھ ہے۔ وہی جس کے بارے میں خدا نے کہا تھا:

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (۱۷:۸۵)	اور تم سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہیے کہ روح میرے رب کے امر سے ہے اور تم کو تو بس تھوڑا ہی سا علم دیا گیا ہے۔

خدا کے زبانی کلام، یعنی قرآن مجید اور اللہ کی صورتِ مجسم، یعنی نوعِ انسانی میں جو ہم نے موازنہ کیا تو اس سے مقصود یہ ہے کہ اسلام کی تعلیمات میں سے یہ نکتہ سامنے لایا جا سکے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ اپنے آپ کو پوری طرح ظاہر کرتا ہے، جب کہ انسان کے معاملے میں ہم پورے انسان کو کبھی نہیں دیکھ پاتے، کیونکہ ہم جس جگہ سے انسان پر نظر ڈالتے ہیں، وہ پورے انسانی وجود کی نشوونما اور وقت کی بساط پر اس کے سفر کا محض ایک چھوٹا سا ٹکڑا کہا جا سکتا ہے۔ یہ سفر اس دنیا میں ہماری زندگی سے پہلے بھی جاری تھا اور ہماری موت سے آگے بھی اس کے مراحل کھلتے اور پھیلتے جائیں گے۔ پس قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا مکمل پرتو ہے جو اس کی پوری نمایندگی کرتا ہے۔ جب کہ ہم لوگ، یعنی انسان کسی بھی لمحۂ زیست میں ادھوری اور نامکمل شبیہ اور دھندلے عکس سے زیادہ نہیں ہوتے۔ ہمیں صورتِ

خداوندی پر خلق کیا گیا ہے، سو ہم میں یہ صلاحیت اور استعداد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کی اپنے عمل سے خارجی دنیا میں صورت گری کریں اور انھیں عالمِ ہستی میں مجسم کر دیں، لیکن یہ جاننے کے لیے کہ یہ صفاتِ خداوندی کیا ہیں اور ہم ان صفاتِ خداوندی کا مجموعہ کیوں کر ہیں، ہمیں اپنے سامنے خارج کی دنیا میں ایک عملی نمونہ درکار ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے لیے یہ نمونہ، یہ عکس، یہ مثال قرآن مجید ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی صفات کھلے طور پر ظاہر ہوتی ہیں۔ مسلمانوں کے لیے رسولِ خداؐ کا اتباع لازم ہے تاکہ قرآن ان کا خلق، ان کا کردار بن جائے، اور ان کے سوچنے، جاننے، محسوس کرنے اور عمل کرنے کے ہر طور طریقے کو ڈھالتا اور بناتا چلا جائے۔ یہ قید و بند نہیں ہے، آزادی ہے۔ تنگنائی نہیں بے کرانی ہے۔ انسان کی نمو پر روک نہیں اس کے امکانات کا پھیلاؤ ہے:

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ج وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا (٦:١٢٦)	سو اللہ جس کو چاہے راہ دے، اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دے، اور جس کو چاہے کہ وہ راہ بھولے تو اس کا سینہ بالکل تنگ کر دیتا ہے۔

اسلام کا مطلب ہے قرآن مجید کو مجسم کرنا۔ اس سے بہت کچھ کھلتا ہے، کیونکہ جب انسان رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرتا ہے اور قرآن مجید اس کا خُلق اور اس کا کردار و عمل بن جاتا ہے تو پھر حقیقت کی تمام صفات سے اس کا سچا اور صحیح رشتہ قائم ہو جاتا ہے، یعنی ہر وہ چیز جو خیر ہے، حسن و جمال ہے، مثبت ہے، لائقِ تعریف ہے اور چاہے جانے کے قابل ہے۔ جب انسان کسی اور راستے پر چل نکلتا ہے یا یوں کہیے کہ راہِ نبوی کے سوا کسی اور راستے پر چلتا ہے تو گویا اپنے آپ کو سکیڑ کر جکڑ دیتا ہے۔ اس طرح انسان کی شخصیت صورتِ الٰہیہ کی بہت سے سمتوں اور جہات سے کٹ جاتی ہے اور اس کی بڑھوتری اس سمت میں رک جاتی ہے۔ انھی سمتوں میں جانے سے انسان انسان بنتا ہے۔ اللہ کے سوا کسی اور نمونے پر خود کو ڈھالنے کا مطلب ہے شرک میں مبتلا ہونا۔ اس طرح انسان اپنی حقیقت کے بارے میں شک و شبہ میں پڑ جاتا ہے، میں وہ ہوں یا یہ، مجھے یہ بننا چاہیے یا وہ، اور پھر وہ اس چیز کی آگہی سے بھی محروم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فلاں یا فلاں نہیں ہے، بلکہ چنیں و چناں، این و آن ہر چیز کا خالق ہے۔ اسی طرح اللہ کا عکس بھی اِس تک یا اُس تک محدود نہیں ہو سکتا۔ وہ چنیں و چناں، این و آن سب کو سمیٹے ہوئے ہے اور ان میں سے کسی ایک کی بھی اس پر کوئی روک نہیں۔ کمالِ انسانی کا جو خواب، جو

تصورِ اسلام دیتا ہے، اس میں لامحدود امکانات، مکمل سرشاری اور تکمیلِ آرزو سب ملے ہوئے ہیں یعنی اُس میں ہمیشہ رہنے والا خوش آیند مستقبل اور بھرپور، مکمل مسرت وشادمانی سب شامل ہیں۔

یہ سب کچھ خود قرآن کے لفظ میں مضمر ہے جب اس کے معنی ''پڑھنے، تلاوت کرنے'' کے لیے جائیں۔ بعض علما نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ''قرآن'' کا لفظ اپنی کتاب کے نام کے طور پر دیا ہے تو اس لفظ کے دوسرے معنی بھی مرادِ خداوندی میں شامل ہیں۔ ہم نے پہلے عرض کیا کہ اس لفظ کا ایک مفہوم ''یکجا کرنا'' بھی ہے۔ پس قرآن مجید کا مطلب ہوا یکجا کرنے یا اکٹھا کرنے والی چیز، لیکن یہ کیا اکٹھا کرتا ہے؟ کسے یکجا کرتا ہے؟ تمام انبیا کی حکمت و دانائی، وہ ہدایت جو اللہ تعالیٰ نے آدمؑ اور اولادِ آدم کو عطا کی۔ اس لیے مسلمان یہ کہتے ہیں کہ علم اور حکمت سب قرآن میں پائے جاتے ہیں۔ قرآن مجید اپنے سے پہلے کے پیغامِ الٰہی کی تصدیق کے لیے آیا، لہٰذا اس نے کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی جو نوعِ انسانی کے لیے ذرا بھی اہمیت رکھتی تھی۔ رسول اللہؐ کے نواسے حضرتِ حسنؓ کا ایک قول ہے جس میں لفظِ قرآن کا یہ مفہوم واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اس سے قرآن مجید کی پہلی سورۃ، یعنی سورۃ فاتحہ کی اہمیت بھی واضح ہوتی ہے۔ مسلمان یہ سورۃ نماز کی ہر رکعت میں پڑھتے ہیں۔ اس سورۃ کی تلاوت کر کے گویا وہ سارے قرآن کی تلاوت اور اس کی تجسیم کرتے ہیں:

> اللہ تعالیٰ نے سو کتابیں نازل کیں اور چار کتابیں اتاریں اور ان ۱۰۰ کتابوں کو چار کتابوں میں رکھا، یعنی تورات، انجیل، زبور اور الفرقان (قرآن مجید)۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان سب کتابوں کو قرآن مجید میں رکھا اور قرآن مجید کی ہر چیز کو اس کی طویل سورتوں میں رکھا اور طویل سورتوں کی ہر چیز کو سورۃ فاتحہ میں رکھ دیا۔

اسمائے قرآن Names of the Quran

ہر وہ نام اور صفت جو قرآن مجید نے اپنے لیے استعمال کی ہے، اس کے کچھ انسانی اور کچھ ربّانی مضمرات ہیں اور ان معانی میں بے انتہا وسعت ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ہر نام میں پائی جاتی ہے۔ مندرجہ ذیل سطور میں ہم قرآن مجید کے چند اسما کا ذکر کریں گے اور مختصراً یہ بتائیں گے کہ مسلمان قارئین کے لیے ان اسما میں کیا کچھ مضمر ہے۔

حضرتِ حسنؓ کا جو قول ہم نے ابھی نقل کیا، اس میں قرآن مجید کا دوسرا مشہور نام مذکور ہوا ہے، ''الفرقان۔'' اس اصطلاح کا بنیادی مفہوم ہے: ''الگ کرنا، جدا کرنا، فرق کرنا'' بہت سے لوگوں کی

رائے یہ ہے کہ اس نام سے قرآن مجید کے دوسرے نام، یعنی القرآن کی تکمیل ہوتی ہے۔ ''قرآن'' کا اگر مطلب ہے، ''وہ جو ہر حکمت و دانائی کو یکجا کرتا ہے'' تو فرقان کے معنی ہیں ''وہ جو حق کو باطل سے جدا کرتا ہے اور حکمت و دانائی کو پرکھنے کی کسوٹی فراہم کرتا ہے۔'' قرآن مجید نے فرقان کا لفظ تورات کے لیے بھی استعمال کیا ہے:

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی وَھٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِیَآءً وَّذِکْرًا لِّلْمُتَّقِیْنَ (۲۱:۴۸)	اور ہم نے موسیٰ اور ہارون کو حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی کسوٹی اور روشنی اور یاددہانی عطا فرمائی خدا ترسوں کے لیے۔
تَبٰرَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا (۲۵:۱)	بڑی برکت ہے اس کی جس نے اپنے بندے پر حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنے والی کتاب اتاری تا کہ وہ اہلِ علم کے لیے ہوشیار کرنے والا بنے۔

قرآن اپنے آپ کو صرف ''الکتاب'' کے نام سے بھی یاد کرتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا یہ اصطلاح قران نے صحائف سماوی کے لیے بالعموم اور تورات و انجیل کے لیے بالخصوص استعمال کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید نے اس لفظ کو دو سو سے زیادہ مقامات پر استعمال کیا ہے اور ان سب آیات میں یہ لفظ وحی revelation کے لیے ایک عنوان کے طور پر برتا گیا ہے۔ خود ''وحی'' اور ''تنزیل'' (اتارنا) کے الفاظ کہیں کم استعمال ہوئے ہیں:

ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ (۲:۲)	یہ کتاب الٰہی ہے۔ اس (کے کتاب الٰہی ہونے) میں کوئی شک نہیں۔ ہدایت ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لیے۔
یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ (۴:۱۳۶)	اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو اس نے اس سے پہلے اتاری۔

ان دو اسما کے علاوہ قرآن مجید اپنے لیے جو اسما اور صفات استعمال کرتا ہے، ان کو دو دستہ کیا جا سکتا

ہے۔ایک وہ جوعلم، حکمت اورحق و باطل کے مابین امتیاز کی اس قوت پر زور دیتے ہیں جوقرآن فراہم کرتا ہے، اور دوسرے وہ اسما جو یہ بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب کیوں نازل کی۔اس سے ان کی غرض کیا تھی، یعنی اس کا کرم، اس کی رحمت۔پہلی قسم کے اسما یہ ہیں: الہدیٰ، الحق، الحکمت، العدل، النور، البرہان، البیان، التبیین، ذکریٰ، تذکرہ اور ذکر۔ دوسرے اسما میں الرحمت، الشفا، کریم اور مبارک شامل ہیں۔

ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ ہدایت کا تصور مسلمانوں کے تصورِ نبوّت کو سمجھنے کے لیے کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں ایک بات کا اور اضافہ کر دیں کہ سورۃ فاتحہ جو سارے پیامِ قرآنی کو اپنی سات مختصر آیات میں سمیٹے ہوئے ہے، ایک دعا کے گرد گھومتی ہے اور اس دعا کا محور ہے ہدایتِ خداوندی:

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (۱:۵) ہم کو سیدھی راہ پر چلا۔

اگر اللہ تعالیٰ اس دُعائے خاص کو قبول کر لیں تو پھر انسان کو کچھ اور نہیں چاہیے یا یوں کہیے کہ باقی سب کچھ خود سے ہو جائے گا۔

قرآن کا نام الحق بھی ہے۔اس پر ہم بطور اسمِ خداوندی کے گفتگو کر چکے ہیں۔

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا (۲:۱۱۹) ہم نے تمھیں حق کے ساتھ بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ (۴:۱۷۰) اے لوگو! رسول تمھارے پاس تمھارے رب کے ہاں سے حق لے کر آ گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ الحق ہے۔قرآن حق ہے اور دلیلِ حق بھی۔ اس طرح قرآن مجید حکمت بھی ہے۔ حکمت کی عام طور پر تعریف یوں کی جاتی ہے: ’’حق کی شناخت کرنا اور عملی صورتِ حال پر اس کا اطلاق کرنا۔‘‘ دانا اور حکیم وہ ہے جو حق کو جانے اور صحیح انداز میں اسے عمل میں لائے۔قرآن حق کو جانتا ہے، بلکہ یوں کہیے کہ قرآن خود الحق ہے۔ پھر اس کو عمل میں لانے کے لیے قرآن مجید نے اسے بولے ہوئے لفظ کی صورت انسانوں تک پہنچایا۔انسان اس حکمت کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ خود کو الحق کی مرضی کے مطابق ڈھال سکے، اس سے سازگاری اور ہم آہنگی حاصل کر سکے۔

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ (۴:۱۱۳) اور اللہ نے تم پر کتاب و حکمت نازل کی اور تمھیں وہ چیز سکھائی جو تم نہیں جانتے تھے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ (۱۰:۱) (۳۱:۲) یہ آیتیں ہیں پُرحکمت کتاب کی۔

چونکہ قرآن مجید حکمت بھی عطا کرتا ہے اور قوتِ امتیاز بھی اس لیے یہ اشیا کے لیے حَکَم بھی بن جاتا ہے۔ فیصلہ کرنے اور حکم لگانے کا مطلب ہی یہ ہے کہ علم کا کسی خاص صورتِ حال پر اطلاق کر کے نتیجہ مرتب کرنا، حق کو باطل سے الگ کر دینا اور معاملے کی صحیح صورت کو واشگاف کر دینا۔ اسلام کے تصورِ عدل کا حکمت سے گہرا تعلق ہے، بلکہ دونوں الفاظ ایک ہی بنیادی سہ حرفی مادے سے نکلے ہیں۔ ان کے بنیادی معنی ایک ہیں:

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا (۱۳:۳۷) اسی لیے ہم نے یہ کتاب اتاری ہے عربی میں، ایک فرمان کی حیثیت سے۔

ہم عرض کر چکے ہیں کہ ''توحید'' کی ماہیت کو جاننے کے لیے نور کا تصور کس قدر اہم ہے۔ نور وہ شے ہے جو پوشیدہ کو عیاں اور چھپے ہوئے کو آشکار کرتی ہے، اسی لیے قرآن مجید نور ہے کہ اس سے وہ خدائی حکمت آشکار ہو جاتی ہے جو عالمِ مخلوقات میں مخفی ہے اور غفلت کے سبب انسان کی آنکھ اور اس کے فہم سے اوجھل رہتی ہے۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا (۶٤:۸) پس ایمان رکھو اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس نور پر جو ہم نے نازل کیا۔

نور سے ہر شے صاف اور واضح ہو جاتی ہے اور جو فیصلہ بھی ہوتا ہے، وضاحت سے ہوتا ہے، ابہام سے پاک ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن نے اپنے آپ کو ''برہان'' (دلیل)، ''بیان'' (clear explication) اور ''التبیین'' (elucidation) کے طور پر پیش کیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا (٤:۱۷٤) لوگو تمھارے پاس تمھارے رب کی جانب سے سند آ چکی اور ہم نے تمھارے لیے واضح روشنی اتار دی۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَیْءٍ وَّهُدًى وَّ رَحْمَةً وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ (۱٦:۸۹) اور ہم نے تم پر کتاب اتاری ہے ہر چیز کو کھول دینے کے لیے اور وہ ہدایت اور رحمت اور بشارت ہے فرمانبرداروں کے لیے۔

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ (۳:۱۳۸)
یہ بیان ہے لوگوں کے لیے ہدایت اور نصیحت ڈرنے والوں کے لیے۔

ہدایت دینے کی صفت کا صاف اور صریح تعلق حق و باطل میں امتیاز اور راہِ راست کی جانب رہنمائی سے تو ہے ہی، اس میں ایک تصور اور بھی مضمر ہے۔ یہ صفت اس امر کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ ہدایت دینے والا اس کا بھلا چاہتا ہے جسے ہدایت دی جا رہی ہے اور اس طرح اسے ہدایت یافتگان کی بہبود عزیز ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ کے اسمائے رحمت و جمال میں سے ایک نام ''الہادی'' ہے۔ اب ہم آتے ہیں قرآن کے ان ناموں کی طرف جو دوسرے دستے میں شامل ہیں، وہ جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید اور دوسری الہامی کتابوں کو نازل کرنے سے اللہ تعالیٰ کی غرض کیا تھی:

وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰى اِمَامًا وَّرَحْمَةً (۴۶:۱۲)
اور اس سے پہلے سے موسیٰ کی کتاب موجود ہے، رہنما اور رحمت۔

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۔ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ (۳۱:۲-۳)
یہ آیات ہیں پُر حکمت کتاب کی۔ وسیلۂ ہدایت اور رحمت حسنِ عمل والوں کے لیے۔

هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّ بِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۷:۲۰۳)
یہ تمھارے رب کی طرف سے آنکھیں کھولنے والی آیات اور ہدایت و رحمت ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے۔

قرآن ایک رحمت ہے، کیونکہ یہ انسان کو اس کی اپنی تکمیل اور فلاح و بہبود کی جانب ہدایت کرتا ہے، چنانچہ اس سے انسان کی سرشت اور فطرت میں پائی جانے والی ہر بیماری کو اس کا مداوا اور ہر زخم کو اس کا مرہم مل جاتا ہے اور وہ پوری صحت سے توحید پر کاربند ہو سکتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۱۰:۵۷)
اے لوگو! تمھارے پاس تمھارے رب کی جانب سے نصیحت، سینوں کے امراض کی شفا اور اہلِ ایمان کے لیے ہدایت اور رحمت آ گئی ہے۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۱۷:۸۲)
اور ہم قران میں جو اتارتے ہیں وہ شفا اور رحمت ہے ایمان والوں کے لیے۔

خلاصہ یہ کہ قرآن ہر اچھی چیز کا مظہر ہے، کیونکہ اگر ہدایت نہ ہوتو نوعِ انسانی برباد ہو جائے۔ قرآن ان کو ان کے اپنے نفوس کا اندمال اور شفا، سالمیت اور فلاح و بہبود فراہم کرتا ہے، اسی لیے اسے ''مبارک'' کا نام دیا گیا ہے۔ اس لفظ میں یہ معنی شامل ہیں کہ یہ کتاب ہر برکت، ہر خیر اور ہر مطلوبہ شئے کا ماٰخذ ہے۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (٦:١٥٦)

اور یہ کتاب ہے جو ہم نے اُتاری ہے، سراپا خیر و برکت، تو اس کی پیروی کرو اور ڈرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔

مسلمان جب بات کرتے ہیں تو قرآن مجید کو صرف قرآن کے نام سے نہیں پکارتے۔ عام طور پر قرآن کے لفظ کے ساتھ کوئی نہ کوئی صفاتی نام شامل کیا جاتا ہے۔ یہ کلام اللہ کے احترام کا تقاضا ہے۔ بعض انگریزی گو مسلمانوں نے قرآن کو ''قرآنِ مقدس'' (The Holy Quran) کہنا شروع کر دیا ہے، جیسا کہ انجیل کو کتابِ مقدس کہا جاتا ہے، لیکن قرآن میں یا کسی بھی اسلامی زبان میں Holy کے لفظ کے کسی بھی لسانی مترادف کو قرآن کے نام کے طور پر استعمال نہیں کیا گیا۔ سب سے زیادہ جو اسمِ صفت قرآن کے نام کے ساتھ استعمال ہوتا ہے، وہ ہے ''کریم'' اور اس کی بنیاد اس آیت پر ہے جس میں یوں آیا ہے۔

وَاِنَّهٗ لَقرآن الکریم (٥٦:٧٧)

بے شک یہ قران ہے، عزت والا۔

الحق اور النور کی طرح الکریم بھی اللہ کا ایک نام ہے اور یہ اس کے اسمائے جمال اور اسمائے رحمت میں سے ہے۔ مزید برآں اگر زمانی اعتبار سے دیکھیے تو شاید صفتِ تخلیق کے بعد یہ پہلی صفت ہے جو قرآن میں نازل ہوئی۔ اسی سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کے لیے ہدایت فراہم کرنے کا خدائی سبب کیا ہے۔ جیسا کہ پہلے ہم نے عرض کیا کہ عام طور پر یہی کہا گیا ہے کہ قرآن مجید کی سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات مندرجہ ذیل ہیں:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۚ الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۚ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۚ (٩٦:١-٥)

انھیں پڑھ کر سناؤ (اے پیغمبر)! اپنے اس پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا ہے۔ لہو کی ایک پھٹکی سے انسان کو پیدا کیا ہے۔ انھیں پڑھ کر سناؤ اور واقعہ یہ ہے کہ تمھارا رب بڑا ہی کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے یہ

قرآن سکھایا۔ انسان کو اس میں وہ علم دیا
جسے وہ نہیں جانتا۔

اللہ تعالیٰ کی شانِ کریمی صرف انسان کو علم عطا کرنے اور اسے ہدایت دینے ہی میں ظاہر نہیں ہوتی، بلکہ ایک گہرے اور بنیادی مفہوم میں تخلیق خود اللہ کے جود و کرم کے سوا اور کچھ نہیں، کیونکہ مخلوقات اپنی ہستی کے لیے کوئی حق جتلانے کی حیثیت نہیں رکھتی۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اگر قرآن اسلام ہے تو سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم انسان کی صورت میں مجسّم اسلام ہیں۔ وہ اللہ جس نے قرآنِ مجید میں خود کو منکشف کیا ہے، اس کی محبت اور بندگی کا تقاضا ہے کہ کلامِ خداوندی کی کامل تجسیم، اس انسانِ کامل سے بھی وہی وابستگی اور محبت رکھی جائے جو اپنے اسوۂ حسنہ میں اللہ کی صفاتِ فرقانی وقرآنی، اس کی صفاتِ ہدایت، حق، حکمت، نور، عدل، برہان، تبیین، ذکر، رحمت، شفا، کرم اور برکت سب کا مظہر ہے۔

اسلام کی ساری تاریخ میں سیدنا محمدؐ کی ذات کو جو حیثیت رہی ہے،[۵۶] اس پر نظر کیجیے تو یہ امر باعثِ تعجب معلوم ہوتا ہے کہ بعض نئے خیال کے مسلمان جنھیں بالعموم بنیاد پرست کے عنوان سے پکارا جاتا ہے، ''توحید'' کے نام پر رسولِ خداؐ سے محبت، عقیدت اور تعلق کو گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جن لوگوں کی طرف سے یہ تنقید ہوتی ہے اُن میں ''تشبیہ'' کا تصور بھی تقریباً مفقود دیکھا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ ہے ''تنزیہ'' پر ایک ایسا مبالغہ آمیز اصرار جو خدا کو انسانی معاملات سے اتنا ماورا بنا دیتا ہے کہ اس کے بعد صرف چند صریح احکامِ خداوندی کی پابندی چھوڑ کر لوگ باگ آزادی سے جو چاہیں کیا کریں۔

اس میں شک نہیں کہ اگر جدیدیت کو آنا ہے تو اسلام میں اس نوعیت کے تغیرات جنم لیتے رہیں گے، لیکن ہم لوگ جو مغربی دنیا میں رہتے ہیں، جدیدیت سے گذر کر مابعدِ جدیدیت کے دور میں داخل ہو چکے ہیں۔ کم از کم ہم تو یہ پورا حق رکھتے ہیں کہ اس فیصلے کے خلاف آواز اٹھا سکیں اور یہ اعتراض کر سکیں کہ روایت اور زمانے کے آزمائے ہوئے اُصولوں کو ٹکنالوجی کی ترقی سے پیدا ہونے والی جنتِ ارضی کی امیدِ موہوم کی خاطر اٹھا کر پھینک دینا کوئی دانش مندی نہیں ہے۔

روایتی اسلام میں رسول خداؐ کی کیا حیثیت رہی ہے، اس کی وضاحت کے لیے ہم صرف ان چند نکات تک محدود رہیں گے جو قرآن مجید نے آپؐ کے لیے بیان کیے ہیں۔ ہمارا کہا ہوا سرسری اور سطحی سے

زیادہ نہیں ہو سکے گا۔ ''کان خلقه القرآن'' کو نظر میں رکھیے تو یہ بات سمجھ میں آسانی سے آجائے گی کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں رسول اللہؐ کا نام لے کر ذکر آیا ہے، صرف ان مقامات کو پڑھنے سے رسول اللہؐ کی عظمت اور حیثیت واضح نہیں ہو سکتی۔ کتابِ خداوندی ساری کی ساری اگر اللہ کے بارے میں بتاتی ہے تو ساتھ ہی اللہ کے افضل و اشرف نبی کے کمال یافتہ جوہرِ انسانی کا اظہار بھی کرتی ہے۔ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم صورتِ الٰہیہ کا وہ حقیقی مظہر ہیں جو مسلمانوں کی نگاہ میں دوسرے ہر مظہرِ صورتِ خداوندی سے برتر و بہتر ہے، وہ دوسرے مظاہر جو انبیا اور اولیا کی شخصیات میں آدمؑ سے لے کر دنیا کے لمحۂ آخر تک پھیلے ہوئے ہیں۔

اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا مرتبہ و حیثیت دیتا ہے، اسے جاننا ہو تو پہلے ''تنزیہ'' کے حوالے سے اس پر غور کرنا چاہیے، یعنی اس نقطۂ نظر سے کہ اللہ تعالیٰ الحق ہے اور اس کے سوا ہر شے بے حقیقت۔ اس لحاظ سے دیکھیے تو ہر خیر اللہ کے پاس ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ماسوی اللہ میں سے ہیں، لہٰذا دیگر تمام مخلوقات کی طرح اللہ کے مقابلے میں وہ بھی کچھ نہیں۔ انسانی اصطلاحات میں کہیے تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی تمام دوسرے لوگوں کی طرح انسانِ فانی ہیں، لیکن رسولِ خداؐ اور دوسرے لوگوں کے مابین ایک بڑا فرق ہے۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھیے کہ آپ اللہ کے عبدِ کامل ہیں۔ ہم عرض کر چکے کہ کائنات کی ہر شے اللہ کی بندگی کر رہی ہے، لیکن انسان نے چونکہ ''بارِ امانت'' اٹھایا تھا، لہٰذا اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنی صلاحیت اور استعداد کی مکمل نمود کے لیے اپنے ارادے اور اختیار سے اللہ کی بندگی کرے۔ نفسِ انسانی کی اللہ کے سامنے اختیاری سرافگندگی کی یہ صفت رسولِ خداؐ کی ذات میں سب سے نمایاں ہے۔ اسی لیے قرآن مجید نے آپؐ کو ''عبداللہ'' (اللہ کا بندہ) کہا ہے۔ مسلمان کے شعور میں اس لقب سے زیادہ قابلِ تعظیم اور واجبِ احترام اور کوئی لقب نہیں۔

سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں صرف اتنا ہی کہنا کافی نہیں۔ عبدِ کامل ہونے کے ساتھ آپ کامل خلیفۃ اللہ بھی ہیں۔ ''تنزیہ'' کو پوری طرح واقعہ بنانے کے ساتھ آپؐ نے ''تشبیہ'' کو بھی مجسم کر دیا تھا۔ قرآن مجید نے سیدنا محمد علی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کے ان دو پہلوؤں کو یوں ظاہر کیا ہے:

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (۱۸:۱۱۰) (۴۱:۶)	کہیے کہ میں بھی ایک آدمی ہوں، جیسے تم۔ مجھ پر وحی آتی ہے کہ تمھارا معبود بس وہی اللہ ہی ہے۔

عہدِ جدید میں بہت سے مفسرین نے اس آیت کے صرف پہلے حصے پر توجہ دی ہے اور یہ بھلا دیا ہے کہ دوسرے حصے میں کیا مضمر ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے انسانوں کی طرح ایک بشر ہیں، وہ بھی انسان ہیں، لیکن یاد رہے کہ انسان کو سارے اسما کا علم دیا گیا تھا اور فرشتوں نے انسان کو سجدہ کیا تھا۔ انسان ہونے کا مطلب عام و عامیانہ ہونا نہیں ہے۔ یہ ایک خدائی امانت ہے، ایک خاص استحقاق، خصوصی چیز، اور کم ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اس بارِ امانت کا حق ادا کرتے ہیں اور اس کا صحیح مصداق بنتے ہیں:

اِنَّاعَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ، اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (۳۳:۷۲)

ہم نے اپنی امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تو انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھالیا۔ بے شک وہ ظلم کرنے والا اور جذبات سے مغلوب ہو جانے والا ہے۔

سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسرے انسانوں سے جو چیز الگ کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ آپؐ نے انسان کی اصل ذمہ داری کے مطابق زندگی گذار کر دکھا دی۔ اللہ کی ہدایت پر پورا عمل فرمایا اور اسی لیے آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے سارے عالم کے لیے ایک رحمت کے طور پر منتخب فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (۲۱:۱۰۷)

اور ہم نے تو تم کو بس اہلِ عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

سابقہ اقتباس میں جو آیت درج کی گئی تھی، اس کے دوسرے حصے میں ایک بہت اہم نکتہ آیا ہے:

اِلَّا اَنْ يُّوْحٰى اِلَيَّ اَنَّمَا اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ

مجھ پر وحی آتی ہے کہ تمھارا خدا تو بس اللہ ہی ہے۔

اسی سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم انسان تو ہیں، مگر ایسے انسان جس پر وحی آتی ہو۔ اگر کسی کے دماغ میں یہ خیال کہیں گذرا ہو کہ وہ بشر تھے اور بشر ہونے کی وجہ سے ہماری ہی طرح کچھ کمی کوتاہی رکھتے تھے تو اس آیت سے یہ غلط سوچ رفع ہو جانا چاہیے۔ آخر صرف آپؐ ہی کو قرآن نازل کرنے کے لیے کیوں چنا گیا؟

یہ درست ہے کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے انسانوں کی مانند ایک بشر تھے، لیکن وہ عام انسانوں کی طرح غفلت ونسیان میں نہیں تھے، بارِ امانت سے گریزاں نہیں تھے۔ یہ بارِ امانت آپؐ

نے اٹھایا اور ایسے کہ ساری دنیا اس سے آج تک فائدہ اُٹھا رہی ہے۔ وہ صفات جن کی نمود آپ کی ذات میں ہوئی، وہ آپؐ کی اپنی صفات نہ تھیں، یہ اللہ کے اسما اور اس کی صفات کا ظہور تھا۔ ہم نے پہلے درج کیا کہ بحیثیت ایک بشر کے آپؐ اپنی خواہش سے کسی کی ہدایت کا سامان نہیں کر سکتے تھے، تاہم اللہ کے رسول کے طور پر اور خلیفۃ اللہ کی حیثیت میں آپؐ دلیلِ حق بھی تھے، الحق کی جانب رہنما بھی اور نجات کے لیے انسان کے رہبر بھی۔ اللہ کا نورِ ہدایت اسی طرح ظاہر ہوتا ہے:

وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔ صِرَاطِ اللّٰهِ (۵۳-۵۲:۴۲)

اور تو البتہ سُجھا تا ہے سیدھی راہ، راہ اللہ کی۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا۔ وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا (۴۶-۴۵:۳۳)

اے نبی! ہم نے تم کو گواہی دینے والا اور خوشخبری پہنچانے والا اور آگاہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے اور اللہ کی طرف، اس کے اذن سے، دعوت دینے والا اور ایک روشن چراغ بنا کر بھیجا۔

آپؐ سے جو نور ظاہر ہوا ہے، وہ آپؐ کا نور نہیں، خدا کا نور ہے۔ ''**لا نور الا اللّٰہ**'' (اللہ کے سوا کوئی نور نہیں)۔ انسانِ فانی کے پاس نور کہاں، لیکن خلیفۃ اللہ کے طور پر انسان مشعلِ نور ہوسکتا ہے۔

قرآن بہت وضاحت سے یہ حکم دیتا ہے کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک نمونہ اور ایک مثال ہیں۔ اس مثال کی پیروی، اس کا اتباع کرنا لازم ہے۔ آپؐ کے اتباع ہی سے اللہ کی یاد کا راستہ کھلتا ہے، یہ ذکر اللہ کا وسیلہ ہے اور ذکرِ خداوندی ہی وہ مطلوبہ اور پسندیدہ جواب اور ردِعمل ہے جو خدا کی بھیجی ہوئی یاد دہانیوں کے روبرو انسان کو اختیار کرنا ہے۔ یہ بات اہم اور لائقِ توجہ ہے کہ اسلامی روایت میں سیدنا محمدؐ کو جو بہت سے القاب دیے گئے ہیں، ان میں سے ایک ''ذکر اللہ'' (یادِ خدا) بھی ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَاللّٰهَ كَثِيْرًا (۲۱:۳۳)

اور تمھارے لیے اللہ کے رسول کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے، ان کے لیے جو اللہ کی ملاقات اور روزِ آخرت کی توقع رکھتے ہیں اور اللہ کو زیادہ سے زیادہ یاد کرتے ہیں۔

ہم نے عرض کیا تھا کہ مسلمان ہونے اور اللہ کا بندہ ہونے کا مدار اطاعتِ الٰہی پر ہے۔ اطاعتِ خداوندی کا انحصار سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پر ہے:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (٤:٨٠)	جو رسول کی اطاعت کرتا ہے اس نے اللہ کی اطاعت کی۔
قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۰ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ (٣:٣١-٣٢)	کہ دو: اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری راہ چلو کہ اللہ تم کو چاہے اور بخشے تمھارے گناہ، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ کہ دو: حکم مانو اللہ کا اور رسول کا۔ پھر اگر یہ ہٹ رہیں تو اللہ نہیں چاہتا منکروں کو۔

اللہ سے محبت اور اتباعِ رسول کے درمیان قرآن مجید نے جو رشتہ قائم کیا ہے، وہ خاص طور پر اہمیت کا حامل ہے۔ اس پر آگے چل کر دوبارہ گفتگو ہو گی۔ یہاں اتنا عرض کرنا مناسب ہو گا کہ محبت یا لگاؤ نفس و دل کی ایک صفت و صلاحیت ہے جو محبوب اور محبت کے درمیان فاصلے کو پاٹ دیتی ہے، اسے قابلِ عبور بناتی ہے۔ یہاں انسان محبّ ہے، چاہنے والا اور عاشق۔ محبوب اللہ تعالیٰ ہے۔ یہ آیت لوگوں کے لیے جو پیغام دے رہی ہے، وہ یہ ہے کہ اگر وہ اللہ کا قرب چاہتے ہیں تو اس کے لیے ان کو لازم ہے کہ سیدنا محمدؐ کے اسوہ و مثال کی پیروی کریں۔

بشارت اور انتباہ Good News and Warning

سابقہ صفحات میں قرآن کی ایک ترکیب ''بشیر و نذیر'' (خوش خبری دینے والا، خبردار کرنے والا) ہماری نظر سے گذر چکی ہے۔ اس پر ہم نے تبصرہ نہیں کیا۔ اسلام کے تصورِ نبوّت کا خلاصہ پیش کرنے کے لیے مفید ہو گا کہ ان الفاظ میں پنہاں معانی پر غور کیا جائے۔ قرآن مجید نے یہ لفظ ''بشارت اور خوشخبری'' تقریباً ۴۰ آیات میں استعمال کیا ہے۔ قرآن میں لفظ ''بشریٰ'' اور اس سے متعلق الفاظ ان آیات میں ایک یا زیادہ پیغاماتِ نبوّت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ ان میں سے نصف آیات میں ''ڈرانے، خبردار کرنے'' (نذر اور متعلقہ الفاظ) کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے، لیکن یہاں خوشخبری کا کوئی ذکر نہیں۔ انبیا نے اپنی قوموں کو جو خبردار کیا تھا اس کا ذکر ہے۔ اس گنتی سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ نبوّت بشارت دینے سے کہیں زیادہ خبردار کرنے کا نام ہے۔ خبردار کرنے اور ڈرانے سے قدرتی طور پر انسان خوفزدہ ہوتا ہے اور بچتا ہے، جب کہ بشارت اور خوشخبری سن کر مسرور ہوتا ہے۔ شاید یہاں قرآن ہمیں یہ بتا رہا ہے کہ نبیوں کو بھیجنے سے اللہ تعالیٰ کا مقصد لوگوں کو خوش کرنے سے زیادہ یہ ہے کہ ان

کے دلوں میں خوف کو بیدار کیا جائے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ بات قرآن کے بارے میں عمومی طور پر بھی کہی جا سکتی ہے اور انسان کے بارے میں قرآن نے جو تصویر کھینچی ہے، اس کا بھی قدرتی نتیجہ یہی ہے۔

قرآن کے پیغام کو اگر سمجھنا ہو تو اس کتاب کے مصنف کی غرضِ تصنیف کو سامنے رکھنا ضروری ہو گا۔ اسلام کا کہنا ہے کہ یہ خدا کی کتاب ہے۔ اس کا حرف حرف لکھنے والے کی منشا میں رنگا ہوا ہے۔ یہ مصنف عام مصنّفین سے مختلف ہے جو اگرچہ اپنی کتابیں ایک غرض سے لکھتے ہیں، لیکن انھیں اس بات پر کوئی اختیار نہیں ہوتا کہ ان کی کتاب لوگ کس طریقے سے پڑھیں گے۔ کتابِ خداوندی کا مصنف علیم و خبیر ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے والے خود کو یوں نہیں جانتے جیسا کہ وہ انھیں جانتا ہے۔ اسے بخوبی علم ہے کہ اس کی کتاب کیوں کر سمجھی جائے گی۔ آپ یہ اعتراض تو کر سکتے ہیں کہ بہت سے لوگ یقیناً کتابِ خداوندی کے مصنف کے منشا کو غلط سمجھیں گے، لیکن اگر آپ توحید کے تصور کو اور خود اس کتاب کی گواہی کو سنجیدگی سے لیں تو یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ اس غلط فہمی کا اللہ تعالیٰ کو پہلے سے علم نہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ اس غلط فہمی کو اپنے کام کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ اور منشائے ربّانی اور اغراضِ انسانی لازم نہیں کہ ایک ہی ہوا کریں۔ یہ سب باتیں ہدایت اور گمراہی کے تصورات سے بے تعلق نہیں ہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسۡتَحۡیٖۤ اَنۡ یَّضۡرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوۡضَۃً فَمَا فَوۡقَہَا فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فَیَعۡلَمُوۡنَ اَنَّہُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّہِمۡ وَاَمَّا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَیَقُوۡلُوۡنَ مَا ذَاۤ اَرَادَ اللّٰہُ بِہٰذَا مَثَلًا یُضِلُّ بِہٖ کَثِیۡرًا وَّ یَہۡدِیۡ بِہٖ کَثِیۡرًا وَمَا یُضِلُّ بِہٖۤ اِلَّا الۡفٰسِقِیۡنَ (۲:۲۶)

اللہ اس بات سے نہیں شرماتا کہ وہ تمثیل بیان کرے خواہ وہ مچھر کی ہو یا اس سے بھی چھوٹی کسی چیز کی۔ تو جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہی بات حق ہے ان کے رب کی جانب سے۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا تو وہ کہتے ہیں کہ اس تمثیل کے بیان کرنے سے اللہ کا منشا کیا ہے؟ اللہ اس چیز سے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے اور وہ گمراہ نہیں کرتا، مگر ان لوگوں کو جو نافرمانی کرنے والے ہیں۔

وَ اِذَا قَرَاۡتَ الۡقُرۡاٰنَ جَعَلۡنَا بَیۡنَکَ وَبَیۡنَ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ حِجَابًا مَّسۡتُوۡرًا، وَّجَعَلۡنَا عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ اَکِنَّۃً اَنۡ یَّفۡقَہُوۡہُ وَفِیۡۤ اٰذَانِہِمۡ

اور جب تم قرآن سناتے ہو تو ہم تمھارے اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ایک مخفی پردہ حائل کر دیتے ہیں

وَقْرًا (۱۷:۴۵-۴۶)

اوران کے دلوں پر حجاب اوران کے کانوں میں بوجھ پیدا کر دیتے ہیں۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَ نَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا (۱۸:۵۷)

اوران سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جن کو ان کے رب کی آیات کے ذریعے سے یاددہانی کی جائے تو وہ اس سے اعراض کریں اور اپنے ہاتھوں کے کرتوت بھول جائیں اور ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں کہ وہ اس کو نہ سمجھیں اوران کے کانوں میں ڈاٹ دے دی ہے (کہ اس کو نہ سنیں)۔ اس وجہ سے تم ان کو ہدایت کی طرف کتنا ہی بلاؤ، وہ کبھی ہدایت پانے والے نہیں۔

تو پھر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کیوں نازل کیا۔اس سوال کے جواب دینے کے کئی طریقے ہیں۔ سادہ انداز میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ قرآنِ مجید نازل کرنے سے اللہ تعالیٰ کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو ہمیشہ رہنے والی خوشی اور راحت کی خوشخبری دی جائے۔ یہ خوشی انسان کا پیدائشی حق ہے، لیکن ساتھ ہی اسے یہ بھی بتا دیا جائے کہ یہ خوشی اسے یونہی خود ہی سے حاصل نہیں ہو جائے گی۔حقوق ہوں گے تو ذمہ داریاں اور فرائض بھی ہوں گے۔اگر آپ کوئی چیز بننا چاہتے ہیں، کوئی مرتبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں، اللہ کے بندے اور خلیفۃ اللہ بننا چاہتے ہیں تو آپ کو اپنے عمل کا حساب کرنا ہوگا۔

قرآن یقینی طور پر تاریخ کی ایک کتاب کے طور پر نہیں آیا۔اگر تاریخ سے ہماری مراد تاریخی واقعات کی فہرست بنانا اور ترتیب لگانا ہو تو قرآن میں بارہا تاریخی واقعات کے حوالے اور اشارے آئے ہیں، اور کوئی وجہ نہیں کہ جس طرح یہ واقعات اللہ تعالیٰ نے بیان کیے ہیں، اس میں شک کیا جائے، اور یہ سوچا جائے کہ شاید واقعہ کسی اور طرح ہوا ہوگا، تاہم اللہ تعالیٰ جب بھی کوئی تاریخی قصہ بیان کرتے ہیں تو وہ کسی خاص نکتے اور سبق کو اُجاگر کرنے کے لیے ہوتا ہے۔اللہ کو سب سے بہتر معلوم ہے کہ اس موقع پر کہانی کیوں کر کہی جائے۔علاوہ ازیں قرآن اللہ کی نشانیوں پر جس طرح زور دیتا ہے، اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہم جس چیز کو اصل واقعہ کہہ رہے ہیں اللہ کا منشا اس کی

تعریف بیان کرنا نہیں کچھ اور ہے۔ اس کا پیغام وعدہ بھی ہے اور وعید بھی۔ یہ قوتِ عمل کے لیے مہمیز ہے۔ تاریخی واقعے کا معروضی، غیر جانبدارانہ بیان نہیں۔ معروضی حقائق انسانی نیت اور انسان کے منشا اور اس کی شرح وتعبیر سے الگ کوئی وجود رکھتے ہیں، یہ خیال ایک سراسر جدید اختراع ہے اور آج یہ تصور اپنی ساری کشش کھو کر اگر کہیں زندہ ہے تو عوام کی عامیانہ ثقافت میں۔ کتابِ خداوندی کے الفاظ اس غرض سے نازل نہیں کیے گئے کہ وہ ہمارے لیے معلومات اور اطلاعات کے اِدھر اُدھر کے ٹکڑے فراہم کر دیں تاکہ ہمارا ذخیرۂ مہملات وسیع تر ہوتا رہے۔ کلامِ خداوندی کا منشا یہ ہے کہ انسان کو یہ یاد آتا رہے کہ انسان ہونے کے معنی کیا ہیں۔

انسان وہ ہے جو صورتِ الٰہیہ پر خلق کیا گیا اور جسے اللہ کے دو ہاتھوں نے ڈھالا۔ انسان ہونے کا مطلب ہے ساری صفاتِ خداوندی کو اپنے اندر سمو لینا اور اللہ تعالیٰ کے جلال و جمال، رحمت وغضب، کرم اور قہر کا مظہر بن کر دکھانا۔ اس کا مطلب ہے توحید کے مطابق زندگی گذارنا۔ اس کی صفاتِ جلال وغضب کے سامنے انسان کا مفہوم ہے اللہ کا بندہ، اس کا غلام۔ اس کی صفاتِ جمال ورحمت کے روبرو انسان کے معنی ہیں خلیفۃ اللہ۔ تنزیہ کا تقاضا ہے انسان اللہ تعالیٰ کو خود سے ماورا اور بے انتہا دور جانے اور بے انتہا مختلف، جب کہ تشبیہ یہ چاہتی ہے کہ انسان اسے اپنے نزدیک جانے اور اپنی شہ رگ سے قریب پائے۔

لیکن نوعِ انسانی کی یہ تصویر صرف ان افراد پر صادق آتی ہے جنھوں نے اس ''بارِ امانت'' کو ٹھیک سے اٹھایا اور اپنی فطرت، اپنی سرشتِ انسانی کو عملی حقیقت بنا دیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے نازل کردہ ''ذکر'' کو کان دھر کے سنتے ہیں اور یادِ خداوندی کے ذریعے اس کا جواب دیتے ہیں، اس سے لو لگاتے ہیں۔ ایسے لوگ بہت کم یاب ہیں۔ صرف انبیا اور خدا دوست لوگوں میں سے چند لوگ ''توحید'' کے اس درجے کے مطابق زندگی گذارتے ہیں۔ باقی کے لوگوں پر یا تو ''غفلت'' کا مکمل غلبہ ہوتا ہے یا وہ انبیا کی تعلیم و ہدایت کے مطابق زندگی کو ترتیب دینے کی راہ پر چلتے ہوئے اس کے کسی نہ کسی مرحلے سے گذر رہے ہوتے ہیں۔

اکثر لوگ اللہ سے غافل اور اپنی قدرتی سرشت ونہاد سے بے خبر ہوتے ہیں۔ اس بات کو مان کر چلیں تو سب سے پہلے انسانوں کو اس بات سے آگاہ کرنا ضروری ہے کہ وہ جس جگہ کھڑے ہیں، جس صورتِ حال سے دوچار ہیں، وہ کوئی آئیڈیل صورتِ حال نہیں ہے۔ ان کے ذہن میں یہ خیال اجاگر کرنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے دور ہے اور دور ہی رہے گا، اگر وہ اپنے آپ کو بدلنے کے لیے کوئی کوشش نہیں کریں گے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِهِمۡ (۱۳:۱۱) — اللہ کسی قوم کے ساتھ اپنا معاملہ اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی روش تبدیل نہ کرے۔

اس میں کوئی شک نہیں:

وَهُوَ مَعَكُمۡ اَيۡنَ مَا كُنۡتُمۡ (۵۷:۴) — وہ تمھارے ساتھ ہے، جہاں کہیں تم ہو۔

لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ہم اللہ کے ساتھ ہیں۔ حضورِ خداوندی کا شعور اور آگہی انسان کو پیدا کرنا پڑتی ہے اور یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے، کیونکہ اس مقام تک پہنچنے کے لیے انسان کو سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کے مطابق اللہ کا بندہ بننا پڑتا ہے۔

جو باتیں لوگوں کو حقیقی معلوم نہیں ہوتیں، ان کے بارے میں وہ طبعی طور پر لاپروا ہو جاتے ہیں۔ والدین، اساتذہ اور معالجین آپ کو شراب نوشی اور منشیات کے تباہ کن اثرات کے بارے میں خبردار کرتے رہتے ہیں، لیکن کئی لوگ ان کی بات پر کوئی دھیان نہیں دیتے۔ سائنسدان دہائی دیتے رہتے ہیں کہ فضائی آلودگی ہماری دنیا کو تاخت و تاراج کر رہی ہے، لیکن لوگوں کی اکثریت کے لیے ماحول کا مسئلہ دوسروں کا دردِ سر ہے۔ ہم میں سے جن لوگوں میں قدرتی ماحول کو کوڑے کرکٹ کا ایسا ہولناک ڈھیر بنانے کی عادت پختہ ہو چکی ہے جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی وہ کسی طرح اس بات پر آمادہ نہیں ہوتے کہ اپنے پوتوں پڑپوتوں کی خاطر اپنے ''گراں قدر'' طرزِ زیست کی کسی بھی اہم چیز سے دستبردار ہو جائیں۔ ہم نے فرض کر رکھا ہے کہ ''وہ'' (تیسری دنیا کے لوگ) اس بات کے ذمہ دار ہیں کہ اپنے جنگلات کی حفاظت کے لیے کچھ نہ کچھ کریں، کیونکہ ''ہم'' (جنھوں نے اپنے طبعی قدرتی ماحول کو پہلے ہی ملیامیٹ کر رکھا ہے) اس بات کے حقدار ہیں کہ حالات کو ان کے ڈھرے پر چلنے دیں اور اپنے طور طریقوں کی خرابی کو دور کرنے کے لیے کوئی کوشش نہ کریں۔

زندگی کے عام تجربوں سے ہم بہت سی اور مثالیں پیش کر سکتے ہیں۔ نکتہ صرف یہ ہے کہ عام قاعدہ کلیہ یہی ہے کہ لوگ باگ عموماً بے خبر، کل کی فکر سے غافل اور اپنے نفس کے بندے ہوتے ہیں۔ انھیں مستقبل کے فائدے کے بارے میں جتنا بھی بتاتے رہیے، وہ متاعِ وقت کو ہاتھ سے دینے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ اسے کس طرح کے کند ذہن لوگوں سے معاملہ کرنا ہے۔ کارِ خداوندی اس ضمن میں یہ ہے کہ انھیں جھنجوڑ کر بیدار کیا جائے اور وہ انبیا کو مبعوث کر کے یہی کام کیا کرتا ہے۔ كَلِّمُ النَّاسَ عَلٰى قَدۡرِ عُقُوۡلِهِمۡ[۵۷] (لوگوں سے ان کی سمجھ کے مطابق بات کیا کرو) ارشادِ نبیؐ ہے۔ والدین سے بات کرنا اور انداز سے ہوتا ہے اور چھوٹی ناسمجھ بہن

سے گفتگو کسی اور ڈھب سے۔ دوست سے گپ لڑانے کا طریقہ الگ ہے اور پالتو جانور کو پکارنے کا اسلوب جدا۔ اسی لیے اللہ کے پیغام کا بھی اس کے مخاطب لوگوں کی سمجھ بوجھ کے مطابق ہونا ضروری ہے۔

انسان سے کلام کرنے میں اللہ تعالیٰ کا طرزِ خطاب کیا ہوتا ہے؟ اسے سکھانے کے لیے اللہ تعالیٰ کیا ترکیب استعمال کرتے ہیں؟ بنیادی طور پر یہ وہی ترغیب اور دھمکی کی ترکیب ہے، چابک اور چھڑی پر لٹکی ہوئی گاجر والا حربہ جو بدشوق اور کند ذہن طالب علموں کے سلسلے میں برتا جاتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہم نے سابقہ صفحات میں جو کچھ بیان کیا ہے اس کے الٰہیاتی مضمرات کی بنا پر یہاں چھڑی پہلے ہے اور گاجر بعد میں۔ اللہ تعالیٰ جو ''الحق'' بھی ہے اور ''الرحمٰن'' بھی، اپنی مخلوق سے بہت ماورا ہے اور یہ خدشہ ہر دم لگا رہتا ہے کہ انسان حقیقت و رحمت سے دوری میں پڑا رہ جائے۔ ایسا ہوا تو انسان پر اللہ کے اسمائے ''تنزیہ'' ہی کا غلبہ رہے گا، جلال، قہر، غضب اور انتقام کا غلبہ، تاہم اللہ کا قرب حاصل کرنا ممکن ہے مگر اس کے لیے انسان کو اللہ کی صفاتِ تشبیہ سے مانوس اور جمال، لطف، رحمت اور عفو و درگذر کا خوگر ہونا ہوگا۔

اگر انبیا کو بھیجنے سے اللہ کی غرض یہ ہے کہ لوگوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا جائے تو یہ دونوں الفاظ ''بشریٰ'' اور ''انذار'' (خوشخبری دینا اور خبردار کرنا) اس بات کو بہت خوبصورتی سے بیان کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انسان کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ کون ہے اور اس بات سے خبردار کرنا چاہتے ہیں کہ اگر وہ اس بارِ امانت کو اٹھانے سے گریز کرے گا جو سرشتِ انسانی میں داخل ہے تو اس کے نتائج خود اسی کو بھگتنا ہوں گے۔

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ (۶:۴۸) (۱۸:۵۶)	اور ہم رسولوں کو تو صرف خوشخبری دینے والے اور خبردار کرنے والے ہی بنا کر بھیجتے ہیں۔
قُلِ اللّٰهُ ۚ شَهِيْدٌۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۚ وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ (۶:۱۹)	کہو: اللہ۔ وہ میرے اور تمھارے درمیان گواہ ہے۔ اور مجھ پر یہ قرآن وحی کیا گیا ہے کہ میں بھی اس سے تم کو خبردار کروں اور وہ بھی جن کو یہ پہنچے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو تنبیہ کی ہے اور جس بات سے ڈرایا ہے، اس کا توحید سے گہرا تعلق ہے۔ چونکہ حقیقت اگر ہے تو صرف ایک ہی، سو ہر وہ شخص جو اللہ کے سوا کسی اور چیز کو حقیقی جانتا ہے، شرک میں پڑا ہوا ہے اور شرک ناقابلِ معافی گناہ ہے۔

اَنۡ اَنۡذِرُوۡۤا اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاتَّقُوۡنِ(۱۶:۲)

کہ لوگوں کو آگاہ کردو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تو مجھ ہی سے ڈرو۔

اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی انسان کو خدا سے دور کر دیتی ہے۔ اسی خاطر اللہ تعالیٰ انسان کو اس درد والم اور عذاب سے خبردار کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے القہار اور المنتقم جیسے اسما کے انسانی لوازم ہیں۔ نارِ جہنم، عذاب اور حشر کے علاوہ قرآنِ مجید خاص طور پر قیامت کے دن سے انسان کو ڈراتا ہے، جب انسان اپنے رب کے روبرو ہوگا۔ انسان نے جیسا تعلق اللہ سے قائم کیا ہوگا، اسی کے لحاظ سے اسے خدا کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اگر وہ اس سے دوری اور بُعد میں پڑا ہوا تھا تو وہ اللہ کے غضب اور چہرۂ انتقام کا سامنا کرے گا اور اگر اس نے راہِ خدا پر گامزن ہونے کی اپنی سی کوشش کی ہوگی تو رحمت اور مغفرت اس کا استقبال کرے گی۔

فَاَنۡذَرۡتُكُمۡ نَارًا تَلَظّٰى ۚ لَا يَصۡلٰٮهَاۤ اِلَّا الۡاَشۡقَى (۱۵-۱۴:۹۲)

سو میں نے تمھیں دہکتی آگ سے خبردار کر دیا ہے۔ اس میں سب سے بڑا بدبخت ہی پڑے گا۔

وَسِيۡقَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا... اَلَمۡ يَاۡتِكُمۡ رُسُلٌ مِّنۡكُمۡ يَتۡلُوۡنَ عَلَيۡكُمۡ اٰيٰتِ رَبِّكُمۡ وَيُنۡذِرُوۡنَكُمۡ لِقَآءَ يَوۡمِكُمۡ هٰذَا (۷۱:۳۹)

اور جو منکر تھے وہ گروہ در گروہ ہانک کر جہنم کی طرف لے جائے جائیں گے۔ کیا تمھارے پاس تمھی میں سے رسول نہیں آئے تھے، اپنے رب کی آیات پڑھتے اور تم کو اس دن کی تمھاری ملاقات سے خبردار کرتے ہوئے؟

يَوۡمَ هُمۡ بَارِزُوۡنَ لَا يَخۡفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنۡهُمۡ شَىۡءٌ (۱۶-۱۵:۴۰)

تاکہ ان کو روزِ ملاقات سے آگاہ کردے جس دن وہ خدا کے آگے بالکل بے نقاب ہوں گے۔ ان کی کوئی چیز بھی خدا سے مخفی نہیں ہوگی۔

وَاَنۡذِرۡهُمۡ يَوۡمَ الۡاٰزِفَةِ اِذِ الۡقُلُوۡبُ لَدَى الۡحَنَاجِرِ كٰظِمِيۡنَ مَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ حَمِيۡمٍ وَّلَا شَفِيۡعٍ يُّطَاعُ (۱۸:۴۰)

اور ان کو قریب آ لگنے والی آفت کے دن سے ڈرا جب کہ دل حلق میں آن پھنسیں گے اور وہ غم سے گھٹے ہوئے ہوں گے۔ اس روز ظالموں کا نہ کوئی ہمدرد ہوگا اور نہ کوئی سفارشی جس کی بات سنی جائے۔

قرآن یہ چیز واضح کر دیتا ہے کہ اس کے خبردار کرنے کا اثر صرف ان لوگوں پر ہوتا ہے جو اہلِ ایمان ہیں۔ دوسرے لوگ اس کے ڈرانے کو سنجیدگی سے نہیں لیتے۔

اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ (۳۵:۱۸)	تم تو بس انھی لوگوں کو ڈرا سکتے ہو جو غیب میں رہتے اپنے رب سے ڈرتے اور نماز کا اہتمام کرتے ہیں۔
وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۔ اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّ اَجْرٍ كَرِيْمٍ (۳۶:۱۰-۱۱)	اور ان کے لیے یکساں ہے، ان کو ڈراؤ یا نہ ڈراؤ۔ وہ ایمان نہیں لانے کے۔ تم تو بس انھی کو ڈرا سکتے ہو جو نصیحت پر دھیان کریں اور غیب میں خدائے رحمان سے ڈریں۔ سو ایسے لوگوں کو مغفرت اور باعزت صلہ کی بشارت دو۔

سوال کیا جا سکتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو یہ معلوم ہے کہ لوگ سنی ان سنی کر دیں گے تو پھر آخر وہ انھیں خبردار کرنے کی زحمت کیوں کرتا ہے؟ جواب ہے عدلِ خداوندی۔ ظلم ایک انسانی خاصیت ہے۔ یہ صفتِ خداوندی نہیں ہے۔ کل کو کوئی شخص بھی یہ نہیں کہہ سکے گا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے راہِ راست سے ہٹا دیا۔ وہ ہر انسان کو اچھی طرح خبردار کر دیتا ہے۔ پھر بھی اگر وہ غفلت سے بیدار نہ ہوں، پیغامِ خداوندی پر کان نہ دھریں تو قصور انھی کا ہوگا۔ ملامت انھیں کو کی جائے گی۔ وہ رسّہ جس سے انسان خود کو پھانسی دیتا ہے، اس کے اپنے ہاتھوں ہی کا بٹا ہوا ہوتا ہے۔

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (۳:۱۸۲)	یہ تمھارے اپنے ہی ہاتھوں کی کرتوت ہے اور اللہ اپنے بندوں کے ساتھ ذرا بھی ناانصافی کرنے والا نہیں۔
اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَ هٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ وَ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۔ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ	ہم نے تم پر اس طرح وحی کی ہے جس طرح نوح اور ان کے بعد آنے والے نبیوں پر وحی کی۔ اور ہم نے ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب، اولادِ یعقوب، عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان پر وحی بھیجی، اور ہم نے داؤد کو زبور

قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا، رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا (۴:۱۶۳-۱۶۵)

عطا کی، اور دوسرے بھی بہت سے رسولوں پر وحی بھیجی جن کا حال ہم تم کو پہلے سے سنا چکے ہیں اور بہت سے رسولوں کا حال نہیں سنایا، اور موسیٰ سے تو اللہ نے کلام کیا۔ اللہ نے رسولوں کو خوشخبری دینے والا اور ہوشیار کرنے والا بنا کر بھیجا تا کہ ان رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے اللہ کے سامنے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

قرآن اگرچہ اللہ کے غضب اور اس کے نتائج پر زور دیتا ہے، لیکن اکثر یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ رحمتِ خداوندی وہ صفت ہے جو سب صفات سے بڑھی ہوئی ہے۔ وہ اپنے بندوں سے ناراض ہو جاتا ہے، لیکن اس کا غضب بھی اس کی رحمت کے زیرِ تدبیر ہے۔ وہ اپنے غضب کا اظہار صرف اس لیے کرتا ہے کہ انسان ہوش میں آئے۔ اس قہر کا مقصد یہ ہے کہ اپنے بندوں سے انتہائی تلطّف کا معاملہ کرے۔ ہمیں اس وقت تعجب نہیں ہوتا جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ لوگ صرف محبت اور شفقت کی وجہ سے اپنی اولاد سے سختی سے پیش آتے ہیں، تو اس بات میں کیا اچنبھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی سرزنش اور سزا ان کی اصلاح اور ان کے فائدے کے لیے کرتا ہے۔ اللہ کے نبی جو بشارتیں لے کر آتے ہیں، ان کا گہرا تعلق ان صفاتِ خداوندی سے ہے جو رحمت، جمال اور لطف و کرم کی صفات ہیں۔ قرآن بار بار انسان سے یہ کہتا ہے کہ اس کے ڈرانے میں جو سختی اور شدت ہے، اس کے کارن ناامید نہ ہو اور الحق کے روبرو اپنی نارسائیوں اور کوتاہیوں کو دیکھ کر ہمت نہ ہارے۔

قُلْ يٰعِبَادِیَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (۳۹:۵۳)

کہ دو اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں۔ اللہ تمام گناہوں کو بخش دے گا۔ وہ بڑا ہی بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

وہ لوگ جو پیامِ خداوندی کو کھلے کانوں سے سنتے ہیں، وہ ''الرحمٰن'' سے ڈرتے بھی ہیں۔ خطرے کا سامنا ہو تو قدرتی انسانی ردِّعمل یہ ہوتا ہے کہ اس سے دور بھاگا جائے، لیکن اگر معاملہ خوفِ رحمت کا

ہوتو صرف یہ اندیشہ رہے گا کہ رحمت سے محروم نہ ہونا پڑے۔ وہ لوگ جو اللہ سے ڈرتے ہیں، اس سے دور نہیں بھاگتے، اس کی جانب بڑھتے ہیں۔ بہرکیف، چونکہ اللہ ہی حقیقت ہے، سب راستے اسی کی طرف جاتے ہیں، اس سے ہٹ کر اور راہِ فرار انسان کے پاس ہے ہی کہاں۔ پس وہ رسولِ خداؐ کی مناجات کی پیروی کرتے ہیں، ''میں تیرے غضب سے تیری رضا کی پناہ لیتا ہوں، تیرے عذاب سے تیری مغفرت کی پناہ لیتا ہوں اور تجھ سے تیری ہی پناہ میں آتا ہوں۔''

انسان کو اللہ کے غضب سے بچنا چاہیے اور اس کی رحمت سے چمٹے رہنا چاہیے، یعنی ''شرک'' سے گریزاں ہو کر ''توحید'' کی جانب بڑھنا چاہیے۔ کثرت سے وحدت کا سفر کرنا چاہیے۔ غور فرمایئے گا کہ مندرجہ ذیل آیات میں ''انذار'' کو کس طرح اللہ'' کی طرف'' بھاگنے اور ''توحید'' کے اثبات سے متعلق کیا گیا ہے کہ یہی وہ واحد وسیلہ ہے جو قربِ خداوندی کی ضمانت دیتا ہے۔

فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ اِنِّىْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۔ وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ اِنِّىْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (۵۱:۵۰-۵۱)

پس اللہ کی طرف بھاگو! میں اس کی طرف سے تمھارے لیے ایک کھلا ڈرانے والا ہوں۔ اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو شریک نہ بناؤ۔ میں اس کی طرف سے تمھارے لیے کھلا ڈرانے والا ہوں۔

انبیا کی لائی ہوئی بشارتوں اور خوشخبری پر فرحت و شادمانی ان لوگوں کے لیے ہے جو اللہ کی پناہ میں آجاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے پیامِ ہدایت کو قبول کر کے سرِتسلیم خم کر دیتے ہیں، بلکہ یوں کہیے کہ جو اس پیامِ ہدایت پر ایمان لاتے ہیں (کہ فقط تسلیم کر لینا اس امر کے لیے کفایت نہیں کرتا) اور اس پیغامِ ہدایت پر اس طرح عمل پیرا ہوتے ہیں کہ ان کے اندر حضرت آدمؑ اور دیگر انبیا کے اخلاق و اوصاف اور نیکیاں نمو حاصل کر کے ہویدا ہوتی چلی جاتی ہیں۔ جیسے صبر، تواضع، انکسار، تقویٰ اور دیگر صفات۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۲:۲۲۳)

اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ تمھیں اس سے لازماً ملنا ہے اور ایمان والوں کو خوشخبری ہے۔

وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ۔ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَآ اَصَابَهُمْ

اور خوشخبری دو ان کو جن کے دل خدا کے آگے جھکے ہوئے ہیں، جن کا حال یہ ہے کہ

وَالْمُقِيْمِی الصَّلٰوۃِ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۲۲:۳۴-۳۵)	جب ان کے سامنے خدا کا ذکر آتا ہے، ان کے دل دہل جاتے ہیں۔ ان پر جو مصیبت آتی ہے اس پر صبر کرنے والے اور نماز کا اہتمام رکھنے والے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو بخشا ہے، اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں۔
اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۔ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِی الْحَيٰوۃِ الدُّنْيَا وَ فِی الْاٰخِرَۃِ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۱۰:۶۳-۶۴)	ان کے لیے خوشخبری ہے دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اللہ کی باتوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔
طٰسٓ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۔ هُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۔ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَۃِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۔ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ (۲۷:۱-۴)	یہ طٰس ہے۔ یہ قرآن اور ایک واضح کتاب کی آیات ہیں۔ یہ ہدایت وبشارت ہے ان ایمان والوں کے لیے جو نماز کا اہتمام کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہی ہیں جو آخرت میں یقین رکھتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ قرآن مجید نازل کرنے سے اللہ تعالیٰ کا جو منشا ہے، وہ تبھی سمجھ میں آتا ہے جب اسے ''توحید'' کے سیاق وسباق میں رکھیے اور انسان کی منزلِ آخرین اور مآل وانجام کے تناظر میں دیکھیے۔ ''توحید'' پر گفتگو تمام ہوئی۔ اب ہم حیاتِ انسانی کے مآل وانجام کی طرف آتے ہیں۔ انسان کہاں سے آیا ہے اور اسے لوٹ کر کہاں جانا ہے؟ اللہ کے پاس۔ اگلے باب کا موضوع یہی ہوگا، معاد، سفرِ آخرت اور اللہ کے ہاں لوٹ جانے کے مراحل۔

باب پنجم

آخرت The Return

اسلام کے سارے عقائد اور تمام عبادات کی تہ میں ایک خیال کارفرما ہے، اللہ کی طرف لوٹنے کا خیال، معاد اور آخرت۔ اس کو سمجھے بغیر ''توحید'' اور نبوّت کی معنویت گرفت میں نہیں آتی، نہ توحید و رسالت کو حوالہ بنائے بغیر معاد کی معنویت واضح ہوتی ہے۔ ایمان کے یہ تینوں اصول مل کر اسلام کے بنیادی عقائد کے معانی کی تفصیل فراہم کرتے ہیں اور یوں اس تفصیل کی بنیاد پر ''اللہ'' کے لفظ کا وہ مفہوم اُجاگر ہوتا ہے جو قرآن مجید میں نازل ہوا ہے۔ توحید، رسالت اور معاد تینوں ایک ہی پیغام کے تین رخ ہیں۔ ان میں سے کسی پر بھی بات کیجیے، کسی کی تحقیق کے لیے نکلیے، باقی دونوں کو نگاہ میں رکھنا پڑتا ہے۔

ایک اعتبار سے یہ کہنا درست ہے کہ رسالت کی بحث دوسری شہادت ''محمد رسول اللہ'' کی بنیاد پر ضروری ٹھہرتی ہے، لیکن دوسری شہادت کا مدار خود ''توحید'' پر ہے اور توحید کا تقاضا ہے کہ ''تنزیہ'' اور ''تشبیہ'' دونوں موجود ہوں۔ اگر یہ بات سمجھ لی جائے کہ اللہ تعالیٰ کے دو ہاتھ ہیں اور یہ کہ اس کا دایاں اور رحمانی ہاتھ اس کے بائیں اور قہرمانی ہاتھ سے اوپر ہے تو یہ دوسرا نکتہ بھی فی الفور سمجھ میں آ جاتا ہے کہ اللہ اور اس کی مخلوق میں جو رشتہ ہے، اس میں رحمتِ خداوندی کا کردار، اس کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ اپنی رحمت کی طرف لوگوں کو بلانے کے لیے اللہ تعالیٰ رسولوں اور نبیوں کو بھیجتا ہے جو خبردار بھی کرتے ہیں اور بشارت بھی دیتے ہیں۔

ساری اقلیمِ حقیقت، خدا تعالیٰ اور عالَمِ غیب و شہادت سبھی، انسان کی فلاح و بہبود چاہتے ہیں۔ اس تعلق کو ہدایت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ بطورِ الھادی الحق کا بنیادی منشا یہ ہے کہ انسان کی سعادت اور کمال و فلاح کا سامان کر دیا جائے، لیکن اس میں اللہ کے دونوں ہاتھ کارفرما ہیں۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ انسان اس کے دائیں ہاتھ پر تو توجہ مرکوز رکھے اور بائیں ہاتھ کو نظر انداز کر دے۔ دایاں ہاتھ اگر لوگوں کو ابدی مسرت کی نوید سناتا ہے اور ہمیشہ رہنے والی خوشی کی بشارت دیتا ہے تو ساتھ ہی اس بات سے بھی خبردار کرتا ہے کہ انسان بائیں ہاتھ کی پرچھائیں تلے زندگی بسر کر رہا ہے اور اسے لازم ہے کہ اس زندگی کو اس طرح مرتب کرے کہ اس پر سے بائیں ہاتھ کی یہ پرچھائیں ہٹتی چلی جائے۔

یہ تو تھا توحید و رسالت کا مختصر بیان۔ انسانی نقطۂ نظر سے یہاں جو بات سب سے اہم ہے، وہ یہ ہے کہ اُس کی خوش انجامی کی کوئی لازمی ضمانت نہیں ہے۔ انسان کی آزادیِ اختیار ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ انسان اِس سلسلے میں کافی آزاد ہے کہ اللہ کے دامانِ رحمت کے سائے تلے آنے کے تجربے کو ٹالتا رہے، مؤخر کرتا رہے۔

اسلام میں تصورِ آخرت اور معاد کی بحث کی بنیاد انسانی سرشت اور انسانی مسرت کے ایک خاص تصور پر استوار کی گئی ہے۔ اس تصور کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم انسانی نکبت اور بدبختی کی نوعیت کو بھی سمجھیں۔ ہم اس سے پہلے ''عہدِ الست''، ''فطرت''، ''بارِامانت''، ''عبدیت'' اور ''خلافت'' کے تصورات پر گفتگو کر چکے ہیں۔ اب ہم انسانی ذمہ داری اور اس کی جواب دہی پر گفتگو کریں گے یا یوں کہیے کہ ''بارِامانت'' اٹھانے کے تقاضوں اور اس کے نتائج پر بات ہوگی۔

معاد و آخرت کی بحث کو عموماً دو حصوں میں بانٹا جاتا ہے۔ ان کو ''معادِ اختیاری'' اور ''معادِ اضطراری'' کا نام دیا گیا ہے۔ اس تقسیم سے آپ کو اسلام اور عبدیت کی دو قسمیں یاد آئیں گی جن پر پہلے تبصرہ کیا گیا تھا، یعنی کائناتی، عالمگیر ''اسلام'' اور ''اسلام'' نبوی نیز اختیاری بندگی اور اضطراری بندگی۔

اپنی خلقی سرشت و فطرت کے لحاظ سے نوعِ انسانی اللہ کے سامنے سرافگندہ اور مطیع ہونے پر مجبور ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس امر کے لیے آزاد بھی ہے کہ انبیا کے لائے ہوئے پیغام کو قبول کر لے یا اس سے منہ موڑ لے۔ اس طرح انسان کے پاس اللہ کی طرف لوٹ جانے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ ایک روز سبھی کو اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ ہر انسان کو موت آئے گی اور ہر شخص اللہ کے حضور میں پہنچے گا۔ ہاں اس دنیا سے رخصت ہونے کا انداز الگ الگ ہوتا ہے۔ کچھ لوگ خوشی خوشی یہ جانتے ہوئے رخصت ہوں گے کہ انھوں نے پیغمبروں کے لائے ہوئے احکام و ہدایات کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا تھا اور اللہ تعالیٰ اپنے کہے ہوئے کے خلاف نہیں کریں گے، ان کا وعدہ پورا ہوگا۔ کچھ دوسرے ایسے بھی ہوں گے جنھیں گردن سے پکڑ کر کھینچا جائے گا۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (۳:۱۸۵)	ہر جان کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔
يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ (۸٤:٦)	اے انسان تو بھی کشاں کشاں اپنے پروردگار کی طرف جا رہا ہے اور اس سے ملنے والا ہے۔
وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	اللہ نے ان لوگوں سے جو ان میں سے ایمان

مِنۡهُمۡ مَّغۡفِرَةً وَّاَجۡرًا عَظِيۡمًا (۴۸:۲۹)

لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے، مغفرت اور ایک اجرِ عظیم کا وعدہ کیا ہے۔

وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدۡخِلُهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَاۤ اَبَدًا وَعۡدَ اللّٰهِ حَقًّا وَمَنۡ اَصۡدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيۡلًا (۴:۱۲۲)

اور جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیے ہم ان کو ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن میں نہریں جاری ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کا وعدہ حق جانو اور اللہ سے زیادہ وعدے کا سچا کون ہوسکتا ہے!

اَلَاۤ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰـكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ (۱۰:۵۵)

سن رکھو کہ اللہ کا وعدہ شدنی ہے، لیکن ان کے اکثر اس بات کو نہیں جانتے۔

قُلۡ اِنَّ الۡمَوۡتَ الَّذِىۡ تَفِرُّوۡنَ مِنۡهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيۡكُمۡ ثُمَّ تُرَدُّوۡنَ اِلٰى عٰلِمِ الۡغَيۡبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ (۶۲:۸)

ان کو بتا دو کہ جس موت سے تم بھاگ رہے ہو، وہ یقیناً تم سے دوچار ہو کر رہے گی، پھر تم غائب وحاضر کے جاننے والے کے سامنے حاضر کیے جاؤ گے۔ پس وہ تم کو ان سارے اعمال سے آگاہ کرے گا جو تم کرتے رہے ہو۔

وَلَوۡ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوۡنَ فِىۡ غَمَرٰتِ الۡمَوۡتِ وَالۡمَلٰۤئِكَةُ بَاسِطُوۡۤا اَيۡدِيۡهِمۡ اَخۡرِجُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ (۶:۹۴)

اگر تم دیکھ پاتے اس وقت کو جب یہ ظالم موت کی جان کنیوں میں ہوں گے اور فرشتے ہاتھ بڑھائے ہوئے مطالبہ کر رہے ہوں گے کہ اپنی جان حوالہ کرو۔

موت کے بعد تو ہر انسان کو مجبوراً لوٹ کر اللہ کے پاس جانا ہی ہے، لیکن اگر وہ چاہے تو اس دنیا کی زندگی میں بھی اللہ کی طرف رجوع کرنے کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ اللہ کا بندہ بننے سے وہ راہ کھلتی ہے جو اللہ کے قرب تک لے جاتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مرنے سے پہلے وہ اللہ تک پہنچ جائے (یہ وہ مقصد اور منزل ہے جس پر اسلام کی تیسری جہت میں زور دیا جاتا ہے) یا پھر وقتِ مرگ اس پر یہ کھلے کہ وہ الحق سے نسبتاً زیادہ قریب آ چکا ہے۔ پس ایسے لوگ کہیں زیادہ مکمل اور مقرّب ہوں گے بہ نسبت ان لوگوں کے جو پیغامِ خداوندی سے منہ موڑ کر اپنی زندگی کو اپنی اغراض اور خواہشات کے مطابق بسر کرتے رہے۔

معاد (لوٹنا، واپس ہونا) کا لفظ ہمیں اس نکتے سے آگاہ کرتا ہے کہ وہ مصنّفین جو اس موضوع کو زیرِ غور لاتے ہیں، وہ صرف اس بات تک بحث کو محدود نہیں رکھتے کہ انسان کہاں جا رہا ہے۔ وہ اس نکتے پر بھی کلام کرتے ہیں کہ انسان آیا کہاں سے ہے۔ انسان اگر ''لوٹ کر'' جا رہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ پہلے وہاں تھا جہاں اب واپس جا رہا ہے۔ انسان آیا کہاں سے ہے، عام طور پر یہ بحث ایک اور عنوان کے تحت کی جاتی ہے، یعنی ''آغاز و ابتدا'' (مبدأ)۔ بہت سی کتابوں کا تو نام ہی اس پر رکھا جاتا ہے ''المبدأ والمعاد'' یعنی آغاز و انتہا، یا ان کتب کے عنوان میں ''مبدأ'' اور ''معاد'' کے الفاظ کسی طرح شامل ہوتے ہیں۔

''مبدأ'' (آغاز) اور ''معاد'' (واپسی، منتہا) دونوں الفاظ قرآنی اصطلاحات سے اخذ کیے گئے ہیں، اگرچہ قرآن مجید نے اس مفہوم کے لیے اور بھی کئی الفاظ استعمال کیے ہیں۔

كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ (۷:۲۹)	جس طرح اس نے تمھارا آغاز کیا، اسی طرح تم لوٹو گے۔
وَهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۴۱:۲۱)	اور وہی ہے جس نے تمھیں پہلی بار پیدا کیا اور اسی کی جانب لوٹائے جا رہے ہو۔
كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ (۲۱:۱۰۴)	جس طرح ہم نے پہلی خلقت کا آغاز کیا، اسی طرح ہم پھر اس کا اعادہ کریں گے۔
اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ (۱۰:۴)	اسی کی طرف تم سب کو لوٹنا ہے۔ یہ اللہ کا پکا وعدہ ہے۔ بے شک وہی خلق کا آغاز کرتا ہے پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا تاکہ جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے ان کو عدل کے ساتھ بدلہ دے۔
وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (۳:۱۰۹)	اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، سب اللہ ہی کے لیے ہے اور سارے معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔

''ہر شے'' یا ''ہر امر'' کو اس کی طرف لوٹ کر آنا ہے، اللہ کی طرف لوٹایا جانا ہے، یہ قرآن مجید

میں بہت سی آیات میں وارد ہوا ہے۔ بعض آیات میں قرآن مجید نے انسان کے سفر کی چند تفصیلات بھی بیان کی ہیں۔ ان کا آغاز انسان کی ابتدا یا ابتدا کے قریب سے ہوتا ہے:

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۲:۲۸)

تم اللہ کا کس طرح انکار کرتے ہو اور حال یہ ہے کہ تم مردہ تھے تو اس نے تم کو زندہ کیا، پھر وہ تم کو موت دیتا ہے، پھر زندہ کرے گا۔ پھر تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

اس آیت میں وہ بڑے بڑے مراحل آ گئے ہیں جن پر مبدأ و معاد کی کتابوں میں بحث کی جاتی ہے، یعنی: عدم اور نیستی، یہ دنیا، موت، قبر کی زندگی، حشر اور قیامت۔ قیامت کے بعد انسان دو گروہوں میں بانٹ دیے جائیں گے، ایک وہ جو جنت میں جائیں گے اور دوسرے وہ جن کا ٹھکانا دوزخ ہوگا۔

زندگی اور موت Life and Death

معاد یا اللہ کی طرف واپسی پر بات کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ''زندگی'' اور ''موت'' کی اصطلاحات کا بار بار حوالہ دیا جائے، لہٰذا ان دونوں الفاظ کے معانی کا ایک واضح تصور ذہن میں ہونا چاہیے۔ ہم نے مندرجہ بالا آیات میں دیکھا کہ انسان کے اس دنیا میں داخل ہونے کی حالت کو قرآن مجید نے ''مردہ شے'' (امواتاً) کہا ہے۔ یہ موت یا مردنی کوئی مطلق موت نہیں ہو سکتی، کیونکہ ''عہدِ الست'' باندھنے کے لیے انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی نہ کسی نوع کی ہستی رکھتا ہو، موجود ہو، تا کہ اس سے عہد لیا جا سکے۔ لہٰذا اس دنیا سے پہلے کا عالمِ مرگ ایک اضافی موت ہوگی۔ اس طرح اس دنیا کی زندگی کوئی مطلق زندگی نہیں ہے، کیونکہ یہ زندگی کچھ زیادہ دنوں کی نہیں ہوتی نہ اس کا کوئی اعتبار ہے کہ کب عمر کی نقدی ختم ہو جائے اور موت کا بلاوا آ جائے۔ اسی طرح سفرِ حیات کے آخر میں جو موت ہے وہ بھی کوئی مرگِ مطلق نہیں ہے، بلکہ ہستی کے ایک طور سے دوسرے طور میں، ایک اندازِ ہستی سے دوسرے میں منتقل ہونے کا نام ہے۔ اس دوسرے اندازِ ہستی کا نام ''قبر'' ہے جس میں بہت سے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں اور ''مردہ شخص'' مختلف تجربات سے گذرتا رہتا ہے۔ تجربہ کرنا، کوئی واقعہ پیش آنا، زندہ ہستیوں کی صفت ہے، مردہ اشیا کی نہیں۔ سو یہ جسے موت کہتے ہیں، اصل میں صرف اس دنیا کے لحاظ سے موت ہے، سارے عالمِ حقیقت کے مقابل اور اس کے حوالے سے موت نہیں ہے۔

قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کو ''الحي القيوم'' کہا ہے (۲:۲۵۵)۔ بالفاظ دیگر صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے جو اپنے آپ سے زندہ ہے، اپنی ذات سے قائم ہے۔ توحید کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا زندہ کوئی نہیں اور نہ اپنے آپ سے کوئی قائم ہی ہے۔ اللہ کے سوا ہر شے اگر اسے اللہ سے جدا کر کے دیکھا جائے تو سرے سے مردہ ہے، بلکہ وجود ہی نہیں رکھتی۔ حیّ اور قیّوم صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ پس اگر کسی شے میں زندگی ہے تو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حیات عطا کی ہے اور اگر کوئی شے قائم ہے تو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے قائم رکھا ہے۔ وہ مخلوق جسے زندگی ملی ہے، اس کی زندگی کا اگر اللہ کی حیات سے مقابلہ کیا جائے تو اسے موت ہی شمار کیا جائے گا۔ انسان کو زندہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس ساعت میں پوری طرح مردہ نہیں ہے، لیکن بہت جلد موت اسے آن لے گی اور اس کی اس زندگیِ ناپائیدار کا اختتام ہو جائے گا۔ زندگی کی اسی بے ثباتی اور ناپائداری سے انسان کو زندگی ہی میں موت کا تجربہ ہو جاتا ہے۔

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (۲۸:۸۸) اس کی ذات کے سوا ہر چیز فانی ہے۔

اللہ تعالیٰ اگر چیزوں کو زندہ کرتا ہے تو ان سے زندگی چھین بھی لیتا ہے، اسی لیے اس کو صرف الحَیی ہی نہیں کہا گیا، المُحیِی (زندگی دینے والا، حیات آفریں) اور المُمِیْت (مارنے والا، موت دینے والا) بھی کہا گیا ہے۔ یہ وہ نام ہیں جو قرآن مجید میں اللہ کے لیے آئے ہیں۔

اس کائنات کے اندر نہ تو حیاتِ مطلق پائی جاتی ہے نہ مرگِ مطلق۔ ہاں اس کائنات سے باہر اللہ تعالیٰ حیاتِ مطلق ہے اور عدم — جس کا بہرحال کوئی وجود نہیں — مرگِ مطلق ہے۔

حیاتِ خداوندی حیاتِ ناب ہے، خالص اور بے ملاوٹ زندگی، جس میں موت کا شائبہ تک نہیں۔ موت کیا ہے زندگی کا نہ ہونا یا زندگی کا رک جانا، ختم ہو جانا۔ انسانی زندگی ناخالص بھی ہے اور اس میں موت بھی ملی ہوئی ہے، بیماری یا کسی ذہنی آزار کا سامنا ہو تو بسا اوقات یہ زندگی موت سے بدتر معلوم ہوتی ہے۔ صحت اور تندرستی قائم بھی رہے تب بھی زندگی کی ڈور نازک سی چیز ہے جس کا کوئی اعتبار نہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اسے آنے والا کل دیکھنا یقیناً نصیب ہوگا، لیکن اگر انسانی زندگی میں موت گھلی ملی رہتی ہے تو اس کی موت میں بھی زندگی کی آمیزش ہوتی ہے۔ عالمِ تخلیق کی سطح پر ہر مخلوق کی زندگی کے لیے موت ایک لازمی چیز ہے، جیسے دن کے بعد رات۔ ایک چیز کا تجربہ کرنا ہو تو دوسری کا مزا بھی چکھنا پڑتا ہے۔

قرآن مجید جب موت کا ذکر کرتا ہے تو اس سے عموماً اس کی مراد اس دنیا کی زندگی کے مقابلے میں

موت ہوتی ہے۔ ہم نے سطورِ بالا میں جس آیت کا حوالہ دیا تھا، اس میں قرآنِ مجید نے انسان سے یہ سوال کیا ہے کہ "تم اللہ کا کس طرح انکار کرتے ہو اور حال یہ ہے کہ تم مردہ تھے تو اس نے تم کو زندہ کیا؟"

انسان کس طرح حقیقتِ خداوندی کو جھٹلا سکتا ہے اور کیوں کر اس کی ناشکری کر سکتا ہے جب کہ ذرا سا غور و تدبر اسے بتانے کے لیے کافی ہے کہ وہ ہرگز زندگی پر اپنا حق نہیں جتا سکتا۔ ایک وقت ایسا تھا کہ انسان مردہ تھا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس دنیا کی زندگی میں اس کا کوئی حصہ نہیں تھا۔ آج اگر وہ زندہ ہے تو اس میں اس کا اپنا کوئی کارنامہ نہیں۔ اس کی موجودہ زندگی اس کے اندر پھونکی جانے والی روح کی روشنی سے پھوٹتی ہے۔ جس طرح آب و گل کے اندر روح کا نور چھپا رہتا ہے، اسی طرح بدن کے اس سانچے میں زندگی اگرچہ کمزور اور ناپائیدار ہوتی ہے، لیکن بہرحال ہے تو زندگی۔

دنیا اور آخرت This World and the Next World

اسلام میں کائنات کا جو تصور اور جو نظام بیان ہوا ہے، اس پر ہم گفتگو کر چکے ہیں۔ اس کے بنیادی نکات یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ حق ہے اور یہ کائنات "ماسویٰ اللہ" ہے۔ پس یہ کائنات بے حقیقت ہے، تاہم غیر حقیقی ہونے کے بھی کئی درجے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اضافی طور پر حقیقت کے مختلف درجات ہوتے ہیں۔ کچھ چیزیں دوسری چیزوں سے زیادہ حقیقی ہوتی ہیں اور کچھ چیزیں کچھ چیزوں سے کم حقیقت رکھتی ہیں۔ مطلقاً غیر حقیقی صرف ایک چیز ہے۔ وہ ہے عدمِ محض اور نیستی۔ اس کے علاوہ ہر شے میں ایک طرح کی حقیقت پائی جاتی ہے۔

آسمان زمین سے زیادہ حقیقی ہیں، کیونکہ آسمان اُس بلند اور نورانی سے عبارت ہے جس میں نور، حیات، علم، ارادہ، قدرت اور کلام جیسی صفاتِ خداوندی اپنا بھرپور رنگ ظاہر کرتی ہیں۔ آسمانوں کے باسی، روحیں اور فرشتے، اللہ کے قرب میں مسکن پاتے ہیں۔ اس کے برعکس زمین ایک تاریک اور پست دنیا ہے جہاں صفاتِ خداوندی کا بس مدھم سا عکس پڑتا ہے۔ وہ اشیا جو سراسر زمینی سرشت رکھتی ہیں، مثلاً بے جان چیزیں وغیرہ، وہ اللہ تعالیٰ سے اضافی طور پر ایک دوری میں پڑی ہوتی ہیں۔

زمین و آسمان کے درمیان بہت سی مخلوقات ہیں، مثلاً پودے اور جانور۔ ان میں آسمانی خواص بھی ہیں جو انھیں حیات، ارادہ، قدرت، دیگر صفاتِ خداوندی کے وسیلے عطا ہوتے ہیں اور ان میں اپنے مادی اجسام کی وجہ سے زمینی اوصاف بھی پائے جاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ مخلوقات صفاتِ زمینی اور صفاتِ آسمانی دونوں کا آمیزہ ہوتی ہیں۔ دوسرے جانداروں سے نوعِ انسانی اس لحاظ سے

الگ ہے کہ اسے صفاتِ خداوندی میں سے سب سے زیادہ صفات میسر آئی ہیں۔ وہ صفات بھی جو آسمانوں میں ظاہر ہوتی ہیں اور وہ بھی جو زمین پر نمودار ہوتی ہیں۔ دوسری ہر مخلوق کچھ نہ کچھ صفاتِ خداوندی سے عاری ہوتی ہے۔ ''سارے اسما کا علم'' تو صرف انسان کو عطا ہوا ہے۔

یہ کائنات ایک نظامِ درجات پر استوار کی گئی ہے۔ جمادات، نباتات اور حیوانات یکے بعد دیگرے اللہ تعالیٰ سے افزوں تر قرب کی نمایندگی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ الحق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ تینوں ایک دوسرے سے بڑھ کر حقیقت کے درجات کے نمایندہ ہیں۔ چنانچہ جیسے جیسے ہم ان درجات کو زینہ بہ زینہ طے کر کے نوعِ انسانی کی طرف بڑھنے لگتے ہیں، حیات، علم، ارادہ اور قدرت جیسی صفاتِ خداوندی زیادہ کھلے طور پر اور زیادہ شدت سے اپنا ظہور کرتی نظر آتی ہیں۔ اسی طرح ساتوں آسمان اللہ تعالیٰ سے درجہ بہ درجہ قرب کی نمایندگی کرتے ہیں۔ ان آسمانوں سے ماورا پہلے کرسی ہے اور پھر عرشِ خداوندی۔ اس عرش پر الرحمٰن متمکن ہے جو اس ساری کائنات کو اپنی رحمت تلے سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ کائنات بھی اس کی رحمت کے سوا کچھ اور نہیں — اس کا کرم، اس کی عطا ہے ان بے مایہ لوگوں کے لیے جن کے پاس اپنا کچھ بھی نہیں — اور سب کچھ تو چھوڑیے ان کا تو وجود اور ہستی بھی اُسی کی دین ہے۔

کائنات کا یہ نقشہ بنیادی طور پر سکونی ہے۔ اس میں خالق اور مخلوق کے مابین جس رشتے کی صورت گری کی گئی ہے، وہ لمحۂ حاضر تک محدود ہے، لیکن قرآن مجید اللہ تعالیٰ سے اس سے کہیں زیادہ حرکی، فعال اور بدلتے ہوئے تعلق کو بیان کرتا ہے، اور اس کے لیے جو اصطلاحات اس نے استعمال کی ہیں، وہ ہیں ''سامنے یا قریب کی چیز''، یعنی الدنیا اور ''اخیر والی'' یا ''آنے والی دنیا'' یعنی الآخرۃ۔ قرآن مجید نے کائنات کے ان دو حرکی اور سکونی نقشوں اور صورتوں کے درمیان تعلق کو بہت کھول کر بیان نہیں کیا، لہٰذا مفسرین کے یہاں اس بارے میں کئی طرح کی آرا دیکھنے کو ملتی ہیں۔

''اِس دنیا'' سے مراد وہ عالم ہے جہاں ہم اس وقت ہیں، اور آخرت یا ''وہ دنیا'' اس عالم کو کہتے ہیں جہاں ہم اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد رکھے جائیں گے۔ کچھ علما کا کہنا ہے کہ عالمِ آخرت کا آغاز قیامت سے ہوگا۔ ان کے نقطۂ نظر کے مطابق قبر چونکہ موت اور قیامت کے درمیان کے وقفے کو کہتے ہیں، لہٰذا اس میں اس دنیا اور اگلے جہان دونوں کے اوصاف پائے جاتے ہیں۔ اس کی مثال نفسِ انسانی جیسی ہے جو بدن اور روح کے درمیان واقع ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ قبر کی

مشابہت نفسِ انسانی سے اتنی زیادہ ہے کہ اسے اکثر موت کے بعد ہستیِ نفسِ انسانی ہی قرار دے دیا جاتا ہے۔اس تصور پر ہم آگے چل کر پھر گفتگو کریں گے۔

توحید کی روشنی میں ہمیں یہ بات فوراً سمجھ آ جاتی ہے کہ اس دنیا کی زندگی فانی اور ناپائیدار ہے، کیونکہ اصلی زندگی تو صرف اللہ ہی کی ہے، لیکن قرآن میں جہاں ان نکات کا بیان ہوا ہے، وہاں ان سے کچھ نتائج بھی سامنے لائے گئے ہیں۔قرآن ماہیتِ اشیا کا بیان اسی لیے کرتا ہے کہ انسانوں پر معنیِ ہستی عیاں ہو سکیں۔ ہر شے ایک نشانی ہے اور اس میں کچھ معانی پنہاں ہیں، لیکن انسان غافل ہے اور اسے ان معانی کی بازیافت اور یاددہانی کی ضرورت رہتی ہے۔قرآن بار بار یہ بات یاد دلاتا ہے کہ اس دنیا کی زندگی آنی جانی ہے، چند روزہ اور بے ثبات ہے۔ یہ بات کہیں کھلے لفظوں میں اور کہیں قصہ کہانی اور مجاز و تمثیل کے رنگ میں بیان ہوئی ہے۔مندرجہ ذیل آیات میں ایک تمثیل بیان ہوئی ہے:

وَاضۡرِبۡ لَهُمۡ مَّثَلَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا كَمَآءٍ اَنۡزَلۡنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخۡتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الۡاَرۡضِ فَاَصۡبَحَ هَشِيۡمًا تَذۡرُوۡهُ الرِّيٰحُ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ مُّقۡتَدِرًا (۱۸:۴۵)

اور ان کو اس دنیاوی زندگی کی تمثیل سناؤ کہ اس کو یوں سمجھو کہ بارش ہو جس کو ہم نے آسمان سے اتارا۔ پس زمین کی نباتات اس سے خوب اپچیں، پھر وہ چورا ہو جائیں جس کو ہوائیں لیے پھریں۔ اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

قرآن نے زور اسی بات پر دیا کہ روندی اور مسلی ہوئی سوکھی گھاس بھوسے کے لیے زندگی صرف کرنے والے اپنی عمرِ عزیز اور قیمتی وقت کا زیاں کرتے ہیں، یہ انسان کو انسان کے مرتبے سے گرا دینے کی بات ہے۔ وہ شے جس کا اعتبار ہی نہ ہو، جو کسی لمحے دم دے جائے، اس ہستیِ ناپائیدار کے لیے زندگی کا گنوانا کیسا! انسان کا عمل ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ گویا زندگی کے معنی صرف کاروبارِ دنیا میں پوشیدہ ہیں، یا روزمرہ کی زندگی اور اس کے تجربات و واقعات اللہ کی نشانیوں کے سوا اور بھی کچھ معنویت رکھتے ہیں۔حقیقت صرف اتنی ہی نہیں ہے جتنی انسان کی آنکھ دیکھتی ہے۔خلاصہ یہ کہ قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ صرف چیزوں کے ظواہر پر نہ جاؤ، ظاہر سے دھوکہ نہ کھاؤ:

وَمَا الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّ لَهۡوٌ (۶:۳۲) — اور یہ دنیا کی زندگی تو بس کھیل تماشا ہے۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ لَا يَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوۡا بِالۡحَيٰوةِ — جو لوگ ہم سے ملاقات کی توقع نہیں رکھتے اور

الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ. اُولٰٓئِكَ مَاْوٰهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۱۰:۷-۸)	اسی دنیا کی زندگی پر قانع اور مطمئن ہیں اور جو ہماری نشانیوں سے غافل ہیں، انھی لوگوں کا ٹھکانا دوزخ ہے، ان کے اعمال کی پاداش میں۔
وَقَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ. وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ (۶:۲۹-۳۰)	کہتے ہیں کہ ہماری زندگی تو بس یہی دنیا کی زندگی ہے اور مرنے کے بعد ہم اٹھائے نہیں جانے کے۔
يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓى اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ (۶:۱۳۱)	اے جنوں اور انسانوں کے گروہ! کیا تمھارے پاس تمھیں میری آیتیں سناتے اور تمھاری اس دن کی ملاقات سے تم کو ہوشیار کرتے ہوئے، تم میں سے رسول نہیں آئے؟ وہ بولیں گے: ہم خود اپنے خلاف شاہد ہیں اور ان کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں رکھا۔
يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ (۳۵:۵)	اے لوگو! اللہ کا وعدہ شدنی ہے تو تم کو یہ دنیا کی زندگی دھوکے میں نہ ڈالے اور نہ اللہ کے باب میں تم کو فریب کار شیطان فریب میں رکھے۔

اس دنیا کی زندگی کہاں کی زندگی ہے۔ اصل زندگی، سچی زندگی تو خدا کے ہاں ہے، اس کے قرب میں ہے۔ اگلا جہان، آخرت کی دنیا، اس دنیا کے مقابلے میں ہمیشہ رہنے والی ہے، کیونکہ وہ حقیقت سے، الحق سے قریب تر واقع ہے۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۲۹:۶۴)	اور یہ دنیا کی زندگی تو بس کھیل تماشا ہے اور دار آخرت ہی ہے جو اصل زندگی کی جگہ ہے، اگر وہ اس کو جانتے۔
اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ (۹:۳۸)	کیا تم آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی پر قانع ہو بیٹھے ہو؟ آخرت کے مقابلے میں یہ دنیا کی زندگی تو بہت ہی حقیر ہے۔

وَمَا اُوْتِیْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَمَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَزِیْنَتُھَا ۚ وَمَا عِنْدَاللّٰہِ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۲۸:۶۰)

اور جو چیز بھی تمھیں عطا ہوئی ہے تو یہ بس حیاتِ دنیا کی متاع اور اس کی زینت ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر اور پائیدار ہے۔

عقل وہ نورِ روحانی ہے جو ''توحید'' کا شعور بیدار کرتی ہے۔ یہ انسان کی سرشت و نہاد میں ہے پس عقل کو فی الفور یہ احساس ہو جاتا ہے کہ ''اللہ کی حیات کے سوا اور کوئی حیات نہیں'' اور اس کے سوا اور ہر زندگی ایک دھوکے سے زیادہ نہیں۔

ایک حدیث میں اس دنیا کی زندگی کی بے ثباتی اور اگلے جہان کی حقیقت کا فرق بہت خوبی سے واضح کیا گیا ہے۔ رسول خداؐ نے فرمایا:[۵۸]

> روزِ قیامت اہلِ دوزخ میں سے اس آدمی کو لایا جائے گا جس کی دنیا کی زندگی سب سے مزے میں گذری تھی اور اُس نے ہر نعمت پائی تھی۔ اسے ایک مرتبہ آگ میں ڈال کر نکالا جائے گا۔ پھر اس سے کہا جائے گا: ''اے فرزندِ آدم! کیا تو نے کبھی کوئی خیر و برکت دیکھی، کیا تجھے کبھی کوئی نعمت ملی؟'' وہ جواب دے گا کہ ''اے میرے رب، کبھی نہیں۔ مجھے قسم ہے اللہ کی۔''
>
> پھر اہلِ جنت میں سے ایک شخص کو لایا جائے گا جس کی زندگی دنیا میں نہایت صعوبت اور تکلیف رہی تھی۔ اسے ایک مرتبہ جنت میں داخل کر کے نکال لیا جائے گا۔ پھر اس سے کہا جائے گا: ''اے فرزند آدم! کیا تو نے کبھی کسی دکھ تکلیف کا سامنا کیا؟ کیا تجھ پر کبھی کوئی مشکل پڑی؟'' وہ جواب دے گا: ''نہیں میرے رب۔ واللہ مجھ پر تو نہ کبھی کوئی مشکل آئی، نہ مجھے دکھ تکلیف کا سامنا ہوا۔''

قبر The Grave

اگلے جہان کی جانب پہلا قدم یا اگلے جہان کا پہلا مرحلہ قبر کہلاتا ہے۔ انسان مر کر قبر میں پہنچتا ہے۔ موت اس لیے آتی ہے کہ یہ اللہ کا کام ہے۔ وہ جس طرح زندگی کو بقدرِ اندازہ معین کرتا ہے، اسی طرح موت کو بھی اپنے پیمانۂ تقدیر سے معین کر دیتا ہے۔ اسلام جس طرح اس دنیا، موت و حیات اور کائنات کو دیکھتا ہے، اس نقطۂ نظر سے یہ ایک بالکل ہی اجنبی اور انوکھا خیال ہو گا اگر کوئی یوں سوچے کہ موت ایک حادثہ ہے جسے روکا جا سکتا تھا، اگر مزید احتیاط کی جاتی یا اسے ٹالا جا سکتا تھا اگر علمِ طب میں اور ادویات میں کچھ اور ترقی ہو چکی ہوتی۔

قرآن مجید نے اکثر کہا ہے کہ ہر شے کو ایک مقررہ میعاد، ایک معین وقت تک کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ رسول اللہؐ کا فرمان ہے کہ وہ فرشتہ جو جنینِ انسانی میں روح پھونکتا ہے، اسی لمحے اس کی عمر بھی ثبت کر

دیتا ہے۔ موت تو اٹل ہے ہی اور اس سے بچنا کسی طرح ممکن نہیں، اس کے ساتھ موت کا وقت اور دن بھی معین ہے۔ دیگر تمام صفاتِ خداوندی کی طرح حیات بھی نپی تلی ہوتی ہے اور بقدرِ نصیب ہی ملتی ہے:

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا (۳:۱۴۵)	اور کوئی جان مر نہیں سکتی، مگر اللہ کے حکم سے، ایک مقررہ نوشتہ کے مطابق۔

اس کا یہ مطلب کسی طرح نہیں نکلتا کہ لوگ باگ بے پروا ہو کر بیٹھ جائیں۔ لمحۂ مرگ کا معین ہونا بھی ان مثالوں میں سے ایک ہے جہاں جبر و اختیار ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ چناؤ کی آزادی، اختیارِ انسانی کا بھی ایک کردار ہے اور ہر انسان مانتا ہے کہ اسے انتخاب کرنے کا موقع اور صلاحیت دی گئی ہے۔ انسان اگر موت و حیات سے بیگانہ ہو جائے، اپنے مرنے جینے کی پروا ہی نہ کرے تو یہ اس کا اپنا انتخاب ہے۔ قرآن کا ارشاد تو یہ ہے:

وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (۲:۱۹۵)	اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی میں نہ جھونکو۔

مسلمانوں کو معقول حد تک احتیاط پسند ہونا چاہیے اور چونکہ ہر شخص کے لیے ''معقول حد'' اور ''مناسب حد'' کا فیصلہ کرنا آسان نہیں، لہٰذا انھیں اس کے لیے رہنمائی درکار ہوگی اور دیگر معاملات کی طرح قرآن مجید اور رسولِ خداؐ کی سنت سے رجوع کرنا ہوگا۔ مثال کے طور پر یہ دیکھیے کہ انسان کی عمر اور اس کا اسلوبِ مرگ پہلے سے مقرر ہے، خواہ مرنے والے نے خودکشی کر کے زندگی کا خاتمہ کیا ہو، تاہم رسولِ خداؐ نے صاف صاف فرما دیا کہ خودکشی ایک بڑا گناہ ہے جب آپؐ نے کہا: ''جس نے خودکشی کی، وہ ہمیشہ کے لیے آگ میں پڑے گا۔''[59] عمل کوئی بھی ہو، اس کی ذمہ داری اس کے فاعل کی ہے اور اس کا نتیجہ بھی اسی کو بھگتنا ہوگا۔

قرآن مجید نے بعض مقامات پر اس گمراہ خیالی کی طرف اشارہ کیا ہے جس کے تحت انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح موت کو ٹال سکتا ہے:

فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْ لَا اَخَّرْتَنَا اِلٰى اَجَلٍ قَرِيْبٍ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى وَلَا تُظْلَمُوْنَ	تو جب ان پر جنگ فرض کر دی گئی تو ان میں سے ایک گروہ لوگوں سے اس طرح ڈرتا ہے جس طرح اس سے ڈرا جاتا ہے یا اس سے بھی زیادہ، اور وہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب! تو نے ہم پر جنگ کیوں فرض کر دی،

فَتِيلًا ٭ اَيۡنَ مَا تَكُوۡنُوۡا يُدۡرِكْكُّمُ الۡمَوۡتُ وَلَوۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ بُرُوۡجٍ مُّشَيَّدَةٍ (۴:۷۷-۷۸)

کچھ اور مہلت کیوں نہ دی؟ کہہ دو: اس دنیا کی متاع بہت تھوڑی ہے اور جو لوگ تقویٰ اختیار کریں گے، ان کے لیے آخرت اس سے کہیں بڑھ کر ہے، اور تمھارے ساتھ ذرا بھی حق تلفی نہ ہوگی اور موت تم کو پالے گی تم جہاں کہیں بھی ہو گے، اگرچہ مضبوط قلعوں کے اندر ہی ہو۔

موت کو تو آنا ہی ہے، اس سے کوئی مفر نہیں اور کسی کو معلوم نہیں کہ اس کی موت کب اور کیسے ہوگی:

وَمَا تَدۡرِىۡ نَفۡسٌ مَّاذَا تَكۡسِبُ غَدًا ؕ وَمَا تَدۡرِىۡ نَفۡسٌ بِاَىِّ اَرۡضٍ تَمُوۡتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌ خَبِيۡرٌ (۳۱:۳۴)

اور کسی کو پتا نہیں کہ وہ کل کیا کرے گا اور نہ کسی کو یہ علم ہے کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا۔ بے شک اللہ علم والا اور خبر رکھنے والا ہے۔

اس آیت میں جو نکتہ بیان ہوا ہے، وہ سیدنا سلیمانؑ کے بارے میں سنائے جانے والے ایک قصے میں بھی آیا ہے۔ یہ قصہ اکثر سننے میں آتا ہے۔ ہوا یوں کہ سیدنا سلیمانؑ کے ہاں ایک روز ایک دوست مہمان ہوا۔ آپ اس سے بات چیت میں مصروف تھے کہ حضرت سلیمانؑ کے وزیر نے آکر اطلاع دی کہ عزرائیلؑ آئے ہیں۔ سیدنا سلیمانؑ کے پاس فرشتۂ اجل، یعنی عزرائیلؑ اکثر آیا کرتے تھے۔ باہم گفتگو رہتی تھی۔ حضرت سلیمانؑ نے انھیں بلوا لیا۔ ان کے ساتھ نظامِ عالم اور ان دیگر امور پر بات ہوئی جو فرشتوں اور انبیا کے معاملات ہوا کرتے ہیں۔ ان کے رخصت ہوتے ہی اس دوست نے حضرت سلیمانؑ سے تقاضا کرنا شروع کر دیا کہ آپ مجھے کوئی ذمہ داری دے کر ہندوستان بھجوا دیجیے۔ حضرت سلیمانؑ نے اس سے پوچھا کہ بھئی یہ اچانک ہندوستان جانے کا خیال تمھارے سر پر کیوں سوار ہو گیا ہے؟ وہ کہنے لگا کہ عزرائیلؑ نے کمرے میں داخل ہو کر مجھے عجیب طرح سے گھور کے دیکھا تھا۔ ڈرتا ہوں کہ وہ میری جان لینے کے لیے دوبارہ نہ چلے آئیں۔ حضرت سلیمانؑ کو یقین تھا کہ ان کا مہمان بلا سبب خوفزدہ ہو گیا ہے، لیکن اس کو خوش کرنے کے لیے آپ نے اسے جادوئی قالین پر بٹھا کر ہندوستان بھجوانے کی حامی بھر لی۔ چند ہفتے بعد عزرائیلؑ دوبارہ ملنے آئے۔ حضرت سلیمانؑ کو وہ واقعہ یاد تھا۔ آپ نے عزرائیلؑ سے دریافت کیا کہ کیا واقعی آپ نے اس شخص کو گھور کر

دیکھا تھا۔عزرائیلؑ نے جواب دیا کہ شاید ایسا ہی رہا ہوگا۔ میں اسے آپ کے ہاں دیکھ کر بہت حیران ہوا تھا، کیونکہ اسی روز مجھے حکم ہوا تھا کہ کل کو اس شخص کی روح ہندوستان میں قبض کرلوں۔

اللہ تعالیٰ ہی زندگی دیتا ہے اور وہی زندگی چھین بھی لیتا ہے، لیکن اس کام کے لیے اس کے ہاں کچھ درمیانی واسطے ہیں۔ اس سے قریب ترین واسطے اس کے فرشتے ہیں۔ قرآن مجید میں عزرائیلؑ کا نام تو نہیں آیا، لیکن انھیں ''موت کا فرشتہ'' کہہ کر یاد کیا گیا ہے۔

بَلْ هُمْ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ۔ قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِىْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ (۳۲:۱۰-۱۱)	بلکہ یہ لوگ اپنے رب کے آگے پیشی کے منکر ہیں۔ کہہ دو کہ تمھاری جان وہ فرشتہ ہی قبضہ کرتا ہے جو تم پر مامور ہے، پھر تم اپنے رب کی طرف ہی لوٹائے جاؤ گے۔

بدن کے قالب کو اس دنیا میں چھوڑ کر نفوسِ انسانی کو ایک مختصر امتحان اور فیصلے سے گذرنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد قبر ان کا ٹھکانا ہوتا ہے۔ یہ چیز جسے قبر کہا گیا ہے، نہ صرف وہ چوکور گڑھا ہے جس میں انسان کے جسدِ خاکی کو دفن کیا جاتا ہے نہ اس سے بالکل مختلف کوئی اور شے۔ احادیث کے بیان کے مطابق قبر کی پہلی رات کو دو فرشتے منکر اور نکیر لوگوں کی آزمایش کرتے ہیں اور ان سے اللہ، اللہ کے رسول اور کتابِ خداوندی کے بارے میں سوالات کرتے ہیں۔ اگر ان کے جواب درست ہوں تو قبر کو کھلا اور آرام دہ بنا دیا جاتا ہے۔ جس میں وہ یومِ قیامت سے پہلے تک ہنسی خوشی رہتے ہیں۔ اس لمحے تک جب اسرافیلؑ صور پھونکیں گے اور زمین و آسمان میں ہر شخص غش کھا جائے گا۔ اگر سوالات کے جواب غلط نکلے تو انسان کی قبر بہت تنگ کر دی جائے گی اور اس میں ہر وہ شے بھر جائے گی جس سے انسان کراہت کرتا تھا، ڈرتا تھا۔ اس کے گرد سانپ، بچھو، مکڑیاں ہوں گی جو اس روز تک اسے عذاب سے دوچار رکھیں گی جب صور پھونکا جائے گا۔

اس دنیا کے خاتمے تک مرنے والے اپنی قبروں میں رہیں گے اور اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ دنیا کب تک رہے گی۔ بہرکیف قبر میں انسان کی ہستی اس دنیا میں اس کی زندگی کے مانند نہیں ہے۔ پس قبر کے احوال اور وہاں کا قاعدہ کلیہ بھی اس دنیا سے کچھ الگ ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یہی دیکھیے کہ زمانہ اور وقت پہلے کی طرح ٹھوس اور خارجی نوعیت کا نہیں رہتا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے گا کہ اس دنیا میں آپ سورج اور چاند کے حساب سے یا گھڑی دیکھ کر بتا سکتے ہیں کہ کتنا وقت بیت گیا، لیکن

قبر کی دنیا میں وقت کا پیمانہ کچھ اور ہے۔ وہاں اس کا ایک زیادہ قریبی تعلق صاحبِ قبر پر گذرنے والے حالات کے داخلی احساس سے پیدا ہو جاتا ہے۔ اس ہماری دنیا میں بھی اگر دندان ساز کا زنبور اور نشتر دانتوں کو کریدا کھیڑ رہا ہو تو پانچ منٹ بھی ایک گھنٹہ لگتے ہیں اور کسی یارِ خوش خصال کے ساتھ دل کی بات کرتے ہوئے گھنٹہ بھر کی گفتگو بھی چند منٹ کا وقفہ معلوم ہوتی ہے۔ اُس دنیا میں، قبر میں ''جیسا لگتا ہے'' جو محسوس ہوتا ہے وہی ہوتا بھی ہے۔ آپ پر جو بیت رہی ہوتی ہے، اسی کے مطابق آپ کا طرزِ احساس ڈھلتا جاتا ہے، لیکن وہی چیز دوسرے کسی شخص کو کسی اور طرح لگے گی۔ اس کا انحصار اس کی اپنی فطرت پر ہے۔ وہ جیسا ہوگا ویسا ہی پائے گا۔ کسی کو قبر کا عرصہ بہت تھوڑا سا لگے گا اور کسی کو اتنا لمبا کہ گمان سے باہر، جب کہ دونوں کی موت ایک ہی روز واقع ہوئی ہوگی۔

دنیا کا خاتمہ The End of the World

قرآن مجید نے جس طرح موت کے بعد پیش آنے والے واقعات سے انسان کو خبردار کیا ہے، اسی طرح اس نے دنیا کی آخری ساعتوں کے بارے میں بھی تنبیہ کی ہے، وہ وقت جب انسان کے گرد و پیش کی دنیا، یہ زمین و آسمان سرے سے بدل جائیں گے۔ روزِ قیامت صرف اگلے جہان کا روزِ حشر ہی نہیں ہوگا، اس دن ہماری اس دنیا کا خاتمہ بھی ہو جائے گا۔ قیامت اور یومِ آخر سے پہلے کئی واقعات سامنے آئیں گے جو روزِ آخرت کی آمد کی نشانیاں ہوں گی۔ احادیث میں قیامت کی نشانیوں کے بارے میں بہت کچھ بیان کیا گیا ہے۔ آپؐ نے خبردار فرمایا تھا کہ قیامت کی گھڑی قریب آ چکی ہے۔ ایک حدیث میں یوں آیا ہے کہ آپؐ نے ہاتھ اٹھا کر انگوٹھے اور انگشتِ شہادت کے درمیان ذرا سا فاصلہ کرتے ہوئے فرمایا: ''مجھ میں اور یومِ آخر (الساعۃ) میں بس اتنی دوری ہے۔''[۶۰]

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسولوں میں سب سے آخری رسول ہیں، یہ خیال اور دنیا کے خاتمے اور قربِ قیامت کا خیال ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ آپؐ کا پیغام انسان کے لیے آخری پیغام ہے، اس کے بعد انسان کے پاس ہدایت پانے اور اپنی اصلاح کرنے کا اور کوئی موقع نہیں ہوگا۔ آغازِ اسلام کے زمانے میں کتنے ہی لوگوں کو یہ توقع تھی کہ دنیا کا خاتمہ ان کی آنکھوں کے سامنے ہی ہو جائے گا۔ حضرت عیسیٰؑ کے ماننے والوں میں بھی پہلی نسل کے کتنے ہی لوگ اسی خیال کی پرورش کرتے رہے۔ یہ دنیا اگر ابھی تک گھسٹ رہی ہے تو اس سے قربِ قیامت کے عقیدے پر کوئی ضرب نہیں پڑتی۔ انسان کو یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ کے لیے ''ایک دن پچاس ہزار سال ہے''، (۷۰:۴)

بلکہ ایک دوسری آیت میں یوں آیا ہے:

اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (۲۲:۴۷)	تمھارے رب کے ہاں کا دن تمھارے حساب سے ہزار برس کا ہے۔

پچاس ہزار سالہ دن کا صرف ایک گھنٹہ بھی اگر آپؐ کے اور روزِ قیامت کے درمیان باقی تھا، تب بھی اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابھی ہمیں اس ''ساعت'' کے انتظار میں خاصا وقت کھنچنا ہے۔قرآن مجید سے ہمیں اتنی بات یقینی طور پر معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ یہ دنیا کب ختم ہو گی۔ جو بھی اس گھڑی کا علم رکھنے کا دعویٰ کرتا ہے، جھوٹ بولتا ہے۔

یادرہے کہ اس دنیا کے خاتمے کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ یہ کائنات، یہ باہر کی دنیا ختم ہو جائے گی۔ عالمِ صغیر microcosm کا بھی یہ لمحۂ آخر ہوگا۔اس جہانِ پیر کی موت جس طرح واقع ہوگی، وہ فرد کی موت سے بہت مشابہ ہے۔مندرجہ ذیل آیات میں سے کچھ آیات میں یہ پہلو بھی قابل غور ہے۔اس دنیا میں رہنے والوں کی موت اور دنیا کا اختتام۔ایک حدیث میں یوں آیا ہے کہ ''**من مات فقد قام قيامته**''۔ (جسے موت آتی ہے اس کی قیامت قائم ہو جاتی ہے۔)

اسی بات کو بعد میں اسلامی روایت نے ''قیامتِ صغریٰ'' (چھوٹی قیامت) اور ''قیامت کبریٰ'' (بڑی قیامت) کی اصطلاحات سے یاد کیا ہے اور فرد کی موت (چھوٹی قیامت) کو آنے والی بڑی قیامت کا پیش خیمہ قرار دیا ہے۔آیات ذیل میں ''**الساعة**'' کا لفظ آیا ہے۔قرآن مجید میں جو الفاظ روزِ قیامت، روزِ آخرت کے لیے استعمال ہوئے ہیں، یہ ان میں سے ایک ہے:

وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ (۱۶:۷۷)	اور قیامت کا معاملہ بس آنکھ جھپکنے کی طرح یا اس سے بھی جلد تر ہوگا۔
وَّ اَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَ اَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِى الْقُبُوْر (۲۲:۷)	اور قیامت آ کے رہے گی، اس کے آنے میں ذرا شبہ نہیں اور اللہ ان سب کو ایک دن زندہ کر کے اٹھائے گا جو قبروں میں ہیں۔
يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّىْ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَا اِلَّا هُوَ ثَقُلَتْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَا تَاْتِيْكُمْ	وہ تم سے قیامت کے باب میں سوال کرتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہوگا۔کہہ دو کہ اس کا علم تو بس میرے رب ہی کے پاس ہے۔

اِلَّا بَغْتَةً (۷:۱۸۷)

وہی اس کے وقت پر اس کو ظاہر کرے گا۔ آسمان وزمین اس سے بوجھل ہیں۔ وہ تم پر بس اچانک ہی آ دھمکے گی۔

یَسْئَلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا (۳۳:۶۳)

لوگ تم سے قیامت کے وقت کو پوچھتے ہیں۔ کہہ دو: اس کا علم تو بس اللہ ہی کے پاس ہے اور تمھیں کیا پتہ شاید قیامت قریب ہی آ لگی ہو۔

قیامت کے دن یہ دنیا جس طرح مٹ جائے گی، اسے قرآن نے تفصیل سے اپنے خاص اسلوب میں بیان کیا ہے۔ اس کی آیات سے یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے، دنیا کے نظام میں جو ربط و تنظیم ہمیں نظر آتا ہے اور جسے ہم پکے اور اٹل قوانینِ قدرت کا نتیجہ سمجھتے ہیں، وہ سب آناً فاناً غائب ہو جائے گا۔ ساری کائنات کی بساط دوبارہ بچھائی جائے گی، اسے از سرِ نو ترتیب دیا جائے گا:

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (۱۴:۴۸)

اس دن کو یاد رکھو جب یہ زمین بدل دی جائے گی اور آسمان بھی۔ اور سب اللہ واحد وقہار کے حضور پیش ہوں گے۔

وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِى الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِى الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ وَ كُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ۔ وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ (۲۷:۸۷-۸۸)

اور اس دن کا خیال کرو جس دن صور پھونکا جائے گا تو جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں، سب گھبرا اٹھیں گے۔ صرف وہی اس سے محفوظ رہیں گے جن کو اللہ چاہے گا، اور سب اس کے آگے سرفگندہ ہو کر حاضر ہوں گے۔ اور تم پہاڑوں کو دیکھ کر گمان کرو گے کہ وہ لٹکے ہوئے ہیں، حالانکہ وہ بادلوں کی طرح اڑ رہے ہوں گے۔

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ۔ وَ اِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ۔ وَ اِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ۔ وَ اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ۔ وَاِذَا

اُس وقت، اے لوگو! جب سورج کی بساط لپیٹ دی جائے گی، اور جب تارے ماند پڑ

الْوُحُوشُ حُشِرَتْ ، وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ، وَاِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ ، وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ، بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ، وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ، وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ، وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ ، وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ، عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ (۸۱:۱-۱۴)

جائیں گے، اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے، اور جب دس ماہہ گابھن اونٹنیاں چھٹی پھریں گی، اور جب وحشی جانور (اپنی سب دشمنی بھول کر، ایک ہی جگہ) اکٹھے ہوجائیں گے، اور جب سمندر ابل پڑیں گے، اور اُس وقت جب (اُس عالم میں) روحوں کے جوڑ (اُن کے عمل کے لحاظ سے) بندھیں گے، اور جب اُس سے، جو زندہ گاڑ دی گئی، پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ پر ماری گئی؟ اور جب دفتر کھولیں جائیں گے اور جب بہشت قریب لے آئی جائے گی، اُس وقت (اے لوگو! تم میں سے) ہر شخص یہ جان لے گا کہ وہ کیا لے آیا ہے۔

قرآن مجید میں روزِ آخرت کا بیان بہت سی آیات میں آیا ہے۔ ان سب میں زور اس بات پر ہے کہ جب قیامت کی گھڑی آن لگے گی تو انسان اس حقیقت سے آشنا ہو جائے گا جو اس لمحے اس کے روبرو ہوگی۔ یہ شعور کی بیداری کا لمحہ ہوگا، اسی لیے اب ان آیات میں آیاتِ خداوندی اور اللہ کی نشانیوں کا ذکر نہیں ہے کہ اس گھڑی میں ان نشانیوں کے معانی، ان کا مفہوم و انکشاف ہو رہا ہوگا۔ انسان جان لے گا کہ یہ فانی دنیا جس میں وہ زندگی گذار رہا تھا، اس کی ہستی صرف اس لیے تھی کہ اسے باقی رہنے والی دنیا کے لیے تیاری کی مہلت مل جائے۔

قیامت The Resurrection

جب حضرت اسرافیلؑ دوسری بار صور پھونکیں گے، سب انسان اپنی قبروں سے نکل پڑیں گے اور اس وسیع و عریض میدان میں جمع ہو جائیں گے جہاں ان کو اپنے رب کے سامنے پیش ہونا ہے۔

وَ نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ، قَالُوْا يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا

اور صور پھونکا جائے گا تو وہ دفعتاً قبروں سے نکل کر اپنے رب کی طرف چلیں پڑیں

مِنْ مَّرْقَدِنَا هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ (۵۲-۵۱:۳۶)

گے۔ وہ کہیں گے، ہائے ہماری بدبختی ہم کو ہماری قبر سے کس نے اُٹھا کھڑا کیا۔ یہ تو وہی چیز جس کا خدائے رحمٰن نے وعدہ کیا تھااور پیغمبروں کی بات سچی نکلی۔

وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً وَّ حَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا (۴۸-۴۷:۱۸)

اس دن کا خیال کروجس دن ہم پہاڑوں کو چلا دیں گے اور تم زمین کو دیکھو گے کہ بالکل عریاں ہوگئی ہے اور ہم ان کو اکٹھا کریں گے تو ان میں سے کسی کو چھوڑیں گے نہیں۔

یہ واقعہ قیامت کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے، عربی میں ''قیامة'' کے لفظ کا مطلب ہے ''اٹھ جانا، کھڑے ہو جانا۔'' اسے دوسرے لفظوں میں بھی بیان کیا گیا ہے، مثلاً ''حشر'' (The Mustering) اور ''بعث'' (The uprising)۔ قیامت میں جو واقعات بھی ہوں گے، ایک دن سے زیادہ نہیں ہوں گے، لیکن بعض روایات سے پتا چلتا ہے کہ یہ دن ہمارے حساب سے پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا۔ اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ قرآن ہی میں یوں بھی آیا ہے:

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِىْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ (۴:۷۰)

فرشتے اور روح الامین (تمھارے حساب سے) پچاس ہزار سال کے برابر ایک دن میں اس کے حضور پہنچتے ہیں۔

قبر سے نکل کر خدا کے سامنے پیش ہونا بھی تو ایک بعثت ہے۔ لوگ اپنی قبروں سے اٹھ کر خدا کے حضور پہنچیں گے، ایسے ہی جیسے فرشتے آسمانوں میں بلند ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں سے ملنے کے لیے خود نیچے آئیں گے۔ یہ بالکل درست ہے، لیکن اگر اللہ تعالیٰ انسان کی طرف بڑھے تو انسان کو بھی لازماً اس کی جانب بڑھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ الحق ہے، **العلی، الرفیع، المتعالی** اور **الرحمٰن** ہے۔ انسان کی جانب اس کے آنے کا مطلب ہے کہ وہ انسان کو اپنی ان بنیادی صفات کی طرف بلند کر رہا ہے۔

اگر یہ زمین قیامت کے دن دگرگوں ہو جائے گی، زمین زمین نہیں رہے گی، کچھ اور ہو جائے گی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اب نورِ خداوندی پہلے کی نسبت کہیں زیادہ شدت سے اپنا ظہور کرے گا۔ نور اترے

گا تو ظلمت مٹ جائے گی۔ اب کسی نشانی کی ضرورت نہیں کہ نورِ خداوندی نے وہ تمام دھندلاہٹیں، وہ رکاوٹیں مٹا ڈالی ہوں گی جن کے کارن انسان غفلت کا شکار ہوتا تھا اور اسے یاددہانی اور پیغامِ خداوندی کی ضرورت ہوتی تھی۔ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ زمین کے کچھ اوصاف ہیں جو اسے آسمان سے الگ کرتے ہیں۔ آسمان روشن ہے اور زمین تاریک۔ اب اگر نورِ خداوندی سے زمین روشن ہو جائے گی تو پھر یہ وہ زمین نہیں رہے گی جو انسان کا مسکن تھا۔

وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰی فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ۰ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتٰبُ وَجِایْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَ قُضِیَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۰ وَ وُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُوْنَ (۳۹:۶۸-۷۰)

اور صور پھونکا جائے گا تو آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں سب بے ہوش ہو کے گر پڑیں گے، مگر جن کو اللہ چاہے۔ پھر وہ دوبارہ اس میں پھونکا جائے گا تو دفعتہً وہ کھڑے ہو کر تاکنے لگیں گے اور زمین اپنے رب کے نور سے چمک اٹھے گی، اور رجسٹر رکھا جائے گا اور انبیا اور گواہ حاضر کیے جائیں گے اور لوگوں کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا اور ہر جان کو جو کچھ اس نے کیا ہو گا پورا کیا جائے گا، اور وہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں۔

روشنی چمکتی ہے تو انسان کی نظر کام کرتی ہے۔ جب نورِ خداوندی کا اجالا ہو گا تو انسان اپنے آپ کو اس صفائی سے آر پار دیکھے گا کہ اس سے پہلے اپنے آپ پر یوں نظر کرنا کبھی ممکن ہی نہ تھا۔ اب نہ انسان خود سے چھپ سکے گا، نہ دوسروں کی نگاہ سے۔

وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ ۰ وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ لَقَدْ كُنْتَ فِیْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ (۵۰:۲۰-۲۲)

اور صور پھونکا جائے گا۔ وہ ہماری وعید کے ظہور کا دن ہو گا اور ہر جان اس طرح حاضر ہو گی کہ اس کے ساتھ ایک ہانکنے والا ہو گا اور ایک گواہ۔ تو اس سے غفلت میں پڑا رہا

تو ہم نے تجھ سے تیرا پردہ ہٹا دیا تو آج تو
تیری نظر بہت تیز ہے۔

یہ بات ہمیشہ پیش نظر رہے کہ ''نور'' صفاتِ خداوندی میں سے ایک ہے اور ''اللہ کے نور کے سوا کوئی نور نہیں''۔ قرآن مجید نور ہے، اللہ کی کتابیں نور ہیں تو اس لیے کہ ان میں اللہ تعالیٰ نے خود کو ظاہر کیا ہے۔ ہر مخلوق کی اصلی فطرت اس کی سرشت و نہاد میں جتنا نور ہے، اسے مل جاتا ہے۔ انسان کے حصے میں از روئے سرشت جتنا نور آیا ہے، اس میں البتہ اسی قدر اضافہ ہوتا جاتا ہے جس قدر وہ ہدایتِ خداوندی سے میسر آنے والے نور کی پیروی کرتا رہتا ہے اور اس کی اطاعت کو اپنا شعار بناتا ہے۔ اسلام کی نظر میں قرآن مجید کی وحی کا نور دیگر ہر نور سے بڑھ کر ہے۔ پس اگر نورانی بننا ہے تو اس کا سب سے سیدھا راستہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو قرآن کے مطابق ڈھال لیا جائے۔ قرآن مجید نے سیدنا محمدؐ کو ''سراجِ منیر'' (روشنی دینے والا چراغ) کہا ہے تو اس لیے کہ ''کان خلقه القرآن۔'' (ان کا کردار قرآن تھا۔)

قرآن مجید آپؐ کا جسم و جان بن چکا تھا، آپ کے لہو میں اتر چکا تھا۔ احادیث میں مندرجہ ذیل دعا نقل ہوئی ہے جو آپ نماز میں دہراتے تھے یا سجدہ کرتے ہوئے ضرور ادا فرماتے تھے۔[۶۱]

اللّٰهُمَّ! اجْعَلْ فِي قَلْبِي نُوراً، وَفِي سَمْعِي نُوراً، وَفِي بَصَرِي نُوراً، وَعَنْ يَمِينِي نُوراً، وَعَنْ شِمَالِي نُوراً، وَأَمَامِي نُوراً، وَخَلْفِي نُوراً، وَفَوْقِي نُوراً، وَتَحْتِي نُوراً، وَاجْعَلْ لِي نُوراً، أَوْ قَالَ: وَاجْعَلْنِي نُوراً۔

خداوندا! میرے دل میں ایک نور ڈال دے، میری سماعت میں بھی، میری بینائی کو نور دے دے۔ میرے دائیں ہاتھ کو ایک نور دے دے۔ ایک نور میرے سامنے، ایک نور میرے پیچھے۔ ایک نور میرے اوپر اور ایک نور میرے تلے اور میرے لیے ایک نور مقرر کر دیجیے۔

اس حدیث کے آخری حصے کے الفاظ دوسری طرح بھی نقل ہوئے ہیں اور باعث تعجب نہیں ہے کہ ان میں یوں کہا گیا ہے کہ **"وَاجْعَلْنِي نُورًا"** (مجھے ایک نور بنا دے)۔ نبی علیہ السلام کی ایک اور دُعا میں یوں آیا ہے: ''**اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْاَشْيَاءَ كَمَا هِيَ** (خدایا! چیزیں جیسی ہیں ہمیں ویسی ہی دکھا،[۶۲] دیکھنے کے لیے روشنی ضروری ہے، تبھی کچھ سجھائی دے گا۔ اسی طرح فہم و ادراک کے لیے، سمجھنے کے لیے بھی نورِ روحانی کی ضرورت ہے جو قرآن مجید اور اللہ تعالیٰ کی کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ امام غزالی نے اس بات کو یوں کہا ہے کہ جیسے سورج کی روشنی سے چشمِ انسانی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے، اسی طرح قرآن مجید (کی روشنی سے) عقلِ انسانی کو راستہ سجھائی دیتا ہے۔

ان سب نکات سے ہمیں یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ روزِ قیامت نورِ خداوندی کے چمکنے کی اہمیت کیا ہے؟ اس نور کی روشنی میں سب پردے اٹھ جائیں گے، پرچھائیاں چھٹ جائیں گی اور انسان ہر شے کو اس کی حقیقت میں دیکھے گا۔ اس کی نگاہ اگر اس دنیا میں غلط بینی کی عادی ہوگی، شے کی حقیقت کو دیکھنے سے محروم رہی ہوگی تو اگلے جہاں کی چکا چوند اور تابانی میں اس کی آنکھیں چندھیا جائیں گی۔ اگر ان کی چشمِ باطن نے وحی کی روشنی میں دیکھنا نہ سیکھا ہوگا اور اس سے ان کی بصارت کو تقویت نہ ملی ہوگی تو وہ قیامت کے دن بے بصر اٹھے گا، اسے کچھ سجھائی نہ دے گا۔ ایسے انسانوں کی حالت بالکل ایسی ہی ہوگی جیسی اس شخص کی ہوتی ہے جو برسوں کسی تاریک غار میں رہا ہو اور اسے اچانک بھری دوپہر میں سورج کی روشنی میں لا کھڑا کیا جائے:

قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ۔ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى (۲۰:۱۲۵-۱۲۶)	وہ کہے گا: اے رب! تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اُٹھایا، میں تو بینا تھا۔ ارشاد ہوگا: اسی طرح دنیا میں ہماری آیتیں تیرے پاس آئیں تو تو نے ان کو نظر انداز کیا۔ تو اسی طرح آج تو بھی نظر انداز کیا جائے گا۔
هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ (۱۳:۱۶)	ان سے پوچھو! کیا اندھے اور بینا دونوں یکساں ہو جائیں گے؟ یا کیا روشنی اور تاریکی دونوں برابر ہو جائیں گے۔
هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ (۶:۵۰)	کہ دو: کیا اندھے اور بینا دونوں یکساں ہو جائیں گے، کیا تم غور نہیں کرتے؟
وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَلَا الْمُسِيْٓءُ قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ (۴۰:۵۸)	اور اندھے اور بینا اور جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے اور جو برائی کرنے والے ہیں، دونوں یکساں نہیں ہو سکتے۔ تم لوگ بہت کم سوچتے ہو۔

جن کی آنکھیں اس کی تاب لائیں گی، ان کے لیے قیامت کے دن اس روشنی کی چمک ایک رحمت ہوگی وہ اپنے رب کے روبرو پہنچ کر خوش ہوں گے، لیکن منکرینِ حق نے تو اپنی ساری زندگی روشنیاں

بجھانے میں گنوا دی تھی۔ اب وہ چمگادڑوں کی طرح روشنی سے منہ چھپاتے پھریں گے اور چھپنے کی کوئی جگہ نہ پائیں گے:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْــًٔـا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ، اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ (۲۴:۳۹-۴۰)

اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال کی تمثیل یہ ہے کہ جیسے چٹیل صحرا میں سراب ہو جس کو پیاسا پانی گمان کرے۔ یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس آئے گا تو وہاں کچھ نہ پائے گا، البتہ اس کے پاس اللہ کو پائے گا، پس وہ اس کا حساب چکا دے گا اور اللہ جلد حساب چکانے والا ہے یا یوں خیال کرو کہ جیسے ایک گہرے سمندر کے اندر تاریکیاں ہوں، موج کے اوپر موج اٹھ رہی ہو، اوپر سے بادل چھائے ہوئے ہوں، تاریکیوں پر تاریکیاں چھائی ہوئی ہوں۔ اگر اپنا ہاتھ بھی نکالے تو اس کو بھی نہ دیکھ پائے، اور جس کو اللہ روشنی نہ بخشے تو اس کے لیے کوئی روشنی نہیں۔

ہم نے عرض کیا تھا کہ قرآن نے بالکل کھلے واضح انداز میں بتا دیا ہے کہ انسان کو اپنے رب کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ علما نے اس نکتے پر اکثر بحث کی ہے کہ انسان جب اپنے رب کے روبرو ہوگا تو کیا وہ اللہ کو دیکھے گا۔ ان میں سے اکثریت کی رائے ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کو دیکھے گا۔ اس رائے کی تائید میں انھوں نے قرآنی آیات اور احادیث پیش کی ہیں۔ عمومی رائے یہ ہے کہ دیدارِ خداوندی وہ نعمت ہے جس سے بڑھ کر اور کوئی نعمت اور انعام نہیں ہوسکتا اور جو بھی جنت میں جائے گا، اسے یہ نعمت نصیب ہوگی۔ جو لوگ دوزخ میں رہ جائیں گے، وہ اس رویت سے محروم رہ جائیں گے اور اس کا مطلب ہوگا بدترین عذاب کا جھیلنا۔

دیدارِ خداوندی کے تصور کو سمجھنا ہو تو ''تنزیہ'' اور ''تشبیہ'' کی مدد سے سمجھیے۔ اللہ کی صفاتِ قہر اور

صفاتِ جلال کا تقاضا ہے، اللہ سے بُعد اور اس کے غضب کا سامنا کرنا جب کہ اس کی صفاتِ جمال اور صفاتِ رحمت قربِ خداوندی اور انسان کی سعادت و مسرت کا باعث بنتی ہیں۔ دیدارِ خداوندی نہ ہونے کا مطلب ہے کہ اللہ سے دوری اور اس کے قہر کی آگ میں جلتے رہنا۔ اس کا دیدار نصیب ہونے کا مطلب ہے، اس کے قریب ہونا اور اس کے جمال و رحمت کی خنک روشنی سے بہرہ یاب ہونا۔ مندرجہ ذیل آیات کا حوالہ عموماً اس فرق کو بیان کرنے کے لیے دیا جاتا ہے جو اللہ کا دیدار کرنے والوں اور اسے دیکھنے سے محروم رہنے والوں میں واقع ہوتا ہے:

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۔ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَة ۔ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ۔ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ (۲۵-۲۲:۷۵)

کتنے چہرے اس روز تر و تازہ ہوں گے، اپنے پروردگار کی رحمت کے منتظر اور کتنے چہرے، اس دن اترے ہوئے ہوں گے، اس اندیشے سے کہ ان پر وہ ٹوٹنے والی ہے جو کمر توڑ ڈالے گی۔

كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۔ ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْم (۱۶-۱۵:۸۳)

ہرگز نہیں، اس دن تو لاریب، یہ اپنے پروردگار سے روک دیے جائیں گے۔ پھر جہنم میں جا پڑیں گے۔

دیدارِ خداوندی سے محروم ہونے کا مطلب ہے روشنی سے دور، ظلمت میں گم ہونا:

وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۲۷:۱۰)

اور جنھوں نے بدیاں کمائی ہوں گے تو برائی کا بدلہ اس کے مثل ہے اور ان پر ذلت چھائی ہوئی ہوگی۔ اللہ سے ان کو کوئی بچانے والا نہ ہوگا۔ گویا ان کے چہرے شب دیجور کے ٹکڑوں سے ڈھانک دیے گئے ہیں۔ یہی لوگ اہل دوزخ ہیں۔ یہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

قرآن مجید نے اور بھی کئی واقعات بیان کیے ہیں جو قیامت کے دن پیش آئیں گے۔ احادیث میں بھی اس کی تفصیل ملتی ہے۔ ان واقعات میں اعمال کا ترازو میں وزن کرنا بھی مذکور ہے۔ ہم اس کا

ذکر کر چکے ہیں۔ اعمال کو درج کرنے والے فرشتے زندگی میں انسان کے کیے ہوئے عمل لکھتے رہتے ہیں۔ روزِ قیامت یہ فرشتے اپنے لکھے ہوئے کو میزان میں رکھ دیں گے اور امید ہے کہ نیک کام برے کاموں پر بھاری رہیں گے۔

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ (۲۱:۴۷)	اور قیامت کے دن ہم میزانِ عدل قائم کریں گے تو کسی جان پر ذرا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا اور اگر کسی کا رائی کے دانہ برابر بھی کوئی عمل ہو گا اور ہم اس کو موجود کر دیں گے اور ہم حساب لینے کے لیے کافی ہیں۔
يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ۚ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۚ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (۹۹:۶-۸)	اُس دن لوگ الگ الگ نکلیں گے، اِس لیے کہ اعمال انھیں دکھائے جائیں۔ پھر جس نے ذرّہ برابر بھلائی کی ہے، وہ بھی اُسے دیکھ لے گا، اور جس نے ذرّہ برابر برائی کی ہے، وہ بھی اُسے دیکھ لے گا۔

انسان کو قیامت کے دن ایک اور آزمایش کا بھی سامنا ہوگا، یعنی ''صراط'' پر سے گذرنا۔ قرآن مجید میں اسلام کو ''صراطِ مستقیم'' (سیدھا راستہ) کہا گیا ہے اور مسلمان جب فاتحہ پڑھتے ہیں تو اسی سیدھے راستے پر چلنے کی دعا مانگتے ہیں۔ قیامت میں یہی ''صراطِ مستقیم'' ایک پُل کی صورت میں مجسم ہو جائے گا جو جہنم کے اوپر سے گذر رہا ہوگا۔ یہ پل بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہوگا۔ لوگوں سے کہا جائے گا کہ اسے عبور کریں۔ کچھ لوگ اس پر سے اڑ کر گذر جائیں گے، کچھ چوکڑی بھرتے ہوئے گھوڑے کی طرح پار کر لیں گے، لیکن بہت سے ایسے ہوں گے جو پہلے قدم پر پھسل کر اپنی تباہی کے گڑھے میں جا گریں گے۔ اس ''صراط'' کا سامنا قیامت میں کس طرح ہوگا، اس کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ آپ نے اس دنیا میں صراطِ مستقیم پر کس انداز میں سفر کیا تھا اور کس حد تک سیدھے راستے پر چلے تھے۔

قرآن و حدیث سے قیامت کا جو عمومی منظر نامہ سامنے آتا ہے، اس کا تاثر یہ بنتا ہے کہ اس دن انسان کو ہیبت طاری کرنے والے جلالِ خداوندی کا پورا تجربہ ہوگا۔ روزِ قیامت کا بیان جہاں جہاں آیا ہے، اس میں اکثر اللہ کے جلال، اس کی قدرت اور ہر معاملے میں اس کی فرمانروائی اور غلبے پر زور دیا گیا

ہے اور ساتھ ہی انسان کے ہیچ اور ناچیز ہونے کا احساس بھی شدت سے ابھرتا ہے۔ یہ صورتِ حال دنیا کی صورتِ حال کے بالکل برعکس ہوگی جہاں انسان کو یہ زعم تھا کہ وہ اپنی زندگی کا خود مالک ہے اور اپنے احوالِ زیست کی صورت گری کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ قرآن مجید کا بیان ہے:

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۳۹:۶۷)

اور ان لوگوں نے خدا کی صحیح قدر نہیں جانی۔ زمین ساری اس کی مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن اور آسمانوں کی بساط بھی اس کے ہاتھ میں لپٹی ہوئی ہوگی۔ وہ پاک اور برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ شریک بناتے ہیں۔

ایک حدیث میں اس تمثیل کو کھول کر یوں بیان کیا گیا ہے:[۶۳]

يَطْوِى اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ السَّمَاوَاتِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، ثُمَّ يَأْخُذُهُنَّ بِيَدِهِ الْيُمْنىٰ، ثُمَّ يَقُوْلُ: أَنَاالْمَلِكُ، أَ يْنَ الْجَبَّارُوْنَ؟ أَيْنَ الْمُتَكَبِّرُوْنَ؟ ثُمَّ يَطْوِى الْاَرْضَ بِشِمَالِهِ، ثُمَّ يَقُوْلُ: أَنَاالْمَلِكُ، أَيْنَ الْجَبَّارُوْنَ؟ أَيْنَ الْمُتَكَبِّرُوْنَ؟

قیامت کے دن آسمان لپیٹ دیے جائیں گے۔ پھر یہ اللہ کے دائیں ہاتھ میں ہوں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: میں ہوں مالک الملک، بادشاہ۔ کہاں ہیں وہ جو ستم ڈھاتے تھے؟ کہاں ہیں وہ جن کو بڑائی کے دعوے تھے؟ پھر وہ زمین کو لپیٹ دیں گے۔ یہ ان کے بائیں ہاتھ میں ہوں گی۔ پھر کہا جائے گا: میں ہوں مالک الملک، پادشاہ۔ کہاں ہیں وہ جو ستم ڈھاتے تھے؟ کہاں ہیں وہ جن کو بڑائی کے دعوے تھے؟

روزِ حشر لوگوں کو ''برہنہ تن'' جمع کیا جائے گا۔ قدرت واقتدار کی ہر پوشاک سے محروم، ہر قیمتی ملبوس اور مال و دولت دنیا سے تہی، ہر اس شے سے عاری جو دنیا میں ان کے لیے متاعِ غرور اور سرمایۂ افتخار ہوا کرتی تھی۔ رسولِ خداؐ کے فرمان کے مطابق سب سے پہلے جس شخص کو نیا لباس عطا ہوگا وہ حضرت ابراہیمؑ ہوں گے۔ حضرت ابراہیمؑ یہودیت، نصرانیت اور اسلام سبھی کے محترم اور بزرگ ہیں اور قرآن مجید نے انھیں کامل مسلمان کا لقب دیا ہے۔ رسول خداؐ نے فرمایا:[۶۴]

يَاأَيُّهَا النَّاسُ! اِنَّكُمْ مَحْشُوْرُوْنَ اِلَى اللّٰهِ حُفَاةً عُرَاةً غُرْلًا (اے لوگو! تم اپنے رب کے روبرو ننگے پاؤں، عریاں، مختون اٹھائے جاؤ گے)۔ ''جیسا ہم نے پہلی خلقت کا آغاز کیا اسی طرح اسے لوٹائیں گے'' (۲۱:۱۰۴) روزِ قیامت جسے سب سے پہلے لباس ملے گا، حضرت ابراہیمؑ ہوں گے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ انسانوں کی جزا وسزا کا فیصلہ کرے گا۔ بہت سی احادیث میں یوں آیا ہے کہ لوگوں کی اکثریت جہنم واصل ہو جائے گی، تاہم یہاں بھی عقائد کی اہم تفاصیل کی طرح خاصا ابہام باقی رہتا ہے، کیونکہ دیگر احادیث اور قرآنی آیات میں اللہ کے غضب کی جگہ اس کی رحمت پر زور دیا گیا ہے۔

اللہ کی رحمت کا مظاہرہ شفاعت کے مسئلے میں جس طرح کھل کر ہوتا ہے اور کسی مسئلے میں نہیں ہوتا۔ قرآن مجید نے صاف کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت نہیں کر سکتا۔ (۲:۲۲۵) رسول اللہؐ نے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ انھیں قیامت کے دن ''مقامِ محمود'' عطا کرے گا (۱۷:۷۹) اور اس مقامِ عالی[۶۵] کی نشانی یہ ہوگی کہ انھیں سب سے پہلے شفاعت کی اجازت ملے گی۔ جب آپؐ اپنی امت کی شفاعت فرما چکیں گے تو دیگر انبیا کو اپنی اپنی امت کی شفاعت کا اذن ہوگا، اس کے بعد اولیا اللہ اور اہلِ ایمان شفاعت کریں گے۔ جیسا جیسا کسی کا مقام ہوگا، اسی قدر اس کی شفاعت مقبول ہوگی۔ ایک حدیث میں رسول خداؐ نے فرمایا:[۶۶]

> فرشتے شفاعت کریں گے، انبیا شفاعت کریں گے، مومنین شفاعت کریں گے اور خدا ارحم الراحمین کے سوا کوئی باقی نہ بچے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ خود نارِ جہنم میں سے مٹھی بھر لوگ نکال لے گا اور ان لوگوں کو بھی نجات دے دے گا جنھوں نے عمر بھر کوئی اچھا کام نہ کیا تھا۔

بعض روایات میں اس طرح آیا ہے کہ دوزخ کا کام ہے تطہیر کرنا، پاک کرنا اور آلایش دور کرنا ان لوگوں کی جنھوں نے ''توحید'' کا اقرار تو کیا، مگر بڑے بڑے گناہوں میں مبتلا رہے۔ احادیث میں بتایا گیا ہے کہ ایک ایک کر کے گناہ گاروں کو دوزخ سے نکالا جائے گا۔ نارِ جہنم نے انھیں دہکتے کوئلے کی طرح کر رکھا ہوگا۔ انھیں ''آبِ حیات'' میں ڈبو دیا جائے گا۔ اس میں ڈوبتے ہی ''وہ اس طرح پھوٹ نکلیں گے جیسے سیلاب کے ساتھ بہ کر آنے والے بیج سے اکھوا پھوٹتا ہے۔''[۶۷]

جو لوگ جہنم میں ہیں انھیں بھی ناامید نہ ہونا چاہیے، بلکہ اور بلند آواز میں فریاد کرنا چاہیے۔ رسول خداؐ نے فرمایا:[۶۸]

> إِنَّ رَجُلَيْنِ مِمَّنْ دَخَلَا النَّارَاشْتَدَّ صِيَاحُهُمَا فَقَالَ الرَّبُّ تَبَارَكَ وَتَعَالَى: أَخْرِجُوهُمَا، فَلَمَّا أُخْرِجَا، قَالَ لَهُمَا: لِأَيِّ شَيْءٍ اشْتَدَّ صِيَاحُكُمَا؟ قَالَا : فَعَلْنَا ذٰلِكَ لِتَرْحَمَنَا، قَالَ : رَحْمَتِي لَكُمَا أَنْ تَنْطَلِقَا فَتُلْقِيَ أَنْفُسَكُمَا حَيْثُ كُنْتُمَا مِنَ النَّارِ، فَيَنْطَلِقَانِ،فَيُلْقِي أَحَدُهُمَا نَفْسَهُ فَيَجْعَلُهَا عَلَيْهِ بَرْدًا وَسَلَامًا، وَيَقُومُ الآخَرُ فَلَا يُلْقِي نَفْسَهُ، فَيَقُولُ لَهُ الرَّبُّ عَزَّ وَجَلَّ: مَا مَنَعَكَ أَنْ تُلْقِيَ نَفْسَكَ كَمَا أَلْقَى صَاحِبُكَ ؟ فَيَقُولُ رَبِّ! إِنِّنِي لَأَرْجُو أَنْ لَا تُعِيدَنِي فِيهَا

بَعۡدَمَا أَخۡرَجۡتَنِی، فَيَقُولُ لَهُ الرَّبُّ تَبَارَكَ وَتَعَالَى: لَكَ رَجَاؤُكَ فَيَدۡخُلَانِ الۡجَنَّةَ جَمِيۡعًا بِرَحۡمَةِ اللّٰهِ۔

جہنم میں جانے والوں میں سے دو شخص زیادہ بلند آواز میں آہ و فریاد کر رہے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کہیں گے کہ ان کو باہر نکال لاؤ۔ ان سے پوچھا جائے گا: ''تم دوسروں سے بڑھ کر فریاد کیوں کر رہے تھے؟'' وہ کہیں گے: ''تاکہ آپ کو ہم پر رحم آ جائے۔'' اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ''میری رحمت تمھارے لیے یہ ہے کہ تم جاؤ اور خود کو جہنم میں وہیں گرا دو جہاں تم تھے۔'' ان میں سے ایک اپنے آپ کو وہیں لے جا کر گرا دے گا اور اللہ تعالیٰ آگ کو ''خنکی وسلامتی'' (۲۱:۶۹) کر دیں گے۔ دوسرا شخص اٹھ کھڑا ہوگا، مگر اپنے آپ کو آگ میں نہیں ڈالے گا۔ پوچھا جائے گا کہ ''تو نے اپنے ساتھی کی طرح خود کو آگ میں کیوں نہیں ڈالا؟'' کہے گا کہ ''مجھے امید تھی کہ ایک مرتبہ آگ میں سے نکال کر آپ پھر مجھے جہنم میں نہیں پھینکیں گے۔'' اس سے فرمایا جائے گا: ''تو نے ہم سے جس بات کی امید رکھی وہ تیرے حصے میں آئی۔'' پھر ہر دو نفر رحمتِ خداوندی سے جنت میں داخل ہو جائیں گے۔

رحمتِ خداوندی کو اکثر اللہ تعالیٰ کی حسِ مزاح سے بھی منسوب کیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں آنحضرتؐ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے کی مایوسی اور بے چارگی دیکھ کر خندہ فرماتے ہیں جس کا وقت بدلنے والا ہو اور وہ اس سے بے خبر ہو۔''[۶۹] یعنی یہ کہ اس کی صورتِ حال بس تبدیل ہونے والی ہے اور اس کی مایوسی خوشی میں بدل جائے گی۔ آنحضرتؐ سے سن کر صحابہ میں سے ایک صاحب نے پوچھا: ''یا رسول اللہ! کیا اللہ تعالیٰ کو کبھی ہنسی آتی ہے؟'' آپؐ نے فرمایا کہ ہاں اللہ تعالیٰ خندہ فرماتے ہیں۔ اس پر صحابی نے کہا: ''وہ خدا جو ہنستا بھی ہو، اس سے ہر چیز کی امید رکھنا چاہیے۔''

کئی احادیث میں اس شخص کا ذکر ہے جسے سب سے آخر میں جہنم سے نکالا جائے گا۔[۷۰] ایک روایت میں اس طرح ہے کہ اسے جہنم سے نکال کر جنت کے باہر جہنم کے رخ پر ڈال دیا جائے گا:

أَیۡ رَبِّ! اصۡرِفۡ وَجۡهِی عَنِ النَّارِ، فَإِنَّهُ قَدۡ قَشَبَنِی رِيۡحُهَا وَأَحۡرَقَنِی ذَكَاؤُهَا، فَيَدۡعُو اللّٰهَ مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنۡ يَدۡعُوَهُ، ثُمَّ يَقُولُ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى: هَلۡ عَسَيۡتَ إِنۡ فَعَلۡتُ ذٰلِكَ بِكَ أَنۡ تَسۡأَلَ غَيۡرَهُ! فَيَقُولُ: لَا أَسۡأَلُكَ غَيۡرَهُ، وَيُعۡطِی رَبَّهُ عَزَّ وَجَلَّ مِنۡ عُهُودٍ وَمَوَاثِيقَ مَا شَاءَ اللّٰهُ، فَيَصۡرِفُ اللّٰهُ وَجۡهَهُ عَنِ النَّارِ، فَإِذَا أَقۡبَلَ عَلَى الۡجَنَّةِ وَرَآهَا سَكَتَ مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنۡ يَسۡكُتَ، ثُمَّ يَقُولُ: أَیۡ رَبِّ! قَدِّمۡنِی إِلَى بَابِ الۡجَنَّةِ فَيَقُولُ اللّٰهُ لَهُ: أَلَيۡسَ قَدۡ أَعۡطَيۡتَ عُهُودَكَ وَمَوَاثِيقَكَ لَا تَسۡأَلُنِی غَيۡرَ الَّذِی أَعۡطَيۡتُكَ، وَيۡلَكَ يَا ابۡنَ آدَمَ أَغۡدَرَكَ! فَيَقُولُ: أَیۡ رَبِّ! يَدۡعُو اللّٰهَ - حَتَّى يَقُولَ لَهُ: فَهَلۡ عَسَيۡتَ إِنۡ أَعۡطَيۡتُكَ ذٰلِكَ أَنۡ تَسۡأَلَ غَيۡرَهُ! فَيَقُولُ لَا، وَعِزَّتِكَ فَيُعۡطِی

رَبَّهُ مَا شَاءَ اللّٰهُ مِنْ عُهُودٍ وَمَوَاثِيقِ، فَيُقَدِّمُهُ إِلَىٰ بَابِ الْجَنَّةِ، فَإِذَا قَامَ عَلَىٰ بَابِ الْجَنَّةِ انْفَهَقَتْ لَهُ الْجَنَّةُ، فَرَأَى مَا فِيهَا مِنَ الْخَيْرِ وَالسُّرُورِ، فَيَسْكُتُ مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنْ يَسْكُتَ، ثُمَّ يَقُولُ : أَىْ رَبِّ أَدْخِلْنِیْ الْجَنَّةَ، فَيَقُولُ اللّٰه تَبَارَكَ وَ تَعَالَى لَهُ: أَلَيْسَ قَدْ أَعْطَيْتَ عَهُودَكَ وَمَوَاثِيْقَكَ أَنْ لَا تَسْأَلَ غَيْرَ مَا أُعْطِيْتَ، وَيْلَكَ ابْنَ آدَمَ أَغْدَرَكَ! فَيَقُولُ: أَىْ رَبِّ! لَاأَكُونَنَّ أَشْقَىٰ خَلْقِكَ، فَلَا يَزَالُ يَدْعُو اللّٰه حَتَّى يَضْحَكَ اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ مِنْهُ، فَإِذَا ضَحِكَ اللّٰه مِنْهُ قَالَ: ادْخُلِ الْجَّةَ، فَإِذَا دَخَلَهَا قَالَ اللّٰه لَهُ تَمَنَّهُ، فَيَسْأَلُ رَبَّهُ وَيَتَمَنَّى، حَتَّى إِنَّ اللّٰه لَيُذَكِّرُهُ مِنْ كَذَا وَكَذَا، حَتَّى إِذَا انْقَطَعَتْ بِهِ الْأَمَانِيُّ، قَالَ اللّٰه تَعَالَى : ذٰلِكَ لَكَ وَمِثْلُهُ مَعَهُ۔

وہ کہے گا: پروردگار میرا منہ جہنم کے رخ سے ہٹا دیجیے۔ اس کی بد بو مجھے اذیت دے رہی ہے اور اس کی آگ مجھے جھلسا دیتی ہے۔ کہا جائے گا: ''اگر میں یہ کروں تو تم پھر کچھ اور مانگنے لگو گے۔'' وہ کہے گا: ''آپ کی عزت کی قسم! ایسا نہ ہوگا۔'' وہ اللہ سے عہد و پیمان کرے گا جیسا اللہ تعالیٰ چاہیں گے۔ پھر اسے جہنم کے رخ سے ہٹا دیا جائے گا۔ جیسے ہی اس کا رخ جنت کی طرف کیا جائے گا اور وہ اس کی رونق، خیر و سرور دیکھے گا تو وہ اتنی ہی دیر چپکا رہ سکے گا جتنا اللہ کی مرضی ہوگی۔ پھر وہ بول اٹھے گا: ''پروردگار! مجھے جنت کے دروازے کے قریب کر دیجیے۔'' کہا جائے گا کہ ''کیا تو نے وعدہ نہیں کیا تھا کہ تو اس خواہش کے سوا اور کچھ نہیں مانگے گا؟'' وہ کہے گا: ''اے میرے رب! مجھے اپنی بد بخت ترین مخلوقات میں سے نہ بنا۔''

آخر کار اللہ تعالیٰ اس کی درخواست قبول کر لیں گے، لیکن اس سے پھر وعدہ لیں گے کہ وہ اور کسی چیز کا تقاضا نہیں کرے گا۔ ہوتے ہوتے وہ شخص التجا کرے گا کہ اسے جنت میں بھیج دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ اسے ڈانٹیں گے کہ تم وعدہ خلاف اور دھوکے باز ہو، لیکن وہ شخص چپکا رہے گا، مانگتا رہے گا۔

وہ اتنا واویلا کرے گا، ایسے مانگتا رہے گا کہ آخر کار اللہ تعالیٰ اسے دیکھ کر ہنس پڑیں گے۔ جب وہ خندہ فرمائیں گے تو اسے جنت میں جانے کی اجازت مل جائے گی۔ پھر اس سے کہا جائے گا کہ اپنی خواہش بیان کر۔ پھر جب وہ ساری آرزوئیں بیان کر چکے گا تو ارشاد ہوگا: ''جا یہ سب تجھ کو دیا اور اتنا ہی اور بھی تیرا ہوا۔''

جنت اور دوزخ Hell and Paradise

شاید ہی کسی صحیفۂ خداوندی میں عذابِ جہنم اور جنت کی خوشیوں کو اس تفصیل سے بیان کیا گیا ہو جیسا قرآن میں کیا گیا ہے۔ جنت جہنم کے بارے میں قرآن کے آخر میں واقع چھوٹی سورتوں میں جس شان اور زور بیان سے بتایا گیا ہے، وہ دوسرے مقامات پر نہیں پایا جاتا۔ یہ سورتیں مکّہ میں رسولِ خداؐ کی

نبوّت کے ابتدائی زمانے میں نازل ہوئی تھیں۔ ان سورتوں کو پڑھ کر اگر یہ تصور کرنے کی کوشش کی جائے کہ ان لوگوں کے لیے ان سورتوں کی کیا اہمیت رہی ہوگی جو انسانی زندگی کی حتمی معنویت کے تحت سے قائل تھے تو یہ بات سمجھ میں آنے لگتی ہے کہ قرآن کے وعد و وعید، اس کی بشارتیں اور اس کی تنبیہ کوئی چیز بھی نری مجرد اور ذہنی نہیں ہے۔ قرآن نے جنت جہنم کے احوال کا جس طرح سے بیان کیا ہے، اس سے انسان کی ذمہ داری اور اس کے عمل کے نتائج کا ایک نہایت موثر اور زوردار نقشہ کھنچ جاتا ہے۔

جہنم کو قرآن مجید میں کئی ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ ان میں سے ہر نام ذہن میں وہ کچھ لے آتا ہے جس کا اہل جہنم کو اس میں پڑنے کے بعد سامنا کرنا ہوگا۔ ان ناموں میں "**نار**" (آگ) "**هَاوِيه**"، "**جحيم**" "**جهنم**" (یہ عبرانی کا لفظ ہے اور وہاں بھی اس کا مطلب ہے دوزخ کی آگ)، "**حطمة**" crusher اور "**عذاب اليم**" chastisement شامل ہیں۔ عام طور پر قرآن مجید دوزخ کے بیان کے مقابل جنت کی نعمتوں کا ذکر بھی کرتا ہے۔ اس کے لیے جو لفظ قرآن میں آئے ہیں، وہ ہیں "**الجنة**" (باغ)، "**سلام**" (peace)، "**مأوى**" (refuge)، "**نعيم**" (bliss)، "**دار الخلد**" (eternity) اور ''ابدی زندگی'' (everlasting life)۔

إِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَاالْاَنْهٰرُ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (۴۷:۱۲)	بے شک اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنھوں نے عمل صالح کیے ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن میں نہریں بہ رہی ہوں گی، اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ اسی طرح بہرہ مند ہو رہے اور کھا رہے ہیں جس طرح چوپائے کھاتے ہیں، اور دوزخ ان کا ٹھکانا ہے۔
مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ (۱۳:۳۵)	اس جنت کی تمثیل، جس کا متقیوں سے وعدہ ہے، یہ ہے کہ اس میں نہریں بہ رہی ہوں گی، اس کا پھل بھی دائمی اور اس کا سایہ بھی (دائمی)۔ یہ انجام ہے ان لوگوں کا جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا۔ اور کافروں کا انجام دوزخ ہے۔
فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ، الَّذِيْنَ هُمْ فِیْ خَوْضٍ	(اس دن کو یاد رکھو) جس دن آسمان ڈانواں

يَّلْعَبُوْنَ۔ يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا۔ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِىْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ۔ اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ۔ اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْلَا تَصْبِرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِىْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ۔ فٰكِهِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ وَوَقٰهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ۔ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۵۲:۱۱-۱۹)

ڈول ہو جائے گا اور پہاڑ چلنے لگ جائیں گے، پس بدبختی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی! ان کی جو سخن گستری میں لگے ہوئے کھیل رہے ہیں جس دن کہ وہ آتش دوزخ کی طرف دھکے دے دے کر لے جائے جائیں گے کہ یہ وہ دوزخ ہے جس کو تم جھٹلاتے رہے تھے! کیا یہ جادو ہے یا تمھیں سجھائی نہیں دے رہا؟ اس میں داخل ہو جاؤ! اب صبر کرو یا نہ کرو، تمھارے لیے یکساں ہے۔ تم وہی بدلے میں پا رہے ہو جو کرتے رہے تھے۔ بے شک متقی بندے باغوں اور نعمتوں میں ہوں گے، وہ محظوظ ہو رہے ہوں گے، ان نعمتوں سے جو ان کے رب نے ان کو دے رکھی ہوں گی اور اس بات سے کہ ان کے رب نے ان کو دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھا، کھاؤ اور پیو، بے غل وغش، اپنے ان اعمال کے صلے میں جو تم کرتے رہے تھے۔

اِس مفہوم میں ''جنت'' کا لفظ سب سے زیادہ استعمال ہوا ہے۔ قرآن کے اکثر ترجموں میں اس کے لیے paradise کا لفظ برتا گیا ہے۔ انگریزی کا لفظ paradise بھی تو ایک قدیم فارسی لفظ سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے ''باغ۔''[۱۷] قرآن کی کسی بھی اصطلاح پر غور کرنا ہو، اس سے متعلق تصورات پر نظر کرنا ضروری ٹھہرتا ہے تاکہ اس کے مفہوم ومنطق کو سمجھا جا سکے۔ انگریزی بولنے والوں کی گفتگو میں بھی اگر کسی بہت ہی خوبصورت باغ کا ذکر آ جائے تو عموماً یوں کہا جاتا ہے: ''یہ تو نری جنت ہے۔'' جنت بالآخر خوشی اور راحت کی جگہ ہی تو ہے۔ وہ شخص بہت ہی درماندہ ہوگا، بہت ہی بے حس اور شل ہو چکا ہوگا جو رنگ برنگ خوبصورت پھولوں سے بھرے پُرے باغ کو دیکھ کر جھوم نہ اٹھے، جب

باغ میں پرندے چہچہا رہے ہوں، فوارے اچھل رہے ہوں، تتلیاں اڑتی پھرتی ہوں اور پھلوں سے لدی درختوں کی شاخیں جھکی پڑ رہی ہوں۔ بہار کے موسم میں باغ میں دوبارہ زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ یہ وقت ایسا ہے جب غم واندوہ دب جاتے ہیں اور زمین اپنی آغوش آسمان کے لیے وا کر دیتی ہے۔

باغ کیا ہوتا ہے اور اس میں آخر انسانوں کے لیے کیا کشش ہوتی ہے، اس کی حکایت تا دیر کی جا سکتی ہے۔ بہار کی رعنائی اور حسن کے بیان کے لیے شاعر کا قلم چاہیے اور اسلامی زبانوں کی شاعری، بالخصوص فارسی شاعری نے گلستان، باغ اور بہار کا جیسا شاعرانہ بیان پیدا کیا ہے وہ عالمی ادب کے شاہکار شعر پاروں میں شمار ہو سکتا ہے۔

کہنے کو کہا جا سکتا ہے کہ ان شعرا میں سے بہت سے شاعر اس دنیا کے باغوں کی بات کر رہے تھے، اگلے جہان کے باغوں کی نہیں، لیکن ہماری اب تک کی تحریر کی روشنی میں قارئین پر واضح ہو چکا ہو گا کہ مسلمان کی نظر میں حسن و جمال اللہ کی صفات میں سے ہے۔ رسول خداؐ نے فرمایا تھا: ''**اللّٰہ جمیل و یحب الجمال**'' (اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور زیبائی کو پسند کرتا ہے)۔[۲] شہادت کے پہلے حصے سے یہ نکتہ قدرتی طور پر اخذ کیا جا سکتا ہے، یعنی ''لاجمیل الا اللہ'' (اللہ کے سوا اور کوئی جمیل نہیں)۔ خاک سے اٹھی ہوئی چیزوں کو حسن و جمال مستعار ملتا ہے اور یہ متاعِ مستعار مالکِ جمال کو جلد ہی لوٹا دینا ہوتی ہے۔ ورنہ پھول اتنی تیزی سے مرجھایا نہ کرتے۔ شعرا نے ان باغوں ہی کا قصیدہ کیوں نہ لکھا ہو جو ظاہر کی آنکھ سے نظر آتے ہیں، ان کی شاعری کے پڑھنے والوں پر کوئی روک نہیں تھی کہ وہ باغ کے بارے میں لکھے گئے اشعار کو جنت کی خوبصورتی اور رعنائی کی نشانی کے طور پر نہ دیکھیں۔ اس کی گنجایش اس لیے بھی پوری طرح موجود رہتی ہے کہ بعض شعرا نے شعر کہتے ہوئے اس ضمن میں کسی طرح کا شک و شبہ رہنے ہی نہیں دیا۔ ان کے شعر خود بولتے ہیں کہ اس دنیا کے باغات کو یہ حسن اور رعنائی کہاں سے ملتی ہے۔ مثال کے طور پر مولانا روم کو سنیے:[۳]

ای نوبهار خندان از لامکان ر سیدی
چیزی به یار مانی، از یار ما چه دیدی
خندان و تازه رویی، سر سبز و مشك بویی
همرنگ یار مایی یا رنگ ازو خریدی
ای فصلِ خوش چو جانی، وز دیده ها نهانی
اندر اثر پدیدی، در ذات ناپدیدی

ای گل چرا نخندی، کز هجر باز رستی
ای ابر چون نگریی، کز یار خود بریدی
گل، چمن بیارا، می خند آشکارا
زیرا سه ماه پنهان، درخار می دویدی
ای باغ خوش بپرور، این نو رسیدگان را
کاحوال آمد نشان از رعد می شنیدی
ای باد شاخها را در رقص اندر آور
بر یاد آن که روزی بر وصل می وزیدی
بنگر بدین درختان، چون جمع نیك بختان
شادند ای بنفشه، از غم چرا غمیدی
سوسن به غنچه گوید، هر چند بسته چشمی
چشمت گشاده گردد، کز بخت در مزیدی

ترجمہ

اے کھلکھلاتی نو بہار! تو لا مکاں سے اُتری ہے۔
تجھ میں ہمارے دوست کا رنگ پایا جاتا ہے، بتا تو سہی تو نے اُس میں کیا دیکھا؟
ہنستی کھلکھلاتی اور شاداب چہرے والی، سر سبز اور مشک کی مہک میں بسی ہوئی۔
تو ہمارے دوست کی ہم رنگ ہے یا یہ رنگ اُس سے مول لیا ہے؟
اے دل کو نہال کر دینے والے موسم! تو روح کی طرح ہے اور آنکھوں سے پوشیدہ ہے۔
اپنی نشانیوں میں نمودار اور اپنی ذات میں مخفی۔
اے گلِ سرخ! بھلا تو کیوں نہ کھلکھلائے! آخر جدائی سے نجات پائی ہے۔
اے ابر! تو کیوں نہ آنسو برسائے، آخر تجھے اپنے دوست سے منقطع ہونا پڑا ہے۔
اے گل! چمن سجا دے، کُھل کر خندہ کر
کیونکہ تجھے تین ماہ تک کانٹوں میں چھپ کر تگ و دو کرنا پڑی۔
اے باغ! اِن نو واردوں کو خوب اچھی طرح پال پوس
جن کی آمد کا احوال تو نے بادلوں کی گرج سے سُن رکھا تھا۔

اے ہوا! شاخوں کو رقص میں لے آ
اُس دن کی یاد میں جب تو باغِ وصال میں اٹھکیلیاں کیا کرتی تھی۔
ان درختوں کو دیکھ، جیسے طالع مندوں کا کوئی مجمع ہو۔
سب خوش ہیں، اے بنفشہ! تو کیوں سر نیھوڑائے پڑا ہے؟
سوسن، غنچے سے کہتا ہے، ہر چند کہ تیری آنکھ بند ہے،
تاہم یہ بس کھلنے کو ہے، کیونکہ تو نے خوش بختی کا مزہ چکھ لیا ہے۔

قرآن مجید میں جنت کا ذکر جہاں آیا ہے، وہاں عموماً جنت کی نہروں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ "جَنّٰتٍ تَجۡرِی مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰر" کے الفاظ تقریباً ۳۵ آیات میں آئے ہیں۔ کسی بھی باغ میں بہتا پانی اس کے حسن اور تازگی کو چار چاند لگا دیتا ہے، لیکن قرآن مجید نے یہ بتایا ہے کہ جنت کی یہ ''نہریں'' کوئی عام چیز نہیں ہیں:

مَثَلُ الۡجَنَّةِ الَّتِیۡ وُعِدَ الۡمُتَّقُوۡنَ فِیۡهَاۤ اَنۡهٰرٌ مِّنۡ مَّآءٍ غَیۡرِ اٰسِنٍ وَاَنۡهٰرٌ مِّنۡ لَّبَنٍ لَّمۡ یَتَغَیَّرۡ طَعۡمُهٗ وَاَنۡهٰرٌ مِّنۡ خَمۡرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِیۡنَ وَاَنۡهٰرٌ مِّنۡ عَسَلٍ مُّصَفًّی وَلَهُمۡ فِیۡهَا مِنۡ کُلِّ الثَّمَرٰتِ وَمَغۡفِرَةٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ کَمَنۡ هُوَ خَالِدٌ فِی النَّارِ وَسُقُوۡا مَآءً حَمِیۡمًا فَقَطَّعَ اَمۡعَآءَهُمۡ(٤٧:١٥)

اس جنت کی مثال جس کا متقیوں سے وعدہ کیا گیا ہے یہ ہے کہ اس میں نہریں ہوں گی پانی کی جس میں ذرا بھی تغیر نہ ہوا ہوگا، اور نہریں ہوں گی دودھ کی جس کا ذائقہ تبدیل نہ ہوا ہوگا، اور نہریں ہوں گی شراب کی جو پینے والوں کے لیے یکسر لذت ہوگی، اور نہریں ہوں گی صاف شفاف شہد کی اور اس میں ان کے لیے ہر قسم کے پھل بھی ہوں گے اور ان کے رب کی طرف سے مغفرت بھی۔ (کیا یہ لوگ جن کو یہ نعمتیں حاصل ہوں) ان لوگوں کے مانند ہوں گے جو ہمیشہ دوزخ میں رہنے والے ہیں اور جن کو اس میں گرم پانی پلایا جائے گا، پس وہ ان کی آنتوں کو ٹکڑے کر کے رکھ دے گا؟

تو پھر کیا تعجب ہے کہ قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کے جو اسما وصفات جہنم سے متعلق بتائے ہیں وہ جلال وقہر اور غضب کے اسما ہیں اور جو نام اور صفات جنت سے نسبت رکھتے ہیں، وہ اسما وصفات جمال ورحمت ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُوانْتِقَام (۳:۴)	جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا، ان کے لیے سخت عذاب ہے اور اللہ غالب اور انتقام لینے والا ہے۔
وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى (۲۰:۸۱)	اور جس پر میرا غضب اُترا، وہ تباہ ہوا۔
يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ رِضْوَانٍ وَّ جَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ (۹:۲۱-۲۲)	ان کا رب ان کو خوشخبری دیتا ہے اپنی رحمت اور خوشنودی اور ایسے باغوں کی جن میں ان کے لیے ابدی نعمت ہے۔

نفس کی آشکارائی Unfolding of the Soul

صورتِ الٰہیہ کا قیام Shaping the Divine From

قرآن مجید میں معاد اور آخرت کے بارے میں کیا بتایا گیا ہے؟ یہ جاننا ہو تو کتاب الٰہی پڑھتے جائیے۔ آپ کو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ آخرت میں ایک سلسلۂ واقعات ہوگا جو پیش آئے گا اور انسانوں پر یہ واقعات جس طرح بیتیں گے، اس کا تعلق کسی حد تک اس امر سے ہوگا کہ انسان کی اصلی ذمہ داری، اس کا منصب کیا ہے۔ تاہم اگر یہ دیکھنا مقصود ہو کہ عالمِ صغیر (microcosm) اور صورتِ الٰہی پر خلق ہونے والی مخلوق کے طور انسان کے کردار سے معاد کا کیا تعلق ہے تو ہمیں اس موضوع پر ان تحریروں کا مطالعہ کرنا ہوگا جو مسلمان علما نے قرآن وحدیث کی بنیاد پر بعد میں مرتب کیں۔ اس ضمن میں ہم جو عرض کرنا چاہتے ہیں، اس سے یہ واضح ہو جائے گا کہ جس طرح ''توحید ورسالت'' کا جواز، انسان کے لیے ان کی معنویت، ان کا ثبوت اور دلیل اور ان کا تحقق واثبات، معاد ہی کے ذریعے ہوتا ہے، اسی طرح عالمِ کبیر (macrocosm)، یعنی کائنات اور عالمِ صغیر (microcosm)، یعنی انسان کے بارے میں، نظامِ عالم اور ہستی انسانی کے بارے میں اسلامی تعلیمات کی پوری معنویت اور صحیح مفہوم تبھی کھلتا ہے جب ان کو انسان اور تقدیرِ انسانی کے تناظر میں رکھا جائے اور اسی سیاق وسباق میں ان پر غور کیا جائے۔[۴۷]

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی صورت پر تخلیق کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو تمام اسما کا علم دیا۔ سیدنا آدمؑ کو ان اسما کا واقعی، سچا اور بالفعل علم حاصل تھا، البتہ عارضی طور پر ان سے بھی بھول ہوسکتی تھی۔ باقی اولادِ آدم تو ایک ایسی غفلت ونسیان لے کر پیدا ہوئی ہے جو وقتی لحاتی بھول سے کہیں زیادہ ہے۔ صفاتِ خداوندی اس کے اندر خفتہ وخوابیدہ ہیں، ان صفات کو اس خفتگی سے باہر لانے کی ضرورت ہے اور انسان کے فکر وعمل، اس کے ذہن اور اس کے ہر کام پر ان کے نقش کو مجسم کرنا مطلوب ہے۔

ہم نے عرض کیا تھا کہ وہ اسما جو آدمؑ کو تعلیم کیے گئے، وہ تمام اشیا کے اسما تھے، تمام مخلوقات کے اسما تھے۔ بہت سے علما کے نزدیک ان اسما میں اللہ کے اسما بھی شامل تھے۔ کچھ علما کا خیال ہے کہ اشیا کے نام اللہ ہی کے اسما ہیں کہ ہر وہ نام جس سے کسی حقیقت، کسی حقیقی چیز کو موسوم کیا جا سکے، وہ الحق کے لیے بھی بطور اسم استعمال ہوسکتا ہے۔ اگر یہ رائے قبول کی جائے تو پھر یہ کہنا ہوگا کہ ننانوے اسمائے حسنٰی کے سوا بھی اللہ تعالیٰ کے لاتعداد و بے شمار اسما ہیں۔ اگر صرف اتنا ہی مانا جائے کہ سیدنا آدمؑ کو جن اسما کا علم دیا گیا تھا، وہ صرف مخلوقات کے اسما تھے تب بھی یہ تسلیم کرنا لازم آتا ہے کہ ہر مخلوق اللہ ہی کی ایک نشانی ہے۔ ہر مخلوق اللہ کی حقیقت پر دلالت کرتی ہے اور اسے موسوم کرتی ہے۔ چونکہ مخلوقات کا کوئی شمار ہی نہیں، پس اللہ کے ناموں کی تعداد بھی لامحدود ہے۔

سیدنا آدمؑ کو دیے گئے اسما کو کسی بھی مفہوم میں لیجیے، اس سے ایک نکتہ بہرحال ابھرتا ہے کہ ان اسما کے علم ہی سے سیدنا آدمؑ کو وہ فضیلت اور برتری ملی تھی جس نے ان کو ہر مخلوق پر فائق اور ہر شے سے بہتر بنا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو آدمؑ کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا حکم بعد میں دیا، پہلے آدمؑ نے ان کے سامنے اسما کے علم کا مظاہرہ کیا تھا، اور ایک موقع پر سیدنا آدمؑ سے اگرچہ ایک بھول بھی ہوئی، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کا مقام دوبارہ عطا کیا، انھیں اپنے خاص بندے کے طور پر چن لیا اور انھیں اپنا نبی اور رسول بنایا۔

اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدمؑ کو اپنا خلیفہ بنانے کے لیے تخلیق کیا تھا۔ خلافت اولادِ آدم کا پیدائشی حق ہے، تاہم خلافت تک ان کی رسائی صرف اور صرف انبیا کی پیروی کرنے سے ممکن ہوتی ہے۔ اس کے لیے اولادِ آدمؑ کو اس بات پر ایمان لانا ہے اور عمل کرنا ہے جو اسے اللہ کی کتابوں میں بتایا گیا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا	تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے عمل صالح کیے، ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ

اسۡتَخۡلَفَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِم(٢٤:٥٥) ان کو ملک میں اقتدار بخشے گا جیسا کہ ان لوگوں کو اقتدار بخشا جو ان سے پہلے گذرے۔

خلیفۃ اللہ ہونے کا مطلب ہے کہ دیگر باتوں کے علاوہ انسان میں ان تمام صفات خداوندی کا ظہور ہو جن کے پرتو میں انسان کو تخلیق کیا گیا تھا کہ صورت الٰہیہ انھی تمام صفات سے عبارت ہے۔ اللہ کی اپنی صفات کو انسان اگر اپنے فکر و عمل میں مجسم کرے گا تبھی اللہ کی نمایندگی کر سکے گا، تبھی اس کا نائب کہلائے گا، لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ اکثر لوگ اس استعداد، اس چھپی ہوئی صلاحیت پر پورے نہیں اترتے۔ ایمان رکھتے ہوئے اور عمل صالح کرنے کے باوجود وہ کبھی اللہ کے قابلِ اعتبار بندے نہیں بن پاتے کہ ہوا و ہوس اور بھول چوک، نسیان ان کو اپنی اصل ذمہ داری، اپنے اصل منصب سے غافل کر دیتی ہے۔

اس گفتگو کو اگر کارِ خیر اور عملِ صالح کے مبحث سے الگ کر لیا جائے اور مسئلے پر کونیات (cosmology) اور نفسیات کے تناظر میں غور کیا جائے تو بات آگے بڑھائی جا سکتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھیے تو معاملے کو پرکھنے اور سمجھنے کا ایک اور انداز میسر آتا ہے جو اخلاقیات سے بھی مختلف ہے اور اس حد تک انسان مرکز (anthropomorphic) بھی نہیں ہے۔

رحمِ مادر میں جب انسان کا حمل ٹھہرتا ہے تو اس مرحلے پر ہمارے سامنے وہ چیز ہے جسے ہم نے ''خاکِ آدم'' یا آب و گل کا آمیزہ کہا تھا، وہ مجموعۂ آب و گل جسے اللہ کے دو ہاتھوں نے گوندھا اور ڈھالا تھا۔ قرآن مجید میں کئی جگہ رحم مادر میں اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی کارفرمائی کا ذکر آتا ہے:

هُوَالَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ تُرَابٍ ثُمَّ مِنۡ نُّطۡفَةٍ ثُمَّ مِنۡ عَلَقَةٍ ثُمَّ یُخۡرِجُکُمۡ طِفۡلًا ثُمَّ لِتَبۡلُغُوۡۤا اَشُدَّکُمۡ ثُمَّ لِتَکُوۡنُوۡا شُیُوۡخًا وَمِنۡکُمۡ مَّنۡ یُّتَوَفّٰی مِنۡ قَبۡلُ وَلِتَبۡلُغُوۡۤا اَجَلًا مُّسَمًّی وَّلَعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ (٤٠:٦٧)

وہ ہے جس نے تم کو پیدا کیا مٹی سے، پھر نطفے سے، پھر خون کی ایک پھٹکی سے۔ پھر وہ تم کو وجود میں لاتا ہے ایک بچہ کی صورت میں۔ پھر (وہ تم کو پروان چڑھاتا ہے) کہ اپنی جوانی کو پہنچو۔ پھر (وہ تم کو مہلت دیتا ہے) کہ تم بڑھاپے کو پہنچو۔ اور تم میں سے بعض اس سے پہلے ہی مر جاتے ہیں اور (بعض کو مہلت دیتا ہے) کہ تم ایک مدت معین پوری کرو، اور یہ اس لیے ہے کہ تم سمجھو۔

حمل کے چوتھے مہینے تک یہ مشتِ خاک، یہ آمیزۂ آب و گل اتنا صورت پذیر ہو جاتا ہے کہ نَفَسِ رحمٰن (اللہ کی پھونک) کو قبول کر سکے۔ تب فرشتہ بدن میں روح پھونکتا ہے۔ رحمِ مادر کے اندر سارا عرصہ ایسا ہے جس میں جنین وہ خواص اور اوصاف ظاہر کرتا ہے جو جمادات اور نباتات کے خواص ہیں۔ اس جنین میں اور بھی خواص ہوتے ہوں گے، مگر ہمارے حواس کے سامنے ان میں سے کسی کی نمو نہیں ہوتی۔ یہ الگ بات ہے کہ آلات کے ذریعے اس کا قریب سے معائنہ کرنے پر ایک مختلف صورت سامنے آ جائے۔

جب بچے کی ولادت ہوتی ہے تو پہلی خصوصیات جو اس سے ظاہر ہوتی ہیں، وہ عالمِ حیوانات کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ انسان کے بچے کے مقابلے میں جانور کہیں تیزی سے بڑھتا ہے اور اپنے پورے قد کاٹھ کو پہنچ جاتا ہے، اسی لیے جانور اپنی نسل کے جملہ خواص، سارے اوصاف پیدا ہونے کے چند دنوں یا زیادہ سے زیادہ چند مہینوں کے اندر ظاہر کرنے لگتا ہے، لیکن انسان کا معاملہ مختلف ہے۔ نسلِ انسانی کے افراد اپنی سرشت میں موجود صفات کو عملاً کبھی بھی پوری طرح ظہور میں نہیں لا پاتے، کیونکہ ان کی تعداد لامحدود ہے۔

جنین کی نباتی صلاحیت یا ملکۂ غاذیہ میں صفاتِ الٰہیہ بہت کمزور سی صورت میں اپنا ظہور کرتی ہیں۔ پودوں کی طرح جنین میں بھی زندگی کے آثار ہوتے ہیں، یہ اپنی غذا حاصل کرتا ہے، اسے جذب کرتا ہے اور اس میں نمو اور بڑھوتری کی صلاحیت ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ جنین میں انسانی خواص بیدار ہوتے ہیں۔ ماں کو اس کا پہلا احساس اس وقت ہوتا ہے جب بچہ شکمِ مادر میں حرکت کرتا ہے۔ گذرے وقتوں میں جنین میں نمودار ہونے والی زندگی کے یہ آثار محسوس کرنے کو ''بیداریِ رحم'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ حیوانی اوصاف جلد ہی نمودار ہو جاتے ہیں جو اس میں اور دوسرے جانوروں میں مشترک ہیں، مثلاً بھوک اور غصہ۔ یہ دونوں صفات اصل میں ارادہ اور غضب کی دو صفات خداوندی کا ظہور ہوتی ہیں۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہر ثقافت میں اس جادوئی، کرشماتی طاقت کا اعتراف کیا گیا ہے جو قوتِ گویائی، انسانی نطق و کلام کی صلاحیت کے ساتھ منسلک ہے۔ ہم عرض کر چکے ہیں کہ قرآن مجید کے مطابق اللہ تعالیٰ تخلیق بھی کلام کے وسیلے سے کرتے ہیں اور وحی بھی کلام کے ذریعے نازل کرتے ہیں۔ اسی طرح انسان اللہ کا فہم بھی گویائی کے ذریعے حاصل کرتا ہے اور اپنے اختیار سے اللہ کی طرف

لوٹنے کا عمل بھی کلام کے ذریعے انجام دیتا ہے۔ قرآن کا سیکھنا، پڑھنا اور دین پر عمل کرنا کلام پر منحصر ہے۔ مسلمانوں نے جب یونانی سے ترجمے کیے اور اس فقرے کا یونانی سے عربی میں ترجمہ کیا کہ "The human being is a rational animal" تو ترجمے میں یونانی الفاظ کے معانی کی ایک ایسی سطح اور ایسے پہلو پر زور دیا جو انگریزی میں تقریباً فراموش ہو چکا ہے۔ "**الانسان حیوان ناطق**" کے لفظی معنی ہیں: ''انسان ایک بولنے والا جانور ہے''، جس چیز کو آج rationality (ذی عقل ہونا، ذی شعور ہونا) کہتے ہیں، وہ کیا ہے؟ عقل کا اظہار و بیان گویائی کے وسیلے سے۔ اسی طرح نطق و گویائی کا مطلب ہے عقل جو اظہار میں آ جائے، بیان کی صورت اختیار کر لے۔ گویائی اور کلام اگر مبنی بر عقل نہ ہو تو اس میں اور کتے کے بھونکنے اور پرندے کے چہچہانے میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

سو ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ کلام وہ خاص صفتِ خداوندی ہے جس سے انسان اور دیگر زمینی مخلوقات میں امتیاز قائم ہوتا ہے۔ (فرشتے اور جن بھی گویائی رکھتے ہیں، لہٰذا ان سے امتیاز اس بنیاد پر نہیں ہو سکتا)۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ گویائی اصل میں اس شخص یا ہستی کی ذات کا اظہار ہے جو خود آگاہ ہو، شعورِ ذات رکھتی ہو۔ جب اللہ تعالیٰ کلام فرماتے ہیں تو وہ جانتے ہیں کہ وہ کیا کہ رہے ہیں اور کیوں کہ رہے ہیں۔ بلاشبہ حیوانات بھی بہت کچھ کہتے ہیں، لیکن ان کی گویائی اور خود آگاہی یا شعورِ ذات بہت ہی محدود ہے، اتنا محدود کہ شاید یہ کہنا درست ہوگا کہ ان میں یہ اوصاف پائے ہی نہیں جاتے۔ انسان کی قوتِ گویائی کو، اس کے برعکس، خود آگاہ ہونا چاہیے، لیکن بسا اوقات ایسا نہیں ہوتا۔ انسان کے دیگر اوصاف کی طرح یہاں بھی وہی مسئلہ آن کھڑا ہوتا ہے کہ ''جو عملاً ہوتا ہے''، وہ اس کے الٹ ہے ''جو ہونا چاہیے۔''

انسان اپنی قوت گویائی، ملکہ نطق و کلام کے وسیلے سے کیا کہ سکتا ہے اور کیا جان سکتا ہے؟ اس کی بلاشبہ کچھ حدود ہیں، لیکن یہ حدود اس امر سے متعین نہیں ہوتیں کہ بولنے والا شخص کون ہے یا کون سی زبان بول رہا ہے یا تاریخ کے کس عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ ان حدود و قیود کا تعلق اس بات سے ہے کہ انسان ہونے کا مطلب کیا ہے۔ انسان کی گویائی پر پابندی و آزادی کو سمجھنا ہو تو ہمیں نسلِ انسانی کے ان عظیم اور مثالی افراد کو دیکھنا ہوگا جن کی ذات میں صفاتِ خداوندی مجسم ہو گئیں اور ان کا ظہور اپنے نقطۂ کمال کو پہنچا۔ بات گویائی یا قدرت کمال کی ہو تو ہمیں سب سے پہلے نسلِ انسانی کے عظیم ترین بولنے والوں پر نگاہ کرنا ہوگی، وہ جنھیں خطاب کرنے اور خوش کلامی کی استعداد سب سے زیادہ ملی تھی۔

ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جن پر اللہ کی کتاب اتاری گئی اور وہ بھی جن کے زورِ بیان سے عالمی ادب کے نفیس ترین شاہکار وجود میں آئے۔ قصۂ آدم میں جو اس امر کا ذکر آیا ہے کہ حضرت آدمؑ کو تمام اشیا کے نام دنیا کی تمام زبانوں میں سکھائے گئے تھے تو اس کے ایک معنی تو بالکل واضح ہیں، اور وہ یہ کہ، انسان خلقی طور پر سب اسما کا علم رکھتا ہے، لہٰذا اسے یہ قدرت حاصل ہے کہ وہ ملکۂ گویائی کے تمام امکانات کو ظہور میں لا سکے۔

انسانی تاریخ میں قدرتِ کلام اور حسنِ بیان کا ظہور جس طرح ہوا ہے اس پر غور کیجیے۔ یہ بات فی الفور سمجھ میں آ جائے گی کہ قوتِ گویائی اور لطفِ سخن میں جیسے جیسے امکانات پوشیدہ ہیں، ان کے مقابل ہم آپ تو اس کے بہت ہی ناقص اور ادھورے مظاہر شمار کیے جائیں گے۔ آج کا بڑے سے بڑا شاعر شیکسپیئر، دانتے یا حافظ کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتا ہے؟ ہما شما کس شمار قطار میں آتے ہیں؟ دوسری طرف دنیا کا شاہکار ادب دیکھیے تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ شیکسپیئر کا کوئی بھی ڈرامہ انجیل کی ہمسری کر سکتا ہے یا تاؤتی چنگ کی یا بھگوت گیتا کی؟

نومولود بچے کی مثال پر ذرا غور فرمایئے۔ اس دنیا میں آنے کے بعد کئی ماہ تک طفل شیر خوار میں انسان کی قوتِ گویائی کے پروان چڑھنے کا عمل شروع نہیں ہوتا، اور جب ایک مرتبہ امکانات گویائی کے پنپنے اور بڑھنے کا عمل شروع ہو جاتا ہے تو پھر یہ تا دمِ مرگ جاری ہی رہتا ہے۔

گویائی کی اس قوت کو ایک عملی حقیقت بنانے کے لیے بچے کے سامنے اسے بڑھانے اور ترقی دینے کے جو امکانات ہیں، ان میں سے سب سے بہتر راستہ کیا ہے؟ ہماری ثقافتی زندگی میں اس سوال کے جواب پر کوئی اتفاق رائے نہیں ہے۔ جیسا اور جتنا کسی نے پڑھ رکھا ہے، ویسا ہی جواب اس کے پاس فراہم ہوتا ہے۔ ہر شخص نے اس معاملے میں اکا دکا ماہرین کی رائے یاد کر رکھی ہے اور اسی کو فیصلہ کن بتاتا ہے۔ کچھ لوگوں کے خیال میں اس سوال کا جواب نفسیات کے پاس ہے، دیگر حضرات اس کے جواب کے لیے سماجیات کو موزوں جانتے ہیں یا فلسفہ، دینیات سے رجوع کرتے ہیں، یا پھر اپنے بزرگوں میں سے کسی فرد مثلاً چچا جان سے پوچھتے ہیں۔ بچوں کی نفسیات کا ایک ماہر آپ کو جو مشورہ دیتا ہے، دوسرے ماہر کا مشورہ اس کے برعکس ہوتا ہے اور کسی بڑی بوڑھی سے پوچھیے تو وہ کہے گی کہ یہ جو بچوں کی نفسیات کے ماہر بنے بیٹھے ہیں، ان کو سرے سے بچوں کے بارے میں کچھ پتا ہی نہیں ہے۔

اسلامی تہذیب کے تناظر میں یہ اختلاف رائے آج کے مقابلے میں بہت کم تھا۔ سب لوگ یہ

بات جانتے اور مانتے تھے کہ قوت گویائی اور ملکۂ نطق وکلام اللہ کی صفات میں سے ہے اور زبان کا، اعجازِ بیان کا، کامل ترین نمونہ قرآن میں پایا جاتا ہے اور انسانوں میں اگر کوئی شخص سب سے فصیح و بلیغ تھا اور قدرتِ کلام میں سب سے بڑھا ہوا تھا تو وہ رسول خداؐ کی ذات تھی۔ حقیقی کلام تو کلام اللہ ہی ہے ''لا کلام الا کلام اللہ۔'' اگر انسان نے واقعی اس صفتِ خداوندی کی اپنے اندر نشو ونما دیکھنا ہے تو اسے وہیں سے اپنا آغاز کرنا ہوگا، جہاں اس صفتِ خداوندی نے ایسی شکل میں ظہور کیا جسے ہر انسان دیکھ سکتا ہے، اس تک رسائی حاصل کر سکتا ہے اور وہ صورت ہے قرآن مجید۔ یہی سبب ہے کہ اسلامی ثقافت دنیا کے ہر خطے میں اس بات کو تسلیم کرتی ہے اور اس پر زور دیتی ہے کہ قرآن کو اپنے اندر سمونا، اسے مجسم کرنا اور اپنے آپ کو نورانی کرنا کتنا اہم ہے۔

خیال Imagination

مسلم ماہرین نفسیات نے بتدریج قرآن وحدیث پر مبنی مختلف افکار اور نظریات مرتب کر لیے جن کی مدد سے اس امر کی توضیح ہوتی تھی کہ نفسِ انسانی ایک بالقوہ صورتِ الٰہیہ کے مرحلے سے لے کر ایک مکمل اور فی الواقع حقیقی صورتِ الٰہیہ تک کیسے پروان چڑھتا ہے اور کن مراحل سے گذرتا ہے۔ اس ضمن میں ان کے سارے نظریات کی بنیاد نفس کے اس تصور پر استوار کی گئی ہے جس کا ذکر ہم نے ''توحید'' کی بحث میں کیا تھا۔ اس تصور کے مطابق نفس کی ماہیت دو رُخی نوعیت کی ہے اور اسے روح اور بدن کے درمیان کی چیز گردانا جاتا ہے۔ سابقہ گفتگو کو تازہ کرنے کی غرض سے اتنا مکرر عرض کر دیتے ہیں کہ انسان کی ہستی مرکب ہے نفخِ روح اور آمیزۂ آب و گل سے۔ مشتِ خاک میں اللہ کی روح پھونکنے سے انسان کا وجود ہے۔ روح کی خلقی اور اصل صفات ہیں نور، حیات، علم (یا آگہی)، ارادہ، قدرت، کلام وغیرہ۔ اس فہرست کو اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسما تک وسیع کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس بدن جس حد تک خاکی ہے، اس حد تک اس میں ان صفات میں سے کوئی صفت بھی ڈھنگ سے نہیں پائی جاتی۔

نفس وہ نقطہ ہے جہاں روح اور بدن کا اتصال ہوتا ہے، نور وظلمت گھل مل جاتے ہیں، موت و حیات یکجا ہو جاتے ہیں اور بے خبری اور آگہی کا ملاپ ہوتا ہے۔ نسلِ انسانی کا ہر فرد علم اور لاعلمی، قدرت اور ناطاقتی، خواہش اور بے رغبتی سب صفات کے آمیزے کا نمایندہ ہوتا ہے۔ اگر ہم مختلف صفاتِ خداوندی پر غور کریں تو جلد ہی ہم پر عیاں ہو جائے گا کہ یہ صفات مختلف لوگوں میں مختلف درجات میں پائی جاتی ہیں، کسی میں کم کسی میں زیادہ۔ ہم نے چند صفحات قبل ذکر کیا تھا کہ صفتِ کلام،

گویائی کا ملکہ انسانوں میں کیوں کر پایا جاتا ہے اور اس کے کتنے درجات اور سطحیں ہیں۔ بچوں کی غوں غاں سے لے کر زبانِ رسالت کی فصاحت تک سب اللہ کی صفتِ کلام کا ظہور ہے۔ اسی طرح زندگی یا حیات کی صفت بھی یکساں انداز میں سب جگہ نہیں پائی جاتی۔ ہم سب زندہ تو ہیں، اس میں شک نہیں، لیکن کچھ لوگ بیماری کا شکار ہیں، عمر رسیدہ ہیں یا دوسرے اشخاص کے مقابلے میں موت سے زیادہ قریب ہیں۔ قدرت Power کی صفت جس طور ظہور پذیر ہوتی ہے، اس میں بھی بہت تنوع اور اختلاف ہے اور اس کے درجات کا یہ فرق بہت واضح ہے، کیونکہ مغربی ثقافت نے صدیوں تک طاقت اور قدرت آزمائی کو خاص اہمیت دی ہے۔ قدرت سے ہماری مراد ہے معاملات اور اشیا پر قابو یافتگی، بالا دستی، اقتدار۔ اس کی ایک سطح وہ ہے جو جسمانی طاقت سے متعلق ہے اور اس سلسلے میں بھی انسان انسان میں بہت فرق ہوتا ہے۔ دوسرے پہلو سے قدرت کا ایک مظہر سماجی قوت ہے جس کا اطلاق اور استعمال اقتصادی قوت کے طور پر بھی ہو سکتا ہے اور سیاسی قوت کے طور پر بھی، نیز اس کے دیگر راستے بھی ممکن ہیں۔

ہر انسان ذی نفس ہے اور نفس کیا ہے، اللہ کی روح جو مشتِ خاک میں پھونکی گئی، روح جو بدن کے قالب میں آ گئی۔ انسان کو نہ تو روح سے براہ راست آگہی حاصل ہے نہ بدن کا بلاواسطہ شعور۔ ہمیں اپنے آپ کا جو تجربہ ہوتا ہے، وہ نفس کے واسطے سے ہے، نفس ہی اس کا تعین کرتا ہے۔ اپنے بدن کا اور دوسرے جسموں کا جو تجربہ جو آگہی ہمیں ملتی ہے وہ نفس کے واسطے سے ہو کر آتی ہے۔ اسی طرح روح کی آگہی بھی نفس ہی کے وسیلے سے میسر ہوتی ہے۔ آگہی، شعور اور احساس ہمارے نفوس کی صفات ہیں اور انھی سے ہم اپنے بدن کو جان پاتے ہیں۔ اس شعور و آگہی کا منبع روح ہے اور ذرا اور پیچھے جائیے تو خود اللہ تعالیٰ اس کا ماخذ ہے، کیونکہ ''لا عالم الا اللہ''۔ اللہ کے سوا شعور و آگہی، علم و معرفت اور کس کو ہے؟

بدن بحیثیت بدن کوئی احساس و آگہی نہیں رکھتا، کیونکہ یہ محض مجموعۂ آب و گل ہے۔ دوسری جانب روح بطور روح ہمارے حواس کی گرفت سے باہر ہے کہ خود روح ہی تو ہمارے احساس و آگہی کی آخری اور حتمی بنیاد اور داخلی مرکز ہے۔ آگہی اور شعور روح سے ہے، لہٰذا خود روح سے آگاہ ہونا اس کا شعور و احساس حاصل کرنا ممکن نہیں جیسے نظر خود اپنی آنکھ کو نہیں دیکھ سکتی۔ ہاں آنکھوں کو دیکھنے کے لیے آپ آئینے کے سامنے البتہ جا سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر روح کو دیکھنا ہو تو اپنے نفس میں جھانکیے کہ اس میں روح کا پرتو ہے، روح کی صفات کا عکس اس میں جھلک رہا ہے، لیکن ''آپ'' جو اس دیکھنے کی تہ میں کارفرما ہے، آپ کا اپنا ''آپ''، اسے کبھی دیکھا نہیں جا سکتا کہ یہی روح سے عبارت ہے۔

ہم عرض کر چکے کہ نفس کی ماہیت بیان کرنے کے لیے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں، ان میں سے ایک ''خیال'' (imagination) کا لفظ بھی ہے۔ کسی چیز کی تمثیل یا عکس میں خاص بات یہ ہوتی ہے کہ یہ بیک وقت اس چیز سے مختلف بھی ہوتا ہے اور عین اس چیز جیسا بھی۔ مثال کے طور پر فیصل مسجد کی شبیہ یا عکس کو لیجیے۔ یہ فیصل مسجد ہی کا عکس ہے، سپریم کورٹ یا سینیٹ کی عمارت کا نہیں، لہٰذا اپنے مشمولات کے اعتبار سے یہ شبیہ ایک مختلف چیز بھی ہے، کیونکہ یہ کاغذ پر کیمیاوی طریقے سے ایک عکس کو ثبت کرنے کا نام ہے۔ روایتی طور پر عکس و شبیہ کی جو مثال عام طور پر پیش کی جاتی تھی، وہ تھی آئینے میں عکس کی مثال۔ اب ذرا نفس کی طرف واپس آئیے۔ نفس میں روح اور بدن دونوں کا عکس موجود ہے۔ روح کا عکس، اس کا نقش جتنا زیادہ ہوگا اتنا ہی نور، حیات، علم، ارادہ، قدرت اور دیگر صفات نفس میں جاگزیں اور غالب ہوں گی۔ اسی طرح بدن کا عکس نفس کے اندر ظلمت و تیرگی، موت، بے علمی اور عجز و ناطاقتی کو جنم دے گا۔

نفس، روح و بدن کے درمیان کی شے ہے، لیکن یہ درمیانی حیثیت کوئی ساکن اور جامد مقام نہیں ہے۔ خواب میں آنے والی شبیہ کی طرح نفس بھی ایک انقلابِ پیہم کی زد میں رہتا ہے۔ اس کی صورت و ماہیت ہر آن بدلتی رہتی ہے۔ اس نکتے پر غور کرنا ہو تو کبھی کسی گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر باہر کی دنیا سے قطع نظر کرکے ذرا اپنی نگاہ کا رخ اندر کی جانب کر لیجیے، اپنے نفس پر نظر کیجیے۔ آپ کو احساس ہوگا کہ آپ کے اندر ہر لحہ بدلتی ہوئی شعور کی ایک رَو ہے جس میں یادیں، محسوسات، خیالات، عکس اور شبیہیں پل پل نیا روپ لیتی رہتی ہیں۔

زندگی کے روزمرہ معمولات میں انسان ان صفاتِ خداوندی کو ظاہر کرتا ہے جو اس کے اندر خوابیدہ اور چھپی ہوئی ہیں۔ ایک لحہ وہ مائل بہ کرم ہوتا ہے (الکریم کی صفت کا مظہر) اور دوسرے لمحے اس سے المانع اور القابض (روک لینے والا، واپس لے لینے والا) کی صفاتِ ربّانی کا ظہور ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان کی خود آگہی اور خلق آگہی بھی کبھی یکساں نہیں رہتی۔ مثالی صورت تو یہ ہے کہ انسان دوسرے انسانوں سے معاملات کرتے ہوئے اس علم کو جو حضرت آدمؑ کو دیا گیا تھا زیادہ سے زیادہ عمل میں لائے، اسے حقیقت واقعہ بنائے۔ دین کے پانچ ارکان اور دیگر اعمال مثلاً ذکرِ الٰہی کا مقصد یہی ہے کہ انسان کی آگہی کو اس چیز پر مرکوز کیا جا سکے جو فی الواقع اللہ تعالیٰ نے انسان میں رکھی ہے، جو اللہ کی طرف سے ظاہر ہوئی ہے اور اس طرح انسان کے اندر جو صورتِ الٰہیہ ہے، وہ الحق کی صفات کے مکمل ظہور کے

مطابق بڑھے، پروان چڑھے اور اپنی پوری دمیدگی تک پہنچے، تاہم ایک چیز یقینی ہے۔ نفس چونکہ عالمِ خیال کی ایک حقیقت ہے، پس متواتر دو لمحے کے لیے بھی یہ ایک سا نہیں رہتا۔ پل پل بدلتا رہتا ہے۔

نفس کی ماہیت اور روح و بدن کے درمیان ایک مبہم حقیقت کے طور پر اس کے مرتبہ وحیثیت کو بیان کرنے کے لیے اور بھی کئی لفظ استعمال کیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر اسے روح کی تجسیم کہا گیا ہے۔ نفس میں آ کر بدن کے خدوخال اختیار کر کے ہی روح اپنی صفات، مثلاً کلام اور قدرت وغیرہ کو ظاہر کر سکتی ہے۔ بدن کا وسیلہ نہ ہو تو روح کلام نہیں کر سکتی۔ نفس وہ نقطۂ وصال ہے جہاں روح اور وہ الفاظ یکجا ہو جاتے ہیں جو ہم بولنے والے کی زبان سے سنتے ہیں۔ اللہ کے کلام کی طرح روح کا کلام بھی اس وقت اظہار و بیان میں آتا ہے جب اسے لفظ کے وسیلے سے ایک خارجی قالب میسر آتا ہے۔ بلا لفظ آگہی یا بے آواز سوچ سے لے کر لفظ اور فقرے کا سفر جادۂ نفس پر ہی طے ہوتا ہے۔ اس کا تجربہ ہم میں سے ہر شخص کو ہوگا۔

مثال کے طور پر اگر آپ ایک ریاضی دان ہیں اور کوئی آپ سے آپ کے موضوع پر ایک مشکل اور الجھا ہوا سوال کر دیتا ہے۔ آپ کو اس کا جواب معلوم ہے اور سوچے بغیر فوری طور پر آپ کے ذہن میں آ گیا ہے، لیکن اس جواب کو سامنے لانے، بیان کرنے کے لیے آپ کو دس منٹ تک گفتگو کرنا پڑتی ہے۔ یہ ہے وہ عمل جس میں بے حرف وآواز اور غیر مجسم روح، یعنی آپ کا فہم وآگہی نفس کی وساطت سے الگ الگ لفظوں اور فقروں کا قالب اختیار کرتا ہے اور جامۂ حرف وصوت میں آ جاتا ہے۔

لفظ بذاتِ خود ''خیال'' کے عالم سے متعلق ہے۔ اقلیمِ گویائی میں لفظ ہی نفس کی ماہیت کا نمایندہ ہوتا ہے۔ لفظ نہ تو آگہی وشعور ہے اور نہ کوئی مادی جسمانی شے۔ نفس کے مانند الفاظ بھی روح و بدن کے درمیان کے حقائق ہیں۔

روح کی صفات میں سے ایک صفت اس کی وحدت و یکتائی بھی ہے۔ اللہ نے جو روح پھونکی، وہ ایک ناقابلِ تقسیم حقیقت ہے، نورانی، ذی شعور، صاحبِ ارادہ اور قدرت رکھنے والی۔ روح کے برعکس بدن کو جتنا چاہے تقسیم کر لیجیے۔ بدن اور اجزائے بدن میں سے کوئی بھی اپنے آپ میں ایک مکمل کُل نہیں ہے۔ بدن اگر یکجا اور ایک وحدت میں بندھا ہوا ہے تو اس کا سبب روح کی قدرت ہے جس نے منتشر اجزا کو ایک ایک کر کے جوڑا ہے۔ روح نہ ہو تو بدن مٹی میں مل کر، بکھر کر، مٹی ہو جاتا ہے۔ پس روح واحد ہے جب کہ بدن کثیر۔

نفس وحدت و کثرت ہر دو کا اسیر ہے، ایک بھی ہے اور متعدد بھی۔ واحد اس لیے ہے کہ ہم میں سے ہر انسان ایک منفرد اور یکتا شخصیت ہے جو اس امر کا انکار نہیں کرسکتا کہ ''میں، میں ہوں''۔ نفس میں تعدد اس لیے ہے کہ ایک ہی نفس کے کتنے ہی کردار اور حیثیتیں ہیں جو بدن میں ہونے سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ نفسِ واحد، یہ ''انا'' یا ''خودی'' ذی حیات ہے، علم رکھتی ہے، صاحبِ ارادہ ہے، گویائی، سماعت، بصارت، ذائقہ، لمس کی صلاحیت رکھتی ہے اور اس کی یادداشت بھی ہے۔ نفس کی ان صلاحیتوں یا قوتوں میں سے کئی ایسی ہیں جن کا بدن کے خاص خاص اعضا سے تعلق ہے۔ خلاصہ یہ کہ نفس روح کی تجسیم کا نام ہے۔ روح نہ ہوتو ہر وحدت مٹ جاتی ہے، بدن نہ ہوتو کثرت ظہور میں نہیں آتی۔

ہمارے تجربے میں آنے والی دنیا میں نفس بطور روحِ مجسم کے لیے اگر قریب ترین مثال کوئی ہو سکتی ہے تو وہ نورِ مرئی کی مثال ہے۔ مطلب یہ کہ نفس کو اگر روح کی تجسیم مانا جائے تو اس کی مثال اس روشنی کی ہوگی جو ہم دیکھ سکتے ہیں۔ یہ روشنی ایک حقیقتِ واحدہ ہے، لیکن جیسے ہی نور کی یہ حقیقتِ واحدہ مادی، جسمانی اشیا سے ٹکراتی ہے، اس میں رنگ ابھرنے لگتے ہیں۔ یہ رنگ اس روشنی میں شروع ہی سے بالقوہ موجود تھے، لیکن یہ رنگ ہائے خفتہ اس وقت تک نمودار نہیں ہوسکتے اور فی الواقع سامنے نہیں آسکتے، تاوقتیکہ یہ روشنی کسی چیز کی سطح سے نہ ٹکرائے یا اس کو کسی اور مادی طریقے سے، مثلاً منشور (prism) کے ذریعے رنگوں میں بکھیرا نہ جائے۔ اسی طرح زندگی، علم اور قدرت روح کے اندر موجود ہوتے ہیں، لیکن بدن کے بغیر ان صفات کا خارج میں ظہور نہیں ہوتا، یہ امرِ واقعہ نہیں بنتے۔ سو ہماری تمثیل کے مطابق روشنی نور ہوئی، اس کے رنگ نفس کے مترادف ٹھہرے اور مادی اشیا جن پر روشنی پڑ رہی ہے بدن کی مثال قرار پائے۔

خیال (Imagination) کی تعریف اکثر تجسدِ ارواح، یعنی ''روحانی امور کی تجسیم'' کے الفاظ سے کی جاتی ہے۔ اسی طرح عموماً اس کو یوں بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ''خیال'' کا کام ہے جسمانیات کو روحانیات میں تبدیل کرنا۔ اس بحث میں نفس کی حقیقت کی ایک اور جہت، ایک اور پہلو عموماً پیش نظر ہوتا ہے۔ غور فرمایے کہ خارج کی دنیا میں جو چیزیں موجود ہوتی ہیں، ہم ان کی آگہی حاصل کرکے، ان کو اپنے حواس کی گرفت میں لاکر کیوں کر اپنے نفس میں منتقل کر لیتے ہیں! ہم ایک درخت یا ایک مکان یا کسی شخص کو دیکھتے ہیں، یہ دیکھنا بذاتِ خود نفس کا ایک عمل ہے۔ ایک جسمانی، مادی شے یعنی درخت، مکان یا کوئی شخص، اب مبدل بہ روح ہوگیا ہے، یعنی ایک ایسی چیز میں بدل گیا ہے جو ہماری

آ گہی کے نورانی حلقے میں شامل ہوگئی ہے۔ یہ چیز اب ہماری ذات کا، ہمارے نفس کا حصہ ہے۔ یہ ہماری زندگی سے زندہ ہے۔ جو پہلے مردہ تھی، (یعنی جس حدتک وہ صرف آب وگِل سے عبارت تھی) اب ہمارے اندر، وہ ہماری وساطت سے زندہ ہے، چنانچہ اپنی پہلی حیثیت کے مقابلے میں اب اسے روحانیت حاصل ہوگئی ہے۔

یاد رہے کہ روح اور بدن کے تصورات کوئی مطلق تصوارت نہیں ہیں۔ان میں ایک اضافیت پائی جاتی ہے۔مثال کے طور پر روح کے مقابلے میں نفس ایک جسمانی چیز ہے، روح کے لیے نفس بدن کی طرح ہے، کیونکہ روح کے برعکس اس میں بدن کے سارے خواص، ظلمت و تیرگی، موت، جہل اور کمزوری وغیرہ سب پائے جاتے ہیں، لیکن اگر نفس کا موازنہ بدن سے کیا جائے تو نفس ایک روحانی چیز ہوگا کہ اس میں روح کی ساری صفات، نور، حیات، علم، قدرت وغیرہ پائی جاتی ہیں۔سو ہم پھر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ نفس ایک دورُخی اور مبہم شے ہے۔ یہ ''خیال'' ہے، یہ روح کی شبیہ ہے اور بدن کی شبیہ بھی، لیکن ساتھ ہی یہ نہ تو نرا بدن ہے اور نہ محض روح۔

''خیال'' کے اس تصور کو پس منظر میں رکھیے اور پھر از سر نو نفس کی نشو ونما پر غور کیجیے۔نفس میں جتنی بھی صفاتِ خداوندی موجود ہیں، وہ ''خیال'' کی چیزیں ہیں (یہاں ''خیال'' وہمی، فرضی اور تخیلاتی کے معنی میں نہیں ہے)، یعنی یہ کہ ان میں عکس وشبیہ کے خواص پائے جاتے ہیں۔ پس نفس کی زندگی اصل میں زندگی کا عکس ہے۔اصلی، حقیقی زندگی تو حیاتِ خداوندی ہے جب کہ بے آلایش حیاتِ مخلوقہ فرشتوں کی زندگی ہے۔انسانی زندگی، حقیقی زندگی کا پرتو ہے، یعنی یہ حیاتِ خداوندی سے مشابہ بھی ہے اوراس سے مختلف بھی۔جس حدتک اس کی مشابہت حیاتِ خداوندی سے ہے (تشبیہ کا اصول)، انسانوں کو حقیقی زندگی میسر ہے۔جس حدتک یہ حیاتِ خداوندی سے مختلف ہے، انسان فی الاصل مردہ ہے۔تو پھر کیا کہا جائے گا، انسان مردہ ہے یا زندہ ہے؟ زندہ مردہ ہردو یا پھر نہ زندہ نہ مردہ؟ یا پھراس کے جواب کا دارومداراس امر پر ہے کہ آپ نے سوال کس نقطۂ نظر سے کیا ہے۔پتھر کے مقابل انسان ذی حیات ہے، جب کہ فرشتوں کے مقابلے میں انسان مردہ ہے۔ یہ عکس جس چیز کا عکس ہے، یعنی حیاتِ خداوندی کا تو اگر یہ اس کے مطابق ہے تو نفس کی زندگی سچی اور حقیقی ہے۔اب اسی نہج پر گفتگو دیگر صفاتِ خداوندی، مثلاً علم، ارادہ، قدرت، کلام، جودوکرم اور عدل وغیرہ کے بارے میں بھی کی جاسکتی ہے، لیکن ہماری مذکورہ بالا بحث پر اگر غور کرلیا جائے تو کوئی بھی قاری اس بحث کی تکمیل خود سے کرسکتا ہے۔سو ہم صرف ایک

نکتے پر مزید گفتگو کریں گے اور اس کے بعد دوسرے مبحث کی جانب رجوع کرنا چاہیں گے۔

نفسِ انسانی کا ارتقا اور نشو ونما ''خیال'' کی اقلیم میں واقع ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر، صورتِ الٰہیہ میں مضمر تمام صفات، وہ تمام اسما جو آدمؑ کو تعلیم کیے گئے، روح اور بدن کے مابین معلق رہتے ہیں، تاہم جیسے جیسے کوئی صفت نشو ونما پاتی ہے، وہ اپنی اصل کی قوی سے قوی تر شبیہ بنتی جاتی ہے، اصل یعنی صفتِ خداوندی کی شبیہ۔ انسانی نشو ونما کے آغاز میں تنزیہ کو انسان کے دروبست پر غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ سے بے انتہا دور ہوتا ہے کہ نومولود بچے میں صفاتِ خداوندی کی بس ایک رمق ہی پائی جاتی ہے، لیکن جوں جوں انسان پیغمبروں کے لائے ہوئے پیامِ ہدایت سے ہم آہنگ ہو کر نشو ونما حاصل کرتا ہے، اس کے اندر صفاتِ خداوندی قوی سے قوی تر ہوتی جاتی ہیں۔ وہ مدھم سی روشنی جو آغازِ کار میں ٹمٹما رہی تھی، اب زیادہ واضح طور پر محسوس ہونے لگتی ہے۔ علم اور آگہی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ جسم کی زندگی آگے بڑھتی ہے اور گویہ زندگی ایک بار پھر کم ہوتی ہوئی مرجھا جاتی ہے، لیکن سچی زندگی جو نفس کی زندگی ہے، اس میں کمی نہیں آتی۔ جسم پر موت طاری ہونے کے باوجود نفس کی زندگی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ روح کو نور سے تشبیہ دی جا سکتی ہے اور بدن کو چیزوں کی سطح سے جن سے روشنی ٹکراتی ہے۔ اسی طرح نفس کی مثال ان رنگوں کی ہوگی جو روشنی کے کسی چیز کی سطح پر پڑنے سے ابھرتے ہیں۔ اسی تمثیل کو آگے بڑھایا جائے تو اس امر کی وضاحت ہو سکے گی کہ جب نفسِ انسانی اپنی تمثالِ ربانی، صورت الٰہیہ کے الوہی نمونے کے مطابق نشو ونما پاتا ہے تو اس کو کون سے مراحل درپیش ہوتے ہیں۔

عہدِ طفلی میں بدن کی ظلمت کا غلبہ ہوتا ہے اور روح کا نور ابھی مخفی ہوتا ہے اور ایک اجمالی صورت میں رہتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کے رنگ ابھرتے ہیں، سب سے پہلے بنیادی رنگ ظاہر ہوتے ہیں جن کی مثال حیات، علم و آگہی، ارادہ اور قدرت سے دی جا سکتی ہے، لیکن ابھی یہ رنگ بہت دھندلے ہوتے ہیں، کیونکہ روشنی مدھم ہے۔ بتدریج روشنی تیز ہوتی ہے اور رنگ نکھرنے لگتے ہیں، لیکن اب بنیادی کے ساتھ دیگر رنگ بھی نمودار ہوتے ہیں۔ آخر کار رنگارنگی اس حد کو پہنچ جاتی ہے کہ آپ ظاہر ہونے والے گوناگوں رنگوں کی تعداد پر کوئی قید نہیں لگا سکتے، بالکل ایسے ہی جیسے ظہور پذیر ہونے والی صفاتِ خداوندی کی تعداد پر کوئی قید نہیں لگائی جا سکتی۔ روشنی کی نمود کے امکانات بے شمار ہیں، اس کی رنگارنگی بے پایاں ہے، اسی طرح روح کے امکانات بھی بے حد و حساب ہیں کہ روح اللہ تعالیٰ کا غیر مرئی نور ہی تو ہے۔

ہر وہ رنگ جو نور میں سے الگ الگ ظاہر ہوتا ہے وہ اسی نور میں مخفی تھا۔ جب اس کی نمود ہوتی ہے تو یہ نور کا ایک عکس، اس کی شبیہ بن جاتا ہے، یعنی اب یہ رنگ بیک وقت نور ہے بھی اور نہیں بھی۔ یہ نور اس لیے ہے کہ نور کے سوا اور کس چیز کا ظہور ہوا ہے اور اسے عین نور اس لیے نہیں کہا جاتا کہ ہر رنگ اپنی جگہ نور کے جملہ امکانات میں سے صرف ایک خفیف سے جزو کا نمایندہ ہے۔ مزید برآں، رنگ اگر نمودار ہوتے ہیں تو صرف اس لیے کہ نور مدھم پڑ جاتا ہے۔ اگر نور اپنی پوری تابانی کے ساتھ درخشندہ ہو تو اس کی چمک میں کوئی کچھ نہ دیکھ سکے۔ ہم اگر اللہ تعالیٰ کو دیکھنے سے مجبور ہیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ یہی پردۂ نور اور اس کی خیرہ کن چمک نگاہ کا حجاب بن جاتی ہے۔ جیسا کہ رسول خدا ؐ نے فرمایا: ''**حِجابُہٗ النُّور**''[۵](اللہ کا حجاب نور ہے)۔ مذکورہ تصورات میں سے کئی مندرجہ ذیل حدیث میں مضمر ہیں۔ یہ حدیث نفسیات اور کونیات (cosmology) پر لکھی گئی تحریروں میں اکثر نقل کی جاتی ہے:[۶]

> اللہ تعالیٰ کے نور و ظلمت کے ستر پردے ہیں۔ اگر یہ پردے اٹھ جائیں تو روئے یزدانی کی درخشندگی سے ہر وہ شے جل کر خاک ہو جائے جسے مخلوقات کی نگاہ دیکھ سکتی ہے۔

عالمِ رؤیا The Dream World

نفس کی نشو و نما کیوں کر ہوتی ہے اور موت کے بعد اسے کیا پیش آتا ہے، اس پر لکھتے ہوئے کئی مسلمان مصنّفین نے خوابوں کی مثال پیش کی ہے اور خواب کو ایک طرح کا پیشگی تجربہ قرار دیا ہے۔ خواب میں ہم جس دنیا کا تجربہ کرتے ہیں، وہ خیال کا عالم ہے۔ خواب دیکھتے ہوئے نفس کو عکس و شبیہ کا ادراک ہوتا ہے۔ یہ شبیہیں نہ تو عینِ نفس ہیں نہ نفس سے الگ کوئی دوسری چیز، کیونکہ خواب میں جو چیزیں نظر آتی ہیں، وہ نہ تو عین وہ اشیا ہوتی ہیں جو نظر آ رہی ہیں نہ ادراکِ خواب میں آنے والی اشیا سے الگ کوئی چیز۔ عالمِ خواب سارے کا سارا ابہام اور تحیر کی دنیا ہے۔

اگر آپ خواب میں اپنی ہمشیرہ کو دیکھیں تو وہ سچ مچ آپ کی ہمشیرہ ہی ہوں گی، کیونکہ نہ تو وہ آپ کی والدہ ہیں نہ آپ کی بیٹی۔ دوسری طرف خواب میں نظر آنے والی شخصیت آپ کی ہمشیرہ اس لحاظ سے نہیں ہیں کہ آپ کی ہمشیرہ آپ کے نفس میں مقیم نہیں ہیں، نہ ان کے خدوخال اور خواص عین اس عکسِ خواب کے سے ہیں جو پردۂ خواب پر نمودار ہوا ہے۔ آپ کی یادداشت میں ہمشیرہ کا جو نقشہ ہے، اسے آپ ایک ایسی صورت میں دیکھ رہے ہیں جو خواب دیکھنے والے کی نفسیاتی حالت کے لیے مناسب ہوتا ہے، لیکن اس کے باوجود آپ کی ہمشیرہ کا تشخص نہیں بدلتا، وہ آپ کے چچا سے بہرحال مختلف ہوں گی۔

عکسِ خواب کی حیثیت کیا ہے؟ کیا یہ شبیہیں روحانی چیزوں کی جسمانی صورت ہوتی ہیں یا ان میں مادی چیزیں روحانی شکل اختیار کر لیتی ہیں؟ جواب یہ ہے کہ پردۂ خواب پر نظر آنے والی چیزیں روحانی بھی ہو سکتی ہیں، جسمانی بھی اور روحانی و جسمانی ہر دو بھی ہو سکتی ہیں۔ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہم کس لحاظ سے، کس نقطۂ نظر سے ان کو دیکھ رہے ہیں۔ ہمارے ادراک و آگہی میں ان شبیہوں کو چونکہ جسمانی صورت ملتی ہے، لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ روحانی اشیا نے جسمانی صورت اختیار کر لی، لیکن اگر اس پہلو سے غور کیا جائے کہ ہمارے ذہن نے خارجی دنیا کے عکس و شبیہ کا ادراک کر کے انھیں قبول کیا ہے تو یہ کہا جائے گا کہ مادی اشیا نے روحانی قالب اختیار کر لیا ہے۔

قرآن مجید اور احادیث دونوں میں نیند اور موت کے مابین ایک گہرا تعلق بیان کیا گیا ہے۔ روایتی طور پر مسلمان نیند اور موت کو ایک ہی حقیقت کے ظہور کے دو پہلوؤں کے طور پر سمجھتے رہے ہیں۔ موت میں بھی اور عالمِ خواب میں بھی باہر کی دنیا کی براہ راست آگہی منقطع ہو جاتی ہے، جب کہ ہر دو صورتوں میں نفس کی خود آگاہی باقی رہتی ہے۔ قرآن مجید کے مطابق دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ نیند کے بعد اللہ تعالیٰ نفس کو پھر سے بدن کے اختیار میں دے دیتا ہے۔ (۳۹:۴۲)

خواب کا بیشتر تعلق نیند ہی سے ہے۔ خواب بھی نیند کے دوران خود آگاہی کا ایک انداز ہے۔ تو پھر کیا جو کچھ ہم نیند کے دوران خواب دیکھتے ہوئے محسوس کرتے ہیں، اس کی کوئی مشابہت اس سے بھی ہے جو موت کے بعد محسوس ہوگا، مرنے کے بعد پیش آئے گا؟ بہت سے مسلمان مفکرین کا جواب یہ ہے کہ موت کی ہر چیز خواب سے مشابہت رکھتی ہے۔ سو اگر یہ جاننا ہو کہ نفس کو موت کے بعد جن واقعات کا سامنا کرنا ہوگا، ان کی نوعیت کیا ہے تو بہترین طریقہ یہ ہے کہ خواب اور عالمِ خواب کے بارے میں غور کیا جائے اور اسے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

خوابوں کو اور خواب دیکھنے کے عمل کو سمجھنے کا طریقہ کیا ہو؟ جس شخص نے بھی اپنے خوابوں کے بارے میں کچھ سوچا ہے، بخوبی جانتا ہے کہ خواب عام طور پر خاصے الجھے ہوئے اور مبہم ہوتے ہیں اور خواب دیکھنے والے کو بھی بکھرا ہوا اور بے چین چھوڑ جاتے ہیں۔ اسلام میں خوابوں کی تعبیر کا ملکہ ایک خاص عنایتِ خداوندی شمار کیا جاتا ہے اور یہ ملکہ انبیا کو عطا کیا جاتا ہے۔ اس کی سب سے مشہور مثال حضرت یوسفؑ کے قصے میں ان کے زندانِ مصر کے زمانے میں پیش آئی۔ قرآن مجید کی بارہویں سورت میں یہ قصہ آیا ہے اور قرآن مجید نے اسے ''احسن القصص'' (سب سے اچھا قصہ) کہا ہے۔

حضرت یوسفؑ کا سارا معاملہ شروع ہی ایک خواب سے ہوتا ہے جس میں انھوں نے سورج، چاند اور گیارہ ستاروں کو اپنے سامنے سجدہ کرتے دیکھا۔ جب انھیں مصر میں اسیری سے رہائی ملی تو اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ انھوں نے بادشاہ کے خواب کی صحیح تعبیر دی تھی۔ اس کے بعد جب انھوں نے مصر کو قحط کے چنگل سے بچالیا اور اپنے خاندان کو بھی محفوظ کرلیا، تب اللہ تعالیٰ نے ان کے خواب کے معنی ان پر آشکار کیے۔ ان کے والدین اور ان کے گیارہ بھائی ان کے سامنے سجدۂ شکر کے لیے جھک گئے۔

بہت سی احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ملکۂ تعبیر رؤیا کا ذکر آیا ہے۔ آپؐ کے صحابہ اپنے خواب آپ سے بیان کیا کرتے اور آپؐ ان کے خوابوں کی تعبیر ان کو بتاتے۔

سو اس بات پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ خوابوں کی تعبیر کے علم کو اسلام میں ہمیشہ ایک مقبول علم کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اسلام میں تعبیرِ رؤیا یا خوابوں کے معنی بتانے کا علم کئی لحاظ سے خوابوں کی تعبیر کی آج کل کی مروجہ کتب اور نفسیات کی کتابوں میں پائے جانے والے طریقۂ کار سے مشابہ ہے۔ ہر دو میں اس تصور پر ہمیشہ زور دیا جاتا ہے کہ پردۂ خواب پر ہمارے ادراک میں آنے والا ہر عکس اور ہر شبیہ ایک علامت اور نشانی ہے کسی اور چیز کی جو اس علامت کے پردے میں چھپی ہوئی ہے۔ خوابوں کی تعبیر کا سارا ہنر ہی یہ ہے کہ آپ یہ شناخت کر لیں کہ کسی خاص شبیہ یا عکس کے پردے میں اصل میں کیا چیز، کیا حقیقت نمودار ہو رہی ہے، لیکن اس کام کے لیے تعبیر دینے والے کو عام انسانی نفسیات کا بھی بخوبی علم ہونا چاہیے اور اس شخص کے بارے میں خاص طور پر پتا ہونا چاہیے جس کے خواب کی تعبیر کے لیے وہ کوشاں ہے۔

اسلامی روایت میں، آنحضرتؐ کے بعد جو لوگ تعبیرِ رؤیا کے مستند ماہر ہو گذرے ہیں، ان میں بعض اہل اللہ اور مقدس ہستیاں شامل ہیں۔ عام طور پر یہ بات مانی جاتی ہے کہ انسانی نفسیات پر گرفت اور اس کا وافر علم ہر ایک کو عطا نہیں ہوتا۔ آخر انسان صورتِ الٰہیہ پر بنا ہے، پس اگر خواب میں آنے والی شبیہوں کی صحیح اور اصلی معنویت کا سمجھنا درکار ہو تو اس کے لیے تعبیر کرنے والے کے پاس خدا کا عطا کردہ علم ہونا ضروری ہے۔ ہاں اس ضمن میں ایک خاص حد تک ہر شخص فہم حاصل کر سکتا ہے۔ تعبیرِ رؤیا کے علم کا سب سے اہم اصول یہ ہے کہ خواب میں نظر آنے والے عکس یا شبیہ اور اس چیز کے درمیان مناسبت اور رشتہ تلاش کیا جائے جس کی علامت کے طور پر یہ عکس پردۂ خواب پر نمودار ہوا ہے۔ خواب کی اگر صحیح تعبیر دینا ہو تو لازم ہے کہ پہلے ان اوصاف اور صفات کو سمجھا جائے جو خواب میں ابھر رہی ہیں اور پھر یہ جاننے کی کوشش کی جائے کہ ان خاص اوصاف کا اس ''چیز دیگر'' سے کیا

تعلق ہے، اس چیز کی صفات سے کیا نسبت ہے جو خواب دیکھنے والے کے آئینۂ ادراک پر عکس تو ڈال رہی ہے، لیکن خود اس کے دائرۂ ادراک سے مخفی ہے۔

امام غزالی نے عکس و حقیقت اور پردۂ خواب پر ظاہر ہونے والے عکس کی صفات اور جس شے کی یہ علامت ہے، اس کی صفات کے درمیان مناسبت تلاش کرنے کے بارے میں ایک مثال نقل کی ہے جو دوسری صدی کی مشہور شخصیت محمد بن سیرین (م ۱۱۱ھ/۹-۷۲۸ء) کے بارے میں بیان کی جاتی ہے۔ ایک شخص نے خواب دیکھا کہ اس نے ایک مہر والی انگوٹھی ہاتھ میں پہن رکھی ہے۔ مہر والی انگوٹھی خطوط پر مہر ثبت کرنے کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ لفافے پر پگھلی ہوئی موم ڈال کر انگوٹھی سے مہر لگا دی جاتی تھی۔ اگر مہر ٹوٹی ہوئی نہ ہوتو اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ خط کو کھولا نہیں گیا۔

اس شخص نے خواب دیکھا کہ وہ خطوط کو مہر لگا کر لفافے میں بند کرنے کی بجائے لوگوں کو مہر بلب کر رہا ہے اور مردوں عورتوں کی شرمگاہوں پر مہر لگا رہا ہے۔ وہ شخص ابن سیرین کے پاس آیا اور ان سے اپنے خواب کے معنی دریافت کیے۔ ابن سیرین نے جواب دیا کہ سیدھی صاف بات ہے۔ تم مسجد کے مؤذن ہو اور رمضان شروع ہو چکا ہے۔ خواب ایک مناسب صورت اور علامت میں یہ بتا رہا ہے، تم صبح کی اذان دے رہے ہو۔ ادھر تم نے اذان دی، ادھر سب لوگوں کے لیے یہ اعلان ہو گیا کہ روزہ شروع ہوا اور اب کھانے پینے اور جنسی تعلقات سے رک جانا ہوگا۔

سرِدست ہمارا موضوع خوابوں کی تعبیر نہیں ہے، لہٰذا ہم مزید تفصیل میں جانا مناسب نہیں سمجھتے کہ مسلمانوں نے خوابوں کو کس طرح سمجھا ہے۔ اتنا عرض کرنے کا مطلب بھی صرف یہ تھا کہ یہ جان لیا جائے کہ مسلمان خواب اور اس کی علامتی معنویت سے بخوبی آگاہ تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ خواب کے معنی کو سمجھنا ہو تو اس کے ظاہر پر نہ جانا چاہیے، بلکہ خواب میں نظر آنے والی شبیہ اور اس کے معنی، اس کی حقیقت کے مابین مناسبت اور معنوی رشتے کو تلاش کرنا چاہیے۔ پردۂ خواب پر نمودار ہونے والا عکس اس معنی کی تجسیم ہوتا ہے۔ اس طرح ہر مسلمان یہ بھی جانتا ہے کہ نیند اور موت کے درمیان ایک طرح کی مشابہت ہے، اسی لیے بہت سے مسلمان مفکرین کے لیے یہ ایک سامنے کی بات ہے کہ موت کے بعد کے واقعات پر روشنی ڈالنا ہو، ان کی نوعیت کو سمجھنا ہو تو خوابوں کی ماہیت پر غور کرنا چاہیے اور یہ دیکھنا چاہیے کہ خواب میں جس شبیہ یا عکس کا ہم ادراک کرتے ہیں، اس میں اور اس معنی میں کیا تعلق اور مماثلت ہے جو اس شبیہ کے وسیلے سے نمودار ہو رہا ہے۔

برزخ The Barzakh

ہم نے عرض کیا تھا کہ قبر انسان کے سفرِ ہستی کا ایک مرحلہ ہے۔ یہ مرحلہ لمحۂ مرگ سے لے کر روزِ حشر تک پھیلا ہوا ہے۔ قبر کو اکثر برزخ کا نام دیا گیا ہے۔ برزخ کے معنی ہیں ''رکاوٹ'' (barrier) یا ''ایسی چیز جو دیگر دو چیزوں کے درمیان حائل ہو جائے۔'' قرآن مجید میں یہ لفظ جہاں آیا ہے، اس مقام سے اقتباس درج ذیل ہے:

حَتّٰی اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ، لَعَلِّیْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ كَلَّا اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ (۲۳:۹۹-۱۰۰)

یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت سر پر آن کھڑی ہوگی تو وہ کہے گا کہ اے رب! مجھے پھر واپس بھیج کہ جو کچھ چھوڑ آیا ہوں، اس میں کچھ نیکی کماؤں۔ ہرگز نہیں! یہ محض ایک بات ہے جو وہ کہنے والا بنے گا اور آگے ان کے ایک پردہ ہوگا اس دن کے لیے جب وہ اٹھائے جائیں گے۔

دو اور آیات میں بھی قرآن نے کھارے اور میٹھے دو سمندروں کے درمیان حائل ہونے والے پردے، ان کے درمیان آنے والی روک کے لیے ''برزخ'' کا لفظ استعمال کیا ہے:

وَهُوَ الَّذِیْ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَجَعَلَ بَیْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا (۲۵:۵۳)

اور وہی ہے جس نے ملایا دو دریاؤں کو۔ ایک کا پانی شیریں اور خوشگوار اور دوسرے کا نہایت شور و تلخ۔ اور ان کے درمیان اس نے ایک پردہ اور ایک مضبوط بند کھڑا کر دیا۔

بَیْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیٰنِ (۵۵:۲۰)

لیکن ان کے درمیان ایک پردہ حائل رہتا ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے۔

بعض مفسرین قرآن نے لکھا ہے کہ یہاں ''بحرین'' (دو سمندر) علامت ہیں عالمِ ارواح کے لیے اور عالمِ اجسام کے لیے۔ یہ دو عالم سمندر سے مشابہ اس لیے ہیں کہ سمندر کی طرح ان میں بھی جانداروں کی اقسام، اتنی رنگا رنگی اور اتنی کثیر تعداد پائی جاتی ہے جن کے بارے میں ہماری معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں اور سمندر آخر الامر پانی ہے اور ''پانی سے ہم نے بنایا ہر جاندار'' وَجَعَلْنَا مِنَ

الْمَآءِ كُلَّ شَىْءٍ حَيٍّ (۲۱:۳۰)۔ میٹھا پانی پاکیزگی ہے،صاف،شفاف،نورِ سیال، ملکوتی تازگی (angelic freshness) کھارے پانی میں ہر طرح کی کثافت اور ناخالص چیزیں ملی رہتی ہیں جیسے وہ نہایت مدہم روشنی جو مادی اجسام کی دنیا میں منعکس ہوتی ہے۔

وَمَا يَسْتَوِى الْبَحْرٰنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَآئِغٌ شَرَابُهٗ وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ (۳۵:۱۲)

اور دونوں دریا یکساں نہیں ہیں۔ ایک شیریں، پیاس بجھانے والا، پینے کے لیے خوشگوار ہے اور ایک کھاری کڑوا ہے۔

اگر ''بحرین'' (دوسمندروں) کو روحوں اور اجسام کی طرف اشارے کے معنی میں لیا جائے تو پھر برزخ کیا ہوگی؟ ان دونوں کے درمیان کا ''عالمِ خیال'' (World of Imagination) جو دوسمندروں کو ایک دوسرے سے الگ رکھتا ہے، لیکن خود اس برزخ میں تو میٹھے اور کھاری کا ملاپ ہوسکتا ہے۔ سو اسلامی فلسفے اور کونیات میں ''برزخ'' کا لفظ کسی بھی ایسی دنیا یا ایسی حقیقت کے لیے استعمال ہونے لگا جو دو دنیاؤں، دو اقالیم کے درمیان ہو۔

علمِ کونیات کے سیاق وسباق میں اس اصطلاح کے دو بنیادی معانی ہیں۔ کائنات کی دو تصویروں میں سے جو بھی پیشِ نظر ہوگی، اسی کے مطابق اس کے معنی کا تعین ہوگا۔

اگر اس کائنات پر زمانے اور وقت کے حوالے سے غور نہ کیا جائے اور اسے ایک غیر حرکی، سکونی تناظر میں دیکھا جائے تو یہ نورِ محض سے لے کر درجہ بدرجہ ظلمت و تاریکی تک کا منظر نامہ دکھائی دے گا۔ عالمِ خلق کے مراتب میں سب سے اوپر خلق کردہ نورِ محض یا نورِ خالص کا عالم ہے جو فرشتوں، ارواح اور عقول کا مسکن ہے۔ سب سے نیچے وہ دنیا ہے جو قریب قریب ظلمتِ محض کی اقلیم ہے، یہ عالمِ اجسام ہے۔ ان دو کے درمیان ایک بہت وسیع دنیا آباد ہے جس میں جن، شیطان اور نفوس رہتے ہیں۔ یہ درمیانی عالم، کائناتِ خیال یا برزخ ہے، کیونکہ یہ عالمِ روحانی کے بحرِ شیریں اور مادی دنیا کے کھارے سمندر کے درمیان ایک فصیل اور روک کا کام کرتا ہے، یا پھر اس لیے کہ ان میں سے ہر دو کے اوصاف اور خصوصیات اس میں بھی پائی جاتی ہیں۔

اگر اس کائنات پر زمانی اعتبار سے غور کیا جائے اور اسے ایک حرکی تناظر میں دیکھا جائے تو ہمارے سامنے دو عالم ہوں گے، دو جہان ہوں گے۔ یہ دنیا اور اگلا جہان۔ یہ دنیا، یہ جہان حضرت آدمؑ کے زمانے سے لے کر روز قیامت تک جاری رہے گا اور اس روز اگلے جہان کا آغاز ہوگا، لیکن پھر یہ

بتانا ہوگا کہ وہ لوگ جو موت کے گھاٹ اترے، وہ کہاں ہیں، اس دنیا میں یا اگلے جہان میں؟ اکثر اوقات اس کا جواب ہوتا ہے نہ یہاں نہ وہاں۔ مرنے والے برزخ کے مکین ہو جاتے ہیں جو اس دنیا کی ناخالص اور دھندلی اقلیم (کھارا سمندر) اور نور کی اقلیمِ خالص (بحرِ شیریں)، یعنی اگلے جہان کے درمیان کا ایک مرحلہ ہے۔ اس تفسیر کی تائید اور دلیل میں مفسرین نے مذکورہ بالا آیات میں سے پہلی آیت پیش کی ہے: "وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ" (۲۳:۱۰۰)۔

جن مفکرین نے عالمِ برزخ کی خصوصیات اور اس کی نوعیت پر بحث کی ہے، ان کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ خیال کا عالم (Imaginal World) ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ نفس کو برزخ میں جو کچھ پیش آتا ہے، اس کا سامنا اسے ایک ایسی صورت میں کرنا ہوتا ہے جو عالمِ برزخ سے مناسبت رکھتی ہے اور جو نہ تو خالص روحانی ہوتی ہے اور نہ پوری طرح مادی اور ٹھوس صورت رکھتی ہے۔ اس دنیا میں نفس کی نشو ونما جن اعمال، افکار اور صفات و اوصاف کی آغوش میں ہوئی تھی، برزخ کے احوال اور برزخ کا تجربہ عین اسی کے مطابق ہوتے ہیں۔ مزید برآں یہ کہ "خیال" کی حرکی اور ہر دم متغیر نوعیت کے پیشِ نظر یہ بھی کہنا ضروری ہے کہ برزخ ایک جامد اور متعین حالت کا نام نہیں ہے، بلکہ ایک سیلانِ پیہم ایک مسلسل بہاؤ ہے، ہر لحہ بدلتے ہوئے تجربات کا ایک دریائے رواں۔

ان باتوں کا مطلب کیا ہوا؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ موت کے بعد نفس اپنے آپ کو ان صورتوں میں پاتا ہے، ان تجربات سے گذرتا ہے جو اس کی نوعیت، اس کی ماہیت سے مناسبت رکھتے ہیں، لیکن موت کے بعد نفس کی ماہیت اور نوعیت کا تعین اس بات سے ہوتا ہے کہ زندگی میں اس کی نشو ونما کیوں کر ہوئی تھی۔ اگر نفس کی پرورش سرشت و نہادِ انسانی (الفطرت) کے مطابق ہوئی تھی اور اس میں وہ سب صفاتِ خداوندی رچ بس چکی تھیں جو صورتِ الٰہی پر خلق ہونے کی وجہ سے اس کے اندر مخفی تھیں، اس میں رکھی گئی تھیں تو پھر برزخ میں بھی نفس کو صحت، توازن، تناسب، یکتائی اور یکجائی کی حالت میسر ہو گی۔ ایسے میں کہا جائے گا کہ نفس کی پرداخت "توحید" کے تقاضوں کے مطابق ہوئی تھی۔

اس کے برعکس اگر نفس کی زندگی انکار و کتمانِ حق میں بسر ہوئی ہوگی اور اس نے الحق سے سازگاری اور اس کے مطابق خود کو ڈھالنے سے روگردانی کی ہوگی تو پھر ایسا نفس وحدت و یک رنگی سے دور ہوگا۔ اس میں چند صفاتِ خداوندی تو جزوی طور پر نمودار ہوئی ہوں گی، لیکن باقی صفات مرجھا کر رہ گئی ہوں گی۔ ایسا نفس آشفتگی، بکھراؤ، وحشت اور بے ترتیبی کا شکار ہوگا۔ بالفاظ دیگر اس پر حقیقت کے

روحانی پہلو (بحرِ شیریں) کا غلبہ ہونے کے بجائے اس کے جسمانی پہلو (کھارے سمندر) کا غلبہ ہوگا۔

نفس کی حالت کے بیان کے لیے ہم نے جو الفاظ ہم آہنگی، توازن، یک رنگی و وحدت وغیرہ استعمال کیے ہیں وہ ذرا مجرد قسم کے ہیں۔ ان کے ٹھوس معنی کیا ہیں؟ ان سے ہماری مراد کیا ہے؟ نفس کو مرنے کے بعد اصل میں کس چیز کا سامنا ہوگا؟ اس کو پیش آنے والے واقعات کیا ہوں گے؟ اسلامی روایت کا جواب یہ ہے کہ موت کے بعد کے عالم میں روحانی اور مادی تجربہ مل کر ایک ہو جاتا ہے جیسا کہ عالمِ خواب میں ہوتا ہے۔ خواب دیکھتے ہوئے بھی بدن اور نفس میں امتیاز کرنا دشوار ہوتا ہے، کیونکہ خواب کے سارے عکس اور شبیہیں بیک وقت جسمانی بھی ہوتی ہیں اور نفسیاتی بھی۔ ہم اپنی نفسیاتی کیفیات اور احوال کو ایک مادی اور محسوس صورت میں ''دیکھتے'' بھی ہیں اور ان کا ''تجربہ'' بھی کرتے ہیں۔ عین یہی نوعیت ''خیال'' کی بھی ہے۔ برزخ میں ہم آہنگی یا راحت کا تجربہ کسی مجرد، نامجسم، ملکوتی صفت کے طور پر نہیں ہوگا، بلکہ اس کا انداز ویسا ہی ہوگا جیسا اس ہماری دنیا میں ہوتا ہے، مثلاً کسی خوشنما اور حسین باغ میں گھومتے ہوئے، خوبصورت چہرے کا مشاہدہ کرتے ہوئے، اچھی موسیقی پر سر دھنتے ہوئے۔

خیال کا عالم، نفس کا عالم ہے بلکہ کچھ لوگ تو یوں کہتے ہیں کہ یہ نفس سے سوا اور کچھ نہیں۔ نفس کے سارے حواس ہوتے ہیں۔ دیکھنا، سننا، چکھنا، سونگھنا اور چھونا۔ یہ خیال غلط ہے کہ دیکھنے اور سننے کے لیے نفس کو جسم کی آنکھ اور جسمانی کان درکار ہیں۔ خواب کی دنیا میں نفس کان اور آنکھ کے بغیر بخوبی دیکھتا ہے اور سنتا ہے۔ اسی طرح عالمِ برزخ میں بھی نفس کو اپنی حقیقت کا تجربہ ایک محسوس صورت میں تو ہوتا ہے، لیکن یہ تجربہ جسمانی اعضا اور حواس کے بغیر ہوتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا تھا، برزخ میں ''جیسا لگتا ہے'' وہی سب کچھ ہوتا ہے۔ نفس اگر پورا، مکمل اور ہم آہنگ ہے تو اسے برزخ کا ادراک بھی تکمیل اور ہم آہنگی کی صورت میں ہوگا، لیکن اگر نفس پارہ پارہ اور بکھرا ہوگا تو اُس کے لیے برزخ کا تجربہ بھی جزوی اور پراگندہ ہوگا۔ نفس کی حقیقت جس قدر آشفتہ اور بگڑی ہوئی، مسخ شدہ ہوگی، اسی قدر اسے اپنا برزخ کا ''عالمِ خواب'' ہولناک محسوس ہوگا۔

بعض علما کی رائے یہ بھی ہے کہ برزخ اس کے سوا کچھ نہیں کہ نفس کا اندرون، اس کا باطن نکل کر باہر آ جائے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اس دنیا میں بدن ظاہر کی چیز ہے اور نفس مخفی ہے۔ بدن نسبتاً پختہ اور متعین بھی ہے، جب کہ آگہی کا عمل دم بہ دم بدلتا رہتا ہے۔ ہر لحظہ ذہن میں سوچیں آتی ہیں اور جاتی ہیں، خیالات کی آمد و رفت میں ہمارے ارادے کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ سوچ اور خیالات

کیا ہیں، ہم ہی ہیں۔ بالکل ایسے جیسے خواب میں نظر آنے والی شبیہیں ہمارے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

وہ صفات جو اس دنیا میں بدن سے خاص تھیں، برزخ میں جا کر گویا ان کا رخ اندر کی جانب ہو جاتا ہے جہاں وہ اس ہستی کے اندرونی مرکز میں نسبتاً ایک معین اور مستقل چیز کی نمایندگی کرتی ہیں، لیکن نفس کا اندرون خارج میں آ جاتا ہے اور ان صورتوں میں مجسم ہو جاتا ہے جو اس کی اپنی نوعیت سے مناسبت رکھتی ہیں۔ نفس کا اپنا ادارک شبیہوں اور عکس کی ایک دنیا کی صورت میں ہوتا ہے جیسا کہ خواب کے عالم میں ہوتا ہے۔ برزخ اور عالمِ خواب میں ایک بڑا فرق ہے اور وہ یہ کہ برزخ اس عالم کے مقابلے میں کہیں زیادہ حقیقی اور مستقل ہے۔ عالمِ برزخ میں داخل ہوں گے تو لوگوں کو احساس ہو گا کہ جس دنیا میں وہ رہتے آئے تھے، وہ ایک خواب کی دنیا تھی۔ یہی اس مشہور قول کا مطلب ہے جس کی نسبت اکثر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کی جاتی ہے: ''**الناس نیام اذا ماتوا انتبھوا**''[۷۷] (لوگ سو رہے ہیں، موت آن لے گی تو جاگیں گے)۔ قرآن بھی یہی بات اس آیت میں کہتا ہے جہاں یہ ذکر آیا ہے کہ جو لوگ مرجاتے ہیں ان کی نظر ''چیر جانے والی'' بن جاتی ہے: **"وَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْد"** **(۲۲:۵)** (تو آج تو تیری نظر بہت تیز ہے)۔

برزخ کے عالمِ خیال ہونے کے بارے میں قرآن مجید نے کئی جگہ اشارات کیے ہیں، لیکن ان کو سمجھنے کے لیے اسلامی روایت کی فراہم کردہ بصیرت کی ضرورت پڑتی ہے، تاہم اس ضمن میں قرآن کی نسبت احادیث میں کہیں زیادہ کھل کر وضاحت کی گئی ہے۔ مرنے کے بعد کے واقعات کے بارے میں رسولِ خداؐ نے جو کچھ فرمایا ہے، اس میں سے کئی احادیث کو صرف ایک ایسی اقلیمِ خیال کے بیان کے طور پر سمجھا اور سمجھایا جا سکتا ہے جہاں انسان کا ہر تجربہ اور پیش آنے والا ہر واقعہ اس کے اپنے اعمال و افکار سے مناسبت رکھتا ہے۔

اسی لیے آپؐ نے فرمایا کہ بے دھیانی سے پڑھی ہوئی نماز پرانے کپڑے کی طرح لپیٹ کر انسان کے منہ پر ماردی جائے گی۔ سرکشوں کے اعمال کتوں کی صورت اور شک و شبہ میں پڑے ہوئے انسانوں کے عمل سُوروں کی شکل میں نمودار ہوں گے۔ قبر میں کارِ خیر کشتیوں کی صورت میں مجسم ہو جائیں گے جس میں لوگ بیٹھیں گے۔ شراب نوشی کرنے والوں کی گردنیں شراب کے مٹکوں کے وزن سے جھکی پڑ رہی ہوں گی جو ان کے گلے میں لٹکا دیے جائیں گے۔ ''کافر کی کچلی احد پہاڑ کی طرح ہو گی اور اس کی چمڑی اس قدر موٹی ہو جائے گی کہ تین رات کی مسافت میں پار کی جائے۔''[۷۸] کافر

اپنی زبان میلوں کھینچے گا، یوں کہ لوگ اسے روندتے ہوئے گذریں گے۔"[۹۷]

انسان کے اعمال وافکار کی کسی مناسب صورت میں یہ تجسیم کچھ برزخ سے خاص نہیں ہے۔ بہت سی روایات میں آیا ہے کہ یہی صورت قیامت کے دن بھی واقع ہوگی۔ اسی طرح جنت کے مزے اور جہنم کا عذاب بھی عالمِ خیال سے مناسبت رکھنے والی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ متاخرین میں سے کئی مسلم مفکرین نے جنت اور جہنم کو عالمِ خیال ہی میں رکھا ہے اور اس کا نقشہ ایک بے انتہا وسیع عالم کے طور پر کھینچا ہے۔ اس طرح برزخ "خیال" کی صرف ایک صورت ٹھہری۔ ایک عارضی صورت جو صرف قیامت تک باقی رہے گی۔

فرشتوں کا سامنا Meeting the Angels

اس بحث کو سمیٹنے کے لیے اور یہ سمجھانے کے لیے کہ رسولِ خداؐ نے جو طرزِ بیان استعمال فرمایا ہے، اسے عالمِ خیال کے حوالے کے بغیر سمجھنا مشکل ہے، ہم مندرجہ ذیل حدیث کی جانب توجہ دلائیں گے۔ حدیث خاصی طویل ہے، لیکن اس اقتباس سے ہمیں یہ آسانی ہوجائے گی کہ قبر کے بارے میں مسلمانوں کے بنیادی عقائد ایک منطقی اور مرتب شکل میں سامنے آجائیں گے۔ کہیں کہیں ہم اپنا تبصرہ بھی کردیں گے تاکہ قاری پر واضح ہوجائے کہ سابقہ بحث سے اس اقتباس کا ربط کیا ہے۔

اگلے جہان کے بارے میں دیگر کئی احادیث کی طرح اس حدیث میں بھی دو بیانات برابر برابر آئے ہیں۔ پہلا ایک صاحبِ ایمان کے نفس کا ہے اور دوسرا ایک کافر کا۔ واقعات ایک سے ہیں، لیکن مومن کو اللہ تعالیٰ کے دائیں ہاتھ کی رحمت اور جمال نصیب ہوتا ہے جب کہ کافر کو اللہ کے بائیں ہاتھ کے غضب وانتقام کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اول الذکر نفس اللہ کے قرب میں لے آیا جاتا ہے، جب کہ دوسرے کو دوری نصیب ہوتی ہے۔ پہلے نفس کا تجربہ خوشی، رحمت اور تکمیل کا ہوتا ہے جب کہ دوسرے پر جو گذرتی ہے، وہ اس کے لیے آشفتگی اور بدحالی پیدا کرتی ہے۔ دو متضاد صفاتِ خداوندی جن کا اس حدیث میں ذکر آیا ہے، رضائے الٰہی (good pleasure) اور غضب (anger) کی صفات ہیں۔ اس حدیث سے اس امر کی وضاحت بھی ہوجاتی ہے کہ رسولِ خداؐ یہ دعا کیوں مانگا کرتے تھے کہ "میں تیرے غضب سے تیری رضا کی پناہ میں آتا ہوں۔"

حدیث کے شروع میں وہ صحابی جو اس حدیث کے راوی ہیں، بتاتے ہیں کہ وہ دیگر صحابہ کے ساتھ آنحضرتؐ کی معیت میں ایک جنازے کے ساتھ گئے۔ قبر کھودنے والوں نے ابھی اپنا کام مکمل

نہیں کیا تھا۔ سب لوگ انتظار میں بیٹھ رہے۔ کچھ دیر بعد رسولِ خداؐ نے سر اٹھا کر فرمایا: ''قبر کے عذاب سے اللہ کی پناہ مانگو۔'' آپؐ نے دو یا تین مرتبہ اس بات کو دہرایا۔ اس کے بعد آپ گویا ہوئے:[۸۰]

جب بندۂ مومن اس دنیا سے رخصت ہونے لگتا ہے اور اس کا رشتہ اس دنیا سے کٹ کر دوسرے جہان سے جڑتا ہے تو اس پر آسمان سے فرشتے اترتے ہیں۔ ان کے چہرے سفید ہوتے ہیں، سورج کی طرح چمکتے ہوئے۔ وہ اپنے ساتھ جنت کے ملبوسات میں سے ایک اور وہاں کی خوشبو میں سے ایک لے کر آتے ہیں۔ تاحدِ نظر وہ اس شخص کے پاس بیٹھے ہوتے ہیں، پھر فرشتۂ اجل آ کر اس کے سرہانے بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ''اے نفسِ مطمئنہ! اللہ کی رضا اور اس کی مغفرت کے لیے نکل آ۔'' اس شخص کی جان یوں نکلتی ہے جیسے مشکیزے سے پانی کا قطرہ۔ موت کا فرشتہ اسے لے لیتا ہے۔ دوسرے فرشتے اس راضی و مطمئن نفس کو لمحہ بھر کے لیے بھی فرشتۂ اجل کے ہاتھ میں نہیں رہنے دیتے اور اسے فوراً کفن میں لپیٹ کر اس خوشبو میں بسا دیتے ہیں جو اس دنیا کی عمدہ ترین مشک کو مات کرتی ہے۔

پھر وہ اسے اوپر لے جاتے ہیں۔ فرشتوں کے جس مجمع کے پاس سے وہ گذرتے ہیں وہ یہ ضرور پوچھتا ہے کہ ''یہ اتنی اچھی خوشبو کیا ہے؟'' وہ جواب دیتے ہیں کہ ''یہ فلاں ابن فلاں ہے۔'' اسے وہ ان بہترین ناموں سے پکارتے ہیں جن سے اس دنیا میں اسے یاد کیا جاتا تھا۔ جب وہ آسمانِ دنیا پر پہنچتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اس کے لیے دروازے کھول دیے جائیں۔

اس کے لیے دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔ پھر ہر آسمان پر مقرب فرشتے اس کے ساتھ چلتے ہیں اور اگلے آسمان تک لے جاتے ہیں۔ اسی طرح وہ ساتویں آسمان تک لے جایا جاتا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''میرے بندے کا اعمال نامہ علیین میں لکھو اور اسے واپس زمین پر لے جاؤ جس سے میں نے اسے خلق کیا تھا۔ اسی کی طرف میں لوٹا دیتا ہوں اور وہیں سے میں اُسے دوسری مرتبہ اٹھاؤں گا۔''

پھر اس کی روح اس کے جسدِ مردہ کی طرف لوٹا دی جاتی ہے۔ دو فرشتے اسے آ کر پوچھیں گے: ''تمھارا رب کون ہے؟'' وہ کہے گا: ''میرا رب اللہ ہے۔'' پھر وہ کہیں گے ''تمھارا دین کیا ہے؟'' وہ جواب دے گا: ''اسلام'' پھر وہ کہیں گے کہ ''تم میں کون مبعوث کیا گیا تھا؟'' وہ کہے گا: ''وہ اللہ کا رسول ہے۔'' پھر پوچھا جائے گا: ''تمھارا علم کیا ہے؟'' وہ جواب میں کہے گا کہ ''میں نے کتابِ خداوندی پڑھی ہے اور میرا اس پر ایمان ہے اور میں اس کی حقانیت کی تصدیق کرتا ہوں۔''

پھر آسمان سے ایک اور ندا دی جائے گی کہ ''میرے بندے نے سچ کہا، جنت سے ایک قالین اس

کے لیے اتارا جائے، اسے بہشتی لباس پہنایا جائے اور اس کی قبر میں جنت کا ایک دروازہ کھول دیا جائے۔'' پھر جنت کی راحت اور اس کی مہک کچھ کچھ اس تک پہنچنے لگتی ہے اور اس کی قبر وہاں تک وسیع کر دی جاتی ہے جہاں تک اس کی نظر جا سکتی ہے۔

پھر ایک شخص اس کے پاس آئے گا، حسین چہرہ، زیبا لباس اور معطر خوشگوار۔ وہ کہے گا: ''میں تجھے وہ خوشخبری دوں گا جو تجھے نہال کر دے گی۔ آج وہ دن ہے جس کا تجھ سے وعدہ تھا۔''

وہ پوچھے گا: ''تم کون ہو؟ کہ تمھارا چہرہ بشارت دینے والے کا چہرہ ہے۔'' وہ کہے گا: ''میں تمھارا کارِ خیر، عملِ صالح ہوں۔''

وہ مرد درگذشتہ کہ اٹھے گا: ''میرے پروردگار! اب قیامت آ جائے۔ یارب! اب قیامت آ جائے۔ کہ میں اپنے خاندان اور اپنے مال واسباب میں لوٹ جاؤں۔''

اس حدیث میں نفسِ صالح کی جو خصوصیات بتائی گئی ہیں، ان پر غور فرمائیے۔ نورانیت کے جلو میں فرشتے اس کے لیے اترتے ہیں، گویا سورج نکل رہا ہے اور اپنے ساتھ جنت سے ایک لبادہ اور ایک خوشبو لاتے ہیں۔ فرشتۂ اجل ایسے نفس سے خطاب کرتے ہی اسے اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور اس کی رضا کی خوشخبری دیتا ہے۔ یہ دونوں صفات اللہ تعالیٰ کی صفاتِ رحمت و جمال میں سے ہیں۔ پھر فرشتے اس نفس کو ساتھ لائے ہوئے بہشتی لبادے میں لپیٹ دیتے ہیں۔ اس طرح نفس کے جسمانی پہلو چھپ جاتے ہیں کہ یہ جسمانی پہلو ملکوتی اور جنتی نورانیت کے مقابل تاریک اور بے کیف ہیں۔

یہ فرشتے اس نفس کو جنت کی مہک میں بسا دیتے ہیں۔ خوشبو لگانے کے اس عمل کی معنویت کو سمجھنا ہو تو اسلامی شعور میں عطر اور اچھی خوشبو کی جو اہمیت ہے، اسے یاد کیجیے۔ مثال کے طور پر رسولِ خدا پیاز اور لہسن نہیں کھاتے تھے، گو اس کا استعمال آپ نے ممنوع نہیں کیا تھا۔ آپ کا ارشاد تھا کہ فرشتے اس کی بو سے کراہت کرتے ہیں۔ آپ کا ایک معروف قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس جہان کی تین چیزوں کی پسندیدگی آپ کے دل میں ڈالی: عورت، خوشبو اور نماز۔[81] اسلامی راویت میں محبت کا مقصود ہمیشہ ایسی چیزیں ہوتی ہیں جو مرقعِ جمال ہوں، حسین ہوں، اس لیے کہ حدیث میں آیا ہے: ''اللہ جمیلٌ ویحبّ الجمال'' (اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور جمال پسند ہے)۔ جو تین چیزیں آنحضرت کے لیے محبوب بنائی گئیں، وہ اس دنیائے دنی کے سب سے حسین و جمیل اور بنا بریں سب سے زیادہ الوہی عناصر کی نمایندگی کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے جمال، رحمت اور عفو و درگذر کی صفات کا اس دنیا میں اگر سب سے واضح اور براہ راست مظہر ہے تو نسوانی حسن۔ خوشبو وہ لطیف اور غیر مرئی حسن ہے جو

عالمِ خیال اور عالمِ روحانی میں سرایت کیے ہوئے ہے، نیز یہ کہ خوشبو اپنے ساتھ جنت کی خوشی اور راحت کا ایک احساس بھی لاتی ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ اکثر خوشبویات پھولوں سے کشید کی جاتی ہیں اور آنحضرتؐ کی مرغوب خوشبو عطرِ گلاب بتایا گیا ہے۔ تیسری چیز، یعنی نماز جو آپؐ کے لیے محبوب بنائی گئی، علامت ہے قرآن کے مجسم ہو جانے کی یا حسنِ عمل اور حسنِ کردار و اخلاق کی نمایندہ۔

تین محبوب چیزوں کے بارے میں جو حدیث ہم نے درج کی، اس میں خوشبو کے لیے ''طِیب'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح پہلے مذکور ہونے والی طویل حدیث میں نفسِ سلیم کے لیے، اچھے نفس کے لیے ''طیّب'' کا لفظ آیا ہے جو ''طِیب'' ہی کی ایک صورت ہے اور بطور اسمِ صفت برتا گیا ہے۔ نفسِ سلیم شروع ہی سے ''طیّب'' ہے جس کا مطلب ہے ''خوشبودار، پرکشش، خوشگوار، اچھا اور خوبصورت۔'' اس کے حسن و خوبی کا اقلیمِ خیال میں ادراک دیکھنے کی حس بھی کرتی ہے اور قوتِ شامہ بھی، کیونکہ لبادہ اور خوشبو جو فرشتے ساتھ لے کر آتے ہیں، اسی پر دلالت کر رہے ہیں۔ یہ اس دنیا کا کپڑا اور یہاں کی خوشبو نہیں ہے، بلکہ جنت سے لائے گئے ہیں۔ اسی سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اس نفس کو فرشتوں نے خوبصورت کیوں جانا ہے۔

فرشتے سوال کرتے ہیں کہ ''یہ اتنی اچھی خوشبو کیسی ہے؟'' یہاں خوشبو کے لیے لفظ ہے ''رَوح۔'' ''رَوح'' اور ''رُوح'' کی املا ایک سی ہے اور رُوح کے معنی آپ جانتے ہیں۔ یہاں ''رَوح'' کا لفظ خود بول رہا ہے کہ یہ خوشبو کوئی دنیاوی خوشبو نہیں ہے، بلکہ ایک ملکوتی اور روحانی مہک ہے جو آسمانوں، یعنی عالم بالا ہی کے لیے زیبا ہے۔

فرشتے اس نفسِ سلیم کو ایک ''معراج'' پر لے جاتے ہیں اور اس کا راستہ وہی ہے جو رسول خداؐ کی معراج کا تھا۔ اگر آنحضرتؐ نے اس زندگی ہی میں آسمانوں کا سفر فرمایا تو اہل ایمان سے وعدہ یہ ہے کہ وہ موت کے بعد آسمانوں کی جانب عروج کریں گے۔ آسمانوں سے آگے بڑھ کر اہلِ ایمان قربِ خداوندی میں پہنچتے ہیں۔ اللہ سے قریب ہونے کا مطلب ہے الحق کے، الاحد کے، الکامل، النور اور الجمیل کے قریب ہونا۔ ان صفات سے جو نفس قریب ہوگا، وہ ان میں سے حصہ پائے گا اور اس طرح وہ صفاتِ خداوندی، وہ صورتِ الٰہیہ جس پر نفسِ انسانی خلق کیا گیا، زیادہ مکمل طور پر حقیقی اور واقعی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

اچھے اور نیک لوگوں کے اعمال ''علِیّیون'' میں درج کیے جاتے ہیں۔ اسے عموماً ساتویں آسمان

میں ایک جگہ یا کتاب کے طور پر لیا جاتا ہے۔''علیّیون'' کے لفظی معنی ''اقلیم بالا'' یا ''بلند ترین مقامات'' کے مترادف ہیں۔خود یہ لفظ ''علی'' سے مشتق ہے جس کا مطلب ہے: ''اونچا، بلند و بالا''، اور ''العلی'' اللہ تعالیٰ کے اسما میں سے ایک ہے۔اس سے یہ اشارہ بالکل واضح ہے کہ اس سے مراد ہے اللہ تعالیٰ سے کسی نہ کسی صورت میں قرب۔

اس حدیث کے پہلے حصے کے آخر میں رسولِ خداؐ کا ایک قول آیا ہے جس میں اس نکتے کی صراحت آپؐ کے ارشاد سے ہوگئی ہے کہ اس دنیا میں انسان کے کیے ہوئے عمل عالمِ خیال سے مناسبت رکھنے والی ایک صورت میں مجسم ہو کر سامنے آئیں گے۔مرنے والے کو ایک شخص کی صورت دکھائی دے گی جو خوشرو اور خوش لباس ہوگا اور اس کے پاس سے اچھی خوشبو پھوٹ رہی ہوگی۔پوچھے گا تو پتا چلے گا کہ اس کے اپنے اعمال اس صورت میں مجسم ہو کر نمودار ہوئے ہیں۔عمر بھر جو کارِ خیر اس نے انجام دیا، وہ ایک ایسی صورت میں اس کے سامنے لے آیا گیا جو برزخ میں اس کی حالت سے مناسبت رکھتی ہے۔

حدیث کے دوسرے حصے میں رسولِ خداؐ نے ایک منکرِ حق، کافر کی موت کا منظر بیان کیا ہے۔ غور فرمائیے کہ حدیث کے الفاظ اور اندازِ بیان تقریباً یکساں ہے، تاہم سبھی اسمائے صفت بدل گئے ہیں، کیونکہ حق کے انکار میں گڑا ہوا یہ نفس ایک مومن، ایک صاحبِ ایمان کے نفس کی ہر لحاظ سے سراسر ضد ہے، اس کا بالکل الٹ ہے۔آغازِ کلام ہی میں نفس کو ''نفسِ خبیث'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے جو ''نفس طیّب'' کے متضاد کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔مسلمان جب اس حدیث کو پڑھتے ہیں تو ان کا ذہن فوراً ان متعدد قرآنی آیات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جن میں ''طیّب'' اور ''خبیث'' کا تقابل کیا گیا ہے۔مندرجہ ذیل آیت بالخصوص قابل ذکر ہے:

لِيَمِيزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۸:۳۷)	تاکہ اللہ خبیث کو طیّب سے چھانٹ کر الگ کرے اور خبیث کو ایک دوسرے پر ڈھیر کرے، پھر اس کو جہنم میں جھونک دے۔ یہی لوگ نامراد ہونے والے ہیں۔

قبر کے احوال کی حدیث کا باقی حصہ یوں ہے:

جب بندۂ کافر اس دنیا سے رخصت ہونے لگتا ہے اور اس کا رشتہ اس دنیا سے کٹ کر دوسرے جہان سے جڑتا ہے تو اس پر آسمان سے فرشتے اترتے ہیں۔ان کے چہرے سیاہ ہوتے ہیں، وہ اپنے ساتھ کھردرے کپڑے کے ٹکڑے لے کر آتے ہیں۔تاحدِ نظر وہ اس شخص کے پاس بیٹھے ہوتے ہیں۔

پھر فرشتۂ اجل آ کر اس کے سرہانے بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ''اے نفسِ خبیث! اللہ کے غضب کے لیے نکل آ۔'' اس شخص کی جان سارے بدن میں بکھر جاتی ہے، مگر موت کا فرشتہ اسے یوں کھینچتا ہے جیسے گیلی روئی میں سے سوا۔ موت کا فرشتہ اسے نکال لیتا ہے۔ دوسرے فرشتے اس نفسِ خبیث کو لمحہ بھر کے لیے بھی فرشتۂ اجل کے ہاتھ میں نہیں رہنے دیتے اور اسے فوراً اس کھردرے کپڑے میں لپیٹ دیتے ہیں۔ اس سے سڑی ہوئی لاش کی بدترین بدبو پھوٹتی ہے، ایسی ناگوار کہ اس جیسی کریہہ بدبو اس روئے زمین پر اور کہیں نہ ہوگی۔ پھر وہ اسے اوپر لے جاتے ہیں۔ فرشتوں کے جس مجمع کے پاس سے وہ گذرتے ہیں، وہ یہ ضرور پوچھتا ہے کہ ''یہ مکروہ تعفّن کیا ہے؟'' وہ جواب دیتے ہیں کہ ''یہ فلاں ابن فلاں ہے۔'' اسے وہ ان نفرت انگیز ناموں سے پکارتے ہیں جن سے اس دنیا میں اسے یاد کیا جاتا تھا۔ جب وہ آسمانِ دنیا پر پہنچتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اس کے لیے دروازے کھول دیے جائیں۔ اس کے لیے دروازہ نہیں کھولا جاتا۔

پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''اس کا اعمال نامہ سجین میں لکھو، زمین کے سب سے پست درجے میں۔'' پھر اسے اٹھا کر پھینک دیا جاتا ہے۔

پھر اس کی روح اس کے جسدِ مردہ کی طرف لوٹا دی جاتی ہے۔ دو فرشتے اسے آ کر پوچھیں گے: ''تمھارا رب کون ہے؟'' وہ کہے گا: ''آہ، آہ مجھے تو پتا نہیں۔'' پھر وہ کہیں گے: ''تمھارا دین کیا ہے؟'' وہ جواب دے گا: ''آہ، آہ مجھے تو پتا نہیں۔'' پھر وہ کہیں گے کہ ''تم میں کون مبعوث کیا گیا تھا؟'' وہ کہے گا: ''آہ، آہ مجھے تو پتا نہیں۔''

پھر آسمان سے ایک اور ندا دی جائے گی کہ ''اس نے جھوٹ بولا، سو جہنم سے ایک قالین اس کے لیے بچھا دو اور اس کی قبر میں دوزخ کا ایک دروازہ کھول دو۔'' پھر دوزخ کی آگ کی لپٹ اور جھلستی ہوا اسے آن لے گی اور اس کی قبر ایسی تنگ کر دی جائے گی کہ اس کی پسلیاں بھنچ کر رہ جائیں گی۔

پھر ایک شخص اس کے پاس آئے گا، بدصورت، بدنما لباس، ناگوار بدبو لیے ہوئے۔ وہ کہے گا: ''میں تجھے وہ خبر دوں گا جو تجھے بدحال کر دے گی۔ آج وہ دن ہے جس کا تجھ سے وعدہ تھا۔''

وہ پوچھے گا: ''تم کون ہو؟ کہ تمھارا چہرہ منحوس خبر دینے والے کا چہرہ ہے۔'' وہ کہے گا ''میں تمھاری برائی، تمھارے اعمالِ بد ہوں۔''

وہ مرد درگذشتہ کہ اٹھے گا: ''میرے پروردگار! قیامت سے بچائیو۔ قیامت آ ہی نہ جائے۔''

قرآن مجید نے کائنات کا جس طرح نقشہ پیش کیا ہے، وہی اس حدیث کی اکثر تفصیلات میں بھی نظر آتا ہے۔ ایک نکتہ خاص طور پر قابلِ غور ہے۔ کافر کو پہلے آسمان میں داخل ہونے سے روک دیا

جاتا ہے۔ یہاں آسمان اور جنت کو خلط ملط نہ کیجیے۔ یہ درست ہے کہ حدیث میں جنت اور جہنم کا تذکرہ موجود اور حقیقی چیزوں کے طور پر کیا گیا ہے، لیکن یہاں ان کے محلِ وقوع کو متعین نہیں کیا گیا۔ ''توحید'' پر گفتگو کرتے ہوئے ہم نے لکھا تھا کہ ''آسمان'' ہر اس شے کی طرف اشارہ ہے جو اونچی، بالاتر، نورانی، روحانی، ذی عقل اور اچھی ہے۔ وہ اشیائے بلند و بالا جو ان آسمانوں میں ہیں، ان کے کئی درجات ہیں، سات آسمان اسی کی علامت ہیں۔ ان سب آسمانوں سے ورا اور ان سے باہر اللہ تعالیٰ ہے اور اصل بلندی اور عالی مرتبہ اسی کا ہے۔ اہلِ ایمان کے نفوس موت کے بعد آسمانوں میں اس لیے اٹھائے جاتے ہیں کہ انھوں نے اس دنیا کی زندگی میں آسمانی چیزوں کے اوصاف اور صفات کو اپنے اندر واقعی بیدار اور راسخ کر لیا تھا اور یہ وہی صفات تھیں جو اس روح کی صفات ہیں جسے خاکِ آدم میں پھونکا گیا تھا۔

اس کے برعکس کافروں کے نفوس آسمان میں نہیں اٹھ سکتے، بلکہ ان کو ''سجین" میں پھینک دیا جاتا ہے۔ ''عِلّیین" کے لفظ کی طرح ''سِجّین" کے لفظ کی بھی کئی تفاسیر کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر کہا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ جگہ ہے جہاں کافروں کی کتابِ عمل رکھی جاتی ہے، یا جہنم کی ایک گھاٹی ہے، یا ساتویں زمین کے نیچے شیطانوں اور ابلیس کی آماجگاہ ہے۔ ''سِجّین" کے لفظ کے معنی ہیں: ''محبوس کرنا، قید میں ڈالنا۔'' ''عِلّیین" بلند اقلیم آزادی اور تکمیلِ آرزو کا مقام ہیں، "سِجّین" کی اقلیم پست قید و بند اور صعوبت و تکلیف کی جگہ ہے۔ ایک اور بات پر غور فرمایئے۔ کافر یہ کہتا ہے کہ وہ نہ خدا کو جانتا ہے نہ کتابِ خدا کو، نہ رسول خداؐ کو۔ جواب ملتا ہے کہ تم جھوٹے ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ قبر میں پڑنے کے بعد بھی حق کو چھپا رہا ہے، کفر کر رہا ہے۔

روزِ جزا Final Judgment

اللہ کی طرف لوٹنے، یعنی ''معاذ'' کے بارے میں قرآن مجید نے جو کچھ کہا ہے، اس کی تہ میں ایک تصور مستقل کارفرما ہے کہ انسان کو بالآخر ایک روز اپنے آخری حساب کے لیے حاضر ہونا ہے اور اس بات کی جواب دہی کرنا ہے کہ وہ اس دنیا میں کیا کرتا رہا۔ اس سے اس کے اعمال کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اسے جواب دہی کرنا ہوگی، جب اللہ تعالیٰ اس سے پوچھیں گے کہ تم جو کچھ کرتے رہے وہ کیوں کرتے رہے؟ جیسا کہ آنحضرتؐ کے صحابی حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا تھا: لوگوں سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ انھوں نے ''کیا'' کیا؟ اعمال تو ان کے نامۂ اعمال میں لکھے ہوئے موجود ہوں

گے جو وہ پڑھ سکتے ہیں۔ ان سے پوچھا یہ جائے گا کہ جو کچھ کیا وہ ''کیوں'' کیا؟

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے پرسشِ اعمال کرنے کے بعد ان کے اعمال کو میزان میں تولیں گے۔ اس کے بعد اللہ کا فیصلہ سامنے آئے گا۔ کچھ لوگ جنت میں بھیج دیے جائیں گے، کچھ جہنم میں ڈال دیے جائیں گے۔ بہت سے جدید لوگوں کو حساب کتاب، اللہ کا فیصلہ اور لوگوں کو آگ میں جھونکنے کا یہ سارا معاملہ خاص طور پر شاق گذرتا ہے۔ سامی ادیان کے نقطۂ نظر کے مقابلے میں ہندو یا بدھ مت کے تناظر کو ترجیح دینے کی عام طور پر جو وجوہات بیان کی جاتی ہیں، ان میں سے یہ بھی ہے کہ موخرالذکر مذاہب میں انسان کی تقدیر کا فیصلہ کسی من مانی کرنے والی، متلوّن مزاج الوہی ہستی سے متعلق نہیں ہے، بلکہ اس کی جگہ ''کرموں'' (Karma) کے تصور کے تحت ہر مرد و زن اپنے کیے کا خود ذمہ دار اور اس کے بھگتنے پر مجبور ہے۔

قرآن مجید میں جو خدا ہم سے کلام کرتا ہے، وہ بلاشبہ ایک موجود فی الخارج ذات ہے، الہِ شخصی (Personal God) ہے جو انسانوں کی قسمت کا فیصلہ کرتا ہے، لیکن اکثر مسلمان مفکرین ایسے رہے ہیں جو انسان نما، شخصی تمثیلوں اور لفظیات سے ہمیشہ پہلو بچا کر چلے۔ کسی مسلمان نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے، اس کی قضا اس طرح کی ہوگی جیسے کسی انسانی عدالت میں بیٹھے ہوئے قاضی کی ہوتی ہے، کیونکہ آخرالامر، "لیس کمثله شیء" (اس کی مثل کوئی شے نہیں) (۱۱:۴۲)۔ اور اس میں وہ قاضی اور منصف بھی شامل ہیں جنھیں انسان نے دیکھا ہے یا جن کے بارے میں سن رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حَکَم ہونے، فیصلہ کرنے کا مطلب، دوسرے لفظوں میں یہ ہوا کہ حقیقت خود کو ظاہر کر دیتی ہے۔ ہر شے وہی نظر آنے لگتی ہے جو وہ اصل میں ہے، کائنات میں فریب اور دھوکے کا سکّہ نہیں چلتا، ہر شے بالآخر اپنی مناسب جگہ پر پہنچ کر رہتی ہے۔ جو چیز اللہ کی وحدت، سالمیت، توازن، عدل، جمال، ہم آہنگی اور رحمت کا ظہور کرتی ہے وہ الاحد (The One)، الجمیل اور الرحیم کے قرب میں بار پائے گی اور وہ چیز جو کثرت، ژولیدگی، انتشار، جزویت، بے اعتدالی، قباحت اور قہر سے مغلوب ہوگی، وہ الاحد سے دور رہ جائے گی۔

کائناتی اسلام کے نقطۂ نظر سے ہر شے اللہ تعالیٰ کی حقیقت کی مکمل بندگی اور فرمانبرداری میں اپنے آپ کو الگ الگ کر لیتی ہیں۔ ہر شے پوری پوری نپی تلی اور بہ اندازۂ تقدیر ہے، لیکن اس کے علاوہ اسلامِ خاص بھی تو ہے، یعنی انسان کی وہ آزاد اور اختیاری اطاعت اور بندگی جو وہ رسولوں کے لائے

ہوئے پیغامِ خداوندی کے وسیلے سے کرتے ہیں۔ تجزیہ کرتے جائیے تو آخر کار مسلمانوں کو بھی یہ ماننا ہی پڑتا ہے کہ اسلامِ خاص بھی کائناتی اسلام ہی کا ایک پہلو ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہیے کہ اختیاری فرمانبرداری بھی پیمانۂ تقدیر کے مطابق ہی ہوتی ہے۔ ہاں یہ تسلیم کرتے ہوئے وہ ''توحید'' کا تصور ملحوظ رکھتے ہیں اور یہ بھی کہ الحق ہی حتمی اور قطعی حقیقت ہے اور اس سے انسان کی اس آزادی پر کوئی زد نہیں پڑتی جس کا اسے ادراک حاصل ہے۔

یہاں آ کر بات کا رخ پھر ایک مرتبہ جبر و قدر کے مبحث کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ مسلمان مفکرین کے لیے یہ تصور ناقابلِ قبول ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک طرف تو انسان کو کفر پر مجبور کرتا ہے اور دوسری جانب اس کی پاداش میں اس کو سزا دینے کا حکم صادر کرتا ہے یا یہ کہ وہ انسان کو ایمان پر مجبور کرکے، پھر اس نیکی کی اسے جزا عطا کرتا ہے۔ اس سارے معاملے میں انسان کی آزادیِ اختیار کا جو حصہ ہے وہ اس امر کے لیے کفایت کرتا ہے کہ انسان اپنی مرضی سے جو عمل کرے، اس کی ذمہ داری بھی قبول کرے اور اس کے لیے جواب دہی کرے۔

انسان جو کچھ کرتا ہے، اس کے لیے اس کے پاس دلیل موجود ہوتی ہے اور اس کا کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے۔ انسان اس لیے عمل نہیں کرتا کہ اسے کچھ کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے، بلکہ اس لیے کہ وہ اپنی مرضی اور اختیار سے ایک عمل منتخب کرتا ہے۔ قیامت کے دن جب خدا کا سامنا ہوگا اور انسان سے کہا جائے گا کہ ''اقراء کتابك'' (اپنی کتاب پڑھ) تو انسان دیکھے گا کہ ''رائی کے دانے کے برابر بھی کوئی شے'' (۲۱:۴۷) اس کے دفترِ عمل سے باہر نہیں رہی ہوگی۔ پھر جب اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کہ تم نے ایسا کیوں کیا اور ایسا کیوں نہیں کیا، تو انسان کے پاس جواب تو ہوگا، لیکن اسے بخوبی معلوم ہوگا کہ اس کے پاس اصل میں کہنے کو ہے کچھ نہیں۔ اس کے اکثر جواب ادھورے ہیں اور محض بات بنانے کے لیے کہے جا رہے ہیں۔

معاملے کو اس انداز میں پیش کرنے کا مطلب ہے کہ ہم ایک مرتبہ پھر مسئلے کو تجسیمی انداز میں اور انسان پر قیاس کرکے پیش کر رہے ہیں۔ اسی استدلال کو دوسرے ڈھب سے بھی بیان کیا جا سکتا ہے، لیکن دیکھا گیا ہے کہ تجسیمی اسلوبِ بیان لوگوں کے لیے عام طور پر سب سے زیادہ قابلِ فہم ہوتا ہے، تاہم اس وقت جو گفتگو ہم کر رہے ہیں، اس کے لیے ضروری نہیں کہ ہم اس چیز کی تہ تک پہنچنے کی سعی کریں جسے مسلمان مفکرین نے ''سرّ القدر'' (تقدیر کا بھید) کہہ کر بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ مزید

یہ بھی کہتے ہیں کہ جب تک کوئی شخص کمالِ روحانی کی راہ پر خاصا آگے نہ نکل جائے، اسے اس راز کی سمجھ نہیں آ سکتی۔[۸۲]

عدلِ خداوندی کا مسئلہ قرآن مجید میں اکثر جزا و سزا کے حوالے سے بیان ہوا ہے۔ عام طور پر اس کو یوں کہا گیا ہے کہ انسان کا ہر عمل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک جواب لاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ اس ضمن میں قرآن نے جو عمومی اصطلاح استعمال کی ہے، وہ ہے ''جزاء'' اس کا مطلب ہے: ''اسی شے میں ادا کرنا، بدلہ دینا'' خواہ خیر ہو یا شر۔ نیکی بدی دونوں کا بدلہ ملے گا۔ مندرجہ ذیل آیات دیکھیے:

وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ۨ الْحُسْنٰى وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا (۱۸:۸۸)	رہا وہ جو ایمان اور عمل صالح اختیار کرے گا تو اس کے لیے اللہ کے پاس بھی اچھا بدلہ ہے اور ہم بھی اس کے ساتھ آسان معاملہ کریں گے۔
وَمَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ، جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَاالْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى (۲۰:۷۵)	اور جو اس کے پاس با ایمان ہو کر جائیں گے، انھوں نے نیک عمل بھی کیے ہوں گے تو یہی لوگ ہیں جن کے لیے اونچے درجے ہوں گے۔ ان کے لیے ہمیشگی کے باغ ہوں گے، جن میں نہریں بہتی ہوں گی، ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہ صلہ ہے اس کا جس نے پاکیزگی اختیار کی۔
فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِى النَّارِخَالِدَيْنِ فِيْهَا وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ (۵۹:۱۷)	پس انجام کار دونوں ہی دوزخ میں ہمیشہ رہنے والے بن کر پڑیں گے۔ اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والوں کا بدلہ یہی ہے۔
قُلْ اِنِّىْ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّىْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ مَا عِنْدِىْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفَاصِلِيْن (۶:۱۵۷)	جو لوگ ہماری آیات سے اعراض کر رہے ہیں، ہم ان کو اس اعراض کی پاداش میں عنقریب نہایت برا عذاب دیں گے۔

جزا کے علاوہ قرآن مجید میں ''ثواب'' اور ''عقاب'' کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ ثواب وعقاب کا بشارت دینے اور خبردار کرنے سے چولی دامن کا ساتھ ہے اور زیادہ عمومی معنی میں ثواب وعقاب کا تعلق بنتا ہے رحمتِ خداوندی اور غضبِ الٰہی سے۔ اللہ تعالیٰ کو اس کے اسمائے رحمت اور جمالی ناموں سے موسوم کیجیے تو وہ نفس کو جزا دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ بطور اسمائے قہر وغضب کے نفس کو سزا دیتا ہے۔ اسی بات کو قدرے کم تجسیمی انداز میں بیان کرنا ہو تو یوں کہیں گے کہ وہ نفس جس نے ہستی کی نورانی اور روحانی جہت سے اپنا رشتہ مضبوطی سے استوار کر رکھا ہے ہوگا، وہ اس رشتے کے وسیلے سے الحق کے قرب میں داخل ہوگا، لیکن وہ نفس جو ہستی کی نورانی جہت سے گریزاں ہوگا اور اس کی ظلمانی اور جسمانی جہت کو آغوش میں لیے ہوگا، اس پر بے حقیقتی کا غلبہ طاری ہو جائے گا۔

قرآن وحدیث میں اس بدحالی اور ابتلا کا ہولناک نقشہ کھینچا گیا ہے جو جہنم میں کفار کو درپیش ہوگی۔ اسی طرح جنت کی نعمتوں، خوشگوار اور لذت بخش چیزوں کا بھی قرآن وحدیث میں تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ بہت سے مسلمان علما نے جہنم کے خطرے اور اس سے بچنے پر اتنا زور دیا ہے کہ جنت کا وعدہ پس منظر میں چلا گیا ہے۔ اگر یہ امر نظر میں رہے کہ اسلامی تعلیمات کی پہلی ترجیح یہ ہے کہ زندگی کے لائحۂ عمل کے طور پر شریعت کو قائم کیا جائے تو پھر اللہ کے قہر اور جلال پر زور دینے کا مذکورہ بالا انداز باعثِ تعجب معلوم نہ ہوگا۔ انسان کچھ بھی بننا چاہے، اسے سب سے پہلے اس بات کا شعور ہونا چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا بندہ ہے (خواہ وہ چاہے یا نہ چاہے) اور یہ اس کی اخلاقی اور وجودی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ارادے اور اختیار سے اللہ کی بندگی کرے۔ جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، وہ خدا جس کی بندگی اور چاکری کی جاتی ہے خدائے ''تنزیہ'' ہے، وہ بادشاہِ عالم جو انسان سے دور، ماورا رہتا ہے اور اپنے احکام بھیجتا ہے۔ اس سلطانِ زمان کے غضب اور قدرتِ قاہرہ سے ڈرنا چاہیے۔

اسلام میں اگرچہ ''تنزیہ'' بندگی اور عبودیت اور انذارِ خداوندی پر عمومی طور پر زور دیا گیا ہے، تاہم اسلامی روایت میں بہت سے علما ومفکرین نے اس امر کو کبھی فراموش نہیں کیا کہ رحمتِ خداوندی اس کے غضب سے بڑھی ہوئی ہے اور اس کے غضب پر حاوی ہے۔ اُس کی رحمت ساری خلقِ خدا پر پھیلی ہوئی ہے، سب کے لیے عام ہے، جب کہ اس کا غضب اس کی مخلوق میں سے کچھ کے لیے، کچھ حالات میں واقع ہوتا ہے۔ نظامِ عالم کا رخ رحمت کی سمت ہے اور آخرالامر جیت بھی رحمت ہی کی ہوگی۔ بالفاظِ دیگر، قربِ خداوندی، وحدت، توازن، اعتدال اور جمال ورحمت کے سب نام حقیقت کی

ماہیتِ اصلی کا تعین کرتے ہیں۔ اللہ سے دوری، ژولیدگی، تخریب، عدم توازن اور اسمائے قہر وغضب سے جو آثار ونتائج مخلوقات میں پیدا ہوتے ہیں، یہ سب نابودی، عدم ہستی اور فقدانِ حقیقت سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھیں کوئی ثبات حاصل نہیں۔ آخرالامر، کثرت اپنے آپ کو عدم میں مٹا دے گی، ایسے ہی جیسے اپنے منبعِ نور سے دور ہوتے ہوئے روشنی کی چمک مدھم ہوتی جاتی ہے۔ پس مخلوقات میں جو شے حقیقی ہے، وہ باقی اور جو کچھ بے حقیقت ہے وہ مٹ کر رہتی ہے۔ ''**کلّ شیٔ ھالك الا وجھه**'' (۱۸:۸۸) روئے یار کے سوا ہر شے مٹنے والی ہے۔ اسی کی بنیاد پر بعض مسلمان علما نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جہنم اس طرح ابدی نہیں ہوسکتی جس طرح اللہ تعالیٰ ابدی ہے۔ جس معنی میں اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، اس معنی میں جہنم کو دوام حاصل نہیں۔ جنت البتہ ہمیشہ رہے گی، کیونکہ جنت کا تعلق رحمتِ خداوندی سے ہے، لیکن جہنم کی کرب واذیت آخر کار مٹ جائے گی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے غائب ہونے میں اتنے طویل زمانے صرف ہوجائیں کہ ان کی موت کا تصور کرنا ہمارے بس سے باہر ہو۔

حقیقت میں رحمت کے غالب ہونے کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ نیک اعمال کی جزا کئی گنا بڑھا کردی جاتی ہے، جب کہ بدعملی کی سزا صرف عمل کے برابر ہوتی ہے۔ عملِ صالح سے انسان کا الحق سے تعلق مضبوط تر ہوتا جاتا ہے، چنانچہ ان کا اثر یہ ہوتا ہے کہ غیر حقیقی محو ہوتا رہتا ہے۔ تاریکی ہو تو ذرا سی روشنی بھی بہت ہوتی ہے۔ حق کی جزا حق سے ملتی ہے اور ناحق یا بے حقیقتی کی بے حقیقتی سے، لیکن بے حقیقتی کے مقابل حقیقت، لاشے کے سامنے شے کے مترادف ہے۔ ان میں کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ رہا وہ عمل، وہ کام جس کی جڑیں ایمان کی زمین میں پیوست نہیں ہیں تو وہ محض اس روشنی کی طرح ہے جو تاریکی، انتشار اور ژولیدگی میں ڈوبتی چلی جارہی ہو۔

تجسیمی انداز میں بیان کیجیے تو یوں کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ ہر عملِ صالح کو ایک موقع بنا لیتے ہیں انسان کو اپنی جانب کھینچ لینے کا۔ عملِ صالح وہ عمل ہے جو نبوّت سے حاصل ہونے والی رہنمائی کی بنیاد پر اللہ کی بندگی کی نیت سے انجام دیا گیا ہو، اسی لیے قرآن مجید میں فرمایا گیا: ''**فَاذْكُرُوْنِیٓ اَذْكُرْكُمْ**'' (۲:۱۵۲) (مجھے یاد کرو، میں تمھیں یاد کروں گا)۔ اب سوال یہ ہے کہ اللہ کے یاد کرنے اور کسی انسان کے اللہ کو یاد کرنے کو ایک دوسرے کے برابر کیوں کر رکھا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ الحق ہے، حقیقت ہے اور انسان بے حقیقت ہے۔ پس اس میں اصل اہم بات یہ ہوئی کہ ایمان رکھنے والے انسان کے عمل کے جواب میں اللہ تعالیٰ کا فعل صادر ہوتا ہے، جب کہ اس کے برعکس برے کام کو اللہ تعالیٰ

یونہی چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ اس شخص پر اپنے بداثرات پھیلاتا چلا جائے جس نے یہ عملِ بدانجام دیا تھا۔ اشیا کی حقیقتیں اپنے وقت پر ظاہر ہو جائیں گی اور پھر انسان کو سمجھ آئے گی کہ اس نے کیا کیا تھا:

جَزَآءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا (۱۰:۲۷)

برائی کا بدلہ اس کے مثل ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِىْ كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِاْئَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (۲:۲۶۱)

ان لوگوں کے مال کی تمثیل جو اپنے مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، اس دانے کی مانند ہے جس سے سات بالیاں پیدا ہوں اور اس کی ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ اللہ برکت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ اللہ بڑی گنجایش والا اور علم والا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ وَ اِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا (۴:۴۰)

اللہ ذرا بھی کسی کی حق تلفی نہیں کرے گا۔ اگر ایک نیکی ہو گی تو اس کو کئی گناہ بڑھائے گا اور خاص اپنے پاس سے بہت بڑا اجر عطا فرمائے گا۔

انسانی عمل اور اللہ تعالیٰ کا فعل دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ ان میں جو فرق ہے اس کو ایک معروف حدیث میں آنحضرتؐ نے یوں ظاہر کیا ہے:[۸۳]

جو بھی اعمالِ حسنہ لے کر آئے گا، اسے ہر اچھے عمل کا دس گنا ملے گا، بلکہ ہم (اور بھی) بڑھا دیں گے۔ جو اعمالِ بد لے کر آئے اس کے ہر عملِ بد کا اس کے برابر بدلا ملے گا یا پھر ہم اسے معاف کر دیں گے۔ جو شخص میری طرف ہاتھ برابر بڑھتا ہے، میں اس کی طرف باز و برابر بڑھتا ہوں۔ جو میری جانب باز و برابر بڑھتا ہے، میں اس کی جانب گزوں بڑھتا ہوں۔ جو جو میری طرف چل کر آتا ہے، میں دوڑ کر اس کی طرف آتا ہوں۔ جو میرے روبرو ایسے گناہ لیے ہوئے ہوتا ہے کہ جن سے زمین روپوش ہو جائے، لیکن اس نے میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا ہوتا تو میں اسے وہ مغفرت لیے ہوئے ملتا ہوں جو اس کے سارے گناہوں کو کافی ہوتی ہے۔

باب ششم

مسلم فکریات

ایمان کے تین اصولوں کے مضمرات کیا ہیں، انھیں ہم نے کھول کر بیان کیا ہے۔ یہ بحث ابھی اختتام کو پہنچی ہے۔ ہم یہ نہیں کہ رہے کہ ہم نے جو لکھا ہے، وہ تمام مسلمانوں کے عقائد کی نمایندگی کرتا ہے یا کسی خاص طبقے کے معتقدات کا بیان ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص یہ پوچھے کہ ''اللہ کے بارے میں یا رسول اللہ کے بارے میں مسلمانوں کے اعتقاد کی حقیقی نوعیت کیا ہے؟'' تو اس کا تفصیل سے ایسا جواب دینا ناممکن ہوگا جو ہر مسلمان کو مطمئن کر سکے، خواہ مسلمان سے مراد آج کل کے مسلمان ہوں یا وہ مسلمان جن کی تحریریں ہم تک پہنچی ہیں۔ ایمان کن چیزوں پر مشتمل ہوتا ہے، اس کا تعین ان بنیادی ارکان سے ہوتا ہے جن سے ہم نے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔ قرآن مجید میں ان ارکان کا بار بار ذکر آیا ہے۔ اللہ، فرشتے، مقدس کتابیں، انبیا اور رسول، روزِ آخرت، تقدیر، بلکہ یہ فہرست بھی کئی اعتبار سے مسائل پیدا کر سکتی ہے، لہٰذا اگر عقائدِ اسلام کو اس طرح بیان کرنا مقصود ہو کہ انھیں عالمگیر طور پر ہر کوئی تسلیم کر لے تو ہمیں مجبوراً فہرست کو مختصر کرنا ہوگا اور یوں کہنا ہوگا کہ اسلام کا مسلمہ، عالمگیر عقیدہ ہے: ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔''

تاہم ہوتا یہ ہے کہ جونہی آپ ''اللہ''، ''رسول''، ''قرآن''، ''فرشتے''، ''روزِ آخرت'' جیسے الفاظ کے مفہوم ومعنی کی بحث شروع کرتے ہیں، اختلافِ رائے نمودار ہونے لگتا ہے۔ ایمان کے تین ارکان کو اسلام کی فکری تاریخ میں کس طرح سمجھا گیا ہے، اس سوال پر غور کیا جائے تو یہ چیز سامنے آتی ہے کہ مختلف لوگوں نے ان کے بارے میں الگ الگ آرا قائم کی ہیں۔ بحیثیتِ مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مسلمان جو ان مسائل پر غور کرتے رہے ہیں، ان کے ہاں عمومی باتوں پر، اجمال میں، اتفاقِ رائے پایا جاتا ہے۔ اختلاف صرف تفصیلات کا ہے۔ اختلافِ رائے یوں بھی گہرا ہو جاتا ہے کہ اسلام میں کئی مکاتبِ فکر قائم ہوئے اور ہر مکتبِ فکر نے ارکانِ ایمان کی شرح وتعبیر کا ایک مخصوص اسلوب اپنا لیا۔

شریعت، شرعی قوانین اور اسلام کے ارکانِ پنجگانہ (کلمہ، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج) اگر اس طبقۂ علما کا خاص میدان تھا جسے ''فقہا'' کہا گیا ہے تو ایمان کے ارکان، اس کے اجزا بھی علما کے تین طبقات یا

گروہوں سے خاص ہو گئے۔ ان کو ایک ابتدائی تقسیم کے مطابق ہم متکلمین (علمِ کلام کے ماہرین)، نظریاتی تصوف یا عرفانِ نظری اور فلسفے کے ماہرین کے تین طبقات میں بانٹ سکتے ہیں۔ ان میں سے ہر طبقے میں کئی کئی ذیلی مکاتبِ فکر پائے جاتے ہیں۔ اس سے ایمان کی شرح وتعبیر کا سارا عمل اور اس کی نشو ونما کی تاریخ سب مل کر ایک خاصا پیچیدہ معاملہ بن جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسے علما جو ان تین مکاتبِ فکر سے یکساں واقفیت رکھتے ہوں، خال خال ہی رہ گئے ہیں۔ اکثر مسلم علما: بلکہ غیر مسلم ماہرین بھی ان تین مکاتبِ فکر میں سے کسی ایک کو اپنی خصوصی مہارت کے لیے چن لیتے ہیں، بلکہ یہ بھی کم ہوتا ہے۔ زیادہ امکان یہ رہتا ہے کہ ہر اہل علم ان تین مکاتبِ فکر میں سے کسی ایک کی ایک شاخ یا اس شاخ کے مشاہیر میں سے کسی ایک کو اپنے مطالعہ کے لیے منتخب کرلیں گے۔

ان تینوں مکاتبِ فکر کو ایک دوسرے سے الگ الگ کر کے ان میں امتیاز کرنا ہمیشہ ممکن نہیں رہتا۔ اسلامی تاریخ میں بہت سے اہلِ علم افراد ایسے ہو گذرے ہیں جن کو بیک وقت ان مکاتبِ فکر میں سے دو یا تین کا نمایندہ قرار دیا جا سکتا ہے یا پھر ان کی انفرادی علمی حیثیت ایسی تھی کہ انھیں کسی بھی مکتبِ فکر یا طبقے کی حدود میں قید نہیں کیا جا سکتا۔

تاہم ان تینوں مکاتبِ فکر پر الگ الگ بحث کرنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ وہ سب سمتیں ہماری نگاہ میں آ جائیں گی جن کی جانب مسلم فکر نے ''توحید''، ''رسالت'' اور ''معاد'' کے تصورات کی نشو ونما کے دوران سفر کیا۔ روایتی طور پر بھی ان مکاتبِ فکر کا مطالعہ اسی طرح جداگانہ طور پر کیا جاتا تھا۔ جدید علمی دنیا میں بھی یہی رواج ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی ہمارے سامنے رہنا چاہیے کہ ان تینوں اسالیبِ فکر کا موضوع ایک ہی ہے۔ یہ تینوں اندازِ جستجو، اپنے اپنے ڈھب سے تلاشِ حق کرتے ہیں۔ تلاش کا ہدف اور مقصد مشترک ہے، طریقے اور راستے جدا جدا ہیں۔ ان سب کا ہدفِ اولین اور مشترک موضوع ہے: ''حقیقت'' جو ہمارے سامنے ظاہر ہو رہی ہے، یعنی اسلام کے نقطۂ نظر سے تلاشِ حقیقت۔ سو اس طرح ایمان کے ارکان ثلاثہ (توحید، رسالت، آخرت) سے ان تمام افکار اور مباحث کی ایک وسیع حد بندی عمل میں آ جاتی ہے۔

ان میں سے ہر مکتبِ فکر پر ہم مختصراً الگ الگ تبصرہ کریں گے۔ اس سلسلے میں ایک بات شروع ہی میں سمجھ لینا چاہیے کہ ان تینوں کے طریقِ کار میں فرق ہے۔ اسلام کے مذکورہ بالا تین اصولوں کا مطالعہ کرنے کے لیے، ان پر غور وفکر کرنے کے لیے ان تین مکاتبِ فکر نے ایک دوسرے سے مختلف

اسلوب اور جداگانہ منہاجِ تحقیق اپنایا ہے۔ ان مکاتبِ فکر میں جو بنیادی اور مرکزی فرق بتایا جا سکتا ہے، جس سے ان کا امتیاز قائم ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ انسانی فہم، انسان کے حصولِ علم کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر ایک دوسرے سے الگ ہے۔ علم کی ماہیت کیا ہے، علم کیوں کر حاصل ہوتا ہے؟ یہ ایک ایسا بنیادی سوال ہے جو ہر اس شخص کے سامنے آتا ہے جو ذرا ٹھہر کر دائمی اہمیت کی حامل کسی بھی چیز کو غور و تأمل کا موضوع بنانا چاہتا ہو۔ ''مجھے جو معلوم ہے اس کا علم مجھے کیسے حاصل ہوتا ہے؟'' حقیقت اصل میں کیا ہے، یہ سمجھنے اور جاننے کے لیے کس طرح کا علم چاہیے؟'' یہاں یہ نکتہ سامنے رہے کہ تمام مسلمان مفکرین ایک بات متفقہ طور پر مانتے تھے اور وہ یہ کہ کوئی ایک حتمی اور آخری حقیقت وجود رکھتی ہے۔ یہی شہادتِ اوّل (لا الٰہ الا اللہ) کا تقاضا ہے۔ اسے تسلیم نہ کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ مسلمان مفکر نہ رہتے۔ چنانچہ جدید مغربی دنیا کے برعکس، مسلمانوں میں شاذ و نادر ہی کوئی ایسا مفکر ملے گا جو ایک حقیقتِ عظمیٰ کے وجود کا منکر ہو یا جو اس بارے میں تشکیک کا شکار ہو کہ حتمی معنویت رکھنے والی کسی شے کے علم کا امکان ہے یا نہیں۔

اس معاملے پر اگر بحیثیتِ عمومی نظر کیجیے تو معلوم ہوگا کہ دیگر بہت سے مذہبی اسالیبِ فکر کی طرح اسلام میں بھی یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ الحق کا علم حاصل کرنے، کائنات کی ساخت اور ماہیت کو سمجھنے اور نفسِ انسانی کے جاننے کے لیے یہ تین طریقے، تین انداز و اسالیب ہو سکتے ہیں۔ پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ انسان اپنی عقلِ خداداد، اپنی خلقی عقل کو استعمال میں لائے۔ یہ تو ہوا طریقِ عقلی۔ قرآن بار بار لوگوں کو ترغیب دلاتا ہے کہ وہ اپنی عقل استعمال کریں۔ اس ضمن میں بعض مسلمانوں نے یہ سوچا کہ عقل کو برتنے کا سب سے بہتر انداز یہ ہے کہ اسے اس ڈھب سے استعمال میں لایا جائے جو یونانی فلسفیوں بالخصوص ارسطو اور افلاطون نے رواج دیا تھا۔ حقیقت کو سمجھنے کا یہ فلسفیانہ اور منطقی انداز کئی اعتبار سے مغربی فلسفے کی اس روایت سے مشابہ ہے جو ڈیکارٹ سے پہلے مغرب میں پائی جاتی تھی۔

الحق کو جاننے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ انبیا کے لائے ہوئے پیغامات کو بے چون و چرا مان لیا جائے۔ یہ ''وحی'' کا راستہ ہے۔ یہ ایمان کا عمومی راستہ ہے۔ مسلمان اسے نہایت قابلِ تعریف گردانتے ہیں۔ اگر اس مؤقف کو اختیار کرنے والے اس کی تعمیم نہ کرنے لگیں اور اس دعویٰ پر نہ اتر آئیں کہ ہر شخص پر (فکر و فہم) کی انھی قیود کو بلا استثنا لاگو کیا جائے گا جو ان کے حصے میں آئی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اگر آپ یہ کہیں کہ ''میں یہ بات مانتا تو ہوں مگر میں اصل میں اسے

سمجھا نہیں ہوں'' تو یہ ایک چیز ہے، لیکن اگر آپ یہ دعویٰ کریں کہ ''چونکہ میں اسے سمجھ نہیں پایا، لہٰذا کوئی بھی اسے سمجھ نہیں سکتا'' تو پھر بات کچھ اور ہو جاتی ہے۔ تمام مسلمان وحی کو تسلیم کرتے ہیں۔ شہادتِ دوم (محمد رسول اللہ) کے معنی ہی یہی ہیں، تاہم مسلمانوں میں سے کچھ لوگ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ قرآن کی آیات کو لفظی معنی ہی میں قبول کرنا اہم ہے، جب کہ دوسرے لوگوں کی نگاہ میں لفظی معنی پر اس درجہ اصرار کرنا لازمی نہیں۔ ماہرینِ علمِ کلام پر اگر نظر کیجیے تو بحیثیتِ عمومی ان کی اکثریت کو ''وحی'' ہی کے راستے پر گامزن پایے گا۔

الحق کو جاننے کا تیسرا راستہ یہ ہے کہ حقیقت کو عقل جزوی یا وحی کی وساطت کے بغیر اپنا تجربہ بنایا جائے۔ اس راہ کے یوں تو بہت سے نام ہیں، لیکن ہم اس کے لیے یہاں وہ اصطلاح استعمال کریں گے جو سب سے زیادہ معروف ہے، یعنی ''کشف'' (کھولنا، بے نقاب کرنا)۔ اس لفظ سے جو تصور ابھرتا ہے وہ ایک دوسرے خیال سے جڑا ہوا ہے، یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے پردے میں ہے، اس کے اور مخلوق کے درمیان حجابات ہیں۔ ایک حدیث میں ہم نے یہ تصور پہلے بھی دیکھا تھا:[۸۴]

> اللہ تعالیٰ کے نور وظلمت کے ستر پردے ہیں۔ اگر یہ پردے اٹھ جائیں تو روئے خداوندی کی درخشندگی سے ہر وہ شے جل کر خاک ہو جائے جس کا درک خلقِ خدا اپنی بصارت سے کر سکتی ہے۔

کشف تب واقع ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ اپنے اور اپنی مخلوق میں سے کسی شخص کے درمیان پردوں میں سے کچھ حجاب اٹھا دیتے ہیں۔ جس شخص کو کشف کا تجربہ ہوتا ہے، اس کی بینائی خاکستر بھی ہو سکتی ہے اور بچ بھی سکتی ہے، لیکن اس تجربے کے بعد اس کے لیے پردوں کی اوٹ میں الحق کے بارے میں شک وشبہ کی کوئی گنجایش نہیں رہ جاتی۔ مغربی زبانوں میں mysticism کا لفظ اکثر جس معنی میں استعمال ہوتا ہے وہ اسلامی زبانوں میں ''کشف'' کے لفظ کے قریب تر ہیں۔ مقام افسوس یہ ہے کہ سرّیت (mysticism) کے لفظ سے کچھ ایسے منفی تلازمات وابستہ ہو گئے ہیں کہ ان سے معاملے کی وضاحت ہونے کی جگہ الجھنوں میں اضافہ ہی ہوتا دیکھا گیا ہے، لہٰذا ہم اس لفظ کو برتنے سے گریز کریں گے۔[۸۵] الحق کو جاننے کے جو تین اسالیب یا راستے ہم نے بیان کیے، وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔ یہ تینوں ایک دوسرے سے گھلے ملے رہتے ہیں، یہ اور بات ہے کہ تاریخِ اسلام میں کچھ ایسے لوگ بھی گذرے ہیں جن کا دعویٰ یہ تھا کہ ان میں سے صرف ایک ہی راستہ یا ایک ہی اسلوب کو جائز اور قابلِ عمل کہا جا سکتا ہے۔

قاعدہ کلیہ یہ رہا ہے کہ اسلام کے تینوں مکاتبِ فکر نے وحی کو کسی نہ کسی درجے میں اپنا رہنما اورحَکَم تسلیم کیا ہے۔ اگر آپ یہ تسلیم نہ کریں کہ قرآنِ مجید علمِ خداوندی ہے جو انسانوں کے لیے نازل کیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے شہادتِ دوم کا انکار کر دیا اور مسلمان نہیں رہے۔ وہ لوگ جو راہِ کشف کے مسافر ہیں، وہ قرآن کے عطا کردہ علم کو اپنا ہادی و رہنما بنانے کے سلسلے میں خاص طور پر بہت محتاط رہے ہیں۔ ان کے خیال میں کشفِ صحیح صرف اور صرف اس وقت واقع ہوتا ہے جب انسان رسول خداؐ کی سنت کی پیروی کرتا ہو۔

عمومی طور پر دیکھیے تو کہا جا سکتا ہے کہ جاننے سمجھنے کے یہ تین اسلوب انسانوں کے ہر معاشرے میں پائے جاتے ہیں۔ ہر انسانی تہذیب، البتہ ان میں سے ایک کو دوسرے پر فوقیت دیتی رہی ہے۔ مثال کے طور پر عیسوی تہذیب میں اگرچہ وحی پر زور دیا گیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ روایت پر ایک عقلی اسلوب میں غور کرنے کا رویہ بھی خوب پھلتا پھولتا رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسے مسیحی بھی ہمیشہ رہے ہیں جن کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ سچی عیسائیت وہ ہے جس میں ایمانی حقائق ہمارا ذاتی تجربہ بن جائیں۔ یہی وہ چیز ہے جسے مسلمان کشف کہتے ہیں۔ رہی جدید مغربی تہذیب تو اس میں صدیوں سے جو اسلوبِ فہم غالب ہے، وہ ہے عقلیاتی یا استدلالی۔ فہمِ انسانی کے باقی دونوں طریقے بھی سرے سے مفقود کبھی نہیں ہوئے۔ حالیہ زمانہ میں یوں لگتا ہے کہ یہ دونوں دبے ہوئے اسالیب پھر سے ابھرنے لگے ہیں۔

اسلام کے ابتدائی عہد میں ایمان کا بیان کیسے ہوا؟

بہت سے جدید اہلِ علم نے اسلام کا مطالعہ کرتے ہوئے علمِ کلام پر غیر معمولی توجہ صرف کی ہے۔ یہ رویہ اتنا بڑھا کہ عام قاری جو اس موضوع پر زیادہ معلومات نہ رکھتا ہو، بہ آسانی اس مغالطے میں پڑ جاتا ہے کہ علمِ کلام ہی اسلامی فکر کی سب سے اہم شکل ہے۔ ان لکھنے والوں کا محرک ہر صورت میں یہ جاننا نہیں رہا کہ اسلام اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے۔ ان کے اغراض و مقاصد اکثر کچھ اور رہے ہیں۔ اسی کارن ان کے ہاں علمِ کلام کے عقلی اسلوبِ فہم کو زیادہ اہم قرار دینے یا دیگر اسالیب سے دلچسپ تر جاننے کا روّیہ نظر آتا ہے۔

یہ درست ہے کہ علمِ کلام کو اسلامی تہذیب میں ایک اہم حیثیت حاصل رہی ہے، لیکن اس اصطلاح کو انگریزی میں Theology (الٰہیات) کے لفظ سے ترجمہ کرنے کا مطلب یہ نہیں لینا چاہیے

کہ اسلام میں علم کلام کا وہی کردار رہا ہے جو مسیحیت میں Theology نے انجام دیا تھا۔ اسلام میں مرکزی اہمیت شریعت کو حاصل ہے، علمِ کلام کو نہیں۔ اسلام پر عمل کرنے والے مسلمانوں کی اکثریت کو علمِ کلام کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہوتا، اگرچہ ان میں سے ہر ایک کو کسی نہ کسی حد تک شریعت سے شناسائی حاصل ہوتی ہے۔ علمِ کلام کے بغیر بھی انسان اچھا مسلمان ہو سکتا ہے، لیکن شریعت کے بغیر کسی بھی طرح کا مسلمان ہونا ایک امرِ محال ہے۔ بہت سے عظیم مسلم علما، جیسے امام غزالی نے علمِ کلام کا مطالعہ کرنے سے مسلمانوں کو منع کیا ہے، کیونکہ علمِ کلام عقلی مسائل پر توجہ مرکوز کر دیتا ہے جن کی اکثر لوگوں کے لیے کوئی عملی اہمیت نہیں ہوتی۔

سوال یہ ہے کہ پھر اسلام میں علمِ کلام کی نمود ہوئی کیوں؟ اس کے جواب کے لیے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اشاعتِ اسلام کے اوّلین عہد میں مسلمانوں کو کن حالات کا سامنا تھا۔

اپنے آغاز کے پہلے سو سال کے اندر اندر اسلام ایران کے بڑے حصے، شمالی افریقہ اور مشرقِ وسطٰی کے عرب علاقوں میں پھیل چکا تھا۔ ان علاقوں میں جو ادیان پہلے سے موجود تھے، ان میں عیسائیت، یہودیت، زرتشتیت اور متھراویت، مانویت اور حرّان کی صابئیت شامل تھی۔ ان میں سے بعض ادیان کے اندر ایک دوسرے کے حریف مکاتبِ فکر یا فرقے بھی موجود تھے۔ اس کے علاوہ ان علاقوں کے بہت سے لوگ یونانی فلسفے، بالخصوص نو فلاطونیت سے آشنا تھے اور یہ فلسفیانہ نظام اکثر خود ایک مذہب کی حیثیت اختیار کر لیتا تھا۔

مسلمانوں نے جب ان لوگوں کے ساتھ رہنا بسنا شروع کیا جو مسلمان نہیں تھے تو کچھ مسلمان قدرتی طور پر دین کے بارے میں ان سے تبادلۂ خیال بھی کرنے لگے۔ مسلمانوں کے پاس قرآن تھا اور حدیث جن پر ان کا انحصار تھا، جب کہ دوسری روایتوں کے نمایندوں، بالخصوص عیسائی حضرات کے ہاں صدیوں پر پھیلے ہوئے پیچیدہ الٰہیاتی مباحث کا ایک ایک پس منظر تھا جس کے نتیجے میں فکر کی تراش خراش کے عمل سے بہت سے سوالات نکھر کر سامنے آئے تھے۔ یہاں یہ یاد رہے کہ عیسائیت اس علاقے میں پروان چڑھی تھی جہاں یونانی فلسفہ ہی سب سے بڑی فکری قوت تھی۔ اپنی ابتدا ہی میں عیسائیوں نے یونانی فلسفیوں کے بعض افکار کے خلاف ایک مناظرانہ موقف اختیار کر لیا تھا، لیکن فلسفے پر بحث کرنے کے لیے انھیں فلسفے ہی کا سامانِ جنگ استعمال کرنا لازم تھا۔ ان لوگوں سے بات کرنے کے لیے جو صدیوں سے فلسفیانہ مباحث پر کلام کرتے رہے ہوں، عیسائیوں کے لیے ضروری

ٹھہرا کہ وہ منطقی اور فلسفیانہ مباحث کی ساری پیچیدگیوں اور نزاکتوں پر عبور حاصل کریں۔

دوسری روایتوں کے ایسے نمایندوں سے جب مسلمانوں کا سابقہ پڑا تو بعض مسلمان تو ان کو ''کافر'' اور ''منکرِ حق'' کہ کر الگ ہو گئے، لیکن یہ رویّہ ان لوگوں کا نہیں تھا جن کو اسلام سے پہلے آنے والی وحیِ خداوندی اور عقلِ انسانی کا کچھ بھی پاس لحاظ تھا۔ جس جس مسلمان میں عقلی مباحث کا میلان تھا، اسے یہ فکری سوالات اہم دکھائی دینے لگے۔ ان میں دین کی اصل و اساس، اس کی نوعیت، نبوّت اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں دوسرے ادیان کے ایسے لوگوں سے تبادلۂ خیال کے عمل کا آغاز ہوا جو اللہ پر ایمان رکھتے تھے۔ پہلے قدم پر ہی انھیں یہ احساس ہو گیا کہ منظّم انداز میں سوچنے والے ان مفکرین کے مقابل کامیابی سے گفتگو کرنا آسان نہیں جو فلسفے اور الٰہیات کے مباحث میں باضابطہ تربیت یافتہ ہوں۔

پھر یہ بھی قدرتی بات تھی کہ وہ مسلمان جن کی افتادِ طبع عقلیات کی طرف میلان رکھتی تھی، یہ سوچنے لگے ہوں کہ کیوں نہ ہم اپنا موقف اس انداز میں بیان کرنے میں مہارت حاصل کر لیں جو دوسرے ادیان کے پیروکار لوگوں کو اسلام کی بات انھی کی زبان میں سمجھا سکے۔ ان کے پاس اس کے سوا چارۂ کار تھا بھی نہیں کہ وہ اپنے مخاطبین کے طرزِ کلام کو اختیار کر لیں اور اسی میں ان سے کلام کریں۔ قرآن سے انھیں یہ بات معلوم تھی کہ اللہ تعالیٰ اپنی وحی کی زبان کو ان لوگوں کے لیے ڈھال دیتے ہیں جن کی طرف وحی بھیجی جا رہی ہو۔ ''وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ'' (۱۴:۴۰) (**اور ہم نے جو رسول بھیجا اس کی قوم کی زبان میں بھیجا تاکہ وہ ان پر اچھی طرح واضح کر دے**)۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ رسولِ خدا ؐ کی ہدایت ہے کہ لوگوں سے ان کی سمجھ کے مطابق بات کی جائے (**كلّموا الناس على قدر عقولهم**)۔ سو جب انھوں نے اپنے حلقۂ شناسائی میں داخل ہونے والے نئے لوگوں کو اللہ کے بارے میں، کائنات کے بارے میں یا کلامِ الٰہی کے بارے میں ایسی کوئی بات کہتے سنا جو قرآن میں بتائی ہوئی کسی چیز کے خلاف جاتی تھی تو انھوں نے ان لوگوں کے دلائل کا انھی کی زبان میں ایسا جواب فراہم کرنے کی کوشش کی جو قابلِ فہم بھی ہو اور قرآنی حقائق پر مبنی بھی ہو۔

اسلام نے جن علاقوں کو فتح کیا تھا، وہاں یونانی فلسفہ پڑھنے کے سارے وسائل میسر تھے۔ اسکندریہ کی مثال سامنے کی ہے جو یونانی فلسفے کی روایت، بالخصوص نوفلاطونیت کا سب سے بڑا وارث تھا۔ جو مسلمان شروع شروع میں ان مباحث میں شامل ہوئے، وہ یونانی فلسفے اور مقامی ادیان سے کچھ زیادہ واقف نہیں تھے، لیکن یہ فکری روایتیں ان کے فکری ماحول اور ذہنی فضا کی صورت گری میں معاون ضرور رہی تھیں۔

جو لوگ اسلامی تعلیمات کو اپنے زمانے کے معاصر عقلی اسلوب میں بیان کرنے کا آغاز کر رہے تھے، ان کے بنیادی مقاصد میں سے ایک یہ تھا کہ غیر مسلموں کے اعتراضات کے سامنے ارکانِ ایمان کا دفاع کیا جائے۔ یوں رفتہ رفتہ مسلمانوں نے بنیادی مسائل پر کچھ ایسے موقف قائم کر لیے جو الٰہیاتی اور فلسفیانہ فکر کے لیے اہم تھے۔ وہ مسلمان جو متکلمین (یعنی ماہرینِ علمِ کلام) کے نام سے معروف ہوئے، ان کے ہاں قرآن مجید کو بحیثیتِ کلامِ الٰہی پیش کرنے کے لیے ایک دفاعی موقف متعین ہو گیا۔ جو لوگ فلسفی کہلائے، ان کی دلچسپی ایسے مباحث میں زیادہ رہی جو یونانی فلاسفہ، مثلاً افلاطون، ارسطو اور فلاطینوس نے پیش کیے تھے۔ فلسفیوں کے اندازِ نظر پر ہم الگ سے گفتگو کریں گے۔

یہ بھی ایک امرِ واقعہ ہے کہ ابتدائی عہد کی کچھ ایسی تحریریں ہمارے سامنے ہیں جن میں وہ مباحث جو بعد کو علمِ کلام کے مرکزی مباحث بن گئے، ایک بلند فکری سطح پر نہایت صفائی سے بیان ہوئے ہیں۔ ان تحریروں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عہدِ قدیم کے مشرقِ وسطیٰ کی فکری فضا کسی حد تک مکّہ اور مدینہ میں بھی پائی جاتی تھی۔ مثال کے طور پر رسولِ خداؐ کے چچا زاد اور داماد سیدنا علیؓ کے اقوال کو چوتھی/دسویں صدی میں نہج البلاغہ کے عنوان سے یکجا کیا گیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس شخص نے ان اقوال کی جمع و تدوین کا کام انجام دیا، اس کی رائے پر اس کی اپنی صدی کے فکری مباحث بھی اثر انداز ہوئے ہوں گے۔ ان مباحث میں علمِ کلام کے بہت سے مناظرے بھی شامل رہے ہوں گے اور انھی کے زیرِ اثر انتخاب کرنے والے نے یہ فیصلہ کیا ہوگا کہ کن اقوال کو شاملِ انتخاب کیا جائے اور کون سے اقوال چھوڑ دیے جائیں۔ یہ تو ممکن ہے کہ انتخاب میں بعض موضوع اقوال بھی در آئے ہوں، لیکن بعض جدید اہلِ علم کی یہ رائے قبول کرنا ناممکن ہے کہ یہ سارے اقوال حضرت علیؓ سے غلط طور پر منسوب کیے گئے ہیں۔ اس مجموعے کا عمومی اسلوبِ بیان یکساں ہے اور تحریر کی روحانی اور فکری سطح اتنی بلند ہے کہ اسے جعل سازی نہیں کہا جا سکتا۔ مزید برآں نہج البلاغہ سے پہلے کی کچھ کتب اور بھی ہیں جن میں ان میں سے بہت سے اقوال مل جاتے ہیں۔

نہج البلاغہ کو پڑھیے تو قرآن اور رسول خداؐ کے بعد، سیدنا علیؓ ''توحید'' کے سب سے بڑے ترجمان نظر آتے ہیں، لیکن قرآن کا اپنا ایک یکتا و بے مثل اسلوب ہے۔ اس کی اثر انگیزی کی نقل کرنا محال ہے۔ یہ اسلوب زیادہ تر پند و نصیحت، فہمایش اور ترغیب و ترہیب پر مبنی ہے اور نفسِ انسانی کی عمیق ترین جہات پر براہِ راست اثر انداز ہوتا ہے۔ قرآن خدا کے لہجے میں کلام کرتا ہے جس میں

فرمانروائے جہان کا حکم و اختیار گونجتا ہے۔ قرآن آغاز ہی سے مسلمانوں کے دل میں اتر گیا تھا۔ احادیث کا اپنا ایک خاص اسلوب ہے جو قرآن سے مختلف ہے۔ قرآن اور حدیث کے اسالیب سے جو شخص ایک مرتبہ شناسا ہو جائے، اس کے لیے ناممکن ہے کہ پھر وہ کبھی ان دونوں کو خلط ملط کر سکے۔ رسولِ خداؐ کے لہجے میں ایقان و اذعان تو ہوتا ہے، لیکن ایک خلیق انسان کا انکسار اور مروت بھی ساتھ رہتی ہے۔ قرآنی آیات کے مقابلے میں احادیث میں بات کو زیادہ کھول کر بیان کیا جاتا ہے۔ آپؐ کے کلام میں تفصیل ہوتی ہے اور ایک ہی فقرے کو یا تراکیب کو قدرے تبدیلی کے ساتھ دہرانے کا خوشگوار عمل نظر آتا ہے جو کہ لفظوں کے تقابل سے بات کے مدعا کو بالکل واضح کر دے۔ رسولِ خداؐ کے الفاظ محسوس اور عملی ہوتے ہیں مجرد نہیں ہوتے، بطور کلیہ ہم کہ سکتے ہیں کہ آپؐ اپنی گفتگو میں روزمرہ کے الفاظ کے سوا اور الفاظ نہیں برتتے تھے۔

سیدنا علیؓ کی نہج البلاغہ ایک تیسرے اسلوبِ بیان کی نمایندگی کرتی ہے جو قرآن اور حدیث سے بالکل الگ ہے۔ اگر رسولِ خدا کا کلام روزمرہ اور زمینی عبارت کے لطف سے مملو ہے تو حضرت علیؓ کا طرزِ کلام آسمانی اور مرعوب کن اسلوب کی جانب مائل دکھائی دیتا ہے۔ ان کی زبان رسولِ خداؐ کی زبان سے کہیں مشکل ہے۔ رسولِ خداؐ کے کلام میں بھی کہیں کہیں ایسے الفاظ آتے ہیں جو عام فہم نہیں ہوتے، لیکن یہ الفاظ عام طور پر وہ اسما ہوتے ہیں جو اگرچہ ٹھوس اشیا کو موسوم کرتے تھے، لیکن کسی وجہ سے بعد کے زمانوں میں متروک ہو گئے۔ حضرت علیؓ کے ہاں لفظوں کا ایک ذخیرہ ہے جو مختلف فکری اور مجرد بیانات کے سیاق و سباق میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس کے لیے انھوں نے عربی زبان کے بھرے پُرے خزانے میں پائے جانے والے وافر ذخیرۂ الفاظ کو اس طرح برتا ہے کہ اس کی ان سے پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔ انھیں ایک اور چیز کا خاص طور پر ملکہ حاصل تھا، بات کو ایسے پُرمعنی اور جامع انداز میں سمیٹ کر کہنا کہ فقرہ ضَربُ المَثَل بن جائے۔ اسی اسلوب کی وجہ سے حضرت علیؓ کا ایک مقولہ کتابوں اور دفتروں پر پھیلے ہوئے مباحث پر بھاری ثابت ہوتا ہے۔

نہج البلاغہ سے سیدنا علیؓ کی جو شخصیت اُبھرتی ہے، وہ ایک ایسے آدمی کی ہے جو حکمتِ قرآنی اور دانشِ نبوی کی گہرائیوں سے واقف ہو۔ ذرا مزید عمومی انداز میں پھیلا کر کہیے تو حضرت علیؓ آپؐ کے وہ صحابی ہیں جو وحیِ خداوندی کے سب سے گہرے معانی اور مخفی گوشوں کے شناسا تھے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ **"ومن یؤتی الحکمة فقد أُوتی خیراً کثیرا"** (۲:۲۶۹) (جسے حکمت عطا ہوئی،

اسے خیر کثیر کا خزانہ مل گیا)۔ اس لحاظ سے حضرت علیؓ مردِ دانا اور حکیم دانش مند کے مثالی نمونے کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ یہاں یہ نہیں کہا جا رہا کہ حضرت علیؓ رسولِ خدا ؐ سے زیادہ دانائی رکھتے تھے۔ بات صرف اس قدر ہے کہ آنحضرتؐ کے اقوال میں بسا اوقات حکمت کی بات روزمرہ کی تفصیلات کی اوٹ میں آ کر نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ حضرت علیؓ کی حکیمانہ باتیں سرتا سر دوسری دنیا سے متعلق ہوتی ہیں۔ عام دنیاداری کی سطح پر اس اسلوب کی کمزوری چوتھے خلیفۂ راشد کے طور پر ان کے دورِ خلافت سے عیاں ہے جسے سیاسی طور پر کسی طرح کامیاب نہیں کہا جا سکتا۔

اس وقت ہم جس بحث پر کلام کر رہے ہیں، اس سے حضرت علیؓ کا مذکورہ اسلوبِ بیان اس لیے متعلق ہے کہ ان کے اقوال میں وحیِ اسلامی کے وہ امکانات ظہور کرنے لگے ہیں جو اسے ایک عقلی پیرایۂ اظہار میں پیش کرنے کے لیے ضروری تھے۔ علمِ کلام، عرفانِ نظری اور فلسفہ سبھی کے آثار ان کی تحریر میں اپنی نمود کرتے نظر آتے ہیں۔ رہا یہ سوال کہ عہدِ عتیق کے مشرقِ وسطی میں پائی جانے والی فکری فضا سے حضرت علیؓ کس حد تک آگاہ تھے تو اس پر بحث کی بہت گنجایش ہے۔ ایک بات یقینی ہے کہ ان کے بعد کی مسلمان نسل میں سے کچھ لوگ حضرت علیؓ کے اس پیرایۂ اظہار کی طرف ایک فکری میلان رکھتے تھے اور انھی لوگوں نے فلسفیانہ اور کلامی مباحث اٹھانے کے جملہ مواقع سے استفادہ کیا۔

علمِ کلام

ایمان کے اصولوں پر ایک مخصوص انداز سے نظر کرنے کے عمل کے لیے ''کلام'' کا لفظ کہیں چوتھی /دسویں صدی میں جا کر مروج ہوا۔ اس سے پہلے اس کے لیے اور الفاظ برتے جاتے تھے۔ حنفی مکتبِ فقہ کے بانی امام ابوحنیفہ خود بھی کلامی مباحث کے ضمن میں ایک اہم شخصیت شمار ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں اس کے لیے جو عنوان ملتا ہے، وہ ہے الفقہ الاکبر' اس کا ترجمہ اردو میں کیجیے تو اسے ''اعلیٰ ترفہم'' یا ''بہتر سمجھ بوجھ'' (The greater understanding) کہا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ نے یہاں ''فقہ'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ہم نے یہ لفظ سابقہ مباحث میں ''قانون'' یا ''فقہی ضابطوں'' کے معنی میں برتا تھا، جب کہ امام ابوحنیفہ کے ہاں یہ لفظ اپنے قرآنی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ قرآن میں ''فقہ'' کا مطلب ہے تعلیماتِ دین کا فہم، دین کی سمجھ۔ امام ابوحنیفہ نے ''اکبر'' (بڑی) اور ''اصغر'' (چھوٹی) کے لفظ استعمال کر کے ''فقہِ اکبر''، یعنی اصولِ دین کے فہم اور ''فقہِ اصغر'' یعنی شرعی احکامات کے فہم کے مابین فرق قائم کر دیا ہے۔ علمِ کلام کو 'اصول الدین'' بھی کہا گیا ہے جس کے معنی ہیں دین کی جڑ، بنیاد۔ اس

نام میں اشارہ یہ پنہاں ہے کہ اسلام کی اصل بنیاد ایمان پر ہے، یعنی ماہیتِ اشیا کے فہم پر۔ اس اعتبار سے دیکھیے تو فقہی احکامات کو ''فروع الدین'' (دین کی شاخیں یا ضمنیات) کہا جائے گا، کیونکہ دین کی عملی تعلیمات کی حیثیت ایمان کے اصولوں کے اطلاق ہی کی ہوتی ہے۔

علمِ کلام کے ماہرین کا اولین ہدف یہ رہا ہے کہ قرآن مجید کی صداقت پر ہونے والے اعتراضات کا جواب دیا جائے، اس کی حقانیت کا دفاع کیا جائے۔ جو اس کے کلامِ خداوندی ہونے میں شک کرے اس کی دلیل کا ردّ کیا جائے، مگر اعتراض کرنے والے کے پاس کچھ کہنے کو ہونا ضروری تھا۔ یاد رہے کہ علمِ کلام ایک ایسا فکری عمل تھا جو منجھے ہوئے اہلِ فکر نے اپنے ایسے مخاطبین کا جواب دینے کے لیے اختیار کیا جو ان مباحث کی اہمیت اور معنویت کے قائل تھے۔

یہ درست ہے کہ فکرِ اسلامی کے لیے علمِ کلام کے مباحث اپنی ایک اہمیت رکھتے تھے، لیکن یہ اہمیت ایسی بھی نہیں ہے جیسی عموماً فرض کر لی جاتی ہے۔ اسے بڑھا چڑھا کر بیان کرنے میں زیادہ تر ان جدید اہلِ قلم کا ہاتھ ہے جو کسی نہ کسی سبب اس بات کو تسلیم کر چکے ہیں کہ متکلمین نے اپنے بارے میں، اپنی حیثیت اور ضرورت کے بارے میں جو دعوے کیے ہیں، وہ سب درست ہیں۔ ایمان کی سطح پر اصل اہمیت جس شے کی رہی ہے، وہ ہے شہادت اوّل اور شہادت دوم، ''لا الہ الا اللہ'' اور ''محمد رسول اللہ'' جن کے بنا اسلام ہی وجود میں نہیں آتا، لیکن مسلمان مفکرین، بشمول ماہرینِ علمِ کلام، اسے مسلّمات میں سے جانتے تھے اور اس کو موجود مان کر آگے بڑھتے تھے۔ اہلِ کلام کے لیے جو مباحث زندگی اور موت کا مسئلہ بنے ہوئے تھے، وہ کچھ یوں تھے۔ ''قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق اور ابدی؟'' ''اللہ کی صفات اس کی ذات سے الگ ہیں یا ذات وصفات ایک ہی ہیں؟'' کیا انسان مجبور ہے یا آزادیِ اختیار رکھتا ہے؟'' علمِ کلام کے تناظر میں ان مباحث پر گفتگو کرنا ہو تو بات بہت دور نکل جائے گی اور ہماری کتاب اس کا بوجھ برداشت نہیں کر سکے گی، تاہم یہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ اسلام میں ان مباحث کی اہمیت کیا ہے، نیز یہ بھی کہ ایک دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھنے پر یہی مباحث ویسے اہم کیوں نہیں رہتے جیسے کہ بظاہر معلوم ہوتے ہیں۔

ان سوالات پر بحث اس لیے اہم ہے کہ بعض لوگ ان الجھے ہوئے دقیق مسائل کے صاف اور دوٹوک جواب کی تلاش کے لیے خود کو مجبور پاتے ہیں۔ کچھ لوگ پیدائشی طور سوچ بچار کے عادی یا علمی نکات پر غور کرنے کے شائق ہوتے ہیں۔ کوئی بھی دین ایسے لوگوں کو نظرانداز نہیں کر سکتا۔ ان کا فکری

سفر سوالات اٹھانے سے عبارت ہوتا ہے اور اگر ان کو تسلی بخش جواب نہ مل سکیں تو وہ کسی اور جانب رخ کرنے لگتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ علم کلام نے سبھی سوالات کے جواب فراہم کر دیے، ہرگز نہیں۔ اگر ایسا ہو گیا ہوتا تو اسلام میں عرفانِ نظری اور فلسفے کی نشو ونما ہی نہ ہوتی، تاہم اتنا ضرور ہے کہ علم کلام نے لوگوں کی ایک بڑی تعداد کے لیے جوابات فراہم کر دیے اور علمِ کلام کے ان جوابات سے جو ایک فکری اور عقلی سہارا ان کو میسر آیا، اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی بندگی اور قرآن سے تعلق پر ان کا دل پوری طرح جم گیا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ان کا ایمان مستحکم ہو گیا۔

اس سارے معاملے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ ان کلامی اور الٰہیاتی مباحث سے کچھ سیدھے سادے سیاسی نتائج بھی فراہم ہوتے تھے، بالخصوص جب حکومتِ وقت ان سے اپنے اقتدار کا جواز فراہم کرنا چاہتی تھی۔ اس نکتے سے بعض جدید اہلِ علم اس طرف گئے ہیں کہ تمام کلامی مباحث اور آرا کی وضاحت صرف سیاسی پس منظر ہی کے حوالے سے کی جانا چاہیے۔ یہ درست ہے کہ مباحث اٹھانے والا پہلا بڑا طبقہ، یعنی معتزلہ کشمکشِ اقتدار کے معاملات سے قریبی تعلق رکھتا تھا۔ ان کے ہاں اچھے اور برے مسلمانوں کے درمیان امتیاز کا مسئلہ ایک بنیادی اہمیت رکھتا تھا اور جب خلیفہ مامون الرشید کے عہد میں ان کو تیسری/نویں صدی کے اوائل میں سیاسی سرپرستی حاصل ہوئی تو انھوں نے ایسے علما کے خلاف باقاعدہ مہم چلائی جو اچھے مسلمان کی تعریف کے مسئلے پر ان سے اختلاف رکھتے تھے۔

بعد کے ادوار میں بھی علم کلام کے مکاتبِ فکر سیاست سے متعلق رہے ہیں، کم از کم بالواسطہ طور پر۔ ایسا ہونا لابدی تھا۔ یہ کیوں کر ہوسکتا ہے کہ آپ انسانوں کے ہست و بود کے بنیادی مسائل کے بارے میں ایک رائے دیں اور اس رائے کے عملی مضمرات اپنا ظہور نہ کریں۔ یہ بات آج بھی اتنی ہی درست ہے جتنی آج سے ہزار سال پہلے تھی۔ یہ اور بات ہے کہ آج کے آدمی کو یہ پتا ہی نہیں کہ اس کے گرد و پیش جو سوالات جنم لے رہے ہیں اور جو جوابات و دلائل دیے جا رہے ہیں، وہ انھی پرانے الٰہیاتی مسائل و مباحث کا پرتو ہیں۔ مثال کے طور پر جبر و قدر یا تقدیر کے مسئلے کو لیجیے جس پر علمِ کلام کے مکاتبِ فکر کے مابین سب سے زیادہ اختلاف رائے ہوتا رہا ہے۔ یہ مسئلہ عیسوی تہذیب کے لیے بھی اہم رہا ہے اور آج کے لادینی سیکولر مغربی معاشرے میں بھی اسی طرح زندہ ہے۔ فرق یہ پڑا ہے کہ اب اس مسئلے کو اللہ تعالیٰ کے حوالے سے دیکھا نہیں جاتا۔ مثال کے طور پر کتنے ہی معاصر اہلِ علم ایسے ہیں جو فطرت یا تربیت (Nature versus Nurture) کے مباحثے میں سرگرمی سے شامل ہیں۔ ان میں

ماہرینِ نفسیات بھی ہیں، فلسفی بھی، سیاسی مفکر بھی اور ماہرینِ سماجیات و حیاتیات بھی۔ بنیادی سوال سیدھا سادہ ہے کہ انسانی نشو ونما اس کی فطرت و سرشت سے متعین ہوتی ہے یا انسان تعلیم و تربیت کے ذریعے خود کو بڑی حد تک بدل سکتا ہے؟ اس سوال کا اطلاق بہت سی جگہ ہوتا ہے، لہٰذا آج کل مغربی دنیا میں اس سوال سے جنم لینے والے نکات پر گرما گرم بحث چھڑی ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ مرد اور عورت میں جو فرق ہے، کیا وہ محض حیاتیاتی ہے، یعنی کیا ان میں فرق صرف یہ ہے کہ عورت اولاد پیدا کرتی ہے، مرد نہیں کرسکتا یا ان دونوں اصناف کی ذہنی صلاحیتوں میں بھی فرق پایا جاتا ہے؟ یا ایک اور میدان کی مثال لیجیے۔ سوال کیا گیا ہے کہ جنسی رجحانات پیدایشی اور خلقی طور پر انسان میں موجود ہوتے ہیں یا معاشرے سے ان کی تعمیر ہوتی ہے۔ کچھ لوگ ایک بات کے قائل ہوئے ہیں تو کچھ دوسرے موقف کے حق میں ہو گئے ہیں۔ جس سرگرمی اور زور شور سے ان مباحث پر دلائل کا انبار لگایا جا رہا ہے، اس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ جدید دانشوروں کے لیے بھی الٰہیاتی اور کلامی مباحث کا جوش و جذبہ کوئی اجنبی چیز نہیں۔ یہ بات اپنی جگہ بالکل بجا ہے کہ ان مباحث پر مختلف مفکرین نے جو موقف قائم کیے ہیں اور جو دلائل دیے، ہیں وہ بہت سے عناصر سے مرکب اور بہت دقیق نوعیت کے ہیں، لیکن یہی کیفیت علم کلام کے پرانے ماہرین کی بھی تھی۔ ان کے ہاں بھی علمی موشگافی، دلائل کی شستگی اور باریک بینی کا یہی عالم تھا۔ ''فطرت یا تربیت'' کی طرح ''جبر و قدر'' بھی ایک سہولت کا راستہ تھا جس کے ذریعے یہ مفکرین ہستیِ انسانی کے سب سے بنیادی معمے اور مسئلے تک رسائی حاصل کرتے تھے۔

اسلام کے اوائل میں علم کلام اس لیے ایک ضرورت بن گیا تھا کہ کچھ لوگوں کی افتادِ طبع اور فکری تقاضوں کی تکمیل اس کے سوا ممکن نہ تھی، نیز اس عہد میں اسلامی معاشرے کے سماجی اور سیاسی حالات بھی اسی کا تقاضا کرتے تھے، تاہم علم کلام کو ہر کس و ناکس کے لیے موضوعِ مطالعہ بنانے کی کسی نے بھی حمایت نہیں کی۔ یہ ایک نامناسب عمل سمجھا جاتا تھا۔ بہت سے علما نے تو اسے قرآن و سنت کے خلاف قرار دے دیا ہے، یا کم از کم اتنا ضرور کہا کہ بنا کسی صحیح اور موزوں علمی تیاری کے اس میں الجھنا خطرناک ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر امام غزالی نے اپنی بعض کتب میں علمِ کلام پر سخت تنقید کی ہے، (اگرچہ علمِ کلام پر خود ان کی کتنی ہی تصانیف ہیں)۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ عوام کی اکثریت اگر ماہرین علمِ کلام کی نکتہ چینی اور ضرورت سے زیادہ عقلیت زدہ طرزِ فکر سے بچ کر رہے تو یہ اس کے حق میں زیادہ بہتر ہوگا۔ کلام سے ان کے ایمان کو تقویت تو کیا ملے گی، ضعفِ ایمان البتہ لاحق ہو جائے گا، لیکن یہ کوئی

ایسی دلیل نہیں ہے جس سے علمِ کلام کو سرے سے نابود کر دیا جاتا۔ امام غزالی کا منشا یہ تھا بھی نہیں۔ ہاں بے جا تجسس اور زیادہ مین میکھ نکالنے کے خلاف یہ دلیل دی جا سکتی تھی۔ رسولِ خداؐ نے فرمایا تھا کہ ”اِنَّ مِنْ حُسن اسلام المرءُ ان یترك مالا یعنیه“[۸۶] (انسان کے لیے اسلام کا حسن یہ بھی ہے کہ ہر وہ چیز چھوڑ دے جو اس کے لیے لایعنی ہے)۔ آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ ''اَللّٰھُم اَعُوذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا یَنْفَعُ''[۸۷] (میں اللہ کی پناہ میں آتا ہوں اس علم سے جس کا کوئی فائدہ نہ ہو)۔ علمِ نافع وہ ہے جو انسان کو اپنے رب کے روبرو جانے کے لیے تیار کر دے۔ علمِ کلام ایسی کوئی ضمانت نہیں دے سکتا۔

ماہرینِ علمِ کلام کا دعویٰ یہ ہے کہ علمِ کلام ایک اہم چیز ہے، کیونکہ اس سے اسلامی عقائد کے بارے میں صحیح تعلیمات کی حفاظت ہوتی ہے اور ان میں باطل نظریات کی آمیزش نہیں ہو پاتی۔ لوگوں کو اگر اللہ تعالیٰ کے بارے میں صحیح علم اور درست فہم میسر نہیں ہوگا تو وہ ٹھیک سے اس کی عبادت نہیں کر سکیں گے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بندۂ خدا ہونے کی حیثیت سے ان پر جو فرض عائد ہوتا ہے، اسے ادا کرنے سے قاصر رہ جائیں گے۔ اسلام میں ایمان کی بنیاد توحید پر اٹھائی گئی ہے اور ہم یہ عرض کر چکے ہیں کہ قرآن میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر بات سے درگذر کی گنجایش ہے سوائے شرک کے، لیکن ''توحید' کے اصل معنی کیا ہیں اور شرک کیا ہے؟ اگر ہمیں قرآنی تعلیمات کا مضبوط فہم حاصل نہ ہو تو ہم توحید اور شرک کے مابین امتیاز نہیں کر پائیں گے اور نتیجے میں اگلے جہان میں تباہی سے دوچار ہو جائیں گے۔

ماہرینِ علمِ کلام کے نقطۂ نظر سے دیکھیے تو علمِ کلام سب علوم میں سے اہم ترین ہے، کیونکہ یہی وہ یقینی اور مستند طریقہ ہے جس سے ایمانِ صحیح استوار ہوتا ہے۔ اگر ایمان نہ ہو تو ہر عمل بے نتیجہ رہ جاتا ہے۔ ایمان کے بغیر اسلام آدمی کی نجات کے لیے کافی نہیں ہے، تاہم علمِ کلام کو اتنی زیادہ اہمیت دینے کی گنجایش صرف اس صورت میں تسلیم کی جا سکتی ہے، اگر ہم یہ مان کر چلیں کہ اس کے سوا ایمان کے اخلاص اور بقا کا اور کوئی راستہ نہیں۔ ماہرینِ علمِ کلام کو یہی بات سچی لگتی ہے، لیکن فلسفی، صوفیہ اور بہت سے فقہا اسے نہیں مانتے۔ پھر یہ بھی ہے کہ متکلمین، یعنی علمِ کلام والے مسلمانوں میں گنتی کے چند لوگ تھے۔ خلفا اور سلاطین پر کچھ ادوار میں وہ اثر انداز بھی ہوتے رہے اور ان کی آرا سے بسا اوقات بڑے بڑے سیاسی نتائج بھی مرتب ہوئے، لیکن عوام کی اکثریت کے ایمان و عمل پر ان کی آرا کا کچھ ایسا اثر نہیں پڑا۔

پہلی اور دوسری صدی ہجری میں اگرچہ وہ مسائل اہم رہے تھے جن پر ماہرینِ علمِ کلام بحث

کرتے تھے، لیکن معتزلہ سے قبل مفکرین کا کوئی ایسا اہم اور دوسروں سے الگ طبقہ نامزد کرنا مشکل ہے جسے ہم متکلمین کا عنوان دے سکیں۔ معتزلہ کا آغاز دوسری / آٹھویں صدی کے اوائل سے ہوتا ہے۔ معتزلہ کی شناخت یا امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ وہ قرآن کے دفاع اور اس کی تفسیر کے لیے اس بات پر غیر معمولی زور دیتے تھے کہ ہر معاملے کا تجزیہ اور فیصلہ عقل کے ذریعے ہونا چاہیے۔ اگر قرآن کی کوئی آیت منطقی فکر کے خلاف پڑتی ہو تو اس کی تفسیر اس انداز میں کرنا چاہیے جس سے واضح ہو جائے کہ قرآن اور عقل کی منطق میں کوئی تضاد نہیں۔

بغداد کی خلافتِ عباسیہ کے ابتدائی دور میں بہت سے اسباب کی بنا پر معتزلہ کو عروج حاصل ہوا۔ یہ اسباب سیاسی بھی تھے، لیکن ان کا زمانہ زیادہ دیر چلا نہیں اور بالآخر ایک اور مکتبِ فکر غالب آ گیا جو اشاعرہ کے نام سے معروف ہوا۔ اس کے بانی ابوالحسن الاشعری تھے (م ۳۲۴ھ/ ۹۳۵ء)۔ اشاعرہ کا مکتبِ فکر گویا اسی پرانے موقف کی جانب واپسی سے عبارت تھا جو وحی کی حاکمیت اور عقل کی محدودیت کے اعتراف پر مبنی تھا۔ معتزلہ کو اس بات پر ناز تھا کہ عقل کے ہتھیار سے انھیں وہ قدرت حاصل ہوئی ہے جو ہر شے کا فہم حاصل کر سکتی ہے۔ اس ضمن میں ان پر یونانی فلسفیانہ فکر کے گہرے اثرات تھے (گو انھیں اس امر کے تسلیم کرنے میں عار محسوس ہوتا تھا)۔ اس کے برعکس اشاعرہ کے ہاں عقل کی حدود اور اس کی نارسائی کا کھل کر اعتراف کیا جاتا تھا۔

ان مباحث میں ابھرنے والے پیچیدہ دلائل کو قدرے سہل کر کے پیش کرنے کی غرض سے ہم مسئلہ خلقِ قرآن کی مثال لیتے ہیں۔ یہ مبحث ایک اور بنیادی الٰہیاتی مسئلے سے جڑا ہوا ہے۔ وہ مسئلہ یہ تھا کہ صفاتِ خداوندی اور ذاتِ خداوندی کے مابین اصل میں کیا تعلق ہے؟ معتزلہ کا انحصار عقلی اندازِ فہم اور قوانینِ منطق پر تھا۔ سوان کا اصرار تھا کہ جواب لازماً دوٹوک ہونا چاہیے، نفی میں یا اثبات میں۔ یا تو ذات اور صفات ایک ہی ہیں یا صفاتِ خداوندی اللہ کی ذات سے الگ ہیں۔ منطق کے لیے یہ قبول کرنا محال ہے کہ ایک شے بیک وقت کسی دوسری شے کی عین بھی ہو اور اس سے الگ بھی ہو۔ ان کی رائے میں ذات اور صفات ایک ہی چیز تھیں۔ اگلا قدم یہ تھا کہ چونکہ قرآن اللہ کی ذات سے الگ ہے، لہٰذا قرآن مخلوق ہے۔

ان کے برعکس اشاعرہ کا کہنا یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کو انسانی منطق کی تنگنا کا اسیر نہیں کیا جا سکتا۔ ہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ جس طرح ہم اس دنیا کی چیزوں کا فہم حاصل کرتے ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ کو بھی

سمجھ سکتے ہیں۔مخلوقات کے لیے تو نفی/اثبات کا کلیہ چل سکتا ہے،لیکن غیر مخلوق کے لیے یہ قاعدہ لازماً کارآمد نہیں ہوتا،کیونکہ اس کا تعلق حقیقت کے ایک سراسر مختلف درجے سے ہے۔مآلِ کار اشاعرہ نے ایک ایسا قاعدہ وضع کر لیا جو ارسطو کے قوانینِ منطق کو توڑ کر آگے بڑھتا ہے۔''صفاتِ خداوندی نہ تو ذاتِ خداوندی ہیں نہ اس سے الگ۔'' قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اور کلامِ خداوندی،جس حد تک اس کی ذات کا عین ہے اسی حد تک قرآن غیر مخلوق ہوگا،اسی لیے اشاعرہ کا موقف خلقِ قرآن کے خلاف تھا،تاہم انھیں اس بات سے انکار نہیں تھا کہ جس حد تک قرآن تحریر میں آتا ہے یا انسانوں کی زبان پر جاری ہوتا ہے،اس حد تک اسے مخلوق کہا جائے گا۔

صفاتِ خداوندی کے بارے میں اشاعرہ کا پیش کردہ یہ قاعدہ اس تصور کا ایک ابتدائی اظہار ہے جو ہم اپنی کتاب میں شروع سے بیان کرتے آئے ہیں،خدا بیک وقت مخلوق سے مشابہ بھی ہے اور اس سے جداگانہ بھی،منزہ بھی ہے اور مشابہ بھی۔اشاعرہ کا بیان ان بہت سی عبارات اور طریقوں میں سے ایک ہے جن کے ذریعے تنزیہ اور تشبیہ کا ایک ایسا امتزاج وجود میں لایا جا سکتا ہے جو اپنے ظاہر میں تضاد کا شکار معلوم ہوتا ہے۔[۸۸]

تصوفِ نظری Theoretical Sufism

تصوف کی فکری اور عقلی نوعیت پر گفتگو کرنے کے لیے اتنا یاد کر لینا کافی ہوگا کہ تصوف کا ہدف ہے اشیا کے باطن پر نظر کرنا (صوفیہ کے نقطۂ نظر پر ہم اس کتاب کے حصہ سوم میں بحث کریں گے)۔ اہلِ تصوف کو اس امر کا احساس تھا کہ صرف شرعی احکام،یا ایمان مع شرعی احکام اس بات کے لیے کافی نہیں ہیں کہ لوگ رسولِ خداؐ کی سنت کی کامل طور پر پیروی کر سکیں۔یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص شرعی احکام پر عمل تو کر رہا ہو،مگر اپنی کسی ذاتی غرض کے لیے بغیر اللہ پر ایمان رکھے ہوئے۔اسی طرح اس بات کا بھی امکان ہے ایک شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہو،مگر نہ ایمان میں مخلص ہو،نہ اس میں وہ اوصاف بیدار ہوئے ہوں جو اسے صاحبِ عجز و انکسار،بامروت،خیر اور رحمت و محبت کا نمونہ بنا سکتے ہوں۔صوفیہ کی کوشش یہ رہی کہ انسان کے داخل کی ان خصوصیات کی نشوونما کی جائے،ان اوصاف کو جِلا دی جائے جن کی وجہ سے ایمان و عمل ہر دو کو درجۂ کمال حاصل ہوتا ہے۔یہ اوصاف عملِ صالح اور فکرِ صحیح کی تہ میں موجود تو ضرور ہوتے ہیں،مگر ان کو فی الواقع بیدار کرنے کی ضرورت رہتی ہے۔ان کے نقطۂ نظر سے یہ داخلی رویے اور صفاتِ حمیدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ تھے۔مختصر یہ کہ صوفیہ کی آرزو یہ رہی ہے کہ وہ نہ صرف رسولِ خداؐ کی طرح عمل کریں (اسلام)،نہ صرف آپؐ کی طرح سوچیں (ایمان)،

بلکہ آپؐ کی طرح اپنے آپ میں اور ہر شے میں اللہ کے دستِ قدرت کی کارفرمائی کا شعور بھی حاصل کریں (احسان، ذکر) اور اس کے مطابق عمل کریں۔ ابتدائی صوفیانہ تحریروں میں اخلاقِ حسنہ کے حصول کو مرکز بنایا جاتا تھا۔ صدق و اخلاص کیوں کر حاصل ہوتا ہے؟ انسان اپنے عمل کو ایسا کیوں کر بنا سکتا ہے گویا وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہو؟ انکسار کیوں کر پیدا ہو جب نفس سے مسلسل ایک پکار اٹھتی رہتی ہو کہ ''میں تو اس سے بہتر ہوں۔'' ہم یہ کیوں کر یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ہماری ساری جدوجہد اللہ کی بندگی کے لیے ہے اور ہم ہوا و ہوس کے پھندے میں نہیں پھنسے ہوئے؟ اللہ پر مکمل بھروسا اور توکل کیوں کر نصیب ہو جب کہ دو وقت کی روٹی بھی ایک مسئلہ بنی ہوئی ہو؟

اہلِ تصوف کی طرف سے جو اوّلین کتب تصنیف کی گئیں، ان میں عموماً دین کے تین اصولوں پر براہ راست کلام نہیں کیا گیا تھا، بلکہ یہ بتانے کی کوشش کی گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ سے ایک درست اور سچا تعلق استوار کرنے کے لیے ان تین اصولوں کی کیا حیثیت ہے۔ امام غزالی (م ۵۰۵ھ/۱۱۱۱ء) کے زمانے تک آتے آتے البتہ کچھ صوفیہ نے توحید، نبوّت اور معاد کے موضوعات پر ایک ایسے انداز میں لکھنا شروع کر دیا تھا جو ماہرینِ علمِ کلام اور فلاسفہ دونوں کے طرزِ تصنیف اور نقطۂ نظر سے اپنی ایک الگ شناخت رکھتا تھا۔ امام غزالی کے بارے میں اکثر کہا جاتا ہے کہ ان کا بڑا کام یہ ہے کہ انھوں نے تصوف کو ان حلقوں اور ان طبقوں کے لیے بھی محترم اور قابلِ قبول بنا دیا جو اس کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ انھوں نے چند چھوٹے چھوٹے رسالے توحید اور دیگر مباحثِ ایمان کے بارے میں بھی لکھے، لیکن ان کی توجہ بنیادی طور پر اس امر پر مرکوز تھی کہ انسان کے ان داخلی کمالات کو وضاحت سے بیان کیا جائے جن کی نشوونما ایک ضروری تقاضا ہے اور انھی سے انسان صحیح معنوں میں رسولِ خداؐ کی سنت کے مطابق زندگی گذارنے کے قابل ہوتا ہے۔

امام غزالی کا نام محمد الغزالی تھا۔ ان کے ایک چھوٹے بھائی تھے جن کا نام احمد تھا (م ۵۲۰ھ/۱۱۲۶ء)۔ احمد غزالی نے عشقِ الٰہی پر جو کتاب (عربی میں نہیں، بلکہ فارسی میں) لکھی، وہ تصوف کی شاہکار کتب میں شمار ہوتی ہے۔ اس کتاب سے صدیوں پر پھیلی ہوئی ایک طویل روایت کا آغاز ہوتا ہے جس کا خاصہ یہ تھا کہ یہاں توحید پر غور و فکر تقریباً ہمیشہ ہی عشق کے باطنی حال و واردات کے حوالے سے ہوتا تھا وہ عشق جو خود اللہ ہے۔

احمد غزالی کے ایک شاگرد اور مرید عین القضاۃ ہمدانی (م ۵۲۵ھ/۱۱۳۱ء) نے حقیقت کے تمام

مدارج میں عشق کی بنیادی حیثیت کو بیان کرنے کے لیے مسلمان فلسفیوں کی زبان اور طرزِ اظہار کو استعمال کیا۔ ایمان کے تین اصولوں کا جو تفصیلی بیان ان کے ہاں ملتا ہے، اسے اصولِ ایمان کے موضوع پر اہلِ تصوف کا اوّلین اظہارِ خیال قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس سے پہلے یہ میدان زیادہ تر علمِ کلام کے ماہرین اور فلاسفہ کے ہاتھ میں رہا تھا۔

عرفانِ نظری یا تصوف کے نظریاتی، علمی پہلوؤں پر کلام کرنے والے لوگوں میں سب سے بڑی شخصیت ابنِ عربی کی ہے۔ وہ ۵۶۰ھ/۱۱۶۵ء میں اندلس، موجودہ سپین میں پیدا ہوئے۔ ۶۳۸ھ/۱۲۴۰ء میں دمشق میں اُن کا انتقال ہوا۔ ان کی تصانیف بہت ہیں جن میں انھوں نے ایمان کے تینوں اصولوں کے ہر ہر پہلو پر ایسی باریک بینی، ذہانت اور دوررس بصیرت سے بحث کی ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ اس ضمن میں شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ گذشتہ چھے سو سال کے عرصے میں، قرآن اور رسولِ خداؐ کو چھوڑ کر، کوئی اور شخص اللہ کے بارے میں مسلمانوں کے طرزِ فکر پر ان سے بڑھ کر اثر انداز نہیں ہوا۔ اِدھر کے سو سالوں میں بہت سے مسلمانوں نے ابنِ عربی کی میراثِ فکر کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا تھا اور فکر کے دوسرے دھاروں پر زیادہ توجہ دینے لگے تھے، تاہم ابنِ عربی کے اثرات آج بھی بہت مضبوط ہیں اور اب جب کہ مغربی عقلیت پرستی، مابعد جدیدیت کے عہد میں آ کر، چرمرا کر ٹوٹ پھوٹ رہی ہے، بہت کم مسلمان اس قابل رہ گئے ہیں کہ علمِ کلام کے عقلیاتی طرزِ تفکر کو زیادہ سائنٹی فک یا جدید تر کہ کر اس کا سہارا لیں اور اسے ابنِ عربی اور ان کے پیروکاروں کے طرزِ فکر پر ترجیح دیں۔

کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ بہت سی تحریکیں جن کو ''بنیاد پرستی'' کے عنوان سے جانا جاتا ہے، اب صوفی اندازِ فکر کو اپنانے کا آغاز کر رہی ہیں۔ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ بنیاد پرست حضرات جس حد تک بھی (علمِ فقہ کے مقابلے میں) اسلام کی فکری روایت کا سہارا لیتے ہیں، ان میں ان کا مرکزِ نگاہ علمِ کلام ہی ہوتا ہے، بلکہ علمِ کلام کے بھی وہ رجحانات انھیں اپنی طرف کھینچتے ہیں جن پر عقلیت پرستی غالب رہی ہے۔ بنیاد پرستی میں تو از خود کشف اور فلسفیانہ فکر کی تردید شامل ہے، یہی نہیں ان کے ہاں اسلامی روایت کے بڑے مفکرین اور اہلِ حکمت و دانش کی بھی کوئی جگہ نہیں ہے، اس کے ساتھ ساتھ اکثر بنیاد پرست تحریکوں کی مغرب کی سائنسی عقلیت پرستی سے خوب نبھتی ہے، انھیں یہ البتہ محسوس ہوتا ہے کہ مغرب نے اخلاقیات کو مرکزی حیثیت نہ دے کر عقلیت کی راہ سے غداری کا ارتکاب کیا ہے۔ یہ بات ان کے تصور ہی سے باہر ہے کہ عقلیت پرستی اور اخلاقیات سے آزادی ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔[۸۹]

فلسفہ

مسلم فلسفے کی نشو ونما بھی علمِ کلام کے ساتھ ساتھ ہوئی ہے۔ یہ دونوں طرزِ فکر اپنے ذخیرۂ اصطلاحات کے بڑے حصے کے لیے یونانی فکری ورثے کے مرہونِ منت ہیں۔ عقلی بحث وتمحیص ان کے طرزِ فکر میں جو اہم کردار ادا کرتی ہے، اس کی اصل بھی یونانی فلسفے کے اثرات میں تلاش کی جا سکتی ہے۔ علمِ کلام کے ماہرین کے ہاں مرکزی حیثیت قرآن کو اور عقائدِ اسلامی کے اس فہم کو دی جاتی تھی جو علمِ کلام سے جلا حاصل کرتا ہو، جب کہ فلسفیوں کے ہاں مرکزی حیثیت عقل اور یونان کی میراثِ فکر کو دی جاتی تھی۔

بحیثیتِ عمومی مسلم فلاسفہ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ عقل کے وسیلے سے کی گئی تلاش وجستجو حقیقت کی ماہیت کو جاننے کے لیے کافی ہے۔ اہلِ کلام اپنی آرا کی تائید اور تقویت کے لیے مسلسل قرآن سے رجوع کرتے تھے، جب کہ ابتدائی مسلم فلسفی یہ رجحان رکھتے تھے کہ قرآنی حوالے دیے بغیر مشاہدہ، استدلال اور منطقی فکر کے سہارے زیرِ غور بحث کو واضح کیا جائے۔ مزید برآں فلاسفہ کو اس بات پر بھی فخر تھا کہ وہ یونان کی فکری روایت سے آگاہی رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں ارسطو کو ''معلمِ اوّل'' کہا جاتا تھا اور کئی ایسی باتیں تسلیم کی جاتی تھیں جن تک یونانی فلسفی اپنے فکری سفر میں پہنچے تھے۔ ان کے برعکس علمِ کلام والے اس امر کے اعتراف سے کنّی کتراتے تھے کہ ان کے ہاں بھی یونانی فلسفے کی چھوٹ پڑتی ہے۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ خود قرآن مجید نے اپنے پیغام کو سمجھنے کے لیے عقل کو ایک بنیادی وسیلہ قرار دیا ہے اور یہ راستہ اسی کا مقرر کیا ہوا ہے۔

ماہرینِ علمِ کلام کے مباحث کا ہدف اگر ذات اور صفاتِ خداوندی تھا تو فلسفیوں نے خود حقیقت کو اپنی فکری سرگرمی کا مرکز بنایا تھا، یعنی یہ تلاش کہ حقیقت کیا ہے، تاہم اتنا کہنا لازم ہے کہ مسلم فلسفہ جس شکل میں بھی پروان چڑھا، اس کی تہ میں ''توحید'' کارفرما رہی۔ تمام مباحث کی بنیاد توحید پر تھی۔ فلسفیوں کے ہاں سب سے زیادہ عام بحث ''وجود'' کی رہی ہے۔ اس کا انگریزی میں ترجمہ being یا existence کے الفاظ سے کیا جائے گا۔ عملاً ان میں سے سب کے ہاں اس بات پر اتفاق پایا جاتا ہے کہ ''وجود'' کو کئی اقسام میں بانٹا جا سکتا ہے۔ وجود اپنی خالص اور منزہ صورت میں ''ہویتِ محض'' (pure "is-ness") ہے۔ وہ جس کا نہ ہونا محال ہے۔ یہ وہی وجود ہے جس کی طرف انبیا نے ''خدا'' کہ کر اشارہ کیا ہے۔ وجود کی اور بھی صورتیں ہیں جو آنی جانی ہیں۔ ظاہر ہوتی ہیں اور مٹ جاتی ہیں۔ وجودِ اصل کے مقابلے میں وجود کی یہ دوسری صورتیں جن میں وجود ظاہر ہوتا ہے، اپنی کوئی الگ حقیقت

نہیں رکھتیں۔ ان کے ہونے کا تمام انحصار ''وجود'' پر ہے۔ وجود کی یہی صورتیں ہمیں کائنات میں ہر طرف ملتی ہیں: موجودات، مخلوقات۔

اسلامی فلسفے میں الفارابی (م ۳۳۹ھ/۹۵۰ء) کو ''معلمِ ثانی'' کا نام دیا گیا ہے، اگرچہ اس سے قبل بھی کئی اہم فلسفی گذرے ہیں۔ ان میں الکندی (م ۲۵۲ھ/۸۶۶ء) قابل ذکر ہے، لیکن ابن سینا (م ۴۲۸ھ/۱۰۳۷ء) کو ساری اسلامی تاریخ کا نہ سہی، تو بھی ابتدائی عہد کا عظیم ترین فلسفی کہا جا سکتا ہے۔ اس کے ہاتھوں یونان کی فکری روایت اسلام کی آغوش میں اپنے عروج کو پہنچی۔ وہ صرف ایک بڑا فلسفی ہی نہیں تھا۔ فلسفے کے علاوہ وہ تاریخ کے عظیم ترین ماہرینِ طب میں بھی شمار ہوتا ہے۔ علمِ طب کے عملی اور علمی دونوں پہلوؤں پر اس کا کام ایسا ہی شاندار تھا۔ اس کی تصانیف میں کئی کتابیں جلد ہی لاطینی میں ترجمہ ہو گئیں اور ابھی کچھ عرصہ پہلے تک اسے مغربی دنیا میں بھی ایک عظیم فلسفی اور طبیب کے طور پر جانا جاتا تھا۔

ابن سینا کے ہاں حکمتِ ایمانی اور حکمتِ یونانی کا ایک ماہرانہ اور شاہکار امتزاج ملتا ہے اور اس میں جو جامعیت ابن سینا نے پیدا کی، وہ ان کا کارنامہ تھا، تاہم بہت سے اہلِ کلام اور صوفیہ کی رائے یہ رہی ہے کہ ابن سینا کے نظریات پر یونانی افکار اور یونانی اصطلاحات کا بوجھ کچھ زیادہ لدا ہوا ہے۔ آج کے نقطۂ نظر سے دیکھیے تو کہا جا سکتا ہے کہ اکثر مسلمانوں کے ذوق کے لیے ابن سینا ذرا زیادہ ہی کتابی اور علمیت زدہ ہو گئے تھے۔ وہ لوگ یہ چاہتے تھے کہ حکمتِ اسلامی کو اسلامی اصطلاحات میں بیان کیا جائے اور اس کا مطلب یہ تھا کہ قرآن اور سنت کو ہر چیز سے بالاتر اور محترم رکھا جائے۔ اگر کہیں ایسی صورتِ حال پیدا ہو کہ قرآن مجید کا کہا ہوا ارسطو کے بتائے ہوئے سے ٹکرا جائے تو ہم میں اتنی جرأت ہونا چاہیے کہ صاف کہہ دیں کہ ارسطو نے غلط کہا تھا۔

امام غزالی نے ابن سینا کے فلسفے پر مؤثر اعتراضات کی ایک مہم چلائی۔ ایسا ہی ایک دوسرا مجموعۂ اعتراضات اس کے تقریباً سو سال بعد فخر الدین رازی (م ۶۰۶ھ/۱۲۰۹ء) نے پیش کیا۔ امام رازی ان آخری ماہرین کلام میں سے تھے جن کے ہاں تمام فکری سرگرمی علمِ کلام کے تناظر تک محدود نظر آتی ہے۔ اسی دور میں کچھ اور فکری رجحانات اور سوچ کے کچھ اور دھارے بھی نمودار ہو رہے تھے۔ ہم گذشتہ سطور میں عرض کر چکے ہیں کہ غزالی برادران نے ایمان کے تین اصولوں کو تصوف کی زبان میں بیان کرنے کا آغاز کر دیا تھا۔ اس کام میں اور لوگ بھی ان کی پیروی کر رہے تھے۔ صوفیہ کے سرخیل

ابن عربی، امام رازی کے معاصر تھے، بلکہ دونوں میں بعض مباحث پر خط و کتابت بھی رہی۔ ابن عربی کو البتہ امام رازی کے طرزِ فکر سے بالکل اتفاق نہیں تھا۔ ان کے خیال میں امام رازی عقل پر حد سے زیادہ بھروسہ کرنے لگے تھے اور کشفِ حقائق ان کے بس سے باہر تھا۔

ادھر خود اقلیمِ فلسفہ کے اندر شہاب الدین سہروردی نے ایک نئے تناظر کا در باز کر دیا تھا۔ سہروردی ۳۸ سال کی عمر میں اسیری کے دوران ۵۸۷ھ/۱۱۹۱ء میں فوت ہوئے۔ یہ مردِ دانا اور مفکر ایک عجیب، غیر معمولی شخصیت کا حامل تھا۔ اس نے ابن سینا کا سارا نظامِ فکر لے کر اسے ایک نئی سمت اور تازہ اسلوب میں از سرِ نو مرتب کر دیا اور کشفِ حقائق کے عمل پر خاص زور دیا جسے ابن سینا نے اتنی اہمیت نہیں دی تھی۔ سہروردی نے اس ''فلسفۂ اشراق'' میں یونانیوں کی فکرِ استدلالی اور قدیم حکمائے فارس کے طریقِ کشفِ حقائق کو یکجا کر کے ایک جامع کُل کے طور پر پیش کیا۔ ان کے مطابق قدیم حکمائے ایران کے دل نورِ خداوندی کی قبولیت کا ملکہ رکھتے تھے اور اس کی ضیا سے روشن ہو چکے تھے۔ سہروردی کا کہنا یہ تھا کہ ان کا پیش کردہ جامع امتزاج ہی وحیِ اسلام کی پوری معنویت کو آشکار کر سکتا ہے، کیونکہ وحی کو سمجھنے کے لیے عقل و منطق اور کشفِ حقائق ہر دو کی ضرورت ہوتی ہے۔

سہروردی کے افکار کئی اعتبار سے ابن عربی سے مشابہت رکھتے ہیں، تاہم سہروردی کی رائے میں فلسفیانہ روایت سے فکر و استدلال کی جو تربیت ملتی ہے، وہ عقلی اور روحانی کمال کے حصوں کے لیے ایک لازمی تقاضا ہے۔ اس کے برعکس ابن عربی کا کہنا یہ تھا کہ سچے اربابِ دانش ان صداقتوں کو تسلیم کرتے ہیں جن کا ادراک عقل سے کیا جا سکتا ہے، لیکن ذہنی جستجو اور فکری موشگافیاں فی نفسہ ایک رکاوٹ ہیں جن سے ہمیں کوئی مدد حاصل نہیں ہوتی۔ کشفِ حقائق ہی وہ راستہ ہے جو انبیا کا راستہ تھا اور جو ان کے سچے پیروکاروں کا راستہ ہے۔

اسلامی فلسفے کو سہروردی نے جو کچھ دیا، اس میں سب سے مشہور نظریہ وہ ہے جسے ان کی ''مابعد الطبیعیاتِ نور'' کہا جاتا ہے۔ عام فلسفیوں کے برعکس سہروردی نے ایک فلسفیانہ موقف کے طور پر ''وجود'' کو تمام اشیا کی حقیقتِ غائی اور بنیادِ پنہاں ہونے کے لحاظ سے موضوعِ بحث نہیں بنایا۔ اس کے بجائے ان کے ہاں آخری اور حتمی حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے ''نور'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ نور کا عقلی تجزیہ بھی کیا جا سکتا ہے اور دوسری طرف یہ بھی ہے کہ صوفیہ کے ہاں بہت پہلے سے یہی لفظ اس حقیقت کے لیے استعمال ہوتا آیا تھا جس کا ادراک انھیں کشف کے ذریعے ہوا تھا، نیز یہ کہ

قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ایک نام ''النور'' بھی آیا ہے۔ دوسری طرف زرتشتی اساطیر میں نور کا ایک بڑا کردار رہا ہے اور سہروردی نے اس کی جانب اکثر اشارہ بھی کیا ہے۔

سہروردی کے بعد جو مسلمان فلسفی آئے، ان کی فکری بنیاد وسیع تر تھی۔ وہ ابن سینا، سہروردی اور اہلِ کلام میں سے متعدد لوگوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ اپنے فلسفیانہ مباحث میں ان فلسفیوں نے اکثر کشف کو بھی ایک وسیلے کے طور پر برتا اور ان کے ہاں ابن عربی کے افکار سے آگاہی حاصل کرنے کا رجحان نظر آتا ہے، کیونکہ ابن عربی کی تصانیف کو اصولِ ایمان کے بارے میں نظری تعلیمات کا ایک عظیم الشان خزینہ اور سرچشمہ سمجھا جاتا تھا۔ بعض اسلامی ممالک بالخصوص ایران میں فلسفے کی اس روایت کا تسلسل ہمیں عہدِ حاضر تک نظر آتا ہے۔

متاخرین فلاسفہ میں سب سے بڑا فلسفی شاید ملا صدرا شیرازی (م ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۱ء) کو کہا جا سکتا ہے۔ ملا صدرا کی شہرت ان کی جامعیت کی وجہ سے ہے کہ ان کے ہاں فکرِ اسلامی کے تمام دھارے مل کر ایک قالب میں ڈھل جاتے ہیں۔ جن اصطلاحات میں ملاّ صدرا نے اپنے افکار پیش کیے ہیں، ان پر البتہ ابن سینا کے فلسفے کا غلبہ ہے۔ وحی کے بارے میں لکھتے ہوئے ملاّ صدرا نے نہ صرف قرآن و حدیث کو بہت غور سے دیکھا ہے، بلکہ اہلِ تشیع کے ائمہ کے اقوال پر بھی توجہ دی ہے۔ ابن عربی اور ان کے پیروکاروں نے کشفِ حقائق کی بنیاد پر جو نظری توضیحات پیش کی تھیں، ان کو بھی ملاّ صدرا نے نظر میں رکھا۔ ان سب کے علاوہ ملا صدرا نے زندگی کا بڑا حصہ تصوف کے عملی مراحل طے کرنے میں صرف کیا اور اپنی نظری تعلیمات کو اپنی کشفی معلومات کی معنویت واضح کرنے کے لیے استعمال کیا۔

ملاّ صدرا کے ہاں تینوں اندازِ فکر، تینوں اسالیبِ فہم کو ملا کر علم حاصل کرنے کا عمل اپنے نقطۂ تکمیل کو پہنچ جاتا ہے اور یوں اصولِ ایمان (توحید، نبوّت، آخرت) کو سمجھنے کا ایک جامع راستہ وجود میں آتا ہے۔ ان کے ہاں اسلام کے ہر طرزِ فکر اور ہر راہِ تفہیم کا احترام اور استعمال پایا جاتا ہے اور وہ ان میں سے ہر ایک کو، توحید کو سمجھنے اور جاننے کا، ایک درست اور قابلِ عمل راستہ گردانتے ہیں۔ ہمارے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے پیشرو مفکرین کی ہر بات کو بے چون و چرا مانتے چلے جاتے ہیں، ہرگز نہیں۔ اپنے اسلوبِ کلام اور اپنے افکار کے طرزِ اظہار میں اوّل و آخر وہ فلسفے کی روایت کے ایک نمایندے کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ بنابریں ان کے ہاں سب سے پہلے ہر علمی معاملے کو، ہر نکتے کو میزانِ عقل میں تولا جاتا ہے۔ اہلِ کلام کے، فلسفیوں کے اور صوفیہ کے کتنے ہی خیالات اور آرا

پر ملاّ صدرا نے تنقید کی ہے، جب کہ بہت سے موقف قبول بھی کر لیے ہیں، لیکن تب جب عقلی دلائل کے بنیاد پر ان کی صحت کو واضح کر لیا۔ ان کا طرزِ تفکر اگرچہ پوری طرح عقلیاتی ہے، تاہم اس کے ساتھ ساتھ ان کی قوتِ فکر کو کشف کی روشنی اور وحیِ قرآنی کے نور سے بھی جلا ملی ہے۔

فہم وادراک کے قطبین The Two Poles of Understanding

ہم نے عرض کیا تھا کہ کلام، عرفانِ نظری اور فلسفہ، بالترتیب، وحی، کشف اور عقل پر زور دیتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی ہم نے اس امر کی جانب بھی اشارہ کیا تھا کہ ہر مکتبِ فکر میں بات کو سمجھنے کے دوسرے دونوں طریقے، دیگر اسالیبِ فہم بھی ایک کردار ادا کر سکتے ہیں اور کرتے رہے ہیں۔

یہاں یہ نکتہ اہم ہے کہ حصولِ علم کے ان اسالیب کے مختلف ہونے کا مطلب اچھی طرح سمجھ لیا جائے ورنہ امکان رہے گا کہ ہم ان اسالیب کو ایک دوسرے کی ضد تصور کرنے لگیں گے، جب کہ دراصل یہ معاملہ ہے کسی بات کو سمجھنے، اس کی تہ تک پہنچنے کے تین انسانی اسالیب کا، تین طرز ہائے فہم کا جو ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ وہ لوگ جن کی افتادِ طبع عقلیت کی طرف مائل ہوئی ہے، وہ قدرتی طور پر ان میں سے ایک یا ایک سے زیادہ اسلوب کی طرف کھنچتے ہیں۔ یہ تینوں مکاتبِ فکر ارکانِ ایمان کو جاننے اور سمجھنے کی انسانی صلاحیت کے تین اظہار ہیں اور ان میں اس صلاحیت کی سماجی اور منظّم تجسیم ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔

اسلام میں علم حاصل کرنے یا فہم انسانی کے ان تین اسالیب یا تین مکاتب فکر کی مثال جدید دنیا میں علم کے بارے میں پائے جانے والے نقطۂ ہائے نظر میں بھی تلاش کی جا سکتی ہے۔ یہاں بھی لوگ فطری طور پر فلسفے، یا مثال کے طور پر سائنس یا فنون کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ اسلام کے حوالے سے دیکھیے تو اس کے تینوں اسالیبِ فہم، ایمان اور توحید میں اپنی بنیاد رکھتے ہیں، جب کہ دنیائے جدید میں ان تینوں اسالیب کو مشترکہ اصولوں کی کوئی ایسی بنیاد میسر نہیں ہے، (البتہ یہ کہا جا سکتا ہے اصولوں کا فقدان ہی ان کا مشترکہ اصول ہے)۔

چونکہ توحید اسلامی فکریات کی مشترک اساس اور موضوع ہے، لہٰذا اس کے حوالے سے فہمِ انسانی کے مختلف اسالیب کی درجہ بندی کی جا سکتی ہے۔ بالفاظِ دیگر اگر ہمارے سامنے توحید کے فہم کے تین انداز، تین طریقے ہوں تو ہم یہ امتیاز کر سکتے ہیں کہ بہ اعتبار توحید ان میں فرق کیا گیا ہے، انھیں ایک دوسرے سے کیسے الگ پہچانا جا سکتا ہے۔

ہم یہ پڑھ چکے ہیں کہ تقاضائے توحید یہ ہے کہ حقیقت کے بارے میں دو ایسے تناظر سامنے آئیں گے جو ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہوں۔ ان کو ''تنزیہ'' اور ''تشبیہ'' کہا جاتا ہے۔ سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ ان دونوں کے مابین پورا توازن رکھا جائے، تاہم، ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ انسانی نشو ونما کے ابتدائی مراحل میں ''تنزیہ'' کو کسی حد تک ایک حقِ ترجیح حاصل ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ تنزیہ سے اللہ تعالیٰ کی عظمت اور بڑائی اور انسانوں کا چھوٹا پن پوری طرح کھل جاتا ہے یا یوں کہیے کہ الحق کا حقیقی ہونا اور بے حقیقت کا بے حقیقی ہونا واضح ہو جاتا ہے۔ اس سے انسان کا اپنے رب سے صحیح رشتہ استوار ہوتا ہے۔ اسی سے ان کو سمجھ آتا ہے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں اور انھیں بندوں ہی کی طرح عمل کرنا چاہیے۔ اسی سے انھیں اس بات کا ادراک ہوتا ہے کہ اسلام ان کے لیے لازم ہے۔ انھیں کھل کر اپنی ناقص سرشت و نہاد کا اعتراف کرنا چاہیے اور اس کی تہذیب و اصلاح کے لیے اس ہدایت ِ ربّانی کی پیروی کرنا چاہیے جو انبیا کے ذریعے ان تک پہنچی ہے۔

انسانی نشو ونما کے ابتدائی مراحل میں تشبیہ کا سرے سے انکار ہونا چاہیے یا کم از کم اسے پس منظر میں رہنا چاہیے۔ تنزیہ سے اگر انسانی اور ربّانی کے مابین فرق کا احساس اجاگر ہوتا ہے تو تشبیہ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ انسان میں کچھ خدائی چیزیں بھی ہیں، تاہم اللہ تعالیٰ سے یہ مشابہت، یہ خدا آسا ہونا ابتدا میں ہمارے لیے کوئی مدد فراہم نہیں کرتا۔ یہ دعویٰ تو کیچڑ، مچھر اور زہریلے پودے بھی کر سکتے ہیں۔

اگر الحق سے مشابہت کا کوئی فائدہ ہے تو اس کو اسی انداز میں قائم ہونا چاہیے جو الحق کی منشا ہے۔ بالفاظِ دیگر انسان کو اس کے فہم میں لازماً انبیا کی پیروی کرنا چاہیے اور اس مشابہت کو اسی انداز میں سمجھنا چاہیے جس انداز میں الحق کے پیغامبروں نے اسے سمجھا تھا۔ اس فہم تک رسائی کے لیے انسان کو اللہ کی ہدایت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ انسان کو یوں یک لخت اپنی بارگاہ میں، اپنے حضور نہیں بلا لیتے۔ اس کے لیے انسان کو پہلے اپنے ارادہ و اختیار سے اس کا بندہ بن کے دکھانا ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوتا ہے کہ انسان اس کے قرب میں داخل ہو اور اس کائنات میں اس کی نمایندگی کرے۔ خلافت کا دار و مدار عبودیت اور بندگی پر ہے اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ تشبیہ کے درست ادراک کا انحصار تنزیہ کے صحیح فہم پر ہے۔

اگر انسان ہونے کے دو مختلف، لیکن ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے اسالیب، یعنی بندگی اور خلافت کو تنزیہ و تشبیہ کے حوالے سے بیان کیا جا سکتا ہے تو فہمِ انسانی کے دو مختلف، مگر تکمیلی اطوار کو،

انسانی سمجھ کے دو مختلف، مگر ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے طریقوں کو بھی انھی کے حوالے سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ تنزیہ کو سمجھنے کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے دور ہونے، انسان سے الگ اور جدا ہونے، منزہ و برتر ہونے اور انسان کی رسائی سے باہر، ماورا ہونے کو سمجھنا۔ تشبیہ کو سمجھنے کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قریب ہونے، مشابہ ہونے، ہر جا اور ہر آن حاضر ہونے اور پہنچ کے اندر ہونے کو سمجھنا۔ پہلے نقطۂ نظر سے دیکھیے تو زور ہوگا غیریت پر، دوسرے اعتبار سے دیکھیے تو مشابہت پر زیادہ زور دیا جائے گا۔

وہ مسلمان مفکرین جنھوں نے ان دو اسالیبِ فہم کا تجزیہ کیا ہے، تنزیہ کو عقل سے منسوب کرتے ہیں، جب کہ ان کی رائے کے مطابق کشف اور خیال کا تشبیہ سے ایک قریبی تعلق ہے۔ اس نکتے کی قدرے وضاحت درکار ہے، لیکن ایک مرتبہ اسے سمجھ لیا جائے تو یہ دیکھنا آسان ہو جائے گا کہ اسلامی تہذیب کے اندر ہر اسلوبِ فکر نے کیوں کر دوسرے اسالیبِ فہم پر تنقید کرنے یا اس کی آرا اور نتائجِ فکر کا رد کرنے کے باوجود توحید پر توجہ مرکوز کیے رکھی۔ مزید براں معاملے کو اس رخ سے دیکھنے سے شاید ہم یہ بھی سمجھ سکیں کہ مغربی تہذیب میں اس طرح کے متوازی نقطۂ نظر کیوں پائے جاتے ہیں اور آرٹ اور سائنس، اساطیر اور عقلیت، باطنیت اور منطق یا وجدان اور فکرِ استدلالی کی راہیں الگ الگ کیوں ہو جاتی ہیں۔

تنزیہ کا مطلب ہے کہ الحق کو بطور ''غیر'' کے، بطور ایک ماورا و جداگانہ ہستی کے سمجھا جائے۔ اس سے انسان اس امر کا اثبات کرتا ہے کہ وہ ایک چیز ہے اور خدا کچھ اور ہستی ہے جو انسان سے بالا و ماورا اور الگ ہے۔ عقلِ جزوی فہم کا وہ طریقِ کار ہے جو حقیقت کو تجزیے کے ذریعے توڑ توڑ کر اور الگ الگ کر کے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ عقلِ جزوی سے سمجھنے کے لیے ہم اصولِ استثنا قائم کرتے ہیں، یعنی یہ کہ ایک چیز یا تو یہ ہوگی یا وہ۔ بیک وقت دونوں نہیں ہو سکتی۔ یہ سیدھا سا منطقی قاعدہ ہے اور منطق ہی میں عقلِ جزوی کی خلقی خاصیت ظاہر ہوتی ہے۔

جب انسان الحق کو عقلِ جزوی کی مدد سے سمجھنے کی سعی کرتے ہیں تو اختلاف اور جداگانہ حیثیت، یعنی تنزیہ کا اصول کارفرما ہوتا ہے کیونکہ عقلِ جزوی صرف اسی ایک انداز سے حقیقت کو دیکھ سکتی ہے۔ عقل اپنے گردوپیش کے مظاہر پر نظر کرتی ہے اور اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان مظاہر سے مختلف ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کی جھلک عقلِ جزوی کو بھی کسی حد تک ہر شے میں نظر آتی ہے، لیکن یہ ان صفات کو اشیا سے جدا کر کے دیکھتی ہے۔ مثال کے طور پر عقلِ جزوی کے تناظر میں یہ تو دیکھا جاتا ہے کہ رحمت ایک صفتِ خداوندی ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ ایک ماں اپنے بچے سے جو تعلق رکھتی ہے اس

میں یہی صفتِ رحمت ظاہر ہو رہی ہے، لیکن یہاں آ کر وہ رحمت کو ماں سے الگ کر کے اسے ''مجرد'' بنا دیتی ہے۔ مجرد کرنے یا ''تجرید'' کا مطلب ہے: ''دور کر دینا، الگ نکال لینا۔'' عقل کے تمام کاموں، اس کے طریقِ کار کا خاصہ یہی تجرید ہے۔ عقل تمام صفات کو ان اشیا سے الگ کر لیتی ہے جن میں یہ صفات ظہور پذیر ہوئی ہوتی ہیں اور علمِ کلام کے نقطۂ نظر کے مطابق، ان کو دور، ماورا بنا کر اللہ تعالیٰ کی ذات میں موجود بتاتی ہے۔ اس کا حاصل کیا ہوتا ہے، مختلف ہونا جدا گانہ ہونا، دوری اور فاصلہ، یعنی تنزیہ۔

عملی اعتبار سے دیکھیے تو یہ نظر آئے گا کہ عقلِ جزوی کی کارفرمائی کا نتیجہ فطری طور پر یہ ہوتا ہے کہ اختلاف اور تجزیہ کاری پر زیادہ زور دیا جانے لگتا ہے۔ چیزوں کو ایک دوسرے سے اور اللہ تعالیٰ سے الگ کر کے، جدا کر کے دیکھنے کے عمل میں عقل کثرت اور تعدد پر مرکوز رہتی ہے۔ ریاضی انسان کو الگ اور جدا جدا چیزوں سے معاملہ کرنے کا وسیلہ فراہم کرتی ہے۔ اس لحاظ سے ریاضی عقلِ جزوی کا بہترین آلہ ہے، تاہم ہوتا یہ ہے کہ انسان مختلف ہونے پر جتنی زیادہ توجہ مرکوز کرتا ہے، اسی قدر انسانی کاوشیں اور معاملات ایک دوسرے سے جدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔

انسان اگر صرف اللہ کی تنزیہ، اس کے ماورا اور مختلف ہونے اور اس کائنات کا غیر ہونے پر ہی سوچتا رہے تو انجامِ کار یہ کائنات اس کے لیے وحدت اور یکتائی سے دور کی چیز معلوم ہونے لگے گی کہ وحدت اور یکتائی اللہ کی صفات ہیں۔ اگر آپ اللہ کے بعید ہونے، ماورا ہونے پر ہی زور دیتے چلے جائیں گے تو آپ کے پاس ایک ایسی کائنات رہ جائے گی جس کا اللہ سے کسی طرح کا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ اس کا صرف ایک مطلب ہے کہ انسان کے پاس اللہ کا تصور تک باقی نہ رہے اور وہ دہریہ یا لاادری ہو جانے کو ایک منطقی چیز جاننے لگے۔

خدا کے دور ہونے پر ایک سرے سے متواتر زور دیتے جایئے تو ایک نقطہ وہ آ جاتا ہے جب اللہ کو مرکز بنا کر سوچنا ایک کارِ بے مصرف بن کر رہ جاتا ہے، لیکن خدا کے تصور کے بغیر، ایک حتمی مرکز، الحق، الواحد، الاحد کے تصور کے بغیر، انسان کے پاس کوئی راستہ نہیں جو اسے یہ دکھا سکے کہ یہ کائنات کس طرح مربوط ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ انسانی علم اور انسان کا عمل زیادہ سے زیادہ منتشر اور ہم آہنگی سے محروم تر ہوتے چلے جائیں گے۔ جدید مغربی دنیا کی مثال ہمارے سامنے ہے جو گذشتہ کئی صدیوں سے عقلِ جزوی کی اندھا دھند پیروی میں لگی ہوئی ہے۔ سنجیدہ علمی مباحث کی دنیا سے خدا کو کب کا ملک بدر کیا جا چکا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں وحدت پیدا کرنے کا کوئی اصول نہیں ہے، گو کتنے ہی

سائنس دان اور فلسفی ایسے کسی اصول کی تلاش میں اپنی کوششیں صرف کر رہے ہیں۔ سائنس اور علم کے مختلف شعبوں میں زیادہ سے زیادہ اختصاص آتا جارہا ہے، اور وہ اپنے اپنے طور پر محدود تر ہوتے جارہے ہیں اور ان کی باہمی بے تعلقی میں اضافہ ہو رہا ہے۔

علم کی اِس بڑھتی ہوئی ژولیدگی کو اگر دیکھنا ہو تو اس کا سب سے صاف نمونہ بے حدوحساب پھیلتے ہوئے طغیانِ معلومات اور اطلاعات میں عیاں نظر آتا ہے جس کا نہ کوئی اختتام ہے نہ انجام۔ انسانوں کے درمیان ابلاغ کا رشتہ دشوار تر ہوتا جارہا ہے، کیونکہ ہر شخص کی سمجھ بوجھ، اس کی فہم اپنی بساط بھر معلومات ہی کو گرفت میں لاسکتی ہے اور معلومات کی تفصیلات کا انبار اتنا ہے کہ انسان اس کے چھوٹے سے حصے کو بھی بمشکل جذب کر پاتے ہیں۔ کسی کو یہ سمجھ نہیں آتا کہ یہ ساری سائنسی معلومات جو اکٹھی کی جاچکی ہیں اور مسلسل کی جارہی ہیں، ان کا باہمی ربط کیا ہے۔ علم کے وہ شعبے جنھیں کبھی چھوٹا سمجھا جاتا تھا، ان کے بھی مزید ذیلی شعبے بنتے جارہے ہیں اور ان کی معنوی یک رنگی ختم ہوتی جارہی ہے۔ سائنسی تعلیم اور یونی ورسٹی کی تدریس کی سطح پر اس کا نتیجہ ہے بڑھتی ہوئی اختصاصیت، کسی محدود سے شعبے میں کوئی خاص مہارت۔ ہر شعبے کا اپنا میدان ہے اور اس میں مہارت رکھنے والے لوگ ہیں، لیکن مختلف میدانوں کے ماہرین ایک دوسرے سے قطعاً الگ زبان بولتے ہیں اور ایک دوسرے کی بات نہ سمجھ سکتے ہیں نہ سمجھا سکتے ہیں۔

سائنس دان کے معنی اب محض ''ماہرِ طبیعیات'' کے نہیں رہے بلکہ ''ذراتی طبیعیات''، ''کائناتی طبیعیات'' یا کسی اور نوع کی طبیعیات کے ماہرین بھی اس میں شامل ہوگئے ہیں۔ طبیعیات کے ہر ذیلی شعبے میں معلومات کا روز بروز بڑھتا ہوا ایک ڈھیر ہے اور ہر شعبے کے ماہر کو اس سے باخبر رہنے کے لیے اپنے شعبے کی تنگنائے علم کے بیسیوں مجلّات کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ دوسرے شعبوں کے ماہرینِ طبیعیات سے تبادلۂ خیال کرنا مشکل تر ہوتا جارہا ہے، گو ایک عام آدمی کی نظر میں یہ سب لوگ ایک ہی میدان میں کام کر رہے ہیں۔ یاد رہے کہ بات ابھی طبیعیات سے آگے نہیں بڑھی۔ حیاتیات، ارضیات، یا دیگر ٹھیٹھ سائنسی علوم کا ابھی ذکر نہیں آیا۔ پھر عصب شناسی (نیوروسائنس) کا کیا ہوگا جس میں ماہرین ہمیں یہ بتارہے ہیں کہ ''ریسرچ کی وہ کثرت ہے کہ یہ شعبۂ علم چاہِ بابل بن گیا ہے۔''[۹۰] اور پھر سماجی علوم کے بارے میں کیا کہا جائے گا اور علومِ انسانی کے مختلف شعبوں کا معاملہ کیا ہوگا؟ اور تو اور فلسفے کے میدان میں بھی کیفیت یہی ہے جس کے بارے میں ہر انجان شخص یہ گمان رکھتا

ہے کہ کم از کم یہاں تو ذی عقل حیوانِ ناطق ایک دوسرے کی بات سمجھنے کے قابل ہوں گے، ان میں بامعنی مکالمہ ہوتا ہوگا، لیکن حالت یہ ہے کہ یہاں بھی شدید ترین اختلافِ رائے اور بے تحاشا لڑائی جھگڑے پائے جاتے ہیں، لہٰذا حیرت نہیں ہوتی جب ہم اپنے معاصرین کی طرف سے یہ تبصرہ سنتے ہیں کہ جدید فکری زندگی کی شناخت اگر کسی چیز سے ہوتی ہے تو وہ ہے جزویت، انتشار اور ٹوٹ پھوٹ۔

انسانی عمل کی سطح پر دیکھیے تو ایسے کرچی کرچی علم کا لامحالہ نتیجہ یہ ہوگا ہے کہ لوگ باگ معاشرے میں جو کچھ کریں گے، وہ ایک دوسرے کی ضد ہوگا۔ ایسے میں سماج کا تانا بانا بکھرنے لگتا ہے، گروہ در گروہ چھوٹے چھوٹے ذیلی معاشرے بنتے چلے جاتے ہیں اور ہر گروہ اپنے آپ کو جوڑنے کے لیے محدود مطمحِ نظر اور تنگ سے تنگ فکری آدرش اپنانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

جدید لوگوں کے لیے یہ بہت مشکل ہے کہ کشف کی نوعیت کو سمجھ سکیں، کیونکہ ہمارے تمدن میں عقلِ جزوی اور عقلیت پر اتنا زیادہ زور دیا گیا ہے کہ ہر دوسری چیز اس کے مقابلے میں ماند پڑ گئی ہے۔ کشف کے لیے جو لفظ انگریزی میں استعمال ہوتا ہے یعنی (unveiling)، اس کا تجزیہ اس کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے معاون ہوگا۔ Veil (حجاب یا پردہ) وہ چیز ہے جو الگ کرے، جدا کردے، وہ چیز جو دیکھنے اور سمجھنے میں روک بن جائے۔ پردہ یا حجاب ایک کپڑے کا لٹکا ہوا ٹکڑا بھی ہو سکتا ہے اور دیوار، جھاڑی، بادل کا ٹکڑا، چہرے کا تاثر یا شبِ تاریک بھی۔ حجاب انسانی بدن کا بھی ہو سکتا ہے جو نفسِ انسانی کو دیکھنے میں آڑ بن جاتا ہے۔ تاریکی بھی ایک پردہ ہے، کیونکہ تاریکی فقدانِ نور ہے۔ حجاب جہالت کا بھی ہوتا ہے، کیونکہ جہالت ذہن کی تاریکی ہے۔ رعونت، تکبر، رشک وحسد، لالچ اور سو دوسری برائیاں ایسی ہیں جو نفس کو سکیڑ کر اتنا تنگ بنا دیتی ہیں کہ اُس کے لیے اپنی حدود سے آگے دیکھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

نور خود ایک حجاب بن سکتا ہے۔ افراطِ نور کا اثر بھی وہی ہوتا ہے جو فقدانِ نور کا، آنکھ چکاچوند ہو جاتی ہے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ وضاحتِ بیاں ہر اس شخص کے اوپر سے گذر جائے گی جس کی فہم اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ اسلامی نقطۂ نظر سے یہی اس نکتے کی توضیح ہے کہ قرآن مجید مبیّن ترین اور کھلی ہوئی روشنی ہونے کے باوجود انسان کی گرفت میں نہیں آتا۔ انجیلِ یوحنا کے الفاظ میں ''تاریکی میں نور فروزاں ہوتا ہے، مگر تاریکی کو نور کا ادراک نہیں ہوتا۔'' خلاصہ یہ کہ حجاب یا پردہ وہ شے ہے جو ہمیں اپنے علاوہ ہر دوسری شے سے الگ کردے، وہ جو ہر دوسری شے کے فہم میں مانع ہو جائے۔

unveiling یا کشف (کھولنے، پردہ ہٹانے) کا مطلب ہے اس دوری، علیحدگی کو ختم کر دیا جائے جو نظر کے لیے روک اور فہم کے لیے رکاوٹ بنی ہوئی ہے، یعنی دو چیزوں کے درمیان، میرے اور میرے غیر کے درمیان جو فرق اور اختلاف ہے، اس پر کسی حد تک اور کسی نہ کسی طور غالب آیا جائے۔ وسیلۂ علم کے طور پر، علم حاصل کرنے کے لیے ایک ڈھب کے طور پر کشف جب کارفرما ہوتا ہے تو یہ اشیا کو توڑ کر، جدا کر کے نہیں دیکھتا، انھیں ایک دوسرے سے جوڑ کر ملا کر دیکھتا ہے۔ اس کی خاصیت ہے اشیا کی وحدت، کلیّت، یکسانیت، مشابہت اور عینیت کو دیکھنا۔ کشف اس امر کا ادراک کرتا ہے کہ ہر شے اللہ کی ایک نشانی ہے اور اسی کی حقیقت کے ظہور کی علامت ہے۔ اس چیز کا ادراک اسے استدلالی، فکری اور مجرد انداز میں نہیں، بلکہ بلاواسطہ اور براہ راست ہوتا ہے۔ اشیا عالم خارجی کی ہوں یا عالمِ باطنی کی، کشف جب ان پر نظر کرتا ہے تو اس بات کا ادراک کر لیتا ہے کہ ہر شے کی بقا کا انحصار اللہ تعالیٰ ہی پر ہے۔

کشف (unveiling) کا لفظ ایک خاص نوعیت کے ادراک اور فہم کے لیے استعمال ہوتا ہے جس کا دارومدار سراسر اس بات پر ہے کہ انسان نے کس حد تک خود کو انبیا کے راستے کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ قاعدہ یہی ہے کہ کشف صرف پختہ ایمان رکھنے والے ان لوگوں کو میسر ہوتا ہے جو شریعت کی پوری احتیاط سے پابندی کرتے ہیں اور اپنے صدق و اخلاص کی نشو ونما ایک خاص نہج پر کرتے ہیں (اس خاص طریقے یا نہج پر گفتگو کتاب کے تیسرے حصے میں ہوگی)۔

اس سلسلے میں ایک اور لفظ بھی قابلِ توجہ ہے۔ اس کا مفہوم ''کشف'' سے وسیع تر ہے اور اس سے فہم و ادراک کی ہر اس نوع کی جانب اشارہ کیا جاتا ہے جس سے عینیت یا دوسری شے سے یکسانیت و ہم آہنگی پیدا ہوتی ہو۔ ادراک کا یہ انداز انبیا کے ماننے والوں اور ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی حاصل ہوتا ہے، نیز اس کے لیے ضروری نہیں کہ اس کے ساتھ حضورِ الٰہی (Presence of God) کا ادراک بھی نصیب ہو جائے، یہ لفظ ہے ''خیال'' (imagination)۔ اس کے بارے میں کافی گفتگو ہو چکی ہے۔ اس وقت ہم جس نکتے پر بات کر رہے ہیں، اس کے حوالے سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ خیال کے بارے میں ہم جو کچھ جانتے ہیں، وہ عقلِ جزوی اور کشف دونوں اسالیبِ فہم میں فرق اور امتیاز قائم کرنے میں ہماری مدد کر رہا ہے۔

ہم نے عرض کیا تھا کہ خیال کا تعلق ابہام کی دنیا سے ہے، نیمے دروں نیمے بروں، ہر دو اطراف

کے زیرِ اثر۔ کسی چیز کی شبیہ نہ تو خود وہ چیز ہوتی ہے نہ اس چیز سے یکسر الگ کوئی شے۔ علمِ کائنات کے حوالے سے بات کیجیے تو یہ کہا جائے گا کہ خیال ہر اس چیز کو کہا جا سکتا ہے جو نہ تو پوری طرح مرئی ہو نہ سرے سے اوجھل، جو نہ خالص نور ہو، نہ محض مٹی، جو نہ صرف روح ہو، اور نہ فقط بدن۔ اسلامی نفسیات کے تناظر میں ''خیال'' کی اصطلاح کا اطلاق نفس پر کیا جا سکتا ہے جو نہ صرف بدن ہے اور نہ فقط روح، بلکہ ان دونوں کے درمیان کی ایک چیز ہے۔

جس سیاق و سباق میں ہم گفتگو کر رہے ہیں، اس میں ''خیال'' کا لفظ فہم کے ایک ایسے ڈھب اور جاننے کے ایک ایسے اسلوب کی طرف اشارہ کرتا ہے جس سے یکسانیت اور مشابہت کا ادراک ہوتا ہے۔ یکسانیت اور عینیت کا مطلب ہے دونوں اطراف کو ملا دینا۔ خیال کا کام ہے شبیہ و عکس کو دیکھنا۔ آئینہ خیال میں جو شبیہ نمودار ہوتی ہے، اس میں دو چیزیں ملی ہوئی ہوتی ہیں، شبیہ کو دیکھنے والی ہستی اور جو چیز اپنا عکس یا شبیہ پیدا کر رہی ہے۔ شبیہ میں ہر دو یکجا ہو جاتی ہیں، چنانچہ آئینے میں ابھرنے والی شبیہ، آئینے اور منعکس ہونے والی شے دونوں سے مل کر بنتی ہے، اسی طرح خواب میں آنے والی شبیہ بھی نفسِ انسانی اور اس شے کا مرکب ہوتی ہے جو خواب میں نظر آ رہی ہوتی ہے۔

دینی اصطلاح یا الٰہیاتی اسلوب میں کہیے تو ادراکِ خیالی کا تعلق بنتا ہے تشبیہ سے۔ کشف (unveiling) کا خاصہ ہے کہ وہ اشیا کو ان سے مناسبت رکھنے والی شبیہوں ہی میں دیکھتا ہے، لہٰذا کشف سے اللہ تعالیٰ کے کائنات اور نفسِ انسانی میں ہر جا اور ہر آن ہونے کا ادراک ہوتا ہے۔ اس کے برعکس عقل یہ واضح کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ غیب میں ہے۔ نگاہِ خیال جانتی ہے کہ یہ نشانیاں، آیاتِ خداوندی اسی ''سے'' ہیں چاہے عقل ہمیں بتایا کرے کہ یہ آیات اس ''کی'' نشانیاں ہیں۔ جب عقل قرآن کی آیت ''فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ'' (۲:۱۱۵) (جدھر بھی رخ کروں وہیں روئے خداوندی ہے) سنتی ہے تو بہت سی ایسی تاویلیں گھڑ کے ہمارے سامنے پیش کر دیتی ہے جو یہ بتاتی ہے کہ قرآن کا مطلب وہ نہیں جو کہا جا رہا ہے۔ خدا کا چہرہ نہیں ہے، خدا کو دیکھا نہیں جا سکتا اور خدا تو دراصل ہم سے بہت دور ہے، لیکن کشف جدھر رخ کرتا ہے، ادھر چہرۂ خداوندی ہی دیکھتا ہے۔ جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے۔ کشف جانتا ہے اللہ تعالیٰ فی الواقع یہاں بھی ہے اور وہاں بھی، ہر جا، ہر آن، حاضر و ناظر۔

انسان کی عملی زندگی کے وسیع میدان کو لیجیے تو ''خیال'' وہ اسلوبِ فہم ہے جو شگاف پُر کرتا ہے اور یکسانیت اور عینیت کا ادراک کرتا ہے جب کہ عقلِ جزوی مختلف ہونے کا ادراک کرتی ہے۔ ''خیال''

کے وسیلے سے سمجھنے کی سب سے واضح مثال شاعری، موسیقی اور فنونِ لطیفہ میں نظر آتی ہے۔ شعرا اور فنکار ان چیزوں میں بھی ربط و تعلق دیکھ لیتے ہیں جہاں ہمیں آپ کو صرف اختلاف نظر آتا ہے۔ شعری تماثیل کا انحصار بالعموم ایک لطیف نوعیت کی عینیت اور یکسانیت کے ادراک پر ہوتا ہے جو عقلِ جزوی خود سے کبھی دریافت نہیں کر سکتی۔ جس حد تک ہماری قوتِ متخیلہ زندہ ہوگی، صحیح و سالم ہوگی اسی حد تک اس میں اشیا کے درمیان اس یکسانی اور اندرونی ہم آہنگی کا احساس قوی ہوگا خواہ عقلِ جزوی اسے یہ بتایا کرے کہ اس دنیا کی چیزیں حقیقت میں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔

عقل کا کام ہے تنزیہ کو سمجھنا اور تنزیہ کے بغیر نہ کوئی سرافگندگی (islam) اسلام ہے نہ عبد و معبود اور یہ اگر نہ ہو تو نہ ''تشبیہ'' رہے گی نہ خلیفۃ اللہ، جب کہ خیال سے تشبیہ کے متحقق ہونے کی گنجایش پیدا ہوتی ہے۔ خیال کے اسلوبِ فہم ہی کا کرشمہ ہے کہ قرآن مجید مسلمانوں کے رگ و ریشے اور جسم و جان میں سرایت کر جاتا ہے۔ عقل کو اللہ تعالیٰ اور قرآن مجید دور اور ماورا دکھائی دیتے ہیں، جب کہ خیال انھیں انسان کے قریب پاتا ہے۔ عقل کا اصرار ہے کہ خدا سے ایک فاصلہ رکھا جائے جب کہ خیال اسے اپنی آغوش میں لینا چاہتا ہے۔ عقل ناظر اور منظور، موضوع اور معروض کو الگ الگ کرکے دیکھتی ہے، جب کہ خیال یہ سمجھتا ہے کہ شاہد ہی مشہود ہے۔

یہاں پر ہم اس نکتے پر زور دینا چاہتے ہیں کہ ان دونوں میں سے اگر کسی ایک نقطۂ نظر کو بھی فراموش کر دیا جائے تو ہم توحید کو بگاڑ دیں گے، اس کو جھٹلانے لگیں گے۔ توحید کی تردید کرنے کا مطلب ہے شرک کو ہوا دینا، یعنی اللہ کے سوا دوسری کسی شے کو اس کا شریک ٹھہرانا۔ یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ آپ صرف اتنا کہہ کر فارغ ہو جائیں کہ ''اللہ تعالیٰ بہت دور اور ماورا ہے''، نہ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ ''اللہ قریب ہے'' کا اعلان کرکے بات کو ختم کر دیں۔ دونوں نقطہ ہائے نظر کا اختلاف واضح رکھنے کے لیے ہمارے لیے ان دونوں کے درمیان الٹ پھیر کرنا لازم ہے۔ انسان کی حقیقت کا تقاضا عبودیت بھی ہے اور خلافت بھی، تنزیہ بھی ہے اور تشبیہ بھی۔ کسی ایک کو بھلا دینے کا مطلب ہے ایمان اور علم کی سالمیت کو تباہ کر دینا۔

اگر ہم صرف تنزیہ پر ہی زور دیتے چلے جائیں اور تشبیہ کو نظر انداز کر دیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ مخلوق سے خالق کے دور ہونے کا ادراک مستقل ہو جائے گا۔ اگر خدا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور ہوگا تو عملاً وہ اپنی مخلوق سے کٹ کر رہ جائے گا۔ یہ بھی ایک طرح سے وہی چیز ہے مغربی دنیا میں جسے ڈی ازم (Deism) کہا جاتا ہے اور اسلام نے اسے ''تعطیل'' کا نام دیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کو اس کے منصب سے الگ کر

دینا، اس کائنات میں اس کی کارفرمائی کو معطل کر دینا۔ جب اللہ تعالیٰ کو مستقل طور پر دور دور رکھا جائے گا تو یہ دنیا اور خاص طور پر اس میں انسانی ماحول ایک خودمختار اور آزاد حقیقت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ معاملات اگر ہمارے اختیار میں ہیں اور اگر نگرانِ اعلیٰ انسان ہے تو پھر گویا ہم اللہ کے ساتھ اپنے آپ کو شریک ٹھہرا رہے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ تنزیہ پر حد سے بڑھا ہوا زور بالآخر چھوٹے چھوٹے خداؤں کی کثرت کی شکل میں نمودار ہوتا ہے جو ہماری اس دنیا کی ترجیحات کا فیصلہ کرتے نظر آتے ہیں۔ عقل کے فطری میلان کو سامنے رکھیے تو ان خداوندانِ جدید کے نام تو مجرد ہی ہوں گے، مثلاً ''تقدم و پیش رفت''، ''اشتراکیت''، ''کمیونزم''، ''سائنس'' اور ''ترقی'' مگر وہ اپنے پجاریوں کے لیے حقیقی ہی متصور ہوں گے —— اتنے حقیقی کہ ان کے تقدس کے خلاف آواز اٹھانا بھی خطرے سے خالی نہ ہوگا۔ یہ سچ ہے کہ ان میں سے چند خداوندانِ نو کے نام پر اس تباہی کی وجہ سے حرف آ چلا ہے جو ان کی پرستش نے جدید دنیا میں پھیلا رکھی ہے، لیکن ایک دیوتا رخصت ہوتا ہے تو اس کی جگہ لینے کے لیے ایک اور جھوٹا خدا آن موجود ہوتا ہے۔

تشبیہ کو فراموش کرنے سے اگر شرک ابھرتا ہے تو اس سے کہیں زیادہ شرک اس وقت پیدا ہوتا ہے جب تنزیہ کو بھول کر صرف تشبیہ کا اثبات کیا جاتا ہے۔ تشبیہ کے تناظر میں، اس کے زاویۂ نگاہ سے ہر شے میں خدا کا پرتو ہے۔ تنزیہ سے انسان یہ سیکھتا ہے کہ اشیائے کائنات ایک دوسرے سے الگ، ممتاز اور جدا ہیں، آپس میں ہم آہنگی نہیں رکھتیں، جب کہ تشبیہ یہ بتاتی ہے کہ یہی اشیا ہم آہنگ ہیں، جڑی ہوئی ہیں اور ایک وحدت میں منسلک ہیں۔ دونوں تناظر ایک دوسرے کی اصلاح کرتے ہیں، افراط و تفریط کا امکان پیدا نہیں ہوتا۔

مثال کے طور پر دیکھیے کہ صوفیہ تشبیہ پر زور دیتے ہیں۔ ان کے ہاں اشیا کے مابین پائے جانے والے فرق کو بے اہمیت قرار دینے کا رجحان اکثر نظر آتا ہے اور وہ تمام کثرت کو اللہ تعالیٰ ہی کی جلوہ فرمائی سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں علوم و فنون کے مختلف شعبے یکساں حقائق تک لے جانے کے متعدد راستے ہیں۔ فرق و امتیاز کچھ ایسا اہم نہیں، یکسانیت اور عینیت ہی اشیا کا اصل وصف ہے اور غلبہ اسی صفتِ تشبیہ کو حاصل ہے۔

اس طرح کا صوفیانہ نقطۂ نظر اگر حد سے باہر ہو جائے تو انسان یہ بھول جاتا ہے کہ الحق اس دنیا سے مختلف اور الگ ہے۔ پھر وہ اس دنیا کو حقیقی، قابلِ قدر، اچھی اور مقصود و مطلوب سمجھنے لگتا ہے۔ دنیا

کی ہر شے الوہی اور ربّانی حیثیت اختیار کر جاتی ہے، تاہم ہر شے میں یکساں حقیقتِ خداوندی کا یہ مشاہدہ تادیر برقرار نہیں رہتا اور کچھ چیزوں کو جلد ہی جھوٹے خداؤں کی حیثیت مل جاتی ہے۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو حقیقی جاننے لگتا ہے۔ ''میں ربّانی ہوں، پرتوِ خداوندی میرے اندر ہے، میں حقیقی ہوں، اور دوسروں کو وہ حقوق حاصل نہیں ہیں جو مجھے حاصل ہیں، کیوں کہ ان کی حقیقت اتنی ہی ہے جتنی میری حقیقت سے انھیں ملی ہے۔'' یہ موقف اختیار کرنا اور پھر اس کے منطقی نتائج کی راہ پر گامزن ہونا پاگل پن کی طرف لے جاتا ہے اور یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ روایتی طور پر دیوانگی کو عقل سے پیدا ہونے والے شعورِ امتیاز سے محرومی سمجھا جاتا تھا، یعنی عقل کی گرفت کمزور ہو جائے اور خیال و تخیل بے قابو ہو کر پھیلتا چلا جائے تو اسے دیوانہ پن کہا جائے گا۔

''اللہ قریب ہے'' کے نقطۂ نظر پر اگر مسلسل زور دیا جاتا رہے تو اس سے ایک اور طرح کی منہ زور جذباتیت بھی جنم لیتی ہے جو آج کل خاص طور پر عام ہو گئی ہے۔ اس کے دعویدار ہمیں یہ بتانے چلے ہیں کہ ہر شے ایک ہے، لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہر شے اور ہر انسان سے برابر محبت کریں۔ بالفاظِ دیگر، اللہ نے ہمیں خیر و شر میں تمیز کی جو صلاحیت دی ہے، صحیح اور غلط میں جو فرق بتایا ہے اور جنت و جہنم میں جو امتیاز رکھا ہے، ان سب کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا جائے۔

عملاً یہی ہوتا ہے کہ بہت کم لوگ تشبیہ کو اس کی منطقی انتہا تک لے جاتے ہیں، کیونکہ صرف اپنے ''خیال'' میں زندہ رہنا اور عمل کرنا ایک کارِ دشوار ہے، تاہم خیال پر ضرورت سے زیادہ انحصار کرنا انسانوں کی عام خاصیت ہے اور قرآن نے اس کے لیے ''اپنی ہوا و ہوس کی پیروی کرنا'' کی اصطلاح استعمال کی ہے: ''اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ'' (دیکھا اسے جس نے اپنی خواہش کو اپنا خدا بنا رکھا ہے)۔ اس کے بارے میں ہم پہلے عرض کر چکے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ تشبیہ کے معاملے میں افراط ہو جائے تو انسان بہت سے خداؤں کا بندہ بن جاتا ہے، عقیدت اور تعلق کے کئی محور بن جاتے ہیں یا پھر اللہ کے بجائے اپنی انا کی پرستش ہونے لگتی ہے، ہر دو صورتوں میں یہ شرک ہے اور توحید سے محرومی۔ تشبیہ پر ضرورت سے زیادہ توجہ دینے کا نتیجہ بھی عملاً وہی ہوتا ہے جو صرف تنزیہ پر زور دیتے چلے جانے کا ہے۔

ہم نے عقل اور کشف (اور خیال) پر خاصی تفصیل سے گفتگو کی ہے، لیکن ہمیں وحی کو بھی فراموش نہیں کرنا ہے۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ انبیا کا بنیادی منصب ہے انسانوں کو توحید کی یاددہانی کروانا۔ جب انبیا انسان کو توحید کا سبق یاد دلاتے ہیں تو عقل کا رابطہ الحق سے استوار ہو جاتا ہے۔ جس سے وہ

یہ جان لیتی ہے کہ حقیقت فقط اللہ ہی کی ہے اور اللہ کے سوا ہر شے باطل، بے حقیقت اور نابود و ناموجود ہے۔ دوسری طرف خیال کو جب توحید کی یاد آوری کی جاتی ہے تو اس کا ربط بھی حتمی اور آخری حقیقت سے قائم ہو جاتا ہے، تاہم وہ اشیا کا باہمی فرق نہیں دیکھتا، صرف ان کی یکسانیت پر نظر رکھتا ہے۔ خیال اس امر کا اثبات کرتا ہے کہ اللہ کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ اللہ ہی سے ہے۔ ہر شے حقیقی ہے، ہر شے کچھ نہ کچھ ہے، لیکن صرف اسی حد تک جس حد تک اس میں اللہ تعالیٰ کا جلوہ (presence) موجود ہے۔ پس کلمۂ شہادت کی بنیاد پر عقل تنزیہ کی طرف جاتی ہے اور خیال تشبیہ کی جانب دیکھتا ہے۔

توحید کا آموختہ اگر میسر نہ ہو، وحی کے ذریعے اگر انسان کو یاددہانی نہ کرائی جائے تو عقل اور خیال کی قوتیں اپنی الگ الگ راہیں اپنا لیتی ہیں، کبھی ان کا عمل ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہوتا ہے، کبھی ایک دوسرے کے خلاف پڑتا ہے۔ جاننے اور سمجھنے کے ان دو طریقوں، ان دو اسالیبِ فہم سے انسان کے لیے کوئی مفر نہیں کہ یہ انسان کی ہستی میں پیوست ہیں۔ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ دونوں قوتیں مناسب اور ہم آہنگ طور پر تبھی کام کرتی ہیں جب انھیں وحی کی رہنمائی میسر ہوتی ہے۔

سلسلۂ کلام کو مذکورہ تین مکاتبِ فکر کی جانب واپس لاتے ہوئے ہم عرض کریں گے کہ ان کی مشابہت اور اختلاف، ان کے مابین فرق اور ان کے مشترک عناصر سب اس بات پر منحصر ہیں کہ ان میں سے ہر ایک توحید کے مختلف پہلوؤں پر زور دیتا ہے یا یوں کہیے کہ ان مکاتبِ فکر میں وحی، عقل اور خیال کو جو حیثیت دی جاتی ہے، اسی سے ان کی شناخت ہوتی ہے۔

علمِ کلام کی عقلیت

نظری طور پر علمِ کلام میں وحی کو مرکزی اور نمایاں ترین جگہ دی جاتی ہے، تاہم وہ لوگ جنھیں ہم ماہرینِ علمِ کلام یا متکلمین کہتے ہیں، ان کے ہاں وحی کی تفسیر و تعبیر عقل کی بنیاد پر کی جاتی ہے، چونکہ عقل فرق و امتیاز قائم کرتی ہے، لہٰذا علم کلام تنزیہ پر زور دیتا ہے۔ خدا ہر شے سے مختلف ہے، لہٰذا خدا کے بارے میں جو کچھ کہا جائے گا، اس کی شرح و تفسیر اس طرح ہونا چاہیے کہ وہ دوسری ہر شے کے بارے میں کہی ہوئی ہر بات سے الگ نظر آئے۔ خدا کو مجرد اصطلاحات میں بیان کیا جائے گا۔ اُسے مظاہر کی اس دنیا سے ہمیشہ الگ اور جدا کر کے دیکھا جائے گا اور اس سے دور رکھا جائے گا۔ علمِ کلام کی زبان اور سوچ کا انداز عموماً مجرد نوعیت کا ہوتا ہے جس کی وجہ سے اکثر لوگوں کو علمِ کلام خشک اور بیزار کن محسوس ہوتا ہے۔ کسی ایسی چیز کی بات کرنا ہو جو بنیادی طور پر فہم سے بالاتر ہو تو اس کے لیے ایسی زبان کا استعمال

لازم آتا ہے جو خود بھی سمجھنے میں آسان نہ ہو۔ اکثر لوگ کسی بھی چیز کو مجرد انداز میں نہیں دیکھتے، ٹھوس، محسوس اور سامنے کے انداز میں دیکھتے ہیں، یعنی تشبیہی انداز میں۔ علمِ کلام کے نقطۂ نظر سے تشبیہ ایک خطرناک چیز ہے کیونکہ تشبیہ یہ بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ یکسر مختلف نہیں ہے۔ ماہرینِ علمِ کلام کی نگاہ میں تشبیہ عوام میں پائی جانے والی ایک غلطی ہے جو ان لوگوں سے سرزد ہوتی ہے جو فکری تربیت سے محروم ہوں، جن کو خدا شناسی کا ملکہ حاصل نہ ہو یا جن کی عقلی صلاحیتیں کمزور ہوں۔ اللہ تعالیٰ کو حاضر و شاہد جاننا کیوں کہ خلافِ عقل ہے، لہٰذا درست نہیں۔ قرآن میں جہاں جہاں اللہ تعالیٰ کا ذکر ایسے انداز میں کیا گیا ہے جس سے اس کے قریب و حاضر ہونے کا گمان ہوتا ہے، ان مقامات کے بارے میں علمِ کلام کا اصرار یہ ہے کہ ان آیات کو اس طرح پڑھا اور سمجھا جائے کہ ان سے اللہ تعالیٰ کے غیب میں ہونے اور اس کی دوری کا احساس مستحکم ہو سکے۔

ہم نے عرض کیا تھا کہ علمِ کلام کے بنیادی مقاصد میں سے ایک اسلامی عقائد کا دفاع ہے۔ اسلامی معاشرے اور اسلامی تعلیمات کے لیے علمِ کلام کی ایک حفاظتی حیثیت ہے، لیکن چونکہ اس کا اندازِ فکر تنزیہی ہے، لہٰذا اس کی نظر میں انسان کا کردار بنیادی طور پر بندگی، اطاعت اور عبودیت کا ہے۔ اللہ تعالیٰ مالک و آقا ہے، دور فاصلے پر رہنے والا بادشاہِ کائنات اور انسان اس کا بندہ، سزائے دردناک کے خوف سے لرزاں، اس کے احکام بجالاتا ہے۔ علمِ کلام کا خدا ایسا نہیں جس سے ہر کوئی محبت کر سکے۔ اس کا خوف سب کو ہے اور اس کی عزت و احترام تو سب کرتے ہیں، مگر اس سے محبت نہیں کر سکتے۔ بعض ماہرینِ علمِ کلام نے تو یہ بھی کہا ہے کہ خالق سے محبت محال ہے۔ اس کے لیے ان کو قرآن کی اس آیت کی تاویل گھڑنا پڑی جس میں کہا گیا تھا کہ "يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ" (٥:٥٤) (وہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اس سے)۔ اپنی فکری مہارت سے انھوں نے اس آیت کو تو راستے سے ہٹا دیا لیکن نتیجہ کیا ہوا؟ اس کی جانب ابن عربی نے بہت خوبی سے اشارہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس طرح کے عقلی رویے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آپ صرف تنزیہ میں الجھ کر رہ جاتے ہیں، ایک ایسا تصورِ خدا جو اپنے بندوں سے بے انتہا دور ہے، اس لیے خوب ہوا کہ مذہبی تعلیمات صرف عقل پرست مفکرین کے ہاتھ میں نہیں رہیں۔ اگر کہیں ایسا ہو گیا ہوتا تو دنیا میں کبھی کوئی شخص اللہ سے محبت نہ کرتا۔

علمِ کلام کے بارے میں ایک بات اور آخر میں عرض کر دیں اور وہ یہ کہ بحث و نزاع علمِ کلام کا خاصہ ہے۔ ''کلام'' کے لفظ کا مطلب ہے ''بات، گفتگو''، اور اسے اکثر ''مباحثہ'' یا ''مناظرے'' کے

معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔علمِ کلام کی کتب میں پائے جانے والے مباحث کا ہدف زیادہ تر یہ رہا ہے کہ دیگر کلامی مکاتبِ فکر فلاسفہ اور دیگر فرقوں کے عقائد کا رد کیا جائے۔علم کلام کے مباحث کی ایک جھلک فراہم کرنے کے لیے ہم سطور ذیل میں اشعری مکتب فکر کے بانی ابوالحسن اشعری کی تحریر سے ایک اقتباس پیش کررہے ہیں۔[۹۱] جس میں وہ قدریہ پر تنقید کررہے ہیں جن کا عقیدہ یہ تھا کہ انسان پوری آزادیِ اختیار رکھتا ہے۔

وزعمت القدرية ان الله عزوجل يخلق الخير و الشيطان يخلق الشر وزعموا ان الله عزوجل يشاء مالا يكون ويكون مالا يشاء خلافا لما اجمع عليه المسلمون من ان ماشاء الله كان ومالم يشاء لم يكن و رد القول الله عزوجل (وما تشاؤن الا ان يشاء الله) فاخبر انا لا نشاء شيا الا و قد شاء الله ان نشاء ه ولقوله تعالىٰ (و لو شاء الله مااقتتلوا)[٧٦:٣٠] ولقوله تعالىٰ (ولو شئنا لآتينا كل نفس هداها) ولقوله تعالىٰ (فعال لمايريد) ولقوله تعالىٰ مخبرا عن شعيب انه قال (وما يكون لنا ان نعود فيها الا ان يشاء الله ربنا وسع ربنا كل شئ علما)۔

ولهذا سماهم رسول الله صلى الله عليه وسلم مجوس هذه الامةلانهم دانوا بديانة المجوس وضاهوا اقاويلهم و زعموا ان للخير والشر خالقين كما زعمت المجوس ذلك وانه يكون من الشرور ما لا يشاء الله كما قالت المجوس وانهم يملكون الضر و النفع لا نفسهم دون الله رد القول الله عزوجل لنبيه عليه السلام (قل لا املك لنفسى نفعا و لا ضرا الا ماشاء الله) [١٨٨:٧] واعراضا عن القرآن وعما اجمع عليه اهل الاسلام وزعموا انهم ينفردون بالقدرة على اعمالهم دون بالقدرة على اعمالهم دون ربهم فاثبتوا لا نفسهم الغنى عن الله عزوجل ووصفوا انفسهم بالقدرة على ما يصفون الله عزوجل بالقدرة عليه كما اثبت المجوس للشيطان من القدرة على الشر مالم يثبتوه الله عزوجل فكانوا مجوس هذه الامة اذ دانوا بد يانة المجوس و تمسكوا با قاويلهم وما لوا الى اضا ليلهم وقنطوا الناس من رحمة الله وأيسو هم من روحه و حكموا على العصاة بالناروالخلود فيها خلافا لقول اللهتعالىٰ (ويغفر مادون ذلك لمن يشاء)

قدریہ کا کہنا یہ ہے کہ خیر کو اللہ تعالیٰ نے خلق کیا جب کہ شر کو شیطان نے پیدا کیا۔انھوں نے یہ بھی فرض کررکھا ہے کہ اللہ نے جو چاہا، وہ ہو نہ سکا اور جو ہوا وہ اس کی منشا نہ تھی۔یہ اہلِ اسلام کے اجماع

کے خلاف ہے، کیونکہ (رسولِ خداؐ نے فرمایا کہ) "ماشاء اللّٰہ کان و مالم یشاء لم یکن" (جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے وہ ہو جاتا ہے اور جو اس کی منشا نہ ہو، وہ نہیں ہوتا)۔ قدریہ کے اس زعمِ باطل کا ٹکراؤ اللہ کے کلام سے بھی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ" (تم نہیں چاہو گے جب تک اللہ نہ چاہے) (۷۶:۳۰)

رسول خداؐ نے قدریہ کو اس امت کے مجوسی کہا تھا کیونکہ یہ دینِ مجوس کی پیروی کرتے ہیں اور انھی کے اقوال کی نقل کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں خیر و شر کے خالق الگ الگ ہیں۔ مجوس کا کہنا بھی یہی تھا۔ قدریہ یہ کہتے ہیں کہ شر میں سے کچھ چیزیں ایسی ہیں جو اللہ کی منشا نہیں ہیں۔ مجوسی بھی یہی کہتے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ وہ اپنے نفع و ضرر پر اللہ کے علاوہ خود بھی قدرت رکھتے ہیں۔ ان کا یہ خیال قول خداوندی کے بالکل خلاف ہے کہ "قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ" (کہو! میں اپنے نفع اور ضرر کا مالک نہیں ہوں اگر اللہ نہ چاہے) (۷:۱۸۸) — انھیں یہ زعم بھی ہے کہ وہ اپنے رب سے ہٹ کر اپنے اعمال پر خود قدرت رکھتے ہیں۔ اس طرح وہ اس دعویٰ کا اثبات کرتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے بے نیاز ہیں۔ وہ خود کو ایک ایسی چیز پر قادر جانتے ہیں جس پر قدرت کا وصف ان کے خیال میں اللہ تعالیٰ میں بھی نہیں۔ مجوسیوں کے ہاں بھی یہی خیال پایا جاتا ہے کہ شیطان کو شر پر وہ قدرت حاصل ہے جو خدا کو بھی میسر نہیں۔

فلسفے کے تجریدی افکار

اسلامی تعلیمات کے بارے میں فلسفیانہ نقطۂ نظر کئی لحاظ سے علمِ کلام سے مشابہ ہے اور کئی اعتبار سے اس میں اور علمِ کلام میں گہرے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ دونوں میں ایک بنیادی اختلاف وحی کے مسئلے پر ہے۔ فلاسفہ قرآنی وحی کی ضرورت کو بلا چون و چرا ماننے پر تیار نہیں، پھر یہ کہ قرآن اللہ کا کلام ہے یا نہیں، اس مسئلے پر بھی، ان کے نزدیک، بحث کی جانا چاہیے۔ فلسفیوں کی اکثریت مسلمان تھی اور شریعت کی پابندی کرتی تھی۔ ان میں سے اکثر نے اپنے عقلی اطمینان کی حد تک اس بات کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا تھا کہ رسالت حقائقِ ہستی میں سے ہے، تاہم رسالت کے جواز اور اس کے ضروری ہونے کا سوال اٹھانا ہی اپنی جگہ ایک ایسی جسارت تھی جس نے مسلمانوں کی اکثریت، بالخصوص ماہرینِ علمِ کلام کو مشتعل کر دیا۔ مزید برآں یہ کہ کچھ فلسفیوں کے ہاں نبوت و رسالت کی بحث کے نتیجے میں یہ کہا گیا کہ انبیا اپنی کوشش سے اس دانشِ ربّانی تک پہنچے تھے، لہٰذا دوسرے لوگ بھی اس مقام تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ ان کے ناقدین نے اس کا مطلب یہ نکالا کہ فلسفیوں کی نظر میں

نبیوں کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ وہ (فلسفی) خود نبوّت کے درجے پر فائز تھے۔

ماہرینِ علمِ کلام نے اپنے تناظر کی بنیاد وحیِ قرآنی کے بارے میں اپنے فہم پر رکھی تھی۔ اس کے برعکس فلسفی حضرات اپنے آپ کو افلاطون، ارسطو اور فلاطینوس کی یونانی فکری روایت کے امین سمجھتے تھے۔ ان کی نگاہ میں اسلام اور دانشِ یونانی کے مابین کوئی ٹکراؤ نہیں تھا جب کہ ماہرینِ علمِ کلام کی نظر اپنے دفاعی موقف پر تھی اور وہ اس رائے کو عملاً ایک گمراہی اور انحراف سمجھتے تھے۔

فلسفیوں اور ماہرینِ علمِ کلام کے درمیان قدرِ مشترک یہ تھی کہ وہ عقل اور اس کی کارفرمائی پر زور دیتے تھے۔ نظریاتی طور پر تو اکثر ماہرینِ علمِ کلام وحی کو عقل پر فوقیت دیتے تھے، لیکن عملاً ان میں سے بہت سے حضرات کا اصرار یہی تھا کہ قرآن کو پیمانۂ عقل پر پورا اترنا چاہیے۔ دوسری طرف فلسفی عملی اور نظری ہر دو اعتبار سے عقل کو سب سے بلند حیثیت دیتے تھے۔

فلسفے اور علمِ کلام کے اندازِ نظر اور اسلوبِ فہم میں یوں تو کئی فرق ہیں لیکن ان اختلافات کا اندازہ ان ثانوی علوم یا علومِ آلیہ کا جائزہ لے کر بھی کیا جا سکتا ہے جن کو یہ دونوں مکاتب اہم سمجھتے ہیں۔ ماہرینِ علمِ کلام کے ہاں بالعموم تفسیرِ قرآن، حدیث، عربی صرف ونحو اور قواعد اور فقہ پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ دوسری طرف فلاسفہ بھی اگرچہ عام طور پر یہی علوم پڑھتے تھے، لیکن ان کے ہاں خالص فلسفے سے زیادہ شغف پایا جاتا تھا جس کے تحت ماوراالطبیعیات اور منطق کے علاوہ دیگر کئی علوم شامل کر لیے جاتے تھے، مثلاً فلسفۂ طبعی یعنی طبیعیات، بصریات اور میکانکی علوم یا مثلاً ریاضی مع فلکیات اور علمِ موسیقی یا نفسیات (وہ علم جو روح، نفس اور بدن کے تعلق سے بحث کرتا ہے) اور طب۔ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ ابن سینا کو اکثر سب سے بڑا مسلمان فلسفی کہا جاتا ہے، لیکن یاد رہے کہ وہ اس کے ساتھ ساتھ اسلامی تاریخ کا عظیم ترین طبیب بھی تھا۔ الفارابی مسلمانوں کا معلمِ ثانی، فنِ موسیقی پر ایک مفصل اور ضخیم کتاب کا مصنف بھی تھا۔ نصیرالدین طوسی (م ۶۷۲ھ/۱۲۷۴ء) سارے علومِ عقلیہ کا ماہر تھا۔ وہ کلام اور عرفانِ نظری پر بھی عبور رکھتا تھا اور اس نے ابنِ سینا کے فلسفے کو ایک مرتبہ پھر سے زندہ کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ اُس کا شمار تاریخِ انسانی کے عظیم ترین ماہرینِ فلکیات اور ریاضی دانوں میں بھی ہوتا ہے۔

فلسفے میں غور وفکر، سوچ بچار کا جو پہلو ہے، یعنی اس کا نظری حصہ، اس کی ہمیشہ بہت اہمیت رہی ہے، لیکن آج کل کے بہت سے جدید فلسفیوں کے بالکل برعکس مسلمان فلسفی اپنی مابعدالطبیعیات اور علمِ کائنات کو روزمرہ کی زندگی پر بھی لاگو کرتے تھے۔ جس کی مثال یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو

اخلاقیات سے گہری دلچسپی تھی۔ ان میں سے اکثر فلاسفہ کے نزدیک اخلاقیات کا مقصد ہے تربیتِ نفس، نفس کی تہذیب، تاکہ وہ الحق سے ہم آہنگ ہو سکے اور معاد، یعنی اللہ کی جانب لوٹ جانے کے لیے تیار ہو جائے، لیکن ان کے ہاں اخلاقیات کی بحث جن اصطلاحات میں کی گئی ہے، وہ یونانی فلسفے سے ان کو ورثے میں ملی تھیں اور بنیادی طور پر قرآنی اسلوبِ بیان سے مختلف تھیں۔

فلسفیانہ طرزِ فکر میں سوچنے کا جو ایک عام تجریدی انداز تھا، اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ذرا مندرجہ ذیل اقتباس پر نظر ڈالیے۔ ابن سینا کی اس عبارت میں خیر و شر کے مسئلے پر وجود کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔ فلسفیوں کی فکر کا ایک بنیادی نکتہ یہ تھا کہ ''الوجود کے سوا کسی شے کو حقیقی وجود حاصل نہیں۔'' اس قول کا مطلب یہی ہے کہ ''الحق کے سوا اور کوئی بھی ذی حقیقت نہیں ہے۔'' اسی طرح خیرِ مطلق صرف اللہ ہی ہے، کیونکہ مذہبی زبان میں ''لا خیر الا اللہ'' (اللہ کے سوا اور کوئی خیر نہیں)۔ فلسفیوں کی زبان میں اسی ''وجود'' کو ''جو ''الحق'' اور ''الرحمٰن'' کا ہم معنی اور مصداق ہے، ''واجب الوجود'' کا نام دیا گیا ہے، کیونکہ وجودِ واجب وہ ہے جسے ہونا ہی ہے، جس کا نہ ہونا محال ہے۔ اقتباسِ ذیل میں ابن سینا یہ واضح کر رہے ہیں کہ شر تو محض خیر کے فقدان یا ''وجود'' کے غیاب کا نام ہے۔

> ہر وہ شے جو اپنے آپ سے ہے، جو وجودِ واجب ہے، وہ خیرِ محض بھی ہے اور کمالِ محض بھی۔ خلاصہ یہ کہ ''خیر'' وہ ہے جو ہر شے کی طلب ہے اور جس کے وسیلے سے ہر شے کا ''وجود'' اپنی تکمیل تک رسائی حاصل کرتا ہے لیکن شر کی کوئی اصل نہیں، کیونکہ شر یا تو کسی جوہر کے نہ ہونے، اس کی نابودگی کا نام ہوگا یا کسی کیفیت کی عدمِ صحت یا عدمِ سالمیت کو شر کہا جائے گا۔ پس ''وجود'' ہی خیر ہے اور کمالِ وجود ہی خیرِ وجود ہے۔ وہ وجود جس کے ساتھ عدم و نابودگی لگی ہوئی نہ ہو، خواہ یہ عدم کسی جوہر کا عدم ہو یا اس جوہر سے متعلق کسی عَرَض کا عدم، اور وہ وجود جو ہمیشہ اور دائمی طور پر حقیقی و واقعی ہو، وہی خیرِ محض اور خالص خیر ہے۔
> ہر وہ شے جو اپنی اصلی ماہیت میں وجودِ ممکن ہو، وہ خیرِ محض نہیں ہوگی، کیونکہ اس کی ماہیت اپنے آپ میں ایسی کوئی چیز نہیں رکھتی جس سے اسے لازماً وجود حاصل ہو۔ بنابریں اس کی ماہیت، اس کی اصل میں عدم کی گنجایش پائی جاتی ہے۔ ہر وہ شے جس میں کسی طرح بھی عدم کی گنجایش ہو، شر سے اور نقص سے ہر لحاظ سے آزاد نہیں ہو سکتی۔ پس صرف وجودِ واجب ہی خیرِ محض ہے۔ وہ وجود جو اپنے آپ سے ہے۔
> ''خیر'' اس کو بھی کہا جائے گا جو اشیا کے کمال کے لیے سودمند اور مفید ہو۔ ہم یہ واضح کریں گے کہ یہ لازم ہے کہ وجودِ واجب اپنی ماہیت کے اعتبار سے ہر وجود اور ہر کمالِ وجود کی اصل ہے۔ اس لحاظ سے بھی وجودِ واجب ایک خیر ہے جس میں کوئی نقص اور کوئی شر راہ نہیں پا سکتا۔[۹۲]

یہ درست ہے کہ فلسفیوں کا احساس یہی تھا کہ عقل ہی فہم کی کلید ہے، لیکن ان میں سے بہت سے ایسے تھے جو یہ جانتے تھے کہ خیال کے وسیلے سے ذہن کو چند ایسے تناظر مل جاتے ہیں جو عقل کی رسائی سے باہر ہوتے ہیں۔ مسلمان فلسفی چونکہ ماہرِ نفسیات بھی ہوتے تھے، لہٰذا نفس کی ایک قوت کے طور پر خیال کا جو کردار ہو سکتا ہے، اس سے تو انھیں ہمیشہ دلچسپی رہی، لیکن اپنے نظریات کا زندگی پر اطلاق کرنے والے مفکرین کی حیثیت سے وہ خیال کو بھی فطرت الٰہی اور اللہ کے بارے میں بصیرت حاصل کرنے کے وسیلے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ تمام فلسفیوں کے بارے میں تو یہ کہنا درست نہیں ہوگا، لیکن ان کی ایک بڑی تعداد، جس میں ابن سینا اور سہروردی بھی شامل تھے، یہ بات جان گئی تھی کہ فہمِ حقیقت اور اظہارِ حقیقت کا ایک مختلف انداز وہ بھی ہے جو خیال کے وسیلے سے میسر آتا ہے۔ فلسفیوں کی اکثر تحریریں خشک، مجرد اور نمایشِ علم سے بھری ہوئی ہوتی ہیں۔ ماہرینِ علم کلام کی کتب بھی ایسی ہیں، تاہم ابن سینا اور سہروردی دونوں نے ایسی تحریریں بھی یادگار چھوڑی ہیں جن کو ''اشراقی رسائل'' (visionary treatises) کا نام دیا گیا ہے۔ ان کتب میں عقل کا کردار ثانوی ہے اور قاری کے فہم و ادراک کا در وا کرنے کے لیے تمثیلی انداز استعمال کیا گیا ہے۔ یہ تحریریں نثر کم اور شاعری زیادہ لگتی ہیں۔ ان تحریروں کی کشش ان کے منطقی استدلال میں نہیں، بلکہ ان کے حسنِ بیان اور ایک تحیر کی فضا قائم کرنے کے عمل میں چھپی ہوئی ہے۔[۹۳]

ماہیتِ اشیا کی وضاحت کرتے ہوئے سہروردی کو اس بات کا خاص طور پر دھیان رہتا ہے کہ عقل اور خیال میں توازن بگڑنے نہ پائے۔ فلسفیانہ تلاش اور تحقیق میں اس نے وجود کی جگہ یہ جو ''نور'' کو ہدفِ توجہ بنایا ہے، اس سے پتا چلتا ہے کہ اس نے اس توازن کو برقرار رکھنے کے لیے کتنی کوشش کی ہے۔ قرآن مجید میں اگرچہ وجود کا لفظ استعمال نہیں ہوا، تاہم سہروردی کے دور تک آتے آتے یہ لفظ ایک فلسفیانہ اصطلاح کے طور پر پوری طرح متعارف ہو چکا تھا۔ فلسفیوں نے یہ لفظ جس طرح برتا ہے، اس سے تجریدی اندازِ فکر کو فروغ ملتا ہے۔ اس میں تنزیہ کا اظہار زیادہ تھا اور تشبیہ کا کم، لیکن سہروردی کشفِ حقائق سے حاصل ہونے والی دانشِ حضوری کے اہم کردار سے بھی بے خبر نہ تھے۔ اس کائنات میں حضورِ حق کا ادراک اور حضورِ حق میں رہنے کا براہِ راست تجربہ نہ ہو تو انسان تنزیہ میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔

نور کی اصطلاح قرآن میں آنے والے اسمائے خداوندی میں سے ایک ہے۔ اس بات کا ذکر ہم پہلے بھی کر چکے ہیں۔ فلسفیوں کے ہاں وجود کا لفظ جس طرح استعمال ہوا ہے، اس کے برعکس ''نور'' حقیقتِ

مطلقہ کی طرف اشارہ کرتا ہے، وہ شے جو عالم بھی ہے اور معلوم بھی۔ نور یا روشنی پردے اٹھا دیتی ہے، کھول دیتی ہے، منکشف کر دیتی ہے، نور سے آگہی ملتی ہے۔ منور ہونے کا مطلب ہے آگاہ ہونا۔ نور، الحق ہے، نہ صرف بطور مشہود و منظور، بلکہ الحق بطور ناظر و شاہد بھی۔ ہمارے لیے نور کا تجربہ آگہی کا تجربہ ہے، نور آگہی ہے۔ صوفیہ نے عام طور پر کشف کو نور ہی کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ جب نورِ ربّانی ضوفشاں ہوتا ہے تو جہالت کی تاریکی چھٹ جاتی ہے۔

سہروردی نے ابن سینا کے اسلوب میں کئی فلسفیانہ کتب تصنیف کی ہیں۔ جن میں عقل کی اہمیت پر اکثر زور دیا گیا ہے۔ ان کے اشراقی و تمثیلی رسائل (visionary recitals) پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سہروردی میں نور کے وسیلے سے دیکھنے کی کتنی صلاحیت تھی اور وہ خود کس حد تک نور میں ڈھل چکے تھے۔ عقل سے انسان اور خدا کے درمیان فاصلہ قائم ہوتا ہے، لیکن ایک مرتبہ تلاشِ حق کرنے والے کو ذوقِ نور حاصل ہو جائے، نور اس کا تجربہ بن جائے تو بندے اور رب کے درمیان فاصلے مٹ جاتے ہیں۔ تاہم ''نور'' اور شعاعِ نور (یعنی ہستی انسانی) کی یہ عینیت عقلی طور پر اس وقت تک بیان نہیں ہو سکتی جب تک فاصلے کی اور مجرد اندازِ فکر کی رکاوٹ درمیان میں نہ لائی جائے۔ اس کے برعکس تمثیلی اور تشبیہی تحریروں کا خطاب براہ راست خیال و تخیل سے ہوتا ہے۔ ان تماثیل کے وسیلے سے نفس کو اپنے جوہرِ تمثیلی کی شناخت حاصل ہوتی ہے اور یہ شناخت اس کے لیے یہ امکان پیدا کرتی ہے کہ وہ یہ تجربہ حاصل کرے کہ وہ الحق کے پرتوِ خیال سے الگ کچھ اور نہیں ہے۔

سہروردی کی اشراقی تصانیف کے نمونے کے طور پر لغتِ موراں (چیونٹی نامہ) سے ایک واقعہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ کتاب کا عنوان قرآن مجید کی اس آیت سے لیا گیا ہے جس میں سیدنا سلیمانؑ کے چیونٹیوں کی گفتگو سننے کے واقعے کا ذکر آیا ہے:

فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰي وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ (۲۷:۱۹)

پس وہ اس کی بات سے خوش ہو کر مسکرایا اور دعا کی: اے میرے رب! مجھے سنبھالے رکھ کہ میں اس فضل کا شکرگزار رہوں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر فرمایا اور میں ایسے نیک کام کروں جو تجھے پسند ہوں اور تو اپنے فضل سے مجھے اپنے صالح بندوں کے زمرے میں داخل کر!

اس کہانی میں یوں لگتا ہے کہ سہروردی کے ہاں حضرت سلیمانؑ ذاتِ خداوندی کا استعارہ و علامت ہیں اور بلبل انسان کی علامت ہے۔ بلبل کو فارسی میں ''بلبلِ ہزار داستان'' بھی کہا جاتا ہے۔ بلبل کو انسان کی علامت اس لیے کہا گیا ہے کہ انسان کو تمام اسما کا علم دیا گیا اور پھر وہ غفلت میں پڑ گیا۔

همه مرغان در حضرت سلیمان علیه السّلام حاضر بودند الّا عندلیب، سلیمان مرغی را برسالت نام زد کرد که عندلیب را بگوید که ضروریست رسیدن ما و شما بیکدیگر۔ چون پیغام سلیمان علیه السلام بعندلیب رسید هرگز از آشیان بدر نیامده بود، با یاران خود مراجعت کرد که فرمان سلیمان علیه السلام برین نسق است واو دروغ نگوید۔ باجتماع ایعاد کرده است۔ اگر او بیرون باشد وما درون، ملاقات میسر نشود واو در آشیانهٔ مانگنجد وهیچ طریق دیگر نیست۔ یکی سالخورده در میان ایشان بود، آواز داد که اگر وعدهٔ 'یوم یلقونه' راست باشد وقضیهٔ 'کل لدینا محضرون'، و 'انّ الینا ایابهم' و 'فی مقعد صدق عند ملیكٍ مقتدرٍ' درست آید، طریق آنست که چون ملك سلیمان در آشیانهٔ ما نگنجد ما نیز بترك آشیانه بگویم و بنزدیك او شویم، و اگر نه ملاقات میسّر نگردد۔

تمام پرندے حضرت سلیمانؑ کے سامنے حاضر تھے۔ بس ایک بلبل غیر حاضر تھا۔ حضرت سلیمانؑ نے ایک پرندے کو نامہ بر کے طور پر چن لیا۔ اسے بلبل کو یہ پیغام دینا تھا کہ ''تمھارا ہم سے ملنا ضروری ہے''۔ حضرت سلیمانؑ کا پیغام بلبل کو ملا۔ بلبل کبھی اپنے گھونسلے سے نکلا ہی نہ تھا۔ اس نے اپنے دوستوں سے مشورہ کرتے ہوئے کہا: ''حضرت سلیمانؑ کا حکم یوں ملا ہے اور ان کا کہنا غلط نہیں ہوتا'' اگر وہ باہر ہوئے اور ہم اندر تو ان سے ملنا ناممکن ہو جائے گا، لیکن ہمارے گھونسلے میں تو ان کی سمائی ہو نہیں سکتی، پھر یہ ملاقات کیوں کر ہو؟

ان میں ایک عمر رسیدہ بھی تھا۔ اس نے پکار کر کہا کہ اگر ''یَوۡمِ یَلۡقَوۡنَهٗ'' (جس دن وہ اس سے ملیں گے (۷۷:۹) کا وعدہ سچا ہے اور اگر ''وَاِنۡ كُلٌّ لَّمَّا جَمِیۡعٌ لَّدَیۡنَا مُحۡضَرُوۡنَ'' (اور بے شک وہ سب ہمارے ہی حضور میں پیش کیے جائیں گے) (۳۶:۳۲) اور ''اِنَّ اِلَیۡنَاۤ اِیَابَهُمۡ'' (بے شک ہماری ہی طرف ان کی واپسی ہے) (۸۸:۲۵) اور ''فِیۡ مَقۡعَدِ صِدۡقٍ عِنۡدَ مَلِیۡكٍ مُّقۡتَدِرٍ'' (ایک پائیدار مقام عزت میں، ایک مقتدر بادشاہ کے پاس) (۵۴:۵۵) کو ہو کر رہنا ہے تو پھر ایک ہی راستہ ہے: چونکہ شاہ سلیمانؑ ہمارے گھونسلے میں نہیں سما سکتے، لہٰذا ہمیں اپنے گھونسلے سے نکل کر ان کے پاس جانا ہوگا۔ ایسا نہ کیا تو ان سے ملاقات ممکن نہ ہو سکے گی۔[۹۴]

خلاصہ یہ ہوا کہ بیانِ حقیقت کا جو ایک خاص فلسفیانہ انداز ہے، اس کا محور تنزیہ ہے اور فکرِ مجرد،

تاہم کئی فلسفی عقل کی کوتاہی اور نارسائی سے بخوبی آ گاہ تھے اور الحق کے قریب ہونے، اللہ کے ''القریب'' ہونے کے اظہار کے لیے، تشبیہ کے بیان کے لیے تماثیل یا رموز و علائم کا استعمال کرتے تھے۔

مشاہدۂ حق کے بارے میں تصوف کا نقطۂ نظر

ہم نے عرض کیا تھا کہ عرفانِ نظری کا زور کشفِ حقائق پر رہتا ہے یا یوں کہیے کہ نورِ خداوندی کی دید پر، یعنی اس دنیا اور نفسِ انسانی میں اللہ تعالیٰ کے سچ مچ موجود ہونے کے مشاہدہ پر، لیکن تصوف کی جڑ بنیاد اتنی ہی وحیِ اسلام پر بھی استوار ہے۔ تصوف کے نظری مباحث پر کلام کرنے والے حضرات نے ماہرینِ علم کلام سے کہیں بڑھ کر اپنے تجربے کو قرآن اور سنت سے وابستہ رکھا تھا۔ رسولِ خداؐ نے اپنا علم اپنی عقلی، استدلالی اور خیال کی قوتوں کے سہارے حاصل نہیں کیا تھا، اس کے برعکس اللہ نے ان کو ایک موزوں ظرفِ قبولیت کے طور پر چن لیا تھا اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دی تھی۔

وَاَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَعَلَّمَكَ مَالَمۡ تَكُنۡ تَعۡلَمُ وَكَانَ فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكَ عَظِيۡمًا (۴:۱۱۳)	اور تم پر کتاب و حکمت نازل فرمائی اور تمھیں وہ چیز سکھائی جو تم نہیں جانتے تھے۔ اور اللہ کا تم پر بڑا فضل ہے۔

یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری رسول ہیں اور ان کے بعد اب کوئی صحیفۂ خداوندی نہیں آئے گا، ان امور پر صوفیہ کے ہاں کوئی سوال نہیں اٹھایا گیا، تاہم انھوں نے یہ بھی کبھی تسلیم نہیں کیا کہ آنحضرتؐ کے اتباع کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ انسان آپؐ کی سنت کی پیروی کرے اور قرآن و حدیث یاد کرلے۔ اس کے برعکس مسلمان کے لیے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ رسولِ خدا کے اتباع میں ایسا سچا اور مخلص ہو، آپؐ کی پیروی کی ایسی لگن رکھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ اسے اکتسابِ عقلی کے وسیلے کے بغیر ہی براہِ راست علم عطا کر دے۔ صوفیہ کے ہاں اس کی دلیل کے طور پر قرآن کی درج ذیل آیت کا اکثر حوالہ ملتا ہے:

اتَّقُوا اللّٰهَ وَ يُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ (۲:۲۸۲)	اللہ سے ڈرتے رہو گے تو وہ تمھیں علم دیتا رہے گا۔

کشفِ حقائق کا لازمی تقاضا ہے کہ انسان میں تقویٰ ہو اور تقویٰ (جیسا کہ ہم کتاب ہذا کے حصہ سوم میں دیکھیں گے) ایمان و عمل کو صدق و اخلاص کے ذریعے درجۂ کمال تک لے جانے کا نام ہے، لیکن اس کے لیے یہ ہرگز ضروری نہیں کہ انسان کی فکری اور عقلی قوت کو فلسفیوں اور اہلِ کلام کے سے منظّم انداز میں بروئے کار لایا جائے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اکثر صوفیہ کی رائے کے مطابق ادراکِ حقیقت کے لیے اس طرح کی عقلی کاوشیں معاونِ فہم ہونے کے بجائے سَدِّ راہ بن جاتی ہیں۔

اس کا مطلب یہ نہ لیا جائے کہ صوفیہ نے عقل کے ایک جائز اسلوبِ فہم ہونے سے انکار کیا ہے۔ قرآن بار بار انسانوں کو عقل استعمال کرنے کی دعوت دیتا ہے۔صوفیہ کی رائے یہ تھی کہ عقل ایک انسانی ملکہ یا قوت ہے اور اس کو کمال تک پہنچانے کے لیے اس کی تربیت اور نشو ونما درکار ہے۔ انھیں البتہ اس بات کے تسلیم کرنے میں دریغ تھا کہ علمِ کلام یا فلسفہ انسان کی سوچ بچار کی قوت یا عقل و استدلال کی تربیت کا بہترین ذریعہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہاں پھر ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ رسولِ خداؐ کی سنت کا اتباع اور تقویٰ پر عمل کرنا عقلی قوت کے کمال تک لے جانے والا راستہ ہے۔

تصوف کی تحریریں کسی طرح خلافِ عقل نہیں کہی جا سکتیں، خواہ اس کے لیے فلسفہ و کلام کا پیمانہ ہی کیوں نہ استعمال کیا جائے۔ بہت سے صوفیہ ایسے بھی رہے ہیں جنھوں نے فلسفے یا کلام یا دونوں ہی کی باقاعدہ تحصیل کی تھی اور اپنی تحریروں میں کلامی اور فلسفیانہ دلائل استعمال کیا کرتے تھے، اس لیے اکثر یہ بتانا دشوار ہو جاتا ہے کہ کسی ایک خاص مصنف کو کس مکتبِ فکر کے تحت شمار کیا جائے، صوفی کہا جائے، متکلم قرار دیا جائے یا فلسفی سمجھا جائے، یا پھر تینوں مکاتبِ فکر کا نمایندہ مانا جائے۔

الغزالی اس دشواری کی ایک نمایاں مثال ہیں کہ ان کو کس طبقے میں شمار کیا جائے۔ اپنی بہت سی تحریروں میں وہ اشعری مکتبِ فکر کے علمِ کلام کے سرخیل نظر آتے ہیں، جب کہ بعض کتابوں میں انھوں نے علمِ کلام پر سخت تنقید کی ہے اور کچھ تصانیف میں ان کا اندازِ نظر خالص صوفیانہ رہا ہے۔ غزالی فلسفے سے بھی بخوبی واقف تھے اور مغرب میں ان کا تعارف ایک فلسفی ہی کی حیثیت سے زیادہ عام رہا ہے۔ ساتویں/تیرھویں صدی کے فلسفی افضل الدین کاشانی نے منطق پر کتابیں لکھیں اور اشیا کے بارے میں ان کا ادراکِ عقلی غیر معمولی حد تک تیز تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی انھیں یہ سہولت بھی تھی کہ وہ کشف کے مرتبۂ بلند سے ان معاملات پر نگاہ کر سکتے تھے۔ ایسے اور بھی کئی لوگ ہو گذرے ہیں جن کو کسی ایک طبقے تک محدود کرنا ممکن نہیں ہوتا، اور ایسا ہونا بالکل قدرتی امر تھا، کیونکہ یہ تینوں مکاتب حصولِ علم کے تین مختلف، مگر ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے انداز اور اسالیب ہیں اور ان میں سے کوئی بھی دوسروں کو نہ تو رد کرتا ہے اور نہ ان کو دائرہ اعتبار سے خارج قرار دیتا ہے۔

تصوف نے اگرچہ تینوں طرح کے علم کا استعمال کیا ہے، لیکن کشفِ حقائق پر اس کا زور دینا اس بات کا غماز ہے کہ صوفیہ تنزیہ کے مقابلے میں تشبیہ کے علمبردار تھے۔ کشف سے حاصل ہونے والے ''خیال'' پر مبنی علم کی وجہ سے وہ یہ دیکھنے کے قابل ہوتے تھے کہ یہ دنیا اور نفسِ انسانی سب حضورِ

خداوندی میں ہیں۔ اشیائے کائنات اور خالقِ کائنات کے مابین قربت، اس کے حاضر و ناظر ہونے کا یہ براہ راست اور بلاواسطہ تجربہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور و غیاب میں کوئی تضاد کی بات نہیں تھی۔ ''خیال'' کی بنیاد پر، کشفی طور پر اگر وہ یہ جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ انسان اور کائنات کے قریب ہے تو عقلی طور پر انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ بعید و ماورا ہے اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ کوئی شے نہیں ہے، بلکہ ہر شے سے الگ اور تمام اشیا سے منزہ و بلند و برتر ہے۔

تصوف کا علمِ کلام سے اس نکتے پر کوئی جھگڑا نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ دور ہیں، تاہم چونکہ علمِ کلام والے حضرات تنزیہ پر ایک سرے سے زور دیتے چلے جاتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے صفاتِ قہر و جلال ہی کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے رہتے تھے، لہٰذا صوفیہ نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ تصویر کا دوسرا رخ بھی دکھانا چاہیے۔ ان کی تحریروں میں تشبیہ پر اور اللہ کی صفاتِ رحمت و جمال پر جو زور دیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے۔

علمِ کلام پر لکھی گئی تحریریں اگر زیادہ تر مجرد انداز کی ہوتی ہیں تو عجب کیا ہے کہ عقلی اور استدلالی طرزِ فکر کو یہی طریقہ راس آتا ہے۔ اس کے برعکس صوفیانہ تحریروں کا جھکاؤ ٹھوس پن اور واقعیت کی طرف ہے کہ کشف کا فراہم کردہ ادراکِ خیال و تمثیل اسی سے مناسبت رکھتا ہے۔ اسی سے یہ نکتہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اسلامی تہذیب میں فلسفہ و کلام کی نسبت تصوف کہیں زیادہ مقبول کیوں رہا ہے اور اس کی اشاعت اتنی زیادہ کیوں ہوئی ہے۔ عرفانِ نظری پر لکھنے والے بہت سے صوفی مصنّفین نے تمثیل، علامت اور قصہ و داستان کے جملہ امکانات کو بروئے کار لانے کی کوشش کی اور اس طرح وہ ہر شخص سے اس کے ذوق کے مطابق کلام کرنے میں کامیاب رہے۔ قصہ کہانی تو ہر ایک کی سمجھ میں آ جاتی ہے، خواہ اس کہانی کے پردے میں ماوراالطبیعیات اور الٰہیات کا کوئی لطیف نکتہ ہی کیوں نہ بیان ہو رہا ہو، لیکن یہی بات اگر اہلِ کلام اور فلسفیوں کے سے مجرد طرزِ استدلال اور مخصوص عقلی دلائل کے رنگ میں کہی جائے تو معدودے چند لوگ ہی اسے سمجھ سکیں گے۔ علاوہ ازیں صوفی مصنّفین نے شاعری کا بھی خوب خوب استعمال کیا ہے۔ عربی، فارسی، ترکی اور دیگر اسلامی زبانوں کے عظیم ترین شعرا میں سے بہت سے حضرات صوفی تھے۔ ان کا شعر جلوہ گاہِ عالم میں تجلیاتِ خداوندی کا بیان تھا۔ ان کا شعر اشیائے کائنات میں خالقِ کائنات کا پرتو دیکھتا اور دکھاتا تھا۔ اس کے برعکس کوئی بڑا فقیہ، متکلم یا فلسفی کبھی درجہ اوّل کا شاعر نہیں بن پایا۔ یہی وہ نکتہ ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ اپنے تصورِ حقیقت، اور

مشاہدۂ کائنات کو بیان کرنے میں اہلِ تصوف اتنے کامیاب کیوں کر رہے۔ یہ بات اور بھی واضح ہوجاتی ہے۔ اگر یہ پہلو بھی سامنے رہے کہ شاعری ادب کی وہ صنف ہے جسے دیگر اصناف کے مقابلے میں ساری اسلامی دنیا میں ہمیشہ سب سے زیادہ قبولِ عام حاصل رہا ہے۔

اس امر سے کوئی انکار نہیں کہ بعض صوفی مصنّفین نے بھی ایسی مشکل اور ادق کتابیں لکھیں ہیں جو عوام کی اکثریت کے لیے ناقابلِ فہم رہی ہیں۔ ان کتب میں جہاں ایک طرف قوتِ ''خیال'' کا استعمال کیا گیا تو دوسری طرف فلسفیوں اور ماہرینِ علمِ کلام کے طرزِ تصنیف اور تکنیک کو بھی بروئے کار لایا گیا، کیونکہ فلسفی اور اہلِ کلام بھی ان کتب کے مخاطَب تھے۔ بہرکیف تصوف نے اپنی تعلیمات کے اظہار و بیان کے لیے ہمیشہ خیال، تخیل اور تمثیل کو برتا ہے، جب کہ کلامی تحریروں کا انحصار تقریباً سارے کا سارا فکرِ مجرد پر رہا ہے۔ کتاب کے اگلے حصے میں ہم صوفیانہ تحریروں کی مثالیں پیش کریں گے۔

حصّہ سوم

احسان

باب ہفتم

احسان کی قرآنی بنیادیں

حدیثِ جبرئیل میں معین کردہ، دین کی پہلی دو جہات، یعنی اسلام اور ایمان کا جائزہ ہم لے چکے، اب موقع ہے کہ دین کی تیسری اور سب سے گہری جہت احسان (بحسن وخوبی کرنا، وہ کرنا جو احسن ہو، حسنِ عمل) کی جانب متوجہ ہوں۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ اسلام کی بحث کا محورِ عمل ہوتا ہے جب کہ ایمان کی بحث بنیادی طور پر تفہیم کے گرد گھومتی ہے۔ اسی طرح احسان کے بارے میں جو کچھ کہا جاتا ہے اس کا مرکزی نقطہ انسانی ارادہ اور نیت ہوتی ہے۔ انسان جو کچھ کرتا ہے، کیوں کرتا ہے؟ اسلام ہمیں یہ بتاتا ہے کہ انسان کو کیا کرنا چاہیے اور ایمان سے اُسے یہ ادراک حاصل ہوتا ہے کہ جو وہ کر رہا ہے، اسے کرنا کیوں ضروری ہے؟ لیکن یہ دونوں اقالیم اس بات سے غیر متعلق ہیں کہ انسان کے محرکاتِ عمل اور اس کی نفسیاتی کیفیات اور اوصاف کو اس کے عمل اور اس کے فہم سے کیوں کر ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے؟ یہ ان لوگوں کا موضوع ہے جو احسان اور اس سے منسلک تصورات کو نفسِ انسان کی مثالی اور مطلوبہ صفات کے طور پر ہدفِ توجہ بناتے ہیں۔ اب ہم آپ کے سامنے چند ایسی مثالی صفات رکھتے ہیں جن کو قرآن مجید میں حسنِ نیت اور صحیح محرکِ عمل کے طور پر پیش کیا گیا ہے، نیز اسلامی تہذیب نے ان اہداف و مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے تاریخ میں جو طریقے اپنائے، ان کا بھی کچھ تذکرہ کیا جائے گا۔

احسان لفظ اور معانی

حدیثِ جبرئیل میں رسولِ خداؐ نے فرمایا تھا کہ احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے اس کو دیکھ رہے ہو، کہ اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ تو تم کو دیکھ رہا ہے۔'' رسولِ خداؐ کے اس قول کے معانی ومضمرات کی تلاش ہم ذرا بعد میں کریں گے، پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید اور حدیثِ نبوی میں احسان کا لفظ کس طرح استعمال ہوا ہے۔

احسان کا لفظ نکلا ہے حُسن سے اور اس صفت کے معنی ہیں، ''اچھا ہونا، خوب ہونا، خوبصورت ہونا۔'' عربی زبان کی لغات سے پتا چلتا ہے کہ حُسن کے عمومی معنی ہیں ہر مثبت صفت (بھلائی، اچھائی، جمال وزیبائی، خوشگواری وہم آہنگی، توازن وتناسب، جاذبیت اور مطلوب وگوارا ہونا)۔ اس

کے متضاد لفظ ہیں قبح (ناگوار، کراہت انگیز) اور سُوء (برائی، شر)۔ لغات میں حُسن کے جو معنی ہیں ان کے مطابق یہ لفظ خیر کا مترادف نہیں ہے۔ شر کے مسئلے پر بات کرتے ہوئے ہم اس لفظ پر بحث کر چکے ہیں)۔ حسن وہ بھلائی یا اچھی بات ہے جو لا محالہ طور پر خوبصورت، اور پر کشش بھی ہو جب کہ خیر، وہ بھلائی ہے جس سے کوئی ٹھوس فائدہ پہنچتا ہے خواہ وہ خوبصورت اور پر کشش نہ بھی رہی ہو یا پھر خیر وہ چیز بھی ہے جو صرف اپنے متبادل کے مقابلے میں ''بہتر'' ہو۔ ہم نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ خیر کا لفظ عموماً ایک ایسے اسمِ صفت کے طور پر استعمال ہوتا ہے جو دوسری صفت سے بہتر اور مفید تر ہو۔

حُسن کو جمال سے بھی الگ کر کے دیکھنا چاہیے اگرچہ دونوں کا ترجمہ خوبصورتی، زیبائی کے لفظ سے کیا جاتا ہے۔ جمال کا لفظ حدیث نبوی میں ہم دیکھ چکے ''**اللّٰہ جمیلٌ و یحب الجمال**'' (اللہ تعالیٰ جمیل ہیں اور جمال پسند ہیں)۔ جمال کا لفظ بسا اوقات عملی طور پر حسن کے مترادف کے طور پر برتا جاتا ہے۔ بعض لغت نگاروں کی رائے یہ ہے کہ اگر بات انسانی خوبصورتی کی ہو رہی ہو تو حُسن کا تعلق آنکھوں سے اور جمال کا اشارہ ناک کی طرف ہوگا۔ مذہبی اصطلاح میں جمال کا کوئی متضاد نہیں بلکہ اسے جلال کے تلازمے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی لیے ہمارے ہاں اللہ تعالیٰ کے جمالی اور جلالی دونوں قسم کے نام پائے جاتے ہیں۔

قرآن میں حَسَنَۃ کا جو لفظ آیا ہے، اس کی اور حُسن کی اصل ایک ہی ہے اور اس کے معنی ہیں ''اچھی اور خوبصورت'' چیز یا کام۔ اِس کا متضاد سَیِّئَۃ ہے جس کے معنی برائی یا بری چیز کے ہیں۔ حَسَنَۃ انسانی بھی ہوتا ہے اور اللہ کے کام بھی حَسَنَۃ ہوتے ہیں لیکن سَیِّئَۃ اللہ تعالیٰ سے صادر نہیں ہوسکتا:

مَآ اَصَابَکَ مِنْ حَسَنَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ وَمَآ اَصَابَکَ مِنْ سَیِّئَۃٍ فَمِنْ نَّفْسِکَ (۴:۷۹)	تمھیں جو سکھ بھی پہنچتا ہے خدا کی طرف سے پہنچتا ہے اور جو دکھ پہنچتا ہے وہ تمھارے اپنے نفس کی طرف سے پہنچتا ہے۔
مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَۃِ فَلَہٗ خَیْرٌ مِّنْھَا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّیِّئَۃِ فَلَا یُجْزَی الَّذِیْنَ عَمِلُوا السَّیِّاٰتِ اِلَّا مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (۲۸:۸۴)	جو نیکی کما کر لائے گا تو اس کے لیے اس سے بہتر صلہ ہے اور جو بدی کما کر لائے گا تو بدی کمانے والوں کو وہی بدلے میں ملے گا جو وہ کر کے آئیں گے۔

حُسن کے لفظ سے نکلے ہوئے الفاظ میں سے سب سے پُر معنی استعمال شاید وہ ہے جو اسمِ صفت

حُسنیٰ (سب سے خوبصورت، حسین) میں نظر آتا ہے۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ قرآن کریم کی چار آیات میں ''اسمائے حُسنیٰ'' (اللہ تعالیٰ کے حسین ترین ناموں) کا ذکر آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صفاتِ خداوندی دیگر ہر شے کی صفات سے زیادہ خوبصورت، دلکش اور قابلِ تعریف ہیں۔ فی الواقع حُسنیٰ کا اسم صفت شہادتِ اوّل ہی کا بیان ہے، کیونکہ اسمائے حُسنیٰ میں سے ہر نام ایک صفت تفضیل کی طرف اشارہ کرتا ہے، بلکہ یوں کہیے کہ ہر اسمِ خداوندی کسی ایک ایسی صفت کو بیان کرتا ہے جو صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ جمیل ہے سو **لا جمیل الا اللہ**۔ اللہ تعالیٰ جلیل ہے لہٰذا **لا جلیلَ الا اللہ**۔ اسی طرح تمام اسمائے حُسنیٰ کلمہ ٔ توحید میں رکھے جا سکتے ہیں۔

قرآن مجید نے حُسنیٰ کا لفظ صفت کے علاوہ اسم کے طور پر بھی استعمال کیا ہے اور اس کے معنی ہیں: ''سب سے بہتر، سب سے حسین وخوبصورت'' جو ہر خوبی، بھلائی، خوبصورتی اور مطلوبیت کا حامل ہو۔ حُسنیٰ اہلِ ایمان کو ملنے والی جزا اور انعام بھی ہے۔ انبیا کی پیروی کر کے اور ''امانتِ حق'' کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان اپنے اندر اللہ کے اسمائے حُسنیٰ کو حقیقت بناتا ہے اور اس طرح ہر اس شے میں شریک ہو جاتا ہے جو حُسنیٰ ہے، سب سے اچھی اور خوبصورت ہے۔ مراد یہ کہ حُسنیٰ کا لفظ صفاتِ خداوندی کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے اور انسان کے ہدفِ آخرین، اس کی منزلِ مقصود کی جانب بھی، یعنی اس فلاح وسعادت کی طرف جس کا اسے اگلے جہان میں تجربہ ہوگا:

وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ۨالْحُسْنٰى (۱۸:۸۸)	رہا وہ جو ایمان اور عمل صالح اختیار کرے تو اس کے لیے اللہ کے پاس بھی اچھا بدلہ ہے۔
لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى وَالَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّ مِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ (۱۳:۱۸)	جن لوگوں نے اپنے رب کی دعوت کو لبیک کہا، ان کے واسطے انجام کار فیروزمندی ہے، اور جن لوگوں نے اس کی دعوت قبول نہیں کی، اگر ان کو وہ سب کچھ حاصل ہو جائے جو زمین میں ہے اور اسی کے برابر اور بھی وہ فدیہ میں دے ڈالیں تو بھی اُن کا حساب برا اور ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور وہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے!

لفظ احسان وہ فعل ہے جس کے معنی ہیں خوبصورت، اچھا اور بھلا کام کرنا یا حُسن، بھلائی اور خوبی

برقرار رکھنا۔ درج ذیل آیاتِ قرآنی میں اس لفظ کا انگریزی ترجمہ to do what is beautiful اور to make beautiful سے کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ اور اس سے بننے والا اسمِ فاعل مُحسِن (وہ جو اچھا، خوبصورت کام کرتا ہو) ستّر آیات میں آیا ہے۔ غور طلب اور اہم بات یہ ہے کہ اکثر یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف بھلائی کے کام کو نسبت دینے کے لیے استعمال ہوا ہے اور المُحسِن اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احسان (اچھا، خوبصورت کام کرنے) کا آغاز تخلیقِ کائنات ہی سے ہو جاتا ہے اور اس عملِ تخلیق کا سرتاج نوعِ انسان کو بنایا گیا جسے صورتِ خداوندی پر خلق کیا گیا، جو حُسنیٰ اور خوبصورت ترین ہے:

ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۙ الَّذِیْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ وَ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۚ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۚ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (۳۲:۶-۹)

وہ غائب و حاضر کا جاننے والا، غالب اور مہربان ہے، جس نے جو چیز بھی بنائی خوب بنائی اور اس نے انسان کی خلقت کا آغاز گارے سے کیا، پھر اس کی نسل حقیر پانی کے خلاصہ سے چلائی، پھر اس کے نوک پلک سنوارے اور اس میں اپنی روح پھونکی اور تمھارے لیے کان، آنکھیں اور دل بنائے۔ تم بہت ہی کم شکر گذار ہوتے ہو!

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ښ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (۴۰:۶۴)

اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے زمین کو مستقر اور آسمان کو چھت بنایا۔ اور تمھاری صورت گری کی تو تمھاری صورتیں اچھی بنائیں، اور تم کو پاکیزہ چیزوں کا رزق بخشا۔ وہی اللہ تمھارا خداوند ہے۔ پس بڑی ہی بابرکت ذات ہے اللہ، عالم کے خداوند کی!

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ (۶۴:۳)

اس نے آسمانوں اور زمین کو غایت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس نے تمھاری صورت گری کی تو اس نے تمھاری صورتیں اچھی بنائیں،

اور اسی کی طرف لوٹنا ہوگا۔

اگر نوعِ انسانی کی تخلیق اللہ کا احسان (بھلا اور خوبصورت کام) ہے تو انسان کی ذمہ داری یہ ٹھہری کہ وہ اللہ سے اپنے تعلق اور دوسری مخلوقات سے اپنے معاملات کو بحسن وخوبی استوار کرے، دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ انسان کو اپنی فطرت کے مطابق عمل کرنا چاہیے، یعنی اس سرشتِ اصلی کے مطابق، جسے اللہ نے انسان کے خمیر میں رکھ دیا ہے:

اَحۡسِنۡ كَمَآ اَحۡسَنَ اللّٰهُ اِلَيۡكَ (۲۸:۷۷) اور جس طرح خدا نے تمھارے ساتھ احسان کیا ہے، اسی طرح تم بھی (دوسروں کے ساتھ) احسان کرو۔

انسان اگر احسان پر عمل پیرا ہوتا ہے تو بلاشبہ اللہ کو اُس کا کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اپنی عمیق ترین سرشت وفطرت پر پورا اترنے سے جو بھی فائدہ ہے، وہ سراسر انسان کا ہے:

اِنۡ اَحۡسَنۡتُمۡ اَحۡسَنۡتُمۡ لِاَنۡفُسِكُمۡ وَاِنۡ اَسَاۡتُمۡ فَلَهَا (۱۷:۷) اگر تم بھلے کام کروگے تو اپنے لیے کروگے اور اگر برے کام کروگے تو بھی اپنے ہی لیے۔

لیکن یہ حسنِ عمل یا خوبصورت کام انسان اس وقت تک انجام نہیں دے سکتا جب تک اللہ تعالیٰ کی مدد شامل نہ ہو۔ آخری بات یہی ہے کہ انسانی عمل کا آغاز بھی اللہ ہی کے حکم سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو خوبصورت بنایا جیسا کہ اس نے ہر شے کو مسلم (مطیع وفرماں بردار بنایا)۔ لیکن جب تک اس کی ہدایت شاملِ حال نہ ہو، انسان مسلم نہیں بن پاتا اور جب تک اس کی برکت ورحمت ساتھ نہ ہو، انسان کے قبیح اوصاف واخلاق صفاتِ حمیدہ وپسندیدہ میں تبدیل نہیں ہو پاتے۔ اسی سے آنحضرتؐ کی اس دُعا کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے: ''یارب، تو نے میری تخلیق کو حسن دیا، سو میرے خُلق کو بھی حسین بنا دے۔''[۱]

قرآن مجید نے بار بار انسان کو یہ حکم دیا کہ وہ حسنِ عمل یعنی احسان اختیار کرے اور ساتھ ہی یہ وعدہ بھی کیا کہ جو لوگ اچھے، خوبصورت عمل کریں گے، ان پر اللہ کے اسمائے جمالیہ، اسمائے رحمانیہ اور اسمائے حُسنیٰ کی عنایات ہوں گی۔ درجِ ذیل آیات اس اعتبار سے خصوصاً اہم ہیں، کیونکہ ان میں احسان اور حُسنیٰ کا باہمی تعلق واضح نظر آتا ہے۔ ہمیں یاد دلایا گیا ہے کہ جس بات میں، جس کام میں برائی ہو، قباحت ہو اس کی سزا تو صرف اس کے برابر ہوگی، لیکن حسن وخوبی کے کاموں کی جزا نہ صرف ان کے برابر ہوگی، بلکہ کئی گنا بڑھا کر دی جائے گی۔ انسانی صفات کو حقیقت اگر ملتی ہے تو اللہ کی صفاتِ حُسنیٰ

کے ذریعے۔ جب انسان اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اس کی صفاتِ حمیدہ کو اللہ کی صفات سے جدا کرنا مشکل ہو جاتا ہے:

وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ لِيَجْزِیَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِیَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰی (۵۳:۳۱)	اور اللہ ہی کے اختیار میں ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے کہ وہ بدلہ دے ان لوگوں کو جنھوں نے برے کام کیے ہیں ان کے کیے کا بدلہ دے ان لوگوں کو جنھوں نے اچھے کام کیے ہیں اچھا۔
لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَ زِيَادَةٌ (۱۰:۲۶)	جن لوگوں نے اچھے کام کیے، ان کے لیے اچھا بدلہ ہے اور اس پر مزید بھی۔

بھلے اور خوبصورت کام میں برے اور قبیح عمل کو ختم کرنے اور حسنِ عمل میں سوءِ عمل کو مٹانے کی جو قوت ہے، اسے ایک حدیث میں بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے[۲]

جب بندہ اطاعت کرتا ہے اور اس کی اطاعت حسنِ عمل کے ساتھ ہوتی ہے تو اللہ اسے ہر اس قبیح شے سے آزاد کر دیتا ہے جسے اس نے چھوا ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہر اچھے، خوبصورت عمل کی جزا دس گنا سے سات سو گنا تک ہوگی اور برے کام کی سزا اس کے برابر، اگر اللہ نے اسے بھی معاف نہ کر دیا ہو تو۔

درج ذیل آیاتِ قرآنی میں توحید کے بعد جس احسان یعنی اچھے عمل پر زور دیا گیا ہے، وہ ہے اپنے والدین سے احسان (نیکی، بھلائی) کہ انھی کے وسیلے سے اسے جامۂ ہستی نصیب ہوا۔ اس دنیا میں ماں باپ ہی وہ ذریعہ ہیں جو اللہ تعالیٰ انسانی تخلیق کے لیے، انسان کو خوبصورت بنانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ تخلیقِ انسانی کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے۔ یہ توحید کا تقاضا ہے، لیکن وہ یہ چاہتا ہے کہ انسان اپنی تخلیق کے انسانی وسیلے اور واسطے سے صحیح اور مناسب سلوک کرے۔ تبھی وہ یہ توقع کرسکتا ہے کہ دوسری مخلوقات اور اس کی اولاد اس کے ساتھ اچھا اور بھلا سلوک کرے۔

لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۣ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (۲:۸۳)	اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو گے، والدین کے ساتھ احسان کرو گے۔
تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْا	کہو: آؤ! میں سناؤں جو چیزیں تم پر تمھارے رب نے حرام کی ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ تم کسی

اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ
وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ
(٦:١٥١)

چیز کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ، اور ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کرو، اور اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ ہم ہی تم کو بھی روزی دیتے ہیں اور ان کو بھی۔ اور بے حیائی کے کاموں کے پاس نہ پھٹکو، خواہ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ۔

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا
مَّخْذُوْلًا ۰ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا
اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ
الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ
اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۰
وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ
وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا
(١٧:٢٢-٢٤)

اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو شریک نہ کر کہ تو سزاوار مذمت اور دھتکارا ہوا ہو کر رہ جائے اور تیرے رب کا فیصلہ یہ ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کرو۔ اگر وہ تمھارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں، ان میں سے ایک یا دونوں، تو نہ ان کو اُف کہو اور نہ ان کو جھڑکو اور ان سے شریفانہ بات کہو اور ان کے لیے رحم دلانہ اطاعت کے بازو جھکائے رکھو اور دعا کرتے رہو کہ اے میرے رب! ان پر رحم فرما، جیسا کہ انھوں نے بچپن میں مجھے پالا۔

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ
كُرْهًا وَّ وَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ
شَهْرًا حَتّٰى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً
قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْ
اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا
تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ
وَاِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (٤٦:١٥)

اور ہم نے انسان کو حکم کیا کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرے، ماں نے اس کو پیٹ میں رکھا اور دکھ کے ساتھ اس کو جنا، اور اس کو پیٹ میں رکھنا اور اس کا دودھ چھڑانا تیس مہینوں میں ہوا۔ یہاں تک کہ جب وہ پہنچ جاتا ہے اپنی پختگی کو اور پہنچ جاتا ہے چالیس سال کی عمر کو، وہ دعا کرتا ہے: اے رب! مجھے

سنبھال کہ میں تیرے اس فضل کا شکر ادا کروں
جو تونے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر فرمایا اور
وہ نیک عمل کروں جو تجھے پسند ہیں، اور میری
اولاد میں بھی میرے نیک بخت وارث اٹھا۔
میں نے تیری طرف رجوع کیا اور میں تیرے
فرماں برداروں میں سے بنتا ہوں۔

قرآن مجید میں جہاں بھی مُحسِنین (احسان، بھلا اور خوبصورت عمل کرنے والے لوگوں) کا ذکر آیا ہے انھیں اچھے اور قابلِ تعریف انسانوں کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ انھیں اللہ کی صفتِ احسان میں سے حصہ ملا ہے اور اسی لیے وہ اللہ سے قریب تر ہیں اور اس کی رحمت و جمال میں شریک ہوتے ہیں۔ چونکہ وہ احسان کرتے ہیں، لہٰذا خود بھی مُحسِن ہیں، بھلا اور خوبصورت کام کرنے والے خود بھی تو بھلے اور خوبصورت ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں یہ دیکھ کر تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ جن سولہ آیات میں یہ ذکر آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں سے محبت کرتے ہیں، ان میں سے پانچ میں ایسے لوگوں کو مُحسِن (احسان والے لوگ) کہہ کر پکارا گیا ہے، جب کہ باقی گیارہ آیات میں ان کو دیگر اچھی اور خوبصورت صفات سے مزین بتایا گیا ہے۔ (اس نکتے کی معنویت پر ہم اس وقت تبصرہ کریں گے جب محبت کے بارے میں بات کی جائے گی)۔

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ (۱۶:۱۲۸)	بے شک اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا اور جو خوب کار ہیں۔
وَاَحْسِنُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (۲:۱۹۵)	بھلائی کرو۔ بے شک اللہ خوبی کے ساتھ کام کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔
فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (۵:۱۳)	پس ان کو معاف کرو اور (ان سے) درگذر کرو۔ بے شک اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔
وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (۱۱:۱۱۵)	اور ثابت قدم رہو، اللہ تعالیٰ یقیناً خوب کاروں کا اجر ضائع نہیں کرے گا۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ(۶۹:۲۹)

اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں جھیل رہے ہیں، ہم ان پر اپنی راہیں ضرور کھولیں گے اور بے شک اللہ خوب کاروں کے ساتھ ہے۔

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا (۴:۱۲۵)

اور بہ اعتبار دین اس سے بڑھ کر کون ہوسکتا ہے جو اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ کر دے، درآنحالیکہ خوب کار بھی ہو اور ابراہیم کی ملت کی پیروی کرے جو بالکل یکسو تھا؟ اور اللہ نے ابراہیم کو اپنا دوست بنایا۔

وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ؕ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ (۷:۵۶)

اور ملک میں، اس کی اصلاح کے بعد، فساد نہ برپا کرو اور اسی کو پکارو، امید و بیم، دونوں حالتوں میں۔ بے شک اللہ کی رحمت نیکوکاروں سے قریب ہے۔

فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ (۵:۸۵)

تو اللہ ان کے اس قول کے صلے میں ان کو ہمیشہ رہنے کے لیے ایسے باغ عطا فرمائے گا جن میں نہریں بہتی ہوں گی، اور خوب کاروں کا یہی صلہ ہے۔

لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِيْنَ (۳۹:۳۴)

ان کے لیے ان کے رب کے پاس وہ سب کچھ ہوگا جو وہ چاہیں گے۔ یہ صلہ ہے خوب کاروں کا۔

احسان کا لفظ متعدد معانی میں استعمال ہوا ہے۔ حسنِ عمل ہر سطح پر اہمیت رکھتا ہے۔ ایک جگہ جہاں مسلمانوں نے اس قاعدے کا ہمیشہ سب سے زیادہ خیال رکھا ہے وہ بچوں کے نام رکھنے کا مرحلہ ہوتا ہے۔ ہر دوسری تہذیب کے انسانوں کی طرح مسلمان بھی اپنے بچوں کے لیے ایسے نام منتخب کرتے ہیں جن میں وہ معیار اور آدرش نظر آئیں جنھیں پا لینے کی آرزو اپنی اولاد کے لیے ہر شخص کیا کرتا ہے۔ کئی احادیث میں بھی صحیح نام رکھنے کی اہمیت بیان ہوئی ہے اور رسولِ خداؐ بسا اوقات لوگوں کے نام بدل دیا کرتے تھے، اگر ان میں کوئی نامناسب بات ہوتی تھی۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ اسلام لانے

والے لوگ ایک اسلامی نام اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ ایک علامت ہوتی ہے اس شناخت اور حیثیت کو حاصل کرنے کی جس کی وہ تمنا رکھتے ہیں۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے پسندیدہ نام عبداللہ (اللہ کا بندہ) اور عبدالرحمٰن (رحمٰن کا بندہ) ہیں۔ ناموں کی اہمیت کو آپ نے اس حدیث میں سمیٹ دیا ہے: کہ ''قیامت کے روز تم کو تمھارے اور تمھارے آبا کے نام سے پکارا جائے گا، سو اپنے لیے خوبصورت نام رکھا کرو۔''[۳]

ایک سطح پر اگر اس حکم کا تقاضا یہ ہے کہ بچوں کے خوبصورت نام رکھے جائیں، تو دوسری سطح پر یہ حکم انسانوں سے یہ تقاضا بھی کرتا ہے کہ وہ اپنے اخلاق و کردار درست کریں کہ انھیں بھی کریم و رحیم و رحمان وغیرہ جیسے ناموں سے پکارا جا سکے جو اللہ تعالیٰ کے خوبصورت ترین ناموں میں سے ہیں۔ آخرت کے باب کے آخر میں جو طویل حدیث ہم نے نقل کی تھی، اس میں ذکر ہے کہ موت کے بعد انسانوں کو ان اچھے اور خوبصورت یا برے اور قبیح ناموں سے پکارا جائے گا جن سے اس دنیا میں انھیں اس بنا پر یاد کیا جاتا تھا کہ اُن میں یہ صفات و اوصاف پائے جاتے تھے۔

اسلام کے تناظر میں حُسن کی کیا اہمیت ہے، اس کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ رسولِ خداؐ کے دونواسوں کا نام حَسن اور حُسَین تھا۔ لفظِ حَسَن جو حُسن سے اسمِ صفت بنایا گیا ہے اسے ہم اس سے پہلے بھی دیکھ چکے ہیں۔ حسین اسی لفظ کا اسمِ تصغیر ہے، سو اگر ان دو الفاظ کا ترجمہ کرنا ہو تو کچھ یوں ہوگا کہ ''حُسن والا'' اور ''ننھا حَسین۔'' مغرب میں ان ناموں کو مردوں کے لیے موزوں نہیں سمجھا جائے گا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ مغرب اور اسلام کے تصورِ حسن میں کتنا فرق ہے۔ اس ضمن میں یہ بات یقینی ہے کہ یہ دونوں نام رسولِ خداؐ نے خود چنے تھے یا کم از کم پسند ضرور کیے تھے۔

احسان کے بارے میں سب سے دلچسپ حدیث درجِ ذیل ہے۔ جو حدیث کے تقریباً سبھی مستند مجموعوں میں ملتی ہے:[۴]

> اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کام کے لیے احسان کی تاکید کی ہے۔ جب تم قتال کرو تو خوبصورتی سے کرو اور جب تم ذبیحہ کرو تو خوبصورتی سے۔ ہتھیار کی دھار خوب تیز رکھا کرو تا کہ معمول کو اذیت کم ہو۔

حدیث کا پہلا فقرہ خاص طور پر اہم ہے، کیونکہ اس میں ایک عالمگیر عمومی قاعدہ مقرر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو ایک حسن عطا کیا ہے، اسی طرح ہر انسانی عمل کو بھی بحسن و خوبی انجام پانا چاہیے، کیونکہ ان پر بھی نمونۂ خداوندی کا اتباع لازم ہے۔ اس کے بعد حدیث اس خاص واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کی وجہ سے غالباً آپؐ کو یہ قولِ مبارک ارشاد فرمانا پڑا۔ رسولِ خداؐ اپنے صحابہ

سے ارشاد فرما رہے ہیں کہ وہ قرآن پڑھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ قرآن نے تمام اُمور کو خوش اسلوبی سے انجام دینے پر احسان کا امر فرمایا ہے، لہٰذا انھیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ کام جنھیں عموماً بھلے کام نہیں گردانا جاتا، ان کا اس حکم سے کوئی تعلق نہیں۔ کسی کو قتل کرنا عام طور پر ایک قبیح فعل ہے اور کسی جائز اور منصفانہ سبب کے بغیر ایک انسان کو مار ڈالنا کسی بھی شخص کو جہنم رسید کرنے کے لیے کافی ہے:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا (۵:۳۲)

جس کسی نے کسی کو قتل کیا، بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا ملک میں فساد برپا کیا ہو، تو گویا اس نے سب کو قتل کیا۔

اسی طرح غذائی مصرف کے لیے جانوروں کو ذبح کرنا بھی ایک ایسا کام ہے جو اکثر لوگوں کے لیے بجا طور پر خوشگوار اور باعثِ کشش نہیں ہوتا، اور طبیعت کا یوں ابا کرنا سمجھ میں بھی آتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس بات کی اجازت دے رکھی ہے، لہٰذا اسے بھی بہترین طریقے سے انجام دینا چاہیے۔

حدیث کے تیسرے فقرے میں رسولِ خداؐ نے ایک مثال دی ہے جس سے یہ پتا چلتا ہے کہ اس سطح پر احسان (حسنِ عمل) کا کیا مطلب ہوگا جہاں ایک گونہ قباحت ناگزیر طور پر موجود ہو۔ چاقو کی دھار تیکھی ہونا چاہیے تاکہ جانور کا گلا جلدی سے کٹ جائے اور اسے تکلیف نہ ہو۔ اسی طرح اگر معاملہ انسان کے قتل کا ہو، خواہ معرکۂ جنگ میں ہو یا دفاع وسزا کے لیے، تو اس کے لیے بھی تیز دھار تلوار استعمال کرنا چاہیے۔ شریعت میں جنگ کے بارے میں جو بہت سی ہدایات اور ممنوع چیزیں بیان ہوئی ہیں، تیز دھار تلوار کا حکم ان سے غیر متعلق نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ان ہدایات کے مطابق عورتوں، بچوں، راہبوں، پادریوں اور بالعموم جنگ آزمائی نہ کرنے والوں کو نقصان نہ پہنچانے کا حکم دیا گیا ہے۔ (اس کا سامنے کا مطلب یہ ہوا کہ جدید آلاتِ جنگ اور اسلحے میں جتنے ایسے وسائل ایجاد ہوئے ہیں جو وسیع پیمانے پر تباہی پھیلاتے ہیں ان کا استعمال شریعت کی رُو سے جائز نہیں)۔

عبادت

قرآن مجید اور رسولِ خداؐ نے احسان کو ایک بڑی خوبی اور انسانی صفات میں سے نہایت پسندیدہ صفت قرار دیا ہے۔ قرآن میں احسان کا تعلق ہر اس شے سے ہے جو اچھی اور قابلِ تعریف ہو اور صاحبِ احسان کو جنت کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ حدیثِ جبرئیل میں آنحضرتؐ نے احسان کی جو تعریف معین کی ہے وہ خاص طور پر غور طلب ہے، کیونکہ اس سے ہمیں اس صفت کی داخلی جہت اور اس

کی نفسیات کے بارے میں ایک بصیرت حاصل ہوتی ہے۔اس سے ان انسانی رویوں اورمحرکات کی وضاحت ہوتی ہے جو احسان کا لازمہ کہے جا سکتے ہیں۔آیئے عبادت کے لفظ پر پہلے غور کرتے ہیں۔''احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو، گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو۔''

ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ عبادت کے لفظ کی اصل وہی ہے جو عبد (بندہ، غلام) کی ہے۔اس کا ترجمہ ''بندگی کرنا اور بندہ بننا'' کے طور پر کیا جا سکتا ہے۔اللہ کی عبادت کا مطلب ہے اس کی بندگی کرنا اور اس کے کہے پر چلنا، اس کا حکم بجالانا۔ یہاں ذکر اضطراری بندگی کا نہیں ہو رہا:

اِنۡ كُلُّ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اِلَّاۤ اٰتِى الرَّحۡمٰنِ عَبۡدًا (۱۹:۹۳)	آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں، سب خدائے رحمان کے حضور بندے ہی کی حیثیت سے حاضر ہوں گے۔

بلکہ احسان سے مراد وہ بندگی ہے جو اپنے اختیار سے، آزادانہ طور پر اور پورے اخلاص سے انجام دی جائے۔

اسلامی کتب میں عبادت کا لفظ جب ایک محدود معنی میں استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد ہوتے ہیں دین کے پانچ ستون (ارکانِ خمسہ) اور دیگر اعمال جیسے دُعا اور ذکرِ خدا۔ یہ تمام اعمال مراسمِ عبودیت اور پرستش کی نوع کے ہیں۔اس معنی میں یہ لفظ اکثر جمع (عبادات) کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔یہاں اس کا ترجمہ ''اعمالِ عبادت'' کے الفاظ سے کیا جا سکتا ہے۔فقہ میں انسانی عمل کو عموماً دو بڑی اقسام میں بانٹ کر دیکھا جاتا ہے: ''عبادات'' اور ''معاملات۔'' پہلی قسم، یعنی عبادات وہ مراسم اور مذہبی معمولات ہوئے جو انسان کا تعلق اللہ سے جوڑتے ہیں جب کہ ''معاملات'' کا ربط انسانوں کے باہمی تعلقات، یعنی شادی بیاہ، میراث، لین دین وغیرہ سے ہوتا ہے اور ان کو بھی اللہ کے احکام کے مطابق انجام دینا ضروری ہے۔

قرآن میں عبادت کا لفظ ان پانچ ارکانِ دین کی بجا آوری سے کہیں زیادہ وسیع مفہوم میں آیا ہے۔اس لفظ کا مطلب ہے کسی کو اپنا خدا بنالینا اور پھر اس خدا کی طرف سے جن باتوں کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ان کی پابندی کرنا۔یعنی اپنی ہستی اور اپنی زندگی کو اس رخ پر ڈالنا اور ڈھالنا جو انسان کی نظر میں حقیقی اور حق نما ہو۔اس کا مطلب ہے اپنے خدا سے امداد اور ہدایت کی دعا کرنا اور اس کی عنایات و برکات کے لیے اس کا شکر گذار ہونا۔

صحیح عبادت کا مرکز و محور صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے، اور توحید کا تقاضا بھی یہی ہے۔ دراصل عبادت، توحید کے سامنے کے اور اوّلین عملی مطالبات میں سے ہے۔ چونکہ اللہ کے سوا اور کوئی حقیقت نہیں ہے، لہٰذا انسان کو اپنا رخ الحق کی سمت رکھنا چاہیے۔ نفسِ انسانی کا خود کو ایک حقیقت کے رخ پر ڈالنا اور پھر اس کے مطابق ایک لائحہ عمل طے کرنا جو شخصی بھی ہو اور اس کے کچھ اخلاقی تقاضے بھی ہوں، اسی کو عبادت کہتے ہیں۔ چونکہ عبادت کی ضرورت توحید پر اپنی بنیاد رکھتی ہے اور نظریۂ توحید انسانوں (اور بظاہر جنّات کی بھی) فطرت و سرشت میں پیدائشی طور پر موجود ہے، لہٰذا قرآن مجید نے تخلیق اور عبادت کو براہِ راست ایک دوسرے سے جوڑ دیا ہے:

وَمَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (۵۱:۵۶)	اور میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔

اسی طرح ایک خدا کی عبادت اور پرستش ہی وہ پیغام ہے جو ہر پیغمبر کو دیا گیا، کیونکہ توحید کا تقاضا عبادت ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِىْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْت (۱۶:۳۶)	اور ہم نے ہر امت میں ایک رسول اس دعوت کے ساتھ بھیجا کہ اللہ ہی کی بندگی کرو اور طاغوت سے بچو۔
وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِىٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (۲۱:۲۵)	اور ہم نے تم سے پہلے جتنے رسول بھی بھیجے، ان کی طرف یہی وحی کرتے رہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری ہی عبادت کرو۔
وَاسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ (۴۳:۴۵)	اور پوچھو ان سے جن کو ہم نے تم سے پہلے بھیجا اپنے رسولوں میں سے۔ کیا ہم نے خدائے رحمان کے سوا دوسرے معبود ٹھہرائے جن کی عبادت کی جائے؟

قرآن مجید کے بیان کے مطابق جب اللہ تعالیٰ نے سیدنا موسیٰؑ سے بقعۂ نور میں سے خطاب کیا تو فرمایا:

اِنَّنِىٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِىْ وَ اَقِمِ	بے شک میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی

الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِی (٢٠:١٤) — معبود نہیں تو میری ہی عبادت کرنا اور میری یاد کے لیے نماز کا اہتمام کرنا!

اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت کرنے پر قرآن مجید میں بہت کڑی تنقید آئی ہے، کیونکہ اس کے سوا اور کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ معبود اور خدا وہی ہے جو عبادت کے قابل ہو، پوجے جانے اور اطاعت وفرمانبرداری کا مستحق ہو۔ توحید سے ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ یہ صفت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات میں ہے۔ عقل وذہانت سے محروم لوگوں کے بس کی بات نہیں کہ وہ توحید کو سمجھ سکیں:

اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰہَ اِنَّنِیْ لَکُمْ مِّنْہُ نَذِیْرٌ وَّبَشِیْرٌ (١١:٢) — کہ تم اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو۔ میں تمھارے لیے اس کی طرف سے ہوشیار کرنے والا اور خوشخبری دینے والا ہوں۔

قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَاللّٰہَ وَلَآ اُشْرِکَ بِہٖ اِلَیْہِ اَدْعُوْا وَاِلَیْہِ مَاٰبِ (١٣:٣٦) — تم کہ دو کہ مجھے تو حکم ہوا ہے میں اللہ ہی کی بندگی کروں اور اس کا کسی کو ساجھی نہ ٹھہراؤں۔ میں اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف میرا لوٹنا ہے۔

وَمَالِیَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِیْ فَطَرَنِیْ وَاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ (٣٦:٢٢) — اور میں کیوں نہ بندگی کروں اس ذات کی جس نے مجھے پیدا کیا اور جس کی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے؟

اُفٍّ لَّکُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَفَلَا تَعْقِلُوْن (٢١:٦٧) — تف ہے تم پر بھی اور ان چیزوں پر بھی جن کو اللہ کے سوا تم پوجتے ہو! کیا تم لوگ سمجھتے نہیں؟

وہ لوگ جو ماسوا کی عبادت کرتے ہیں، انھوں نے اللہ کے سوا دوسروں کو بھی اس کا شریک بنا دیا ہے اور اس طرح شرک میں جا پڑے ہیں۔ وہ جھوٹا خدا جس کی پرستش پر نکیر کی گئی ہے، کبھی ''ہوا و ہوس'' کا بت بھی ہوتا ہے جو انسان کے اندر گھر بنا لینے والے خداؤں میں سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ وہ انسان کو ہر لمحے کی آتی جاتی خواہش کے دھارے پر ادھر ادھر اچھالتا رہتا ہے۔

قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ — کہ دو کہ مجھے تو ان کی عبادت سے روکا گیا

دُوۡنِ اللّٰہِ قُلۡ لَّاۤ اَتَّبِعُ اَھۡوَآءَکُمۡ قَدۡ ضَلَلۡتُ اِذًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُھۡتَدِیۡنَ (٦:٥٦)

ہے جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو۔ کہہ دو: میں تمھاری خواہشوں کے پیچھے نہیں چل سکتا۔ (اگر میں نے ایسا کیا) تو گمراہ ہو جاؤں گا اور پھر راہ پانے والوں میں سے نہ بن سکوں گا۔

اَلَمۡ اَعۡھَدۡ اِلَیۡکُمۡ یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ اَنۡ لَّا تَعۡبُدُوا الشَّیۡطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَکُمۡ عَدُوٌّ مُّبِیۡنٌ (٣٦:٦٠)

اور اے آدم کے بیٹو! کیا میں نے تمھیں یہ ہدایت نہیں کر دی تھی کہ شیطان کی بندگی نہ کرنا۔ بے شک وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

خلاصہ یہ کہ قرآن مجید کی نظر میں اللہ کی اختیاری عبادت انسان کے لیے لازمی ہے اور جو لوگ اس کی ٹھیک سے بندگی کرتے ہیں اور اس کی عبادت اس طرح بجالاتے ہیں جیسا کہ عبادت کا حق ہے، بہترین انسان وہی ہیں۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ خلیفۃ اللہ ہونے کے لیے شرط یہ ہے کہ انسان پہلے اس کا بندہ بنے، لیکن یہ بندگی کوئی عام بندگی نہیں، بلکہ خالص، بے لوث اور سچی عبودیت ہونا چاہیے۔ اللہ کے ان بندوں کو اخلاص اس لیے نصیب ہوتا ہے کہ وہ اللہ سے معاملہ اس طرح کرتے ہیں، جیسا کہ اس کا حق ہے۔ بہرحال سچی بات یہی ہے کہ بالآخر اللہ ہی ہے جو اپنے بندے کا تزکیہ کرتا ہے۔ اسی لیے قرآن میں بسا اوقات ایسے لوگوں کا ذکر بھی ملتا ہے جو ”مخلص بنائے گئے“:

اِلَّا عِبَادَ اللّٰہِ الۡمُخۡلَصِیۡنَ ۔ اُولٰٓئِکَ لَھُمۡ رِزۡقٌ مَّعۡلُوۡمٌ ۔ فَوَاکِهُ ۚ وَھُمۡ مُّکۡرَمُوۡنَ ۔ فِیۡ جَنّٰتِ النَّعِیۡمِ (٣٧:٤٠-٤٣)

بے شک تم کو دردناک عذاب چکھنا پڑے گا! اور یہ تو تم اسی کا بدلہ دیے جا رہے ہو جو تم کرتے رہے ہو، بس اللہ کے مخصوص بندے ہی اس سے محفوظ رہیں گے۔

دیدارِ حق Seeing God

رسولِ خداؐ نے فرمایا کہ ”احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے تم اُس کو دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔“ یہاں آپؐ کا اشارہ اُس رویے اور نیت کی طرف ہے جو انسان کی جانب سے اسلام کے مطلوبہ ظاہری اعمال کے پسِ پشت کارفرما ہوتی ہے۔ اگر یہ غور کیا جائے کہ ہم روزمرہ کے کام کس طرح کرتے ہیں تو یہ نکتہ آسانی سے سمجھ میں آ جاتا ہے۔ مثلاً قانون ہم سے کہتا ہے کہ مقررہ رفتار سے تیز گاڑی نہ چلائیں۔ بہت سے لوگ از خود قانون کی

پابندی کرتے ہیں، لیکن ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو صرف اس خوف سے قانون کی پاسداری کرتے ہیں کہ اگلے موڑ پر پولیس کے گشتی دستے کا سامنا نہ ہو جائے اور اگر ٹریفک میں ان کے پیچھے پولیس کی گاڑی آ رہی ہو تو وہ رفتار کی حد سے تجاوز کرنے کا سوچتے بھی نہیں۔

رسولِ خداؐ کے فرمان کا مطلب یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرے، یعنی پانچ ارکانِ دین، بلکہ اپنا ہر کام یوں انجام دے، گویا اللہ تعالیٰ پولیس کار میں ان کا پیچھا کر رہے ہوں۔ اگر آپ پولیس کی پٹرول کار کو دیکھ نہیں رہے تو بھی آپ کو یقینی طور پر یہ معلوم ہے کہ اللہ کے پاس ایسے وسائل ہیں جن کی پہنچ سے کوئی شخص باہر نہیں ہوسکتا:

وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ (٥٧: ٤) اور وہ تمھارے ساتھ ہوتا ہے جہاں کہیں بھی تم ہوتے ہو۔

جو رویّہ احسان کے لیے درکار ہے اس پر تنزیہ کا غلبہ بھی ہوسکتا ہے، تشبیہ بھی غالب ہوسکتی ہے اور تشبیہ و تنزیہ کا برابر امتزاج بھی واقع ہوسکتا ہے۔ گذشتہ سطور میں ہم نے گشتی پولیس کار کا جو ذکر کیا تھا، اس میں اشارہ تھا قہر اور غضب یعنی صفاتِ تنزیہ کی طرف۔ ''السلطان ظل اللہ'' (سلطان اللہ کا سایہ ہوتا ہے) میں خدا کو بطور بادشاہ اور حکمران کے پیش کیا گیا ہے، اور پولیس بادشاہ کا دست و بازو ہونے کے ناتے سے قانون کا سختی سے نفاذ کرتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھیے تو انسان اللہ کی عبادت اس لیے کرتا ہے کہ اگر اس نے اللہ کے جاری کردہ احکام کی پابندی نہ کی تو اس کی پاداش میں اُسے سزا بھگتنا ہوگی۔ انسان رب العالمین کا بندہ ہے اور اس کو اللہ کا حکم ماننا ہے ورنہ قید کی سزا ہو جائے گی، اور اس کا ٹھکانہ ''سجین'' (جیل خانہ) ہوگا جہنم کا پست ترین گڑھا۔

لیکن ہر عمل کا محرک خوف نہیں ہوتا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان محبت کی وجہ سے ایک کام کرتا ہے اور اپنے مقصود کا قرب حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس صورت میں اُس کے عمل اور نیت کے لیے رحمت، کرم اور جمال جیسی صفاتِ تشبیہ سے پھوٹنے والی اُمید اور بھروسا مہمیز کا کردار ادا کرتے ہیں۔ جب ایک نوجوان اپنی محبوبہ کی ہر فرمایش پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے تو ہوسکتا ہے کہ محبوبہ سے شادی کرنے کی خواہش اس کے اِس عمل کو حرکت میں لانے کا باعث بنتی ہو، اس کے سامنے ایک مقصد ہے جسے وہ حاصل کرنا چاہتا ہے، تاہم ایک بات یقینی ہے کہ اگر محبوبہ اس کے پاس ہو تو اس کا اندازِ عمل کچھ اور ہوگا اور اگر وہ اپنے اہل خاندان کے ساتھ کہیں چلی جائے تو یہ انداز بدل جائے گا۔ قدرتی بات

ہے کہ جب محبوبہ سامنے نہ ہو تو عاشق کی کاوشیں سست پڑتی جاتی ہیں اور جب محبوبہ واپس آ جائے تو کوشش میں پھر سے جان پڑ جاتی ہے۔

ان دو مثالوں میں عمل کا محرک ہے نقصان کا خوف اور کسی شے کے حصول کی امید، لیکن بہت سے مسلمان علما کی رائے میں ''اللہ کی عبادت اس طرح کرنا جیسے آپ اسے دیکھ رہے ہوں'' کا مطلب یہ ہے کہ فائدے اور نقصان کی ہر سوچ کو بھلا کر اللہ کی عبادت کی جائے۔ اتنا جاننا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ الحق ہے اور بندہ بے حقیقت۔ انسان کو چاہیے کہ اپنی توجہ کو الحق پر مرکوز رکھے اور بے حقیقت کو فراموش کر دے۔ بالفاظِ دیگر یوں کہیے کہ انسان کو اپنے بارے میں ہر سوچ کو بھلا کر، صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف متوجہ ہو جانا چاہیے۔ اسے صرف اللہ ہی کا دھیان ہونا چاہیے۔ اور یہی ہے ذکرِ خدا کا نقطۂ کمال۔ جو شخص دور ہو اس کو یاد کرنا کچھ اور ہوتا ہے اور جو پاس موجود ہو، اس کا ذکر کچھ اور انداز رکھتا ہے۔ اللہ کے حضور میں بسر اوقات کرنے والے نہ صرف دائمی طور پر اس کا ذکر کرتے ہیں، اس کی یاد میں رہتے ہیں، بلکہ اسے شاید کبھی بھلا ہی نہیں سکتے۔

احسان کی تعریف یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو ''جیسے اس کو دیکھ رہے ہو کہ اگر تم اسے نہیں دیکھتے، تو وہ تم کو دیکھ ہی رہا ہے۔'' وہ تمھیں اس لیے دیکھ رہا ہے کہ انسان جہاں بھی ہو، اللہ اس کے ساتھ ہوتا ہے، لیکن یاد رہے کہ اس تعریف میں یہ بھی ہے کہ ''اگر تم اسے نہیں دیکھتے۔'' اگر ہم اسے دیکھ سکتے تو کیا ہوتا؟ عبادت کا مقصود اور منزل یہی ہے۔ ایسا ہو جائے تو انسان کی عبادت بلاشبہ صرف اور صرف اللہ ہی کے لیے ہو گی۔

انسان اللہ تعالیٰ کو کیسے دیکھ سکتا ہے؟ یہ ایک پیچیدہ سوال ہے، ایک ایسا سوال جس پر فکرِ اسلامی کی پوری تاریخ میں مسلسل بحث اور اختلافِ رائے ہوتا رہا ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ علما نے اس سوال کے مختلف جواب دیے ہیں۔ جن کا نقطۂ نظر تنزیہ پر مبنی تھا ان کے جواب کا ایک انداز ہے اور جن پر غلبہ تشبیہ کو حاصل تھا، انھوں نے کسی اور طرح سے جواب دیا ہے۔ ماہرینِ علمِ کلام کے ہاں چونکہ زور تنزیہ پر رہا ہے، لہٰذا ان کی رائے میں اس دنیا میں اللہ کو دیکھنا محال ہے، اگرچہ ان میں سے اکثر حضرات یہ مانتے ہیں کہ اگلے جہان میں ہم اللہ کو دیکھ سکتے ہیں اور دیکھیں گے۔ ان کے برعکس اہلِ تصوّف جن کا زور تشبیہ پر رہتا ہے، کہتے ہیں کہ اس دنیا میں بھی اللہ کو دیکھا جا سکتا ہے، لیکن چشمِ سر سے نہیں دل کی آنکھ سے، تاہم صوفیہ کی اکثریت کا کہنا بھی یہی ہے کہ اس دنیا میں یا آخرت میں، انسان اللہ تعالیٰ کو

اس طرح نہیں دیکھ سکتا جیسا کہ وہ خود کو دیکھتا ہے۔ انسان کے لیے دیدارِ خداوندی صرف اتنا اور ویسا ہی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ دکھانا چاہے۔ اگر ''هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ'' (تم جہاں بھی ہو، وہ تمھارے ساتھ ہے) تو پھر آپ اس کو اسی حد تک دیکھ سکتے ہیں جس حد تک ''وہ'' آپ کے ساتھ ہے، لیکن لازم نہیں کہ آپ اسے اُسی طرح دیکھ سکیں جیسے دوسرے اسے دیکھتے ہیں یا جیسے وہ فرشتوں کے سامنے ظاہر ہوتا ہے اور جس طرح وہ اپنے لیے ظاہر ہوتا ہے، اسے تو انسان ہرگز نہیں دیکھ سکتا۔

کہا جا سکتا ہے کہ احسان کا مقصود یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اس کو واقعی دیکھتے ہوئے کی جائے۔ اس ہدف اور مقصود کی اہمیت کا صحیح اندازہ تب ہوسکتا ہے، جب ہم یہ یاد کریں کہ جنت کی سب سے بڑی سعادت ہی دیدارِ حق ہے، یعنی اللہ کی دید۔ رویتِ باری اور دیدارِ حق سے بڑھ کر اگلے جہان میں اور کوئی چیز نہیں۔ اسی طرح اس دنیا میں بھی احسان کے ذریعے حاصل ہونے والی دیدِ دوست سے بڑھ کر اور کوئی شے نہیں ہوسکتی۔

اخلاص

احسان یہ ہے کہ انسان یوں عمل کرے، گویا اللہ کو دیکھ رہا ہے۔ ایسی کیفیت میں انسان کا ادراک یہ ہوتا ہے کہ اللہ سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے، لیکن یہاں مقصود صرف اتنا نہیں ہے کہ اللہ نے جو حکم دیا ہے اس کے مطابق عمل کیا جائے، بلکہ یہ کہ ہر کام کو صرف اور صرف اللہ کی خاطر کیا جائے۔ یہ ہے توحید فی العمل، توحید کا عملی اظہار۔ چونکہ الحق کے سوا اور کوئی حقیقت نہیں ہے، سو ہر عمل اور ہر سوچ الحق کے مطابق ہونا چاہیے۔ اس مطابقت کے حصول کا ایک محرک یہ ادراک بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ حاضر و ناظر ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ نہ صرف انسان کے ہر عمل کو دیکھ رہا ہے، بلکہ انسان کی کوئی سوچ بھی اس سے اوجھل نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ہر بات کا علم ہے، کیا عیاں اور کیا پنہاں۔ کھلا اور چھپا سب کچھ اس کے سامنے ہے اور ہمارے سب سے مخفی خیالات بھی اس سے پوشیدہ نہیں ہیں:

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَافِىْ قُلُوْبِكُمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَلِيْمًا (۳۳:۵۱)	اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے اور اللہ علیم اور حلیم ہے۔
اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِىْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ (۲۹:۱۰)	کیا لوگوں کے دلوں میں جو کچھ ہے، اللہ اس سے اچھی طرح باخبر نہیں ہے؟
يَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ (۲۷:۲۵)	وہ جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو دکھاتے ہو۔

احسان کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اس بات سے آگاہ رہے کہ وہ ہر لحہ اللہ کی نگاہ میں ہے اور اس کا عمل اللہ کے حاضر و ناظر ہونے کے مطابق ہو، لیکن ساتھ ہی ساتھ احسان یہ بھی چاہتا ہے کہ انسان کی سوچ، احساس اور نیت بھی اس کے مطابق ہو۔ ظاہری عمل درست ہو جائے، صرف اتنا کافی نہیں ہے (یہ صرف ایک سطح ہوگی، یعنی ''اسلام'')، بلکہ اندر کی سوچیں اور رویے بھی خارجی عمل کے عین مطابق ہونے چاہییں۔ انسان کی سوچ اور اس کے عمل میں تضاد نہیں ہونا چاہیے یا یوں کہیے کہ انسان جو ہے اور جو سوچتا ہے، اس میں فرق نہیں ہونا چاہیے۔ انسانی شخصیت کو جہاں ہم آہنگ، متوازن اور سالم و مکمل ہونا چاہیے، وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ایسے رجحانات اور ذہنی محرکات سے پاک ہو جو اسے مختلف سمتوں میں کھینچ رہے ہوں۔

انسانی ذات کی اس ہم آہنگی کو اکثر اخلاص کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ انگریزی میں اسے عموماً sincerity کے لفظ سے ترجمہ کیا جاتا ہے۔ اخلاص جیسا ظاہر میں ہونا چاہیے ویسے ہی باطن میں بھی ہونا چاہیے۔ جب ایک مخلص آدمی کچھ کہتا ہے تو اس کے لفظ سچے ہوتے ہیں اور اس کے فہم اور اس کے ایمان کے عین مطابق ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسان مخلص ہو تو اس کا عمل اس کے وجود اور اس کے احساس کا عکس ہوگا۔ جیسا وہ ہوگا اور جو اس کا سچا احساس ہوگا، وہی اس کے عمل میں ظاہر ہوگا۔

اخلاص کا انگریزی متبادل sincerity خاصے ڈھیلے ڈھالے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جبکہ عربی میں ایسا نہیں ہے۔ وہاں اخلاص کا لفظ اس طرح چلتے ہوئے مفہوم میں کبھی نہیں برتا جاتا۔ آج کل کے انگریزی روزمرہ میں تو sincerity ایک بہانہ ہے ہر وہ کام کرنے کا جو کر کے مزہ آتا ہو۔ اپنی مرضی کرنا، اپنے من کی موج میں رہنا۔ اگر آپ sincere ہیں، یعنی آپ کے جی میں جو کچھ ہے، اس سے سچے ہیں تو پھر آپ جو کچھ بھی کیا کریں وہ ٹھیک ہے۔ معاملے پر اس انداز میں نظر کرنا اسلامی فکر کے نقطۂ نظر سے ایک بالکل اجنبی چیز ہے، کیونکہ اخلاص تو اللہ تعالیٰ کی نسبت سے اور اس کی ذات کے لیے ہے، اور یہ خاص قسم کا ''اخلاص'' (sincerity) جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے، وہ ایک جھوٹے خدا سے مخلص ہونے کے مترادف ہے، وہی جھوٹا خدا جسے قرآن نے ''ہوا'' کا نام دیا ہے۔ سو یہ شرک ہی کی ایک صورت ہے۔

اخلاص کے معانی پر غور کرنا ہو تو اس کے الٹ الفاظ کو دیکھنا چاہیے۔ اِس کا سب سے پہلا متضاد تو نفاق ہے۔ نفاق کو انگریزی میں hypocrisy کہتے ہیں، لیکن اس کا عربی مادہ یا جڑ جن حروف سے

بنی ہے، ان کے معنی ہیں ''بیچنا، فروخت کرنا''، چنانچہ اس کے لفظی معنی ہوئے ''اپنے آپ کو بیچ ڈالنے کی کوشش۔'' اسلام کے نقطۂ نظر سے منافق وہ شخص ہے جو لوگوں کو وہ بن کر دکھا رہا ہو جو وہ نہیں ہے، جو لوگوں کو قائل کرنا چاہے کسی ایسی چیز کے لیے جو اس میں نہیں ہے، انھیں وہ مال فروخت کرنا چاہتا ہے جو ویسا ہے نہیں جیسا نظر آتا ہے۔

مدینہ کے اسلامی معاشرے میں ایک گروہ تھا جو ''منافقین'' کے نام سے معروف تھا۔ اس کا ایک خاص کردار تھا۔ اوپر اوپر سے انھوں نے اسلام تو قبول کر لیا تھا، لیکن ان کی اصل دلچسپی صرف اپنی ذاتی اغراض سے تھی جن کی تکمیل ان کا مقصد تھا۔ وہ نہ تو اللہ پر ایمان رکھتے تھے نہ اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر، لیکن ان کی نظر اس بات پر تھی کہ ان حالات میں نئے دین کی پیروی کرنا ان کے لیے سود مند رہے گا۔ قرآن مجید نے اکثر اس گروہ کی طرف اشارہ کرنے کے لیے منافق کا لفظ استعمال کیا ہے اور تیس آیات میں اس گروہ کا صراحتاً ذکر آیا ہے۔ قرآن مجید نے اس گروہ کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، اس سے ان کی جو عمومی تصویر ابھرتی ہے، وہ انھیں بدترین قسم کے کفار اور حق کے چھپانے والے بنا دیتی ہے، اسفل السافلین، سب سے گھٹیا۔ غور کیجیے کہ ان آیات میں ایک بات یہ پنہاں ہے کہ منافقین لوگوں کو تو دھوکہ دے سکتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ ان کی اصلیت کیا ہے۔ وہ ان کے دلوں کا حال جانتا ہے اور وہ یہ بھولے ہوئے ہیں کہ وہ جہاں بھی ہوں، اللہ تعالیٰ ان کو دیکھ رہا ہے، ان کے ساتھ ہے:

اِذَا جَآئَکَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُهٗ وَاللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ۔ اِتَّخَذُوْٓا اَیْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (۶۳:۱-۲)

جب منافق تمھارے پاس آتے ہیں کہتے ہیں: ہم گواہی دیتے ہیں کہ بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں، اور اللہ جانتا ہے کہ بے شک تم اس کے رسول ہو، اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین بالکل جھوٹے ہیں۔ انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے اور وہ اللہ کی راہ سے رک گئے ہیں۔ بے شک نہایت ہی برا ہے جو یہ کر رہے ہیں۔

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ یَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْکَرِ وَ یَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ

منافق مرد اور منافق عورتیں، سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ یہ برائی کا حکم دیتے

وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۔ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا هِيَ حَسْبُهُمْ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ (۹:۶۷-۶۸)

ہیں، بھلائی سے روکتے اور اپنے ہاتھوں کو بند رکھتے ہیں۔ انھوں نے اللہ کو بھلا رکھا ہے تو اللہ نے بھی ان کو نظرانداز کر دیا ہے۔ یہ منافق بڑے ہی بدعہد ہیں۔ منافق مردوں، منافق عورتوں اور کفار سے اللہ نے جہنم کی آگ کا وعدہ کر رکھا ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہی ان کے لیے کافی ہے۔ اور ان پر اللہ کی لعنت اور ان کے لیے دائمی عذاب ہے۔

اخلاص کے متضاد کے طور پر ایک اور لفظ جو قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے، وہ ہے ریاء۔ اس لفظ کی اصل ہے ''دیکھنا'' اور اس کا مفہوم یہی ہے کہ لوگ بظاہر بھلے کام کرتے دکھائی دیتے ہیں، لیکن ان کے عمل کے پردے میں جو نیت کارفرما ہوتی ہے، وہ ان کے عمل کو جھٹلا رہی ہوتی ہے۔ ان کا عمل اللہ کی خاطر نہیں ہوتا، بلکہ لوگوں پر رنگ جمانے کے لیے یا کسی خاص شخص کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ قرآن میں یہ لفظ منافقین کے عمل کو بیان کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے:

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا (۴:۱۴۲)

منافقین خدا سے چال بازی کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ چال وہ ان سے چل رہا ہے۔ اور جب یہ نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو الکسائے ہوئے اٹھتے ہیں، محض لوگوں کے دکھانے کے لیے اور اللہ کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔

عملِ خالص وہ ہے جو صرف اللہ کی خاطر کیا جائے۔ مثال کے طور پر قرآن میں زکوٰۃ کے لازمی فریضے کے علاوہ بھی خیرات اور انفاق کی تاکید کی گئی ہے۔ اب اگر یہ صدقہ اور خیرات اللہ کے لیے ہے تب تو یہ سچا انفاق ہے، لیکن اگر اس میں یہ نیت پنہاں ہو کہ لوگ مجھے سخی اور نیک دل سمجھیں گے تو یہ عمل ریاکاری پر مبنی ٹھہرے گا۔ مزید برآں یہ خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ جن لوگوں کو خیرات دی جا رہی ہے، ان کی آنکھ نیچی نہ ہو، کیونکہ اصل میں تو یہ تحفہ ان کو اللہ کی طرف سے مل رہا ہے۔ اس خیر کے کام کے لیے انھیں اللہ کا شکرگزار ہونا چاہیے، لیکن اگر آپ کی کوشش یہ رہی کہ ان کو اپنا مرہونِ

احسان بنائیں تو آپ کا عمل، آپ کا کارِ خیر نیت کی خرابی سے داغدار ہو جائے گا۔ آپ بھی اور وہ بھی، دونوں توحید کو بھلا دیں گے۔

اس سیاق وسباق میں قرآن نے بسا اوقات مَنّ کا لفظ بھی استعمال کیا ہے جس کا مطلب ہے ''یہ کوشش کرنا کہ لوگ آپ کے احسان مند رہیں، بارِ منتِ احسان اٹھاتے رہیں''، مثلاً آپ نے اپنے دوست کو ایک اچھا سا ڈسک پلیئر سالگرہ کے تحفے میں دیا۔ پھر آپ ہر موقع پر اسے جتاتے رہے کہ آپ کتنے کشادہ دست اور دینے دلانے والے ہیں تاکہ اپنے لیے کوئی مفاد طلب کرسکیں یا صرف اتنا ہی ہو کہ آپ کے اندر ایک اطمینان پرورش پاتا رہے کہ واہ بھئی میں کیسا اچھا اور شاندار آدمی ہوں۔ اپنے دوست سے اس طرح کا برتاؤ یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ تحفہ اصل میں تحفہ نہیں تھا، متوقع مفاد کے لیے سرمایہ کاری تھی۔ قرآن مجید نے کھلے لفظوں میں اس قسم کے ظالمانہ عمل کی ممانعت کی ہے اور یہ کہا ہے کہ دوسروں پر اس طرح احسان جتانا اور اپنی مہربانیوں کا بار بار تذکرہ کر کے انھیں شرمندہ کرنا اور دکھ دینا ایسے ہی ہے جیسے اس تحفے کو برباد کر دینا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (۲:۲٦٤)

اے ایمان والو! احسان جتا کر اور دل آزاری کر کے اپنی خیرات کو اکارت مت کرو، اس شخص کی مانند جو اپنا مال لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور روزِ آخرت پر وہ ایمان نہیں رکھتا۔

سو اخلاص کا ایک جزو یہ بھی ٹھہرا کہ انسان دکھاوا نہ کرے، جو کرے صرف اللہ کے لیے کرے اور کسی کو اس کی خبر نہ ہونے دے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ ''چھپا کر کیے ہوئے نیکی کے کاموں سے اللہ کا غضب ٹل جاتا ہے۔''[۵] انسان کو چاہیے کہ نہ تو دوسرے لوگوں کے سامنے اپنی نیکی کا دکھاوا کرے اور نہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے حضور نیکی جتلانے کی کوشش کرے۔ اگر دوسرے آدمی پر احسان جتانا بری اور گری ہوئی بات ہے تو اس سے کہیں زیادہ بری اور احمقانہ بات یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ اور اس کے رسولؐ پر اس امر کا احسان جتانے چلے کہ اس نے وحی کا پیغام قبول کر لیا اور اس کی پیروی کرتا رہا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اسلام اور ایمان کا فائدہ اگر کسی کو ہے تو انسان کی اپنی ذات کو، اللہ اور اس کے رسولؐ کو نہیں۔ شکر گذار ہمیں ہونا چاہیے ان کو نہیں:

يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَىَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۴۹:۱۷)

یہ تم پر احسان رکھتے ہیں کہ یہ لوگ اسلام لائے۔ کہہ دو کہ مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ رکھو، بلکہ یہ اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تم کو ایمان کی توفیق بخشی، اگر تم سچے ہو۔

آیئے! اب ذرا لوٹ کر پھر اخلاص کے لفظ پر غور کریں۔ اخلاص کے بنیادی معنی ہیں ''صاف ہونا، خالص ہونا، آمیزش سے پاک ہونا۔'' اخلاص کے لفظی معنی ہیں ''خالص بنانا، صاف کرنا، چھاننا، ہر آمیزش سے پاک کرنا۔'' قرآن مجید نے یہ لفظ صرف ایک جگہ استعمال کیا ہے، "اَخْلَصُوا دِيْنَهُم لِلّٰه" (جنھوں نے اپنا دین اللہ ہی کے لیے خالص کرلیا)۔ یہاں ہمیں منافقوں کے بارے میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ وہ اگر اپنے دین، یعنی اپنے ایمان وعمل کو ہر طرح کی ملاوٹ سے پاک کرلیں تو ان کی اصلاح ہوسکتی ہے۔ کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ ''صاحب اس کا اطلاق تو صرف منافقین پر ہوتا ہے، مجھ پر نہیں''، لیکن ایسا کہنے والے نے یہ فراموش کر دیا کہ جب تک ہوا و ہوس اور دوسرے جھوٹے خداؤں کا ذرا سا اثر بھی انسان کی سوچ اور اس کے عمل پر پڑتا رہے، وہ منافق ہی ہوتا ہے:

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا۔ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا (۴:۱۴۵-۴۶)

منافقین دوزخ کے سب سے نیچے کے طبقے میں ہوں گے۔ اور تم ان کا کوئی مددگار نہ پاؤ گے، البتہ جو توبہ اور اصلاح کرلیں گے اور اللہ کو مضبوطی سے پکڑیں گے اور اپنی اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کرلیں گے، وہ ایمان والوں کے ساتھ ہوں گے۔ اور اللہ ایمان والوں کو اجر عظیم عطا فرمائے گا۔

یاد رہے کہ قرآن مجید کے مطابق منافقوں کا ٹھکانا جہنم کا سب سے گہرا گڑھا ہوگا۔ اِس سے اِس بات کا بھی اندازہ ہوجاتا ہے کہ مسلمانوں کی نظر میں منافقت کیسی قبیح چیز ہے اور اس کے برعکس اخلاص کیسی اچھی اور پسندیدہ صفت ہے۔ ایک حدیث میں یہی بات قدرے آرایشی زبان میں یوں بیان کی گئی ہے:[۶]

رسولِ خداؐ ایک روز اپنے چند صحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ زور کی ایک دھمک سنائی دی۔ آنحضرتؐ

کے سوا سبھی لوگ چونک اٹھے۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑاتے ہوئے صحابہ میں سے ایک آدھ نے کہا، ”یہ کیا تھا“؟ آنحضرتؐ نے اطمینان سے فرمایا: ”یہ اس پتھر کی آواز تھی جو خزاں کے ستّر موسم قبل دوزخ میں پھینکا گیا تھا اور اب جا کر اُس کی تہ میں گرا ہے۔“ صحابہؓ حیرت سے ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ چند لمحے گذرے تھے کہ ایک شخص دوڑا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ فلاں مشہور منافق کو ابھی موت نے آن لیا۔ اس منافق کی عمر ستّر سال تھی۔

بہت سی آیات میں قرآن مجید نے اخلاص سے بننے والے اسم صفت بھی استعمال کیے ہیں مثلاً مُخلِص اور مُخلَص۔ مجموعی طور پر گیارہ مقامات میں سے جہاں مُخلِص کا لفظ استعمال ہوا ہے، اِن میں سے دس جگہوں پر اس صفت کو متذکرہ بالا آیۂ مبارکہ کی طرح لفظِ دین سے متعلق کیا گیا ہے، اِسی طرح اس صفت کا تعلق عبادت سے بھی ہے: اوّل الذکر کا مطلب ہے ”پاک کرنے والا“ اور ”صاحبِ اخلاص“، جب کہ دوسرے کا مطلب ہے ”پاک شدہ“ یا جسے [اللہ کی جانب سے] اخلاص عطا ہو۔“

اِنَّآ اَنۡزَلۡنَآ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ فَاعۡبُدِ اللّٰهَ مُخۡلِصًا لَّهُ الدِّيۡنَ (۳۹:۲)

بے شک ہم نے یہ کتاب تمھاری طرف قولِ فیصل کے ساتھ اتاری ہے، تو تم اللہ ہی کی بندگی کرو، اسی کی خالص اطاعت کے ساتھ۔

قُلۡ اِنِّىۡۤ اُمِرۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ اللّٰهَ مُخۡلِصًا لَّهُ الدِّيۡنَ (۳۹:۱۱)

کہ دو مجھے تو حکم ملا ہے کہ میں اللہ کی بندگی کروں، اسی کی خالص اطاعت کے ساتھ۔

قُلۡ اَمَرَ رَبِّىۡ بِالۡقِسۡطِ وَاَقِيۡمُوۡا وُجُوۡهَكُمۡ عِنۡدَ كُلِّ مَسۡجِدٍ وَّادۡعُوۡهُ مُخۡلِصِيۡنَ لَهُ الدِّيۡنَ كَمَا بَدَاَكُمۡ تَعُوۡدُوۡنَ (۷:۲۹)

کہ دو کہ میرے اللہ نے تو ہر معاملے میں قسط کا حکم دیا اور یہ کہ ہر مسجد کے پاس اپنا رخ اسی طرف کرو اور اسی کو پکارو، اسی کے لیے اطاعت کو خاص کرتے ہوئے۔ جس طرح اس نے تمھارا آغاز کیا اسی طرح تم لوٹو گے۔

هُوَ الۡحَىُّ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادۡعُوۡهُ مُخۡلِصِيۡنَ لَهُ الدِّيۡنَ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ (۴۰:۶۵)

وہ زندہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، تو اسی کو پکارو، اسی کی خالص اطاعت کے ساتھ! شکر کا سزاوار اللہ ہے۔ عالم کا خداوند!

لازم نہیں کہ اخلاص بھی ہمیشہ کامل اور بے لوث ہوا کرے۔ کچھ آیاتِ قرآنی میں ذکر آیا ہے کہ جب انسان کسی مشکل میں پڑتا ہے تو خطرے کے روبرو اللہ کو پکارنے لگتا ہے اور ”اپنے دین کو اللہ

کے لیے خالص کرنے لگتا ہے۔'' پھر جب خطرہ ٹل جاتا ہے تو وہ اپنی پرانی ڈگر پر آ جاتا ہے۔ یہ سچا اخلاص نہیں، کیونکہ اِس میں ثابت قدمی نہیں پائی جاتی:

فَاِذَا رَکِبُوْا فِی الْفُلْکِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَی الْبَرِّ اِذَا هُمْ یُشْرِكُوْنَ ۙ لِیَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَیْنٰهُمْ وَلِیَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ (۲۹:۶۵-۶۶)

پس جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو اللہ کو پکارتے ہیں اسی کے لیے اطاعت کو خاص کرتے ہوئے۔ پس جب وہ ان کو خشکی کی طرف نجات دے دیتا ہے تو پھر وہ اس کے شریک ٹھہرانے لگتے ہیں کہ ہم نے جو نعمت بخشی اس کی ناشکری کریں اور چند دن اور بہرہ مند ہولیں، پس وہ عنقریب جانیں گے!

آخری بات یہی ٹھہری کہ حقیقی اخلاص انسان خود سے حاصل نہیں کرسکتا۔ یہ اللہ ہی کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔ اللہ کے سوا جیسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں اور اس کے سوا مُضِل (گمراہ کرنے والا) بھی اور کوئی نہیں اسی طرح دینِ خالص بھی اللہ تعالیٰ ہی قائم کرتا ہے۔ قرآن مجید نے جن آٹھ آیات میں مُخلَص (صاحبِ اخلاص بنایا گیا) کا لفظ استعمال کیا ہے، اس کا اشارہ ان میں اِس آیت میں خاص طور پر نمایاں ہے: اِس میں حضرت موسیٰؑ کے بارے ارشاد ہوتا ہے:

وَاذْكُرْ فِی الْكِتٰبِ مُوْسٰۤی اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِیًّا (۱۹:۵۱)

اور کتاب میں موسیٰ کی سرگزشت کو یاد کرو۔ بے شک وہ برگزیدہ اور رسول اور نبی تھا۔

نوعِ انسانی میں سے کوئی شخص اللہ کا نبی تبھی بنتا ہے جب اسے پہلے خود اللہ تعالیٰ نے خالص بنا دیا ہو۔

باقی سات آیات جن میں مُخلَص کا لفظ آیا ہے، وہاں ذکر ہے **"عِبَادَاللّٰهِ الْمُخْلَصِیْنَ"** اللہ کے خالص بندوں کا)۔ یہ وہ انسان ہیں جو جنت میں جائیں گے یا جو شیطان کے حیلہ وفریب سے محفوظ ہیں۔ یہ امر کہ یہ لوگ اللہ کے ''بندے'' ہیں، ہمیں یہ بھی سمجھا رہا ہے کہ اس بندگی میں اور کیا کچھ مضمر ہے۔ اس کا مطلب ہے صرف اور صرف اللہ کی کامل عبادت اور صرف اس سے پوری طرح لو لگانا اور اپنے ایمان وعمل کو صرف اُس ذاتِ واحد پر اِس طرح سے مرکوز کر دینا، کہ ہوا و ہوس اور دوسروں کی پرستش کی کوئی گنجایش باقی نہ رہے۔

خلاصہ یہ کہ اخلاص دراصل انسان میں توحید کی تجسیم کا نام ہے۔ اس بات کی توجیہ اِس اَمر

سے بھی ہوتی ہے کہ قرآن مجید کی سورت ۱۱۲ کو سورۂ اخلاص بھی کہا جاتا ہے اور سورۂ توحید بھی۔ جب توحید انسان کی پوری زندگی پر چھا جاتی ہے اور وہ توحید پر پوری طرح عمل پیرا ہو جاتا ہے تو وہ مُخلِص بھی ہوتا ہے اور مُخلَص بھی، یعنی وہ اپنے دین کو صرف اور صرف اللہ کے لیے خالص کر لیتا ہے اور اس کے انعام میں اللہ تعالیٰ اس کو اپنے سوا ہر شے سے، ماسویٰ اللہ سے، رشتہ جوڑنے اور اس پر توجہ دینے کی آلاش سے پاک کر دیتا ہے۔

تقویٰ God- wariness

احسان کے قریب قریب ہم معنی الفاظ میں سے غالبًا سب سے اہم لفظ تقوی ہے جس کا انگریزی ترجمہ ہم God - wariness کے الفاظ سے اب تک کرتے آئے ہیں۔ مترجمینِ قرآن نے اس لفظ کے بہت سے مترادف استعمال کیے ہیں، مثلاً dutifulness, piety, righteousness, good conduct, Godfearing, God conciousness, guarding against evil.

قرآن میں اہلِ تقویٰ یا متقی انسانوں کا ذکر اہلِ اخلاص اور اہلِ احسان سے کہیں زیادہ تعداد میں آیا ہے۔ لفظِ تقوی کے معنی ہیں ''بچاؤ کرنا، حفاظت کرنا، ہوشیار کرنا، بچنا، احتیاط کرنا، اچھی طرح نگہداشت کرنا''، ''کسی چیز سے ڈرنا، گھبرانا۔'' صاف ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسا انسانی رویّہ ہے جو ہر انسانی خوبی کا نچوڑ ہے اور قرآن کی رُو سے اس خیر و خوبی کا ہدف و مرکز اللہ تعالیٰ کو ہونا چاہیے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ (۴۹:۱۳)	اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ اشرف وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔

قرآن مجید میں بارہا انسان کے لیے تقویٰ کا حکم آیا ہے۔ عام طور پر ان آیات میں فعل اس طرح استعمال ہوا ہے کہ اسم مفعول خود ذاتِ خداوندی قرار پاتی ہے۔ اس صورت میں ہماری نظر میں اس کا ترجمہ یوں ہوگا ''Be wary of God''۔ بعض لوگ ہوسکتا ہے اس کا ترجمہ '' be dutiful، be God fearing، Pious toward God، be concious of God، toward God وغیرہ کریں۔ لفظ کے مضمرات یہ ہیں کہ انسان ہمیشہ اللہ کی طرف متوجہ رہے تو وہ بہت سی چیزوں سے اپنا بچاؤ کر لیتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر آپ جب بھی کچھ کہیں یا کریں تو یوں کریں گویا ''خدا آپ کو دیکھ رہا

ہے۔'' یہاں آپ کو بہت محتاط رہنا چاہیے کہ ہمیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف ہمارے عمل ہی کو نہیں دیکھتا، ہماری سوچ بھی اس پر عیاں ہے:

وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (۴:۱۲۸)	اگر تم حسن سلوک کرو گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو جو کچھ کرو گے، اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔
وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۲:۲۳۳)	اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور جان رکھو کہ یقیناً اللہ جو کچھ تم کر رہے ہو اُسے دیکھنے والا ہے۔
وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۵:۷)	بے شک اللہ سینوں کے بھیدوں سے بھی باخبر ہے۔

تقویٰ کے لفظ میں ایک اور بات بھی مضمر ہے کہ انسان خود کو کسی خطرناک چیز سے بچا رہا ہے۔ ایسے مقامات پر قرآن مجید اسمِ مفعول کے طور پر ذاتِ خداوندی کو نہیں لاتا، بلکہ اس کا عذاب، وعید وتنبیہ، سزا اور دھمکی وہ چیز ہوتی ہے جس سے بچنے کا نام تقویٰ ہے۔ یہاں قرآن انسان کو یہ یاد دلاتا ہے کہ ایک روز اسے اللہ کے روبرو جانا ہے اور اپنے عمل کے لیے اس کے حضور جواب دہی کرنا ہے:

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۲:۱۹۶)	اور اللہ سے ڈرتے رہو اور اچھی طرح جان رکھو کہ اللہ سخت پاداش والا ہے۔
وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ (۲:۱۹۷)	اور نیکی کے جو کام بھی کرو گے، اللہ اس کو جانتا ہے۔ اور اس کے لیے (تقویٰ کا) زادِراہ لو، بہترین زادِراہ تقویٰ (کا زادِراہ) ہے۔ اور مجھ سے ڈرتے رہو، اے عقل والو!
وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ (۲:۲۰۳)	اور اللہ سے ڈرتے رہو اور خوب جان رکھو کہ تم اسی کے حضور میں اکٹھے کیے جاؤ گے۔
وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۲:۲۲۳)	اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ تمھیں اس سے ملنا ہے۔ اور خوشخبری دو ایمان والوں کو۔
وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا	اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی جان کسی

وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (۲:۱۲۳)، (۲:۴۸)

دوسری جان کے کچھ کام نہ آئے گی، نہ اس کی طرف سے کوئی سفارش قبول ہوگی اور نہ اس سے کوئی معاوضہ لیا جائے گا، اور نہ ان کی کوئی مدد کی جائے گی۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِىْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَجَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْئًا اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ (۳۱:۳۳)

اے لوگو! اپنے رب (کی پکڑ) سے بچو اور اس دن سے ڈرو جس دن نہ کوئی باپ اپنی اولاد کے کام آئے گا اور نہ کوئی اولاد اپنے باپ کے کچھ کام آنے والی بن سکے گی۔ بے شک اللہ کا وعدہ شدنی ہے تو دنیا کی زندگی تمھیں دھوکے میں نہ ڈالنے پائے اور نہ اللہ کے باب میں فریب کار تمھیں دھوکے میں رکھے!

قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِيْنِىْ ، فَاعْبُدُوْا مَاشِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ قُلْ اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَلَا ذٰلِكَ هُوَالْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ، لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَ مِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ يٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ (۳۹:۱۴-۱۶)

کہ دو میں تو اللہ ہی کی بندگی کرتا ہوں، اسی کے لیے خالص اپنی اطاعت کے ساتھ تو تم اس کے سوا جس کی چاہو بندگی کرو۔ کہ دو کہ حقیقی خسارے میں پڑنے والے وہی ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو قیامت کے دن خسارے میں ڈالا۔ یاد رکھو کہ کھلا ہوا خسارہ وہی ہے ان کے لیے۔ اُن کے اوپر بھی آگ کے پردے ہوں گے اور ان کے نیچے بھی۔ یہ چیز ہے جس سے اللہ اپنے بندوں کو ڈرا رہا ہے۔ میرے بندو! پس مجھی سے ڈرو۔ تقویٰ کا راستہ وہی راستہ ہے جس کی نشان دہی نبیوں نے کی، یہ وہی راہ

	ہے جس پر اللہ کی نشانیاں ثبت ہیں۔
اِنَّ فِی اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَّقُوۡنَ (۱۰:۶)	بے شک رات اور دن کی آمد و شد اور آسمانوں اور زمین میں اللہ کی مخلوقات میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ڈریں۔
کَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ اٰیٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمۡ یَتَّقُوۡنَ (۲:۱۸۷)	اس طرح اللہ اپنی آیتیں لوگوں کے لیے واضح کرتا ہے تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔
وَکَذٰلِكَ اَنۡزَلۡنٰهُ قُرۡاٰنًا عَرَبِیًّا وَّصَرَّفۡنَا فِیۡهِ مِنَ الۡوَعِیۡدِ لَعَلَّهُمۡ یَتَّقُوۡنَ اَوۡ یُحۡدِثُ لَهُمۡ ذِکۡرًا (۲۰:۱۱۳)	اور اسی طرح ہم نے اس کو عربی قرآن کی صورت میں اتارا اور اس میں ہم نے اپنی وعید گوناگوں پہلوؤں سے واضح کر دی ہے تاکہ یہ لوگ خدا کے غضب سے بچیں یا یہ ان کے اندر کچھ سوجھ بوجھ پیدا کرے۔
وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیۡ مُسۡتَقِیۡمًا فَاتَّبِعُوۡهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمۡ عَنۡ سَبِیۡلِهٖ ذٰلِکُمۡ وَصّٰکُمۡ بِهٖ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ (۶:۱۵۳)	اور یہ کہ یہی میرا راستہ سیدھا راستہ ہے تو اس کی پیروی کرو اور دوسری پگڈنڈیوں پر نہ چلو کہ وہ تمھیں اس کی راہ سے الگ کر دیں گی۔ یہ باتیں ہیں جن کی تمھیں ہدایت فرمائی گئی تاکہ اس کے غضب سے بچو۔

انبیا کی پیروی کر کے جب انسان خود کو قہر خداوندی سے، اس کے جلال سے بچا لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے دامانِ رحمت و جمال میں سمیٹ لیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ تقویٰ یا God-wariness کا انعام جنت ہے:

وَ اِذَا قِیۡلَ لَهُمُ اتَّقُوۡا مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡکُمۡ وَمَا خَلۡفَکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ (۳۶:۴۵)	اور جب ان سے کہا جاتا کہ اس چیز سے ڈرو جو تمھارے آگے اور پیچھے ہے کہ تم پر رحم کیا جائے (تو وہ اعراض کرتے ہیں)۔
اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ اِخۡوَةٌ فَاَصۡلِحُوۡا بَیۡنَ اَخَوَیۡکُمۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ (۴۹:۱۰)	مسلمان باہم دگر بھائی ہیں، تو اپنے بھائیوں کے مابین مصالحت کراؤ اور اللہ سے

ڈرتے رہو کہ تم پر رحم کیا جائے۔

وَ اِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۴:۱۲۹)

اور اگر تم اصلاح کرتے رہو گے تو خدا بے شک بخشنے والا اور مہربان ہے۔

فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۷:۳۵)

جو ڈرا اور جس نے اصلاح کر لی، ان کے لیے نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَ اِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (۳:۱۷۹)

تو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ۔ اور اگر تم ایمان لائے اور تم نے تقویٰ اختیار کیا تو تمھارے لیے بہت بڑا اجر ہے۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵۷:۲۸)

اے وہ لوگو جو ایمان لائے! اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، وہ تم کو اپنی رحمت میں سے دو حصے دے گا اور تمھارے لیے روشنی بنائے گا جس کو لے کر تم چلو گے اور تمھاری مغفرت فرمائے گا۔

لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (۳:۱۵)

جو لوگ تقویٰ اختیار کریں گے، ان کے لیے ان کے رب کے پاس باغ ہیں، جن میں نہریں جاری ہوں گی۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّ ظِلُّهَا تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ (۱۳:۳۵)

اس جنت کی تمثیل، جس کا متقیوں سے وعدہ ہے، یہ ہے کہ اس میں نہریں بہ رہی ہوگی، اس کا پھل بھی دائمی اور اس کا سایہ بھی (دائمی)۔ یہ انجام ہے ان لوگوں کا جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا۔ اور کافروں کا انجام دوزخ ہے۔

تقویٰ تک رسائی ''اللہ کی عبادت''، یعنی اللہ کے کامل بندے بن کر توحید کو قائم و استوار کر کے ہی حاصل ہو سکتی ہے:

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اَفَلَا

اے قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا

تَتَّقُوْنَ (۷:۶۵) (۲۳:۳۲)
معبود کوئی نہیں، تو کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟

یٰاَیُّهَاالنَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۲:۲۱)
اے لوگو! بندگی کرو اپنے اس خداوند کی جس نے تم کو بھی پیدا کیا اور ان کو بھی جو تم سے پہلے گذرے ہیں تا کہ تم (دوزخ کی آگ سے) محفوظ رہو۔

تقوی کی جو تصویر قرآن مجید سے اُبھرتی ہے، وہ صفاتِ تنزیہ وتشبیہ کے درمیان پائے جانے والے تعلق کی ایک واضح مثال ہے، چونکہ تقویٰ اللہ تعالیٰ کے انذار وعذاب سے بچنے پر مرکوز ہے اِس لیے اللہ اور اس کے بندے کے مابین صحیح تعلق یا بالفاظِ دیگر رعایا اور شہنشاہِ کائنات کے درمیان رابطے کی صحیح صورت اس میں بخوبی دیکھی جاسکتی ہے۔ انسان کو جس خدا سے بچنا اور ڈرنا چاہیے، وہ خداوندِ پُر جلال وقہر ہے، وہ خدا جو اس سے دور کہیں ہے اور اس بات کا سزاوار ہے کہ اس کی ہیبت اور خوف انسان کو لرزادے۔

انسان جب ایک مرتبہ ''تنزیہ'' کا رشتہ وتعلق استوار کرلے تو یہ نہیں ہوتا کہ وہ اللہ سے دوری میں پڑا رہے، بلکہ اللہ تعالیٰ اسے اپنے قرب میں لے آتے ہیں۔ اس کی رحمت، مہربانی اور جمال اپنے بندوں کی عاجزی اور فروتنی کے جواب میں انھیں سمیٹ کر اپنے حضور میں بلند مراتب عطا کردیتا ہے۔ اللہ کا قرب ہی انسان کو اس لائق بناتا ہے کہ وہ خود کو شائستۂ خلافتِ الٰہی بنا سکے۔

وہ لوگ جو اہلِ تقویٰ میں سے ہیں وہ الرحمن کے قرب سے سرفراز ہوں گے اور جو اپنے فرائض انجام دینے میں ناکام رہے ہوں گے، وہ القہار کے عذاب کی پکڑ میں آجائیں گے:

یَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِیْنَ اِلَی الرَّحْمٰنِ وَفْدًا، وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِیْنَ اِلٰی جَهَنَّمَ وِرْدًا (۱۹:۸۵-۸۶)
(یاد کرو) جس دن ہم خدا ترسوں کو خدائے رحمان کی طرف وفد وفد لے جائیں گے اور مجرموں کو جہنم کے گھاٹ کی طرف ہانکیں گے، پیاسے۔

قرآن مجید کی ایک آیت میں رحمتِ خداوندی کی دو اقسام کے درمیان واضح امتیاز کیا گیا ہے۔ اپنے وسیع معنی میں رحمت اس شفقتِ خداوندی، اس مہربانی اور نرمی کا حوالہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف

سے ساری مخلوقات کے لیے عام ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر مخلوق کو عدم سے وجود میں لائے جب کہ کسی مخلوق کا حق نہ تھا کہ مطالبۂ وجود کرسکتی۔ رحمت کا ایک محدودتر مفہوم یہ ہے کہ اہلِ تقویٰ کو اللہ کا قرب عطا ہوتا ہے۔ اس کی دوسری طرف عذابِ خداوندی ہے جو ان پر نازل ہوتا ہے جنھوں نے اللہ سے دور رہنے ہی کو اپنا شعار بنالیا ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ اللہ سے دوری ہی عذاب کا دوسرا نام ہے۔ یہ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کیونکہ ''الحق'' کی سالمیت اور ہم آہنگی سے دور ہونے کا مطلب ہے بے حقیقتی کی پارہ پارہ کیفیت اور بے نظمی اور انتشار کا غلبہ۔ اہلِ تقویٰ رحمت کے سزاوار ہوں گے اور تقویٰ کا تقاضا ہے اسلام اور ایمان۔

وَعَذَابِيٓ اُصِيبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ، اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (٧:١٥٦-٥٧)

میں اپنے عذاب میں تو اسی کو مبتلا کرتا ہوں جس کو چاہتا ہوں، اور میری رحمت ہر چیز کو عام ہے۔ سو میں اس کو ان لوگوں کے لیے لکھ رکھوں گا جو تقویٰ اختیار کریں گے اور زکوٰۃ دیتے رہیں گے اور جو ہماری آیات پر ایمان لائیں گے، جو پیروی کریں گے اس نبی امی رسول کی جسے وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ وہ ان کو نیکی کا حکم دیتا ہے، برائی سے روکتا ہے، اور ان کے لیے پاکیزہ چیزیں جائز ٹھہراتا ہے اور خبیث چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اور پابندیاں اتارتا ہے جو ان پر اب تک رہی ہیں۔ تو جو اس پر ایمان لائے، جنھوں نے اس کی عزت کی، اس کی مدد کی اور اس روشنی کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اتاری گئی ہے تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

محبت Love

لفظِ احسان میں جو کچھ بھی مضمر ہے، اس سے سب سے گہرا ربط ''حُبّ'' (محبت) کا ہے۔ بعد کے زمانوں میں تو بالخصوص جب احسان کو اسلام کی تین جہات میں سے ایک کے طور پر موضوعِ بحث قرار دیا گیا تو ''محبت'' ایک مرکزی مبحث بنتی چلی گئی۔ فی الجملہ، سوال یہ ہے کہ انسان کا رویّہ اللہ کے بارے میں کیا ہونا چاہیے؟ تو اِس کا جواب، ہے محبت۔

اسلام کے تصورِ عشق یا تصورِ محبت کو سمجھنا ہو تو پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ قرآن مجید نے اس اصطلاح کو کس طرح استعمال کیا ہے۔ خاص طور پر یہ جاننا چاہیے کہ محبت کا اللہ تعالیٰ سے کیا ربط و تعلق بنتا ہے۔ ایک مرتبہ یہ بات سمجھ میں آجائے کہ اللہ کے محبت کرنے کا کیا مطلب ہے، تو یہ سمجھنا آسان ہو جائے گا کہ انسانی محبت میں کیا کچھ پنہاں ہے۔

لگ بھگ پندرہ آیات ایسی ہیں جن میں قرآن مجید نے ''محبت'' کو اللہ تعالیٰ سے نسبت دی ہے اوران کے علاوہ اور متعدد آیات بھی ایسی ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو کن چیزوں سے محبت نہیں ہے۔ انسانی محبت کو اللہ تعالیٰ کے حوالے سے اگر کوئی معنویت مل سکتی ہے تو فقط اس طرح کہ وہ حُبِّ الٰہی کی مثال کی پیروی کرے۔

ایک حدیث ہے جو ہم پہلے بھی درج کر چکے ہیں؛ اس پر غور کیجیے تو تصورِ محبت کو اس سیاق وسباق میں رکھا جا سکتا ہے جس میں اسلامی روایت نے اسے دیکھا اور سمجھا۔ رسولِ خداؐ نے فرمایا: ''**اللّٰہ جمیلٌ و یحب الجمال۔**'' بعد کے زمانے میں تو ہمیشہ یہی کہا گیا کہ محبت کا ہدف صرف ایک صاحبِ جمال اور حسین چیز ہی ہو سکتی ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ محبت کے بارے میں اس نقطۂ نظر کو قرآن سے الگ سمجھا جائے۔ عربی کتبِ لغت سے معلوم ہوتا ہے کہ عملاً ''جمال'' اور ''حُسن'' دونوں مترادف ہیں۔ احسان کا مطلب ہے حسنِ عمل۔ قرآن میں چودہ مقامات پر ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شے سے محبت کرتے ہیں۔ ان میں سے پانچ مقامات پر محبت ان لوگوں کے لیے مذکور ہے جو اہلِ احسان ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرتے ہیں تو صرف اسی لیے کہ حسنِ عمل سے خود ان میں اخلاقِ حسنہ اور اوصافِ جمیلہ پیدا ہو گئے ہیں اور ان کی وجہ سے وہ اللہ کی محبت کے لائق شمار ہوتے ہیں۔

قرآن میں جہاں کہیں بھی یہ ذکر آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شے سے محبت کرتے ہیں، وہاں نوعِ انسانی کے افراد ہی اللہ کی محبت کے قابل قرار دیے گئے ہیں۔ یہ بہت خاص لوگ ہوتے ہیں، ساری اولادِ آدم

نہیں۔ اللہ کے محبوب انسان وہ ہیں جن کے اعمال اور جن کے اخلاق واوصاف حسن وخوبی کا مرقع ہیں:

اَحۡسِنُوۡا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ (۲:۱۹۵)

اور انفاق خوبی کے ساتھ کرو۔ بے شک اللہ خوبی کے ساتھ کام کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

وَسَارِعُوۡۤا اِلٰی مَغۡفِرَۃٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَ جَنَّۃٍ عَرۡضُہَا السَّمٰوٰتُ وَالۡاَرۡضُ اُعِدَّتۡ لِلۡمُتَّقِیۡنَ، الَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالۡکٰظِمِیۡنَ الۡغَیۡظَ وَالۡعَافِیۡنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡن (۳:۱۳۳-۴)

اور اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کے لیے مسابقت کرو جس کا عرض آسمانوں اور زمین کے عرض کی طرح ہے۔ یہ پرہیزگاروں کے لیے تیار ہے، ان لوگوں کے لیے جو کشادگی اور تنگی، ہر حال میں خرچ کرتے رہتے ہیں، غصہ کو ضبط کرنے والے اور لوگوں سے درگذر کرنے والے ہیں، اور اللہ خوب کاروں کو دوست رکھتا ہے۔

بَلٰی مَنۡ اَوۡفٰی بِعَہۡدِہٖ وَاتَّقٰی فَاِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُتَّقِیۡنَ (۳:۷۶)

ہاں! جو لوگ اس کے عہد کو پورا کریں گے اور (اللہ سے) ڈریں گے تو بے شک اللہ اپنے سے ڈرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

لَیۡسَ عَلَی الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِیۡمَا طَعِمُوۡۤا اِذَا مَااتَّقَوۡا وَّ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوۡا وَّ اٰمَنُوۡا ثُمَّ اتَّقَوۡا وَّاَحۡسَنُوۡا ؕ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡن (۵:۹۳)

جو لوگ ایمان لائے، اور کام نیک کیے، ان پر نہیں گناہ جو کچھ پہلے کھا چکے، جب آگے ڈرے، اور ایمان لائے، اور عمل نیک کیے، پھر ڈرے، اور یقین کیا، پھر ڈرے، اور نیکی کی، اور اللہ چاہتا ہے نیکی والوں کو۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیۡنَ وَیُحِبُّ الۡمُتَطَہِّرِیۡنَ (۲:۲۲۲)

اللہ توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

فَتَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُتَوَکِّلِیۡنَ (۳:۱۵۹)

تو اللہ پر بھروسا کرو۔ بے شک اللہ اپنے اوپر بھروسا کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَهُمَا بِالۡعَدۡلِ وَاَقۡسِطُوۡا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُقۡسِطِيۡنَ (۴۹:۹)	تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ مصالحت کرا دو اور ٹھیک ٹھیک انصاف کرو۔ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔

ان آیات سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اخلاق و کردار کی وہ کون سی چیزیں ہیں جو انسان کے لیے مطلوب ہیں اور پسندیدہ انسانی اوصاف کیا ہیں۔ اس کے برعکس ۲۳ قرآنی آیات میں وہ انسانی صفات مذکور ہوئی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ ناپسند کرتے ہیں۔ سو یہ امر باعثِ تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ حق کا انکار کرنے والوں، ظالموں، فسادی لوگوں، متکبروں، فاسقوں، سرکشوں، حد سے گذرنے والوں اور ڈینگ ہانکنے والوں سے محبت نہیں کرتے۔

قرآن میں محبت کا لفظ جس طرح برتا گیا ہے اس کے بارے میں اہم ترین نکات میں یہ بھی ہے کہ یہ صفت یا تو اللہ تعالیٰ سے منسوب کی گئی ہے اور یا انسانوں میں پائی گئی ہے، اور کسی چیز کو اس میں سے حصہ نہیں ملا، اور پھر یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر کسی مخلوق سے محبت کرتے ہیں تو وہ صرف نوعِ انسانی ہی ہے۔ بہت سے علما کا خیال ہے کہ اور ہر صفت سے بالاتر ہو کر محبت ہی وہ صفت ہے جو خدا اور بندے کے باہمی تعلق کو بیان کرتی ہے، یہی اس ''بارِ امانت'' کا حقیقی مفہوم ہے جو انسان کے سپرد کیا گیا تھا۔ اللہ کا محبوب صرف انسان ہی ہوسکتا ہے اور نوعِ انسانی کے افراد ہی اللہ سے محبت کر سکتے ہیں۔

ہاں، اللہ تعالیٰ ان انسانوں سے محبت نہیں کرتے جو اس سے محبت نہ کریں۔ انسان اللہ تعالیٰ سے محبت کر سکتا، لیکن بالعموم اس کی محبت کا مرکز کچھ اور ہوتا ہے:

كَلَّا بَلْ لَّا تُكۡرِمُوۡنَ الۡيَتِيۡمَ ۙ وَلَا تَحٰٓضُّوۡنَ عَلٰى طَعَامِ الۡمِسۡكِيۡنِ ۙ وَتَاۡكُلُوۡنَ التُّرَاثَ اَكۡلًا لَّمًّا ۙ وَّتُحِبُّوۡنَ الۡمَالَ حُبًّا جَمًّا (۸۹:۱۷-۲۰)	ہرگز نہیں، بلکہ تم یتیموں کی قدر نہیں کرتے اور نہ مسکینوں کو کھلانے پر ایک دوسرے کو ابھارتے ہو اور وراثت کو سمیٹ کر ہڑپ کرتے ہو اور مال کے عشق میں متوالے ہو۔
اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوۡنَ الۡعَاجِلَةَ (۷۶:۲۷)	یہ لوگ صرف دنیائے عاجل سے محبت رکھتے ہیں۔
زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالۡبَنِيۡنَ وَالۡقَنَاطِيۡرِ الۡمُقَنۡطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالۡفِضَّةِ	لوگوں کی نگاہوں میں مرغوباتِ دنیا: عورتیں، بیٹے، سونے چاندی کے ڈھیر، نشان زدہ

وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ (۳:۱٤)

گھوڑے، چوپائے اور کھیتی کھبادی گئی ہیں۔ یہ دنیاوی زندگی کے سروسامان ہیں اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانا ہے۔

بہ الفاظِ دیگر انسان کو اس حسنِ گریز اں سے دل نہیں لگانا چاہیے جس کی کشش اس کی خواہشات کو کھینچتی رہتی ہے، بلکہ اس کی محبت کا ہدف اور مرکز اللہ تعالیٰ کا جمالِ لایزال ہونا چاہیے۔ نوعِ انسانی کے ہر روگ کا علاج اسی میں ہے کہ اس کی محبت کا رخ اس کے اصل مرکز اور اس کے سچے ہدف کی طرف پھر سے موڑ دیا جائے۔

یہاں آ کر ہمیں ایک مرتبہ پھر نبوّت کی بنیادی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ انسان ایک ایسے خدا سے کیوں کر محبت کر سکتا ہے جسے وہ جانتا ہی نہیں، اور پھر جب ایک مرتبہ اس نے یہ جان لیا کہ اللہ تعالیٰ ہی چاہے جانے کے قابل ہے تو پھر اسے کیا کرنا چاہیے؟ قرآن کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایک مرتبہ حبِ الٰہی کا شرارہ پھوٹ پڑے تو راستہ کھلا ہوا ہے۔ اب اس شخص کو رسولِ خدا کی سنت کی پیروی کرنا ہے۔ اسی صورت میں انسان عملِ صحیح، ایمانِ صالح اور احسان کے وسیلے سے اللہ کی طرف بڑھ سکتا ہے۔ صرف عمل ہی میں نہیں، بلکہ اخلاق و کردار میں بھی رسولِ خداؐ کا اتباع کرنے سے ہی انسان اللہ کی محبت کا مستحق ٹھہرتا ہے اور اللہ جس سے محبت کرے، وہ فلاح اور نجات پا لیتا ہے۔ جبھی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ سے فرمایا کہ:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۰ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ (۳:۳۱-۳۲)

کہ دو: اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم کو دوست رکھے گا اور تمھارے گناہوں کو بخشے گا اور اللہ بخشنے والا، رحم فرمانے والا ہے۔ کہ دو کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی، اور اگر یہ اعراض کریں تو یاد رکھیں کہ اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔

قرآن میں اللہ سے محبت کرنے کا ذکر اگرچہ بہت کم آیا ہے، تاہم جن چند آیات میں اس کا ذکر ہے انھیں بعد کی اسلامی روایت میں بہت اہمیت حاصل ہوئی۔ ایک آیت جو اس ضمن میں متواتر پیش کی جاتی رہی ہے، اس میں دو نکات ایسے ہیں جو خصوصیت سے اہم ہیں۔ پہلا یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہتے

ہیں کہ انسان ان سے محبت کرے اور دوسرا یہ کہ انسان کا اللہ سے محبت کرنا نتیجہ ہے اس بات کا کہ خود اللہ تعالیٰ انسان سے محبت کرتے ہیں۔ ہم نے ابھی جو آیت نقل کی، اس میں اگرچہ انسان کے اللہ سے محبت کرنے کا ذکر پہلے آیا ہے، مگر توحید کے نقطۂ نظر سے دیکھیے تو یہ کیوں کر تصور کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس محبت کو جِلا دیے بغیر انسان میں حُبِّ الٰہی کا امکان بھی پیدا ہو سکے۔ اللہ کی رحمت، اس کی مہربانی اور ہدایت شامل نہ ہو تو کوئی انسان کیوں کر اللہ سے محبت کر سکتا ہے؟ اللہ کی رحمت اور محبت نہ ہو تو کسی شے کا وجود ہی کہاں ہو گا؟

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِى اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (٥:٥٤)

اے ایمان والو! جو تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو (اللہ کو کوئی پروا نہیں) وہ جلد ایسے لوگوں کو اٹھائے گا جن سے وہ محبت کرے گا اور وہ اس سے محبت کریں گے، وہ مسلمانوں کے لیے نرم مزاج اور کافروں کے مقابلے میں سخت ہوں گے، اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہ کریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جس کو چاہے بخشے گا اور اللہ بڑی سمائی رکھنے والا اور علم والا ہے۔

یہ آیت ہمیں بتاتی ہے کہ محبت کی عطا اللہ کا انعام ہے اور اسی لیے اس کا رشتہ رحمت، جمال اور کرم کی صفاتِ خداوندی سے جا کر جڑ جاتا ہے۔

تصورِ ''صالحیت'' Wholesomeness

اسلام یا شریعت کا مقصد ہے صحیح عمل اور غلط عمل کے درمیان امتیاز قائم کرنا اور یہ واضح کرنا کہ ہر کام کو کرنے کا درست طریقہ کیا ہونا چاہیے۔ گناہ کے بارے میں اسلام یا شرعی قانون اسی حد تک بحث کرتا ہے جہاں تک اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کا معاملہ ہے۔ اسی طرح کارِ خیر یا عملِ صالح کا مبحث بھی اسلام یا شرعی قانون کی حدود میں اسی حد تک آتا ہے جس حد تک اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی اور رسولِ خدا ﷺ کی اتباع سے ہے۔

ایمان سے فہم کی جہت کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایمان سے انسان یہ سمجھ لیتا ہے کہ عمل کے معنی اس کی روزمرہ زندگی سے ورا ایک عالم سے پیوست ہیں اور اس طرح اس کا رشتہ حقیقتِ ربّانی تک پہنچتا ہے۔ ایمان ہی انسان کو یہ فہم عطا کرتا ہے کہ کائنات کی ہر شے پر توحید کی حکمرانی ہے، تاہم انسان کی آزادیِ اختیار اس توازن کو درہم برہم کر سکتی ہے۔ اسی سے اسے پتا چلتا ہے کہ اُس کے لیے اللہ کا بندہ بننا کیوں ضروری ہے، اور اسی سے اس پر یہ واضح ہوتا ہے کہ اللہ کا خلیفہ بننے کے لیے اسے کون سی راہ کا انتخاب کرنا ہوگا۔ ایمان سے ہر بات عیاں ہو جاتی ہے۔ انسانی عمل کا تار و پود الحق سے ایک گہرے تعلق میں بندھا ہوا ہے اور مرنے کے بعد اس کے نتائج دائمی ہو جائیں گے۔

احسان کی آمد سے اسلام اور ایمان میں ایک اور چیز کا اضافہ ہو جاتا ہے، اور اب ان دونوں کا مرکز حسنِ نیت بن جاتا ہے۔ احسان سے انسان کو یہ تلقین ہوتی ہے کہ اس کے انتخاب اور اس کے ارادہ و کاوش کا رخ اس آگہی کی بنیاد پر متعین ہونا چاہیے کہ ہر شے اللہ کی ہے اور اللہ تعالیٰ حاضر و ناظر اور ہمہ جا موجود ہے۔

قرآن مجید اور اسلامی روایت میں بسا اوقات ان تین جہات یعنی اسلام، ایمان اور احسان کو الگ الگ کر کے دیکھا گیا ہے اور بعض اوقات ان میں یہ امتیاز قائم نہیں کیا گیا۔ قرآن مجید تو خاص طور پر اکثر ایسے الفاظ میں کلام کرتا ہے جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں اسلام کی دونوں یا تینوں جہات پر بیک وقت زور دیا جا رہا ہے۔ سو ہمارے لیے ان اصطلاحات میں سے ایک پر غور کرنا مفید رہے گا تاکہ یہ دیکھا جا سکے کہ ''عملِ صالح'' کا اسلامی تصور قرآن میں جس طرح بیان ہوا ہے، اس کا اسلام کی تیسری جہت سے ایسا گہرا تعلق ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا، خواہ گفتگو اسلام کی پہلی جہت پر ہی کیوں نہ ہو رہی ہو۔ اس ضمن میں جو اصطلاح ہمارے پیشِ نظر ہے وہ ہے صالح۔ اس لفظ کے بنیادی معنی ہیں ''سالم ہونا، ٹھیک ہونا، درست، شائستہ، اچھا اور موزوں ہونا۔'' انگریزی میں اس لفظ کے ترجمے کے لیے ہم نے ہمیشہ wholesome کا لفظ برتا ہے۔ اس سے ہمارا مقصد یہ تھا کہ انگریزی مترادف ایسا ہو جسے انسانوں کے لیے اور انسانی عمل کے لیے یکساں طور پر استعمال کیا جا سکے، کیونکہ قرآن مجید میں لفظ کے دونوں مفاہیم آئے ہیں: ''صالحات'' (نیک اعمال، اچھے کام، wholesome deeds) اور ''صالحون'' (اچھے، نیک لوگ)۔

قرآن مجید کے مطابق ایمان کے ساتھ عملِ صالح جنت کا حقدار بنا دیتا ہے۔ درج ذیل آیات

میں سے پہلی آیت میں لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْن (۵:۹۵) (سن لو کہ اللہ کے دوستوں کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔) کے جو الفاظ آئے ہیں، یہ وہی ہیں جو خدا دوست لوگوں کے لیے برتے گئے تھے۔ یہ بھی ملاحظہ کیجیے کہ بعض آیات میں صالح اور جمیل ہم معنی الفاظ کے طور پر استعمال ہوئے ہیں:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصَّابِئِيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲:۶۲)، (۵:۶۹)

بے شک جو ایمان لائے، جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابئی، ان میں سے جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لایا اور جس نے عملِ صالح کیا تو اس کے لیے اس کے رب کے پاس اجر ہے اور ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (۲:۲۵)

اور بشارت دو ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیے اس بات کی کہ ان کے لیے ایسے باغ ہوں گے جن میں نہریں جاری ہوں گی۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۶:۹۷)

جو کوئی نیک عمل کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، اور وہ ایمان پر ہے تو ہم اس کو ایک پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے، اور ہم ان کو جو کچھ وہ کرتے رہے، اس کا بہتر صلہ دیں گے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ (۴۰:۴۰)

جو کوئی نیک عمل کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن بھی ہوا، تو وہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے جس میں وہ بے حساب رزق و فضل پائیں گے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (۴:۱۲۲) (۴:۵۷)

اور جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے اچھے عمل کیے ہم ان کو ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن میں نہریں بہتی ہوں گی۔

وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۶۴:۹)	اور جو اللہ پر ایمان لائے اور جنھوں نے عملِ صالح کیے ہوں گے، اللہ ان کے گناہوں کو ان سے جھاڑ دے گا اور ان کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن میں نہریں جاری ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔ بڑی کامیابی درحقیقت یہ ہے۔
وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِىْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (۴۱:۳۳-۳۴)	اور اس سے بڑھ کر اچھی بات کس کی ہوگی جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں۔

اس موضوع پر مزید پچاس آیات درج کی جاسکتی ہیں جن میں بنیادی طور پر یہی بات کہی گئی ہے، تاہم اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ صالح انسانوں کے بارے میں قرآن مجید کیا کہتا ہے، یعنی ان لوگوں کے بارے میں جو اہلِ ایمان ہیں اور نیک کام کرتے ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ بات خالی از اہمیت نہیں کہ صالح ایک قدیم عرب نبی کا نام ہے جو انجیل میں مذکور نہیں ہیں۔ ان کا ذکر قرآن مجید کی آٹھ آیات میں آیا ہے۔ اسی طرح قرآن مجید نے بہت سے انبیا کو صالح کے لقب سے یاد کیا ہے۔ ان میں ابراہیم، یعقوب، اسحاق، اسمٰعیل، ادریس، یحیٰی، زکریا، الیاس اور عیسیٰ علیہم السلام شامل ہیں۔ ایک اور آیت میں قرآن مجید نے صالحین، انبیا، مخلصین اور شہدا سب کو ان لوگوں میں شامل کیا ہے جن پر اللہ کی برکت نازل ہوئی (۴:۶۹)، لیکن یہ بھی ہے کہ ہر مخلص مسلم (اپنے وسیع اور عام معنی میں) صالحین میں شمار ہوسکتا ہے خواہ وہ شخص ''مسلمان'' (تاریخی معنی میں) ہو یا نہ ہو:

لَيْسُوْا سَوَآءً مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ (۳:۱۱۳-۴)	سب اہلِ کتاب یکساں نہیں ہیں۔ ان میں ایک گروہ عہد پر قائم ہے۔ یہ رات کے وقتوں میں اللہ کی آیات کی تلاوت اور سجدہ کرتے ہیں، اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، معروف کا حکم دیتے ہیں، منکر سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں سبقت کرتے

ہیں۔ اور یہ لوگ نیکوکاروں میں سے ہیں۔

وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدۡخِلَنَّہُمۡ فِی الصّٰلِحِیۡنَ (۲۹:۹)

اور جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے تو ہم ان کو صالحین کے زمرہ میں داخل کریں گے۔

سامنے کی بات ہے کہ صلاح کا تعلق رحمتِ خداوندی سے ہے۔ صلاح رحمت ہی سے برآمد ہوتی ہے، کیونکہ اس کا نتیجہ ہے اللہ کا قرب (دیکھیے آیات ۲۱:۷۵، ۲۱:۸۶، ۱۹:۲۷) یہاں ایک نکتہ یہ بھی توجہ طلب ہے کہ وہ تین آیات جن میں حضرت ابراہیمؑ کے صالحین میں سے ہونے کا ذکر آیا ہے، ان میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ''فی الآخرۃ'' (اگلے جہان میں)۔ حضرت ابراہیمؑ کمالِ انسانی کا نمونہ، فطرتِ انسانی کی تجسیم، توحیدی ادیان کے جدِّ امجد، اور وہ نبی جن کو اپنے اخلاق و اوصاف میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب ترین سمجھا جاتا ہے۔ یہاں جو نکتہ مضمر ہے، وہ یہ ہے کہ وہ تمام ''مسلم'' جو فطرتِ انسانی کو کاملاً حاصل کر لیتے ہیں، وہ اگلے جہان میں صالحین میں سے ہوں گے، نیز یہ کہ صلاح یا wholesomeness ایک ایسی صفت ہے جو غالب حد تک اگلے جہان ہی سے متعلق ہے۔ عملِ صالح کرنے کا مطلب بالآخر یہی تو ہے کہ اپنے ہر کام اور ہر عمل کو ''الاحد'' سے جوڑ دیا جائے، یعنی توحید قائم کی جائے۔ اس کے پورے امکانات اور مکمل نتائج و ثمرات اس وقت تک انسان کے سامنے نہیں آتے جب تک موت اس کی نگاہ کے پردے ہٹا نہیں دیتی۔

خلاصہ یہ کہ جہاں جہاں قرآن مجید نے عملِ صالح یا صالحات کی اصطلاح استعمال کی ہے، وہاں صرف اتنا نہیں کہا کہ یہ عمل صحیح اور درست ہے، بلکہ یہ بھی کہ اچھا کام ٹھیک نیت سے کیا گیا ہے۔ منافق لوگ بھی اپنے اعمال بظاہر تو ٹھیک طرح ہی سے انجام دیتے ہیں، ان کی پاداش یہی ہے کہ اُنھیں جہنم کے سب سے گہرے گڑھے میں پھینکا جائے گا۔

اسی مادّے اور اسی بنیادی مفہوم سے بننے والے کئی اور الفاظ بھی قرآن مجید نے استعمال کیے ہیں جو خاصے اہم ہیں اور اگر اسلامی شعور کے لیے صلاح کے تصور کی معنویت کو پوری طرح جاننے کے لیے اُن کا سمجھنا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر اصلاح کا لفظ تیس مقامات پر استعمال ہوا ہے، جہاں اس کے معنی ہیں ''صلاح قائم کرنا، صلاح کو استوار کرنا۔'' فی زمانہ اس لفظ اصلاح کو اکثر reform کے مفہوم میں برتا گیا ہے۔ اسی طرح صلح کا لفظ ایک آیت میں اس ہم آہنگی اور سکون و آشتی کے معنی

میں آیا ہے جو اچھے میاں بیوی کے مابین ہونا چاہیے۔ بعد میں یہ لفظ صلح و جنگ کے حوالے سے سیاسی معنی میں استعمال ہونے لگا۔

قرآن کی رُو سے صالح کے دیگر مفاہیم و مضمرات کو سمجھنا ہو تو یہ دیکھنا چاہیے کہ قرآن مجید نے اس کے الٹ لفظ یعنی فاسد کو کیوں کر استعمال کیا ہے۔ فاسد کا مطلب ہے ''غلط، برا، خراب و برباد اور بگڑا ہوا۔'' صالح وہ ہے جو الحق سے ہم آہنگی کی زندگی گذارے اور اپنے عمل کو صلاح اور سازگاری کی بنا پر استوار اور قائم رکھے۔ اس کے برعکس مفسدین (فسادی، فساد کرنے والے workers of corruption) وہ لوگ ہیں جو اشیا کے مابین درست رشتوں کو درہم برہم کر کے تباہ کر ڈالتے ہیں۔

فساد اور توحید میں خلل اندازی کے درمیان جو تعلق ہے، قرآن مجید نے اُسے صریح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ سب سے پہلے تو قرآن نے اس بات پر زور دیا ہے کہ کائنات کی صلاح اور اُس کا نظام اس کے اصولِ واحد پر مبنی ہونے کی وجہ سے ہے۔ اگر حقیقت کا مأخذ ایک سے زیادہ ہوا کرتا تو یہ کائنات پارہ پارہ ہو کر منتشر ہو جاتی:

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (۲۱:۲۲) اگر ان دونوں کے اندر اللہ کے سوا الگ الگ الٰہ ہوتے تو یہ دونوں درہم برہم ہو کے رہ جاتے۔

ہم جانتے ہیں کہ انسان کے بدترین جھوٹے خداؤں میں ہوا و ہوس بھی شامل ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ بھی لوگوں کی ہوائے نفس (caprice) کا تابع ہو جاتا، یعنی صحیح اور غلط کے بارے میں ان کی ذاتی آرا اور ان کی خواہشات کو قبول لیتا تو کائنات برباد ہو کے رہ جاتی:

وَلَوِاتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَ هُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ (۲۳:۷۱) اور اگر ان کی خواہشوں کے مطابق ہوتا تو آسمان و زمین اور جو ان میں ہیں سب تباہ ہو جاتے۔

ایک سطح پر، اس کائنات کے صلاح و نظام کو الواحد، یعنی اللہ تعالیٰ نے سہارا دے رکھا ہے۔ ہر شے مسلم بھی ہے اور عبد بھی۔ اللہ کے سامنے سرافگندہ بھی ہے اور اس کی بندہ بھی۔ ایک دوسری سطح پر اور اختیاری ''اسلام'' اور اختیاری بندگی کے لحاظ سے انسان میں یہ امکان موجود ہے کہ وہ اس دنیا میں صلاح کو درہم برہم کرے اور اس میں فساد پھیلائے۔ قرآن نے یہ کبھی اشارہ نہیں کیا کہ انسان کے پھیلائے ہوئے فساد کا اثر آسمانوں تک جا سکتا ہے، کیونکہ وہ عالم فرشتوں کی دنیا ہے جن کا کام صرف اللہ کی اطاعت و فرماں برداری کرنا ہے۔ اسی سے یہ نکتہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ فرشتوں نے تخلیقِ آدم

پر احتجاج کیوں کیا تھا اور کہا تھا:

قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ (۲:۳۰)	کیا تو اس میں اس کو خلیفہ مقرر کرے گا جو اس میں فساد مچائے اور خون ریزی کرے۔

بطورِ فرشتہ ان کو فساد پھیلانے پر قدرت ہی میسر نہیں۔ فساد کا امکان صرف اس مخلوق میں پنہاں ہے جسے آب و گل سے خلق کیا گیا ہو۔ اگر فرشتوں کو بھی جسدِ خاکی دیا گیا ہوتا تو وہ بھی فساد پھیلا سکتے تھے۔ جیسا کہ ہاروت و ماروت نے پشیمان ہوکر بالآخر یہی سبق حاصل کیا تھا۔

کائناتی نظام میں فساد صرف اور صرف انسان سے مخصوص ہے۔ اللہ کا خلیفہ بننے سے خلقِ خدا کو یہ آزادی بھی مل جاتی ہے کہ خالقِ کائنات کے خلاف جانے کی ہمت کر سکے۔ اسے جو 'امانت' دی گئی ہے، اس کا غلط استعمال ہی کائنات میں اخلاقی فساد اور شر کی نمود کا باعث ہوتا ہے۔ تخلیقِ آدم سے پہلے ابلیس تک سے کوئی فساد سرزد نہیں ہوا تھا۔ جنّات کو اللہ کی نافرمانی کا جو اختیار ملا ہے، وہ بھی کسی نہ کسی طرح خلافتِ انسانی ہی سے جڑا ہوا ہے۔ درج ذیل آیت آج کی جدید دنیا کے بارے میں خاص طور پر ایک بڑا موزوں تبصرہ ہے۔ آج کی جدید ٹکنالوجی اور صنعتوں، کارخانوں کی اُگلی ہوئی کثافت اور آلودگی نے نسلِ انسانی کے لیے اپنے ہاتھوں خود موت کے گھاٹ اترنے کا جو کھلا امکان پیدا کر دیا ہے، یہ اگر نہ ہوتا تو اس آیت کی پوری معنویت شاید آشکار نہ ہو سکتی:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِى النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِىْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۳۰:۴۱)	خشکی اور تری، ہر جگہ لوگوں کے اعمال کے نتیجے میں فساد چھا گیا ہے تا کہ اللہ ان کے بعض کرتوتوں کا مزا چکھائے تا کہ یہ رجوع کریں۔

جدید سائنس اور ٹکنالوجی کے نتیجے میں فساد کیوں جنم لیتا ہے؟ اسلام کے نقطۂ نظر سے اسے سمجھنا دشوار نہیں، ہر چند کہ اکثر جدیدیت زدہ مسلمانوں نے سائنس اور ٹکنالوجی کو اپنی آغوشِ توجہ میں سمیٹ لیا ہے اور اس کی قدر و قیمت بلا چون و چرا تسلیم کر لی ہے۔ ذرا غور کیجیے کہ جدید سائنس کے بانیوں اور ٹکنالوجی کی ترقی و پیش رفت کے علمبرداروں کا اپنا دعویٰ کیا ہے؟ خود ان کی نظر میں سائنس کا ہدف اور مقصد کیا ہے؟ ہم سب ہزارہا مرتبہ یہ سن چکے ہیں کہ مغربی جدید دنیا نے آخر کار عالمِ طبیعی کی تسخیر میں کامیابی حاصل کر لی ہے جس کی بدولت اسے دیگر تمام تہذیبوں پر فوقیت اور برتری حاصل ہوگئی ہے۔ اس طرح کے بیانات کی تہ میں جو مفروضہ کام کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں بحیثیتِ انسان یہ حق حاصل

ہے کہ کائنات کے ساتھ، اس عالمِ طبیعی کے ساتھ جو سلوک چاہیں روا رکھیں۔ دوسری طرف اسلام کی نگاہ میں عالمِ طبیعی یا جولاں گاہ فطرت وہ دائرہ ہے جس میں اللہ کی نشانیاں ظہور کرتی ہیں۔ انسان کی ہر وہ کوشش جو مختلف اُمور کے وقوع پذیر ہونے کے فطری انداز کو تلپٹ کر دے، ایک ایسا عمل قرار پائے گی جو کارخانۂ تخلیق میں اللہ کی مشیت سے سرتابی کے مترادف ہوگا۔ انسان کے لیے عالمِ طبیعی کو مسخر کرنے کی سعی ایسے ہی ہے، گویا اس نے مشیتِ خداوندی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہو اور اللہ تعالیٰ نے اسے جس صورتِ حال میں پیدا کیا تھا، وہ اس کی ناشکری کرنے لگا ہو اور یہ دعویٰ کرنے چلا ہو کہ اس کارخانۂ قدرت میں اللہ تعالیٰ کی کوئی حکمت موجود نہیں ہے۔ یہاں عالمِ طبیعی یا Nature سے ہماری مراد صرف شہر سے باہر کے قدرتی مناظر ہی نہیں ہیں۔ یہ سارا عالمِ مشہود، دکھائی دینے والی ساری کائنات Nature ہے، اس میں معاشرہ اور انسانی افراد سب شامل ہیں۔

فطری بات ہے کہ اس جگہ آ کر لوگوں کی طرف سے یہ صدائے احتجاج بلند ہوگی کہ انسان کو جو صلاحیتیں دی گئیں ہیں، وہ بھی تو فطرت ہی کا حصہ ہیں۔ تسخیرِ فطرت کی قوت بھی تو ہمیں اللہ ہی کی طرف سے عطا ہوئی ہے تاکہ ہم معاشرے کو بہتر بنا سکیں تو پھر ہم اس کا استعمال کیوں نہ کریں؟ آخر ہم ساری آفات کو خاموشی سے کیوں برداشت کریں؟ اسلام کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس قوت کے استعمال کی حدود مقرر کر دی ہیں، کیونکہ یہ قوت انسان کے خلیفۃ اللہ ہونے کے خارجی ظہور سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔ انسان کو اس معاملے میں من مانی کرنے کے لیے آزاد نہیں چھوڑا گیا یا یوں کہیے کہ وہ چاہے تو اس آزادی کو استعمال کر سکتا ہے، لیکن پھر اس کو اپنے اعمال کا نتیجہ بھگتنے کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔ عالمِ مخلوقات پر ''اسلام کائناتی'' کی حکمرانی ہے اور مذہب کی شکل میں انبیا کے اسلام کی جلوہ گری ہے۔ اگر انسان کا عمل ان دونوں سے ٹکرا جائے تو پھر اس کے لیے خسارہ ہی خسارہ ہے، یہاں بھی تباہی اور اگلے جہان میں بھی خرابی۔

سوال یہ ہے کہ پھر انسانی معاشرے کے مسائل کا حل کیا ہے؟ بھوک، بیماری، جور و ستم، کثافت و آلودگی اور انسان کی پیدا کردہ ہزاروں دوسری مصیبتوں کا مداوا کیوں کر ممکن ہے؟ قرآن کے نقطۂ نظر سے راستہ صرف ایک ہی ہے، دین (یعنی اسلام، ایمان، اور احسان) کے ذریعے اللہ کی طرف رجوع:

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ الْقَيِّمِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ (۳۰: ۴۳)

پس اپنا رخ، دین قیم کی طرف، سیدھا رکھو، قبل اس کے کہ اللہ کی طرف سے ایک ایسا دن آ جائے جس کے لیے پھر واپسی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے خیر وشر اور صالح و فاسد اپنے پیمانہ تقدیر کے مطابق پیدا کیا ہے لیکن ہم عرض کر چکے ہیں کہ انسان کے پاس اتنی آزادی ہے کہ وہ اپنے لیے خود راہِ عمل کا انتخاب کر سکے، نیز یہ کہ جو کچھ بھی وہ کرے گا اس کی جواب دہی بھی خود اسی کو کرنا ہوگی۔ وہ جس حد تک بھی غلط چیز کا، فاسد کا انتخاب کرے گا اسی حد تک وہ اللہ کو ناراض کر لے گا۔ اللہ تعالیٰ کو وہ لوگ پسند ہیں جو حسنِ عمل رکھتے ہیں، محسنین ہیں، وہ نہیں جو قبیح اعمال کے مرتکب ہو رہے ہوں:

وَاِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا وَیُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ (۲:۲۰۵)

اور جب وہ (تمھارے پاس سے) ہٹتے ہیں تو ان کی ساری بھاگ دوڑ اس لیے ہوتی ہے کہ زمین میں فساد مچائیں اور کھیتی اور نسل کو تباہ کریں، اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔

قرآن مجید نے بار بار فساد پھیلانے والوں کو ہدفِ ملامت بنایا ہے۔ ان میں سے بدترین لوگ منافقین کا گروہ ہے جو دکھاوا تو کارِ خیر کا کرتے ہیں، لیکن ان کے اندر چھپی ہوئی نیتیں ان کے ظاہری عمل کو جھٹلا رہی ہوتی ہیں۔ درج ذیل آیت صاف صاف بتا رہی ہے کہ صلاح (wholesomeness) بھی اخلاص کی طرح یہ تقاضا رکھتی ہے کہ اچھے کام کی بنیاد اور اس کا محرک ایمان اور خدا ترسی کو ہونا چاہیے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ ۔ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ ۔ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ بِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ ۔ وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْ ا فِی الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۔ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا یَشْعُرُوْن (۲: ۸-۱۲)

اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں۔ یہ لوگ اللہ کو اور ایمان لانے والوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں، حالانکہ یہ خود اپنے آپ ہی کو دھوکا دے رہے ہیں اور اس کا احساس نہیں کر رہے ہیں۔ ان کے دلوں میں روگ تھا تو اللہ نے ان کے روگ کو بڑھا دیا، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے، بوجہ اس کے کہ وہ جھوٹ بولتے رہے ہیں اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ پیدا کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو

اصلاح کرنے والے لوگ ہیں۔ آگاہ رہو کہ یہی لوگ فساد برپا کرنے والے ہیں، لیکن انھیں اس بات کا شعور نہیں۔

اس دھرتی پر فساد تب پھیلتا ہے جب انسان جو اس دنیا میں اللہ کا خلیفہ ہے، اپنے رب کے احکام سے روگردانی کرنے لگتا ہے اور انبیا کے لائے ہوئے پیغام کو فراموش کر بیٹھتا ہے:

وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَاللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ (۱۳:۲۵)

اور جو لوگ اللہ کے عہد کو، اس کے باندھنے کے بعد، توڑتے ہیں اور اس چیز کو کاٹتے ہیں جس کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں، وہی لوگ ہیں جن پر لعنت ہے اور ان کے لیے برا انجام آخرت ہے۔

اور زمین سے فساد اس وقت مٹتا ہے جب لوگ توحید کے وسیلے سے اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف کر لیتے ہیں اور جب اس دنیا میں ان کی ترجیحات آخرت کے حوالے سے اور اپنے انجام کو نظر میں رکھتے ہوئے طے ہونے لگتی ہیں۔ اگلے جہان کے بارے میں سوچنے ہی سے حقیقت پوری طرح عیاں ہوتی ہے اور اپنے عمل کی حتمی معنویت انسان پر آشکارا ہوتی ہے۔

وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ (۲۸:۷۷)

اس میں آخرت کے طالب بنو اور دنیا میں سے اپنے حصہ کو نہ بھولو، اور جس طرح خدا نے تمھارے ساتھ احسان کیا ہے، اسی طرح تم بھی (دوسروں کے ساتھ) احسان کرو۔ اور زمین میں فساد کے طالب نہ بنو، اللہ تعالیٰ فساد چاہنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اللہ کو جو چیز اصل میں پسند ہے وہ احسان ہے۔ اہلِ احسان سے محبت کی وجہ سے وہ ان کو اپنے قریب کر لیتا ہے اور اس کا قرب نام ہے الجنۃ (باغ) یا رحمتِ خداوندی کا:

وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ

اور ملک میں، اس کی اصلاح کے بعد، فساد نہ برپا کرو اور اسی کو پکارو بیم و رجا، دونوں

قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ (۷:۵٦) حالتوں میں۔ بے شک اللہ کی رحمت نیکو کاروں سے قریب ہے۔

خلاصہ یہ کہ صلاح اور فساد کے تصورات کے ذریعے قرآن مجید نے عالمِ خلق میں انسان کے کردار اور حیثیت کی ایک ایسی تصویر کھینچ دی ہے جس میں عملِ صحیح، فہمِ صحیح اور خالص نیت کو ان کی متضاد صفات سے الگ کر کے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس میں ہمارے لیے ایک اور مثال ہے کہ اللہ کے دو ہاتھوں کی، اس کی رحمت اور اس کے غضب کی، انسانوں کی اس دنیا میں کارفرمائی کیسے ہوتی ہے، عالمِ اسفل میں جہاں انسان کو اللہ کا خلیفہ مقرر کیا گیا ہے۔ اس تمثیل میں صلاح رحمت، جنت اور جمال سے وابستہ ہے جب کہ فساد کا تعلق غضب، جہنم اور قباحت و کراہت سے ہے۔

جمال، کمال اور صلاح تب قائم ہوتے ہیں جب انسان پورے کا پورا الحق کا ہو جائے، الحق سے اس کا تعلق مکمل طور پر جڑ جائے۔ صحیح معنی میں صلاح والے یعنی اہلِ صلاح وہ لوگ ہوتے ہیں جو اللہ کی کامل بندگی بھی کرتے ہیں اور اس کے کامل خلیفہ بھی ہوتے ہیں۔

باب ہشتم

احسان کے تاریخی مظاہر

دُعا و مناجات

انسان کے نفس میں جھروکا تلاش کرنا یوں بھی کوئی آسان کام نہیں، اور پھر معاملہ اگر ایک ایسی تہذیب کا ہو جس میں داخلی احوال کو قیدِ تحریر میں لانے کی سرے سے حوصلہ افزائی نہ ہوئی ہو تو معاملہ اور بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ اسلامی ادبیات میں آپ بیتی ایک نسبتاً کمیاب صنف ہے اور اس ضمن میں جو تھوڑی بہت تحریریں نظر آتی ہیں، ان میں بھی مصنف کے محرّکات اور ارادہ و نیت کا تجزیہ شاذ ہی ملتا ہے، بالخصوص مذہبی معاملات کے ضمن میں تو یہ چیز بالکل احاطۂ تحریر میں نہیں آتی، تاہم اصنافِ تحریر کے ضمن میں ایک صنف ایسی ضرور ہے جس میں لکھنے والے اپنے اندر کو کھول کر رکھ دیتے ہیں، دوسرے انسان کے سامنے نہیں بلکہ اپنے رب کے روبرو۔ یہ صنف ہے دُعا Supplication اللہ سے ذاتی درخواست، اللہ کے لیے انسان کی پکار، اس کے حضور مناجات۔ یہ درست ہے کہ دُعا کو اگر تحریراً محفوظ کر لیا جائے تو اس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اس کی بے ساختگی میں کمی آ گئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اسلامی دعاؤں کا آہنگ اِس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے صحیح تعلق قائم کرنے میں ایک مسلمان کو کن کن معاملات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

احادیثِ رسولؐ کا ایک اہم حصہ اور شعبہ دعائیں بھی رہی ہیں۔ رسولِ خداؐ کی ذاتی دعاؤں میں سے بہت سی دعائیں یاد کی جاتی تھیں اور ان کو لکھ بھی لیا گیا تھا، پھر بہت سے مواقع پر ایسا ہوا کہ آپؐ نے دوسروں کو دعا کی تعلیم دی، یہ سکھایا کہ اللہ کو پکارنے کا سلیقہ، قرینہ کیا ہوتا ہے۔ بسا اوقات لوگوں نے آپؐ کو ایک ہی دعا کئی مرتبہ پڑھتے ہوئے سنا اور اس طرح وہ دعا لوگوں کے حافظے میں نقش ہو گئی۔ آپؐ کے خاندان میں سے کئی اصحاب نے دعاؤں کے مجموعے یادگار چھوڑے ہیں۔ ان میں آپؐ کے پڑنواسے حضرت علی بن حسینؓ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی تصنیف الصحیفة السجادیہ کو دعاؤں کی صنف کی امہاتِ کتب میں شمار کیا جاتا ہے۔ اسلام کے ابتدائی عہد میں لوگوں کے تعلق باللہ

کی کیا صورت تھی اور انسان اور اس کے رب کے شخصی، ذاتی تعلق کی دنیا کیسی تھی، یہ اگر جاننا ہو تو کوئی اور چیز اس مجموعے سے حاصل ہونے والی بصیرت کی ہم پلہ نہیں ہو سکتی۔

رسول خداؐ اور دوسرے عظیم مسلمانوں سے منقول دعاؤں کا پڑھنا مسلمانوں کے لیے اپنے اسلاف کا اتباع کرنے کا ایک راستہ ہے جس سے وہ یہ سیکھتے اور جانتے ہیں کہ اللہ سے ہم کلام ہونے، اسے پکارنے کا طریقہ کیا ہے اور اللہ کے روبرو انسان کا صحیح رویّہ کیا ہونا چاہیے۔ علاوہ ازیں، انھیں ان دعاؤں کو دہرا کر یہ طمانیت بھی ملتی ہے کہ وہ دعا کی تلقین کرنے والی شخصیت سے ایک ذاتی قربت پیدا کر رہے ہیں۔

مسلمانوں کی دعاؤں کو پڑھیے تو پہلا احساس یہ ہوتا ہے کہ ان میں مجرد اصطلاحی زبان اور تنزیہ کا تناظر سرے سے موجود نہیں، جب کہ مسلمانوں کی ابتدائی کلامی تحریروں میں یہ عناصر خاص طور پر نمایاں نظر آتے ہیں۔ یہاں خدا ایک دور دراز بادشاہِ وقت نہیں ہے جو صرف اپنے غلاموں کے لیے احکام صادر کرتا ہو اور ان سے ان کی بجا آوری اور اطاعت کی توقع رکھتا ہو۔ اس کے برعکس ان دعاؤں کا خدا عبادت کرنے والے کے پاس ہے، اس کی دعا سنتا ہے اور اس کا جواب دیتا ہے۔ کیا وہ خود ہی قرآن میں نہیں فرماتا کہ ''ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ۔'' مختصراً یہ کہ دعاؤں کا خدا وہ ہے جسے تشبیہ کے نقطۂ نظر سے دیکھا گیا ہے۔ یہ وہ خدا ہے جس سے انسان انس و محبت کا رشتہ جوڑ سکتا ہے۔ وہ خدا جس کا انسانی زندگی کی ہر چھوٹی بڑی چیز سے ناتا ہے۔ انسان کوئی دو مختلف دائروں کا الگ الگ مجموعہ نہیں۔ ایک وہ دائرہ جس کی غیر اہم چیزوں سے اللہ کو کوئی سروکار نہیں اور دوسرا وہ جو اللہ کے معاملات پر مشتمل ہو۔ ایسا ہرگز نہیں توحید کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کے ہر معاملے سے سروکار رکھتا ہو۔ چنانچہ رسول اللہؐ کا ارشاد ہے:[۷] ''تم میں سے ہر شخص کو چاہیے کہ اپنی ہر حاجت کے لیے اللہ کو پکارے۔ تمھاری جوتی کا تسمہ بھی اگر ٹوٹ جائے تو اس سے مانگو۔''

جدید اسلام کی بہت سی شکلوں میں سقم یہ پیدا ہو گیا ہے کہ اللہ سے ذاتی تعلق کی جو ایک گہرائی تھی اور جسے قرآن اور اسلامی روایت نے پسندیدہ قرار دیا تھا، اسے پس منظر میں دھکیل دیا گیا۔ ایسا ہونا بالکل فطری تھا، کیونکہ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ جدیدیت زدہ اسلام میں اسلامی تعلیمات کے عقلی پہلو پر زور دیا جاتا ہے، کچھ اس لیے کہ اس عذر خواہی سے اسلام پر ہونے والی مغربی تنقید کا دفاع ہو جائے اور کچھ اس لیے بھی کہ اس سے مذہبی فکر کا ایک ایسا اصول بن سکے جس کے سہارے سائنس اور علوم کی جدید شکلیں، بالخصوص ٹکنالوجی اسلامی ممالک میں نفوذ پا سکے۔ یہ بات ہمیشہ مدِنظر رہنا چاہیے کہ مذہبی فکر کا

عقلیت پسند روّیہ ہمیشہ اپنی فطرت کے اعتبار سے ہی تنزیہ پر زور دیا کرتا ہے اور اسی لیے اس میں حقیقتِ خداوندی کے غیر شخصی اور بعید پہلوؤں پر توجہ اور ان کا ذکر نمایاں رہتا ہے۔ بایں ہمہ دعا آج بھی مسلمانوں کی مذہبی زندگی میں ایک بڑا کردار ادا کرتی ہے، خاص طور پر ان لوگوں میں جن کے ہاں ابھی جدید تعلیم نے آ کر روایتی تصورِ کائنات کو تبدیل نہیں کیا۔ دعا کے جو اوّلین نمونے مسلمانوں کے سامنے رہتے ہیں، ان کے مطابق دعا آج بھی ایک بالکل ذاتی چیز گردانی جاتی ہے جس سے انسان یہ دیکھنے کے قابل ہو جاتا ہے کہ اس کی زندگی کا ہر پہلو، ہر گوشہ کس طرح اللہ تعالیٰ سے ایک قریبی اور مانوس رشتے میں ڈھلا اور بندھا ہوا ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل دعا پر غور کیجیے۔ اسے ہم نے حضرت علی بن حسین کی کتاب الصحیفة السجادیة سے نمونے کے طور پر منتخب کیا ہے۔ دعا کا عنوان ہے **"دعا عندالاستسقاء بعد الجذب"**[۸] (خشک سالی کے دوران پانی کی دعا)۔

اَللّٰهُمَّ اسْقِنَاالْغَيْثَ وَانْشُر عَلَيْنَاَ رَحْمَتَكَ بَغَيْثِكَ الْمُغْدِقِ مِنَ السَّحَابِ الْمُنْسَاقِ لِنَبَاتِ اَرْضِكَ الْمُوْنِقِ فِىْ جَمِيْعِ الْاٰفَاقِ ۰ وَامْنُنْ عَلٰى عِبَادِكَ بِاِيْنَآعِ الثَّمَرَةِ وَاَحْيِ بِلَادَكَ بِبُلُوْغِ الزَّهَرَةِ وَاَشْهِدْ مَلآ ئِكَتَكَ الْكِرَامَ السَّفَرَةَ بِسَقْيٍ مِنْكَ نَافِعٍ دَائِمٍ غُزْرُهُ وَاسِعٍ دِرَرُهُ وَابِلٍ سَرِيْعٍ عَاجِلٍ ۰ تُحْيِىْ بِهِ مَا قَدْ فَاتَ وَتُخْرِجُ بِهِ مَا هُوَاتٍ وَتُوَسِّعُ بِهِ فِى الْاَقْوَاتِ سَحَابًا مُتَرَاكِماً هَنِيْئًا مَرِيْئًا طَبَقًا مُجَلْجَلاً غَيْرَ مُلِثٍّ وَدْقُهُ وَلَا خُلَّبٍ بَرْقُهُ۔ اَللّٰهُمَّ اسْقِنَا غَيْثًا مُغِيْثًا مَرِيْعًا مُمْرِعًا عَرِيْضًا وَاسِعًا غَزِيْرًا تَرُدُّبِهِ النَّهِيْضَ وَتَجْبُرُبِهِ الْمَهِيْضَ۔اَللّٰهُمَّ اسْقِنَا سَقْيًا تُسِيْلُ مِنْهُ الظِّرَابَ وَتَمْلَأُ مِنْهُ الجِبَابَ وَتُفَجِرُّ بِهِ الْاَنْهَارَ وَتُنْبِتُ بِهِ الْاَ شْجَارَ وَتُرْخِصُ بِهِ الْاَسْعَارَفِىْ جَمِيْعِ الْاَمْصَارِ وَتَنْعَشُ بِهِ الْبَهَآئِمَ وَالْخلْقَ وَتُكْمِلُ لَنَا بِهِ طَيِّبٰتِ الرِّزْقِ وَتُنْبِتُ لَنَاَ بِهِ الزَّرْعَ وَتُدِرُّبِهِ الضَّرْعَ وَتَزِيْدُنَا بِهِ قُوَّةً اِلىٰ قُوَّتِنَا۔ اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ ظِلَّهُ عَلَيْنَاَ سَمُوْمًا وَلَا تَجْعَلْ بَرْدَهُ عَلَيْنَا حُسُوْمًا وَلَا تَجْعَلْ صَوْ بَهُ عَلَيْنَا رُجُوْ مًا وَلَا تَجْعَلْ مَآءَ هُ عَلَيْنَا اُجَاجًا۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ وَارْزُقْنَا مِنْ بَرَكَاتِ السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْض اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىْ ءٍ قَدِيْرٌ

ترجمہ:

الٰہی! ہمیں بارش سے سیراب کر دے۔ اپنی رحمت ہم پر پھیلا دے، موسلا دھار بارش کے وسیلے سے جو ہوا کے دوش پر اڑتے ہوئے بادلوں سے برس رہی ہو کہ تیری یہ موہنی دھرتی سب اطراف میں پھلنے پھولنے لگے۔ اپنے بندوں پر مہربانی فرما کہ پھلوں میں رس بھر جائے۔ اپنی زمین کو پھر سے زندہ کر دے کہ پھول پھر سے کھل اٹھیں، اور اپنے فرشتوں، اعمال کے لکھنے والی ان مکرم ہستیوں کو اس کا

شاہد بنا دے، ایسی سیرابی کا جس کا وفور دائمی، جس کا بہاؤ وافر، بھرپور، تیز اور فوراً آ لینے والا ہو۔ ایسی سیرابی کہ مردہ ہوئی ہوئی چیز پھر سے جی اٹھے اور ہر آنے والی شے ظاہر ہو جائے، تیری عطا سے رزق واسع ملنے لگے، ان بادلوں کے وسیلے سے جو تہ بہ تہ، بارش کے پانی سے لدے ہوئے ہوں، اچھے سیراب کرنے والے، ہلکورے لیتے ہوئے بادل جن سے مینہ برستا جائے، جن کی بجلی کے کوندے بھی بے ثمر نہ ہوں۔

الٰہی! ہمیں پانی دے، بارش برسا، وہ پانی کہ ہماری مدد کرے، ہمیں پیداوار دے، زرخیزی لائے، ہر سُو برس جائے، وافر، بہتا کھلا پانی جو اس شے کو لوٹا لائے جو اٹھ چکی اور ہر اُس کو شے جوڑ دے جو ٹوٹ چکی ہے۔

الٰہی! پانی دے، وہ پانی کہ جو پتھریلی پہاڑیوں کو لبریز کر دے، جس سے کنویں لبالب ہو جائیں، دریا ابل پڑیں، پیڑ پودے ہرے بھرے ہو جائیں، دنیا میں قیمتوں کی گرانی کم ہو جائے، انسانوں جانوروں میں پھر سے زندگی کی لہر دوڑ جائے، ہمارے رزق کی پاکیزہ چیزیں کمال کو پہنچیں، کھیت لہلہانے لگیں، جانوروں کے تھن دودھ سے بھر جائیں، ہماری قوت و طاقت میں اور طاقت کا اضافہ ہو جائے۔ الٰہی! اس بادل کی چھاؤں کو ہمارے لیے بادِ سموم نہ بنانا، اس کی سردی کی کاٹ سے ہمیں بچانا، اس سے برستی بارش کو سنگساری نہ بنانا اور اس سے آنے والے پانی کو ہمارے لیے کڑوا نہ کر دینا۔

الهم صلِّ علی محمد و آل محمد - اور ہمیں زمین و آسمان کی برکتوں میں سے ہمارا حصّہ عطا فرما۔ ’’بے شک تو ہر شے پر قادر ہے‘‘ (۳:۲۶)

فنونِ لطیفہ اور شاعری

فنونِ اسلامی ایک وسیع موضوع ہے اور اسلام کے مطالعہ کا آغاز کرنے والے ہر طالب علم کو اپنے لیے یہ لازم کر لینا چاہیے کہ اسلامی تہذیب پر جو یہ اتنی بہت سی تصویری کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے ایک یا زیادہ کتب کو غور سے دیکھ ڈالے۔ ان کتب میں اسلامی تہذیب کے ان گنت خزانوں میں سے کچھ چیزیں قاری کے سامنے پیش کی گئی ہیں۔ اپنے موضوعِ گفتگو کی رعایت سے ہم ان میں سے صرف چند پہلوؤں کا احاطہ کر سکیں گے اور ان اسباب کی طرف اشارہ کریں گے جن کی وجہ سے اسلامی تہذیب میں مختلف فنی ہیئتوں کی مخصوص نشو و نما وقوع پذیر ہوئی، نیز یہ بھی دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ اسلام کی تین جہات کے تناظر میں اس نمود و ارتقا کی معنویت کیا ہے۔[9]

اسلامی فن کے بنیادی خدوخال خود کلامِ خداوندی، یعنی قرآن مجید میں مضمر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسلامی معاشرے پر اپنے آپ کو کلام کے وسیلے سے ظاہر کیا ہے۔ کلامِ خدا کی حفاظت کے لیے اور

اسے اپنے اندر استوار رکھنے کے لیے مسلمان کے تین بنیادی فرائض ہیں: قرآن کی تلاوت، قرآن کی کتابت اور نماز و دیگر عبادات کے ذریعے قرآن کو جزوِ ہستی بنانا، اس کی تجسیم کرنا۔

ہم عرض کر چکے کہ **اللّٰہ جمیل و یحب الجمال** اور یہ بھی کہ **واللّٰہ یحب المحسنین** (اللہ تعالیٰ احسان والوں کو پسند کرتے ہیں)۔ مسلمانوں میں جو احساسِ جمال ہے اس کے وسیلے انھوں نے چاہا کہ ہر شے کو خوبصورتی سے انجام دیں۔ تلاوتِ قرآن نے صوت و آہنگ سے متعلق فنون کو جنم دیا، قرآن کی تحریری نقول تیار کرنے، یعنی کتابتِ قرآن نے قلم کے ہنر کا آغاز کیا اور قرآن کو مجسم کرنے کی ضرورت سے اسلامی عبادت گاہوں کے ماحول کی تشکیل ہوئی۔ اسی بات کو کھول کر کہیے تو یوں کہا جائے گا کہ اسلام کے تین بنیادی فنون ہیں — قرأت و تجوید اور شاعری؛ خطاطی اور فنِ تعمیر۔

ہم نے پہلے عرض کیا تھا کہ قرآن مجید صرف پڑھا نہیں جاتا، اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں حسنِ آواز ایک بڑی چیز سمجھی جاتی ہے، ایک قابلِ قدر شے، کیونکہ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ قرآن مجید کو جتنے خوبصورت انداز میں پڑھا جائے گا، اتنا ہی سننے والے کے لیے اس کی تاثیر اور ہیبت میں اضافہ ہوگا، اسی قدر اس سے حظ اُٹھایا جائے گا اور اس کے پیغام کی قبولیت بڑھ جائے گی۔ اکثر لوگوں کو بہت کم عمری ہی میں قرآن مجید کا کچھ نہ کچھ حصہ یاد کروا دیا جاتا تھا، بچے قرآنی مکتب میں جاتے تھے جہاں وہ قرآن کی تلاوت سیکھتے تھے (صرف پڑھنا نہیں) اور خطاطی کی تربیت حاصل کرتے تھے، (محض تحریر کی نہیں)۔

قرآن کا ایک خاص ادب ہوتا ہے جس کا ہر شخص لحاظ رکھتا ہے۔ وہ کتاب جو اللہ کا اپنا کلام ہو، اس سے زیادہ سے زیادہ احترام کا معاملہ ہونا چاہیے۔ اسے زمین پر نہیں رکھا جاتا۔ کتب خانے میں اسے سب سے اوپر کے خانے میں رکھا جاتا ہے، اعزاز و اکرام کی جگہ پر۔ انسان اگر شرعی طور پر پاک نہ ہو تو اسے قرآن کو چھونے سے گریز کرنا چاہیے۔ اکثر اوقات قرآن کو پڑھنے کے لیے اٹھاتے ہوئے اسے بوسہ دیا جاتا ہے یا آنکھوں سے لگایا جاتا ہے۔ یہی عمل اسے واپس رکھتے ہوئے کیا جاتا ہے۔ تلاوت شروع کرنے سے قبل اعوذ باللہ پڑھی جاتی ہے کہ قرآن مجید کا حکم یہی ہے:

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ (۱۶:۹۸) پس جب تم قرآن پڑھو تو شیطانِ رجیم سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو۔

تلاوت کرتے ہوئے تلاوت کے ادب آداب کا خیال رکھا جاتا ہے۔ قرآن مجید فصاحت و بلاغت

میں دوسری ہر کتاب سے بڑھا ہوا ہے۔ پس اس کی تلاوت کا اسلوب بھی ایسا ہونا چاہیے جس سے اس کا حسنِ بیان اور فصاحت کھل کر سامنے آ سکے، ہر حرف اور ہر صوت کو صحیح مخرج سے ادا کرنا چاہیے، اس لیے ابتدائی زمانے سے قرآن کے قاریوں نے قرآن کی قراءت کے جو خوش آہنگ اور حسین انداز زبانی منتقل کیے ہیں، اُن کی آج بھی تقلید کی جاتی ہے اور اُن کے سیکھنے سکھانے پر زور دیا جاتا ہے۔[۱۰]

اگر قرآن کے پڑھنے، تلاوت کرنے میں غایتِ احترام ملحوظ رکھا جاتا ہے تو ساتھ ہی اس کے لکھنے میں بھی ایسا ہی احترام پیش نظر رہتا ہے۔ عربی زبان کی خطاطی نے اگر اسلامی تہذیب کے بنیادی بصری فن کے طور پر نشو ونما پائی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کی بنا قرآن پر رکھی گئی ہے اور قرآن کو جس صورت میں پیش کیا جانا تھا، اسے لازماً اس کلام کے متکلّم کے جمال وجلال کی مناسبت سے ہونا چاہیے تھا۔[۱۱] اور آخر میں یہ کہ کوئی ایسی عمارت بھی ہونا چاہیے تھی جس میں قرآن کی تلاوت ہوتی، اس کی تجسیم کی جاتی۔ مسجد (سجدہ گاہ، سجدہ کرنے کی جگہ) نے آغازِ اسلام ہی سے ایک ادارے کے شکل اختیار کر لی۔ یہ درست ہے کہ کوئی بھی پاک جگہ سجدگاہ ہو سکتی ہے اور رسولِ خداؐ نے فرمایا کہ آپؐ کی رسالت کو سابقہ انبیا سے ایک یہ بات بھی الگ کرتی ہے کہ ان کی امت کے لیے سارا روئے ارض مسجد بنا دیا گیا ہے۔[۱۲] تاہم اہلِ ایمان کو جمعہ کی فرض باجماعت نماز ادا کرنے کے لیے ایک ایسی جگہ کی ضرورت تھی جہاں وہ یکجا ہو سکیں، مزید یہ کہ پانچ فرض نمازوں کو بھی مل کر جماعت سے ادا کرنے کی ہمیشہ بہت ترغیب دی گئی ہے۔ پس مسجد کو اسلامی معاشرے میں جلد ہی ایک ایسی جگہ کی حیثیت حاصل ہو گئی جس میں کلامِ خداوندی کی تلاوت کی جاتی ہے اور جو اس تلاوت کے شایان شان ہے۔ اس کی چار دیواری میں قرآن مجید کی گونج سنائی دیتی ہے اور اس کی تزئین و آرایش کا بڑا حصہ عموماً قرآنی خطاطی ہی پر مشتمل ہوتا ہے۔

تلاوت کے حسن میں فطری طور پر ایک آہنگ اور زیر وبم شامل ہوتا ہے اور اس آہنگ کا انحصار ہے آواز کے تال میل اور حرف وصوت کے توازن پر۔ ہر پُرکشش اور دلآویز آہنگ اور خوش الحانی کی تہ میں عدد کی نوعیت اور ماہیت کا ایک وجدانی فہم کارفرما ہوتا ہے یا زیادہ وضاحت سے کہیے تو وحدت اور کثرت کے مابین تعلق کی ماہیت کا ادراک کام کرتا ہے۔ اس طرح اسلامی خطاطی بھی زبان سے ادا ہونے والے لفظ کو بصری توازن اور ہم آہنگی کے وسیلے سے ظاہر کرتی ہے۔ کلامِ خداوندی کے جمال کو خطاطی حسّی صورت میں اظہار دیتی ہے۔

اہلِ مغرب کا جب پہلی مرتبہ فنِ اسلامی سے سامنا ہوتا ہے تو انھیں اس میں صورت گری اور فطرت نمائی (Naturalism) کا نسبتاً فقدان نظر آتا ہےاور مجسمہ سازی سرے سے غائب ملتی ہے۔اس کا تعلق کسی حد تک تو ان احکام سے ہے جو رسولِ خداؐ نے شبیہ سازی (Figurative Art) پر قدغن کے بارے میں جاری فرمائے تھے،لیکن خود یہ احکام توحید کے مضمرات کی اسلامی شکل میں ظہور سے عبارت تھے۔ وہ ہنرِ ربّانی جس کی نقالی انسان کرسکتا ہےاوراسے کرنا چاہیےوہ قرآن مجید ہے،جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنا اظہار کیا ہے۔یعنی وہ صورتِ الٰہی کی لفظی اور سمعی aural تجسیم ہے، وہی صورتِ الٰہی جس پر انسان کی تخلیق کی گئی۔مرکزِ توجہ وحیِ خداوندی کو ہونا چاہیے کہ یہی واحد راہِ ہدایت ہے۔کلامِ خداوندی سے انسان کی توجہ جوں جوں ہٹتی جائے گی، وہ اپنی صورت خداوندی کو ایک واقعیت دینے، اسے عملی حقیقت بنانے میں ناکام ہوتا جائے گا اور شرک میں جا پڑے گا۔

اسلامی فنون کے تجریدی ہونے پر اکثر تبصرہ کیا گیا ہے، یعنی یہ کہ اسلامی فنونِ لطیفہ کا رجحان تصورات کے اظہار کی طرف ہے، شبیہ سازی اور اشیا کی ہستیوں کی نمایندگی کی طرف نہیں۔اس کا سبب واضح طور پر سمجھا جا سکتا ہے، اگر ہم یہ نظر میں رکھیں کہ تجرید عقل کا ایک ملکہ ہے اور عقل جب توحید سے اکتسابِ نور کرتی ہے تو اس کی نگاہ تنزیہ تک جا پہنچتی ہے اور یوں عقل حقیقتِ خداوندی کو دیگر ہر حقیقت، ہر خلق کردہ شے سے جدا کرکے دیکھنے لگتی ہے۔تاہم آرٹ اپنی ماہیت کے اعتبار ہی سے مبنی بر خیال و تخیل ہوتا ہے کہ اس سے شبیہ وصورت ہمارے سامنے آتی ہے۔اسی کارن فنونِ لطیفہ کا تشبیہ سے ایک قریبی تعلق ہے، وہ نظر جو اللہ کو اس کائنات میں حاضر وموجود پاتی ہے۔اب اگر فنی ہیئتوں کو توحید کا اظہار کرنا ہے اور وہ اپنی ماہیت میں تشبیہی بھی ہیں اور عالمِ خیال سے متعلق بھی تو پھر معاملہ برابر رکھنے کے لیے ان میں مجرد اور بعید صفات کا اظہار راہ پائے گا۔ بالفاظِ دیگر ان ہیئتوں کے لیے لازم ہے کہ وہ اظہارِ جمال کچھ اس طرح کریں کہ جمال کی نسبت ان کی طرف نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہو۔اسلامی فنون انسان میں جمالِ حق، جمالِ خداوندی کی یاد کو بیدار کر دیتا ہے، کیونکہ اس فن میں یہ جمالِ الٰہی اس دنیا سے الگ اور مجرّد کرکے دکھایا جاتا ہے، یعنی ان اشیا سے الگ جن کو شبیہ سازی پر مبنی اسالیب ہنر (Figurative Art) شبیہ و ہیئت میں دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے گا: **لا جمیل الا اللہ** (اللہ کے سوا اور کوئی صاحبِ جمال نہیں)، سو اسلامی فنون میں سعی یہ کی گئی ہے کہ جمالِ خداوندی کا اظہار اس انداز میں کیا جائے کہ یہ

دنیا اپنے طور پر حسین نہ بن پائے۔ فنونِ اسلامی کی کوشش رہی ہے کہ وہ جمالِ خداوندی کی نشانیوں، یعنی آیاتِ جمال کو انسان کے سامنے اس طرح پیش کرے کہ جس سے اسے یہ یاد آتا رہے کہ یہ سب محض اس کے جمال کی نشانیاں، عکس اور آثار ہیں۔ یوں تنزیہ و تشبیہ میں ایک توازن آ جاتا ہے۔ تنزیہ کی تجریدی کیفیت تشبیہ کی تمثال گری سے مل جاتی ہے کہ اب حسن و جمال کو ان اشیا سے الگ کر کے دیکھا جا رہا ہے جن میں ظہورِ جمال ہوا ہے۔ جب ایک فنکار کسی حسین شے کی عکاسی کرتا ہے، کسی پیکرِ جمال کو اپنے فن میں ظاہر کرتا ہے تو دیکھنے والی آنکھ اس فنکارانہ حسن کو اس پیکر، اس صورت سے منسوب کر دیتی ہے، خوبصورت چہرہ، دلکش پھول، حسین چیز وغیرہ وغیرہ۔ جب ان مخلوقات کی جگہ نسبتاً مجرّد نقش و نگار پیش کیے جائیں تو فن میں ایک تنزیہی عنصر شامل ہو جاتا ہے، حسن کو اس کے محلِ ظہور سے الگ کر دیا جاتا ہے، جمال اور نقشِ جمال از باہم دگر جدا ہو جاتے ہیں۔ پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ صورت و ہیئت کے توازن اور ہم آہنگی سے جمال پیدا ہوتا ہے۔ ہمیں یہ خیال کبھی نہیں گزرتا کہ کوئی شخص یا کوئی چیز اپنے طور پر خوبصورت ہے، کیونکہ اس فن میں نہ انسانی شبیہ ہے نہ چیزوں کی تصاویر و اشکال۔

آگے چل کر جب اسلامی دنیا کے بعض علاقوں بالخصوص ہندوستان اور ایران میں مصوری نے ایک قدرے اہم حیثیت حاصل کر لی، تب بھی اس کی نوعیت یہ نہیں ہوئی کہ عام لوگوں یا اشیا کی صورت گری کی جائے، بلکہ ہوتا یہ رہا کہ جن مناظر کی تصویر کشی کی جاتی تھی، وہ عموماً ان چیزوں کی عکاسی کرتے تھے جو اس مادی دنیا میں پائی ہی نہیں جاتی تھیں۔ مصوری کا موضوع اکثر جنت کے مناظر سے لیا جاتا تھا اور گاہ گاہ جہنم کی منظر کشی سے۔ جنت، دوزخ ہر دو عالمِ خیال میں واقع ہیں۔ مثلاً ایرانی مینی ایچر miniature مصوری کا ایک نمونہ دیکھ کر شاید ہی کوئی یہ گمان کرے کہ مصور نے جس منظر کی تصویر کشی کی ہے وہ اس نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہوگا۔ یہ منظر یا یہ صورت واضح طور پر ایک دوسری دنیا سے تعلق رکھتی ہوگی اور اس کے اوصاف ایک اور عالم کے اوصاف ہوں گے۔ وہ مسلمان جن میں اپنے دین کی اساسی روحانیت کا شعور موجود ہے، یعنی ان کا طرزِ احساس اس نکتے پر استوار ہے کہ ہر حقیقت اور ہر جمال اصل میں اللہ ہی سے ہے، ان کے ہاں فنی ہیئتوں کو ایک ایسے وسیلۂ ادراک کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے جس سے وہ اللہ کی نشانیوں کو ایک بلاواسطہ طریقے سے، براہ راست انداز میں دیکھنے لگتے ہیں، عالمِ طبیعی میں پائی جانے والی نشانیوں سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ۔

خلاصہ یہ کہ اسلامی فنون میں تخیّل و خیال کا پیکرِ محسوس اور تنزیہ میں مضمر مجرد پن دونوں یکجا ہو

جاتے ہیں۔فن اسلامی میں جمالِ خداوندی کو خیال کے پیکر میں ظاہر تو کیا جاتا ہے، لیکن اس عملِ ظہور میں اظہارِ جمال کی ہیت، اس کے نقش وصورت کو مادی دنیا سے الگ کر دیا جاتا ہے۔ یہ آپ کے سامنے ایک ایسے نفس کی تصویر پیش کرتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے عکسِ جمال کا ظہور ہو رہا ہے۔فنی ہیئتیں نہ تو فقط روحانی ہوتی ہیں نہ صرف جسمانی، بلکہ ان دونوں کے بین بین، اور یہ بین بین چیز صرف خیال ہو سکتی ہے کہ خیال Imagination میں ہر دو اطراف کی صفات مدغم ہو جاتی ہیں۔

اسلام کے بصری فنون میں صورت شکل کی عکاسی سے گریز ہے۔اس کے بالکل برعکس معاملہ ہندومت، بدھ مت اور عیسوی روایت فن میں نظر آتا ہے۔فن کی ان تینوں روایتوں میں انسانی صورت کی عکاسی، اس کی مجسمہ سازی اور مصوری اظہارِفن کے بڑے اسالیب کے طور پر پروان چڑھے ہیں۔تینوں تہذیبی اور فنی روایتوں میں اس عمل کا اصل محرک یہ تھا کہ الحق (حقیقت مطلقہ) کو اس کی انسانی تجسیم میں منعکس کیا جائے، اس کی صورت گری کی جائے۔عیسوی فنون نے حضرت عیسیٰؑ کی شبیہیں بنانے سے اپنا آغاز کیا کہ ان کو خدا کا حلول مانا گیا تھا۔اسی طرح ہندو فن میں اوتاروں کی تصویر کشی کی گئی ہے جو خود دیوتا ہیں (اور ان میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ انسانی اوصاف یا شکلیں پائی جاتی ہیں)، دوسری طرف بدھ تہذیب میں فنون کا مرکز نروان یافتہ انسان ہے، یعنی مہاتما بدھ یا بودھی ستوا۔اسلام کے نقطۂ نظر سے دیکھیے تو بات کچھ اور ہو جاتی ہے۔یاد رہے کہ اسلام ان تہذیبوں پر خارج سے ایک نظر ڈال رہا ہے، مسلمانوں کے لیے یہ ایک اجنبی مظہر ہے۔اسلام کے زاویۂ نگاہ سے ان تینوں تہذیبوں نے تشبیہ پر ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے۔ان کے فنون اور ان کے اساطیر دونوں پر تشبیہی انداز غالب ہے۔عملی اعتبار سے دیکھیے تو یہ چیز ہمیں دو باتوں میں جھلکتی نظر آئے گی، اولاً یہ کہ مسلمانوں میں بت پرستی کے خلاف ایک عمومی کراہت اور نفرت پائی جاتی ہے اور ثانیاً یہ کہ عام طور پر مسلمان یہ سمجھنے کی کوشش کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہوتے کہ ہندو اور بدھ مندروں میں جو مجسمے ہیں، وہ اسلامی معنوں میں بت یا اصنامِ عبادت نہیں ہیں۔کم ہی مسلمان ہوں گے جو عظیم صوفی شاعر محمود شبستری (م ۷۲۰ھ/۱۳۲۰ء) کے مندرجہ ذیل شعر پر کھلے دل سے غور کرنے پر تیار ہوں گے۔

مسلماں گر بدانستی کہ بت چیست
بد انستے کہ دین در بت پرستیست

اس سارے بیان سے ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہنرِ اسلامی یا اسلامی فنون لے دے کر بس

قرآن اور پیامِ قرآن کے اظہار و بیان تک محدود ہیں۔ ہماری غرض یہ ہے کہ قارئین کے سامنے یہ نکتہ واضح ہو جائے کہ اسلام میں زندگی کا محور و مرکز، چونکہ قرآن مجید ہے، لہٰذا خطاطی، صوت وصدا کے خوش آہنگ اسالیب اور فنِ تعمیر کی ہیئتوں پر مسلمانوں کی توجہ اس درجہ مرکوز ہوتی چلی گئی کہ فنی اظہار کی دیگر تمام شکلیں ثانوی ہو کر رہ گئیں۔

مثال کے طور پر دیکھیے کہ آواز کے خوش آہنگ اتار چڑھاؤ کی ایک صورت موسیقی میں ظاہر ہوتی ہے اور فنِ موسیقی نے اسلامی تہذیب میں خوب نشو ونما پائی ہے۔ اسلامی دنیا کے بعض حصوں میں موسیقی کو البتہ قدرے دور دور رکھا گیا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ کچھ علما نے یہ جانا کہ رسولِ خداؐ نے موسیقی کو حرام قرار دیا تھا، لیکن موسیقی کی حرمت پر علما کا اتفاق رائے نہیں ہے۔ ایک بات پر تمام علما البتہ متفق ہیں اور وہ یہ کہ نفسِ انسانی پر موسیقی کا نہایت ہی طاقتور اثر ہوتا ہے، نیز یہ کہ موسیقی کا یہ اثر عکس جمال بھی ہوسکتا ہے، (یعنی جمالِ خداوندی کا انعکاس) اور نفس کو ژولیدگی اور بکھراؤ کی طرف لے جانے والے آتشی (شیطانی) اثرات بھی۔ ان اثرات کے دیگر تمام انسانی امکانات اس کے علاوہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مسلمانوں کی نگاہ میں موسیقی ایک مشتبہ چیز ہی رہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہی مسلمان تلاوتِ قرآن کرتے ہوئے ایک ملکوتی لحن اور اعلیٰ ترین حسنِ آہنگ کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اگر ان سے یہ کہیے کہ یہی تو موسیقی ہے تو جواب ملتا ہے کہ موسیقی تو سازوں سے ہوتی ہے یہ تو قراءت ہے اور تلاوتِ کتاب ہے۔ قرآن مجید کی تلاوت کبھی کسی ساز کے ساتھ نہیں کی جاتی۔ خدا کے کلام کو ادا کرنے کے لائق اگر کوئی وسیلہ ہوسکتا ہے تو وہ صرف ایک ہی ہے، خود اللہ کے خلیفہ کی آواز۔

اسلامی دنیا میں آواز کے زیر و بم کا، خوش الحانی اور آہنگ و قافیہ کے فن کا ایک اور بھی مظہر ہے جو قرآن مجید کی تلاوت سے بھی زیادہ عام ہے۔ ہماری مراد شعر خوانی سے ہے۔ شعر خوانی کو بلاشبہ اسلامی تہذیب کا سب سے بڑا ادبی مظہر کہا جا سکتا ہے، لیکن بہت سے جدیدیت زدہ لوگ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ قرآن کی طرح شاعری بھی کبھی کتاب کی طرح پڑھی نہیں جاتی۔ اس کی باقاعدہ شعر خوانی کی جاتی ہے اور شعر خوانی کا سلیقہ طریقہ الگ ہوتا ہے۔ آج بھی کیفیت یہ ہے کہ اردو یا فارسی کے اہل زبان کے لیے یہ نہایت دشوار ہوتا ہے کہ وہ شعر کو بلند آواز سے پڑھیں اور اسے نثر کی طرح شعری آہنگ کے بغیر ادا کریں۔ ہاں بری شاعری کی بات اور ہے۔ اچھے شعر میں جو وزن اور آہنگ کی ایک قوت ہوتی ہے، وہ پڑھنے والے کو عملاً مجبور کر دیتی ہے کہ وہ شعر کو لے کے ساتھ ادا کریں یا وزن وقافیہ

کی رعایت سے پڑھے۔ جو شخص اپنی زبان کے حسن کو محسوس کرنے سے عاری ہو چکا ہو، وہی اتنا گیا گزرا ہوگا کہ اپنی کلاسیکی شاعری سے اثر قبول نہ کرے۔

اسلامی شاعری کا نسبتاً کم حصہ ایسا ہے جس میں قرآن کے پیغام سے کوئی کھلا، ظاہر تعلق پایا جائے۔ اس کے جو عمومی سانچے بتائے جاتے ہیں، وہ تقریباً درست ہی ہیں۔ فارسی، ترکی اور اردو کے شاعر گل وبُلبل کے قصے دہراتے نہیں تھکتے، مے نوشی اور خمارِ بادہ اور حسنِ یار کی باتیں ان کے عام موضوعات ہیں۔ اس قبیل کی شاعری کو ترجمے میں پڑھیے تو قاری جلد ہی بیزار ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر مترجم کو خود ایک غیر معمولی شاعرانہ صلاحیت میسر ہو یا شعر کا موضوع رزمیہ قصہ یا ناصحانہ کلام ہو تو الگ بات ہے کہ یوں دلچسپی کا ایک پہلو پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی شعر اگر اصلی زبان میں پڑھیے تو معاملہ بہت مختلف نظر آئے گا۔ اسلامی زبانوں میں سے کسی ایک میں اگر آپ نے کبھی کسی اچھے شعر خواں، شاعری کو حسنِ ادا کے ساتھ پڑھنے والے کو دیکھا ہو تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ شعر میں صرف اس کا خیال اور اس کا موضوع ہی ایک اہم چیز نہیں ہوتا۔ فنکار اگر صاحبِ ہنر ہو تو اس کی گائیکی یا پڑھنے کے انداز ہی سے شعر اپنی موسیقیت، اپنے صوتی آہنگ کی وجہ سے سننے والے کے تخیّل کو گرفت میں لے لیتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ قرآن کے برعکس شاعری اکثر ساز و آواز کے سہارے پیش کی جاتی ہے۔ جس سے اس کی قوت اور تاثیر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

اسلامی ادب کے تاریخ نگاروں کے ہاں اکثر یہ بحث چلتی ہے کہ مسلمانوں نے جو شاعری پیدا کی، اس کا بڑا حصہ لادینی نوعیت کا ہے۔ مسلمانوں کی شاعری کے بارے میں یہ صرف ایک چلتی ہوئی رائے ہے اور قدرے جلد بازی سے کی ہوئی بات۔ پہلی وجہ تو اس کی یہ ہے کہ مسلمانوں میں دینی اور لادینی اور قدسی و دُنیوی کے مابین اس طرح کی تفریق کبھی روا رکھی ہی نہیں گئی جیسی مغربی دنیا میں نظر آتی ہے۔ آخرالامر ہر شے اللہ کی نشانی ہے، لیکن آیاتِ خداوندی کو دیکھنے پرکھنے والی آنکھ ہر کسی کے پاس نہیں ہوتی۔ قرآن مجید بار بار انسانوں سے ان لفظوں میں خطاب کرتا ہے: "**یا اولی الابصار**" (اے آنکھیں رکھنے والو)۔ اس سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ یہ آنکھیں اور یہ ذہن رکھنے والے صرف اہلِ ایمان اور اہلِ تقویٰ ہی ہو سکتے ہیں۔ ادبیات کے ماہرین اس زمرے میں اکثر شامل نہیں ہوتے اور اسی کارن وہ اصنافِ ادب اور ادبی ہیئتوں کو لادینی اصطلاحات اور زاویۂ نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں۔ قرآن کا پیغام فقط احکام اور اوامر و نواہی اور الٰہیاتی نکات پر مشتمل نہیں ہے۔ اس کے برعکس اس کے

بنیادی پیغامات میں سے ایک یہ ہے کہ انسان کو نہ صرف حسن کی پہچان بھی ہونا چاہیے، بلکہ احسان پر عمل بھی کرنا چاہیے۔ یہ حسن صرف سیرت و کردار اور اخلاق و عمل کا حسن ہی نہیں ہے، صوت و صدا میں بھی حسن ہے اور دید و بصر میں بھی۔ انسان کا عمل اور برتاؤ حسین ہونا چاہیے، لکھائی خوبصورت ہونا چاہیے اور اس کی بات میں حسنِ کلام جھلکنا چاہیے۔ بہت سے مسلمان، خاص طور پر اسلام کی تیسری جہت کی نظریاتی بنیادوں پر گرفت رکھنے والے، یعنی ماہرینِ تصوّف کہتے ہیں کہ حسن و جمال جہاں بھی ہو، جمالِ خداوندی ہی کا ایک ریزہ ہے اور اس سے انسان میں یادِ خدا بیدار ہوتی ہے۔ اپنی ماہیت کے اعتبار سے یہ جمالِ خداوندی محبت کو حرکت میں لاتا ہے اور محبت کبھی بھی آنی جانی اور عارضی چیزوں سے مطمئن نہیں ہوتی۔ عشق اللہ تک لے جاتا ہے جو واحد جمالِ حقیقی ہے: **اللّٰہ جمیل و یحب الجمال**۔ اسی طرح جس حد تک انسان اپنی صورتِ الٰہیہ کا تحقق کرتا چلا جاتا ہے، اسی قدر جمالِ خداوندی سے محبت کرنے لگتا ہے اور یہ جان لیتا ہے کہ **لا جمیل الا اللّٰہ**۔ اس کے سوا ہر حسن و جمال، جمالِ خداوندی کی محض ایک شعاع ہے۔ محبت کسی بھی شے کی ہو، ہوگی وہ ایک شعاعِ جمال کی محبت اور تجزیہ کرتے جائیے تو مآل کار یہ محبت اللہ ہی کی محبت نکلے گی۔[۱۳]

مسلمانوں کے تجربے میں محبت ایک اہم کردار کیوں ادا کرتی ہے، اس کی مندرجہ بالا وضاحت ایک نسبتاً مجرد اور کتابی انداز کی ہے۔ شعر میں یہی بات جس طرح بیان ہوئی ہے، وہ اس سے کہیں زیادہ سیدھی اور دل میں اترنے والی ہے۔ مولانا روم فارسی کے عظیم ترین شعرا میں سے ہیں۔ محبت اور جمالِ الٰہی کی سچی نوعیت کے بارے میں جو وہ بتا سکتے ہیں وہ دوسرا کوئی کہاں بیان کر پائے گا۔ افسوس کے ہم اردو ترجمے میں ان کے شعر کی نغمگی اور اس کے جادو بیان اسلوب کو نثر میں منتقل کرنے سے قاصر رہیں گے۔ آپ یوں تصور کیجیے کہ آپ آج اپنی زندگی کا حسین ترین نغمہ سماعت فرما رہے ہیں، لیکن گانے والا کیا کہہ رہا ہے، اس پر بھی ذرا غور کرتے جائیے:[۱۴]

هرکرا بامُرده سودایی بُود — بر اُمیدِ زنده سیمایی بود
آن دُرُوگر رُوی آورده بجوب — بر اُمیدِ خدمتِ مه روی خوب
بر اُمید زندهٔ کن اجتهاد — کو نگردد بعد روزی دو جماد
مُونِسی مگزین خسی را از خَسی — عاریت باشد درو آن مؤنسی
اُنسِ تو با مادر و بابا کجاست — گربجُز حق مونسانت را وفاست
اُنسِ تو با دایه و لالا چه شد — گر کسی شاید بغیر حق عُضُد

اُنسِ تو با شیر و با پِستان نماند   نفرت تو از دبیرستان نماند
آن شعاعی بود بر دیوارشان   جانب خورشید وا رفت آن نشان
بر هرآن چیزی که افتد آن شعاع   تو بر آن هم عاشق آیی ای شجاع
عشقِ تو بر هرچه آن موجود بود   آن زوَصف حق چو زر اندود بود
چون زَری با اصل رفت و مِس بماند   وز زری خویشن مفلس بماند
طبع سیر آمد طلاق او براند   پشت بروی کر دو دست از وی نشاند
از زر اندودِ صِفاتش پا بگش   از جهالت قُلب را کم گوی خوش
کآن خوشی درقُلبها عاریّتیست   زیر زینت مایهٔ بی زینتیست
زر زرُوی قُلب درکان می رود   سوی آن کان رَو تو هم کآن می رود
نور از دیوار تا خور می رود   تو بدان خور رَو که در خور می رود
زین سِپس بِستان تو آب از آسمان   چون ندیدی تو وفا در ناودان

ترجمہ

جو کسی بے جان کا عاشق ہوتا ہے   وہ زندہ چہرے والے کی آس پر ہوتا ہے
وہ بڑھئی لکڑی کی طرف متوجہ ہے   خوبصورت ماہ رو کی مصاحبت کی اُمید پر
زندہ کی اُمید پر کوشش کر   جو دو روز کے بعد جماد نہ بن جائے
گھٹیا پن سے کسی گھٹیا کو دوست نہ بنا   اُس میں وہ محبت عارضی ہے
ماں اور باپ کے ساتھ تیری محبت کہاں ہے   اگر خدا کے علاوہ تجھ سے محبت کرنے والوں میں استواری ہے
تیری محبت دایہ اور خادم کے ساتھ کیا ہوئی   اگر کوئی اللہ کے سوا (قوت) بازو ہونے کے لائق ہے
دودھ اور پستان کے ساتھ تیری محبت نہ رہی   مکتب سے تیری نفرت نہ رہی
اُن کی دیوار پر وہ ایک کرن تھی   وہ نشانی سورج کی جانب لوٹ گئی
جس چیز پر وہ کرن پڑ جائے   اے بہادر! تو بھی اُس کا عاشق ہو جائے گا
جس موجود سے بھی تیرا عشق تھا   وہ اللہ تعالیٰ کی صفت سے ملمع شدہ تھا
جب سونا اصل کی طرف چلا گیا اور تانبا رہ گیا   اور اپنے سونے پن سے خالی رہ گیا
طبیعت بھر گئی تو اس کو طلاق دے دی   اس کی طرف پیٹھ کر لی، اُس سے ہاتھ اٹھا لیا
اُس کی صفات سے ملمع کی ہوئی چیزوں سے قدم کھینچ لے   نادانی سے کھوٹے سکے کو کھرا نہ کہہ

اس لیے کہ کھوٹے سکوں میں حسن عارضی ہے — سجاوٹ کے نیچے بھدے پن کی پوٹ ہے
سونا، کھوٹے سکے پر سے کان میں چلا جاتا ہے — تو بھی اس کان کی طرف جا جہاں وہ جاتا ہے
نور دیوار سے سورج کی طرف چلا جاتا ہے — تو اس سورج کی طرف جا کہ یہی مناسب ہے
تو پھر اب تو آسمان سے پانی لے — کیونکہ تو نے دیکھ لیا کہ پرنالے میں وفانہیں ہے

اسلامی فنون کی اس نہایت مختصر بحث کا خلاصہ ہم یوں کر سکتے ہیں کہ قرآن مجید نے خیر اور حسن و جمال کو صفاتِ خداوندی کے طور پر بار بار بیان کیا ہے اور اس سے مسلمانوں میں طرح طرح کے فنون کی ایک کثیر تعداد کی نشو ونما کا حوصلہ پیدا ہوا، کیونکہ خیر اور حسن اگر صفاتِ خداوندی ہیں تو قرآن کے مطابق انسانوں میں ان صفات کا پروان چڑھنا ایک اچھی اور مستحسن چیز ہے۔ فقہا نے ان فنون میں سے بعض کے جائز اور ناجائز ہونے پر بسا اوقات اعتراضات کیے ہیں، لیکن عمومی رویّہ یہی رہا کہ مسلمانوں کے طرزِ احساس میں اسلام کی تیسری جہت کو ہمیشہ کافی اہمیت دی گئی اور مسلمانوں نے ہمیشہ اس بات کو تسلیم کیا کہ صورت و ہیئت کا حسن بھی انسانی زندگی کے لیے اتنا ہی لازمی اور اہم ہے جتنا کہ حسنِ عمل، حسنِ سیرت اور انسان کے اندر کا حسن۔ نوعِ انسانی کو اس دنیا میں اسی لیے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ اپنے نفوس کو صورتِ الٰہیہ سے ہم آہنگ کر کے نشو ونما دے اور یوں اسے قربِ خداوندی حاصل ہو سکے۔ یہ قربِ خداوندی انسان کی طلب ہے اور اس قرب کے ہر سطح پر اپنے پیمانے ہیں۔ عمل اگر ہے تو اسے شرعی احکامات کے پیمانے پر پورا اترنا چاہیے، فکر و فہم کو ایمانیات سے ہم آہنگ ہونا چاہیے اور اخلاق و کردار کی صورت گری احسان، اخلاص اور تقویٰ کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ جس دین میں تصورِ کائنات اتنا جامع ہو اور جس کا تناظر ہر شے کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہو، اس میں انسان کے طبعی ماحول اور اس کے اردگرد کی مادی دنیا کو کیوں کر نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ اس معاملے میں ہر شے کو جانچنے کا اگر کوئی پیمانہ ہے تو وہ جمال ہے، وہ جمال جس کو مضمراتِ توحید نے معین کیا ہو اور جس نے توحید ہی کے تقاضوں کے مطابق صورت شکل اختیار کی ہو۔

فن اور ہنر کی دنیا میں جو جمالِ ظاہری نظر آتا ہے وہ محض اللہ تعالیٰ کے جمالِ مخفی کا عکس ہے۔ نفسِ انسانی کو اگر اپنی صورتِ خداوندی کے پیمانے پر پورا اترنا ہے تو نہ صرف اس کا عمل ایسا ہونا چاہیے جسے حسنِ اخلاق اور حسنِ عمل کے مطابق کہا جا سکے، بلکہ ہیئت وصورت کے میدان میں بھی اسے اظہارِ جمال کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ دوسری طرف سے اگر دیکھیے تو ظاہر کا حسن، ایک سہارا بن جاتا ہے جس سے

باطن کو جِلا ملتی ہے۔ انسان کا ماحول خوبصورت ہو، عناصرِ جمال سے آراستہ ہو تو انسان کو ایک توازن، ہم آہنگی، اعتدال اور مسرت کا احساس رہتا ہے اور یہ کیفیات نفسِ انسانی کی مطلوبہ صفات کی نشوونما میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔

عملی تصوّف

صوفیہ کی تعلیمات کے نظری حصے سے ہم کسی قدر تفصیل سے بحث کر چکے ہیں اور ہم نے اس نکتے کی وضاحت بھی کی تھی کہ تصوّف کا نقطۂ نظر کس طرح فلسفے اور علم کلام سے مختلف ہے۔ اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ تصوّف کو کس اعتبار سے احسان کا ایک مظہر کہا جا سکتا ہے، احسان یعنی وہ کرنا جو خوبصورت ہو یا زیادہ صحیح لفظوں میں کہیے تو خوبصورت ہو جانا ہے۔

عملی تصوّف بھی فقہ، کلام، فلسفہ اور عرفانِ نظری کی طرح انتہائی وسیع اور پیچیدہ مظہر ہے۔ صوفیہ نے خود بھی تصوّف پر لاتعداد کتابیں لکھی ہیں اور ادھر کے کچھ سالوں میں مغربی اہلِ قلم نے بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ ان کی تحریروں میں مسلم معاشرے اور اسلامی تہذیب کے ان تمام مختلف النوع مظاہر پر تحقیق کی گئی ہے جسے تصوّف کے عنوان کے تحت سمیٹا جا سکتا ہے۔ تاریخ میں تصوّف نے جو شکلیں اختیار کی ہیں، ان کا جائزہ لینا شروع کیجیے تو کتنے ہی پیچیدہ مباحث سر اُٹھانے لگتے ہیں۔ ان پر گفتگو کا آغاز کرنا بھی ہمارے لیے یہاں ممکن نہیں ہے، اس لیے ہم صرف اتنا عرض کریں گے کہ تصوّف ایک عنوان ہے، ایک نام ہے جو سہولت کی خاطر اسلام کی تیسری جہت کے بہت سے مظاہر کے لیے برتا جاتا ہے۔ سہولت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ اصطلاح خود اسلامی تہذیب کے بطن سے پھوٹی ہے اور اسے عام طور پر عین اسی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے جو ہمارے پیشِ نظر ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ تصوّف کے مفہوم کے بارے میں اور بھی کئی آرا ظاہر کی جاتی رہی ہیں۔ یہ اصطلاح، چونکہ خود اسلامی تہذیب ہی کی وضع کردہ ہے، لہٰذا اس میں وہ سب خرابیاں نہیں ہیں جو اس کے انگریزی مترادفات میں پائی جاتی ہیں۔ ان مترادفات میں سرفہرست سِرّیت ہے mysticism جس کا پہلے بھی ذکر ہوا ہے اور جو ہمارے خیال میں سرے سے غیر موزوں ہے۔

تو پھر عملی تصوّف کیا ہوتا ہے؟ اولاً یہ کہ نظری تصوّف کو اپنے یومیہ معمولات اور روزمرہ کے ذریعے عمل میں لانا، اس پر عملاً کاربند ہونا۔ نظری تصوّف ہمارے لیے توحید کا ایک ایسا تصور فراہم کرتا ہے جس کی بنا کشفِ حقائق پر استوار ہوتی ہے، نیز نظری تصوّف کو وحی قرآن میں ایک پختہ بنیاد میسر ہے۔ علاوہ ازیں نظری تصوّف کے کئی مظاہر ایسے ہیں جن میں عقلی تلاش و تحقیق کے لیے ایک احترام اور

گوارا کرنے کا روّیہ ضرور پایا جاتا ہے۔ اگرچہ یہاں بھی نظری تصوّف کو معقولات کے باب میں کوئی زیادہ اُمید اور خوش فہمی نہیں ہے۔ تصوّفِ نظری کے تصورِ توحید کے مطابق انسان میں اگر صرف تنزیہ پائی جائے تو یہ اس کے کمال میں ایک نقص کے مترادف ہے اور کمالِ انسانی تب حاصل ہوتا ہے جب تشبیہ سے متعلق تمام صفاتِ الٰہی کو انسان اپنے اندر ایک واقعیت میں بدل دیتا ہے۔ انسان مکمل طور پر انسان تبھی بنتا ہے جب اس میں صورتِ خداوندی کا تحقق ہو جاتا ہے۔ اس مقصد سے صوفیہ رسول خداؐ کی سنت کا اتباع کرتے ہیں اور قرآن مجید کو مجسم عمل بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ قرآن اُسی طرح ان کا اخلاق و کردار ہو جائے جیسا کہ وہ رسول خداؐ کا اخلاق و کردار تھا، ان کی مجسم سیرت تھا، خلق محمدی تھا۔

عملی تصوّف بنیادی طور پر انسان کے اوصاف و اخلاق سے متعلق ہے۔ تصوّف کی ایک عام تعریف یہ کی جاتی ہے کہ تصوّف تہذیبِ اخلاق کا نام ہے۔ ایک اور تعریف میں یوں کہا گیا ہے کہ تصوّف سرا سر ادب ہے۔ انھی تعریفوں کے اسلوب میں ابن عربی ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ تصوّف کا مطلب ہے اخلاقِ خداوندی کو اپنا لینا (التخلّق بہ اخلاقِ اللہ)۔ ان چند عبارتوں کے مضمرات پر غور کریں تو تصوّف کے عملی پہلو کی غرض و غایت کھل کر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

سابقہ سطور میں ہم نے تہذیبِ اخلاق rectification of character کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس اصطلاح کے مضمرات پر گفتگو اور وضاحت سے پہلے ہم یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہی اصطلاح فلسفیوں کے ہاں فلسفے کے مقاصد میں سے ایک بڑے عملی مقصد کی نشان دہی کے لیے استعمال ہوئی ہے۔ اخلاقیات کا سارا میدان فلسفے کا ایک ذیلی شعبہ ہے جس کا موضوع ہی یہی ہے کہ اخلاق و صفات کی ماہیت پر غور و فکر کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ ان کی تہذیب اور درستگی کیوں کر ہو سکتی ہے۔ بلاشبہ مسلمان فلسفیوں کے مکتبِ فکر میں اخلاقیات محض ایک نظریاتی بحث کبھی نہیں رہی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ فلسفہ ایک وسیلہ ہے، ایک طریقہ ہے جسے خصوصیات کے ساتھ اس مقصد کے لیے برتنا چاہیے کہ انسان عملاً ایک بہتر شخصیت بن سکے۔ اس اعتبار سے فلسفیوں اور اہلِ تصوّف میں فرق یہ ہے کہ صوفیہ کے ہاں رسول اللہؐ کو اخلاقِ کامل کا مجسم نمونہ ہونے پر زور دیا جاتا ہے اور آپؐ کی سنت کو وہ دائرہ قرار دیا جاتا ہے جس کے اندر اخلاقِ حمیدہ کا حصول عملاً ممکن ہوتا ہے۔ ابتدائی دور کے فلسفیوں کے ہاں اپنے فلسفیانہ نقطۂ نظر سے عمومی مناسبت کی وجہ سے ہدایتِ انبیا کی پیروی کی ضرورت پر کوئی

خاص زور نہیں دیا جاتا تھا۔ اخلاقیات پر بحث کرتے ہوئے صرف یونانی فلاسفہ، بالخصوص ارسطو کو حوالہ بنایا جاتا تھا۔ اپنی ذاتی زندگی میں وہ اسلام کو اچھے سیرت واخلاق کے لیے ایک لازمہ جانتے تھے یا نہیں، اس امر کا پتا ان کی تحریروں سے واضح طور پر نہیں چلتا، جب کہ صوفیہ کے لیے اسلام ایک بنیادی اوراٹل شرط کی حیثیت رکھتا ہے۔

فلسفیوں کے ہاں اس موضوع کو اخلاقیات کہا گیا ہے۔ ''اخلاق'' جمع ہے ''خُلُق'' کی جس کے معنی ہیں سیرت وکردار۔ اسی سے تہذیبِ اخلاق کی اصطلاح بنی۔ خُلُق کے لفظ سے مراد عمومی کردار ہی نہیں ہوتا، بلکہ اخلاقی اوصاف بھی ہوتے ہیں۔ پس اخلاقیات کا مطلب ہوا اوصاف وصفات انسانی کا مطالعہ۔ ایک نہایت اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ عربی میں ''خَلق'' (تخلیق) اور ''خُلُق'' کو ایک ہی طرح لکھا جاتا ہے۔ انسان کا خُلُق Character ویسا ہی ہوگا جیسا اسے خَلق کیا گیا ہے۔ تقدیر کی دلیل کے طور پر ایک حدیث اکثر بیان ہوئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ''اللہ نے خلق اور خُلُق ہر دو مقدر کر دیے ہیں''[۱۵] تاہم انسان مرتے دم تک خُلُق سے فارغ نہیں ہوسکتا۔ دراصل انسان اپنی زندگی جس طور بسر کرتا ہے اور اپنی آزادیِ اختیار سے جو طرزِ زیست اس نے چنا ہوتا ہے، اسی کے وسیلے وہ اپنے سیرت وکردار کی تعمیر وتخلیق میں شریک رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول خداؐ کو ہم دُعا کرتے ہوئے پاتے ہیں کہ ''الٰہی! تو نے میرے خَلق کو جمال عطا کیا، سو میرے خُلُق کو بھی حسین بنا دے۔'' تہذیبِ اخلاق کا اگر یہ امکان نہ ہوتا تو اللہ کی طرف لوٹنے کا، معادِ اختیاری کا، سارا تصور ہی بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔

تہذیبِ اخلاق کی اصطلاح اس نکتے کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ کسی بھی انسان کے لیے اس کا اخلاق اور مختلف اوصاف کبھی نہیں ہوتے۔ انسان خود کو بدل سکتا ہے، بہتر انسان بن سکتا ہے۔ بہرحال تہذیبِ اخلاق کی بحث میں، توجہ کا مرکز انسان کا عمل نہیں، بلکہ وہ صفات ہوتی ہیں جو انسان کے اخلاق وکردار کی تشکیل کرتی ہیں۔ آج کی اصطلاح میں اس چیز کو غالباً ''شخصیت'' Personality کا عنوان دیا جائے گا۔ جب ہم یہ سوال اُٹھاتے ہیں کہ ''فلاں صاحب کی شخصیت کیسی ہے''، تو ہمیں توقع یہ ہوتی ہے کہ جواب میں ہمیں ان کے اوصاف واخلاق کے بارے میں بتایا جائے گا، لیکن فی زمانہ ہوتا یہ ہے کہ اس طرح کی گفتگو میں اکثر نہایت عمومی نوعیت کے الفاظ اور سراسر عام طرزِ اظہار کو وسیلہ بنایا جاتا ہے اور جواب کچھ یوں ہوتا ہے کہ فلاں صاحب ''اچھے ہیں''، ''واہیات ہیں''، ''نارمل ہیں''، ''عجیب سے ہیں''، ''قاعدے کے آدمی ہیں''، ''قابلِ نفرت ہیں۔'' اسلام کے نقطۂ نظر سے دیکھیے تو قرآن مجید بہت

سی صفات کو اہلِ ایمان اور اہلِ تقویٰ سے منسوب کرتا ہے اور یہ سب صفات ایسی ہیں جو پسندیدہ ہیں، جب کہ بہت سی دوسری صفات ہیں جو منکرینِ حق اور کفار سے مخصوص ہیں، جن سے انسان کو بچنا چاہیے۔ جہاں تک فلاسفہ کا تعلق ہے تو وہ ان مباحث کے لیے بیشتر یونانی علوم سے اخذ کردہ اصطلاحات استعمال کرتے تھے، گو ان اصطلاحات میں سے بہت سی ایسی ہیں جو قرآن مجید میں بھی پائی جاتی ہیں۔

''تہذیب'' کے لفظ کا انگریزی میں rectification کی اصطلاح سے ترجمہ کیا جاتا ہے، اس کے بنیادی معنی ہیں: ''کتر بیونت، آراستہ و پیراستہ کرنا، ستھرا کرنا، اجالنا۔'' سو ہمارے پاس ایک ایسی شخصیت ہوئی جس پر کام کرنا درکار ہے۔ اِس مقصد کے لیے تمام ناگوار اور ایذا دینے والے اوصاف کو کاٹ چھانٹ کر الگ کر دینا ہوگا اور تمام اچھے خواص کو صاف ستھرا کر کے صیقل کرنا ہوگا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ کوئی اچھی اور قابلِ تعریف صفت ایسی نہیں ہے جسے حاصل کرنا درکار ہو، کیونکہ فطرت و سرشتِ انسانی میں ہر اچھی اور پسندیدہ صفت پہلے سے موجود ہے کہ فطرتِ انسانی صورتِ خداوندی پر خلق کی گئی ہے۔

ہم نے ابتدائی زمانے کے ایک صوفی مصنف کا قول نقل کیا تھا کہ تصوّف سراسر ادب ہے۔ ''ادب'' ایک بہت ہی پرمعنی اور نہایت بلیغ تصور ہے جس کے سہارے اسلام کے مجموعی مزاج تک کو بیان کیا جاسکتا ہے۔ اس لفظ کے بنیادی معنی، اس کے مادّے کے معنی ہیں: ''بلانا، کسی ضیافت کے لیے یکجا کرنا''، جب کہ اس کے ثانوی معانی، دورۂ ماقبل اسلام اور خود اسلامی تہذیب میں مہمان نوازی کو وہ اہمیت حاصل رہی ہے، اُس کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ''ابن سبیل'' (راستے کی اولاد)، یعنی مسافر کو قرآن مجید نے ان لوگوں میں شمار کیا ہے جن پر زکوٰۃ کا مال صرف کیا جاسکتا ہے۔ ساری اسلامی تاریخ میں مسافر کو کھانا کھلانے اور اس کی دیکھ ریکھ کو ایک مذہبی اور سماجی فریضے کے طور پر دیکھا گیا ہے۔

''ادب'' کا تصور آگے چل کر اپنی حتمی شکل میں جس طرح پروان چڑھا، اس کا یہ صرف ایک معمولی سا جزو ہے کہ آپ مسافروں یا ان جانے لوگوں کی مدد کریں۔ اسلامی تاریخ کے ابتدائی زمانے ہی سے ادب کے لفظ کا مطلب یہ لیا جاتا تھا کہ انسان کے نفس کی صحیح تربیت اور پرداخت کی جائے اور اس کا عمل صحیح سانچے میں ڈھلا ہوا ہو۔ اس کے بنیادی معنی یہ ہوئے کہ اسلامی علوم اور عملی معاملات کے تمام میدانوں میں مناسب اور موزوں تعلیم و تربیت ہر اس شخص کے لیے ضروری ٹھہرتی ہے جسے اپنے دین کے آدرش اور درجہ کمال کا حصول مطلوب ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے وسیع مفہوم میں ''ادب'' اور سنت نبویؐ ہم معنی قرار پاتے ہیں کیونکہ سنت میں آپؐ کا سیرت و اخلاق بھی آجاتا ہے اور آپؐ کا عمل بھی۔

تاہم یہ بات یقینی ہے کہ ''ادب'' اپنے مفہوم میں کوئی محدود تصور نہیں تھا، مثلاً آپ اسے فقہا کے خیالات یا علم کلام کے ماہرین کے مباحث تک محدود نہیں کر سکتے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا دائرہ صرف شریعت پر عمل کرنے کے احکام بتانے والے یا قرآن و حدیث کا دفاع کرنے والے علما پر آ کر رک نہیں جاتا تھا۔ یہ نہ صرف ہر ذی علم شخص کی منزل اور آدرش تھا، بلکہ بڑی حد تک ہر اس شخص کا بھی جو اسلامی تعلیم و تربیت کے عمل سے گزرتا تھا۔

اسلامی زبانوں میں جب مرد و زن میں سے کسی کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ با ادب ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ وہ مہذب اور شائستہ اطوار ہے، نفاست اور سلیقہ سے بہرہ ور ہے اور بحیثیتِ عمومی اس کی پرورش اچھی ہوئی ہے۔ ''ادب'' کا لفظ ادبی تحریروں، بالخصوص شاعری کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ چیز بھی عام ہے کہ ایک با ادب شخص کو ہزاروں بہترین اشعار زبانی یاد ہوں اور وہ انھیں برمحل استعمال کر سکتا ہو۔ اسی طرح یہ بھی ناقابل یقین بات ہوگی کہ زمانۂ قدیم کے کسی شخص کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ بڑا ''با ادب'' تھا اور وہ خوش خط نہ ہو۔ بہت سی اسلامی زبانوں میں کسی شخص کے بارے میں جو بدترین باتیں کہی جا سکتی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ فلاں ''بے ادب'' ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے آپ یہ کہہ دیں کہ فلاں شخص آدمی کہاں، وہ تو بندر یا سؤر ہے۔

''ادب'' کا لفظ معاشرے کے ہر طبقے کے لوگوں کے صحیح دستورِ عمل کے لیے بھی بولا جاتا تھا اور ان تمام کاموں کے لیے بھی جو فرد کے لیے مناسب اور پسندیدہ قرار دیے جاتے تھے۔ قاضی کے لیے ادب، صوفی مریدین کا ادب، شہزادوں کے لیے ادب، اہل دربار کا ادب، طبیبوں کے لیے ادب، موسیقاروں کا ادب، بلکہ گھر ہستن عورتوں کے لیے ادب کے موضوع پر کتابیں لکھی جاتی تھیں۔ باربرا مٹکاف کی مندرجہ ذیل عبارت یوں تو جنوبی ایشیا کی اسلامی تہذیب کے بارے میں ہے مگر یہ باتیں اسلام کے بارے میں ہر جگہ اور زمانے میں درست ہیں۔ اسلام جب بھی قائم ہوگا ایسا ہی ہوگا۔

> اہل تصوف کی تحریروں میں یہ ظاہر ہے، علما اور اولیا کے عمل میں مضمر ہے، سلاطین اور درباریوں کے لیے ادب آموز کتابوں اور ادبِ قاضی اور ادبِ مفتی میں سرایت کیے ہوئے ہے، روزمرہ کے خوشگوار برتاؤ کی ہدایات اس پر مبنی ہوتی ہیں اور عوام کی مذہبی اور اخلاقی پند و نصیحت کی کتابوں تک سبھی جگہوں پر ادب کا تصور ہی وہ کلیدی تصور ہے جس سے آپ جنوبی ایشیا کی اسلامی تہذیب کے مذہبی تصورات تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔[۱۶]

مٹکاف کا کہنا یہ ہے کہ اسلامی تعلیم کے تین میدان ایسے ہیں جن میں تصوراتی طور پر ایک دوسرے سے امتیاز کیا جا سکتا ہے یعنی شریعت، اہلِ تصوّف کا راستہ یعنی طریقت اور ''ادب۔'' ان میں ہر شعبے کے ماہرین الگ ہیں، باربرا مٹکاف کے نزدیک یہ تینوں شعبے اپنے اپنے انداز میں ایک ہی جیسے اسلامی حقائق کے مظہر ہیں۔ ''تاہم چونکہ یہ سب شعبے اپنی اصل میں رسولِ خداؐ کے عمل کو ایک ضابطے کی شکل دینے اور مجسم کرنے کی کوششوں سے عبارت ہیں، لہٰذا اپنی حتمی اور آخری صورت میں یہ سب اسلام کے مرکزی دھارے میں آ کر ایک ہو جاتے ہیں''، لیکن اس کے ساتھ ہی مٹکاف نے یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ جہاں تک ادب کا تعلق ہے تو وہ خود دوسرے دو شعبوں، ہی کی تعلیمات پر مبنی ہے،''[۷۱] اور یہی وہ نکتہ ہے جس پر ہم یہاں زور دینا چاہتے ہیں۔ ادب کو ایک الگ شعبہ اور الگ میدان قرار دینے کی بجائے یوں کہنا چاہیے کہ ادب وہ میدان ہے جہاں اسلام کی تیسری جہت کے مقاصد اور آدرش اس کی دوسری دو جہتوں کے مقصود و مطلوب سے ہی آ کر ضم ہو جاتے ہیں۔

پس ''ادب'' کا مطلب ہوا، وہ ضابطہ جو عمل کو درست رکھنے کے لیے طے کیا گیا ہو۔ یہ ضابطہ اپنے ہدف اور اپنے سیاق و سباق کے لحاظ سے مختلف ہو سکتا ہے۔ اگر اسے صرف اعمال شرعی تک سختی سے محدود کر دیجیے تو اس کا مرکز کچھ اور ہو جائے گا، فلسفیانہ علم الاخلاق پر مرکوز ہو تو اس کی صورت اور ہو گی اور احسان (حسنِ عمل کی داخلی جہت) پر اہلِ تصوّف کے ہاں جو زور دیا جاتا ہے، اس کو حوالہ بنایا جائے تو ادب ایک الگ چیز ہو گا۔ فقہ پر جو کتابیں لکھی جاتی ہیں، وہ اسلام کی پہلی جہت تک محدود ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس ''ادب'' کے متعلق کتب میں لکھنے والوں کی توجہ تصحیحِ عمل پر بھی مرکوز رہتی ہے اور درست رویے اور صالح اخلاق پر بھی ہیں۔ اس طرح ان مصنّفین کے ہاں اسلام کی پہلی اور تیسری جہت دونوں یکجا ہو جاتی ہیں۔ مزید برآں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایسی کتب بالعموم اسلام کی دوسری جہت کی آغوش میں پروان چڑھنے والے ایک یا ایک سے زیادہ نقطہ ہائے نظر پر براہ راست یا بالواسطہ طور پر مبنی ہوا کرتی ہیں۔

ادب جہاں بھی ہو گا، وہاں اس کے ساتھ حسن، نفاست، شائستگی اور تہذیب و لطافت کا شعور بھی موجود ہو گا، بلکہ اس سلسلے میں تو یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ ادب کی اخلاقِ انسانی کے میدان میں وہی حیثیت ہے جو صوت و صدا کے عالم میں موسیقی اور آہنگ کی ہے یا جو حیثیت خطاطی اور فنِ تعمیر کو بصری فنون کی دنیا میں حاصل ہے۔ ان تینوں اقالیم میں ہر فنی اظہار کی تہ میں جو جذبۂ عمل کارفرما ہے، وہ تلاشِ جمال اور تجسیمِ جمال کا ہے، یعنی یہ کہ حسن و جمال کو ایک قالب اور ایک پیرایہ دے کر اس داخلی ہم آہنگی، وحدت اور اعتدال و توازن کو ظہور میں لایا جائے جو توحید کا لازمی تقاضا ہے، جیسا کہ مٹکاف

نے لکھا ہے کہ ''ادب'' کا لفظ اکثر ظاہری رویے اور عمل کی طرف اشارہ کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، تاہم ''اس کی حیثیت دوہری ہے۔ یہ بیک وقت انسان کے درونِ ذات، اس کے اندر کے انسان کی علت و بنیاد بھی ہے اور اس اندر کے انسان کے عمل کا پھل بھی، گویا جاننا، کرنا اور ہونا۔ علم، عمل اور وجود کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔''[۱۸] بالفاظِ دیگر ''ادب'' ان صورتوں میں سے ایک کا نمایندہ ہے جن میں اسلام کی تینوں جہات ایک مکمل ہم آہنگی کے ساتھ گھل مل کر اس دین کے ٹھوس اور واقعی انسانی آدرش کو ظاہر کرتی ہیں۔

اہلِ تصوّف نے اگر یہ کہا ہے کہ ''تصوّف سراسر ادب ہے'' تو ان کے پیشِ نظر یہ نکتہ تھا کہ انسان کا ہر عمل درست ہونا چاہیے، یعنی اسے اسوۂ نبوی کے مطابق ڈھلا ہوا ہونا چاہیے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب انسان کے نفس میں توازن اور ہم آہنگی ہو، اس کے بکھرے ہوئے عناصر اور میلانات کو اخلاص، تقویٰ اور احسان نے مجتمع کر کے ایک کلیّت عطا کر دی ہو۔ مزید برآں احسان، یعنی حسنِ عمل کو زبردستی لادا نہیں جا سکتا، نہ اس کے لیے بناوٹ اور دکھاوا کام آتا ہے۔ ان چیزوں سے اس کی بے ساختگی برباد ہو جاتی ہے اور بے ساختگی نہ رہے تو اس کے اجزائے حسن میں سے ایک عنصر جاتا رہے گا۔ احسان، یعنی حسنِ فہم و عمل کو نفسِ انسانی میں چشمے کی طرح ابلنا چاہیے یا شعر کی زبان میں کہیے تو یوں ہوگا کہ جیسے پھول سے اس کی مہک پھوٹتی ہے، اسی طرح انسان سے اس کا حسنِ فہم و عمل و نیت ظاہر ہونا چاہیے۔ حسنِ عمل کی بنیاد اس ہستی کے حسن پر ہے جس سے عمل ظہور میں آ رہا ہے۔ مٹکاف کے الفاظ میں ''علم، عمل اور وجود کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔''

تجسیمِ جمال کا مطلب ہے صفاتِ خداوندی کی تجسیم، ان صفات سے خود کو مزین کرنا (تخلق بہ اخلاق اللہ)۔ یہ ابنِ عربی کا نقطۂ نظر ہے جو تصوّف کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ تصوّف کا مطلب ہے ''تخلّق بہ اخلاق اللہ''، یعنی اخلاقِ خداوندی کو اپنا لینا۔ اس کی وضاحت ابنِ عربی نے یوں کی ہے کہ اخلاقِ خداوندی اپنانا ایک کہنے کی بات ہے، ورنہ اصل میں یہ سب اخلاق وصفات انسان کی سرشت میں پہلے سے نہاں ہیں، کیونکہ انسان صورتِ خداوندی پر خلق ہوا ہے، لیکن یہ اخلاق اللہ کے اخلاق ہیں اور جب تک انسان اپنی سرشت وفطرت سے منہ موڑے رہتا ہے اس کے اندر موجود یہ صفاتِ خداوندی صحیح ہم آہنگی اور توازن کے ساتھ ظہور میں نہیں آتیں۔

یہاں یہ نکتہ پیشِ نظر رہنا ضروری ہے کہ مسلمانوں نے کبھی بھی ''اخلاص'' اور ''احسان'' کو محض رویّے،

احساسات یا نفسیاتی کیفیات کے مترادف نہیں جانا۔ ان کے لیے یہ دونوں زندگی کرنے کا ایک طور ہیں، ایک اندازِ ہستی جو اس غیر حقیقی مخلوق کو الحق سے ہم آہنگ کر کے اس مخلوق کے اندازِ زیست اور اطوارِ ہستی کو واقعتاً بدل کر رکھ دیتا ہے۔ صرف اس نوعیت کے وجودی انقلاب اور قلبِ ماہیت ہی سے اس امر کی توضیح ہوسکتی ہے کہ انسان اللہ کا قرب کیسے حاصل کر سکتا ہے۔ اُس کا قرب جو حقیقی ہے، الحق ہے۔

جنت میں جانا ایک کمرے سے اٹھ کر دوسرے میں جا بیٹھنے کی طرح کا عمل نہیں ہے، جیسا کہ جنت کی متداول سماں بندی سے بالعموم تاثر ملتا ہے، بلکہ یہ انسانی فطرت کی ایک ایسی قلبِ ماہیت، اس کے ایسے انقلاب کا نام ہے جس سے ایک نیا اندازِ ہستی ظہور میں آتا ہے۔ مسلمان مصنّفین اس تبدیلی کو بیان کرنے کے لیے اکثر کیمیا گری کی تمثیل سے کام لیتے ہیں۔ کیمیا گری میں آپ یہ نہیں کرتے کہ سیسے کے ایک ٹکڑے کو اس کمرے سے اٹھا کر بیس منزلیں اوپر لے جائیں جہاں وہ اپنی باقی زندگی ہنسی خوشی گزار دے۔ اس کی بجائے سیسے کے ذرے ذرے کی ماہیت اس طرح تبدیل کی جاتی ہے کہ اس میں سوائے سونے کے کچھ باقی نہ رہے۔ پھر یہ سیسہ، جو اب سیسہ نہیں سونا بن چکا ہے، تاجِ شاہی کے لائق ہو جاتا ہے۔ سیسے کا وہ ٹکڑا جو اپنی تیرہ سرشت کو باقی رکھنے پر مصر ہو، اس کی پروانہ بادشاہ کو ہوتی ہے نہ کیمیا گر کو۔ ایسے ٹکڑے کو زمین کی گہرائی میں پگھلتے لاوے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ اس کی جگہ یہی رہ جاتی ہے۔

''احسان'' کے وسیلے سے بندگانِ خدا اس کی عبادت یوں کرتے ہیں گویا اسے دیکھ رہے ہوں۔ درجہ بدرجہ، رفتہ رفتہ ان کی نگاہ اپنی بے حقیقتی سے ہٹتی چلی جاتی ہے اور الحق مرکزِ توجہ اور ہدفِ نگاہ بن جاتا ہے۔ وہ خدا کو ہر دم یاد کرتے ہیں اور اس طرح اپنے نفوس کو، اپنی ہوا و ہوس کو اور اپنی جہالت و حماقت کو فراموش کر دیتے ہیں۔ صورتِ خداوندی پر خلق ہونے کی وجہ سے تمام صفاتِ خداوندی ان میں ایک خاموش اور امکانی حالت میں موجود ہوتی ہیں۔ الحق پر توجہ مرکوز کر کے اور بے حقیقت کو بھلا کر انسان اصل میں اپنے آپ کی حقیقی جہت کو بیدار کرتا ہے۔

مولانا روم نے ایک تمثیل کے وسیلے سے ہمیں یہ بتایا ہے کہ جب نفسِ انسانی میں الحق کو بیدار کیا جاتا ہے تو کیا ہوتا ہے۔ انسان مرکب ہے روح اور جسم کا۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک گدھے کی دم پر فرشتے کے پر لگا دیے ہیں۔ جب انسان اپنی ملکوتی اور خدائی صفات پر اپنے آپ کو مرکوز کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے وہ قوت عطا کر دیتے ہیں جس سے وہ حضورِ حق تک پرواز کر سکتا ہے

اور اگر اپنے فرشتہ سرشت ہونے کو بھلا دے اور صرف اپنی حماریت ہی میں پھنسا رہے تو پھر اس کا ٹھکانا اصطبل ہے۔ اسی حوالے سے مولانا روم نے اکثر انسان کی مثال یوں دی ہے کہ انسان ہونے کا مطلب ہے کہ گویا حضرت عیسیٰؑ خرِ عیسیٰ پر سوار ہوں۔ کہتے ہیں:[۱۹]

رحم برعیسی کن و برخرمکن　　طبع را بر عقلِ خود سَرُوَرمکن

اقلیمِ عشق Ethos of Love

ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ ’’احسان‘‘ کے مختلف مظاہر کا مرکزی نکتہ صفتِ حب یا محبت ہے۔ شاعری پر یہ بات خاص طور پر صادق آتی ہے کیونکہ شاعری کا غالب موضوع محبت ہے اور اس کے بے شمار و انتہا استعارے اور تشبیہات و تمثیلات۔[۲۰] یہی بات تصوّف کے لیے بھی کہی جا سکتی ہے، کیونکہ تصوّف میں عام طور پر محبت ہی کو اسلامی طرزِ زیست اور حسنِ عمل کی کلید کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر مسلمانوں کی اکثریت کے لیے محبت ہی وہ چیز ہے جس سے جسدِ اسلام کو زندگی اور تازگی نصیب ہوتی ہے۔ ان کے نقطۂ نظر سے اگر محبت کی روح حیات آفریں نہ ہو، یعنی اسلام کی تیسری جہت مفقود ہو تو دین مرجھا کر خشک ہو جاتا ہے، اس کی رونق جاتی رہتی ہے اور دین کے نام پر لے دے کر ہمارے پاس یا تو جزئیاتِ فقہ اور تفصیلاتِ عمل کی بنجر بحثیں رہ جاتی ہیں یا مناظرانہ چپقلش اور ہر اس آدمی یا طبقے پر حملۂ مخالفانہ جو عقائد کے ضمن میں ہماری ادعائیت کی لکیر کا فقیر نہ ہو۔

وہ مسلمان جو اسلام کی تیسری جہت کو اپنا مرکزِ توجہ بنائے ہوئے ہیں، یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ایمان کی پرورش کے لیے شریعت ضروری ہے اور ایمان، عمل کے ساتھ مل کر وہ زمین فراہم کرتا ہے جس میں ’’احسان‘‘ کے پھول کھلتے ہیں اور اسی سے احسان کی آبیاری ہوتی ہے۔ انسان کے لیے نہ ایمان سے کوئی گریز ہے نہ عمل سے فرار کہ احسان انھی کے دائرے میں اور انھی کے سہارے پنپ سکتا ہے، لیکن ایمان و عمل مقصود بالذات نہیں ہیں۔ ان کا جوازِ وجود کچھ اور ہے۔ ایمان و عمل کو بار آور ہونا ہے، پھل پھول لانا ہے اور ایک لفظ میں کہیے تو ان کا پھل ہے محبت، حُبِّ الٰہی۔ مسلمانوں میں سے جو لوگ اس انداز میں سوچتے ہیں، ان کے نقطۂ نظر کو سمجھنا ہو تو محبت، عشق اور حُبِّ الٰہی کے بارے میں ان کے خیالات اور تصورات کو قدرے تفصیل سے دیکھنا ہوگا۔

شعر میں عشقِ خداوندی کی سب سے بڑی نمایندہ آواز مولانا روم کی ہے۔ مولانا روم ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ جہاں ایک طرف محبت کی تعریف متعین کرنا ایک ناممکن کام ہے، تو دوسری طرف اس کی

لاتعداد تشریحات کی جاسکتی ہیں۔ ہم نہ یہ کہنے کے قابل ہیں کہ محبت اصل میں ہے کیا اور نہ ہمیں بیانِ محبت کی کوئی انتہا ہی نظر آتی ہے۔ بہر حال اور کچھ نہیں تو مولانا روم اور دیگر صوفی مصنّفین کی پیروی میں ہم عشق ومحبت کے تہ دار معنی کی کچھ پرتیں تو آپ کے سامنے کھول ہی سکتے ہیں۔

ہم اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ محبت صفاتِ خداوندی میں سے ایک ہے یا بالفاظِ دیگر اللہ تعالیٰ المحب ہے، محبت والا ہے۔ لیکن محبت اور رحمت الگ الگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت عامہ ہر مخلوق کے لیے ہے، جب کہ اس کی رحمتِ خاص جنت میں ظاہر ہوتی ہے جہاں یہ اہلِ تقویٰ کو نصیب ہوتی ہے۔ اللہ کی رحمتِ خاص کا الٹ ہے غضبِ خداوندی اور غضبِ خداوندی کا سب سے صاف اور واضح عکس ہے دوزخ۔

قرآن مجید کے مطابق محبت کا تعلق اللہ کی رحمتِ خاص سے ہے، رحمتِ عام سے نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو اہلِ احسان سے، محسنین سے محبت ہے، منکرینِ حق اور اعمالِ قبیحہ کے مرتکب لوگوں سے نہیں۔ اگر اسے ان سے بھی محبت ہوتی تو ان کو دوزخ میں نہ ڈالا جاتا۔ اس سے اس بات کا انکار مقصود نہیں کہ اللہ کی رحمت اس کے غضب سے بڑھی ہوئی ہے اور خود جہنم ان لوگوں کے حق میں ایک رحمت ہے جو دوزخ کی نذر کیے جائیں گے۔ بہر حال یہ ایک جداگانہ بحث ہے اور اس میں الجھ کر ہم محبت کے مسئلے سے بہت دور نکل جائیں گے۔

اہلِ تصوّف میں جو حبِ خداوندی، عشقِ الٰہی پر اتنا زور دیا جاتا ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے ہاں تشبیہ کو تنزیہ پر ترجیح حاصل ہے اور رحمت کو غضب پر غالب رکھا گیا ہے۔ جب فقہا اور اہلِ کلام اللہ تعالیٰ کی بات کرتے ہیں اور اس کا ذکر اپنے معقولاتی سانچوں اور اوامر ونواہی کے حوالے سے کرتے ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ سوائے اِس کے کچھ نہیں نکلتا کہ انسان میں خوف اور دوری کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس صوفیہ کے ہاں زور ہے اللہ کے قرب پر اور انسانوں کے لیے اس کی محبت پر۔ عقلی دلائل اور مجرد بحثوں کی بجائے اہلِ تصوّف ہر طرح کی تمثیلات اور استعارے استعمال کرتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ انسان کے لیے ایک واقعی اور زندہ تجربہ بن جائے۔ ان کے پیغام کی تہ میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے محبت کرتے ہیں اور ہمارا بھلا چاہتے ہیں۔ اسی بات کو سمجھانے کے لیے وہ اللہ کی خوبصورت اور پیاری صفات کو روزمرہ کی زبان میں بیان کرتے ہیں اور اسی پر زور دیتے ہیں۔ اگر کوئی آپ سے محبت کرے تو آپ بھی اسے چاہنے لگیں گے، یہ انسانی فطرت ہے۔ صوفیہ انسان کے اس نفسیاتی رجحان سے سب سے زیادہ آگاہ تھے۔ مزید برآں انھیں اس مابعدالطبیعیاتی امر کا بھی پورا ادراک تھا کہ تخلیقِ

آدم سے اللہ تعالیٰ کا مقصود یہ تھا کہ محبت کو صورت واقعی مل جائے، کیونکہ انسان کے سوا اور کوئی مخلوق صحیح معنوں میں اللہ سے محبت کی اہل نہیں۔

ان نکات کی تائید میں اہلِ تصوّف کی کتابوں سے لاتعداد حوالے دیے جا سکتے ہیں۔ جن کی یہاں گنجایش نہیں۔ یہاں ہم صرف اتنا عرض کرنے پر اکتفا کریں گے کہ اسلام میں حُبِّ الٰہی اور عشقِ خداوندی کے موضوع پر جو کچھ لکھا گیا ہے، انگریزی زبان میں اُس تک دسترس کی سہل ترین صورت مولانا روم کی کتابوں کے مختلف تراجم ہی سے ہو سکتی ہیں۔

اِس موضوع پر انگریزی زبان میں جو کچھ مہیا ہے، اس کے برعکس سطورِ ذیل میں ہم رشیدالدین میبدی کی کشف الاسرار سے ایک اقتباس دے رہے ہیں۔ اس کا ترجمہ انگریزی میں موجود نہیں۔ کشف الاسرار صوفیانہ ادب کی شاہکار کتابوں سے ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جدید محققین نے اسے عموماً نظر انداز کیے رکھا ہے۔ قرآن مجید کی اس تفسیر کی ابتدائے تصنیف مصنف کے بیان کے مطابق ۵۲۰ھ/۱۱۲۶ء میں ہوئی۔ آج جو ایڈیشن ہمارے سامنے ہے، اس کے آٹھ ہزار صفحات ہیں، سو ہم یہ گمان کرنے میں حق بجانب ہیں کہ اس کی تکمیل میں انھیں کئی سال لگے ہوں گے۔ کشف الاسرار کا صرف ایک چوتھائی حصہ آیاتِ قرآنی کی صوفیانہ تفسیر وتعبیر پر مشتمل ہے، باقی تمام متن یا تو قرآن کا فارسی ترجمہ ہے یا آیات کے ظاہری معنی، الفاظ کے دروبست، سیاق وسباقِ کلام، شانِ نزول اور تاریخی نکات کا بیان اور ان کی اہمیت کی شرح وتوضیح۔ اس کے بعد مصنف آیاتِ قرآنی کے نسبتاً پنہاں مفاہیم کو اپنی توجہ کا مرکز بناتا ہے جو عام طور پر نظروں سے اوجھل رہ جاتے ہیں۔ ان مقامات پر وہ اکثر اپنے استاد، مشہور صوفی اور فقیہ خواجہ عبداللہ انصاری ہروی (م ۴۸۱ھ/۱۰۸۸ء) کا حوالہ دیتے اور ان کے اقوال نقل کرتے ہیں۔ خواجہ انصاری کی شہرت ان کی اہم عربی اور فارسی تصنیفات کی وجہ سے ہے۔ فارسی میں ان کی نثری تحریریں اس زبان کے خوبصورت ترین آثار اور شاعرانہ اسلوبِ نثر کے بہترین نمونوں میں شمار ہوتی ہیں، اسی لیے ان کا ترجمہ کرنا خاص طور پر مشکل ہے۔ خواجہ انصاری سے میبدی نے جو اقتباسات نقل کیے ہیں، سطورِ ذیل وہ انھی ترجمے پر مشتمل ہیں۔ اِس ضمن میں ہماری کوشش یہ رہی ہے کہ ان کی تحریر کا آہنگ گرفت میں آ سکے۔ اس لیے ہم نے ان عبارات کے ترجمے میں شعری اسلوب اختیار کیا ہے۔

ایک جگہ مصنف اس آیت کی شرح وتفسیر کر رہے ہیں جس کا حوالہ ''محبت'' پر گفتگو کرتے ہوئے

ہر مبحث میں بکثرت دیکھنے میں آتا ہے۔ وہ آیت یہ ہے:

یَاَ یُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ (۵:۵٤)

اے ایمان والو! جو تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو (اللہ کو کوئی پروانہیں) وہ جلد ایسے لوگوں کو اٹھائے گا جن سے وہ محبت کرے گا اور وہ اسی سے محبت کریں گے۔

میبدی کی عبارت درج ذیل ہے۔[۲۱]

''اے ایمان والو، اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھر جائے''

اس آیت میں جاننے والوں کے لیے ایک اشارہ ہے اور ماننے والوں کے لیے بشارت۔ اشارہ یہ ہے کہ اس ملّت اسلام اور دینِ حنیف اور شریعتِ محمدیہ کا نگہبان خود خدا ہے اور اس دین کو ابدی بقا ہے۔ اس دین کا کیا نقصان اگر کوئی گروہ الٹے پاؤں پھر جائے اور مرتد ہو جائے۔ اگر کوئی جتھا مرتد ہو جائے تو رب العزت دوسری جماعت لے آئے گا جو اس دین کو دل و جان سے لگائے رکھے گی اور اس کی پرداخت میں خود کو کھپائے رکھے گی۔ اللہ تعالیٰ امر و نہی کی نشانیوں اور بنیادوں کو ان کے ذریعے سے محفوظ رکھے گا اور شریعت کی بساط کو ان کے ہونے سے آراستہ رکھے گا۔ اس نے محبت کا نقش **"یحبھم و یحبونه"** (وہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اس سے محبت کرتے ہیں) ان پر کندہ کر دیا۔ اپنے خط میں ان کے صفحہ دل پر رقم کر دیا کہ ''**کتب فی قلوبھم الایمان**" ۲۲:۵۷ (ان کے دلوں میں ایمان لکھ دیا گیا) اور ان کے باطن کو چراغ معرفت سے روشن کر دیا کہ ''**فھو علی نور من ربه**" ۳۹:۲۲ (سو وہ اپنے رب کی طرف سے ایک نور رکھتا ہے)۔ الوہیت ان کی مربی، آغوشِ نبوّت ان کا گہوارہ ہے۔ ازل و ابد ان کی دیکھ بھال کرنے والے، میدان لطف و کرم ان کی نگاہ ٹکنے کی جگہ اور بساط ہیبت ان کی آرزوؤں کی قرارگاہ ہے۔ اسی بات کو اللہ نے ایک دوسری جگہ یوں بیان کیا ہے: **"فان یکفر بھا ھٰؤلاءِ فقد وکلنا بھا قوماً لیسوا بھا بکفرین"** (اور اگر یہ لوگ اُس کی سچائی کو چھپائیں گے تو ہم اسے ایسے لوگوں کو دے چکے ہیں جو اسے چھپانے والے نہیں) اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''میری امت میں ایسا گروہ ہمیشہ رہے گا جو حق کو ظاہر کرے گا، ان کی مخالفت کرنے والا انھیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکے گا اور یہ اس وقت تک رہیں گے جب تک کہ اللہ کا حکم آ جائے)۔

اور بشارت یہ ہے کہ جو مرتد نہیں اُس کا شمار محبوبوں میں ہو جاتا ہے، وہ اہلِ محبت اور اہلِ ایمان ہے۔ جو ارتداد کے گڑھے میں نہ گرا، اس کے لیے بشارت ہے کہ محبت کا نام اس پر صادق آیا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''جو تم میں سے اپنے دین سے منہ موڑے گا تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو لے آئے گا جن

سے اللہ محبت کرتا ہوگا اور وہ اس سے محبت کرتے ہوں گے۔''

اللہ نے پہلے اپنی محبت کا اثبات کیا اور پھر بندوں کی محبت کا، تاکہ تم جان لو کہ جب تک اللہ بندے کو دوست نہیں بناتا، بندہ دوست نہیں بنتا۔

پیر طریقت خواجہ عبداللہ انصاری کا قول ہے:

دوستی کے کنویں کو پانے کی نشانی رضا ہے۔

دوستی کے پانی کو بڑھانے والی وفا ہے، دوستی کا خزانہ سارے کا سارا نور ہے، دوستی کے درخت کا میوہ سب کا سب سرور ہے۔

جس نے دونوں جہانوں سے الگ جا پڑا دوستی کی وجہ سے معذور ہے۔

جس نے دوست سے دوست کے سوا چاہا، ناسپاس ہے۔

دوستی، رب الناس کی دوستی ہے، باقی جو ہے نرا وسواس ہے۔

''یحبھم و یحبونہ'' ایک نقش ہے عظیم اور ایک کاروبار ہے انوکھا

جس نے آب وگل کو اتنا اٹھا دیا کہ دوستیِ حق کا قبلہ بن گیا اور وصل کے تیر کا ہدف۔

اور مسافر کیوں نہ اترائے جب کہ اللہ کی راہ میں نزدیک ترین منزل محبت کی منزل ہے۔

وہ درخت کہ ہمیشہ سرمستی کا پھل لاتا ہے دوستی ہے،

وہ مٹی کہ بس نرگس اُنس اگاتی ہے دوستی ہے،

وہ ابر کہ ہمیشہ نور برساتا ہے دوستی ہے،

وہ شراب کہ جس کا زہر بھی شہد ہے دوستی ہے۔

وہ راہ کہ جس کی خاک کا ذرہ ذرہ مشک وعبیر ہے دوستی ہے۔

دوستی کا نقش ازلی ہے اور دوستی کا داغ ابدی ہے۔

جب سے دوست کی دوستی میرا چلن اور میری سرشت ہے، میں سارے کا سارا دوست کا ہوں اور دوست کُل کا کُل میرا۔

دیکھ سرمایۂ دوستی کہاں تک ہے!

سن دوستوں کا قصہ کہ کتنا زیبا ہے۔

میدانِ دوستی دل جتنا فراخ ہے۔

اقلیم فردوس دوستی کے درخت کی ایک شاخ ہے۔

دوستی کی شراب نوش کرنے والا دیدار کی ضمانت رکھتا ہے۔

جو سچا ہے وہ اپنی مراد ضرور پاتا ہے۔

روحِ خداوندی کا پیکر

بات سے بات نکلتی ہے۔ ارکانِ خمسہ کی بحث سے ہم دور نکل آئے، تاہم شریعت کے بارے میں ہم اتنی گفتگو کر چکے ہیں اور اتنے حوالے دے چکے ہیں کہ قارئین پر یہ واضح ہو جانا چاہیے کہ شرعی اعمال وعبادات اسلام کی بنیاد اور اس کے لازمی ترین عناصر میں سے ہیں۔ انسان کیا ہیں؟ ارواح کی تجسیم، ارواحِ مجسم، یعنی انسان وہ روح ہے جسے قالب مل گیا، جسم فراہم ہو گیا۔ جسم و روح (spirit) کا ملاپ نفس (soul) میں ہوتا ہے جو روح (spirit) بھی ہے اور بدن بھی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ہماری تجسیم، قالب میں آنے کا اٹوٹ تعلق اس بات سے ہے کہ ہم کون ہیں اور ہمارے جسم اور قالب کا ہمارے اقوال واعمال سے ایسا گہرا تعلق ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

ایک مذہبی طرزِ فکر ایسا بھی ہے جو جسم اور روح (spirit) کو ایک دوسرے کی ضد اور ان دونوں کو مسلسل برسرِ پیکار عناصر کے طور پر دیکھتا ہے۔ اس کی عام مثالیں عیسائیت کے علاوہ اس کے بعد ابھرنے والے طرزِ احساس میں بھی جا بجا نظر آتی ہیں۔ عیسائیوں میں بھی یہ خیال آپ کو خاصا عام ملے گا جس کے تحت ہر روحانی چیز اچھی ہے اور جسم سے متعلق ہر شے بری ہے، اس لیے جسم کی ہر شے پر یا تو غلبہ حاصل کرنا چاہیے یا اس سے گریز اور فرار۔ آج کی مابعدِ عیسائیت فکری فضا میں معاملہ اب دوسری انتہا کو چھونے لگا ہے اور ہر بات کو جسم کے پیمانے سے جانچا جاتا ہے اور یہ خیال سرے سے رد کر دیا گیا ہے کہ کوئی روحانی حقیقت ایسی بھی ہو سکتی ہے جو جسم کے بندھن سے آزاد ہو یا جسم کے زیر اثر نہ ہو۔

ہم عرض کر چکے ہیں کہ اسلام کا روایتی نقطۂ نظر روح اور جسم دونوں کو نوعِ انسانی کے لیے ضروری اور اہم عناصر ترکیبی کے طور پر قبول کرتا ہے۔ روح زیادہ حقیقی ہے، کیونکہ اس کا تعلق اشیا کی ربّانی جہت سے ہے، اسے اللہ نے خود جسم میں پھونکا ہے، یہ نَفَسِ رحمان ہے، تاہم انسان کا وجود بحیثیت انسان غالباً اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک اس کے پاس جسم نہ ہو، لہٰذا ایک بہت اہم اعتبار سے روح کا انحصار بدن پر ہے۔ قصۂ آدم اس نکتے کو واضح کرتا ہے۔ پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے گلِ آدم کی صورت گری کی اور اس کے بعد اس پیکرِ آب و گل میں روح پھونک کر آدم کی تخلیق کی۔

ہستیِ انسانی کا رزمیہ نفسِ انسانی کی سطح پر وجود میں آتا ہے۔ یہاں روح کا خلقی اور پیدائشی نور بدن کی تیرگی میں مل جاتا ہے۔ ہماری اپنی انفرادیتوں کو بھی روح یا بدن سے الگ نہیں کیا جا سکتا، اور لفظ نفس (soul) کو ہم نے بعینہٖ اسی معنی میں برتا ہے۔ مسلمان ماہرینِ نفسیات کی تحریروں میں بالعموم

اسے یوں بیان کیا گیا ہے کہ نفس وہ بچہ ہے جو ایک روحانی باپ اور جسمانی ماں کی اولاد ہے۔ نفس کا کمال اس چیز میں ہے کہ میراثِ پدر کو ورثۂ مادری پر غلبہ حاصل ہو جائے یا یوں کہیے کہ آسمانی کا حکم زمینی پر چلنے لگے، نورانی، ظلمانی پر حاوی ہو جائے۔

زمین اپنے خزانے تبھی اگلتی ہے جب آسمان سے اسے روشنی اور پانی نصیب ہوتا ہے۔ عورت بچے کو تبھی جنم دیتی ہے جب اُسے مرد کی تخم ریزی میسر آتی ہے۔ رنگ اس وقت نکھرتے ہیں جب روشنی تاریکی میں جگمگاتی ہے۔ زمین اگر روشنی اور پانی قبول نہ کرے تو وہ خشک ہو جائے گی، مر جائے گی، عورت اگر مرد کو قبول نہ کرے تو وہ بانجھ رہ جائے گی، اور تاریکی اگر روشنی کا انکار کرے تو اس کے پاس دکھانے، آشکار کرنے کو، کچھ نہیں رہ جائے گا۔[۲۲]

یہ وہ تمثیلات ہیں جو مسلمان مصنّفین استعمال کرتے ہیں، یہ بتانے کے لیے کہ نفس (soul) کے لیے لازم ہے کہ روح (spirit) کی تاثیر کے سامنے سپر انداز ہو جائے، ایسے ہی جیسے انسان کے لیے لازم ہے کہ اللہ کے سامنے سرِتسلیم خم کر دے۔ روح سے منہ موڑنا اور بدن پر سارا دھیان جمائے رکھنا ایسے ہی ہے جیسے روشنی کو رد کر کے تاریکی میں ڈوبتے چلے جانا۔ نفس کی روشنی، اس کی نورانیت صفاتِ خداوندی کی رہین، اور اس کی تاریکی اس جسمانی قالب، اس پیکرِ آب و گِل کے کارن ہے جو اس کے لیے مطلقاً ضروری ہے، ورنہ نور کے لیے کوئی جگہ، کوئی محلِ اظہار ہی میسر نہ ہوگا جہاں اس کی چمک اور تابندگی اپنا آپ ظاہر کر سکے۔ نفس کو نور کی تجسیم بھی کہا جا سکتا ہے اور ایسی تیرگی بھی جسے روحانیت مل گئی ہو۔

نفس کوئی جامد و ساکت شے نہیں یہ اللہ تعالیٰ کی خلاقیت کے بہاؤ میں لحہ بہ لحہ بدلتا رہتا ہے۔ ہر آن اسے نت نئی صورتِ حال کا سامنا رہتا ہے اور چونکہ روح ہر قید سے آزاد ہے، لہٰذا اسی کے پرتو میں نفس کو بھی ایک اضافی آزادیِ اختیار ملی رہتی ہے۔ ہر عمل، خاص طور پر ارادی عمل، کا ایک اثر ہوتا ہے اور اسی اثر سے یہ متعین ہوتا ہے کہ انسان کے اندر صورتِ الٰہیہ کس انداز میں دمیدگی کے عمل سے گزرے گی اور مضمر و پنہاں امکان سے بڑھ کر عیاں و آشکار حقیقت میں بدلے گی۔

نفس کی نشو و نما اور ارتقا کا مبحث جس طرح زیرِ غور آتا رہا ہے اس میں سب سے عام طریقہ یہ ہے کہ اسے تین درجہ وار سطحوں کے لحاظ سے دیکھا جائے جنھیں عموماً ''نفسِ امارہ'' (برائی کروانے والا نفس)، ''نفسِ لوامہ'' (ملامت کرنے والا نفس) اور ''نفسِ مطمئنہ'' (وہ نفس جو اطمینان پا گیا) کے عنوانات سے یاد کیا گیا ہے۔

پہلی سطح کو لیجیے: یہاں نفوسِ انسانی اپنے اندر روح کا نور بہت کم پاتے ہیں۔ ان میں غفلت اور نسیان کا، خودفراموشی، خدافراموشی کا میلان پایا جاتا ہے، ہوا و ہوس کا حکم چلتا ہے، لوگ جو چاہتے ہیں کرگزرتے ہیں چونکہ انھیں ایسا کرنا اچھا لگتا ہے۔ ایک شیرخوار بچے کے لیے یہی صورتِ حال فطری، اچھی اور نارمل ہے، تاہم ہم میں سے ہر شخص اس بات سے آگاہ ہے کہ بچے کو رفتہ رفتہ یہ سکھانا لازم ہے کہ اس کی خواہشات سے بلندتر کچھ اور بھی فیصلہ کن عناصر ہیں جن کا حکم ماننا ضروری ہے، لیکن تاوقتیکہ بچے میں عقل کا ملکہ پوری صحت سے نشو و نما حاصل نہ کرلے، اس پر عقلی دلائل برتنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

لیکن قرآن مجید کا خطاب بچوں سے نہیں ہے۔ اس کے مخاطب وہ عاقل و بالغ افراد ہیں جو اپنی فکری صلاحیتوں پر مکمل دسترس رکھتے ہوں۔ قرآن ان سے کہتا ہے کہ ہوا و ہوس کی پیروی بے عقلی کی بات ہے، کیونکہ صاحبانِ عقل جانتے ہیں کہ ان کے اپنے احساسات و میلانات سے بالاتر کچھ اور بھی ہے جس کا حکم ان کے انفرادی میلانات اور جذبات پر حاوی ہے۔ یہ درست ہے کہ قرآن مجید لوگوں میں اس نکتے کا فہم پیدا کرنے کے لیے منطقی استدلال اور فلسفیانہ قیل و قال کا کوئی پروگرام اور خاکہ تجویز نہیں کرتا۔ یہ آج کی یونی ورسٹی کے شعبۂ فلسفہ کا کام تو ہوسکتا ہے، لیکن اللہ کے لیے زیبا نہیں کہ وہ نوعِ انسانی کے تمام بالغ افراد سے خطاب کرنے کے لیے اس طرح کا اسلوبِ بیان اختیار کرے جو صرف ان لوگوں کے لیے موزوں ہو جنھیں فلسفہ طرازی کا شوق ہے۔ وحی کا مقصود ہے لوگوں کو ہدایت فراہم کرنا اور ان کی فلاح و مسرت کی ایک ایسی کیفیت تک رہنمائی کرنا جس کا تصور بھی اللہ کی مدد کے بغیر نہیں:

فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّآ اُخۡفِیَ لَهُمۡ مِّنۡ قُرَّةِ اَعۡیُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ (۳۲:۱۷) تو کسی کو پتا نہیں کہ ان لوگوں کے واسطے، ان کے اعمال کے صلہ میں آنکھوں کی کیا ٹھنڈک پوشیدہ ہے۔

مختصر یہ کہ قرآن مجید انسانوں سے خطاب کرتا ہے اور ان سے یہ کہتا ہے کہ اگر وہ بچوں کی طرح اپنی خواہشات کی غلامی کریں گے اور ہوا و ہوس کے فرمان پر چلتے رہیں گے تو یہ ایک نہایت لغو بات ہوگی۔ صرف لغو ہی نہیں، اس میں بہت سے خطرات بھی ہیں کہ انجام کار یہ بات انھیں کہیں ایسی صورتِ حال سے دوچار نہ کردے کہ جس صورتِ الٰہیہ پر انسان کو خلق کیا گیا تھا، وہ ملیامیٹ ہوجائے، تاہم قرآن اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ، سب نہ سہی، اکثر لوگ اسی سطح پر زندگی کرتے ہیں۔ حقیقت کی جسمانی جہت سے جو تیرگی اور غفلت متعلق ہے، وہ ان کے نفوس کو لپیٹ میں لیے رکھتی ہے۔ انسان کی اس پست ترین حالت

کو بیان کرنے کے لیے مسلمان ماہرین نفسیات نے قرآن کی اصطلاح ''نفسِ امارہ'' (۱۲:۵۳) استعمال کی ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں انکارِ حق اور غفلت شعاری انسان کو اپنی سرشت معلوم ہوتی ہے اور وہ ہر اس شے کو اٹھا کر ایک طرف پھینک دیتا ہے جو اس کی خواہش اور ہوائے نفس کے خلاف پڑتی ہو۔ نتیجہ کیا نکلے گا، اس کی اسے کوئی پروا نہیں ہوتی۔ گدھے کی دم اور فرشتے کے پر کی جو تمثیل مولانا روم نے استعمال کی ہے، اسے ملا کر کہیے تو یوں کہنا ہوگا کہ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں دم سے پر کو جنبش ہو رہی ہے۔

ہمارے پاس یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ انسان ضرور اس مرحلے کو عبور کر کے آگے بڑھ سکے گا۔ قرآن مجید نے بار ہا رسول خداؐ کو خطاب کر کے یہ کہا ہے کہ وہ منکرینِ حق کو قائل کرنے کے لیے اپنے آپ کو ضیق میں نہ ڈالیں۔ اگر کوئی اندھا ہے تو اسے کون دکھائے۔ اللہ ہی چاہے تو اسے سجھائی دے:

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّ بُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۶:۳۹)

اور جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا، یہ بہرے اور گونگے تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے سیدھی راہ پر لگا دیتا ہے۔

یہ نکتہ قابل غور ہے کہ قرآن مجید نے اکثر اندھے بہرے انسانوں کو جانوروں سے تشبیہ دی ہے۔ نفس کا وہ مرحلہ جو برائی کا حکم دیتا ہے، اصل میں نفس کا حیوانی درجہ ہے جسے عقل کی روشنی میسر نہیں۔ روایت میں آیا ہے کہ جو لوگ حیوانی درجے پر رہ جاتے ہیں، انھیں برزخ اور حشر میں اپنا تجربہ جانوروں کی صورت میں ہوگا، وہ خود کو جانوروں کی طرح پائیں گے۔ ان کے امکانِ انسانی اور واقعیتِ حیوانی کے مابین جو وسیع خلیج حائل ہو چکی ہے، اس سے ان کے نفس میں ایک ایسا گہرا عدمِ توازن پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کی پاداش بھڑکتی آگ کے عذاب کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا:

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَ النَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (۴۷:۱۲)

بے شک اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنھوں نے صالح عمل کیے، ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن میں نہریں بہ رہی ہوں گی اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ اسی طرح بہرہ مند ہو رہے ہیں اور کھا رہے ہیں جس طرح چوپائے کھاتے ہیں اور دوزخ ان کا ٹھکانا ہے۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ۔ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَاللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ (۸:۲۱-۲۲)

اوران لوگوں کی روش اختیار نہ کرو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم نے سنا، لیکن سنتے سناتے کچھ نہیں۔ اللہ کے نزدیک بدترین جانور یہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ۔ اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا (۲۵:۴۳-۴۴)

بھلا یہ جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے، تم اس کے ذمہ دار ہو گے۔ کیا تم یہ گمان رکھتے ہو کہ ان میں سے اکثر سنتے یا سمجھتے ہیں؟ یہ تو بس چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی گم کردہ راہ۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (۷:۱۷۹)

اور ہم نے جنوں اور انسانوں میں سے بہتوں کو دوزخ کے لیے پیدا کیا ہے۔ ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں، ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں۔ یہ چوپایوں کے مانند ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو بالکل بے خبر ہیں۔

بچے جوں جوں بڑے ہوتے جاتے ہیں، ان کا خاندان اور ماحول ان کے اندر عمل کرنے اور فیصلے تک پہنچنے کے معیار راسخ کرتا چلا جاتا ہے۔ عام طور پر یہ معیار اور جانچ پرکھ کے یہ پیمانے ایک اخلاقی نوعیت رکھتے ہیں، یعنی چیزوں کو اچھے، برے اور صحیح یا غلط کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ مغربی تہذیب اگرچہ اس میں کامیاب نہیں ہوسکی، تاہم اس کی کوشش رہی ہے کہ وہ ان معیارات اور اقدار کو ایک عقلی اور سائنسی بنیاد فراہم کردے۔ اسلام کا کہنا یہ ہے کہ سچی اقدار اور معیار تو خلقی اور پیدایشی ہوتے ہیں، کیونکہ یہ ہمارے اندر کی صورتِ الٰہیہ سے جنم لیتے ہیں۔ ہم نے جو حدیث نقل کی تھی کہ ''**كل مولود يولد على الفطرة فابواه يهودانه اوينصرانه اويمجسانه**'' (ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے والدین اس کو یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں)۔ آج کی زبان میں کہیے تو یوں ہوگا کہ ''پھر

اسے لاادری، سائنسی انسان پرست، نیوایج تحریک کا رکن وغیرہ وغیرہ بنادیا جاتا ہے۔''

ہماری اقدار کا منبع کچھ بھی رہا ہو، یہ بہرحال ہمارے ساتھ رہتی ہیں۔ انسانوں میں جو حیوان پائے جاتے ہیں، ان کو چھوڑ کر قرآن مجید صرف ان لوگوں کو خطاب کرتا ہے جن میں اقدار کا کچھ پاس لحاظ ہوتا ہے۔ وہ ان کو ان کی سرشت وفطرت یاد دلاتا ہے اور بتاتا ہے کہ ان کی خلقت میں ''توحید'' کا اثبات موجود ہے۔ اس یاد دہانی پر کان دھرنے والے اللہ کو یاد کرتے ہیں، اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں اور شریعت پر عمل کرتے ہوئے احکام خداوندی کے سامنے سرِتسلیم خم کر دیتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اِس طرح نفس میں یک لخت روح کی روشنی سے چکا چوند ہو جائے گی، یا اسے حضورِ ربّانی میں باریابی حاصل ہو جائے گی۔ اس کے برعکس ہوگا صرف اس قدر کہ انسان میں اب یہ آگہی بیدار ہو جائے گی کہ روح وجسم کے اس مرکب کی جسے نفس کہتے ہیں، عقلی اور روشن جہت زیادہ بنیادی ہے، زیادہ حقیقی ہے۔ روح کا خارج میں انعکاس جو وحی کہلاتا ہے، اسے اب آپ نے تسلیم کر لیا ہے لیکن اس کی داخلی حقیقت کو ابھی پوری طرح آپ کے لیے حقیقت میں ڈھلنا ہے۔

یہ نفس کا دوسرا مرحلہ ہے۔ مسلمان ماہرینِ نفسیات اسے ''نفسِ لوّامہ'' کہتے ہیں۔(۷۵:۲) ضمیر اب بیدار ہے، لیکن یہ ضمیر پیامِ نبوی سے اخذ فیض کر رہا ہے۔ نشوونما کے اس مرحلے میں انسان احکامِ شرعی کی پابندی کرتا ہے، جس قدر اس سے ممکن ہو۔ اپنے عمل میں زیادہ سے زیادہ اخلاص پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ہر معاملے میں حسنِ عمل کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ فطری بات ہے کہ اپنی تمام تر سعی کے باوصف اس سے قرآن مجید کے مطلوبہ آدرش اور رسول خداؐ کی سنت کے مطابق زندگی بسر کرنے میں اکثر کوتاہی ہو جاتی ہے، لیکن اب وہ محض کندھے اچکا کے نہیں رہ جاتا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ اس کے بجائے وہ خود کو ملامت کرتا ہے کہ اس نے خدا کے راستے میں زیادہ جدوجہد، زیادہ محنت کیوں نہیں کی۔ وہ خدا کے سامنے شرمندگی محسوس کرتا ہے، کیونکہ وہ اس کی عبادت یوں نہیں کر پایا ''گویا کہ دیکھ رہا ہو۔'' اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کے ایک مفہوم کی طرف رہنمائی ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ''ہر دین کی ایک امتیازی صفت ہوتی ہے اور اسلام کی امتیازی صفت حیا ہے۔''[۲۳]

اکثر اہلِ ایمان ''نفسِ لوّامہ'' کے اس مرحلے کو عمر بھر عبور نہیں کر پاتے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اگر وہ اس کمال تک رسائی حاصل نہیں کر سکے جو رسول خداؐ کی ذات میں مجسم نظر آتا ہے یا ان عظیم لوگوں کے برابر نہیں ہو سکے جو اسلامی روایت کے امین تھے، تو اس وجہ سے ان سب کو یکساں شمار کیا

جائے۔ اہلِ ایمان میں سے ہر شخص نفس کی نشو ونما کے ایک الگ درجے تک پہنچے گا۔ کوئی دو نفوس ایک سے نہیں ہوتے اور خود ہر نفس ہر دم تغیر اور انقلاب کی زد میں رہتا ہے۔ نفسِ لوّامہ کے مرحلے میں زندگی کرنے کا مطلب ہے امید و بیم کے بیچ زندہ رہنا اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دینا، کیونکہ خدا آ گاہی جب تک نہ ہوا پنے آپ کو ملامت کرنے کا مرحلہ آتا ہی نہیں۔ مولانا روم نے اپنے ایک مرید کو جواب دیتے ہوئے یہی نکتہ سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس مرید کے اندر یہ دیکھ دیکھ کر اضطراب بھر چلا تھا کہ لوگ باگ اپنے منگول حکمرانوں کو کیسے غلامانہ انداز میں تعظیم دینے پر مجبور ہیں، وہ منگول جو مسلمان بھی نہیں تھے۔

مرید نے کہا: ''پچھلے وقتوں میں کافر لوگ بتوں کی پرستش کرتے تھے اور ان کو سجدہ کرتے تھے۔ آج ہم بھی یہی کر رہے ہیں۔ منگولوں کے سامنے جا کر ہم ان کے سامنے جھکتے ہیں اور ہر طرح کا عزت واحترام ظاہر کرتے ہیں۔ اس پر ہم خود کو مسلمان سمجھتے ہیں! یہی نہیں ہمارے اندر اور بھی بہت سے بت چھپے ہوئے ہیں، لالچ، حرص و ہوا، کینہ، کدورت اور حسد۔ ہم ان سب کے تابع ہیں۔ داخلی طور پر بھی اور خارج میں بھی، ہم بت پرستوں کی سی حرکتیں کرتے ہیں، لیکن خود کو مسلمان کہتے ہیں!''

مرشد نے جواب دیا: ''لیکن ایک بات اور بھی ہے۔ تمھارے ذہن میں ایک بات آئی ہے کہ یہ چیز بری ہے اور اسے گوارا نہیں کرنا چاہیے۔ سو تمھارے دل کی آنکھ نے یقیناً کوئی ایسی شاندار، پرعظمت چیز دیکھی ہے جس کو نہ تم بیان کر سکتے ہو، نہ اس کی تعریف کر پاتے ہو اور جو تمھیں یہ بتاتی ہے کہ یہ سب کچھ بہت قبیح اور شرمناک ہے۔ کھارا پانی اسی شخص کو کھارا محسوس ہوتا ہے جس نے آبِ شیریں چکھا ہو۔ چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے ایمان کا نور تمھارے نفس میں ڈالا اور تمھارے نفس کو یہ چیزیں بری لگتی ہیں۔ اس نور کا حسن ہی تو ہے جس کی وجہ سے تمھیں یہ چیزیں قبیح محسوس ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے لوگوں کو ان اعمال سے کوئی اذیت نہیں ہوتی۔ وہ اپنے طرزِ عمل پر خوش ہیں اور کہتے ہیں کہ 'یہی تو کرنے کی چیز ہے۔' تم جس شے کی جستجو کرتے ہو، اللہ کی طرف سے وہی عطا ہوتی ہے۔ جس چیز کی آرزو کرو گے، وہی بن جاؤ گے۔ پرندے کو اس کے پر ہوا کے دوش پر اٹھائے پھرتے ہیں اور اہلِ ایمان کو ان کی آرزو پرِ پرواز عطا کرتی ہے۔''[۲۴]

ایمان والوں میں اپنی خرابیوں، کوتاہیوں کا ہمہ وقت احساس ہونا چاہیے اور ان پر غلبہ حاصل نہ کرنے پر خود کو ملامت کرنا چاہیے۔ دوسری جانب ان کے سامنے ایک ایسا مثالی نمونہ ہونا چاہیے جس کی طرح کا بننا ان کے لیے آرزو کی تکمیل ہو۔ اس تک پہنچنا تبھی ممکن ہو گا جب وہ کوشش کریں گے اور کوشش کرنے کے بعد وہ اس کے آدرش تک اپنی سعی و کوشش سے نہیں پہنچیں گے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی

طرف سے اپنے وقت پر انھیں یہ منزل نصیب ہو جائے گی۔ مولانا روم اوران کی طرح کے دیگر مصنّفین ہمیں یہی بتاتے ہیں، کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مہربانی پر زور دیتے ہیں۔

نفس کا آخری مرحلہ ''نفسِ مطمئنہ'' کہلاتا ہے۔ اس کی بنیاد قرآن کی یہ آیت ہے:

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (۸۹: ۲۷-۳۰)	اے وہ جس کا دل (اپنے رب پر) جما رہا، چل اپنے رب کی طرف! تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی! سو مل جا میرے بندوں میں! اور داخل ہو جا میری بہشت میں۔

یہ وہ نفس ہے جو اس دنیا میں اپنے رب کی طرف لوٹ گیا ہے۔ ایسے نفوس ان لوگوں کے ہوتے ہیں جو ''احسان'' کے اس درجے تک پہنچ جاتے ہیں جہاں وہ اللہ کی عبادت یوں نہیں کرتے، ''گویا'' اسے دیکھ رہے ہوں، بلکہ سچ مچ اسے ہر شے میں حاضر پاتے ہوئے، اپنے آپ میں بھی اور دنیا میں بھی۔ اہلِ تصوّف کی نظر میں یہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام ہے جو اللہ کے پہلے بندے ہیں۔ اسی مقام کا پرتو باقی تمام انبیا کا ہے اور ان سب لوگوں کا جنھیں اللہ تعالیٰ اس مقام کے لیے چن لیتے ہیں۔ یہی وہ آدرش ہے، وہ آرزو جس پر ہر مسلمان کی نگاہ جمی رہنا چاہیے اور جسے پانے کی اسے کوشش کرنا چاہیے۔

قرآن کا خطاب نہ تو نفسِ امّارہ سے ہے، نہ نفسِ مطمئنہ سے۔ نفس امّارہ اندھا اور بہرا ہے اور نفسِ مطمئنہ اپنی منزل کو پہنچ کر روح کے نور میں پھر سے مدغم ہو چکا ہے۔ قرآن کا خطاب نفسِ لوّامہ سے ہے جو روح اور جسم، نور و ظلمت، خیر و شر اور درست و نادرست کے درمیان ڈولتا رہتا ہے۔ قرآن انسانوں کو یہ بتاتا ہے کہ وہ کہاں کھڑے ہیں --- ایک ایسی دھندلی مبہم جگہ پر جو اللہ اور نیستی و عدم کے درمیان واقع ہے اور پھر انسانوں کو وہ راستہ دکھاتا ہے جس پر چل کر وہ بے حقیقت چیزوں کی جگہ الحق کا انتخاب کرتے ہیں۔ جس حد تک ان کی آزادی حقیقی ہے، اس حد تک وہ اپنے راہِ انتخاب کا چناؤ کر سکتے ہیں۔ اب انھیں یہ چننا ہے کہ فرشتے کا پر ان کو بلند ترین آسمان تک اٹھا لے جائے گا یا گدھے کی دم انھیں گھسیٹ کر پست ترین زمین پر پہنچا دے گی۔

خدا اور انسان کے بارے میں ساری اسلامی فکر یہی تصویر کشی کرتی ہے، ایک ایسی مبہم حقیقت کی تصویر کشی جو نورِ محض اور مکمل تیرگی کے درمیان جھول رہی ہو، لیکن یہ مبہم حقیقت کسی صورت بھی تجسیم سے بچ نہیں سکتی۔ ''حشرِ اجساد'' صرف اسلامی عقیدہ ہی نہیں ہے، یہ واحد طریقہ ہے جس سے اس بات کی

توضیح ہوسکتی ہے کہ انسان بیک وقت انسانی اور ربّانی صفات سے مرکب ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے جو کسی جسم سے متعلق نہیں ہے اور انسان ہمیشہ کسی قالب اور جسم کا محتاج ہے۔

جسموں کے دوبارہ اٹھائے جانے یعنی حشرِ اجساد کا کسی طرح یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ یہ مادی جسم ہمیشہ باقی رہے گا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ جسدِ فانی محض جسم میں ڈھلی ہوئی روح، یعنی نفس کی سواری ہے۔ نفس یعنی نقش وصورت میں ظاہر ہونے والی روح کو ہیشگی حاصل ہے مادی جسم کو نہیں۔ نفس خود ایک جسم بھی ہے اور روح بھی۔ کبھی کبھار اسے اپنے جسم ہونے کی شناخت نہیں رہتی اور یہ خود کو صرف روح خیال کرنے لگتا ہے، لیکن عالمِ خواب اس کی خود فریبی کو تحلیل کر دیتا ہے۔ بَرزخ بھی اس غلط فہمی کو دور کر دیتی ہے اور حشر، جنت اور جہنم بھی اُسے اس فریب سے نکال لیتے ہیں۔ عالمِ برزخ ہو یا جنت، جہنم، ان میں سے ہر دنیا میں نفس کو ایک ایسے پیراہن میں ملبوس ہونے کا تجربہ ہوتا ہے جو اس بدنی پیراہن سے بالکل الگ ہوتا ہے جو اس نے اس مادی دنیا میں اوڑھ رکھا تھا۔

ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ اسلامی نظری تعلیمات اس کی عملی تعلیمات کو سہارا بھی دیتی ہیں اور ان میں گہرائی بھی لاتی ہیں، لیکن اگر یہ بات نظر میں رکھیے کہ نفس ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ایک جسمانی قالب ہے تو عملی احکام وتعلیمات کو بنیادی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ کوئی اتفاقی بات نہیں ہے کہ اسلام نے جہاں خود کو سب سے کھلے، واضح اور حتمی انداز میں پیش کیا ہے، وہ شریعت کا میدان ہے۔ ارکانِ خمسہ کو ارکان، یعنی ستون اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ان کے بغیر دین کی عمارت استوار نہیں ہو سکتی۔ ارکانِ خمسہ نے جو اعمال واحکام مقرر کیے ہیں اور شریعت میں جو عمومی ہدایات دی گئی ہیں، انھی کے وسیلے سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ قرآن مجسم ہو جائے اور سچ مچ ہماری زندگی کا تجربہ بن جائے۔

حصّہ چہارم

اسلام- تاریخ اور تصوّرِ تاریخ

باب نہم

تاریخ و تعبیر

اسلام کے روایتی تصورِ کائنات اور جدید مغربی تناظر کے مابین تاریخ کے فہم کے سلسلے میں یقینی طور پر ایک گہرا فرق ہے۔ یہ عمیق ترین خلیج ہے جو ان کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے۔ ان دونوں کے نقطہ ہائے نظر اور زاویہ ہائے نگاہ کا فرق سمجھنا ہو تو انگریزی میں تاریخ History کے لفظ پر غور کیجیے۔ اس کے معانی کے دو پہلو ہیں۔ ایک اعتبار سے تاریخ صرف واقعات کا بیان ہے۔ دوسری طرح دیکھیے تو تاریخ کو پسِ واقعہ دیکھنے اور شرح و توضیح سے الگ کرنا ممکن نہیں ہے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ''یہ تو تاریخ ہے'' تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ ماضی میں کوئی واقعہ ہوا اور ہم اس سے آگاہ ہیں۔ اس اصطلاح کے استعمال میں مضمر یہ ہے کہ ماضی میں جو واقعات ہو گذرے، وہ ایک معروضی حقیقت رکھتے ہیں اور ہم اس حقیقت سے باخبر ہیں۔ ماضی کے واقعات ہمارے لیے ایسے ہی ہیں جیسے مقامات و اماکن۔ ان کا ایک خارجی وجود ہے اور یہ غیر متغیر ہے۔

دوسرا نقطۂ نظر ملحوظ ہو تو ''تاریخ'' کا لفظ استعمال کرتے ہوئے ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مطالعۂ تاریخ میں ایک موضوعی عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ ''تاریخ ہمیں یہ بتلاتی ہے، تاریخ کا سبق یہ ہے'' تو خواہ مضمر انداز ہی میں سہی، ہم یہ مان کر چلتے ہیں کہ ماضی کی معنویت تبھی واضح ہوتی ہے جب گذرے ہوئے وقت کا جائزہ کسی خاص تناظر میں لیا جائے۔ اس پر کسی طے شدہ زاویہ سے نظر ڈالی جائے۔ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ہم تاریخ سے سبق الف کی جگہ سبق ج حاصل نہ کریں؟ یہ سوال کرتے ہی آپ کو احساس ہو جائے گا کہ مورخ حضرات، جن کا پیشہ ہی ایامِ گذشتہ کی داستان رقم کرنا ہے، اپنے اپنے نقطۂ نظر، تعصّبات، نظریات اور نظامِ فکر کے اسیر ہیں۔ ان کے ہاں چند مفروضات کو پہلے طے کر لیا گیا ہے اور ان کی بنیاد پر تجزیہ کیا جا رہا ہے۔ یہ چیز جتنی اہلِ تاریخ کے لیے کہی جا سکتی ہے، اسی قدر معاصر معاشرے، نفسیات یا پھر جرثوموں bacteria کے مطالعے کے بارے میں بھی صادق آتی ہے۔ جب ہم کسی چیز یا واقعہ میں معانی کی جستجو کرتے ہیں تو اس کی بنیاد پہلے سے قائم کردہ کچھ آرا و خیالات پر ہوتی ہے۔ ہم نے پہلے سے یہ طے کر رکھا ہوتا ہے کہ

بامعنی ہونے کا مطلب کیا ہے۔ ایسا نہ کیا جائے تو ہمارا حاصل انمل، بے جوڑ معلومات کے ایک ڈھیر کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔

دنیائے جدید میں ایک نئی چیز نے جنم لیا ہے۔ جسے تاریخ کا تنقیدی مطالعہ کہا جاتا ہے۔ ماضی کا مطالعہ کرنے کے جو اتنے بہت سے طریقے وجود میں آ گئے ہیں، ان سے بہت سے اہلِ علم میں یہ خوش گمانی اور اعتماد پیدا ہوگیا ہے کہ انسان کو اب آخر یہ قدرت حاصل ہوگئی ہے کہ وہ پہلی بار گئے وقتوں پر ''معروضی'' اور ''سائنٹفک'' انداز میں نظر ڈال سکے۔ اس نقطۂ نظر میں خودستائی کا جو رویّہ چھپا ہوا ہے، اسے دیکھنے کے لیے کسی تبصرے کی ضرورت نہیں ہے اور یہی امر ہمیں ہوشیار اور محتاط کرنے کے لیے بھی کافی ہونا چاہیے۔

آج کل علمی دنیا میں جو مسلّمات اور نظامِ افکار چل رہے ہیں، ان کی تحقیق کرنا یہاں بے محل ہوگا۔ ایک نکتے پر ہم البتہ زور دینا چاہتے ہیں۔ مورخین اور بہت سے فلسفی اس خیال کے حامل ہیں کہ تاریخ کو ایک نہایت غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ تاریخ کو یہ حیثیت اور مرتبہ دینے کی مثال دنیا کی کسی تہذیب میں اس سے پہلے نہیں ملتی۔ اس سلسلے میں اکثر یہ رائے بھی ظاہر کی گئی ہے کہ تاریخ کو اس طرح بیش از بیش اہمیت دینے کا تعلق یہودی و مسیحی روایت سے ہے۔ اس روایت کی ماہیت ہی ایسی ہے کہ تاریخ از خود غیر معمولی اہمیت اختیار کر جاتی ہے۔ یہودیت کو دیگر پرانے ادیان کے مقابلے میں امتیازی حیثیت بڑی حد تک اسی امر سے حاصل ہوتی ہے کہ یہودیت میں تاریخی واقعات کو ایک خاص معنویت دی گئی ہے۔ یہودیت کے بعد عیسائیت آئی۔ اس کی بنیاد جس امرِ واقعہ پر رکھی گئی، وہ تاریخ کے ''اندر'' تھا، تاریخ کا حصہ تھا، اس سے ''باہر'' اور ماورائے تاریخ نہیں تھا۔ اس سے بھی تاریخ کا عمل ایک خاص حیثیت اختیار کر گیا۔

عہدِ جدید میں بہت سے مغربی دانش ور اپنے دین پر ایمان سے تو ہاتھ دھو بیٹھے ہیں، لیکن اس کے باوجود چند عیسوی رویّوں سے ہنوز خود کو وابستہ کیے ہوئے ہیں۔ ان میں تاریخ کو الوہی جاننے کا رویّہ بھی شامل ہے۔ ہیگل ایک ایسے مفکر کی شاندار مثال ہے جسے الوہیت اگر کہیں نظر آتی ہے تو صرف تاریخ کے عمل میں۔

یہ سب کہنے سے ہماری مراد یہ نہیں کہ تمام جدید مورخین ہیگل کے ماننے والے ہیں، تاہم ہمارا یہ خیال ضرور ہے کہ مورخین میں ایک رائے عام ہو چکی ہے۔ انھیں زعم ہے کہ وہ یہ دریافت کرنے پر قادر ہوگئے ہیں کہ ماضی میں ''سچ مچ'' کیا واقعہ ہوا تھا اور وہ اس سے نتائج بھی اخذ کر سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ عملاً انھوں نے اپنے آپ کو غیب دانی کے ایک ''پیغمبرانہ منصب'' پر فائز کر لیا ہے۔

(اگرچہ چند سال پہلے کے مقابلے میں آج اس خیال میں خاصی کمی آ چکی ہے)۔ اس لحاظ سے دیکھیے تو مورخین ہمارے لیے ماضی کی معنویت اجاگر اور متعین کرتے ہیں۔ لمحۂ حاضر سے پہلے گزرے ہوئے جو بھی واقعات تاریخ میں ثبت ہو چکے ہیں، ان کی ''نشانیاں'' سمجھنے کی اہلیت صرف انھی کے حصے میں آئی ہے۔ اسلام کے عہدِ اوّلین اور اس زمانے کے معاشرے اور اس کے ماحول کی تاریخ پر جیسی نظر ایف ای پیٹرز کی ہے، کم لوگوں کو ملی ہوگی۔ یہودی، عیسائی اور اسلامی مذہبی متون کا ایک مجموعہ ترتیب دیتے ہوئے پیٹرز نے ''غیب بینی'' کے اس دعوے کی طرف ہماری توجہ مبذول کروائی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ اس قسم کے کسی منصب کا دعویٰ نہیں رکھتے، لیکن دوسرے مورخین، جن کی ہجو ملیح پیٹرز کی عبارت سے عیاں ہے، اسی قسم کے ذہن سے کام کرتے ہیں۔ پیٹرز لکھتے ہیں:[۲۵]

> (یہ کتاب مرتب کرتے ہوئے) میں نے صحیح اور غلط، مستند اور غیر مستند کے بارے میں فیصلے صادر کرنے سے تقریباً گریز ہی کیا ہے، یہ کتب اور متون، الہامی صحائف ہوں یا دیگر کتب، دین کے بنیادی متن کے طور پر ہم تک پہنچے ہیں — بنا بریں میری اس تالیف میں آپ کو نہ تو جولیس ولہاوزن اور اگناز گولٹ تسیھر کے انکشافات کی چھوٹ نظر آئے گی نہ روڈولف بلٹ مان اور جوزف شاخت یا جیکب نیوسنر اور پیٹریشیا کرون کے الہامی لہجے کی گونج اور گمک سنائی دے گی۔[۲۶]

یہ چیز مورخین ہی سے خاص نہیں ہے۔ اور لوگ بھی ایسے دعوے کرتے ہیں جن میں یہ اندازِ پیغمبری مضمر ہوتا ہے۔ اگر دین کا کام عملِ صحیح کے لیے ہدایت اور رہنمائی فراہم کرنا ہے، فکرِ صائب کی تلقین کرنا ہے تو انسانوں کا کیا ہوا ہر وہ کام مذہبی معنویت اختیار کرلے گا جس کا تعلق ان تینوں یا کسی ایک اقلیم سے ہوگا۔ عہدِ جدید کی علمی دنیا میں کتنے ہی شعبہ ہائے علم ایسے ہیں، بالخصوص علوم طبیعی یا ایک سے زیادہ hard science جو عوام کے لیے فکر و عمل کی راہیں متعین کرتے ہیں۔ ان کے انکشافات کو عوام میں چلنے والے مجلّات و جرائد میں لپک کر بڑے اشتیاق سے شائع کیا جاتا ہے اور انھیں پڑھ پڑھ کر لوگ باگ دنیا کے جنت بن جانے کی امید پالنے لگتے ہیں۔

آج کی دنیا میں جو عقلیت پرستی کا جو اتنا چلن ہو گیا ہے اور دیگر ہر چیز سے قطع نظر کر کے صرف عقلِ جزئی ہی پر سارا زور دیا جاتا ہے اس کے نتیجے کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ صرف عقلِ جزئی یا قوتِ خرد ہی پر تکیہ کرنے کا مطلب ہوتا ہے حقیقت کی کمیتی جہت، ناپ تول اور پیمایش کی اسیر جہت پر اپنے آپ کو مرتکز کر دینا؟ یعنی جمع، تقسیم، تجزیہ، کاٹ کر، کھول کر، دیکھنے کی کوشش۔ تہذیب جدید کی یہی غیر معمولی طباعی اس کا جوہرِ قابل ہے اور یہی اس کے لیے مکافاتِ عمل کا سبب۔ ڈی کنسٹرکشن (خراب کاری

یا ویران کاری) کے نام سے گو ایک الگ مکتبِ فکر بھی موجود ہے، لیکن ایک اسی پر کیا موقوف ہے سارے ہی تنقیدی علوم کی تہ میں یہی ویران کاری (deconstruction) کا رویّہ کارفرما ہے۔ حاصل اس عمل کا یہ رہا ہے کہ معلومات واطلاعات کا ایک انبارِ عظیم ہمارے سامنے اکٹھا ہو رہا ہے اور ماہیت اشیا پر دھیان دینے اور چیزوں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر، ربط و تعلق میں دیکھنے کا امکان کم سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ (مرسیا ایلیاد کی اصطلاحات مستعار لیں تو) وہ دنیا جس کا نہ تو کوئی نقطۂ ارتکاز ہو نہ نقطۂ آغاز Origin، نہ ابتدا کی خبر ہو نہ انتہا معلوم، اس میں ہر ذیلی شعبۂ علم کے بارے میں ہر نوع کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے۔ مورخین کا ادّعا صاف الفاظ میں یہ ہے کہ ''ہم بہتر جانتے ہیں۔'' اس جاننے کے لیے طریقہ اور ترکیب خواہ کچھ بھی استعمال کی جائے۔

ہمارا اعتراض اس خیال پر نہیں ہے کہ تحقیق و تلاش کے جدید اسالیب اور طریقوں سے ایسی معلومات میسر آنے لگی ہیں جو آج تک یا تو نامعلوم تھیں یا ان کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا تھا۔ اعتراض کی بات تو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کوئی مورخ کسی چیز یا واقعے کی معنویت دینی یا کائناتی حوالے سے بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے یا معنویت کی بنیاد ان امور پر رکھتا ہے جن سے مذہبی اور کائناتی نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

تاریخ کے معنی کی تلاش، اس کی معنویت پر گفتگو کا مطلب صرف ایک ہے، یہ جاننا کہ انسان ہونے کے معنی کیا ہیں؟ بعض مورخین بھلے یہ اعلان کیا کریں کہ وہ تو صرف واقعات کے ترتیب واندراج سے سروکار رکھتے ہیں، لیکن آج کے دور میں اکثر کو یہ ماننا پڑتا ہے کہ معروضی تاریخ نویسی ایک واہمہ اور فریب ہے، کسی بھی واقعے کا بیان اس وقت تک ناممکن ہے جب تک اس کی معنویت کے بارے میں رائے قائم نہ کر لی جائے۔ ماضیِ بعید سے عہد بہ عہد جو معلومات ہم تک منتقل ہوئی ہیں، ان کے بارے میں ایسے فیصلے ہر ہر مرحلے پر کیے جاتے رہے ہیں۔ مورخین نے اپنا شاندار اور لائقِ تحسین ہدف یہ مقرر کیا ہے کہ وہ شرح و تعبیر کے تہ در تہ انبار تلے سے اصل واقعہ برآمد کیا کریں اور راویانِ خبر زدہ کی زد سے بچ کر پسِ واقعہ دیکھنے اور دکھانے کا فریضہ انجام دیں۔ لیکن اس سب کا مطلب صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ راویانِ خبر زدہ کی رائے کی جگہ مورخینِ نظر زدہ کی تعبیر کو حاصل ہو جائے گی۔ مورخ اپنی شرح و تعبیر کا حاصل ہمارے سامنے رکھ دیتا ہے کہ تصورات اور نظریات قائم کرنا اور شرح و ترجمانی ایک ہی چیز کے دو رُخ ہیں۔

علمی دنیا میں آج جو ذہن کارفرما ہے، اس میں خودستائی اور خودتحسینی کا عنصر اکثر غالب رہتا ہے۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ تاریخ پر نظر ڈالنے کے تمام غیر جدید اسالیب کو اور پرانے طرز ہائے فکر کے ممکن اور جائز ماننے کو یہ ذہن رد کر دیتا ہے۔ اس تردید اور انکار کا شکار خاص طور پر وہ اسالیب ہوتے ہیں جو دینی تہذیبوں میں پائے جاتے ہیں۔ لارنس ای سلیوان نے اسی نکتے کی طرف درجِ ذیل اقتباس میں اشارہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ تمام ادیان عام طور پر تاریخی واقعات کو انسان کی عاقبت اور معاد کے حوالے سے معنویت کا حامل قرار دیتے ہیں:

> اکثر ایسا ہوتا ہے کہ زمانے کے بارے میں ہمارا تاریخی تناظر ہمارے لیے آڑ بن جاتا ہے اور ہمارے معاصرین نے ہماری مشترکہ تاریخی صورتِ حال کی گتھی سلجھانے کے لیے جو حل پیش کیے ہوتے ہیں، وہ بے معنی اور غیر متعلق ہو کر رہ جاتے ہیں۔ دنیا کے مآل و انجام کو اس نظر سے دیکھنے کی ہمیں تاب نہیں ہے کیونکہ اس تناظر میں تاریخ کی حیثیت اضافی ہو کر رہ جاتی ہے، وقت کا وہ طور کہ جس میں زر، زمین، محنت، تحریر اور سائنس کی صورت میں علامتی کرنسیوں کا اندوختہ کرنے کی گنجایش پیدا ہوئی۔[۲۷]

اسلام اور ماضی کی تعبیر

مسلمانوں کو ماضی سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ دین کی دوگانہ اساس، یعنی قرآن اور سنت کے فہم کا تقاضا ہے کہ گذرے ہوئے واقعات کے آثار کو لمحۂ حاضر میں انسانی زندگی کے لیے فیصلہ کن اہمیت حاصل ہونا چاہیے۔ بعض مسلمان علما نے عہدِ گذشتہ کے واقعات کی جمع و تدوین کو اپنا ہنر قرار دیا خواہ قرآن اور رسولِ خدا ؐ سے ان کا کوئی براہ راست تعلق نہ ہو۔ ''تاریخ اسلام'' کے عنوان سے ان علما نے از آدمؑ تا این دم کی تاریخ مرتب کی۔ تاریخ کی صنف میں مدون کی جانے والی دوسری نوع کی تحریروں کا یہاں مذکور نہیں۔

جدید مورخین نے مسلمان مورخین کی تحریروں کو اکثر اپنے مطلب کے لیے استعمال کیا ہے۔ اس ضمن میں ان کا لگا بندھا طریقہ یہ رہا ہے کہ مصنف کی تحریر کو لے کر تاریخ کے شرح و بیان کے لیے اس کے اختیار کردہ موقف اور نقطۂ نظر کو متعین کیا، اس سے جنم لینے والی ''بگاڑ اور تحریف'' کو منہا کیا اور پھر اپنے منہاجِ تحقیق کی چھلنی میں سے چھان کر وہ چیزیں اٹھا لیں جو ان کے لیے مفید مطلب ہو سکتی تھیں۔

اسلام میں فنِ تاریخ نویسی کی تاریخ رقم کرنے سے ہمیں سردست دلچسپی کوئی نہیں۔ ہم نے ذکر کر دیا کہ تاریخ نویسی کا بھی ایک کردار رہا ہے، لیکن اس تذکرے سے غرض یہ تھی کہ ایک بات کی صراحت ہو جائے۔ علمِ تاریخ یا تاریخ بحیثیت شعبۂ علم، یا اس کا جو بھی عنوان کسی زمانے میں رہا ہو، مسلمانوں کی کثرتِ کثیرہ کے لیے اس کی کبھی بھی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ ماضی کے لیے ان کے طرزِ احساس کی تشکیل

قرآن اور اس کے تصورِ کائنات سے ہوئی ہے۔ گذرے ہوئے زمانے میں واقع ہونے والا ہر واقعہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔ سو قبل اِس کے کہ لوگ تفصیلات سے آگاہ ہوں، ماضی کی معنویت متعین ہو چکی، لوگوں کو اس کی تفصیلات کا علم بعد کو ہوتا رہے گا۔

دنیائے جدید میں آ کر بھی صورتِ حال میں کوئی حقیقی تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔ اکثر مورخین کی تحقیق اپنے آغاز سے پہلے ہی امکاناتِ معانی پر قدغن عائد کر دیتی ہے، تاہم جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو یہ امر نہایت واضح ہے کہ معنویت کا انحصار نشانیوں اور آیات پر ہے اور آیات اور نشانیاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ بالفاظ دیگر معنویت کا تعین ''توحید'' سے ہوتا ہے۔

قرآن مجید بار بار لوگوں کو متنبہ کرتا ہے کہ وہ ماضی سے سبق حاصل کریں۔ سابقہ صفحات میں ہم نے دیکھا کہ انبیا اور رسولوں کا قرآن میں کتنا ذکر ہے۔ تقریباً ہر معاملے میں قرآن ان آزمایشوں اور تکالیف کا ذکر کرتا ہے جن میں سے خدا کے نبیوں کو گذرنا پڑا تھا۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ انسان ذرا نہیں بدلا۔ اہلِ مکہ رسول اللہؐ سے ویسا ہی سلوک کر رہے تھے جو بنی اسرائیل نے اپنے نبیوں سے روا رکھا تھا۔ مزید برآں اس سے ایک اور بات واضح ہوتی ہے کہ یہ ایک عالمگیر اور عمومی معاملہ ہے۔ بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ یہ صرف سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کا معاملہ نہیں ہے، یہ ہر زمانے اور ہر جگہ کا مسئلہ رہا ہے، کیونکہ خدا اور اس کے پیامبروں سے اعراض اور غفلت کا رویّہ انسانوں کی سرشت میں شامل ہے۔ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسان تاریخ کی معنویت فراموش کرنے کا عادی ہے، اسے ہمیشہ یاد دلانا پڑتا ہے۔

قرآن نے صرف انبیا کے قصوں ہی کو تاریخ میں دستِ قدرت کی کارکشائی کی علامت کے طور پر بیان نہیں کیا، گذرے وقتوں کی معلومات کا سارا ذخیرہ قرآن کے سامعین کے لیے آثارِ ماضی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ نیز مٹے ہوئے تمدن اور پرانی تہذیبوں کے خرابے بھی اللہ کی نشانیاں قرار دیے گئے: ''كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ'' (ہر شے مٹ رہی ہے سوائے رخِ یار کے) (۲۸:۸۸) کے مصداق انسانی تہذیبیں گریزاں اور بے ثبات ہیں۔ اصل حقیقت اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ زمانہ سب کچھ برباد کر دیتا ہے۔ وقت کی تخریب سے پناہ اللہ میں ڈھونڈنا چاہیے، انسانی ہاتھوں اور انسانی دماغ کے گھڑے ہوئے عارضی اور فنا پذیر سہاروں میں نہیں۔ قرآن نے تقریباً بیس مقامات پر اقوامِ گذشتہ کے انجام و عاقبت کا ذکر کیا ہے۔ اپنے پڑھنے والوں سے قرآن اس بات پر غور کرنے کو کہتا ہے کہ وہ دیکھیں کہ

ماضی کی کتنی ہی تہذیبیں اور کتنی اقوام اور تہذیبیں گذشتہ اللہ تعالیٰ نے محض اس لیے مٹا دیں، نیست و نابود کردیں کہ وہ نافرمان وظالم تھیں۔ اس ضمن میں قرآن نے ''سیاحت فی الارض'' (دنیا میں گھومنے پھرنے) کی ترغیب دی ہے کہ اس سے انسان کا ذہنی اُفق وسیع ہوتا ہے اور یہ بات سمجھ آجاتی ہے کہ ہمارے رشتہ وپیوند، علائق دنیا اور چھوٹے چھوٹے الجھیڑے کتنے بے اعتبار اور آنی جانی چیزیں ہیں۔ ذہن کھلتا ہے، نظر وسیع ہوتی ہے تب لوگوں میں نوعِ انسانی کی ناچیزی اور عظمت ہر دو کا ادراک بیک آن جنم لیتا ہے:

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ (۳:۱۳۷)

تم سے پہلے بہت سی مثالیں گذر چکی ہیں تو زمین پر چلو پھرو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْبَآئِهَا وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ۰ وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ۰ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ (۷:۱۰۱-۱۰۳)

یہ بستیاں ہیں جن کی سرگزشتوں کا کچھ حصہ ہم تمھیں سنا رہے ہیں۔ ان کے پاس ان کے رسول کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے تو وہ ایمان لانے والے نہ بنے، بوجہ اس کے کہ وہ پہلے سے جھٹلاتے رہے تھے۔ اسی طرح اللہ ٹھپا لگا دیا کرتا تھا کافروں کے دلوں پر اور ہم نے ان میں سے اکثر میں عہد کی استواری نہیں پائی۔ ان میں سے اکثر بدعہد ہی نکلے۔ پھر ہم نے ان کے بعد موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے اعیان کے پاس رسول بنا کر بھیجا تو انھوں نے (اپنی جانوں پر) ظلم اور نشانیوں (کا انکار) کیا تو دیکھو ان مفسدوں کا کیا انجام ہوا!

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَانُوْآ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاَثَارُوا الْاَرْضَ وَ عَمَرُوْهَآ اَكْثَرَ مِمَّا

کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ وہ دیکھتے کہ کیا انجام ہوا اِن لوگوں کا جو اُن سے پہلے تھے۔ وہ ان سے قوت میں زیادہ اور زمین کو

عَمَرُوْهَا وَجَآءَ تْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْآ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۹:۳۰)

زرخیز بنانے اور آباد کرنے میں اُن سے بڑھ چڑھ کر تھے اور اُن کے پاس اُن کے رسول واضح نشانیاں لے کر آئے۔ پس اللہ اُن پر ظلم کرنے والا نہیں تھا، بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔

قرآن میں یہ بات وضاحت سے کہی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتنے شہروں اور قریوں پر تباہی نازل کی۔ خلقتِ شہر جب رسولوں کے لائے ہوئے پیام خداوندی سے منہ موڑ لیتی ہے، اس کا انکار کرتی ہے تو اس کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے:

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ (۸:۵۴)

آل فرعون کی طرح اور ان سے پہلے کے لوگوں کی طرح جنھوں نے اللہ کی نشانیوں کو جھٹلایا، سو ہم نے ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں ہلاک کر دیا اور آل فرعون غرقاب ہوئی۔ یہ ظلم کرنے والے تھے۔

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ مَالَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا وَّجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ (۶:۶)

کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی قوموں کو ہلاک کر دیا جن کو ہم نے ملک میں وہ قوت وسطوت دے رکھی تھی جو تم کو نہیں دی اور ہم نے ان پر خوب مینہ برسائے اور نہریں جاری کیں جو ان کے نیچے بہتی تھی، پھر ہم نے ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں ہلاک کر دیا اور اس کے بعد ہم نے دوسری قومیں اٹھا کھڑی کیں؟

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَآءَ تْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَ مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ (۱۰:۱۰)

ہم نے تم سے پہلے والوں کو ہلاک کر دیا جب انھوں نے ظلم کیا کہ ان کے پاس رسول کھلی نشانیاں لے کر آئے اور وہ انھیں مان کر نہ

دیے سو یہی قوم مجرمین کی سزا تھی۔

فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّ قَصْرٍ مَّشِيْدٍ (۲۲:۴۵)

کتنی ہی بستیاں ہیں کہ ہم نے انھیں ان کے ظلم کی پاداش میں مٹادیا کہ وہ بنیادوں پر ڈھے گئیں، کتنے کنویں بے آب، کتنے ہی محل ویران۔

مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۰ وَاِذَآ اَرَدْنَا اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ۰ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا (۱۷:۱۵-۱۷)

جو ہدایت کی راہ چلتا ہے تو وہ اپنے ہی لیے ہدایت کی راہ چلتا ہے اور جو گمراہی اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے ہی اوپر وبال لاتا ہے، اور کوئی جان کسی دوسری جان کا بوجھ اٹھانے والی نہیں بنے گی، اور ہم عذاب دینے والے نہیں تھے جب تک کسی رسول کو بھیج نہ لیں، اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو ہم اس کے خوش حالوں کو امر کر دیتے ہیں تو وہ اس میں خوب اودھم مچاتے ہیں۔ پس ان پر بات پوری ہو جاتی ہے، پھر ہم اس کو یک قلم نیست و نابود کر کے رکھ دیتے ہیں اور نوح کے بعد ہم نے کتنی ہی قومیں ہلاک کر دیں، اور تمھارا رب اپنے بندوں کے گناہوں سے باخبر رہنے اور ان کو دیکھنے کے لیے کافی ہے۔

ظالموں کے قریہ وشہر کا تباہی سے دوچار ہونا محض قصۂ ماضی نہیں۔ آنے والے وقت میں بھی اس کی وعید موجود ہے:

وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْمُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا (۱۷:۵۸)

اور کوئی بستی ایسی نہیں ہے جس کو قیامت سے پہلے ہم ہلاک نہ کر چھوڑیں یا اس کو کوئی سخت عذاب نہ دیں۔ یہ بات کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔

رسول خداؐ کے دشمنوں کو تباہ کن عذاب سے ڈراتے ہوئے قرآن نے دوٹوک انداز میں کہ دیا ہے کہ ان پر تباہی نازل ہونے میں دیر صرف اس لیے ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کے درمیان رہ رہے ہیں یا ان میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو قربِ خداوندی کے طالب ہیں:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ (۸:۳۳)

اور اللہ ان کو عذاب دینے کا روادار نہ تھا جب کہ تم ان میں موجود تھے، اور اللہ ان کو عذاب دینے کا روادار نہیں ہوسکتا جب کہ وہ مغفرت کے طلب گار ہوں۔

بعد کے زمانوں میں مفکرینِ اسلام نے اس سے یہ اصول اخذ کیا کہ اللہ تعالیٰ یہ دنیا اس وقت تک ختم نہیں کریں گے، جب تک یہاں ایک بھی صاحبِ ایمان مسلمان اخلاص واحسان پر کاربند ہے۔ اس بات کی تائید میں وہ حدیث نبوی کا حوالہ دیتے ہیں جس میں آنحضرتؐ نے فرمایا: ''قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک روئے زمین پر ایک بھی اللہ، اللہ کہنے والا باقی ہے۔''[۲۸]

آثارِ قیامت

تاریخ انسانی کے بارے میں قرآن مجید کی تعلیمات کے اس اجمالی تعارف کے بعد اب حدیث جبرئیل کا آخری حصہ دیکھیے۔ حدیث کی عبارت کچھ یوں ہے:

> پھر اس شخص نے پوچھا: ''مجھے قیامت کے بارے میں بتایے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس سے پوچھا جا رہا ہے، وہ خود پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔''
>
> اس شخص نے کہا: ''مجھے اس کی نشانیاں بتا دیجیے!'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کنیز اپنی مالکہ کو جنم دے گی اور تم دیکھو گے کہ لوگ جن کے پاؤں میں جوتا ہوگا اور نہ تن پر کپڑا، بھوکے ننگے اور بھیڑ بکریاں چرانے والے عمارتیں کھڑی کرنے کی دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کریں گے۔''

ہم ذکر کر چکے ہیں کہ قرآن مجید کے مطابق یومِ آخرت کے بارے میں صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔ قیامت کب آئے گی، اس کے بارے میں اگر کوئی شخص کچھ جاننے کا دعویٰ کرے تو وہ جھوٹا ہے۔ حدیث کے بیان سے بظاہر تو یہ لگتا ہے کہ رسول اللہؐ نے جبرئیل علیہ السلام کے سوال کو قیامت کی گھڑی سے متعلق جانا کہ ان سے پوچھنے والے نے یہ سوال کیا ہے کہ قیامت کی ساعت کب واقع ہو گی؟ اسی لیے آپ نے جواب میں فرمایا کہ وہ اس کے بارے میں سائل سے زیادہ نہیں جانتے کہ اس

کا خدا کے سوا کسی کو علم نہیں ہے، تاہم یہ ضروری نہیں کہ سوال کرنے والے کا مدعا قیامت کی گھڑی یا یوم آخرت کا وقت دریافت کرنا رہا ہوگا۔ آپؐ کے جواب کی ایک معنویت اور بھی ہو سکتی ہے، کیونکہ آپؐ کو مذکورہ بالا مکالمے کے دوران بخوبی معلوم تھا کہ سوال کرنے والی ہستی کون ہے۔ آپؐ کے جواب کو یوں بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ آپؐ یہ فرما رہے ہوں کہ ''اے جبرئیل! اس کے بارے میں جو تم جانتے ہو، وہ میرے علم میں بھی ہے، لیکن اس علم کو افشا کرنا نہ میرے لیے روا ہے، نہ تم اسے کھول سکتے ہو۔ اس لیے کہ ہمیں جس پیامِ خداوندی کے پہنچانے کا امر کیا گیا ہے، اس میں یہ راز کھولنے کی اجازت نہیں ہے۔''

قربِ قیامت کے آثار سے آنحضرتؐ اور آپؐ کے صحابہؓ کو خاص شغف تھا۔ اس موضوع سے سب کو بہت دلچسپی تھی۔ حدیث کی کتابوں میں رسولِ خداؐ کی بہت سی احادیث تفصیل سے نقل ہوئی ہیں جن کا تعلق قیامت اور آثارِ قیامت سے ہے اور ان میں وہ علامتیں اور نشانیاں بیان ہوئی ہیں جو قیامت کی گھڑی سے پہلے نمودار ہوں گی۔ قرآن میں اکثر قیامت کے ہول کا تذکرہ کیا گیا ہے، بعض معاملات میں تو ایسے واقعات کی خبر دی گئی ہے جو قیامت سے پہلے ظاہر ہوں گے، مثلاً دنیا کے ختم ہونے سے ذرا پہلے ایک جانور نمودار ہوگا:

وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ (۲۷:۸۲)	اور جب ان پر بات پوری ہو جائے گی تو ہم ان کے لیے زمین سے کوئی جانور نکال کھڑا کریں گے جو اُن سے گفتگو کرے گا، کیونکہ لوگ ہماری آیتوں پر ایمان نہیں لاتے تھے۔

ایک اور آیت میں خبردار کیا گیا ہے کہ یاجوج ماجوج کے وحشی قبائل کھلے چھوڑ دیے جائیں گے اور وہ تباہی پھیلا دیں گے۔

حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ۝ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (۲۱:۹۶-۹۷)	اور جس بستی والوں کے لیے ہم نے ہلاکت مقدر کر رکھی ہے، ان کے لیے حرام ہے (کہ وہ رجوع کریں)۔ وہ رجوع کرنے والے نہیں بنیں گے، یہاں تک کہ وہ وقت آ جائے گا جب یاجوج ماجوج کھول دیے جائیں اور وہ ہر

بلندی سے پل پڑیں، اور قیامت کا شدنی وعدہ
قریب آ گیا ہے تو ناگہاں ان لوگوں کی نگاہیں
ٹنگی رہ جائیں گی جنھوں نے اس کا انکار کیا
ہے۔ وہ (پکاریں گے) ہائے ہماری بدبختی! ہم
اس سے غفلت میں پڑے رہے، بلکہ ہم خود
اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے!

حدیثِ جبرئیل میں آنحضرتؐ نے دو نشانیاں ایسی بتائی ہیں جن سے لوگ یہ جان لیں گے کہ قیامت کی گھڑی سر پر آن پہنچی۔ پہلی یہ کہ ''کنیز اپنی مالکہ کو جنم دے گی۔'' قیامت اور آثارِ قیامت کے بارے میں اکثر روایات معما معلوم ہوتی ہیں۔ یہ بیان بھی اسی طرح کا ہے، لیکن بہرکیف اسے سمجھنا کچھ ایسا دشوار نہیں ہے۔ بنیادی مفہوم یہ ہے کہ سماجی نظام تلپٹ ہو کر رہ جائے گا۔

امی جمی کا زمانہ ہو اور حالات معمول پر ہوں تو معاشرتی رشتے ناتوں کا ایک جانا بوجھا تسلیم شدہ نظام ہوتا ہے جو انسانی سماج کو سہارا اور استحکام فراہم کرتا ہے۔ قرآن ان معاشرتی رشتوں کی طرف ان آیات میں اشارہ کرتا ہے جن میں والدین کے احترام اور ان کا کہا ماننے کی ضرورت پر خصوصیت سے توجہ دلائی گئی ہے۔ ایک اور فطری رشتہ حاکم ومحکوم کا، حکمران اور رعایا کا رشتہ ہے۔ کچھ لوگ احکام جاری کرتے ہیں کچھ حکم بجالاتے ہیں:

اَطِیْعُوااللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ (٤:٥٩)

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو، رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اولوالامر کی۔

حدیث رسولؐ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں جس میں فرمایا: ''**کلکم راع وکلکم مسٔول عن رعیتہ**'' (تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور ہر کوئی اپنی رعیت کے لیے جواب دہ ہے)۔

مالکن اور کنیز کے رشتے کی صحیح صورت تو یہ ہے کہ مالکن حکم دے اور لونڈی اس حکم پر عمل کرے (سماجی بندھن اور بھی ہیں لیکن سردست ہمیں مذکورہ بالا تعلق پر گفتگو کرنا مقصود ہے)۔ ایسا ہی رشتہ ماں اور بیٹی کا ہے۔ ماں جنم دیتی ہے، پالتی ہے، بیٹی اپنی ماں کی فرمانبردار ہوتی ہے۔ اب اگر ''لونڈی اپنی مالکن کو جنم دے'' گی تو ماں خادمہ بن کر رہ جائے گی اور بیٹی مالکن کی جگہ لے لے گی۔ اب ہوگا یہ کہ سماجی تعلقات اور رشتوں کا درست نظام الٹ جائے گا۔ ایک گہرا عدم توازن ہوگا اور اعتدال سے

دوری اس کا نتیجہ ہوگا۔ مسلمانوں کے شعور میں اس بات کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ کتنی ہی آیات میں قرآن نے احترام والدین کو ''توحید'' کا پہلا عملی اطلاق قرار دیا ہے۔ اس کی جانب پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے۔ اگر ماں بیٹی کے رشتے میں بگاڑ پیدا ہوجائے اور اگر یہ رشتہ معاشرے کے سب سے بنیادی رشتوں کا نمایندہ ہے تو پھر دیگر سماجی تعلقات اور رشتوں کا ذکر کیا، خود توحید کا رشتہ بھی پراگندگی کا شکار ہوجائے گا، دین اور انسانی معاشرہ ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائیں گے۔

حدیث میں رسول اللہؐ نے قیامت کی جو دوسری نشانی بیان کی ہے، وہ بھی سماجی شکست و ریخت ہی کی ایک اور مثال ہے۔ اسلام کی نگاہ میں غربت بہت قابلِ احترام چیز ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے سے محبت کرتے ہیں جو صاحبِ ایمان ہو، نادار ہو، پاکباز ہو اور کنبے کا کفیل ہو''،[۲۹] لیکن حدیثِ جبرئیل میں جس طبقے کا ذکر آیا ہے یہ وہ لوگ نہیں جو مال و اسباب سے محروم ہیں۔ یہاں اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے جو اپنے اخلاق و عادات اور اپنی خصلت و کردار کے اعتبار سے معاشرے کے پست اور ردّی ترین عناصر میں گنے جانے کے لائق ہیں۔ وہ بھلے سے نام کے مسلمان ہوا کریں، مگر اپنے باطن میں یہ حق کے چھپانے والے (کافر) اور فساد پھیلانے والے لوگ ہوں گے۔ معاشرے کا قوام اگر درست ہو، حالات معمول پر ہوں تو ایسے عناصر کو صرف ایک ادنیٰ ثانوی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ معاشرے پر ان کا بس نہیں چلتا۔ آخری زمانہ آن لگے گا تو یہی لوگ عالی شان عمارتوں کے نقش گر اور معمار بن بیٹھیں گے اور اپنی بنا کردہ اونچی عمارتوں کے گھمنڈ میں بڑھ چڑھ کے اترانے لگیں گے۔

پھر یہ کیا ضرور ہے کہ حدیث میں وارد ہونے والے لفظ ''بنیان'' (عمارت، تعمیرات) کو فقط نظر آنے والی ٹھوس عمارات کا مصداق ہی سمجھا جائے۔ قرآن میں اس لفظ کا جس معنی میں استعمال ہوا ہے، اس سے تو یہ متبادر ہوتا ہے کہ یہ انسان کی ساختہ کسی بھی چیز، اس کی تیار کردہ کسی شے کے لیے بھی بولا جاسکتا ہے خواہ، وہ مکان ہو یا مشین، معاشرے کا ڈھانچا ہو، قوم ہو، فلسفہ ہو یا نظریات۔ درج ذیل آیات دیکھیے:

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْیَانَهٗ عَلٰی تَقْوٰی مِنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٍ خَیْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْیَانَهٗ عَلٰی شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ وَاللّٰهُ یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ (۹:۱۰۹)

کیا وہ بہتر ہے جس نے اپنی تعمیر کی بنیاد اللہ کے تقویٰ اور اس کی خوشنودی پر رکھی یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک کھوکھلی گرتی ہوئی کگر پر اٹھائی، پس وہ اس کے سمیت دوزخ میں بیٹھ گئی؟ اور اللہ ظالموں کو راہ یاب نہیں کرے گا۔

قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَ اَتٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ (۱٦:۲٦)

ان سے پہلے والوں نے بھی چالیں چلیں تو خدا نے ان کی عمارت بنیاد سے اکھیڑ دی، پس ان کے اوپر سے ان پر چھت آ پڑی اور ان پر عذاب وہاں سے آیا جہاں ان کو گمان بھی نہ تھا۔

خلاصہ یہ کہ حدیث جبرئیل کا مذکورہ آخری حصہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ جب زمانہ اپنے آخری دور میں پہنچے گا تو نبیوں کا تشکیل کردہ ہر سماجی نظام تلپٹ ہو جائے گا۔ اور انسانی زندگی اور انسانی معاشرہ ان چیزوں کے زیرِ نگیں ہوگا جو نفسِ انسانی کے انتہائی گھٹیا جبلّی تقاضوں پر پروان چڑھنے والی انسانی عیاری کی پیداوار ہوں گی۔

ہم پہلے اس نکتے کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ ابتدائے اسلام ہی سے بعض مسلمانوں کو خیال تھا کہ دنیا کا خاتمہ بس اب قریب ہے۔ خود رسولِ خداؐ نے ایک مرتبہ اپنا انگوٹھا اور انگشت شہادت تقریباً ملا کر بلند کیا اور فرمایا: ''مجھ میں اور قیامت کی گھڑی میں بس اتنا فاصلہ ہے،'' لیکن ساتھ ہی ہم یہ بھی عرض کر چکے ہیں کہ خدا کا ایک دن ہمارے ہزار سال یا پچاس ہزار سال بلکہ اس سے بھی زیادہ کے برابر ہو سکتا ہے۔ مسلمان بس اتنی بات یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اس روز کے مقابلے میں جب رسولِ خداؐ نے قربِ قیامت کی وعید سنائی تھی، آج یومِ آخر ۱۴۰۰ سال قریب تر ہو گیا ہے اور قیامت کی کتنی ہی نشانیاں ہم سب کے لیے کھل کر سامنے آ گئی ہیں۔ ایک اور بات بھی پکی ہے، اور وہ یہ کہ دین نے جو کچھ انسان کو دیا تھا، وہ نظام، وہ دنیا اب نزولِ مسیح کے ساتھ ہی بحال ہو سکے گی۔ یا یوں کہیے کہ ''اسلام'' ''ایمان'' اور ''احسان'' کو امر واقعہ بنانا، اس پر صحیح معنی میں عمل کرنا، فرد کے لیے بھی اور معاشرے کے لیے بھی دشوار سے دشوار تر ہوتا جائے گا۔

[

باب دہم

موجودہ صورتِ حال

اسلام پر کوئی سی تعارفی کتاب اٹھائیے، اس میں آپ کو اسلام کی تاریخ، اس کی اشاعت اور اسلامی معاشرے کے قیام کی تفصیلات مل جائیں گی۔ عصرِ جدید میں اسلام کی صورتِ حال کا بیان بھی موجود ہوگا۔ مسلم ممالک کے سیاسی حالات اور آج کل کے مسائل پر جتنی کتابیں سامنے آئی ہیں، ان کے مقابلے میں اسلامی تہذیب کے اوائل اور قرونِ سابقہ یا اسلام کی دینی تعلیمات پر لکھی جانے والی کتابوں کی تعداد کچھ بھی نہیں۔ یہاں ہم پہلے سے موجود تحریروں کی تکرار کا ارادہ نہیں رکھتے، نہ ہمارا مقصود یہ ہے کہ زمانے میں اسلام اور اس کے مسائل کو ایسا بنا کر پیش کریں جو معاصر انسان کے طرزِ احساس سے لگّا کھاتا ہو۔ ہم تو صرف اس نکتے پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں کہ تاریخ کو خدا کی نشانیوں کے طور پر کیوں کر دیکھا جا سکتا ہے اور تاریخ پر اس تناظر سے کیوں کر نظر کی جا سکتی ہے جو ''توحید'' پر مبنی تصورِ کائنات کے زیرِ اثر ہو۔ مدعا یہ کہ اسلام جس نظر سے اپنے آپ کو دیکھتا ہے، اسی نظر سے دیکھیے تو معاصر تاریخ کی کیا حیثیت متعین ہوتی ہے؟

ابھی چند سال پہلے تک مغرب کے لوگ یہ فرض کیے ہوئے تھے کہ ارتقا و پیش رفت Progress ہستیِ انسانی کا ایک حقیقی جزو ہے اور یہ کہ غیر مغربی دنیا کو اگر عہدِ حاضر میں اپنی بقا عزیز ہے تو اسے پیرویِ مغرب کرتے ہوئے اس کے نقشِ قدم پر چلنا ہوگا۔ بیسویں صدی میں انسان جن حالات سے دوچار ہوا ہے، اسے دیکھتے ہوئے سمجھ بوجھ والے دانا لوگوں کی اکثریت شک میں پڑ گئی ہے کہ کیا ترقی واقعی ایک خیر کی چیز ہے، اور بہت سے لوگ اب یہ سوال بھی اٹھانے لگے ہیں کہ مغرب کے معاشرے نے ٹکنالوجی کی ترقی اور پیش رفت کا جو راستہ اختیار کیا، تو کیا یہ کوئی دانش مندی کی بات تھی؟ کیا یہ انتخاب درست تھا؟ ہر میدان سے متعلق سائنس دان اور ہر شعبۂ علم کے ماہرین یہ جاننا چاہتے کہ ترقی و پیش رفت کی وہ راہ جس پر آج کا انسان گامزن ہے، کہیں خودکشی کا قریب ترین اور تیز ترین راستہ تو نہیں؟

خود ارتقا یا پیش رفت Progress کا لفظ بھی کتنے ہی سوالوں کو جنم دیتا ہے، منجملہ یہ کہ اس کے لیے ایک سمت، ایک ہدف و مقصد اور اس کو ناپنے کا ایک پیمانہ اور پرکھنے کا ایک معیار ہونا چاہیے، لیکن جب

اس نظر سے انسانوں کے معاملات کا جائزہ لیجیے تو یہی لگتا ہے کہ صرف ایک میدان ایسا ہے جس میں ترقی ہوئی ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا، وہ ہے ٹکنالوجی کے سہارے قوت و استیلا کا حصول۔ ہمارے کمپیوٹر اور ہمارے بم یقیناً پہلے سے بہت بڑھے ہوئے ہیں، لیکن انسانی کاوشوں کا ہر دوسرا شعبہ عملاً سنگین قسم کے شکوک کے نرغے میں ہے، حتی کہ وہ شعبے بھی جن میں عام طور پر ترقی کو ایک مسلمہ حقیقت سمجھا جاتا ہے، یعنی طب اور عمومی نوعیت کے سائنسی علوم۔

اُدھر آپ نے تاریخ کے دھارے سے ابھرنے والی انسانی صورتِ حال پر نگاہِ امتحان ڈالی، یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ تاریخ کے عمل میں خود انسان پر کیا گذری، اُدھر ارتقا کے بارے میں کیے جانے والے خودستائی سے لبریز دعوے معرضِ تشکیک میں پڑے۔ کیا ٹکنالوجی کے سہارے ارتکازِ قوت سے انسان بہتر انسان بن جاتا ہے؟ کیا دوسری جگہوں کے لوگوں کے مقابلے میں پہلی دنیا، ترقی یافتہ دنیا کے باسی زیادہ بھلے لوگ ہیں یا گئے وقتوں میں زندگی گذارنے والے لوگوں سے آج کے مغربی لوگ زیادہ اچھے انسان ہیں؟ یہاں آ کر ہمیں ایک معیار، ایک کسوٹی کی ضرورت پڑتی ہے جس پر جانچ کر ہم آج کے انسانوں کے نیک و بد ہونے کا کوئی فیصلہ کر سکیں، لیکن عملاً ہوا یہ کہ جدید علمی دنیا میں، طبیعی علوم، ٹھوس سائنس ہو یا سماجیات، نفسیات اور فلسفے جیسے علوم، یہ سبھی شعبے ایسے ہر معیار سے دست کش ہو چکے ہیں۔

عہدِ حاضر کے حالات کو ذرا کسی روایتی دین، مثلاً اسلام کے نظامِ اقدار اور معیارِ خیر و شر کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھیے۔ فیصلہ آسان ہو جائے گا کہ "برہنہ پا، عریاں، بھوکے ننگے اور بھیڑ بکریاں چرانے والے عمارتیں کھڑی کرنے کی دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

یہ باتیں محض چونکانے کے لیے نہیں ہیں۔ ہم نے یہ سوالات اس لیے اٹھائے ہیں کہ قارئین ان مفروضات کے بارے میں غور کر سکیں جو تاریخ کی نوعیت، معاشرے اور انسانی فلاح و بہبود کے بارے میں صادر کیے گئے فیصلوں کی تہ میں کام کر رہے ہیں۔ جب ہم یہ اعلان کرتے ہیں کہ فلاں سیاسی معاملہ یا کوئی خاص واقعہ اچھا تھا یا برا تو ہمارا یہ فیصلہ پہلے سے قائم کردہ ان خیالات کی بنیاد پر ہوتا ہے جو خود ہم پر بھی عیاں نہیں ہوتے۔ آج کی اسلامی دنیا کے بارے میں کسی قسم کی رائے دینے سے پہلے یہ بات واضح ہونا چاہیے کہ اسے جانچنے کا اصول اور پیمانہ کیا ہے۔ اکثر کتابوں میں اس چیز کا دھیان نہیں رکھا جاتا بالخصوص وہ کتب جن کا موضوع حالاتِ حاضرہ وغیرہ ہو، ان میں تو انسانی زندگی کے مقصد کے حوالے سے چلتی ہوئی آرا و تعصّبات ہی کو بلا حیل و حجت رائے کی بنیاد بنا لیا جاتا ہے۔ ترقی یا تقدم progress

ایک اچھی چیز ہے، یہ رائے بھی ایسے ہی مفروضات کا ایک نمونہ ہے جنھیں لوگ باگ بے جانے بوجھے مانتے چلے آرہے ہیں۔

اسبابِ زوال

مغربی اہلِ علم نے تاریخِ اسلام کا مطالعہ عروج وزوال کی ایک داستان کے طور پر کیا ہے۔ اسلام کا ''عہدِ زریں'' عموماً وہ زمانہ قرار دیا جاتا ہے جو خلافتِ بغداد کے عروج کا دور تھا اور جب مہذب دنیا کے بڑے حصے میں اسلام اپنے نقطۂ کمال کو پہنچ چکا تھا۔ سائنسی اور فلسفیانہ علوم، شعروادبیات اور فنونِ لطیفہ میں مسلمانوں کے کارنامے ایسی بلندیوں کو چھو رہے تھے کہ انسانی تاریخ میں اس سے قبل اس کی مثال ڈھونڈے سے نہیں ملتی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ مسلمانوں کی تخلیقی قوت کے انحطاط اور وحشی حملہ آوروں کی مسلسل یلغاروں نے اسلام کی خلاّقیت کو زوال آشنا کر دیا، اور اٹھارویں صدی کے آتے آتے اسلام اس حالت کو پہنچ گیا کہ مغربی اقوام اس کو زیر کرلیں، کیونکہ ان اقوام کے سائنسی اور ٹکنالوجی پر مبنی انقلاب کا اسی زمانے میں آغاز ہو رہا تھا۔

یہ ہے وہ دانشِ غرب جو اس موضوع پر عموماً سننے میں آتی رہی ہے، البتہ ادھر کے چند سالوں میں جو مورخین تحقیق کرتے رہے ہیں، وہ اپنے پیشرو مصنّفین کی ہر تحریر، ہر دریافت و بازیافت کے بارے میں سوالات اٹھا رہے ہیں، مثال کے طور پر یہی دیکھیے کہ زوال کا تصور، چونکہ ارتقا اور پیش رفت کے نظریے سے جڑا ہوا ہے۔ اگر آپ ارتقا کے اس مفروضے کو ہٹا دیجیے تو وہی چیز جسے زوال کا نام دیا جارہا ہے، اب ایک پرسکون توازن و اعتدال اور میانہ روی معلوم ہونے لگے گی جس کا وجود تہذیبِ انسانی کے مقاصد کے حصول میں نہایت درجہ مددگار اور مفید ہوتا ہے۔ اسلامی تہذیب نے کبھی سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کو کبھی اپنا اصلی مقصود اور ہدف قرار نہیں دیا، بلکہ اس کا مطمحِ نظر اور آدرش ہمیشہ نفسِ انسانی کے درجۂ کمال کا حصول ہے۔ اسلامی تہذیب اپنے ہی مقرر کردہ اس معیار پر کس حد تک پوری اتری اور اپنے نظامِ اقدار کے پیمانے پر اس کی کیا حیثیت متعین ہوتی ہے، یہ وہ سوالات ہیں جن پر شاید چند ہی مورخین نے کبھی قلم اٹھایا ہو۔

انیسویں صدی آدھی اِدھر آدھی اُدھر تھی اسلامی ممالک میں مغربی تعلیم یافتہ دانشور طبقہ ابھرنا شروع ہوا۔ اس دور سے لے کر آج تک ان کے اثرات بڑھتے ہی رہے ہیں۔ مسلمانوں کا یہ طبقہ جدید نظام ہائے افکار، مغرب کی آئیڈیالوجی اور فکری مفروضات و مسلّمات سے چونکہ بخوبی آگاہ تھا لہٰذا اس کے ہاں ہمیں اسلامی دنیا کی صورت حال کے بارے میں طرح طرح کے موقف اور آرا نظر آتی ہیں۔ مغربی

طرز کی تعلیم حاصل کرنے والے مسلمانوں کا پہلا ردِ عمل تو مغرب کی استعماری قوتوں کے غلبے کے مقابلے میں ایک شدید احساسِ کمتری کا تھا۔ ان قوتوں کو یہ غلبہ ٹکنالوجی کے زور پر حاصل ہوا تھا۔ مسلمان استعماری قوتوں کے غلبے سے اپنے ممالک کو آزاد کرانا چاہتے تھے۔ اس کے لیے جدید تعلیم یافتہ طبقات کو ایک ہی ممکنہ راہ سوجھی اور وہ یہ کہ جدید سائنس اور ٹکنالوجی سیکھی جائے تاکہ ان کے سہارے سیاسی قوت حاصل ہو سکے۔ بہت سے مسلمان کچھ یوں سوچنے لگے کہ روایتی اسلام ان مقاصد کے حصول کے راستے میں نری ایک رکاوٹ ہے، پس یہاں سے دو بنیادی رویے پیدا ہوئے، دو راہیں ایک دوسرے سے الگ ہوگئیں۔ کچھ لوگوں نے دین کو خیر باد کہہ دیا، باقی حضرات اصلاحِ دین میں لگ گئے۔

وہ لوگ جو ترکِ اسلام کر چکے، ان سے ہمیں سروکار نہیں، لیکن وہ لوگ جو اصلاحِ دین کی مہم پر نکلے تھے، ان کے بارے میں البتہ یہ جاننا چاہیے کہ وہ دین کی اصلاح اپنے اپنے خیالات اور تصورِ دین کے مطابق کرنا چاہتے تھے اور ان تصورات کی بنیاد اس سوال پر تھی کہ ایک ایسے دور میں سیاسی آزادی کیوں کر اصل ہو جس میں ارتکازِ قوت ان ہاتھوں میں ہو چکا ہو جو ٹکنالوجی میں زور آور اور زبردست ہیں؟

اسلام میں اصلاحِ دین کے قائل حضرات ہمیشہ اسلامی تعلیمات کی ان جہات پر زور دیتے اور انھی کو نمایاں کرتے ہیں جن کو جدید سائنس اور ٹکنالوجی سے ہم آہنگ کر کے دکھایا جا سکتا ہے۔ مطلب یہ کہ ان مصلحین کے ہاں عقلیت پرستی اور معقولات rationality پر زور ہوتا ہے اور کشف و تخیل کو بے وقعت بتایا جاتا ہے۔ اس گروہِ مصنّفین کی معذرت خواہانہ تحریریں انگریزی میں بھی انیسویں صدی کے ہندوستان میں سامنے آنے لگی تھیں۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اور یہ لکھنے والے یہ اعلان کرتے نہیں تھکتے کہ اسلام نہایت عقلی، سائنسی اور شائستہ و متمدن دین ہے۔ ان کے پیام اور ان کے اعلامیہ کا اگر خلاصہ کیجیے تو کچھ یوں ہوگا:

> جدید سائنس نے جو کچھ کیا ہے وہ قرآنی تعلیمات ہی کے منطقی نشوونما سے عبارت ہے۔ انسانی اقدار کی سطح پر دیکھیے تو اقوامِ متحدہ کا چارٹر قرآن و حدیث سے چربہ کیا گیا ہے۔ بیرونی اثرات اور اندرونی زوال کی وجہ سے مسلمانوں نے قرآنی تعلیمات کے اصل ہدف کو فراموش کر دیا۔ قرآن کا مقصود تھا ٹکنالوجی کی ترقی اور جمہوری معاشرے کا قیام (یہاں بھی نمونہ وہی اقوامِ متحدہ)۔ جب مسلمان اس سے غافل ہوئے تو اہلِ مغرب نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور مسلمان کا پیدائشی حق اس سے چھین کر لے اڑے۔ اب وقت آیا ہے کہ اسلام اپنی میراث دوبارہ حاصل کرے۔ (الزام دیا جا سکتا ہے کہ اصلاح پسندوں کی منطق کا یہ نقشہ کھینچتے ہوئے ہم نے کسی حد تک خاکہ اڑانے کا اسلوب اپنایا ہے، لیکن

اس میں بڑی حد تک حقیقت پائی جاتی ہے)۔

اس طرح کی سوچ کا حاصل کیا تھا، یہ دیکھنے کے لیے دور جانے کی ضرورت نہیں۔ اسلامی ممالک میں زمامِ اقتدار مغربی تعلیم کے سانچے میں ڈھلے ہوئے طبقۂ خواص کے ہاتھ میں ہے۔ جو مختلف اسباب کی بنا پر مغرب کی نقالی کر رہے ہیں۔ آج بھی ''اسلامی'' انقلابیوں کا سائنس اور ٹکنالوجی پر اندھا اعتقاد کم نہیں ہوا۔ انھیں خوب معلوم ہے کہ سیاسی قوت کا لازمہ ہے کہ عوام کو ٹکنالوجی کے بل پر زیردست رکھا جائے، سو اپنے لیے ٹکنالوجی کی طاقت حاصل کرنے اور اپنے لیے اس کا جواز پیدا کرنے کے لیے وہ ہر طرح کی دلیل لاتے ہیں، قرآن و حدیث کے حوالے بھی اس زمرے میں آتے ہیں۔

آثارِ تاریخی پر ایک نظر

جدید دنیا میں سیاسی قوت کے طالع آزماؤں کے بارے میں ہم نے سطورِ ماقبل میں چند آرا ظاہر کی ہیں۔ ہم نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ ان میں سے کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جنھیں صحیح اسلامی تعلیمات سے کوئی مس نہیں ہے۔ وہ طبقہ جسے ''بنیاد پرست'' Fundamentalist کا نام دیا گیا ہے، ان کا بھی یہی حال ہے۔ اب ہم قارئین کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آخر ہماری یہ رائے کیوں ہے کہ اسلام کی نگاہ میں جدید اسلامی سیاسی تحریکیں ایک مشکوک چیز ہیں!

اس کتاب کے آغاز ہی سے ہم یہ کہتے آئے ہیں کہ اسلام اپنے آپ کو جس نظر سے دیکھتا ہے، اس کا تقاضا ہے کہ انسان اور اس کے معاملات کو تین مختلف مگر ایک دوسرے پر منحصر سطحوں کے حوالے سے زیرِ غور لایا جائے: ''اسلام'' ''ایمان'' اور ''احسان'' (بندگی، ماننا اور حسنِ فکر و عمل یا بہ الفاظِ دیگر، عمل، علم اور نیت)۔ اس نقطۂ نظر سے جائزہ لیجیے تو اسلامی تاریخ کی کیا تصویر ابھرتی ہے؟

اس سوال کا مفصل جواب دینے کے لیے تو ایک اور کتاب الگ سے لکھنا ہوگی۔ یہاں ہم صرف نہایت اختصار سے عرض کریں گے کہ معاصر تاریخ اور حالات کو پرکھنے کا کیا طریقہ ہونا چاہیے۔ اس سے قبل ایک نکتہ واضح کر دیں جو اسلام کے تصورِ کائنات کے حوالے سے ایک بدیہی چیز ہے۔ تاریخ میں صرف ایک وقت ایسا تھا جب ہستیِ انسانی کی ان تین جہات، ان تین پہلوؤں میں مکمل توازن پایا جاتا تھا اور یہ وہ زمانہ تھا جب مدینہ کے مسلمان معاشرے پر رسولِ خداؐ کی حکمرانی تھی۔ اس دور سے لے کر آج تک نشیب و تنزل کا سفر جاری ہے (جس میں گاہ گاہ بہتری اور اٹھان کے وقفے البتہ آتے رہے ہیں)۔ آپ نے فرمایا: ﷺ ''تم پر آنے والا ہر وقت پہلے سے برا ہوگا، آج کے مقابلے میں آنے والا

کل زیادہ شر لائے گا تا آنکہ تم اپنے رب سے جا ملو۔‘‘

مسلمان عام طور پر یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ خلافت کا ادارہ، یعنی مسلمان معاشرے کی سیاسی حکمرانی کا نظام اس زمانے سے زوال آمادہ ہے جب سے موروثی خلافت کا دور دورہ ہوا، یعنی پہلی صدی ہجری/ساتویں صدی عیسوی میں خلافتِ بنوامیہ کے وقت سے۔ پہلے چار خلفا کو اسلامی روایت ’’خلفائے راشدین‘‘ کے نام سے یاد کرتی ہے اس کا انگریزی ترجمہ rightly guided caliphs کیا جاتا ہے۔ ایک بہتر ترجمانی یوں ہوسکتی ہے اگر انھیں caliphs of moral integrity کا عنوان دیا جائے۔ اسلام کی سیاسی تقدیر بنوامیہ اور بنوعباس کی خلافت کے ساتھ عروج کی طرف مائل رہی، لیکن مسلمان معاشرے کی دینی حالت اور اس کی رہبری کرنے والے قائدین کے اخلاق کو بحیثیت مجموعی زوال وانحطاط کا منہ دیکھنا پڑا۔ بے شمار اہلِ اخلاص وصفا معاشرے کو ہر صدی، ہر زمانے میں اس زوال سے آگاہ کرتے رہے اور اصلاح پر توجہ دلاتے رہے۔ ابھی قریب کے زمانے تک اصلاحِ دین کا کام اسی تصورِ کائنات، اسی دیدِ دنیا، اسی تناظر اور سیاق وسباق میں متصور تھا جس کا بیان ہم اس کتاب میں کرتے آئے ہیں۔

روایتی نقطۂ نظر سے، معاشرے کی اصلاح فرد کی اصلاح پر منحصر ہے اور فرد کی اصلاح اس طرح ہوتی ہے کہ وہ اسلام کی تینوں جہات پر عمل کرنے والا بن جائے۔ فرد کا کمال ہمیشہ قربِ خداوندی سے متعلق ہوتا ہے یا یوں کہیے کہ ہر شخص، ہر مسلمان، اپنے اندر، اللہ والا بننے کے عمل سے گذرتا ہے۔ یہ تو صرف آج کے دورِ جدید میں دیکھنے میں آیا ہے کہ اصلاح کے نام پر انسان کی تشکیلِ نو کا ڈول ڈالا جائے اور اس کی صورت گری قرآنی خدا کے نمونے پر نہیں، بلکہ (مغرب جدید کو الہام کیے گئے) خدایانِ جمہوریت وارتقا کے ناک نقشے کے مطابق کی جائے۔

اسلام آج بھی پوری طرح زندہ ہے، لیکن اتنی بات تو باہر سے دیکھنے والوں کی نظر میں بھی آسانی سے آجاتی ہے کہ جو لوگ زور شور سے اسلام سے اپنی وابستگی ظاہر کرتے ہیں، ان میں بھی اسلام کی یہ تین جہات ایک توازن کے ساتھ موجود نہیں ہیں۔ یہ بات تقریباً بلا استثنا کہی جاسکتی ہے کہ وہ تمام گروہ جن کو بیرونی مبصرین نے بنیاد پرست کا نام دے رکھا ہے، ان سب کا خاصہ ہے کہ ان کے ہاں شرعی احکام پر تو بہت اصرار ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اخلاصِ نیت، اخلاقی روّیوں اور روحانیت پر جو زور ہونا چاہیے وہ مفقود ہے۔ ’’اسلام‘‘ (بہ معنی احکامِ ظاہر/قانونی احکام) پر اس ڈھب سے بات کی جاتی ہے گویا یہی سارے کا سارا دین ہو اور ’’احسان‘‘ کے بارے میں اگر کبھی کچھ کہا بھی جاتا ہے تو اس

کی حیثیت زبانی جمع خرچ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اس کے ساتھ ہی بنیاد پرستوں کی سیاسی سرگرمیوں میں ایک ایسی غیر واقعی خیال پرستی utopianism روحِ رواں کے طور پر کارفرما نظر آتی ہے جو تاریخ کی روایتی تفہیم سے سراسر متصادم ہے۔

ہم نے لفظِ ''اسلام'' کو جس وسیع مفہوم میں استعمال کیا ہے، اسے ملحوظ رکھیے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ انفرادی اور سماجی دونوں سطحوں پر یہ ایک قابلِ عمل نصب العین اور آدرش تھا اور آج بھی ہے۔ ہر فرد جو اچھا مسلمان بننا چاہے، اس کے لیے لازم ہے کہ شریعت پر پوری احتیاط سے عمل کرنے کی سعی کرے، اپنے ''ایمان'' میں گہرائی پیدا کرے اور ایسے خدائی اور انسانی فضائل virtues کی نمو کے لیے کوشاں رہے جن سے ایک متوازن انسانی شخصیت کی تشکیل ہوتی ہے۔ ان فضائل میں حکمت و دانائی، صبر و شکر، فیاضی و کریمی اور عدل و محبت شامل ہیں۔ ان تینوں کاموں میں سے ہر ایک کام مشکل ہے، خصوصاً آج کی دنیا میں یہ دشواری اور بڑھ گئی ہے۔ پھر ان تینوں پہلوؤں پر بیک وقت توجہ دینا تو بڑے ہی جوکھم کا کام ہے۔

فرد کی سطح پر اگر مقصود اور نصب العین یہ ہے کہ ایک متوازن اسلام پیدا کیا جائے جس سے ایک متوازن شخصیت جنم لے تو سماجی سطح پر ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرنا ہوگی جس میں سب اعضائے قوم ہم آہنگی سے اپنے اپنے فرائض انجام دے رہے ہوں۔ مسلمان اہلِ علم کو آغازِ اسلام ہی سے اس امر کا پورا ادراک تھا کہ ہر شخص دین کی اِن تین جہات پر پورا نہیں اتر سکے گا۔ اولادِ آدم میں بالیدگی، حصولِ کمال اور انحراف کی حیران کن صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ قرآن مجید نے زور دے کر فرمایا ہے:
لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا (۲:۲۸۶) (اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا)۔

ہر فرد سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنی زندگی کو علم حاصل کرنے یا روحانی معمولات و اشغال کے لیے وقف کر دے۔ ہاں ہر شخص کو اپنی ''وسعت'' کے مطابق اس کے لیے کوشش ضرور کرنا چاہیے۔ ایک صحت منداسلامی معاشرے کے افراد کے لیے لازم ہے کہ وہ شریعت پر زیادہ سے زیادہ اخلاص سے عمل کریں، اسلامی علوم وفنون کی تحصیل کے لیے کوشاں رہیں اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق روحانی زندگی کی سختیاں بھی جھیلتے رہیں۔ ایسا معاشرہ اگر کبھی مکمل طور پر وجود میں آیا تھا تو دورِ نبوی میں۔ اس کے بعد سے ماضی قریب تک اسلامی دنیا کے اکثر مسلمان معاشرے اس آدرش کو بس ایک حد تک ہی حاصل کرتے رہے ہیں۔

اگر مذکورہ وسیع معانی کو پیش نظر رکھیے تو باہر سے دیکھنے میں اسلام کی صحت و سلامتی کا فیصلہ کرنا

مشکل ہے، تاہم بعض پیمانے اور معیار ایسے ہیں جن سے ایک تخمینہ لگایا جا سکتا ہے، مثلاً سرکاری اہل کاروں یا حکومتی دباؤ کے بغیر شریعت کی پابندی، عقلی اور نقلی دونوں علوم کی ترویج واشاعت، نیز فنِ خطاطی، فنِ تعمیر، شعروادب اور موسیقی سے اُبھرنے والا حسن وجمال۔

اسلامی اقدار کے خاتمے کی سب سے افسوس ناک نشانیوں میں سے ایک جو گذشتہ پچاس سالوں کے دوران میں سامنے آئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہم احساسِ جمال سے تہی ہوتے جا رہے ہیں۔ اسلامی دنیا کے شہروں میں بچے کھچے روایتی آثارِ تعمیر اور ان کے پہلو میں واقع جدید فنِ تعمیر کے تیار کردہ بھیانک نمونوں میں جو غیر معمولی تضاد پایا جاتا ہے، اُسے ملاحظہ کیجیے۔ فنِ تعمیر میں سے اگر (چند استثنائی مثالوں کو چھوڑ کر) احساسِ جمال اٹھ گیا ہے تو یہ صرف اس بات کی ایک علامت ہے کہ ہماری روزمرہ زندگی سے احساسِ جمال رخصت ہو چکا ہے۔ لوگ باگ تانبے کی دستکاری کا نادر و نفیس نمونہ اور چوبی ظروف اٹھا کر گھورے پر پھینک دیتے ہیں کہ ان کی جگہ پلاسٹک کی بھونڈی، چمکیلی، نمایشی چیزیں سجا سکیں۔ ہمارے خارج میں جو یہ ایک ''پلاسٹکی'' معاشرے کا چلن ہو گیا ہے، یہ علامت ہے کہ ایسا ہی ایک عمل ایک گہری ذہنی اور روحانی سطح پر بھی ساتھ ساتھ ہو رہا ہے۔

عہدِ جدید میں اسلامِ کامل میں بگاڑ آ جانے کی اور بھی کئی نشانیاں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ''تنزیہ'' پر بے تحاشا زور دیا جانے لگا ہے اور ''تشبیہ'' تقریباً گہنا کر رہ گئی ہے۔ کم از کم ان لوگوں کے ہاں تو ایسا ہی ہے جو اسلام اور اسلامی اقدار کے بارے میں بڑھ چڑھ کر باتیں کرتے ہیں، بالخصوص وہ جن کا ایک سیاسی ایجنڈا بھی ہے۔ یہاں تک دیکھا گیا ہے کہ بسا اوقات غضبِ الٰہی اور قہرِ خداوندی کی صفات کو جنگی حربوں کے جواز کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور قتلِ عام یا دہشت گردی کو ان کے حوالے سے روا رکھا جاتا ہے، حالانکہ شریعت نے قتل و غارت کو واضح طور پر حرام قرار دیا ہے۔

جدیدیت زدہ اسلام عمومی طور پر روایت کی عقلی تفہیم کو رد کرتا ہے، مگر یہ کہ اُسے سیاسی اصطلاحات کے لبادے میں پیش کیا جائے۔ اسلام کی سیاسی تعلیمات اپنی جگہ ایک چیز ہیں، لیکن ان کی حیثیت ہمارے ہاں ہمیشہ ثانوی اور غیر اہم رہی ہے۔ ان سیاسی تعلیمات کو مرکزی حیثیت دینے کا مطلب ہوگا آپ اپنی روایت سے کٹ رہے ہیں۔ ہمارے زمانے کی اسلامی تحریکوں کے سیاسی منشور اور اس کی تہ میں کارفرما آئیڈیالوجی کا اسلام کی تعلیمات سے شاذ و نادر ہی اساسی تعلق ہوتا ہے۔ اس کی جگہ ان میں قرآن وحدیث کی ایک ایسی تعبیرِ نو ملتی ہے جس کی بنیاد جمہوریت یا دوسری قسم کی ''اچھی'' طرزِ حکومت سے متعلق جدید مفروضات پر رکھی جاتی ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہوا ہے کہ جیسے اور ہر جگہ مارکسیت کا زور

ماند پڑنے لگا ہے، اسلام کے جدیدیت زدہ حلقوں میں بھی مارکسی تعبیرات روبہ زوال ہیں۔

اسلامی جدیدیت اگر کبھی اسلام کے مکاتبِ فکر اور ایمانیات سے متعلق آرا کی طرف توجہ کرتی بھی ہے تو اس کی مار بس ان چند متکلمین اور فلسفیوں تک ہوتی ہے جو عقلیت پرستی میں سب سے زیادہ بڑھے ہوئے ہوں۔ عقلیت پرستی کو سائنس اور ٹکنالوجی کے عشق سے ہم آہنگ کرنا آسان ہے۔ اس کے برعکس تخیل پر زور، احساسِ جمال اور کشفِ حقائق کا ذکر فی الفور ایسے مسائل کو سامنے لے آتا ہے جن کا ربط انسانی فطرت سے ہے اور عصرِ جدید میں بہت کم لوگ ان مسائل کا سامنا کرنے کا یُوتا رکھتے ہیں۔

علم کلام یا بالخصوص معتزلی نوع کا علم کلام تو بہ سہولت اس سانچے میں ڈھل جاتا ہے جس میں جدید سائنس کے جواز سے اس کا ٹکراؤ نہیں رہتا۔ ''تنزیہ'' پر زور دینے میں متکلم کو آسانی یہ رہتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو مخصوص اور متعین احکام کے سوا اور ہر چیز سے مجرد قرار دے دیتا ہے، عقلِ جزئی کا کام ہی اللہ کو کائنات اور انسانی دنیا سے الگ کرکے دکھانا ہے۔ اس طرح علم کلام کے ماہر کو مقابلتاً چھوٹ مل جاتی ہے کہ وہ انسانی بہبود کا ایک ''عقلی'' پروگرام مرتب کرکے پیش کردے۔ اگر اللہ تعالیٰ کائنات میں حاضر و موجود نہیں ہے، جیسا کہ ''تشبیہ'' کا کہنا ہے، تو پھر انسان آزاد ہے کہ کرۂ ارض سے جیسے چاہے معاملہ کرے۔ کوئی روک، کوئی وجہ نہیں کہ ہم بھی عالمِ طبعی کے دریدہ بدن کو تاخت و تاراج کرنے میں مغرب کی نقل نہ کریں، اور پھر وسیع پیمانے پر اقتصادی ترقی اور صنعتی آلودگی ہی خدا کا ''پسندیدہ'' راستہ قرار پائے جس پر چل کر وہ عقل پرست معاشرہ قائم ہوتا ہے جو ''اسلام کا'' مقصود ہے!

اسلام ایک عظیم مذہب ہے۔ اب تک کی گفتگو سے حاشا یہ مراد نہیں کہ ''اسلام''، ''ایمان'' اور ''احسان'' کا متوازن اور ہم آہنگ میزانِ عمل سرے ہی سے ناپید ہو چکا ہے۔ اور ہر طرف بس انحراف ہی انحراف ہے۔ ایسے مسلمان ساری دنیا میں بکثرت موجود ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ اسلام کو تینوں سطحوں پر جیتا جاگتا رکھنا ضروری ہے۔ اگر ایسے لوگ منظرِ عام پر ظاہر نہیں ہوتے تو تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ دنیائے جدید کی نگاہ میں اہم کیا ہے اور غیر اہم کیا ہے اور ہم سب واقف ہیں اس امر سے کہ ریڈیو، ٹی وی اور جدید میڈیا شور وغل اور غوغا و فساد کا خوگر ہے، ہنگامہ و شورش اس کی ضرورت ہے۔ سکون، توازن، اعتدال اور ہم آہنگی سے تو ''خبریں'' جنم نہیں لیتیں۔

مختصر فرہنگ

مختصر فرہنگ

آدم

انسانِ اوّل، نوعِ انسانی کا پہلا فرد یا محض انسان۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کے جسم کو مٹی سے بنایا، اس میں اپنی روح پھونکی، اسے علمِ اسما سکھایا اور دنیا میں اپنا خلیفہ مقرر کیا۔

آیت

نشانی، علامت۔ قرآن مجید میں یہ لفظ کائنات کی ہر چیز کے لیے استعمال ہوا ہے جو خدا کی خبر دے، خواہ مظاہرِ طبعی ہوں، انسانی مظاہر ہوں یا سماجی مظاہر۔ صحائفِ خداوندی۔ انبیا اور رسولوں سے ظاہر ہونے والے غیر معمولی کام اور معجزات۔ قرآن کی اپنی آیتیں۔ آیت وہ اصطلاحی لفظ بھی ہے جس سے ہر سورت کے اجزا کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

آیت اللہ

اللہ کی نشانی۔ کائنات کی ہر شے اللہ کی نشانی ہے۔ اس لفظ کا ایک مخصوص استعمال بھی ہے۔ ایران میں یہ لفظ بیسویں صدی کے اوائل سے اعلیٰ پائے کے علما کے لقب کے طور پر مستعمل تھا لیکن آج کل ہر نمایاں مذہبی عالم کو ایران میں آیت اللہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

ابلیس

شیطان کا اسمِ معرفہ۔ دوسرے جنّات کے مانند اسے بھی آگ سے تخلیق کیا گیا تھا۔ اپنی عبادت اور نیکوکاری کے سبب اسے فرشتوں ایسا قربِ خداوندی نصیب ہو گیا تھا جب اللہ نے اسے آدم کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا تو اس نے اس سے انکار کر دیا سو اسے راندۂ درگاہ بنا کر حضورِ حق سے نکال دیا گیا۔

احسان

حسنِ عمل، وہ کرنا جو خوبصورت اور اچھا ہو۔ اسلام کی تیسری جہت۔

ارکانِ خمسہ

قرآن و حدیث کے فرض کردہ پانچ بنیادی کام جو مسلمانوں کے لیے لازم کیے گئے ہیں: شہادت، نماز، رمضان کے روزے، زکوٰۃ اور حج۔

اسلام

اللہ کی بندگی، اطاعت اور فرمانبرداری۔ اس لفظ کے چار بنیادی معنی ہیں۔ سب سے پہلے وسیع معنی میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مخلوق اللہ کی مطیع اور اس کے سامنے سرافگندہ ہے، کیونکہ وہ اسی ذات کے دستِ قدرت سے وجود پاتی ہے۔ یہاں اختیار کا معاملہ ہی نہیں، لیکن اس کے علاوہ اس لفظ کے جو تین معانی ہیں، ان میں لوگ اسلام قبول کرتے بھی ہیں اور اس سے منکر بھی ہو جاتے ہیں۔ ''اسلام'' کے دوسرے معنی ہیں انبیا کے ذریعے آنے والی ہدایتِ خداوندی کے روبرو سرِ تسلیم خم کرنا، اسے مان کر قبول کر لینا۔ تیسرا مفہوم وہ ہے جس کے لیے ''اسلام'' بطور اسمِ معرفہ کے بولا جاتا ہے۔ اس کا مطلب ہے وہ ہدایتِ خداوندی قبول کرنا جو قرآن نے عطا کی ہے۔ چوتھا مفہوم سب سے محدود اور خاص ہے۔ اس مفہوم میں اس سے مراد ہے ارکانِ خمسہ پر عمومی عمل اور شریعت کی خاص طور پر پابندی۔

اصل (اصول) ثلاثہ

وہ بنیادی تصور جو فکرِ اسلامی کی اساس و بنیاد ہیں اور جن پر اسلامی عقائد کی بنیاد رکھی گئی ہے: توحید، نبوّت اور معاد۔

اللہ

خدا کے لیے عربی لفظ/نام

امام

رہبر، رہنما، نماز باجماعت میں قیادت کرنے والا شخص۔ مسجد میں نماز پڑھانے والا۔ شیعہ حضرات کے ہاں رسول خداؐ کے اخلاف میں سے کچھ اکابر کو امام اور مسلمانوں کے جائز پیشوا اور رہبر تسلیم کیا جاتا ہے۔

امانت

وہ خاص ذمہ داری جو اللہ تعالیٰ نے ارض و سما اور کوہ وجبل کو عطا کرنا چاہی، مگر انھوں نے اُسے قبول کرنے سے انکار کر دیا، اور پھر انسان اسے اٹھانے پر تیار ہو گیا۔ امانت کو اکثر بارِ خلافت یا بارِ

محبت سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔

اہل سنت

اسلام کی دوشاخوں میں سے بڑی شاخ جس میں شیعیت کے مقابلے میں تقریباً ۸۵ فیصد مسلمان شامل ہیں۔

ایمان

اسلام کی دوسری جہت۔ ایمان کا موضوع ہے، خدا، فرشتے، وحی اور آسمانی صحیفے، نبوّت و رسالت، یومِ آخر اور جزا وسزا۔ عموماً انھیں تین اصولوں، یعنی ''توحید''، ''نبوّت'' اور ''معاد'' کے تحت زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔ ''ایمان'' کا الٹ ہے ''کفر''۔

تشبیہ

اللہ کی اپنی مخلوق سے مشابہت، مخلوق کا اللہ کی مثال پر ہونا، مخلوق میں اس کا اثر وتاثیر مخلوق میں حاضر وموجود ہونا۔ ''تنزیہ'' کا تکملہ۔

تقویٰ

خدا خوفی، اللہ سے ڈرنا۔ قرآن میں بیان کردہ سب سے زیادہ پسندیدہ انسانی صفات میں سے ایک۔ ''احسان'' سے اس کا گہرا تعلق ہے۔

تنزیہ

اپنی مخلوق کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کا بے ہمتا ہونا، بے مثل ہونا، اللہ کا بے چون و بے چگون ہونا، اس کی ماورائیت۔ تشبیہ کا تکملہ۔

توحید

لفظی معنی: ایک ہونے کا اعلان، ایک کہنا، بتانا۔ اللہ کی وحدت کا اثبات، جو ایمان کا پہلا اصول ہے اسلام پر اسی بنیادی تصور کی حکمرانی ہے۔ اس کا لفظی بیان سب سے زیادہ ایجاز سے کلمۂ شہادت کے پہلے جزو میں کیا گیا ہے۔ توحیدِ کامل وہ ہے جس میں ''تنزیہ'' اور ''تشبیہ'' کا بیک آن اثبات کیا جائے۔

جسم

ہر وہ شے جس کا ادراک حواسِ خمسہ سے کیا جاسکتا ہے۔ عام معنی میں جسم وہ چیز ہے جس کو روح

سے ملا کر اللہ تعالیٰ ایک مخلوق کو وجود عطا کرتے ہیں۔ چنانچہ فرشتوں کے جسم نور کے اور جنّات کے جسم آگ کے ہوتے ہیں اور انسانوں اور دوسرے حیوانات کے جسم مٹی کے۔ انسانوں میں جسم کے خواص روح کی صفات کے الٹ مانے جاتے ہیں۔ لہٰذا روح علوی ہے، جسم اسفل، روح نورانی ہے اور بدن تیرہ وغیرہ۔ نفس روح اور بدن کے مابین واقع ہے، آدھا اِدھر، آدھا اُدھر۔

جن

ایک پراسرار مخلوق جس کے بارے میں کسی قدرے ابہام پایا جاتا ہے۔ اسے آگ سے تخلیق کیا گیا ہے۔ اس میں مٹی اور نور دونوں کی صفات پائی جاتی ہیں۔ ان کی نورانیت انھیں کسی حد تک فرشتوں سے مشابہ بناتی ہیں، جب کہ ان کی ظلمانیت ان میں مادی جسم والی اشیا سے مشابہت پیدا کرتی ہے۔ جنّات میں سب سے مشہور ابلیس ہے جسے شیطان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ انسانوں کی طرح جنّات بھی دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں: ابلیس کے پیچھے چلنے والے (حق چھپانے والے) اور نبیوں کے پیروکار (اہلِ ایمان)۔

جہاد

راہِ خدا میں کوشش، جہد اور سعی وعمل۔ اس کے سب سے عام اور عمومی معنی تو ہیں اپنی شخصی خامیوں کوتاہیوں کے خلاف ذاتی جدوجہد جس کا تقاضا ہر مسلمان سے کیا گیا ہے تاکہ اس کا اسلام کامل ہو سکے۔ اپنے خاص معنی میں جہاد اس جنگ کو کہا جاتا ہے جو اسلام کے دشمنوں کے خلاف، شرعی طریقے سے کی جائے، جیسے دفاع کے لیے جنگ۔ اس کا سب سے متداول مفہوم کسی بھی جنگ کا ہے جسے جنگ آزما لوگ جائز لڑائی تصور کرتے ہوں۔ جہاد کا یہ تصور شرعی اعتبار سے ایک الگ سوال کا تقاضا کرتا ہے کہ کیا شریعت اس طرح کی لڑائی کو سندِ جواز دے رہی ہے یا نہیں؟

حج

مکہ کا سفرِ زیارت جو ہر صاحبِ استطاعت مسلمان پر زندگی میں ایک مرتبہ فرض کیا گیا ہے۔ اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک۔

حدیث

رسولِ خداؐ کا یا آپؐ کے صحابہؓ کا قول جو آنحضرتؐ کے عمل کے بارے میں ہو۔ حدیث کے مقابل قرآن ہے جو اللہ کا کلام ہے، قولِ خداوندی ہے۔ احادیث کو بہت سے مجموعوں کی صورت میں

اکٹھا کیا گیا ہے۔ سنّی اسلام میں چھ مجموعوں کو سب سے زیادہ قابل اعتبار اور درست مانا جاتا ہے۔ انھیں ''صحاح'' (صحیح کی جمع) کا نام دیا گیا ہے اور ان کے مرتب کرنے والے علما کے نام سے انھیں موسوم کیا گیا ہے، جیسے صحیح بخاری، صحیح مسلم، صحیح ترمذی، سنن ابی داؤد وغیرہ۔

حدیث قدسی

قولِ مقدس۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث جس میں قولِ خداوندی کو صیغۂ واحد متکلم میں بیان کیا گیا ہو۔ مثال کے طور پر آنحضرتؐ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے اپنے عرش پر لکھ دیا ہے، رحمتی سبقت علی غضبی، (میری رحمت میرے غضب سے بڑھی ہوئی ہے)۔'' دوسری احادیث کی طرح احادیث قدسی بھی قرآن سے الگ چیز ہیں۔

حرام

جو شریعت میں ممنوع کیا گیا ہو۔ ''حلال'' اور ''واجب'' کا الٹ۔

حلال

جس کی شریعت کے حکم کے مطابق اجازت ہو۔ ''حرام'' کا الٹ۔

خلافت

خلیفہ کی صفت

خلیفہ

اللہ کا نمایندہ یا نائب۔ آدم کو اللہ کا خلیفہ بننے کے لیے تخلیق کیا گیا تھا، لہٰذا خلافت نوعِ انسانی کی ذمہ داری بھی ہے اور اس کا اعزاز بھی، جو کسی اور مخلوق کو نہیں دیا گیا۔ خلیفہ بننے کے لیے صحیح معنوں میں بندۂ خدا (عبد) بننا ضروری ہے۔ اسلام کی سیاسی فکر میں خلفا کو رسول اللہ کا خلیفہ اور (بطور حکمران) ان کا جانشین سمجھا گیا ہے، اسی لیے اموی یا عباسی حکمران خلیفہ کے لقب سے معروف ہوئے۔

دُعا

عبادت کی وہ صورت جس میں انسان اللہ کے حضور اپنی شخصی حاجات پیش کرتا ہے۔

ذکر

تذکرہ کرنا، یاد آوری، یاد کرنا۔ لوگوں کو خدا کی یاد دلانا نبیوں اور آسمانی کتابوں کا بنیادی فریضہ

ہے۔ انسان اس پر لبیک کہے تو اسے بھی ذکر کہا جاتا ہے، یعنی خدا کو یاد رکھنا اور خدا نے جو فرائض انسان پر عائد کیے ہیں، ان کا دھیان رکھنا۔ خاص معنی میں عبادت کے ایک خاص انداز کو بھی ذکر کہا جاتا ہے جس میں عموماً اللہ تعالیٰ کے کچھ اسما یا ایسے کلمات کا دہرانا جن میں اللہ تعالیٰ کے نام شامل ہوں۔ مثلاً کلمہ شہادت کا پہلا حصہ لَا اِلٰہَ اِلا اللّٰہ۔

رسول

پیامبر، ایک خاص نوع کا نبی (دیکھیے: نبی)۔ رسولوں کی تعداد ۳۱۳ بتائی جاتی ہے۔ یہ ادیان کی بنیاد رکھتے ہیں جب کہ وہ نبی جو رسول نہیں ہوتے وہ پہلے سے قائم شدہ ادیان میں ترمیم یا اصلاح کرتے ہیں۔

رمضان

اسلامی تقویم کا نواں مہینہ۔ اس مہینے میں ہر روز صبح سے غروب آفتاب تک روزہ رکھنا دین کے پانچ ارکان میں سے ایک ہے۔

روح

وہ نفخِ ربّانی جو اللہ تعالیٰ نے آدم کی مٹی میں پھونکی۔ فرشتوں کو بھی روح کہا گیا ہے یا وہ روح جسے اجسامِ نورانی میں پھونکا گیا۔ تمام مرئی اشیا میں نادیدہ ارواح ہوتی ہیں۔ جب روح و نفس میں امتیاز قائم کیا جائے تو مراد یہ ہوگی کہ روح ایک بلند تر سطح کی چیز ہے اور تمام صفاتِ خداوندی میں براہ راست مشارکت کرتی ہے۔

زکوٰۃ

شرعی ٹیکس۔ پانچ ارکان دین میں سے ایک۔

سنت

زندگی گذارنے اور عمل کا وہ طریقہ جسے رسول خداؐ نے مقرر کیا، یعنی وہ نمونہ، مسلمان جس کی پیروی کرتے ہیں تاکہ خدا کی پسندیدہ زندگی کے سانچے میں ڈھل سکیں۔ سنت کا بنیادی مأخذ حدیث ہے۔

سورۃ

قرآن کے ۱۱۴ حصوں میں سے ایک۔ اس کے لفظی معنی ہیں باڑ یا احاطہ۔

شرک

خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک کرنا۔ یہی ایک گناہ ناقابل معافی ہے۔ اس کا مطلب ہے ایسی سوچ یا ایسا عمل جو یہ ظاہر کرے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں کوئی اور بھی شریک ہے۔ توحید اس کا الٹ ہے۔

شریعت

لفظی معنی گھاٹ یا پانی کو جانے کا راستہ، اللہ کا نازل کردہ قانون جس سے دین کے اوامر ونواہی کا تعین ہوتا ہے۔ اس سے اسلام کی پہلی جہت کی وضاحت ملتی ہے۔ اس کی بنیاد قرآن اور رسولِ خداؐ کی سنت پر ہے۔ شریعت کے دوسرے مآخذ میں اجماع اور قیاس شامل ہیں۔

شہادت

گواہی دینا۔ ایمان کی شہادت جو عربی کے دو فقرے "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه" اور "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰه" ادا کر کے دی جاتی ہے۔ کلماتِ شہادت ادا کرنا اسلام کا پہلا رکن ہے جب کہ کلمۂ شہادت کا پہلا حصہ "توحید" کی بنیادی تعریف اور ایمان کی اساس ہے۔ ایمان اسلام کی دوسری جہت ہے۔ شہادت کا ایک مطلب "مرئی دنیا" بھی ہے۔ جس کے مقابل "غیب" کی دنیا ہے۔

شیعیت

اسلام کی دو شاخوں میں سے ایک جس میں تقریباً ۱۵ فیصد مسلمان شامل ہیں۔ عام طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ شیعہ سنی میں فرق ایک تو فقہ کے مکتبِ فکر کا ہے اور دوسرے بعض اجزائے ایمان کا بالخصوص امامت، یعنی یہ عقیدہ کہ رسول اللہؐ کی اولاد میں سے چند لوگ جن کو امام کہتے ہیں، نوعِ انسانی اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ایک واسطہ ہیں۔

صحابہ

وہ جن کی رسولِ خداؐ سے ملاقات ہوئی اور وہ آپ کے پیغام پر ایمان لائے۔

صلوٰۃ

اسلامی عبادت کی ایک شکل۔ روزانہ کی پانچ نمازیں دین کے ارکانِ خمسہ میں سے ہیں۔

طریقت

لفظی معنی: راستہ۔ ایسا راستہ جو آج اور ابھی اللہ کے روبرو کرے۔ طریقت کو وہ تنگ راستہ کہا

جاتا ہے جس پر مقابلتاً کم لوگ چلتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں شریعت وہ فراخ راستہ ہے جس پر ہر مسلمان کو چلنا ہوتا ہے، بشمول ان لوگوں کے جو راہِ طریقت کے مسافر ہوتے ہیں۔ صوفیہ کے سلسلے اپنے آپ کو ''طریقہ'' کہتے ہیں، کیونکہ تصوف میں اسلام کی تینوں جہات کو عمل میں لانے کی سعی کی جاتی ہے، صرف شریعت ہی پر عمل نہیں ہوتا۔

عبادت

بندگی کرنا، عبد اور بندہ ہونا، پرستش کرنا۔ یہ انسان کا بنیادی فریضہ ہے۔ اس سے قاصر رہنے والے خلافت کے حقدار نہیں ہو سکتے۔

عبد

بندہ، غلام، عبادت کرنے والا۔ کائنات کی ہر شے اللہ تعالیٰ کی ناگزیر بندگی میں ہے کہ ہر شے اس کی مخلوق ہے، لیکن بنی آدم کو اللہ کی اختیاری بندگی بھی اختیار کرنا چاہیے کہ اس مقصد تک رسائی حاصل کر سکیں جس کے لیے ان کی تخلیق ہوئی ہے۔ ''عبد'' کا لفظ اکثر ''خلیفہ'' کے لفظ کے ساتھ بولا جاتا ہے۔

علما (عالِم کی جمع)

اہلِ علم، وہ جو علم رکھتے ہیں۔ یہ وہ عمومی اصطلاح ہے جو ان تمام مسلمانوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو اپنے دین کا علم حاصل کرنے کے لیے زندگی وقف کر دیتے ہیں۔ عام طور پر اس سے مراد فقہ کا عالم لیا جاتا ہے جو اسلامی قانون میں مہارت رکھتا ہو۔ ایسے علما کے معمول کے فرائض میں مساجد میں نماز کی امامت کرنا، نکاح وغیرہ کا انجام دینا اور شریعت کی تشریح و تفصیل شامل ہوتے ہیں۔ اور وہ اکثر ایک مذہبی پیشہ ور گروہ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ویسے وہ تمام لوگ جو اسلامی علوم میں سے کسی ایک شعبے میں مہارت حاصل کر لیتے ہیں، انھیں ٹھیٹھ معنی میں عالم کہنا چاہیے خواہ وہ تفسیر کا علم ہو، علم حدیث ہو، علم کلام ہو، فلسفہ ہو یا تصوف۔ بعض اسلامی زبانوں میں علما کو ملاّ کہا جاتا ہے۔

غفلت

لاپروائی، انسانی کی بنیادی کمزوری، ''ذکر'' کا الٹ

غیب

نادیدہ، غیر مرئی، غیر موجود۔ یہ اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور جنّات کی صفت ہے۔ عالمِ غیب اور عالمِ

شہادت (نادیدہ دنیا اور مرئی دنیا) کائنات کی دو بڑی دنیائیں یا عالم ہیں۔

فطرت

انسان کی سرشتِ اصلی جس پر اللہ نے اسے تخلیق کیا اور جس کا بنیادی خاصہ ہے توحید کا فہم۔

فقہ

وہ علم جو شریعت کو اپنا موضوع بناتا ہے۔

فقیہ

علمِ فقہ کا ماہر

قبلہ

مکہ کی سمت۔ مسلمان نماز ادا کرتے ہوئے قبلے کا رخ کرتے ہیں۔

قدر

لفظی معنی: ناپ تول کر پیمایش سے حصہ دینا، اجزائے ایمان میں سے ایک۔

قرآن

اسلام کا دینی صحیفہ۔ کلامِ الٰہی جو سیدنا محمد ﷺ پر فرشتۂ وحی جبرئیل علیہ السلام کے ذریعے نازل ہوا۔

کافر

حق کو چھپانے والا، منکرِ حق۔ وہ شخص جو کفر کرے۔

کعبہ

لفظی معنی: مکعب۔ مکہ میں اسلام کی مرکزی زیارت گاہ، حرم جسے بیت اللہ یا خانۂ خدا بھی کہا جاتا ہے۔ یہ قبلے کا نشان ہے جس کی طرف لوگ رخ کر کے نماز ادا کرتے ہیں۔ حج کے دوران تمام مراسم و مناسک اسی سے متعلق ہوتے ہیں۔

کفر

ناشکرے پن سے کتمانِ حق۔ لفظی معنی ڈھانپ کر چھپا کر دینا، ڈھانپ دینا۔ قرآن میں یہ لفظ ''شکر'' اور ''ایمان'' دونوں کے متضاد اور الٹ معنی کے لیے آیا ہے۔ قرآن کے تراجم میں اس کا عام ترجمہ unbelief یا infidelity کے الفاظ سے کیا گیا ہے۔ جب اس سے اشارہ انکارِ حق کی طرف تھا اور جب اس

سے مقصود ناشکری کا روّیہ تھا تو ترجمہ کے لیے ingratitude کا لفظ برتا گیا ہے۔غرض یہ کہ کفر بدترین گناہوں میں سے ایک گنا جاتا ہے اس کا مطلب ہے کہ انسان ناشکرا بن کر اللہ کی ہدایت کو رد کر دے۔

متکلم/متکلمین

وہ علما جو علم کلام میں خاص مہارت رکھتے ہوں۔

مدرسہ

درس گاہ۔تعلیم حاصل کرنے کی جگہ۔

مذہب

فقہ کا ایک مکتبِ فکر۔سنّی اسلام میں چار مذاہب فقہ ہیں: حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی۔شیعہ حضرات کی اکثریت ایک پانچویں مذہب۔یعنی جعفری مکتبِ فکر کی پیروکار ہے۔

مسلم

وہ جو''اسلام'' کی صفت سے موصوف ہو۔''اسلام'' کے چار درجات کے لحاظ سے لفظ مسلم کے بھی چار معنی ہیں۔(دیکھیے: ''اسلام'')

مشرک

شرک کرنے والا۔

معاد

اللہ کی طرف واپسی۔ایمان کا تیسرا رکن۔اس لفظ کو انگریزی میں اکثر eschatology کے لفظ سے ادا کیا جاتا ہے۔

معراج

لفظی معنی: زینہ، سیڑھی۔رسول خداؐ کا اللہ تعالیٰ کے ہاں جانا۔معراجِ نبوی۔یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس نے کائنات کی ماہیت اور کمالِ انسانی کے بارے میں مسلمانوں کے تصورات کی تشکیل میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔

ملاّ

(عربی کے لفظ مولیٰ سے)۔پیشہ ور علما میں سے ایک۔

مَلَک (جمع: ملائکہ)

فرشتہ۔ لفظی معنی: فرستادہ، پیام لانے والا۔ مخلوقات کی ایک قسم جسے انسان وحیوان کے مقابلے میں الگ مخلوق مانا جاتا ہے اور عموماً جنّات سے بھی مختلف کہا جاتا ہے۔ فرشتے نورانی جسم کے ساتھ تخلیق کیے گئے ہیں۔ انسانوں اور جنّات کے برعکس وہ کبھی اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے۔ جانور بھی فرشتوں کی طرح کبھی اللہ کے نافرمان نہیں ہوتے۔

نبوّت

ایمان کا دوسرا رکن۔ نبی کے لفظ سے مشتق۔

نبی

وہ انسان جو دوسرے انسانوں کے لیے ہدایتِ خداوندی لے کر آئے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ سے لے کر سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی بھیجے ہیں۔ نبی اور رسول کو عموماً ہم معنی الفاظ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، لیکن اگر ان میں امتیاز کیا جائے تو رسول کا درجہ اللہ کے ہاں نبی سے بلند تر ہے۔

نفس

مختلف مسلم مفکرین نے اس لفظ کو کئی طرح سے استعمال کیا ہے۔ عام طور پر اس لفظ سے مجموعی طور پر انسان کی ذات مراد لی جاتی ہے۔ اس کی صفات کو اکثر روح اور بدن کی صفات کے درمیان، ادھ بیچ میں واقع دکھایا جاتا ہے۔ (دیکھیے: روح اور جسم)

واجب

وہ جو شریعت کی رو سے ضروری و لازم ہو جیسے یومیہ نماز۔ عمل کو جن پانچ اقسام میں بانٹا گیا ہے ان میں سے ایک واجب بھی ہے۔

ہجرت

۶۲۲ء میں رسولِ خداؐ کا مکہ سے مدینہ تشریف لے جانا۔ تاریخ اسلام میں یہ واقعہ اتنا اہم تھا کہ اُسے اسلامی تقویم کا آغاز شمار کیا جاتا ہے۔

اسماء الحسنٰی

اسماء الحسنٰی

اللّٰہ جل جلالہ

۱-	الرحمن	لامحدود رحمت والا، نہایت مہربان	The Infintely Good.
۲-	الرحیم	رحم والا، رحمت رکھنے والا	The All-Merciful
۳-	الملك	راج کرنے والا، بادشاہ، مالک	The King
۴-	القدوس	پاک، ہرعیب سے پاک	The All-Holy
۵-	السلام	سلامتی بخشنے والا، تمام نقائص سے پاک	Peace
۶-	المؤمن	امان دینے والا ، پناہ میں رکھنے والا، امن دینے والا	The Sure; the Faithful; the Safety-Giver.
۷-	المھیمن	محافظ، نگران	The Guardian; the Protector
۸-	العزیز	غالب، بڑائی کا مالک، بلند مرتبہ	The Almighty; the Inestimably Precious; the Hard of access
۹-	الجبار	زبردست، سب پر حاکم، جس کا حکم اٹل ہو	The Irresistiblc; the All-Overpowering
۱۰-	المتکبر	کبریائی کا مالک، اپنی عظمت کا اظہار کرنے والا	The Proud; the Grand.
۱۱-	الخالق	پیدا کرنے والا، عدم سے وجود میں لانے والا	The Creator.
۱۲-	الباری	بنانے والا، جس کی تخلیق میں کوئی نقص نہ ہو	The Maker
۱۳-	المصور	صورت بخشنے والا	The Former
۱۴-	الغفار	بے انتہا بخشش فرمانے والا، عیب پوشی کرنے والا	The Ever-Forgiving
۱۵-	القھار	سب کو مغلوب رکھنے والا، غالب	The Ever-Compelling
۱۶-	الوھاب	ابن مانگے عطا فرمانے والا	The Ever-Giving
۱۷-	الرزاق	رزق دینے والا	The Ever-Providing
۱۸-	الفتاح	کھولنے والا، مشکل کشا، فتح بخشنے والا	The opener (or the inward eye, of the way to saccess); the Victory- Giver.

۱۹- العلیم	علم والا ، ہر چیز کو پورا جاننے والا، جس کا علم کسی ذریعے کا پابند نہ ہو	The Omniscient
۲۰- القابض	رزق وغیرہ بند کر دینے والا ، روک لگانے والا ، روزی تنگ کر دینے والا	He Who' contracts; the Straitener.
۲۱- الباسط	رزق وغیرہ کھول دینے والا	He Who expands; the Mumificent
۲۲- الخافض	پست کرنے والا، ذلیل کر دینے والا	The Abaser
۲۳- الرافع	بلند کرنے والا،عروج دینے والا	The Exalter
۲۴- المعز	عزت دینے والا	The Honourer; the Enhancer.
۲۵- المذل	ذلت دینے والا	He Who humbles
۲۶- السمیع	سننے والا	The All-Hearing
۲۷- البصیر	دیکھنے والا	The All- Seeing
۲۸- الحکم	فیصلہ کرنے والا	The Arbitrator; the Decider
۲۹- العدل	انصاف،سراسر انصاف	The Just; Justice.
۳۰- اللطیف	باریک بین ، چھپی ہوئی چیزوں کا علم رکھنے والا ، جس کا مشاہدہ نہ کیا جا سکے، ماورائے ادراک، تمام خارجی اور ذہنی حدود سے ماورا	The Benign; the Subtle;the All-Penetrating; the Gently All-Prevailing.
۳۱- الخبیر	اندر کی خبر رکھنے والا ، چیزوں کے باطن سے واقف	The Aware; the All-Knowing.
۳۲- الحلیم	درگزر روالا تحمل اور برداشت والام بردبار	The Mild; the Indulgent.
۳۳- العظیم	عظمت و کبریائی کا مالک	The Infinite; the Immense.
۳۴- الغفور	بار بار معاف کرنے والا	The All-Forgiving.
۳۵- الشکور	تھوڑے سے عمل پر بہت اجر دینے والا، قدردان	The Grateful.
۳۶- العلی	بلند	The High.
۳۷- الکبیر	بڑا، بڑائی کا مالک، بزرگی والا	The Great.
۳۸- الحفیظ	حفاظت کرنے والا	The All-Preserver
۳۹- المقیت	روزی پیدا کرنے والا، قدرت رکھنے والا	The All-Nourisher; the Overseer of all; Providence.
۴۰- الحسیب	حساب لینے والا، کفایت کرنے والا، کافی	The All-Sufficient; the All Calculating.

۴۱- الجلیل	عظمت وجلال والا	The Majestic
۴۲- الکریم	بے انتہا عطا فرمانے والا، سخی	The Generous; the ll-Bountiful; the Magnanimous.
۴۳- الرقیب	نگہبان، محافظ	The All-Observing; the Vigilant.
۴۴- المجیب	جواب دینے والا ،دعائیں قبول فرمانے والا، حاجت روا	The All-Answering; the Responsive; the Granter of Prayers.
۴۵- الواسع	جس کے علم نے ہر چیز کو گھیر رکھا ہو، جس کی رحمت وسیع ہو	The Vast; the All-Caoacious.
۴۶- الحکیم	حکمت والا، دانائی کا مالک	The Wise
۴۷- الودود	محبت فرمانے والا	The Loving - Kind
۴۸- المجید	عزت وشرف والا	The All-Glorious,
۴۹- الباعث	اٹھانے والا، انبیاء کو بھیجنے والا، قبروں سے اٹھانے والا، عدم سے وجود میں لانے ، قیامت کے دن مردوں کو زندہ کرنے والا	The Raiser of the Dead; the Sender
۵۰- الشھید	حاضر و ناظر، دیکھنے والا ، گواہ، جس سے کوئی چیز پوشیدہ نہ ہو، جس کے لیے غیب نہ ہو	The All-Witnessing; the Directly Perceiving.
۵۱- الحق	حق، حقیقی	Truth; the True
۵۲- الوکیل	کارساز، جس پر بھروسا کیا جائے	The All-Reliable.
۵۳- القوی	قوت والا، جس کی قوت سب پر غالب ہو	The Overpoweringly Strong.
۵۴- المتین	جسے ہلایا نہ جا سکے، مضبوط ،اٹل ، اپنے مقام پر قائم رہنے والا	The Steadfastly Strong; the Firm.
۵۵- الولی	مددگار، دوست، کارساز	The Patron; the Helper.
۵۶- الحمید	لائق تعریف سراہا ہوا	The All-Praiseworthy.
۵۷- المحصی	گھیر لینے والا ، جس کا علم اور قدرت ہر چیز پر حاوی ہو	The Counter; the Knower of each separate thing.
۵۸- المبدی	عدم سے وجود میں لانے والا، آغاز کا خالق	The Beginner;the Cause.

۵۹-	المعید	دوبارہ تخلیق کرنے والے، فنا کے بعد انسانوں کو دوبارہ زندہ زندہ کرنے والا، جس کی طرف ہر ایک کو پلٹنا ہے	The Bringer-back;the Restorer; the Transformer.
۶۰-	المحیی	زندگی دینے والا، زندگی کا خالق	The Life-Giver.
۶۱-	الممیت	موت دینے والا، موت کا خالق	The Slayer.
۶۲-	الحی	زندہ	The Living
۶۳-	القیوم	جو اپنی ذات سے قائم ہو اور کوئی شے اس کے بغیر قائم نہ رہ سکتی ہو	The Self-Existing;the All-Sustaining.
۶۴-	الواجد	جس کے سامنے ہر شے حاضر ہو	The Complete;the Finder; The All-Resourceful; the Unfailing; the Unneeding.
۶۵-	الماجد	عزت و شرف والا	The Magnificent.
۶۶-	الواحد	یکتا، یگانہ، اکیلا، ایک	The One; the Sole;the Indivisible.
۶۷-	الصمد	بے نیاز، سب کا سہارا، جو کسی کا محتاج نہ ہو اور سب اس کے محتاج ہوں	The Self-Sufficient;the Eternal;the All-Needed;the Unsurpassable;the Fulfiller;the Goal.
۶۸-	القادر	صاحب قدرت، جس کا حکم کسی واسطے اور ضابطے کا پابند نہ ہو	The All-Powerful;the Lord of Absolute Free Will.
۶۹-	المقتدر	اقتدار کا ملک، حاکم مطلق	The All-Determiner.
۷۰-	المقدم	ایک کو دوسرے سے آگے بڑھانے والا	He Who brings forward;the Promoter; He Who brings near.
۷۱-	المؤخر	اپنے قرب سے دور کرنے والا، سزا میں تاخیر کرنے والا	The Postponer; He Who Puts Far away.
۷۲-	الاوّل	جو سب سے پہلے ہو	The First.
۷۳-	الآخر	جو سب کے بعد بھی باقی ہے	The Lset.

The Outwardly Manifest.	جو ہر شے سے ظاہر ہے، سب سے بڑھ کر معروف	۷۴- الظّاھر
The Inwardly Hidden.	جو ہر شے سے مخفی ہے، جس کا ادراک محال ہے، غیب در غیب چھپا ہوا	۷۵- الباطن
The Ruler.	مالک ومولیٰ	۷۶- الوالی
The Exalted; the Sublime; the Transcendent	سب سے بلند اور فہم وادراک سے ماورا	۷۷- المتعالی
The Beneficient.	تمام بھلائیوں اور احسانات کا مبدء	۷۸- البرّ
The Ever-Relenting;He Who makes repentance easy.	توبہ کی توفیق بخشنے والا، جس کی طرف پلٹا جائے، توبہ قبول کرنے والا	۷۹- التواب
The Avenger.	بدلہ لینے والا	۸۰- المنتقم
The Effacer of sins	معاف کرنے والا	۸۱- العفو
The All- Pitying	شفقت والا، شفیق	۸۲- الرّؤف
The Lord of Absolute Sovereingty	مالک کائنات، سب کا مالک	۸۳- مالك الملك
The Lord of Majesty and Bounty	ہر بڑائی اور ہر کمال کا مالک	۸۴- ذو الجلال والاکرام
The Equitable;the Reguiter.	انصاف سے فیصلہ کرنے والا، عادل	۸۵- المقسط
The Assembler;the Uniter.	قیامت کے روز سب کو جمع کرنے والا	۸۶- الجامع
The Infinitely Rich;the Absolutely Independent.	بے نیاز	۸۷- الغنی
The Enricher;the Availgr.	بے نیاز کر دینے والا، مالا مال کر دینے والا	۸۸- المغنی
The Preventer;the Shielder;the Defender.	روکنے والا	۸۹- المانع
He Who harms.	جسے چاہے نقصان اور تکلیف میں مبتلا کر دینے والا	۹۰- الضّآر
He Who benefits.	نفع پہنچانے والا، برکت دینے والا	۹۱- النافع
The Light	نور	۹۲- النّور

۹۳- الھادی	ہدایت بخشنے والا ، مقصود و مطلوب تک پہنچانے والا ، اپنے قرب کا راستہ دکھانے والا	The Guide.
۹۴- البدیع	اشیاء کو کسی مثال کے بغیر بنانے والا	The Peerless;the Marvellous; the Originator
۹۵- الباقی	ہمیشہ رہنے والا	The Permanent;the Eternal
۹۶- الوارث	موجودات کی فنا کے بعد بھی باقی رہنے والا	The Heir;the Inheritor.
۹۷- الرّشید	رہنما ، راستہ دکھانے والا ، جس کی ہدایت اور علم میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے	The Infallibly Right (in guidance and in knowledge)
۹۸- الصبور	صبر وتحمل والا	The All-Patient;the Long-Suffering;the Forbearing

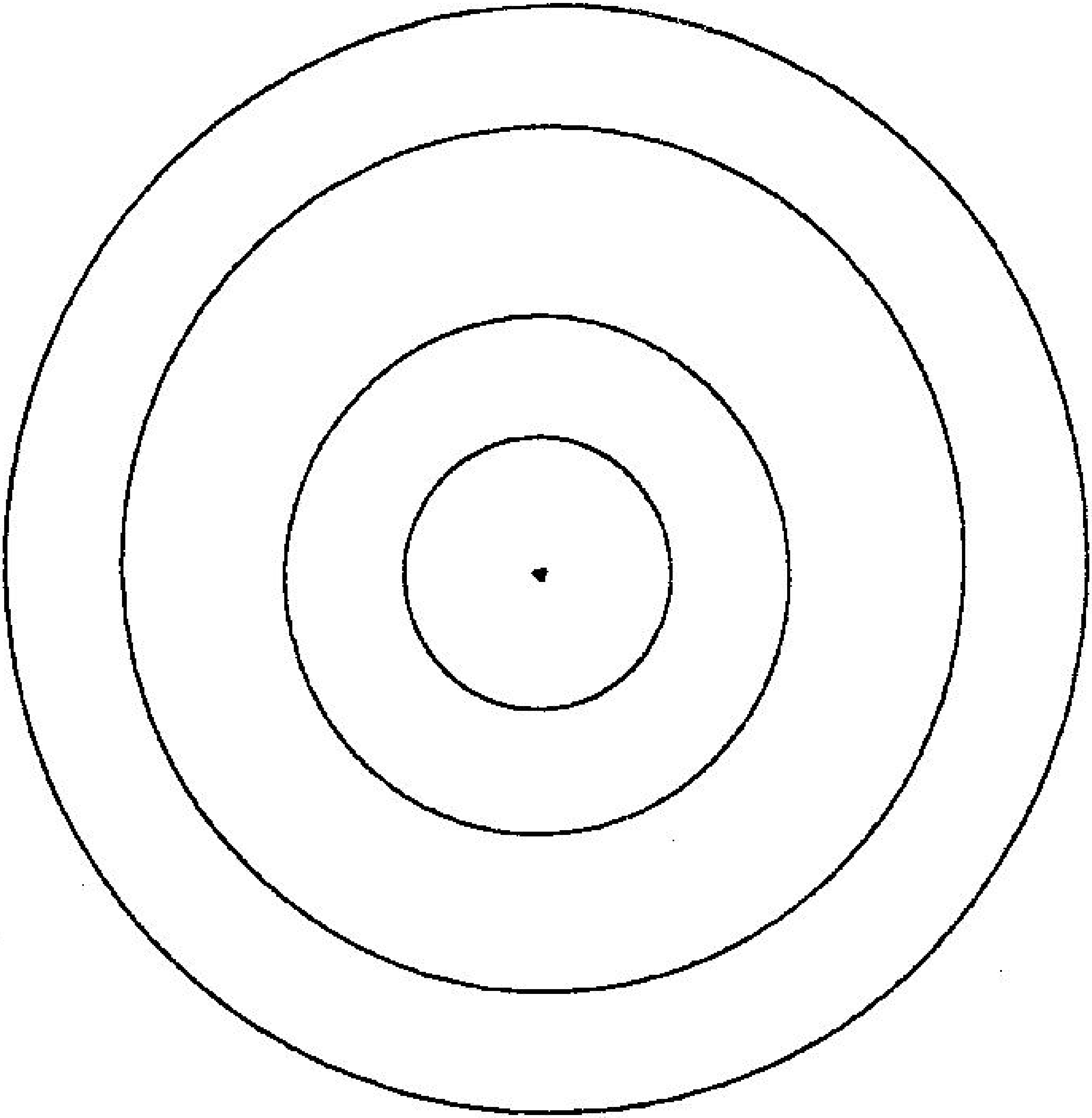

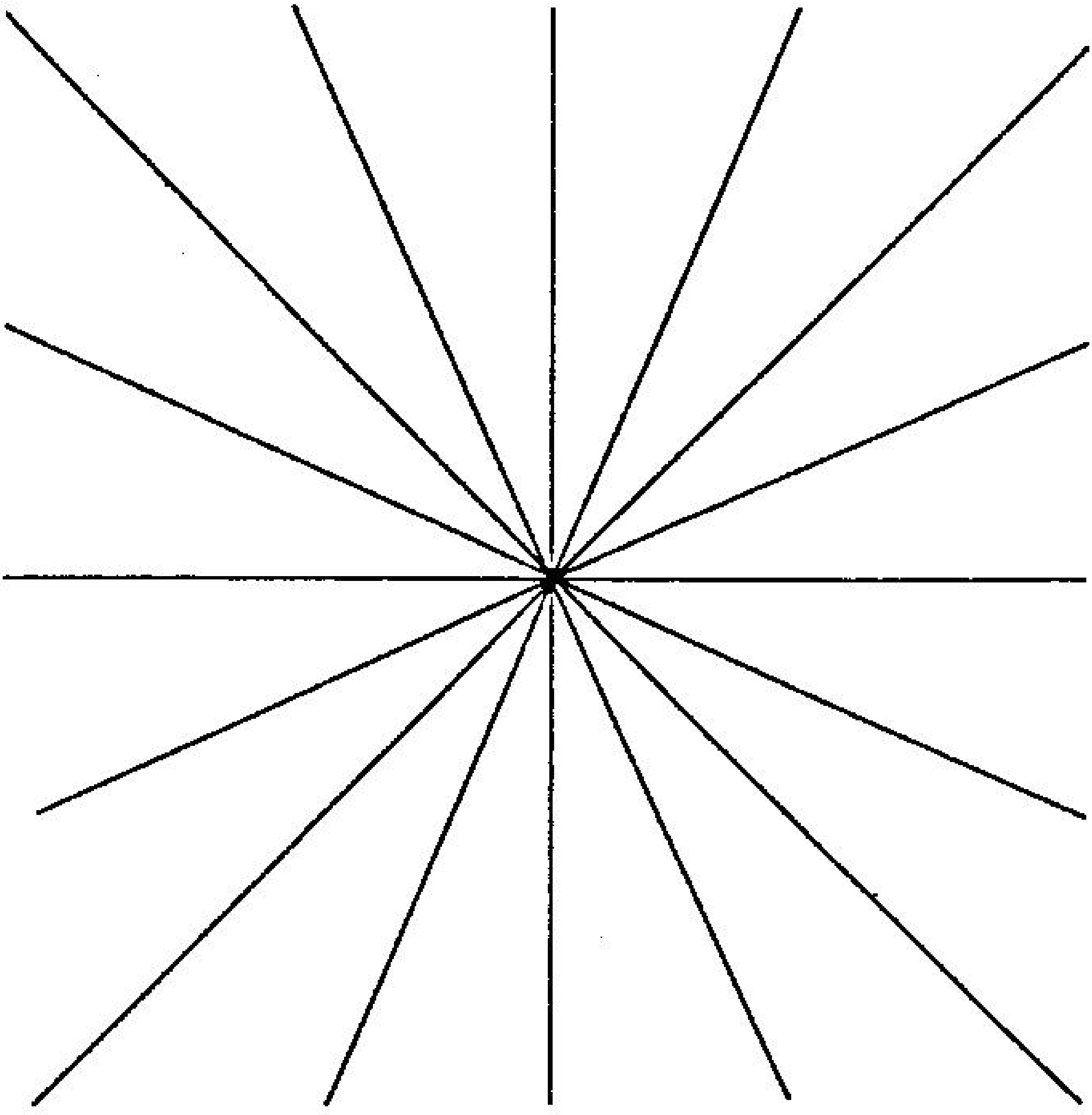

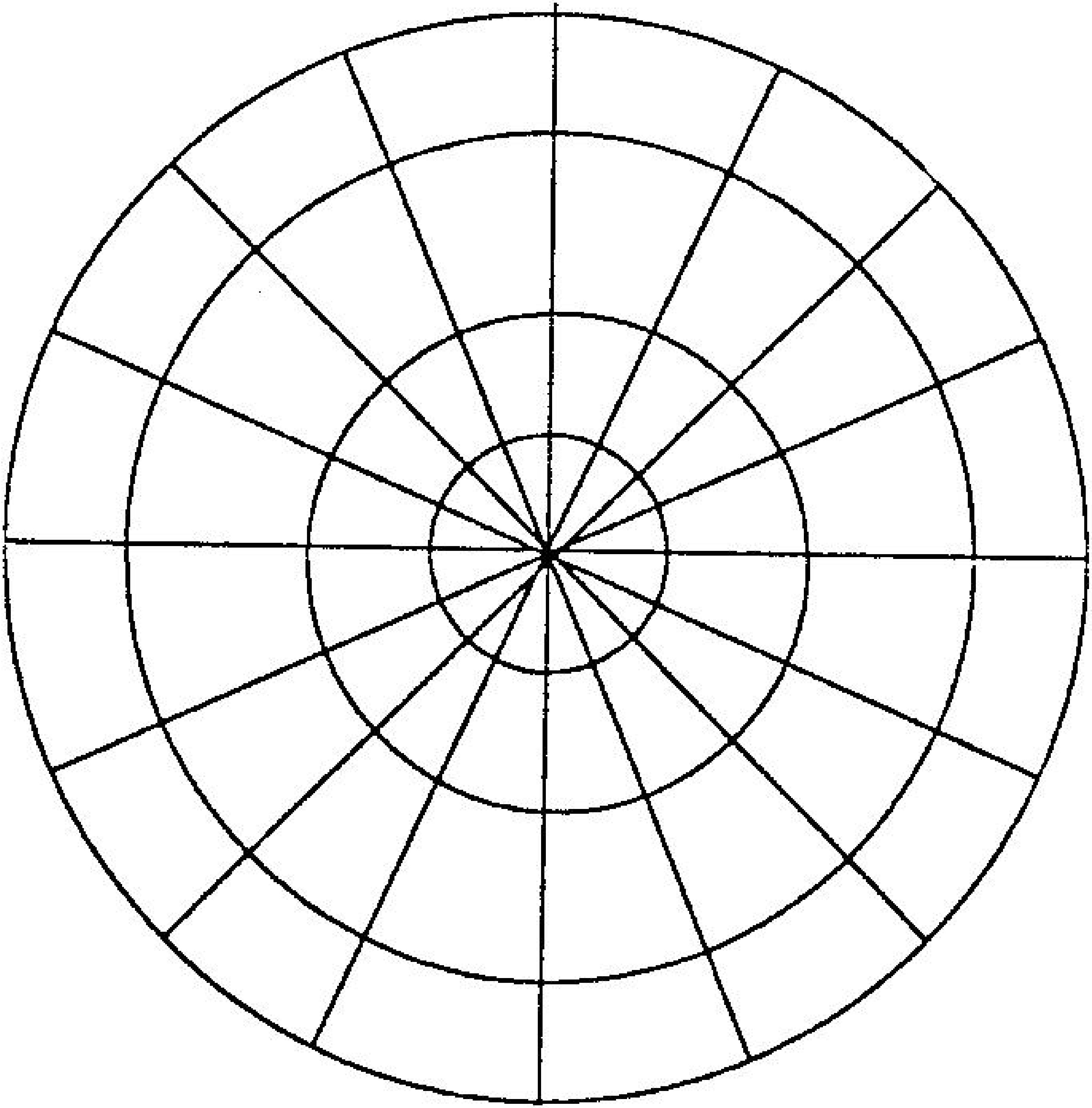

اشاریہ

آخرت/ معاد: ۱۰۸، ۱۰۹، ۳۴۹-۳۵۲

معادِ اختیاری/ معادِ اضطراری: ۳۵۰

المبدا والمعاد: ۳۵۲

آدمؑ: ۱۸، ۱۷، ۲۲۹، ۳۰۱، ۳۴۶

تخلیق آدم: ۱۸۳، ۱۹۲

معصیتِ آدم: ۸۱

ہبوطِ آدم: ۶۷، ۲۶۵

اسلامِ آدم: ۲۶۰

آدمؑ و ابلیس: ۲۶۹، ۲۹۱

آدمؑ اور اسماء: ۲۲۹-۲۳۱، ۳۸۴، ۳۸۸، ۳۹۵
(نیز دیکھیے انسان)

آرامی: ۱۶

آزمایش: ۲۱۴-۲۱۷

آگ: ۱۹۱-۱۹۵، ۲۰۲ (دیکھیے: النار)

آئینہ: ۱۹۹، ۲۱۲، ۲۱۳

آیاتِ خداوندی: ۳۳، ۱۲۱-۱۲۴، ۱۳۷، ۱۷۳

مخلوقات میں اللہ کی نشانیاں: ۲۲۶، ۲۲۷

تاریخ بطور آیت: ۵۵۸

تعبیرِ آیات: ۱۲۴-۱۲۹

آیات کے روبرو انسانی رویہ: ۲۷۶-۲۷۸

آیت اللہ: ۱۲۳

ابراہیمؑ: ۱۴، ۱۸، ۲۰، ۱۷، ۲۵۲، ۵۰۶

ابلیس (شیطان): ۱۲۳، ۱۹۲-۱۹۵، ۲۴۸، ۲۵۹-۲۶۴،
۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۵، ۲۷۹-۲۸۵، ۲۹۲، ۲۹۶،
۴۹۱

ابن العربیؒ: ۴۳۶، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۵۳، ۵۳۰،
۵۳۵

ابن حزم: ۳۱۴

ابن حنبلؒ، احمد: ۹۰

ابن سیرین: ۳۹۹

ابن سینا: ۴۳۸، ۴۵۸، ۴۵۹

ابن عباسؓ: ۴۱۱

ابو حنیفہ: ۹۰، ۴۲۸

ابو بکرؓ: ۲۱، ۲۵

اثم: ۸۲

اجسام، اجسام کی اللہ سے دوری: ۲۹۴

جسمانی اعمال کی اہمیت: ۴۵، ۵۵، ۲۴۶، ۳۲۳

جسم بروز یومِ قیامت: ۱۸۶، ۵۵۰

جسم بطور مٹی: ۱۸۵، ۲۴۶، ۵۴۲

جسم اور نفس: ۲۰۱

اجماع: ۸۰

احسان: ۳۶، ۴۳۴، ۴۶۷-۴۷۷، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۹۹، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۴۹

اسلام، ایمان اور احسان: ۳۶-۳۹، ۵۷، ۴۶۷، ۵۳۷، ۵۷۱

اختیار: ۵۰، ۲۱۸-۲۲۵، ۲۵۴، ۲۵۸، ۲۶۰ (دیکھیے: جبر)

اخفائے حق: ۱۰۵

اخلاص: ۴۸۵-۴۹۲

اخلاق: ۵۳۰، ۵۳۱

ادب: ۵۱۹، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۵

اذان: ۶۴، ۷۰

ارادہ: ۳۸، ۴۶۷

ارسطو: ۴۲۱، ۴۲۶، ۴۳۸، ۴۵۶، ۵۳۱

ارض وسما/ زمین وآسمان: ۱۶۳-۱۶۹، ۲۰۷، ۲۴۲، ۲۵۴، ۲۵۶، ۲۶۶، ۳۵۵، ۴۱۱، ۵۴۳

ارکانِ خمسہ: ۵۵، ۵۶، ۲۵۸، ۳۹۱، ۴۷۸، ۵۵۰

استکبار: ۱۹۱، ۱۹۲

اسحاقؑ: ۵۰۶

اسرافیلؑ: ۱۷۴، ۱۸۳، ۳۶۲

اسکندریہ: ۴۲۵

اسلام: ۹، ۳۴، ۳۵، ۴۹-۵۴، ۷۴، ۸۶، ۲۲۰، ۲۵۰، ۲۶۲

اضطراری اور اختیاری: ۶۰، ۲۳۶، ۲۳۷، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۰، ۴۱۲، ۴۷۱، ۵۰۹، ۵۱۰

اسماءالحسنیٰ: ۱۳۰

اسمائے الٰہیہ/ صفاتِ الٰہیہ: ۱۳۰-۱۳۶، ۱۳۹-۱۴۲، ۲۰۲

اسمائے حسنیٰ: ۱۳۰، ۱۳۱

اسمائے جلال/ اسمائے جمال (رحمت وغضب): ۱۴۷، ۱۴۸، ۲۲۱، ۲۴۷، ۲۹۳، ۳۷۲، ۳۸۳، ۴۱۵، ۴۶۸

اسمائے ذات/ صفات/ افعال: ۱۳۹-۱۴۴، ۱۵۰

اسمائے تشبیہ/تنزیہ: ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۵-۱۵۷، ۲۴۶، ۳۴۲

ائمہ سبعہ: ۲۳۲

لوگوں کے نام: ۲۳۸، ۴۷۵

اسم علم: ۱۳۱

اسمٰعیلؑ: ۲۰، ۵۰۶

اشعریؒ، ابوالحسن: ۴۳۳، ۴۵۴

اشاعرہ: ۴۳۳، ۴۶۲

اصل: ۴۳، ۱۰۷

اصول الدین: ۴۲۸

اصول ایمان (تین): ۱۰۷-۱۰۹

اضلال: ۲۷۹

اطاعت اور معصیت: ۸۰-۸۱، ۱۰۳، ۳۳۶

اطاعت/ اسلام: ۲۶، ۲۹، ۳۰، ۳۴، ۳۶-۳۹
اغویٰ: ۲۷۹
افعال خداوندی: ۱۴۵، ۱۵۹، ۱۶۰
فعل و عمل: ۵۵، ۷۶، ۷۷
عملِ صالح: ۸۰، ۸۳
عمل بالجوارح: ۱۰۰
عمل کی پانچ اقسام: ۷۷
عمل کی اہمیت: ۸۶
افلاطون: ۴۲۱، ۴۲۶، ۴۵۶
الخالق: ۱۳۴ (دیکھیے: آدم)
الست: ۲۵۵، ۲۵۸، ۲۷۲، ۲۷۵
اللہ: ۱۱۱-۱۱۶، ۱۳۰ (دیکھیے خدا)
الٰہ: ۱۱۳-۱۱۵، ۱۳۲
امام/ امامت: ۲۴، ۸۰، ۱۰۷
امانت: ۲۵۲-۲۵۵، ۲۷۵، ۲۸۸، ۳۰۱، ۳۴۰، ۳۴۲، ۵۰۱
انجیل: ۱۷، ۲۵۲، ۳۱۲، ۳۱۴، ۳۱۷
انسان: ۲۲۹-۲۳۵
انسان کی مبہم نوعیت: ۳۹۰، ۳۹۱
انسانی نشو ونما: ۳۸۳-۳۸۸
انسانی تنوع: ۱۹۷، ۱۹۸، ۲۴۳، ۲۴۴
کمالِ انسانی: ۳۲۶
انسان کی انفرادیت: ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۴۸، ۲۵۶
انسان بطور ارواح واجسام: ۱۸۹
انسان بطور کتاب: ۱۸۷
انسان اور صفات خداوندی: ۲۲۹، ۵۲۸
انسان اور صورتِ خداوندی: ۳۲۵، ۳۴۰، ۳۸۳
انسان اور دیگر مخلوقات: ۹۸، ۲۲۸، ۴۴۲، ۴۴۸-۴۴۸
انصاری، خواجہ عبداللہ: ۵۳۹
اولوالعزم: ۳۵۱
اہلِ کتاب: ۳۱۴
ایلیاد، مرسیا: ۵۵۶
ایمان: ۲۶، ۳۰، ۳۶، ۹۷-۱۰۶، ۲۱۶، ۴۳۲، ۴۳۴
ایمان و اسلام: ۵۳، ۹۷-۱۰۶، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۵۰۴
باطن: ۱۵۲
بت پرستی: ۱۲۰
بدھ، مہاتما: ۱۷۹
بدھ مت: ۴۱۲
براق: ۱۶۶
برزخ: ۴۰۰-۴۰۴، ۵۵۰
برکی، جوناتھن: ۴۲
برہان: ۳۲۹
بشریٰ: ۳۳۷
بعث: ۳۶۷

بلا:۲۱۴
بن یامین:۳۲
بنیاد پرستی:۱۴۶،۳۳۳،۴۳۶
بیان:۳۲۹
پانی/آب:۶۷، ۱۶۸،۱۸۲، ۲۰۷، ۲۵۷، ۳۷۵، ۵۱۷-۵۱۸
پیٹر، ایف-ای:۱۷، ۵۵۵
پیغام/پیغامبر:۱۷۱،۱۷۲،۲۵۱ (دیکھیے: نبوت)
پیمانۂ تقدیر: ۱۰۸، ۲۰۲-۲۰۸، ۲۱۰، ۲۱۴، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۹۸، ۴۱۳
تاریخ:۵۵۳-۵۵۷
اسلامی تصورِ تاریخ: ۹، ۴۶، ۸۷، ۱۲۲، ۳۳۹، ۵۵۷-۵۵۹، ۵۷۱-۵۷۵
تبیین:۳۲۹
تثلیث:۳۰۹
تحریف:۳۱۲-۳۱۴
تخلیق:۲۰۴
تخلیق اور پیمانۂ تقدیر:۲۱۴-۲۱۷
تخلیق اور کلام:۱۳۷
تخلُّق:۵۳۰
تسبیح:۱۴۲، ۱۵۴
تشبیہ (دیکھیے: تنزیہ وتشبیہ)
تصوف، عملی:۵۲۹-۵۳۶
نظری تصوف:۴۲۰، ۴۳۴، ۴۳۶-۴۳۶، ۴۶۱، ۴۶۴-۴۶۴
تصوف اور تشبیہ:۴۵۰، ۴۶۳، ۵۳۰، ۵۳۸
تعدد الٰہ:۱۳۲
تعریف:۱۰۴، ۱۳۳، ۱۵۴
تعلیم:۳۹-۴۵، ۸۰
فروغ تعلیم میں رسول اللہؐ کا کردار:۸۵
تفسیر:۴۳
تقدیر:۲۰۲
جبر واختیار:۲۱۹-۲۲۵، ۲۹۸، ۲۹۹، ۴۱۳، ۵۳۹
تقویم:۶۷، ۶۸
تقویٰ:۳۴۶، ۴۹۲-۴۹۸
تنزیل:۳۲۸
تنزیہ وتشبیہ:۱۵۰-۱۵۸
تنزیہ وتشبیہ کا توازن:۱۵۳، ۱۵۴، ۵۴۲
تنزیہ وتشبیہ اور ہبوطِ آدم:۲۶۷
تنزیہ وتشبیہ اور فنونِ لطیفہ:۵۲۱، ۵۲۲
تنزیہ وتشبیہ اور کائنات:۱۶۸، ۱۶۹، ۲۲۶، ۲۴۲
تنزیہ وتشبیہ اور قرب وبعد:۲۹۳، ۳۴۰، ۴۴۳
تنزیہ وتشبیہ اور اختیار:۲۲۰، ۲۲۱، ۲۴۲
تنزیہ وتشبیہ اور خیر وشر:۲۱۲
تنزیہ وتشبیہ اور احسان:۴۸۲
تنزیہ وتشبیہ اور کلام:۴۵۲، ۴۵۳، ۵۷۴

تنزیہ وتشبیہ اور نور:۱۷۶
تنزیہ وتشبیہ اور پیمانۂ تقدیر:۲۰۵
تنزیہ وتشبیہ اور جدیدیت:۳۳۳، ۵۷۵
تنزیہ وتشبیہ اور محمدؐ:۳۳۳، ۳۳۴
تنزیہ وتشبیہ اور ذکر خداوندی:۲۷۳
تنزیہ وتشبیہ اور عقل وخیال:۴۴۲، ۴۴۳، ۴۵۸، ۵۲۲، ۵۲۳
تنزیہ وتشبیہ اور عبد وخلیفہ: ۲۴۰، ۳۴۰، ۴۱۵، ۴۴۲، ۴۹۷
تنزیہ وتشبیہ اور نفس:۱۹۷، ۳۹۴، ۳۹۵
تنزیہ وتشبیہ اور ارواح:۱۸۹، ۱۹۰، ۲۰۱، ۲۰۲
تنزیہ وتشبیہ اور تصوف: ۴۵۰-۴۵۲، ۴۶۲، ۴۶۳، ۵۳۸
تنزیہ وتشبیہ اور دعا:۵۱۶
تنزیہ وتشبیہ اور دیدارِ خداوندی:۱۷۱، ۴۸۳
توحید:۳۴، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۱-۲۴۲، ۴۷۹
تمام انبیا کا پیغام:۵۲، ۲۵۵، ۳۰۸
توحید اور ابلیس:۲۶۲
تورات:۳۰۵، ۳۱۴، ۳۲۴
توکل:۲۲۳
تیمّم:۶۳
ثواب:۴۱۵
جانور:۲۴۴، ۵۴۵ (دیکھیے پودے)
جبرئیلؑ:۱۳، ۱۶۶، ۱۷۰، ۱۷۲، ۱۸۳، ۱۸۵، ۱۹۸،
۳۰۳
حدیثِ جبرئیلؑ:۲۵، ۲۷، ۲۹، ۹۷، ۵۶۲
جدیدیت:۱۶، ۵۶۷، ۵۶۸
جدیدیت، اسلامی:۹۳، ۳۳۳، ۵۶۹، ۵۷۰
جعفر صادقؒ:۹۰
جلال:۴۶۸
جمال:۴۶۸، ۴۹۹
جمال خداوندی:۳۸۰، ۵۲۱
جمال وجلال:۱۴۷، ۴۶۹
حسن وقبح:۲۱۱
حسنِ عمل:۲۵-۲۹، ۴۶۷-۴۷۷، ۵۱۹ (دیکھیے: محبت)
جمعہ:۶۱، ۶۴، ۵۲۰
جن:۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۴، ۲۴۸، ۲۷۰، ۳۰۰، ۴۰۱
جنگ:۷۳-۷۵، ۴۷۷
جہات، اسلام کی تین:۳۶-۳۹، ۷۵، ۵۷۱
جہاد:۷۳-۷۵، ۲۲۰
جہنم:۲۷۰-۲۷۱
حُب:۴۹۹
حج:۷۱، ۷۲
حاجی:۷۲
حدیث:۲۲، ۸۵، ۸۶
حدیثِ قدسی:۲۳

حرام:۸۷
حسن:۲۱۱، ۴۶۷، ۴۹۹، ۵۱۹
حسنیٰ:۱۳۱، ۴۶۹، ۴۷۰
حسنؓ:۳۲۷، ۴۷۶
حَسَن:۱۳۰
حسین:۴۷۶
حشر:۳۶۷
حق:۱۳۵
حقیقت:۱۳۶، ۱۵۶
حکم:۳۲۰
حکمت:۳۲۸
حکومت:۲۳
حلال:۸۷
حنیف:۱۸
حوا:۲۲۹، ۲۵۹، ۲۶۴
حیا:۵۴۷
خاندان: دیکھیے شادی، والدین
خبیث:۴۰۹
خدا:۱۱۳-۱۱۶
خندۂ الٰہی:۳۷۶
خدیجہؓ:۱۸، ۱۹
خطاطی:۵۲۰
خطئیہ:۸۲
خلافت بنوامیہ:۹۲
خلافت بنوعباس:۹۲، ۴۳۳، ۵۷۳
خلق:۱۷، ۴۷، ۵۳۱
خلیفہ/خلافت: ۲۱، ۲۴، ۹۲، ۲۳۰، ۲۳۲، ۲۳۶-۲۳۶، ۲۵۴، ۵۶۹
خلیفۂ راشد:۵۷۲
خلیل:۳۰۴
خمس:۹۰
خواب:۱۹۸، ۳۹۶-۳۹۹
تعبیر الرویا:۳۹۶-۳۹۹
خودکشی:۳۶۰
خوشبو:۴۰۷
خوف:۱۰۵
خیال:۱۹۸-۲۰۱، ۳۸۹-۴۰۴
خیال کا ابہام:۲۱۲
عالم خیال:۴۰۲-۴۰۴
خیال بمقابلہ عقل:۴۴۱-۴۵۲، ۴۵۹
خیر وشر:۱۰۸، ۲۰۸-۲۱۳، ۴۵۷، ۴۶۸
بشارت اور انتباہ:۳۳۷-۳۴۷، ۳۴۹
دانتے:۱۶۷
دجال:۱۹۹

دعا:۵۱۵-۵۱۷

دنیا:۳۵۵

دین:۲۹-۳۹،۵۲،۵۰۷

اصول الدین:۴۲۸

فروع الدین:۴۲۹

دین میں بگاڑ:۲۵۰،۲۵۸،۵۷۴

دین کی جہات:۳۶-۳۸

دین کا مقصد:۱۷۷

دین اور فطرتِ انسانی:۲۵۸

دین اور اخلاص:۴۹۰

دِین:۲۹،۳۰

دَین:۳۰،۳۱

ڈیکارٹ:۴۲۱

ذات:۱۴۰

ذات خداوندی:۱۴۱،۱۴۲،۱۵۹

ذکر:۱۷۹،۲۷۲-۲۷۶،۲۷۸،۳۴۰،۴۳۵،۴۷۸، ۴۸۳

ذکر الٰہی:۱۷۹،۲۷۲-۲۷۵،۳۳۶،۳۹۱،۴۸۳

ذنب:۸۲

رازی،فخر الدین:۴۳۸،۴۳۹

رحمت:۱۳۳،۱۵۵،۲۱۰،۲۱۳،۲۱۴،۲۲۱،۲۹۷

رحمت کی دو اقسام:۴۹۷

رحمت غضب سے بڑھی ہوئی: ۱۵۵-۱۵۸، ۱۶۵،۳۰۷،۳۴۵،۴۱۵-۴۱۶

رحمت اور خندۂ الٰہی:۳۷۶

رسول:۲۵۰-۲۵۲

رمضان:۶۷-۷۰

روح و بدن: ۱۸۴-۱۸۹، ۳۸۹-۳۹۵، ۴۱۰، ۵۴۲

روزہ:۶۷-۷۱،۷۷

روزِ جزا:۴۱۱-۴۱۷

رومیؒ:۱۹۳، ۲۲۷، ۲۹۸، ۳۸۰، ۵۲۶، ۵۳۶-۵۳۸، ۵۴۳، ۵۴۸، ۵۴۹

ریا:۴۸۷

زرتشتیت:۴۲۴،۴۴۰

زکوٰۃ:۶۶،۷۸،۵۳۲

زمین:۱۸۳

زندگی اور موت:۳۵۳-۳۵۵،۳۵۹-۳۶۳،۴۰۲

زندگی اور موت دینے والا:۱۴۵،۳۵۴

ساعۃ:۳۶۴،۵۶۲

سائنس (اور معاصر اہل علم):۴۳۶،۴۴۵،۴۴۶

سائنس کی نارسائی: ۱۴۳، ۱۶۴، ۵۰۹، ۵۴۶، ۵۵۵

سائنس بمقابلہ علومِ اسلامی: ۱۲۴-۱۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱

سبوح:۱۴۲

سجادہ:۶۴
سجین:۴۱۰،۴۱۱،۴۸۲
سریت/ باطنیت:۴۲۳،۴۴۳،۵۲۹
سلام (اسم خداوندی):۱۴۲
سلیمانؑ:۳۶۱،۴۶۰
سلیواں، لارنس-ای:۵۵۷
سمتھ، ڈبلیو-سی:۹۷،۱۰۵
سنت:۶۳،۹۵-۹۱،۳۲۶،۵۰۲،۵۳۲
سنّی:۲۴
سورت:۱۳،۱۳۹
سوء:۲۱۱،۴۶۸
سہروردی:۴۳۹،۵۵۸،۵۵۹
سیاست:۹۱-۹۴،۳۰۶
شاعری:۳۸۰،۴۶۳،۴۶۴،۵۲۴-۵۲۶
شافعیؒ:۹۰
شبستری، محمود:۵۲۳
شر:۲۰۸-۲۱۲،۴۶۸
شرک:۱۱۶-۱۲۰،۲۲۲،۲۴۵،۲۶۹،۳۲۶،۳۴۲،
۳۴۶،۴۳۲،۴۸۰،۵۲۱
شریعت:۷۵-۸۳،۸۷-۹۱،۵۰۳،۵۴۲
شریعت مخصوص:۳۰۳،۳۰۴
ماخذ شریعت:۸۰،۸۵
شفاعت:۳۷۵
شکر:۱۰۳،۱۰۴،۲۱۵-۲۱۸
شہادت:۵۷-۵۹،۲۵۵
پہلی اور دوسری شہادت: ۱۱۱،۱۱۲،۱۳۳، ۲۴۹،
۲۵۰،۲۵۵،۲۶۹،۳۰۱،۳۰۸،۳۴۹،۴۲۱
شہید:۵۷
شہر، عالمِ اسلام کے:۷۰-۷۲،۹۴
شیاطین:۳۰۰،۳۰۱
شیعہ:۲۴
شیعیت/ اہل تشیع:۲۴،۶۴،۹۰
صالحات:۸۳،۵۰۴
صراط:۳۷۳
صفاتِ خداوندی:۱۵۹،۱۶۰،۱۶۱ (دیکھیے: اسماء)
صلوٰۃ/ نماز: ۵۹-۶۵، ۷۷، ۸۵، ۱۰۰، ۱۷۱،
۲۵۸،۳۰۵،۳۲۳،۴۰۷،۵۱۹
نماز باجماعت:۶۱،۶۴
صور:۳۶۲،۳۶۶
طریقت:۵۳۴
طوسی، نصیر الدین:۴۵۶
طہارت:۶۲،۶۳
طیب:۴۰۸
ظاہر:۱۵۲

ظلم:۱۱۶، ۱۱۷، ۲۸۶-۲۹۰ (دیکھیے: عدل)
ظلمت/تاریکی: ۱۷۵، ۱۷۶ (دیکھیے نور)
عاقبت: ۵۵۸
عالم صغیر اور عالم کبیر: ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۲۶، ۲۳۴، ۲۵۴
عائشہؓ: ۸۵، ۳۲۲
عبادت: ۲۳۸، ۲۳۹
عبد: ۲۰۵، ۲۳۶-۲۴۲
اضطراری اور اختیاری: ۲۳۷، ۲۶۲، ۳۵۰
عبد اور خلیفہ: ۲۳۶-۲۳۹، ۲۶۶، ۲۶۷، ۳۳۶، ۳۸۴، ۳۸۵، ۴۴۲، ۴۸۱
عبد: ۲۰۵، ۲۲۴، ۲۳۶-۲۳۷، ۴۷۸
عبداللہ: ۲۳۸
عبرانی: ۱۶
عدل: ۱۰۷
ظلم وعدل: ۲۱۷، ۲۸۶، ۳۲۴
عرب (عربی): ۱۵-۱۷، ۴۵
عرش وکرسی: ۱۶۴، ۱۶۵، ۳۵۶
عزرائیلؑ: ۱۷۱، ۱۷۴، ۱۸۳، ۳۶۱
عقاب: ۴۱۵
عقل: ۸۰، ۹۸، ۹۹، ۲۸۲، ۳۵۹، ۳۸۷، ۴۲۱، ۴۳۳، ۴۵۸، ۵۴۵
عقل اور جدیدیت: ۵۵۵
عقل بمقابلہ خیال: ۴۴۷-۴۵۲، ۴۵۸، ۴۶۲-۴۶۴
علم: ۱۳۴، ۱۳۶
علم کی ژولیدگی: ۴۴۵، ۴۴۶
علم کی تین اقسام: ۴۲۰-۴۲۳، ۴۴۱-۴۵۲
علم وجہل: ۱۴۱
علما: ۳۹-۴۳، ۷۶
علی: ۴۰۹
علی ابن حسین: ۵۱۵
علیّون: ۴۰۸، ۴۰۹
علیؓ: ۲۴، ۸۵، ۸۷، ۹۳، ۴۲۶-۴۲۸
عمرہ: ۷۸
عمرؓ: ۲۶، ۲۹
عمل: ۱۰۰
عیسائیت: ۱۳، ۱۶، ۲۵، ۳۹، ۲۵۹، ۲۶۲، ۲۶۵، ۲۶۷-۲۶۹، ۳۰۷-۳۱۸، ۳۲۴، ۵۲۳، ۵۴۶، ۵۵۴
عیسیٰؑ/مسیحؑ: ۴۵، ۲۱۲، ۲۳۸، ۲۵۲، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۲۴، ۵۰۶، ۴۳۷
عیسیٰؑ اور جبرئیلؑ: ۱۷۲
غزالیؒ، محمد: ۷۶، ۳۶۹، ۳۹۹، ۴۲۴، ۴۳۱، ۴۳۵، ۴۳۸، ۴۶۲
غزالیؒ، احمد: ۴۳۵
غسل: ۶۲
غفلت: ۲۶۸-۲۷۱، ۳۴۰، ۳۸۴

غیب وشہود: ۱۶۲،۱۶۱
فاتحہ: ۱۳، ۶۲، ۸۶، ۳۲۷، ۳۷۳
فارابی: ۴۳۸، ۴۵۶
فاسد: ۵۰۸
فاطر: ۲۵۶
فاطمہؓ: ۲۴
فتنہ: ۲۱۴
فرشتے: ۱۶۲، ۱۶۶، ۱۷۰، ۱۷۸، ۲۰۱
فرشتے اور ارواح: ۱۸۴
فرشتوں کی نورانیت: ۱۷۸
فرشتوں کا پیام: ۱۷۱
فرشتوں کا سامنا موت کے وقت: ۴۰۵
فرشتوں کی دعا: ۵۸، ۱۷۱
فرشتوں کے پر: ۱۸۰
فرشتوں اور آدم کا فرق: ۲۳۰، ۲۴۳، ۳۸۴
فرعون: ۱۴، ۳۳، ۳۵، ۲۹۷
فرقان: ۳۲۷
فطرت: ۱۱۸، ۲۵۶-۲۵۸، ۲۷۸، ۳۴۰، ۴۷۱، ۴۷۹، ۵۱۶
فقہا: ۴۳، ۶۷
فقہ/فقیہ: ۴۳، ۷۵-۸۰، ۹۱-۹۴، ۴۱۹، ۴۲۸، ۴۷۸
الفقہ الاکبر: ۴۲۸
مذاہبِ فقہ: ۸۷-۹۰
فقہ اور بابِ اجتہاد: ۹۱
فلاطینوس: ۴۲۶، ۴۵۶
فلسفہ: ۴۲۰، ۴۳۷-۴۴۰، ۴۵۵-۴۶۰، ۵۲۹
فن: ۵۱۸، ۵۲۱، ۵۲۸
قاہرہ: ۴۱
قبر: ۳۵۹-۳۶۳، ۴۰۰
قدر: ۲۰۲
قدرت: ۲۰۲
قدریہ: ۴۵۴
قدوس: ۱۴۲
قرآن: ۹-۱۷، ۱۹، ۳۱۸-۳۳۲
مخاطبینِ قرآن: ۵۴۴
تفسیرِ قرآن: ۴۳
مقصدِ قرآن: ۳۳۹، ۳۴۰
حفظِ قرآن: ۸۶، ۳۲۰، ۳۲۱
تلاوتِ قرآن: ۱۱، ۴۴، ۴۵، ۳۱۸-۳۲۶، ۵۱۹
ترجمۂ قرآن: ۱۰-۱۲
قرآن بحیثیتِ کلامِ خداوندی: ۱۲۱، ۳۱۶، ۳۲۵
قرآن بحیثیتِ نور: ۹، ۱۷۹، ۳۲۳، ۳۲۹
قرب و بعد: ۱۴۷-۱۵۰، ۱۵۶-۱۵۹، ۱۷۷، ۲۸۱، ۲۹۳، ۲۹۴، ۳۴۰، ۳۵۵، ۴۱۶، ۴۴۳
قلب (دل): ۹۸، ۱۰۱، ۱۰۲، ۳۱۳

قیاس:۸۰
قیامت: ۱۸۶، ۳۴۳، ۳۵۶، ۳۶۳-۳۷۶......
حشر اجساد:۵۵۰
کاشانی، افضل الدین:۴۶۲
کائنات:۱۴۳، ۱۵۹، ۲۵۷، ۳۵۵، ۳۵۶
کائنات بطورِ کتاب:۱۳۸، ۱۳۹، ۱۵۹
کائنات بطورِ مجموعہ آیات:۲۳۵
کائنات بطورِ صورت خداوندی:۳۵
کائنات اور سیارے:۱۶۳
کائنات کا حرکی اور سکونی تصور:۳۵۵
کائنات اور غیب وشہود:۱۶۱
کتاب
کائنات بطور کتاب:۱۳۸
انسان بطور کتاب:۱۸۶
وحی بطور کتاب:۳۲۷
اہلِ کتاب:۲۵، ۸۷
کتمانِ حق:۲۱۶
کروبّیاں:۱۷۴
کریم:۳۳۲
کشف:۴۲۲، ۴۴۶-۴۴۸، ۴۶۱-۴۶۳
کعبہ:۱۷، ۱۷-۲۷
کفر/کافر:۱۰۳-۱۰۵، ۲۱۶، ۲۸۷
کلام: ۹۹، ۱۰۰، ۱۲۱، ۱۳۷-۱۳۹، ۱۹۷، ۱۹۸،
۳۸۶، ۳۸۷
کلامِ خداوندی اور کلامِ انسانی:۱۳۸
کلام بطورِ خیال:۳۹۲
کلام: ۴۲۰، ۴۲۳-۴۲۶، ۴۲۸، ۴۳۴-۴۵۲، ۴۵۶-۴۵۶،
۵۷۵
کلیم:۳۰۳
کندی:۴۳۸
کیمیا:۵۳۶
گناہ:۸۰-۸۳، ۲۶۶، ۲۶۷
لاشیئت:۱۳۵
مارکسیت:۹۳
مالک ابن انسؒ:۹۰
مامون الرشید:۴۳۰
مانویت:۳۱۴
مبارک:۳۳۲
متعہ:۹۰
متکبر:۱۹۵
متکلمین/اہل کلام:۴۲۳، ۴۲۶، ۴۲۹-۴۳۲،
۴۳۷
مٹکاف، باربرا:۵۳۳، ۵۳۴
مثال:۱۹۸
مجاہدہ:۷۳-۷۵، ۲۲۰
مجوسی:۴۵۵

محبت: ۳۳۷، ۴۵۳، ۴۹۹-۵۰۳، ۵۳۷-۵۴۱
محبت اور حسن: ۴۰۷، ۵۰۲
محسن: ۴۷۰، ۴۷۴
محمدؐ: ۱۷-۲۴، ۳۳۳-۳۳۷
آپؐ کے فرائض: ۲۲
آپؐ کے علوم: ۸۵
آپؐ کی محبوب چیزیں: ۴۰۷
بحیثیتِ عبداللہؐ: ۲۰۵، ۲۳۷، ۲۳۸
سراجِ منیرؐ: ۳۶۹
بحیثیتِ پیغمبرؐ: ۳۱۶، ۳۳
مخلِص/مخلَص: ۴۸۵
مدرسہ: ۴۱، ۴۲
مدینہ: ۲۱-۲۳، ۲۷، ۲۸
مذاہب: ۸۷-۹۰
مرسَل: ۲۵۱
مریمؑ: ۱۷۲، ۱۹۸، ۳۱۱
مسجد: ۳۹، ۶۴، ۵۲۰
مسلم/مسلمان: ۹، ۴۹، ۱۲۲، ۲۰۵، ۲۵۰ (دیکھیے: اسلام)
مشرک: ۱۱۶
مطلق اور اضافی: ۱۳۶، ۱۴۰، ۱۷۸، ۱۹۰، ۲۹۵، ۳۵۴، ۳۹۴
معاد: ۱۰۷
معتزلہ: ۴۳۰، ۴۳۳، ۵۷۵
معجزات: ۱۲۲
معراج: ۱۶۶، ۱۶۷، ۳۰۵، ۴۰۸
معصیت: ۸۰
معنی: ۱۸۷، ۱۸۸
مفسدین: ۵۰۸
مکہ: ۷، ۷۱، ۷۲
ملک/ بادشاہ: ۱۳۲، ۱۴۸، ۱۶۵
منکر نکیر: ۱۷۴، ۳۶۲
موت: ۱۵۶، ۲۷۱، ۳۵۳-۳۵۶
فرشتۂ اجل: ۴۰۶
نینداور موت: ۳۹۷ (دیکھیے: زندگی)
موذن: ۶۵
موسیقی: ۵۲۴
موسیٰؑ: ۱۴، ۳۳، ۴۵، ۱۱۴، ۱۲۳، ۲۶۶، ۳۰۳، ۴۷۹، ۴۹۱
میبدی، رشیدالدین: ۵۳۹
میزانِ قیامت: ۳۰۸، ۳۷۳ (دیکھیے: ابلیس)
میکائیلؑ: ۱۷۰، ۱۷۴، ۱۸۳
مَلَک: ۱۷۰، ۱۸۱
مُلّا: ۴۰
مُلّا صدرا: ۴۴۰

نباتات:۲۲۶،۲۲۷،۳۵۵

نبوت/ انبیا:۱۰۷-۱۰۹،۱۲۷،۱۲۸،۲۳۶،۲۵۰-۲۵۲، ۳۰۰-۳۰۶

نبی:۲۵۰

نذر:۳۳۷

نفاق:۴۸۵،۴۸۶

نفس:۱۹۰،۱۹۱،۱۹۶-۲۰۰،۲۱۷

نفس کی آشکارائی:۳۸۳،۳۸۴، ۳۸۹-۴۰۴، ۵۴۲-۵۵۰

نکاح/ شادی:۶۷،۱۰۱،۲۴۱،۲۴۲

نوحؑ:۲۵۲

نور:۴۳۹،۴۵۸،۴۵۹

نور و ظلمت:۱۷۲-۱۸۰،۲۱۱،۲۴۶،۲۶۳،۲۹۱، ۲۹۴،۳۲۳،۴۱۵

نورِ مخلوق اور نورِ غیر مخلوق:۱۷۸،۱۹۰،۲۰۱

قیامت اور نورِ خداوندی:۳۶۷-۳۷۰

روح بحیثیتِ نور:۳۹۳-۳۹۵

نوفلاطونیت:۴۲۴،۴۲۵

والدین:۴۷۲-۴۷۳،۵۶۴

وجود:۴۳۷،۴۳۸،۴۵۷

وحی:۳۲۸،۴۲۱،۴۵۲

وضو:۶۲،۶۳

ہاروت و ماروت:۱۷۰،۱۷۴،۲۴۵،۵۰۹

ہجرت:۲۲

ہدایت:۳۲۹،۳۴۹

ہدایت و گمراہی:۲۷۹-۲۸۵،۲۹۱،۲۹۲،۳۳۸

ہدیٰ:۲۷۹

ہمدانی، عین القضاۃ:۴۳۵

ہندومت:۱۳۲،۴۱۲،۵۲۳

ہویٰ/ ہوا و ہوس:۱۱۵،۱۱۶،۲۰۶،۲۸۱،۴۵۱،۵۴۴

ہیگل:۵۵۴

یاجوج ماجوج:۵۶۳

یروشلم:۱۶۶

یعقوبؑ:۵۱،۱۶۶،۲۵۲،۵۰۶

یوسفؑ:۳۲،۳۴،۴۵،۱۲۳،۲۵۲،۳۹۷،۳۹۸

یہودیت:۶۸،۲۵۸،۳۰۴،۳۰۷-۳۱۸